سید تقی عابدی

تعارف، تقاریب، تاثرات

جلد اول

سائی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

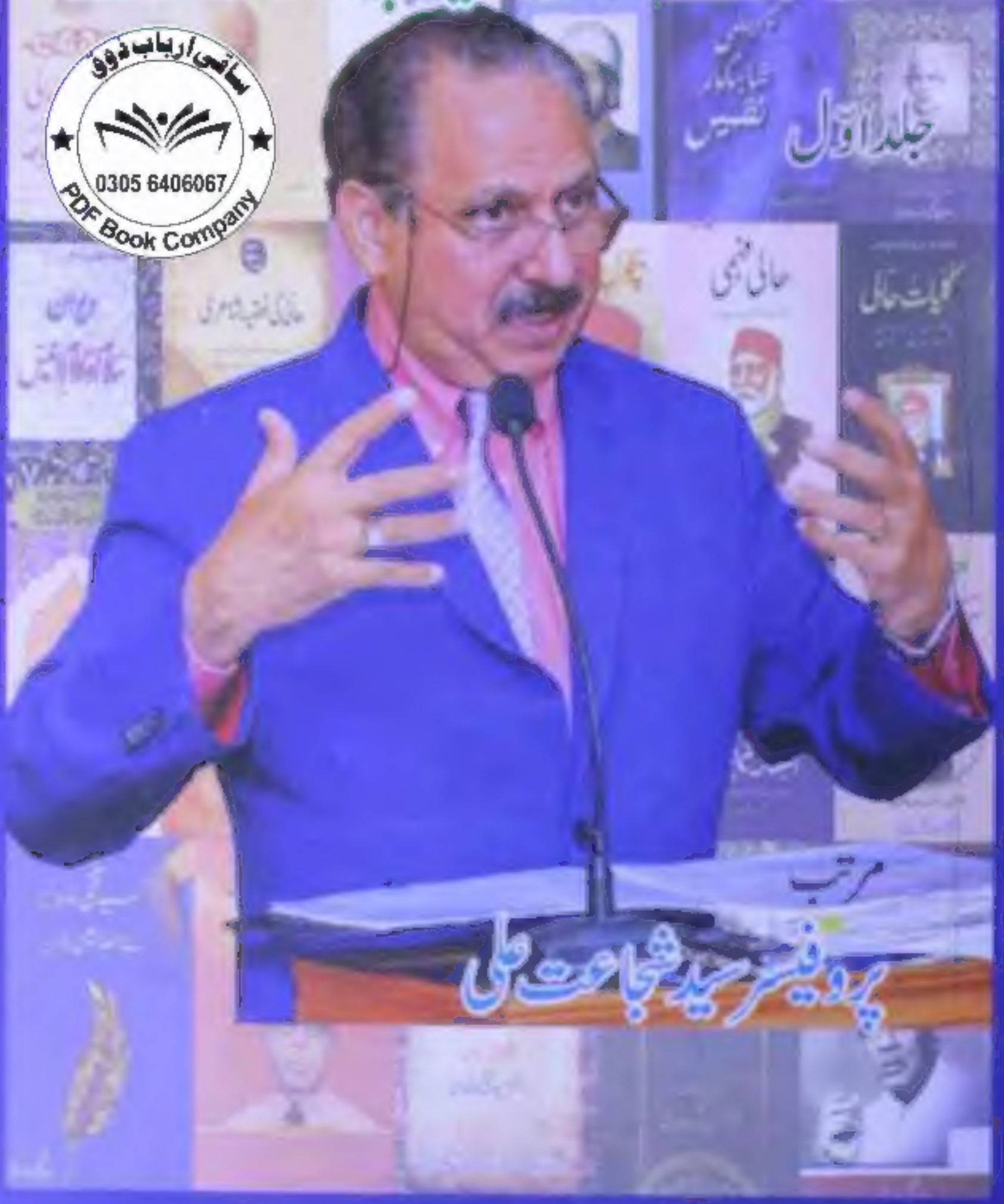

مرتب

پروفیسر سید شجاعت علی

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

سید تقی عابدی

تعارف، تقاریب، تاثرات

(شخصیت، فن، تصانیف اور تالیفات پر مشاہیر کے خیالات)

﴿جلد اوّل﴾

مرتب:
پروفیسر سید شجاعت علی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

0305 6406067
PDF Book Company

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ!

SYED TAQI ABEDI TARRUF, TAQAREEB, TASSURAT
(vol.1)

By: Prof: Syed Shujaut Ali

Year of Edition : 2023
ISBN: 978-81-19035-39-7
Price ₹ 3000/- (2 vol set)

کتاب	:	سید تقی عابدی تعارف، تقاریب، تاثرات (جلد اوّل)
مصنف ومؤلف	:	پروفیسر سید شجاعت علی
سنِ اشاعت	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۱۰۷۲
قیمت	:	۳۰۰۰ روپے (دوجلدوں پر مشتمل)
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	رہبر کمپیوٹرز 2936۔گلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
☆ مکتبہ علم و ادب، سری نگر
☆ ہدیٰ بک ایجنسی، ممبئی۔
☆ ایم بک ایجنسی، پٹنہ
☆ ادارہ ادب و ثقافت، حیدرآباد۔
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

تعارفی خاکہ

نام : سیّد شجاعت علی

قلمی نام : شجاع کامل

تعلیمی قابلیت : M.A.(Urdu), M.A.(Eng), B.Ed, SLET, Ph.D,

والد کا نام : سید عنایت علی مرحوم

والدہ کا نام : سکینہ بیگم مرحومہ

پیشہ : درس وتدریس

عرصۂ کارکردگی بحیثیت ٹیچر 6 سال اور بحیثیت لکچرر 24 سال

موجودہ عہدہ ومقام ملازمت:

پرنسپل اینڈ۔جے۔تھم کالج، جلگاؤں

سابقہ صدر شعبۂ اُردو

لوکمانیہ ٹلک مہاودیالیہ نانڈیڑ (مہاراشٹر)

دیگر عہدے:

(i) ممبر اکیڈمک کونسل، نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی، جلگاؤں

(ii) چیئرمین BOS (Urdu)

Kavayitri Bahinabai Chaudhari

North Maharashtra University, Jalgaon

0305 6406067
PDF Book Company

(iii) سابقہ چیئرمین، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ

(iv) سابقہ ممبر، اکیڈیمک کونسل، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ

(v) سابقہ وزیٹنگ ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، یونیورسٹی آف پونے، پونے

(vi) ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ آف سکینڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، پونے (برائے نہم تا بارہویں جماعت)

(vii) ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ

(viii) ممبر، آرٹس فیکلٹی، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ

(ix) کوآپٹ ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، امراوتی یونیورسٹی، امراوتی

(x) ریسرچ گائیڈ (مضمون: اُردو)

(xi) مختلف جامعات کے تحت M.Phil اور Ph.D مقالات کی تنقیح کے لیے بحیثیت ریفری تقرر

تصنیف و تالیف:

[1980ء سے تا حال تصنیف و تالیف کا کام جاری ہے۔
مختصر تفصیل نیچے دی گئی ہے۔]

1. ''میں اور میرا فن'' (تنقیدی مضامین)
2. ''سمندر کے کنارے اگا سورج'' (افسانوی مجموعہ)
3. ''تذکرہ پروفیسر تراب علی'' (مرتب)
4. ''توسین''
5. ''مضامین شجاع''
6. ''نگارشات'' حصہ اوّل (غزل)
7. ''نگارشات'' حصہ دوّم (نظم)

نصابی کتب کی ترتیب وتدوین:

1. فنکشنل اُردو (برائے سال اوّل گریجویٹ طلبہ)
2. یشونت راؤ چوہان اوپن یونیورسٹی،
ناسک کی اُردو نصابی کتاب کی ترتیب
(برائے بی۔اے۔سال اوّل ودوم)

زیرِ طبع کتب:

1. ''تاریخ ناندیڑ'' (ناندیڑ کی علمی، ادبی وسماجی تاریخ)
2. ''جدید اُردو افسانے میں ترکِ وطن وہجرت کے مسائل ایک تنقیدی جائزہ''
(تحقیقی مقالہ)

دیگر تعلیمی سرگرمیاں:

(a) ریڈیو ٹاکس آکاش وانی اورنگ آباد، پر بھنی ناندیڑ سے افسانے، مباحث اور انٹرویوز نشر

عرضِ مرتب

۲۵ر جنوری ۲۰۱۹ء کو راقم الحروف پر مرتب کتاب کا نامزدگی میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اسی موقع پر یہ طے پایا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے فکر و فن اور شخصیت پر ایک کتاب مرتب کی جائے، جس میں مشاہیر اُردو ادب کے خیالات، تاثرات، کتابوں کی رونمائی کی محافل کی تصویریں بھی شامل کی جائیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی سے میں نے تذکرہ کیا۔ انھوں نے آمادگی ظاہر کی۔

احقر نے کوشش اور عرق ریزی کر کے اس پروجیکٹ کو دو جلدوں میں ترتیب دیا تاکہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشے مزید روشن ہو سکیں۔

والسلام

پروفیسر سید شجاعت علی

(شجاع کاظمی)

نامزد

0305 6406067
PDF Book Company

فہرست

1۔	ڈاکٹر تقی عابدی: محقق و دانشور	پروفیسر شارب ردولوی	15
2۔	خدمت انسان کا امین: ڈاکٹر سید تقی عابدی	پروفیسر سید شجاعت علی	19
3۔	''انیس سے اقبال تک''	ڈاکٹر سلیم اختر	23
4۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی: پیہم موجِ امکانی میں	پروفیسر صادق	31
5۔	تقی عابدی: ایک شخصیت	واصف حسین واصف	35
6۔	صحت کا طبیب اور ادب کا مریض: مجموعۂ ادب تقی عابدی	ڈاکٹر فرحت نادر رضوی	39
7۔	نذرانۂ دل	سید ناظر حسن زیدی	46
8۔	عصر حاضر میں اُردو زبان و ادب کے بے تاج بادشاہ ڈاکٹر سید تقی عابدی: ایک تعارف	محمد حسن حسرت	49
9۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کی عمدہ مثال!	ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری	53
10۔	اُردو کا وکیل: تقی عابدی	ڈاکٹر شہناز قادری	57
11۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی: ایک محقق، مصنف اور شاعر	سلطان جمیل نسیم	66
12۔	مجری ادب کا درخشاں ستارہ ڈاکٹر تقی عابدی	پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین	74
13۔	رثائی ادب کا مسیحا	ڈاکٹر عظیم امروہوی	77
14۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تحقیقی شعور	پروفیسر عبدالکریم	83
15۔	اسلام آباد میں دسمبر کی بہار	شاہد اقبال کامران	90
16۔	قلمی چہرہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی	ڈاکٹر شفیع ایوب	94
17۔	ایک فرد یا ادارہ..... ڈاکٹر تقی عابدی	پروفیسر سید مجاور حسین رضوی	97

PDF Book Company (0305 6406107)

۱۸۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی	سید افتخار حیدر	104
۱۹۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی پر دو کتابیں	علی احمد فاطمی	110
۲۰۔ اُردو میں مجرّی ادب کا پہلا مجموعۂ مکاتیب "بنام تقی عابدی"	ڈاکٹر شہناز قادری	116
۲۱۔ ماہر خسرو و غالبؔ: ڈاکٹر سید تقی عابدی	ڈاکٹر سید کلیم اصغر	127
۲۲۔ جاوید نامہ: ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر میں	زاہدہ حنا	141
۲۳۔ انشائیہ کا ایک سنگ میل	اشفاق حسین	146
۲۴۔ تقی عابدی مشاہیر کی نظر میں		151

انٹرویوز:-

۱۔ "فن کار اب بھی مستور ہے"	افتخار امام صدیقی	168
۲۔ اُردو کی نئی بستیاں	سید فاضل حسین پرویز	192
۳۔ براہ راست	گلزار جاوید	195

منظوم خراج عقیدت:-

ستیہ پال آنند	214
ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی	215
سید باقر زیدی	217
ڈاکٹر جمال الدین	227
ریاضت علی شائقؔ سماکھنوی	228
شکیلؔ آزاد	231
پروفیسر حشمت علی کمالؔ الہامی	233
بشیر اعظم (جے پور)	236
ڈاکٹر محسن رضا رضوی	238
ڈاکٹر پیکر جعفری اترولوی	240
فیروز رشید	242
پنڈت بھوونیش کمار شرما بھون امروہوی	244

0305 6406057 PDF Book Company

	ڈاکٹر نعیم حنیف	217
	زاہد حسین لکھنوی	250
	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	261
	ڈاکٹر خورشید ناظر	283
	ڈاکٹر حسین احمد	293
	مظفر حنفی	297
	مناظر شہاب	307
	ڈاکٹر حسن صدیقی	318
	ڈاکٹر فروغ	329
	ڈاکٹر عبدالحق (لندن)	7
	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
	ڈاکٹر [illegible]	21

تبصرے

۱۔	[illegible]	[illegible]
۲۔	[illegible]	ڈاکٹر فرمان الحق پوری
۳۔	[illegible]	[illegible]
۴۔	[illegible]	[illegible]
۵۔	[illegible]	[illegible]
۶۔	[illegible]	[illegible]
۷۔	[illegible]	[illegible]
۸۔	[illegible]	[illegible]
۹۔	[illegible]	[illegible]
۱۰۔	[illegible]	ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

۱۱۔	تجزیہ یادگار انیس "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے"	زبیر صدیقی	315
۱۲۔	تالیف اور صاحب تالیف	سید باقر زیدی	331
۱۳۔	اظہارِ حق	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	333
۱۴۔	[illegible]	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	338
۱۵۔	تصانیف دبیر اور تقی عابدی	فرحت آرا حیدری	343
۱۶۔	"مثنویات دبیر" "ابواب المصائب" اور "[illegible] فارسی"	میرزا کاکب قدر	354
۱۷۔	شوقِ کلامِ دبیر	پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی	358
۱۸۔	آفتاب مرثیہ گوئی [illegible]	ڈاکٹر سید مجاہد حسن حسینی	365
۱۹۔	مجتہد [illegible] دبیر	[illegible]	[illegible]
۲۰۔	"[illegible]" [illegible]	تصنیف [illegible]	[illegible]
۲۱۔	[illegible] تقی عابدی	[illegible]	[illegible]
۲۲۔	[illegible]	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	390
۲۳۔	[illegible]	پروفیسر [illegible]	395
۲۴۔	[illegible]	[illegible]	399
۲۵۔	تجزیہ "کائناتِ آہ"	ڈاکٹر محمد [illegible]	402
۲۶۔	[illegible]	[illegible]	409
۲۷	[illegible]	[illegible]	419
۲۸	"[illegible]"	ڈاکٹر [illegible]	421
۲۹۔	تقی عابدی اور "[illegible]"	پروفیسر [illegible]	427
۳۰۔	[illegible]	[illegible]	438
۳۱۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی اقبال اور [illegible]	ڈاکٹر [illegible]	444
۳۲۔	چوں مرگ آید	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	449

۳۳۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب "چوں مرگ آید" پر اظہار خیال	افضل خان نیر	453
۳۴۔	"چوں مرگ آید"	شاہین	458
۳۵۔	چوں مرگ آید ڈاکٹر سید تقی عابدی مریض علامہ اقبال	تنویر الٰہی زیدی	461
۳۶۔	"چوں مرگ آید" ڈاکٹر تقی عابدی	[illegible]	465
۳۷۔	چوں مرگ آید	[illegible]	468
۳۸۔	"چوں مرگ آید"	[illegible]	471
۳۹۔	"چوں مرگ آید"	[illegible]	474
۴۰۔	"بدھ مت" (تین تحقیقی و تنقیدی مقالات)	[illegible]	480
۴۱۔	رباعیات بیدل از ڈاکٹر سید تقی عابدی	علامہ سید سلیمان ندوی	493
۴۲۔	رباعیات بیدل ایک جائزہ	پروفیسر احمد علی خاں	497
۴۳۔	رباعیات بیدل	پروفیسر سلیمان [illegible]	501
۴۴۔	ڈاکٹر تقی عابدی اور فیض فہمی	[illegible]	511
۴۵۔	ڈاکٹر تقی عابدی کا تجدیدی کارنامہ فیض فہمی	ڈاکٹر [illegible]	514
۴۶۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا جدید علم اور سائنس	ڈاکٹر رشید علی	519
۴۷۔	ڈاکٹر تقی عابدی اور فیض فہمی	پروفیسر [illegible]	523
۴۸۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی کی فیض فہمی	پروفیسر [illegible]	529
۴۹۔	فیض فہمی ایک تجدیدی مطالعہ	ڈاکٹر [illegible]	544
۵۰۔	فیض فہمی کے خدوخال	[illegible]	554
۵۱۔	ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب "فیض فہمی" پر ایک نظر	تابش صدیقی	560
۵۲۔	تقی عابدی کی کتاب "فیض فہمی"	[illegible]	562
۵۳۔	فیض فہمی	پروفیسر بیگ احساس	567
۵۴۔	تقی عابدی کی فیض فہمی	ڈاکٹر [illegible]	571

۵۵۔ فیض فہمی	پروفیسر عبدالستار دلوی	۶۷۴
تعارف وتقاریب		578
انگلش میٹر		838
فوٹوز		913
پوسٹرز		1041

پروفیسر شارب ردولوی
لکھنؤ (یوپی)

ڈاکٹر تقی عابدی: محقق و دانشور

اُردو کے مشہور و منفرد محقق ڈاکٹر تقی عابدی کا نام ایسا نہیں ہے جس کا تعارف کرایا جائے۔ وہ ایک ایسے محقق و ناقد ہیں جن کے کام سے ہر شخص واقف ہے۔ وہ تنہا ایسے شخص ہیں جنھوں نے ادب سے تعلیمی تعلق نہ ہونے کے باوجود اتنے تحقیقی و تنقیدی کام انجام دیئے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں تلاش کی جا سکتی۔ وہ بنیادی طور پر سائنس سے طالب علم اور پیشہ سے ڈاکٹر (طبیب) ہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ انھوں نے ادب کی یہ خدمات اپنے پیشہ سے سبکدوشی کے بعد انجام دی ہوں بلکہ وہ آج بھی اپنے طبی پیشے سے وابستہ ہیں۔ مختصر سے وقت میں جتنا کام انھوں نے اب تک تحقیق و تنقید کا کیا ہے۔ اس کی نظیر اردو دنیا میں کم ہے۔ کوئی سوچ نہیں سکتا کہ وہ کس وقت تحقیق و تدوین کا کام کرتے ہیں۔ بعض لوگ جنھیں ان کا مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا ان کا کہنا ہے کہ رات کا بیشتر حصہ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ کام ان کی توانائی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ کام کرتے تھکتے نہیں انھوں نے فرد واحد کی حیثیت سے اب تک جتنا کام کر لیا ہے اس کے لیے اداروں اور تنظیموں کی پوری ٹیم درکار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے تحقیقی کاموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کے یہاں تحقیقی جستجو کے ہمرکاب تنقیدی فکر بھی ساتھ سفر کرتی ہے۔ یعنی قدیم تحقیق کے علاوہ تدوین متن کا بہت بڑا کام بھی انھوں نے کیا ہے ساتھ ہی جدید شعرا کے بارے میں بھی ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک منفرد کام میر انیس کے مشہور مرثیے "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا فنی تجزیہ ہے، جو میر انیس کے مرثیوں کے مطالعے و تحقیق و تنقید کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس لیے اس کے بعد انھوں نے دوسرا اس طرح کا

تجزیہ کر سکا ہے اور نہ خود تقی عابدی صاحب نے کسی نظم کا اس طرح سے تجزیہ کیا ہے۔ اگر میں ان کے اس تجزیے کے سلسلہ میں طبی اصطلاح کا ہی استعمال کروں تو یہی کہوں گا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیے کا DNA کیا ہے، اس لیے کہ انھوں نے مرثیہ پر صرف ایک تنقیدی نظر ڈالنے کے بجائے اس کی خوبیاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور خوبیوں میں انسانی خوبیاں بھی ہیں، جمالیاتی خوبیاں بھی ہیں، فنی خوبیاں بھی ہیں، اظہار و بیان کی ندرت بھی ہے۔ رشتوں کی اہمیت، جذبات کا اظہار، مناظر کے اثرات اور احساس کی شدت بھی ہے اور جہاں اتنی ساری چیزیں جمع ہو جائیں وہاں مطالعہ صرف قرات کا نہیں رہ جاتا قاری کو الفاظ کے اندر اتر کر دیکھنا ہوتا ہے اور یہ عمل اس مرثیے کے سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی نے بہت کامیابی سے انجام دیا ہے اور مرثیے کی تمام جزئیات پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

میر انیس ادب میں زبان، مضامین کے عمل سے بخوبی واقف تھے یہی سبب ہے کہ وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کر دیتے ہیں وہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تجربہ بہت آسان ہے اور کوئی بھی کر سکتا ہے۔ میر انیس نے بعض جگہوں پر غیر مانوس روزمرہ کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جیسے ان اشعار میں لفظ ''صندل'' اور ''پرے'' وغیرہ نظر کیجیے ؎

گھوڑے پہ تھا شفق کہ ہوا پر پہاڑ تھا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

•••

صندل سے تا نمک بچوں سے گودی بھری رہے
یارب رسولؐ پاک کی کھیتی ہری رہے

اس طرح کے بے حساب مصرعے، بند اور اشعار مل جائیں گے لیکن کوئی لفظ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ جو لفظ استعمال ہوا ہے محسوس ہوتا ہے کہ وہیں کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے الفاظ کو ایک طرح کا سر قرار دیا ہے اسے نفسی کہہ سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

''شعر میں جو لفظ ایک قسم کا سُر ہوتا ہے اور جو راگ یا نغمہ سروں کے مجموعے کا نام ہے راگ یا نغمے کی شکل ہونے کے لیے اسے ایسے سروں سے ترتیب دیا جائے کہ اس میں باہمی تناسب ہو اس لیے ان کی حفاظت و

روانی اور شیرینی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ مرثیہ پیش کے
الفاظ سے ان کی مناسبت برقرار رہے۔"

(بحوالہ یادگار مرثیہ کے متعلقات)

اس طرح ڈاکٹر تقی عابدی نے الفاظ اور قوافی کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو بہت اہم ہے اس لیے کہ شاعری کی ساری عمارت تعمیر ہوتی ہے ان سرا اب یا نقوش پر، لیکن اس میں بنیادی عمل زبان یا الفاظ کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک بڑا کام انیس کے کلام کی تدوین ہے۔ اب تک یہ بتانا مشکل تھا کہ انیس نے کتنے سلام کہے ہیں۔ پہلی بار تقی عابدی صاحب نے ان سے 112 سلام یکجا کر کے شائع کیے ہیں۔ اس میں انھوں نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ نوحوں کو سلام میں شامل نہ کیا جائے۔ تقی عابدی نے سلام و نوحوں کو الگ کر کے دونوں اصناف میں جو باریک فرق ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے میر انیس کے پندرہ نوحے اور پانچ غزلیں بھی سلام کے مجموعے میں علیحدہ ضمیمے کی شکل میں شائع کر دی ہیں جس سے انیس پر کسی بھی طرح کی تحقیق کرنے والوں کے لیے راہیں ہموار ہو گئی ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک بنیادی کام "کلیات غالب فارسی" [جلد اول اور جلد دوم] ہے۔ غالب کا فارسی کلیات دست و برد زمانہ سے تقریباً ضائع ہو جانے کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ قدیم طباعت اور کاغذ کی خستگی دونوں نے کلیات کو پڑھنے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ تقی عابدی کا قابل ستائش کام یہ ہے کہ انھوں نے "کلیات غالب فارسی" کی تدوین کی اور دونوں جلدوں کو جدید تنقیدی مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا۔ یہاں پر ایک حوالہ اور دینا چاہوں گا وہ ہے "غالب دیوان نعت و منقبت" کا۔ غالب کے عقائد کے سلسلے سے اکثر بحث رہی ہے۔ غالب خود آزاد منش، کشادہ دل اور کشادہ نظر انسان تھے۔ اپنے عقائد کے سلسلے میں بھی ان کے یہاں وہی وسعت نظر پائی جاتی ہے۔ کبھی وہ کہتے تھے۔

شیعی کیوں کر ہو ماورالنہری

اور کبھی کہتے تھے

ہم اسد اللہی ام ہم اسد اللہی یم

مالک رام صاحب نے اس سلسلہ میں بہت بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ہم عصر ادیبوں و شاعروں کے عقائد سے بھی لوگوں کو واقفیت ہوتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ غالب اس سلسلہ میں جیسا موقع ہوتا تھا ویسی بات کرتے تھے۔ شاید ان کے زمانے کے لوگ ان کی آزاد روی کے باوجود ان کے عقائد سے واقف رہے ہوں لیکن تقی عابدی صاحب نے بغیر ان باتوں کا جواب دیئے "غالب دیوان نعت و منقبت" مرتب کرکے خود ایک جواب فراہم کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ "غالب دیوان نعت و منقبت" غالب کے تنقیدی تجزیے میں نہیں زیر بحث نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی لوگ اچھی طرح غالب کے ان قصائد و منقبت سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک بڑا تحقیقی کام انجام دے کر غالب کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ایک بحث ختم کر دی دوسری یہ کہ ان کے کلام میں اچھے خاصے بڑے ذخیرے کا اضافہ کر دیا۔ تقی عابدی نے اس طرح کے بہت سے کام کیے ہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں کے بارے میں جن کے کلیات شائع نہیں ہوئے۔

نجم آفندی گزشتہ عہد کے ایک بہت مقبول شاعر تھے میں خود جانتا ہوں کہ ایک دور ایسا تھا کہ ترنم کے زمانے میں نجم آفندی کے گانے اور سلام مرثیہ کی آواز سے شہر و قصبات گونجتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے مجموعے میں محفوظ نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے وہ جلدوں میں "کلیات نجم" شائع کرکے انھیں ضائع ہونے سے بچا لیا۔ دوسرے نجم آفندی کو ایک نئی زندگی دے دی۔

تقی عابدی نے اس طرح کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں پر اگر گفتگو کی جائے تو اس کے لیے ایک بڑا دفتر چاہیے۔ تقی عابدی نے دیگر مثنویات اور "مجتہد نظم مرزا دبیر" "مسدس حالی" "شیخ سعدی" وغیرہ پر نظر انداز کلام کو سب کے سامنے پیش کر دیا۔

تقی عابدی پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں لیکن جو کام اردو تحقیق و تدوین کا انھوں نے انجام دیا ہے اس طرح سے ان قیمتی کتابوں دونوں تک تالع کرکے پہنچایا ہے وہ ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے جو آج تک کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکا۔

پروفیسر سید شجاعت علی
پرنسپل اقبال انٹرنیشنل کالج، جالنا (مہاراشٹر)

حُرمتِ لفظ کا امین: ڈاکٹر سید تقی عابدی

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شخصیت اور ان کی تحریروں کا جائزہ لینے سے پہلے راقم الحروف اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا۔ مگر اردو ادب کی تہذیب کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ جونیئر اپنے سینئر کی خدمات کا دیانت داری سے جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اسی قبیلہ وابستہ سمجھتا ہوں۔

عہد حاضر کے اردو کے چنندہ ادباء کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو ان کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اور اس فہرست سے جامعات، کالج کے اردو اساتذہ کے نام نکال دیے جائیں تو سرفہرست جو نام نمایاں نظر آتا ہے وہ ڈاکٹر تقی عابدی (سینیئر) کا ہے۔

برصغیر کی علمی و ادبی فضاء میں خاص طور سے اردو ادب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک تغیر پیدا کیا۔ شکر ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کسی جامعہ میں اردو کے استاد نہیں ورنہ ان کی راہ اتنی آسان نہ ہوتی۔

اردو ادب کا یہ مجاہد نہ جانے کیوں کٹھن راہوں کا مسافر بن بیٹھا۔ جب کہ پیشہ سے طب سے وابستگی میں آسودگی ہی آسودگی تھی۔

پھر ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ راستہ کیوں چنا؟

ایک طویل عرصے سے وہ اردو کی ترقی کے لیے تن من دھن کو بھی وار رہے ہیں۔

حضرت علیؓ کا قول ہے:

''میں نے اپنے ارادوں کو ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔''

ڈاکٹر تقی عابدی بھی اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہلے اپنی منزل میں کامیاب ہو

تیز کر لیتے ہیں اور کسی دوسرے مشن پر ڈٹ جاتے ہیں۔

انسان کبھی کبھی حالات سے بددل ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے جغادری ادیب رستہ تبدیل کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی آج کے ادیب ہیں۔ کوئی درباری ادیب نہیں۔ اس لیے وہ ان راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ جو ان کو اطمینان و طمانیت بخشتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی سے میں کب ملا؟ مجھے پتہ یاد نہیں۔ ہاں یہ یاد ہے۔ اورنگ آباد (دکن) سے میرے دوست عباسی کا فون آیا۔

''شجاع! کیا تم ڈاکٹر تقی عابدی کو جانتے ہو؟''

میں نے جواب دیا ''نہیں! مگر میں نے ان کا نام سنا ہے۔ کینیڈا میں رہتے ہیں طب کے پیشہ سے وابستہ ہیں اور رثائی ادب کے ناقد کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے۔''

دوسرے ہی لمحہ تقی عابدی فون پر مجھ سے مخاطب تھے۔

تعارف کے بعد انھوں نے حیدرآباد (دکن) کے کسی پروگرام میں ان کے شرکت کی اطلاع دی۔ اس دوران میں بھی حیدرآباد میں تھا۔ اس لیے ان سے ملاقات کی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا۔ انھوں نے کچھ کتابیں مجھے تحفتاً دیں۔ میں نے مطالعہ کیا، مجھے لگا یہ تو کسی بھی طالب علم کے لیے Ph.D کا مواد ہے۔ میں نے Ph.D تحقیق کے لیے ایک ریسرچ اسکالر سید حبیب کو تیار کیا۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی کی کتابیں مطالعہ کے لیے دیں۔ وہ Ph.D کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح میری نگرانی میں ''رثائی ادب میں تقی عابدی کا حصہ'' اس عنوان پر انھوں نے سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ (مہاراشٹر) سے Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔

اس دوران میں نے انھیں بزم اردو، بیشوناتھ کالج، ناندیڑ کے افتتاح کی دعوت دی۔ تقی عابدی اپنے ساتھ پروفیسر فاطمہ پروین، پروفیسر بیگ احساس، مرحوم مظفر حجاز، ڈاکٹر شجاعت علی رشدی کو بھی لائے۔ بہت خوب صورت پروگرام ہوا۔

اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی کے ساتھ پروگراموں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا آزاد یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں انھوں نے کلیدی خطبہ دیا۔ کنوینر ڈاکٹر یحییٰ

جاوڑے تھیں۔

رات میں ان کے اعزاز میں مرحوم خواجہ معین الدین نے وجد میموریل اورنگ آباد سے زیر اہتمام ایک مشاعرہ مجنوں ہز کے ہال میں منعقد کیا۔

فیروز رشید (ناندیڑ) کی مشاعرہ کی نظامت سے تقی عابدی بہت متاثر ہوئے۔

دوسرے دن یونیورسٹی آف ممبئی میں ڈاکٹر تقی عابدی اور میں دونوں مدعو تھے۔ مشاعرہ کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی اپنے ہوٹل چلے گئے۔ میں دوسرے ہوٹل میں فیروز رشید کے ساتھ مقیم تھا۔

صبح اورنگ آباد ایئر پورٹ پر ہم دونوں کی پھر ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے حیرت کا اظہار کیا کہ آپ نے رات میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں خاموش رہا کیا جواب دیتا؟

ڈاکٹر تقی عابدی کسی بھی سیمینار میں منتظمین پر کوئی بار نہیں ڈالتے۔ اپنے قیام کا خود انتظام کرتے ہیں۔ زاد راہ وغیرہ سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

یونیورسٹی آف ممبئی کا سیمینار جامعہ کے نصاب پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے متاثر کن انداز میں اس بات کا تفصیل سے جائزہ لیا کہ جامعات کے نصاب میں کس طرح کے ادیب و شعراء کو شامل کرنا چاہیے۔

اہم اساتذہ بھی طلباء کی طرح ان کے مشوروں کو غور سے سننے پر مجبور تھے۔ پونے کے شہرت یافتہ اعظم کیمپس کے دکن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی Research Recognition Committee کا میں ممبر تھا۔ اس لیے اعظم کیمپس میں میرا آنا جانا تھا۔ میں نے جناب منور پیر بھائی سے ڈاکٹر تقی عابدی کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے "فیض فہمی" کی رسم اجرائی کی تقریب اعظم کیمپس کے سیمینار ہال میں منعقد کی۔ پی اے انعامدار، عابدہ انعامدار، منور پیر بھائی، ممتاز پیر بھائی، فیروز رشید اور میں نے شرکت کی۔ مشاعرہ میں تقی عابدی کی نعت "وہ میرا نبی ہے، وہ میرا نبی ہے" نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

میرے دوست ڈاکٹر عباس عالم رضوی نے رضوی کالج ممبئی میں مرزا غالب پر قومی سیمینار کا انعقاد کیا۔ میں نے ان سے تذکرہ کیا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کا مرزا غالب پر ایک کام

ہے کیوں نہ ان سے رابطہ قائم کیا جائے۔ اس کی اجازت سے ڈاکٹر تقی عابدی سے بات ہوئی۔ ورڈ اسٹر تقی عابدی نے مرزا زبیر پر یادگار مقالہ پیش کیا۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی اتنی آسانی سے سیمینار میں اپنی بات رکھتے ہیں کہ سامعین اسے قبول کر لیتے ہیں۔ تقریر ہو یا تحریر ان کے نکات میں تسلسل ہوتا ہے۔ تحقیق میں، یوانگی کی حد تک ہمارا ان کا ایمان ہے۔

تقی عابدی کو رثائی ادب سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ ہے۔ میر ببر علی انیس کے مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کو جس تحقیقی انداز سے ترتیب دیا۔ وہ ادب کا ایک شاہکار ہے، جس کا آنے والی نسلیں فخر سے مطالعہ کریں گی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان دو اشعار کے ساتھ اجازت:

ادب کے مطلع انور کا استقبال کرتے ہیں
شگفتہ جذبہ اطہر کا استقبال کرتے ہیں

شب کی صبح سے اختر کا استقبال کرتے ہیں
تقی عابدی برتر کا استقبال کرتے ہیں

ڈاکٹر سلیم اختر
لاہور

انیسؔ سے اقبالؔ تک

معاصر محققین اور ناقدین میں ڈاکٹر سید تقی عابدی اس بنا پر منفرد ہیں کہ ان کی تحقیق مساعی اور تنقیدی کاوشیں ان کے پیشۂ ضمنی پیداوار نہیں یعنی وہ نہ ایم اے اردو ہیں اور نہ ہی کالج میں اردو کے پروفیسر۔ ان کے پیشے کا ادب و نقد سے کسی طرح کا بھی تعلق نہیں بنتا۔ سو یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر تو "بائی پاس آپریشن" کرتا ہے جب کہ شاعر یوں تو یا ہوتا ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

یا پھر بقول مصحفی:

تیرے تو دل میں بہت کام رفو کا نکلا

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا میں اس وجہ سے بھی قائل ہوں کہ کینیڈا میں رہائش کے باوجود انھوں نے اردو زبان و ادب سے ناطہ نہ توڑا۔ کثیر تارکین وطن شاعری سے محظوظ ہوتے یا خود شعر کہہ کر وطن سے ایک نوع کا جذباتی رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے جذباتی ہوتے ہیں کہ

بحرِ رجز میں ڈال کر بحرِ رمل چلے

ڈاکٹر تقی صاحب نے بھاری پتھر اٹھایا یعنی تحقیق و تنقید کو حرزِ جاں بنایا اور اس ضمن میں بھی مرثیہ کو خصوصی ترجیح دی۔ چناں چہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مراثی مدوّن کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں تحقیقی نوعیت کا کارآمد مواد فراہم کرتے ہوئے ایسی معلومات و اطلاعات سامنے لائے جن سے ان دونوں عظیم شعراء کے بارے میں تنقید کا تناظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اس ضمن میں "تجزیہ یا کارِ انیسؔ"، "مجتہد نظم مرزا دبیرؔ"، "سلام مرثیہ" اور "مصحفی فارسی دبیرؔ" اور "مثنویات دبیرؔ" جیسی کتابوں کا بطور خاص ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے میرا اولین تعارف برادرم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے توسط سے ہوا۔ انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے "تجزیہ یا کار نیس" کی ترتیب و تدوین کا ہنگامہ برپا کیا تو مجھے بھی موقع کی مناسبت سے مضمون تحریر کرنے کا حکم دیا۔

یہ کتاب ڈاکٹر سید تقی عابدی سے میرے اولین تعارف کا ذریعہ بنی۔ میری خواہش ہے کہ میں جاری مضمون سے درمیان قارئین چند سوئی خدمت میں وہ مختصر مضمون بھی پیش کروں۔

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں
بحر موج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذرے کو انجم کر دوں
گنگ کو ماہر انداز تکلم کر دوں

درد سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

جس طرح ہم زندگی کلیشوں کے سہارے بسر کر دیتے ہیں اس میں یہ ادراک کیے بغیر کہ کلیشے بے رنگ و بو پھولوں جیسے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادب و نقد میں بھی متعدد کلیشوں کا سکہ چلتا ہے۔ ان اصطلاحیں بے فیض سے ہوئے ہیں کس تسلسل سے برآمد ہوئے۔ ادھر ادھر کی مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہوئے اور اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے صرف ایک کلیشے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ بڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے، جس کی تردید میں حالی کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

یہ بہت بڑا دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

مرثیہ اردو شاعری کی ایسی ہمہ جہت صنف ہے جس میں واقعات کا بیان Epic کا رنگ جذبات کی افراط و تشنج، جو حق باطل کی کشمکش ہے، اسے ڈرامے کی سطح تک لے آتی ہے۔ اس کا کینوس افسانوی تخلیقی فضا کے مماثل ہے۔ فطرت کی تصویر کشی محاکات کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ اسلوب مشکوں کی یاد دلاتا ہے، موزوں مدرزات غزل کی یاد دلاتا ہے تو المیہ یتحرس کا موجب بنتا ہے۔ اسی لیے مرثیہ سامعین سے آنسوؤں کا نذرانہ وصول کرتا ہے اور بجا کرتا ہے۔ بلاشبہ مرثیہ وہ واحد صنف ہے جس میں بیشتر اصناف کا تقدس، رنگ اور خوشبو تحلیل ہے۔ اسی ہمہ

جہت صنف کے فنی تقاضوں سے عہدہ برا ہی کے لیے میر انیس جیسے شاعر ہی کی ضرورت تھی جنھوں نے صرف ایک مصرع میں اپنی شاعری کی اساس بننے والے عناصر کی نشاندہی کر دی۔ یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال اگرچہ انیس یہ دعوی بھی کرتے ہیں

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ میں باندھوں

لیکن اس کے ساتھ عجز ہنر کا احساس تعلّی سے باز بھی رکھتا ہے

خاموش زباں، دعویٰ بے جا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا
آپ اپنی ثناء واہ یہ شیوہ نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

میر انیس نے درست کہا تھا۔ انھیں تعلّی کی ضرورت نہ تھی، وہ خالی برتن نہ تھے اس لیے عظمت فن کی گواہی زمانے نے دی۔ تنقید کی میزان میں تول کر، تحقیق کے تفت خواں سے گزر کر اور پھر بھی یہ احساس باقی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا! مولانا شبلی نعمانی کی ''موازنہ انیس و دبیر'' سے چلیں تو ڈاکٹر تقی عابدی کی ''تجزیہ یادگار انیس'' تک، اردو تحقیق و تنقید کی اہم ترین شخصیات نے انیس کے شاعرانہ محاسن اجاگر کرنے میں اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس لیے اقبالیات اور غالبیات کی مانند اب ''انیسیات'' کی اصطلاح استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

محققین کے بموجب اگرچہ میر انیس کی تاریخ پیدائش متنازعہ ہے لیکن اکثر اسے تسلیم کرتی ہے کہ 1803ء میں فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے، گویا انیس کی پیدائش کو دو صدیاں بیت چکی ہیں اور اس مناسبت سے 2003ء میر انیس کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرکاری طور پر نہ سہی ادبی حلقوں، اہل علم، دانشوروں اور انیس شناسوں کا یہ اجتماع گویا سال انیس کی افتتاحی تقریب کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس موقع پر اگر یہ تجویز پیش کی جائے کہ اکادمی ادبیات پاکستان انیس کے نام کے ایک ایوارڈ کا اجراء کر دے تو اسے بے محل نہ سمجھا جائے۔

یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ سال انیس کا افتتاح کینیڈا میں مقیم دانش تقی عابدی کی ''تجزیہ

یادگار انیس" سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر سید تقی عابدی میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن یہ کتاب انھیں محنت طلب، مشکل پسند بلکہ مشقت پسند محقق کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انیس پر ناقدین کے مقالات جمع کر کے مرتب بن کر مصنف کی عزت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب انیس کے اس معروف مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا تنقیدی، مطالعہ، تنقیدی محاکمہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے۔

مرثیہ انیس میں اس مرثیہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چناں چہ ناقدین کی اکثریت نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیہ کے شاعرانہ محاسن اجاگر کیے ہیں۔ نامور محقق مسعود حسن رضوی ادیب نے "شاہکار انیس" کے نام سے 1943ء میں اس مرثیہ کا دیدہ زیب مصور ایڈیشن لکھنؤ سے شائع کیا تھا، لندن سے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ڈیوڈ میتھیوز نے اس کا انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala" کے نام سے شائع کیا جب کہ حسن علی خاں ناپید نے منظوم سندھی کے قالب میں اسے ڈھالا۔

سائز جیسے آرٹ پیپر پر دیدہ زیب انداز میں مطبوعہ پونے 8 سو صفحات کی یہ کتاب میر انیس کے حالات، کارنامے اور مرثیہ کے بارے میں محققین کے مستند حوالوں کی حامل ہے چناں چہ انیس اور خاندان انیس کے بارے میں خاصی معلومات اور واقفیت حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا اصل کام یہ کارنامہ ہے جس پر ڈاکٹر صاحب نے یقیناً نصف شب کے چراغ جلائے ہوں گے۔ اس مرثیہ کے ہر ایک بند کا تجزیاتی مطالعہ ہے یہ مطالعہ جو فرہنگ و اشتقاق سے لے کر صنائع و بدائع و فصاحت و بلاغت سے وابستہ جملہ امور سخن کا حامل ہے۔ اور جس کے مطالعہ سے میر انیس کے اسلوب کی جملہ جہات کی متنوع جہات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ میر انیس نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ تعداد میں الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور اسے تسلیم بھی کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس مرثیہ کے الفاظ کی تعداد متعین کرنے کے ساتھ حالی کے دعوی کی شماریاتی تصدیق بھی کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بموجب "میر انیس نے دو سو کے قریب مرثیے، سو سے زیادہ سلام اور بہت سی رباعیات کہیں۔ مرثیوں کے سینکڑوں بند اور ہزاروں الفاظ، میر انیس کی [illegible]

جس طرح ہر پھول کا جداگانہ رنگ اور باس ہوتی ہے اسی طرح ہر لفظ جداگانہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے ہر لفظ منفرد، صوتی آہنگ اور معنی تلازمات رکھتا ہے۔ چنانچہ اسلوب کی جمالیات کا انحصار مناسب اور موزوں ترین الفاظ کے انتخاب پر ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ اس لیے شعروں کے انتخاب کی مانند الفاظ بھی رسوائی کا سبب بن سکتے ہیں یہ قول عام شاعری کی بابت لیکن مرثیہ میں الفاظ اور ان کا انتخاب اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ یہ امام عالی مرتبت کی شہادت کے بیان کے لیے وقف ہے۔ اس لیے جوش و خلوص کے باوصف عقیدت و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔ اور یہی کام بطریق احسن میر انیس نے کیا۔

ڈاکٹر تقی ہمیں بتاتے ہیں کہ ''196 بند کے مرثیے میں کل الفاظ جن میں تکرار شامل ہے، ان کی تعداد 9493 ہے۔ عربی الفاظ کی تعداد 1769، فارسی الفاظ کی تعداد 1043، اور ہندی الفاظ کی تعداد 577 ہے۔ اس مرثیے میں 61 فیصد الفاظ اردو، بیس فیصد الفاظ فارسی اور انیس فیصد الفاظ عربی زبان کے ہیں۔'' (ص 98)

اس لسانی تجزیہ کے بعد اسماء کا شماریاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے ''اس 196 بند کے مرثیہ میں امام حسینؑ کا نام، القاب اور کنیت وغیرہ 143 سے زیادہ استعمال ہوئے ہیں، حسینؑ 31 بار اور شبیرؑ صرف چار بار نظر آتا ہے اس کے علاوہ چونسٹھ سے زیادہ القاب اور کنیات سے امام حسینؑ کو خطاب کیا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ کا نام لقب یا کنیت 49 بار نظر آتا ہے۔ حضرت زینبؑ کا نام 21 بار، حضرت فاطمہؑ کا 17 بار، حضرت علیؑ 35 بار، حضرت عباسؑ 12 بار، حضرت سکینہؑ حضرت بانو پانچ پانچ بار، حضرت جعفر طیارؑ چار بار، حضرت علی اصغرؑ تین بار، روح الامینؑ تین بار، امام حسنؑ، امام باقرؑ، حضرت قاسمؑ، حضرت یوسفؑ دو دو بار، حضرت خضرؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت داؤدؑ کے علاوہ حضرت عقیلؑ، حضرت مسلمؑ، مالک اشترؒ، شہزادی کلثومؑ، ام البنینؑ اور فضہؑ کے نام ایک ایک بار مرثیہ میں آئے ہیں۔ (ص 110)

''صرف اس مرثیہ میں کل اضافات 587 سے بھی زیادہ ہیں۔'' (ص 182)

یہ مرعوب کن شماریاتی مطالعہ کمپیوٹر کی مدد سے معاون ہوا ہے ورنہ یہ کام اس سے ممکن نہیں پڑتے۔ تاہم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی لگن اور محنت سے یہ تحقیقی کام ''

انیس کے ڈرامائی کا بھی تجزیاتی شماریاتی مطالعہ کرنا ہیں ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی "اسلوبیات انیس" میں میر انیس کے بعض مرثیوں کا اسلوبیاتی مطالعہ پیش کر ان کے ذخیرہ کے بارے میں دلچسپ نتائج پیش کیے ہیں۔

اس سے اساسی اہمیت کا یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا شعر صرف لفظوں کا کھیل ہے؟ یہ درست کہ شعری تخلیقات کی اساس لفظ ہی پر استوار ہوتی ہے یہ طے قلم و تخلیق بخن بازیچہ الفاظ ہی تو ہیں لیکن محض لفظ کے استعمال اور لفظ کے تخلیقی استعمال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لفظ کے تخلیقی استعمال کا انحصار لفظ کی مزاج شناسی پر ہے۔ لفظ کی مزاج شناسی ہی اسلوب کے جاں و جمال کے ضامن متعین کرتی ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہر بڑے شاعر کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے لیکن میر انیس کی واہی بھی خاصی معتبر ہے۔ یہی وجہ ہے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شماریاتی مطالعہ مزید معتبر بنا دیتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے کلاسیک پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کسی بھی زبان، ادب، صنف میں کلاسیک کا درجہ حاصل کرنے والا شاعر اس زبان، ادب، صنف کے تمام تخلیقی امکانات کو یوں بروئے کار لاتا ہے کہ آنے والے شعراء کے لیے اس کے انداز و اسلوب میں اس سے بہتر بات کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اگر اس معیار پر میر انیس کو پرکھیں تو وہ "کم معیار" نہیں ثابت ہوتا۔ کم معیار یا دوم ایلیٹ کے ساتھ کلاسیک کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا اور مرثیہ میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ انیس نے مرثیہ میں اسلوب سازی سے جو جو تخلیقی جدتیں کیں ان کی بنا پر معاصرین میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ انیس آج بھی اپنی مثال آپ ہے اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کی "تجزیاتی شماریاتی" انیس فہمی میں دلیل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے علامہ اقبال کے "عرفانی رویے" کی صورت میں اقبالیات کی وادی میں قدم رکھا تو یہاں بھی اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اب "چوں مرگ آید" کی صورت میں یہ ڈاکٹر صاحب اقبالیات میں اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے مستند حوالوں، مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص [illegible] تحقیق پر مبنی یہ کتاب اب تک کی پڑھی گئی علامہ اقبال کی میڈیکل ہسٹری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر ہمارے ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں

مہنگی فیسوں والے ماہر ڈاکٹروں کی کمی نہیں، جن کی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ وہ تین ہفتوں سے پہلے پانچ منٹ نہیں نکال سکتے۔ ان میں سے کسی کو اس قسم کی تحقیق کا خیال تک نہ آیا۔ خیال تو دور کی بات ان میں سے اکثر کو اس کتاب کے مطالعہ کی فرصت بھی نہ ملی ہوگی۔

"چوں مرگ آید" کا انداز ہ میڈیکل جرنلز میں طبع ہونے والے تحقیقی مقالات جیسا ہے جس میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے علامہ کے سینتیس امراض کا اس قسم میں جو شمار و مدون کیا ہے اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ نے دنیا بھر کے امراض پال رکھے تھے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اتنے امراض کے باوجود علامہ نے اتنی بھرپور فعال زندگی کیسے بسر کی؟ علامہ اقبال نے اپنے بارے میں کہا تھا

"یہ اک مرد تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا"

اس کتاب سے بھی اس کی توثیق ہو جاتی ہے۔ یعنی علامہ اقبال کی روزمرہ کی زندگی تساہل پسندی کی طرف مائل تھی۔ (ص 41)

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس قدر امراض کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان فرمائی ہیں

1 علامہ اقبال نے کم از کم تیس، پینتیس برس تک تمباکو نوشی کی۔

2 علامہ اقبال کی تساہل پسندی (Life Sedentary) جس میں ورزش وغیرہ کا بالکل دخل نہ تھا۔

3. مرغن اور پر چرب غذا کا استعمال مثلاً دیسی گھی وغیرہ۔

4. زیادہ نمک اور میٹھے پھل کا مسلسل استعمال۔

5. انسیر دل، مغزوں اور گشنوں کا استعمال جو قلب و جگر کے لیے انتہائی مضر تھے۔ (ص 31)

علامہ اقبال کے امراض کی تشخیص میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے معالجین اور ڈاکٹروں کے نام میں بھی مفصل معلومات فراہم کی ہیں۔

تمام امراض کے تجزیہ اور تشخیص کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے والدین اور ان کی اولاد کی عمر کا گوشوارہ مرتب کرنے پر چونکا دینے والا نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ اقبال نے عمر طبیعی "تین برس کم پائی۔" (ص 122)

"علامہ اقبال کی بیت بازی کی مہم بچپن سے مزاحیہ، سماجی، سیاسی، ورزش سے
متعلق، فکری Stressful، اضطراب، فشارِ خون، ذیابیطس، بلڈ پریشر، شعلوں کا
استعمال، Ultra Violet Rays، کا بے جا استعمال، نقرس کی وجہ سے ہاتھ اور
پیروں کی بیماریوں کا بیان جس میں Drug Heals سے متعلق اشعار شامل
ہو سکتے ہیں۔" (ص:123-124)

آخر میں مقالہ نگار کی نوٹس قسم کے مضامین کی مہم سے کلیشے، ورد، تکرار،
بیت بازی کی مہم کے تجزیے میں "چوں مرد آید" تاریخ، واقعہ، تجزیہ کا
بیان، مقالہ نگار کی جانب سے پیش کیے گئے نتائج، تجاویز، سفارشات
ان سے متعلق بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

پروفیسر صادق
...

ڈاکٹر سید تقی عابدی: پیہم موجِ امکانی میں

بیسویں صدی میں اردو تحقیق نے جتنی ترقی کی ہے وہ بیسویں صدی کے اواخر میں ہی ممکن ہوئی۔ اس صدی میں بہت سے بڑے محققین نے تحقیق کے نئے نئے راستے نکالے اور اپنے خونِ جگر سے اس چمن کی آبیاری کی اور اسے قابلِ رشک بنایا۔ ان محققین میں محمود شیرانی، امیر علی مرتضیٰ، مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، حافظ محمود شیرانی، مالک رام، مختار الدین احمد آرزو، سید حسین، چند حسین، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان سب نے اپنی خداداد صلاحیت کی بنیاد پر اپنی اپنی فکر، ذوق اور دلچسپی کے مطابق اپنے اپنے میدانوں میں تحقیق کا کام کیا۔ ان محققین کے کارناموں کی وجہ سے تاریخ ادب اردو کے کئی تاریک گوشے روشن ہو گئے۔ یہ محققین اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایسی مشعلیں روشن کر گئے ہیں جن کی روشنی میں آج تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ ان محققین کی تحریروں سے آج بھی تحقیق کے نئے نئے راستے نکل رہے ہیں۔ ان محققین کی تحریروں کی وجہ سے ہی آج تحقیق کی اہمیت و افادیت کا احساس ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں جو تحقیقی بصیرت ہے اس کی وجہ سے ہی ان کی تحریروں کی اہمیت و افادیت کا احساس ہوا ہے۔

بیسویں صدی کے محققین نے جتنے کارنامے انجام دیے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اب ان کارناموں کی روشنی میں نئی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اب ان محققین کے تحقیقی کارناموں کا ...

ں مثنوی کی نشاندہی سب سے پہلے محمد زماں آزردہ نے کی تھی۔ تقی عابدی کے مطابق "اس مثنوی کا پورا نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ یہ مرزا صادق مرحوم سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے۔ یہ مثنوی دیوان سے خط سے بھی کی اس پر بھی نظر ثانی بھی کی اور چند مصرعوں میں تبدیلی اور چند شعر رد و قطع بھی کرایا ہے۔"

اسی طرح مرزا دبیر کی ایک اہم کتاب "ابواب المصائب" ہے۔ یہ ان کی واحد نثری تصنیف ہے جو وقت اور حالات کی ستم ظریفی سے پہلے طرح نظر انداز ہوتی رہی اردو ادب کی تاریخوں اور نثری ادب پر قلم کی اہم ترین کتابوں تک میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اردو ادب کی یہ پہلی مرثیے کی "افسانہ مجالس" سے بعد یہ مثنوی نثری دوسری اہم کتاب ہے جو نہ صرف کتاب کی بھی طویل عرصہ دراز تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ فضل حسین ثابت، محمد زماں آزردہ، امجد حیدری شمیمی، سید صفدر حسین اور نادر حسین فدوی وغیرہ نے "ابواب المصائب" کا ذکر کیا ہے۔ "ابواب المصائب" چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں پانچ پانچ فصلوں کا اندراج کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری تشریح کرتے ہوئے ان کے مصائب کا موازنہ حضرت حسین اور اہل بیت کے مصائب سے ساتھ یہ معروف عالم انیات سید جعفر کی مرتبہ کتاب "زیارت" میں بھی "ابواب المصائب" کا تذکرہ ملتا ہے۔

دبیر یات کی سے سلسلے کی ایک اور اہم کتاب "رباعیات دبیر" ہے جس پر تقی عابدی اس وقت کام کر رہے ہیں۔ یہ کتاب مرزا دبیر کی [illegible] سے زائد رباعیات پر مشتمل ہے جن سے کچھ ہوئے اور تابی صورت میں محفوظ ہیں۔ تقی عابدی نے بعد یہ مرزا دبیر کی یہ اہم ترین رباعی کوشش عوام کی دسترس میں لانے کی ہے۔ تقی عابدی کی تحقیق کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں مرزا دبیر کی یہ بڑے مرثیے کے علاوہ یہ مثنوی کتاب اور یہ نثری کتاب اور رباعی کوشش عوام کی دسترس میں آ گئی ہے جس سے وہ بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔

"چہلم صبح مجلس" کا پانچ سے پانچ میں سے صادق یہ تقی عابدی کی مرتبہ تازہ ترین کتاب "[illegible]" ہے جس میں سے [illegible]

واصف حسین واصف
نیویارک

تقی عابدی: ایک شخصیت

تقی عابدی کی کتاب کی رونمائی سے قبل ہی مجھے پرتقی عابدی کا قرض تھا۔ تقی عابدی کی تین کتابیں میری میز پر موجود ہیں۔ کتابے کتابے وہ میرے مطالعہ میں بھی رہیں۔ تقی عابدی پر مضمون کا خاکہ ان کی کتابوں کے حوالے سے میرے ذہن میں تھا۔ لکھنا بھی چاہا مگر تقی عابدی نے بھی مشکل کر دیا۔ وہ کربلا پر رہا تو میں بھی اس کے ساتھ کربلا پر رہا اور پھر مجھے یاد آیا کہ ایک کربلا سے میں بھی گزرا ہوں اس کربلا کو میں جھوٹی ہی سہی تھا۔ میں اس وقت کرب و بلا میں تنہا کھڑا ہوں۔ اس کرب نے اس بلا نے اور اس تنہائی نے بار بار قلم پکڑ لیا۔ گزشتہ دو سال کے دوران میں خواہش کے باوجود تنقیدی مضامین نہ لکھ سکا۔ نظیر حسین زیدی نے کہا تھا کہ کربلا ہمیں تین رخ تو دے ہی دیتی ہے۔ کربلا کا کرب ہے۔ یہ ہمیں فکر بھی دیتی ہے اور حریت بھی۔ مگر ہمارا شمار ان لوگوں میں ہے جو اس قید سے کبھی باہر نہیں آتے۔ تقی عابدی کا بڑا حوصلہ ہے کہ وہ اس قید کی تینوں حدیں پار کر گیا۔ وہ رویا بھی، اس نے سوچ بھی اور اسے حریت فکر بھی ہے۔

تقی عابدی سے میری ملاقات دبئی میں سال پہلے پاکستانی ہی محفل میں ہوئی۔ اس محفل میں تقی عابدی کا تعارف ڈاکٹر تقی عابدی سے کرایا جاتا تھا اور میری طرح بہت سے لوگ تقی عابدی کو فزیشن سمجھتے ہیں۔ یہ غلط فہمی دور ہونی تھی۔ کئی برسوں سے ڈاکٹروں کی طرح تقی عابدی بھی شہرت کی تمنا میں ہیں۔ شہرت کی تمنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ یہ وہ قرض ہے جو ہر فنکار کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہر فنکار کا خواب ہوتا ہے۔ یہ خواب زمین پر اترتے ہیں تو زمین سے نکل کر آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم سے بہت سے لوگ اس خواب کی تعبیر کی تلاش میں

تلاش میں وہ لوگ بھی نکلتے ہیں جن کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے اور ان کے مقصد سے لگن شدت و سچائی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ تقی عابدی کا شمار انہی لوگوں میں ہے۔ تقی عابدی نے شہرت کی تلاش کے لیے قدم نہیں اٹھائے۔ اس نے بہت خاموشی سے رہتے ہوئے ان راستوں پر چلنا اور منزل کو پانا۔ ان راستوں پر چلتے ہوئے تقی عابدی نے مقصد کو کبھی نہیں چھوڑا۔ اس نے باقاعدہ ایک اسکیم کے تحت راستوں کا تعین کیا اور ان راستوں پر بہت ثابت قدمی کے ساتھ چلا۔ اس نے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح پڑھائی سے کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے تدریس کی اور پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے شاعری کے ساتھ ساتھ اس نے تاریخ ادب اردو کو اپنا موضوع بنایا۔ تاریخ ادب اردو پر وہ جم کر مختلف جہات پر مختلف زاویوں سے کام کرتے رہے۔ اس نے لندن سے اقبال مرزا کی طرح اپنے کاموں میں ان کو اس طرح شامل نہیں کیا جس طرح اقبال مرزا نے کیا تھا۔ اردو دنیا ان پر فخر کرتی ہے۔

تاریخ ادب اردو پر لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ رام بابو سکسینہ نے کہا تھا کہ اردو ادب کی تاریخ پر ادب کا طالب علم پڑھ جاتا ہے تو اس دوران اتنا مواد اکٹھا ہو جاتا ہے جو چند جلدوں میں ضبط تحریر میں لایا جا سکے۔ رام بابو سکسینہ نے جب تاریخ ادب اردو مرتب کر رہے تھے تو ان کے دوست احباب نے ان سے کہا تھا کہ تاریخ کو مرتب کر رہے ہو۔ مگر ہوگا یہ کہ اس کتاب کے مرتب کرنے میں تم خود ختم ہو جاؤ گے اور رام رام رہ جائے گا۔ یہ کام Technology ہے۔ تقی عابدی نے اس تکنیک کے کام کو اپنے لیے چنا۔ اس نے اس کام کے لیے جس قسم کی محنت کی وہ بھی قابل داد ہے۔ اس محنت میں تقی عابدی نے کتابیں نقل کیں۔ کئی زبان پر مہارت نے اس کا کام آسان بنا دیا۔ اردو کی قدیم کتابوں کے مخطوطات سے وہ تقریباً [illegible] کتابوں کو بہت شوق سے Vision کو بہت شوق سے پڑھا اور ان کی تاریخ لکھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ تقی عابدی نے حیدرآباد دکن سے [illegible] حیدرآباد دکن میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے تقی عابدی کی بہت مدد کی۔ [illegible] حیدرآباد دکن سے تقی عابدی کا تعلق بہت گہرا رہا ہے۔ وہ حیدرآباد دکن سے [illegible] اردو ادب کی تاریخ سے [illegible]

اور یہ محسوس کیا کہ اردو کی تاریخ پر حیدرآباد دکن کے کیا اثرات ہیں۔ حیدرآباد دکن کی خاصیت رہی کہ وہ فارسی کے بہت قریب رہا۔ فارسی زبان کا یہ خاصہ ہے کہ اس زبان میں موقیت سانس لیتی رہی اور فارسی سے قربت کی وجہ سے حیدرآباد دکن سے بھی موقیت کے بہت قریب رہے۔ ان رشتوں نے اردو کے بڑے شاعروں غالب، اقبال اور یگانہ کو ایک خاص پس منظر میں دیکھا۔ تقی عابدی دراصل ماحول کا پروردہ ہونے کے سبب اور فارسی پروردہ ہونے کی وجہ سے اس اردو کو سمجھنے میں مدد ملی جو حیدرآباد دکن میں رائج تھی اور دہلی اور لکھنؤ کی فکر سے ذرا مختلف ہے۔ تقی عابدی کی تخلیقات اور تحریرات میں یہ قدرے بڑے شعور کے ساتھ زندہ ہے۔

تقی عابدی کا مراثی سے ایک قلبی تعلق رہا ہے اور اس قلبی تعلق کا سبب خاص ہے واقعہ کربلا اور اہل بیت سے محبت ہے۔ مگر تقی عابدی کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہے جو مرثیے اپنے کانوں سے سنتے ہیں اور آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔ تقی عابدی نے مرثیوں کو سنا۔ مرثیوں کو پڑھا اور مرثیوں کی فکر اس کی سماعت سے دل اور دماغ تک کا سفر طے کرتی چلی گئی۔ وہ مرثیوں پر روتا تھا مگر اس کو معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے اور اس کا ذہن محسوسات کا تجزیہ بھی کرتا رہا اور اس نے یقین کر لیا کہ واقعہ کربلا ایک عالمی سانحہ ہے۔ اس عالمی سانحہ پر میر انیس نے جو کچھ لکھا اس سے تقی عابدی متاثر تھا اور اس تاثر نے تقی عابدی کو مراثی نگاری اور میر انیس کا مطالعہ کرنے پر اکسایا۔ تقی عابدی سے ہاں میر انیس کا جو مطالعہ موجود ہے مگر اس مطالعہ کی حقیقت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ تقی حسین کی اس بات پر غور کر لیا جائے۔ تقی حسین نے کہا کہ "میر انیس پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدھے انیس ہوں اور واقعہ کربلا کو سمجھنے کے لیے پورا انیس ہونا ضروری ہے۔" تقی عابدی نے میر انیس کے مرثیوں میں اترنے کی جو پوری کوشش کی ہے اس کوشش پر ضروری کا یہ قول بھی نذر قارئین کر رہا ہوں کہ "اہل بیت کی محبت سے بغیر انیس کو سمجھا نہیں جا سکتا۔" تقی عابدی ان تمام راستوں سے گزرا ہے اور اس نے ان تمام راستوں سے وہ تمام چیزیں چن لیے ہیں جو یادگار انیس کی تخلیق کے لیے ضروری تھے۔ یہ چیزیں کل وقتی مطالعے میں کام آتے ہیں۔

تقی عابدی کی شخصیت میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ حسن مزاح بھی ملتی ہے۔ حسن مزاح معاملات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور عمل سکھاتی ہے۔ اس کے علاوہ تقی عابدی کے پاس جنگ داری بھی ملتی۔ اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے محبت بھی۔ تقی عابدی نے ان تمام اثاثوں کو بہت سنبھال رکھا ہے اور برتا ہے۔ نیویارک میں جب تقی عابدی نے شہریت کی تو ان کو معلوم ہوا کہ راستے ہموار اور آسان نہیں ہیں۔ وہ چھوٹے لوگوں کی باتوں سے دل برداشتہ نہیں ہوا ہوگا ہے (وہ موجود تھے) رہنما کرتا چلا گیا۔ یقیناً چھوٹوں کی انا کی ٹھیس سے وہ دل برداشتہ بھی ہوا ہوگا۔ مگر تحمل اور بردباری نے اس کی یہ منزل آسان کر دی۔ وہ اپنی جنس میں کام کرتا رہا۔ کسی سے کسی تمنا کے بغیر۔ چند سال قبل کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تقی عابدی اتنا بڑا کام کر جائے گا۔

مگر تقی عابدی نے آخر یہ کام کر دکھایا اور آج وہ سرخرو ہے۔ تقی عابدی اور دستاویز کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید یہ کام مشکل ہوتا۔ مگر تقی عابدی ان تمام کاغذوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ Safe Haven تلاش کر چکا ہے۔ زبانیں بند ہو چکی ہیں اور اب ایک اور کام تقی عابدی کا منتظر ہے۔ اس دور میں اس کی شناخت کی پذیرائی ہے اور اس کے کام کی تعین کی جا رہی ہے۔ تقی عابدی پر یہ سطور تقی عابدی کی شخصیت کا پتا دے رہی ہیں۔ تقی عابدی سے فن پر بات آئندہ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ تقی عابدی کی کتابوں کا تقسیم کی چار دہائیوں سے گہرا رشتہ ہے۔ یہ مضمون یہ بتاتا ہے۔ انشاء اللہ تقی عابدی کی شاعری پر بھی گفتگو کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی

صحت کا طبیب اور ادب کا مریض
عجوبۂ ادب ڈاکٹر تقی عابدی

حضرات! شاید آپ کو میرے مقالے کا یہ عنوان نامناسب محسوس ہو لیکن عجوبۂ ادب، میں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ یہ میرے الفاظ نہیں بلکہ کسی عابدی شناس کا مقالہ کتب ہے۔ ظاہر ہے اس کی توجیہ بھی اپنی جگہ موجود ہوگی جس پر گفتگو کی جائے گی۔

دنیا میں علوم و فنون کا دریا سا بہہ رہا ہے جس کی الگ الگ شاخوں اور الگ الگ چشموں کو الگ الگ ناموں سے موسوم کیا گیا ہے اور بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ سارے الگ الگ فطرت اور مزاج کے متقاضی ہوتے ہیں۔

چنانچہ سائنٹفک انٹیلیجنس، پریکٹیکل انٹیلیجنس، فزیکل انٹیلیجنس یا پھر ریاضی جیسی مختلف صلاحیتیں الگ الگ انسانوں میں الگ الگ سطح پر موجود ہوتی ہیں۔ انھیں صلاحیتوں کی بنا پر کوئی شخص کسی مخصوص علمی شعبے سے خود کو وابستہ کرتا ہے۔ یعنی فطری طور پر اس کا رجحان کسی مخصوص شعبۂ علم سے ہونے سے سبب اس کی دلچسپیاں بھی ہوتی ہیں اور یہ بھی بات طے ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کس شعبۂ علم سے وابستہ رہے گا اور کس میں اپنی بہتر کارکردگی پیش کر پائے گا۔

ابھی جس شخصیت کے حوالے سے یہ گفتگو ہو رہی ہے وہ بنیادی طور پر (ماہر امراض) شخصیت ہے۔ جس وقت وہ ادب اور اشتہار، شاعری جیسی چیزوں سے دلچسپی لینے لگے تھے (ہدایت کی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] ان کی عمر تک پہنچتے پہنچتے زندگی سے

تجربات شعری پیکروں میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر اترنے لگے۔ یعنی تقی عابدی صاحب شعر کہنے لگے جیسے وہ خود فرماتے ہیں "شعر گوئی کے حوالے سے ابتدا پختہ جوش اظہار کی شدت اور پختہ فطری شاعرانہ مزاج سے سب بھی بیت بازی کے لیے تو بھی متعدد مشاعروں کے انعقاد میں شعر کہتے رہے لیکن جیسے تعلیمی مشغولیت سے فراغت حاصل ہوئی شاعری باقاعدہ طور پر شروع کر دی اور باقاعدہ استاد سے شاعری کی ابتدا میں علم عروض، قافیہ سے بے خبری کے سبب تعین ناشناس اور سقوط سخن شناس کا سامنا کرنے پڑا جو بہت جلد ہی عروض ثابت ہوا۔ یعنی اس قدر دقیق مطالعہ شعری صنعتوں اور فنی باریکیوں کے حوالے سے یا اور دیگر علوم و فنون شاعری کی مشق بہم پہنچائی کہ خود "تخلیقی شعر کی تشریح اس کے لیے (میرے لیے) مدرسے کی وہ تشریح بن گئی جس پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے ہیں۔ چناں چہ "رموز شاعری" کی تصنیف عمل میں آئی۔ اس کتاب میں عروض اور فن کی تشریح مثالوں کے ساتھ اس طرح پیش کی گئی ہے کہ مبتدی اور مشاق سب شعر کی نعمت سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔ فن کا راب بھی مشہور ہے۔

(انٹرویو از افتخار امام صدیقی، ایڈیٹر "شاعر" بمبئی،
ماہنامہ "تعمیر حیات" مرزا نگر، صفحہ 12)

یہاں مجموعی خدمات سے "تجزیہ یا کار انیس" کا مطالعہ کیا ہے، تو جانتے ہیں عروض و فنی نکات شعری میں کے تعارف سے صرف ایک مرثیہ کے حوالے سے تین باب، تقی و تعلیلی نکتہ اس کتاب کے حوالے سے پیش کی ہے اور صرف یہ مرثیہ "کتاب کی ذات شے" سے تجزیہ انیس کے مقام و منزلت کو اس انداز میں ثابت کیا ہے۔

"تجزیہ یا فن انیس" میں آپ نے پروفیسر ہ حیدری صاحب کے حوالے سے تا ہے ہ سے ف یدنت ا ع ا ہیں۔ حیدری صاحب کے حوالے سے ہ ی ت ہیں

ا ہ ہ ی صاحب ی ی ت ت۔ حیدری صاحب نے فن
ت ہ ہ ہ ت ب ہیں ت ہ ا ا ا ر

ہوں۔" وہ یہ انکشاف بھی کیا۔ "تجزیہ پڑھ کر راہ حیدری اپنے آپ کو
سبک محسوس کر رہا ہے۔"

(صفحہ 104 تقی عابدی خصوصی شمارہ ماہنامہ "تحریک امامت")

"تجزیہ یا کار انیس" میں تقی عابدی نے انیس کی حیات اور شخصیت پر مختلف
کی ہے۔ مرثیے کے ہر شعر کے فنی محاسن جس وقت نظر کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ انیس
کے کلام کے حوالے سے یہ تفصیلی گفتگو قبل اتنے سلیقے کے ساتھ [illegible] فن سے
پیش نظر میری نظروں سے نہیں گزری اگرچہ اس حوالے سے سارے تین سو چار صفحے بھی
زیادہ کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ڈھائی ہزار سے زیادہ (2500) صفحات میں سے
حوالے سے کس ترتیب اور تناسب کے ساتھ اشعار کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ طالب علموں
کے لیے یہ کتاب "انیس فہمی" کے مواقع ہی نہیں پیش کرتی بلکہ انیس پر مزید کام کرنے
کے نئے زاویے اور نئے انداز سجھاتی ہے۔ سچ ہے ادب و شاعری اور سائنس و ریاضی میں جو
جائیں تو ایسے بھی مجزے معرض اظہار میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اس کتاب
کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"اس کتاب سے انیس کی زبان اور استعمال الفاظ پر کام کرنے والوں
بھی غیر معمولی مدد ملے گی۔"

جب کہ فرمان فتح پوری "یہ ایک کتاب نہیں بلکہ نکات فصاحت و رموز بلاغت
کا ایک سرچشمہ ہے۔ محاسن لفظی و معنوی کا ایک خزینہ ہے اردو مرثیہ نگاری کی تنقید و تحسین
کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اور انیس شناسی و انیس فہمی کے باب میں ایک نادر کارنامہ ہے۔"

(1) "تجزیہ یا کار انیس، (2) دیوان رباعیات انیس"، (3) "[illegible]
انیس جیسی کتابیں تصنیف و ترتیب دینے والی اس فرہاد عفت نقی نے کام [illegible]
جس الفت اور محبت کا عملی اظہار کیا ہے حقیقی معنوں میں "معاملات انیس و [illegible]" کا عملی
شاید پہلی مرتبہ اس قدر جامع طور پر کیا گیا ہے۔ نقی [illegible] کا [illegible]
مطالعہ کی ضرورت خود انیس شناسی کے لیے ہے۔ یہ [illegible] کی
کاوشوں سے مدتوں بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ [illegible]

میں فلسفہ مرثیہ سے متعلق ابواب ہیں۔ دونوں صاحبان عظیم شعراء تھے۔ دبیر شناسی اردو ادب کے لیے عموماً اور تنقید ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اردو کی فصاحت، بلاغت و ترقی ہوتی ہے۔ ہمیں دبیر کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے۔ لیکن میر انیس کے کلام میں دبیر کا رنگ بالکل نہیں۔

مرزا دبیر کے حوالے سے (1) ''انتخاب مراثی دبیر'' (2) ''مجموعہ نظم مرزا دبیر''، (3) ''سلک نظم دبیر''، (4) ''ابواب المصائب'' (تصنیف دبیر مرتبہ تقی عابدی)، (5) ''مضمون فارسی'' (مجموعہ کلام فارسی مرزا دبیر)، (6) ''رباعیات دبیر'' (7) رباعیاں دبیر (8) ''مطالعہ دبیر کی روایت'' جیسی دیگر عظیم شان تصانیف منظر عام پر لا کر محسن اردو تقی عابدی نے ہمیں سکھایا ہے کہ مطالعہ کس انداز سے کرتے ہیں اور اس کی تشریح کیسی جاتی ہے۔ کتابیں کیسے تصنیف کی جاتی ہیں، شعراء کو سمجھنے کے لیے کن کن باتوں کی ضرورت ہے۔ آخر یہ مرثیہ کی عظمت سمجھتی ہے تو کسی ایک شاعر کی کلام کی نہ کہ مرثیہ کے خلاف مزاج تحقیق ہے۔ چناں چہ ایک سچے محقق کی طرح انھوں نے یہ باب باندھا کہ مرثیہ کی روایت پر توجہ دی ان کا مقالہ بہ عنوان ''حضرت امام حسین'' شائع ہوا۔ بعد میں اردو کی کتابوں میں شائع کیا گیا۔

تقی عابدی کی یہ کتاب ادبیات مرثیہ پر دو جلدوں میں سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی (''ادبیات مرثیہ'' کائنات مرثیہ'') پہلی جلد کے ایک فراموش کردہ موضوع پر مرثیہ کی تنقید، دوسرا کلام ''اظہر حق'' کے نام سے اپنے ہے۔ یہ کتاب 21 مارچ 2015ء کو مرزا دبیر کے حوالے سے یہ وقت پر [illegible] ہے۔ یہ مثال قائم کرنے پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، روپ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، نظیر شعر فضل حسین فضل اور تقی عابدی سے تعلق رکھنے والے دیگر ادبا کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ [illegible] 2015ء میں

ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بطور سندی سلام مراثی خط راقم کو عنایت فرمایا تھا۔ جو ان کی ذاتی لائبریری میں فولڈر میں موجود ہے۔ اس پر فضل رسول فضل کی اصلاح اور اس حوالے سے ان کے خطوط مع دستخط موجود ہیں۔ آپ کی ذاتی لائبریری کا ذکر بھی خاصا توجہ طلب ہے۔

جہاں تقریباً بارہ ہزار کتابیں موجود ہیں، یہ دو سال قبل کی بات ہے ابھی میرا خیال ہے کہ مزید اضافہ ہوئے ہوں گے۔ جن میں اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی ادب سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔

نعتیہ ادب، رثائی ادب، غالبیات، اقبالیات، رسائل و جرائد، مخطوطات کئی کتابوں کے فوٹو اسٹیٹ ایڈیشن، انگلش ڈکشنری ویبسٹر کی گزشتہ دو سو برس میں شائع ہونے والی تقریباً تمام جلدیں۔ چودہ سو سے تک قلمی نسخے جن میں مرثیے رثائی بیاضیں اور قدیم مسودے شامل ہیں جن کو انھوں نے 40 سال کے عرصے میں جمع کیا ہے۔ یہ تمام اثاثہ اہل علم کے لیے ایک عظیم تحقیقی سرمایہ ہے جسے انھوں نے تحفظ ہی نہیں دیا بلکہ طلبہ تک پہنچانے کا بھی اہتمام کر دیا ہے۔ رثائی ادبی خدمات کے علاوہ بھی بہت سے کارنامے ہیں جن پر علیحدہ نظر بھی اس مختصر وقفے میں ڈالی نہیں جا سکتی۔ مختصر یہ کہ "دیوان حالی" اور "کلیات حالی" سو سالوں سے شائع ہوا بھی نہیں لیکن 1200 صفحات پر مشتمل "کلیات حالی اور "حالی فہمی" ادب شناسوں کے لیے ایک بالکل نئے تجربے کا سبب بنی۔ "کلیات غالب فارسی" دو جلدوں میں شائع کی۔ جس کا سہرا حشمی بیگ عابدی صاحبہ کے سر جاتا ہے۔ غالب سے یہ تعلق قائم ہوتا ہے اور نہ یہ باتیں عالم وجود میں آتی ہیں۔

"مصحف غزل" کے نام سے نجم آفندی کی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا جس میں تنقیدی اور تاریخی مضامین پیش کیے گئے ہیں جن سے نجم آفندی کے فن اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ میرے خیال سے یہ مشت نمونہ کافی ہے جس سے میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن چوں کہ مجموعہ ادب کی اور ادارہ یادگار غالب ہے لہٰذا چند نمونے ان کی زبان سے سن لیں کہ آخر یہ نام انھوں نے کن صاحب کے لیے کن بلند یا عظیم تر الی صاحب کہتے ہیں "جو معاصر (1) سال بعد از محمد اقبال سے اس امت کی

جائزہ کرے اس سے ہم یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ 1200 صفحات پر بھی نفسیاتی و عملی امراض امت کی کھوج لگائے اور "شکوہ و جواب شکوہ" کی شرح سا بقہ صفحات پر چھپائے۔ امت کے مسائل (قبل) کی تشخیص، تجاویز، علاج معالجے پر مکمل و مدلل بحث کرے یہ تجزیہ نہیں تو اور کیا۔" ("شکوہ جواب شکوہ کا تنقیدی جائزہ" از عارفی ترابی، مجلہ سنابادی شمیرہ رسالہ "خلیفہ امت" تخلیقہ 204)

صرف یہی نہیں ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں میں علامہ اقبال و ان کی شاعری کے حوالے سے ریسرچ پروفیسر بنا چکی ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے غالب یونیورسٹی میں "کائنات خطہ" کے جشن اجراء کے موقعے پر کہا تھا "عابدی صاحب اتنے ثواب دیا کریں گے۔ انہیں ہمارے درمیان بھی یہ ثواب بانٹنے ہوں گے۔" اور یہ بھی سچ ہی تھا وہ آخر یہ سارے کام کس طرح کرتے ہیں۔ پہلے سوال کے جواب سے تو سامعین خود ہی سمجھ گئے۔ شاید وہ ثواب بانٹنے والی بات سے متفق کہ تھے یوں کہ ثواب تو کمایا جاتا ہے بٹتا نہیں اور دوسرے سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ "روزانہ کچھ گھنٹے اپنی ذہنی یکسوئی میں کام کرتے ہیں۔" انھوں نے متعدد موقعوں پر یہ بات کہی ہے کہ ہم وقت کی واپسی ہوا بہت سے کاموں کی جانب توجہ کرنے سے عاری ہو چکے ہیں جب کہ زیادہ تر لوگ کام تو کرتے رہتے ہیں اور جذبہ عمل صادق ہے ان سے یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ یہ عمل تخلیق کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں نے اپنی مصروف کاروباری زندگی کے درمیان تخلیقی کام کرنے کے طریقے سیکھ لیے ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ "میں یہ ہے کہ میں اپنی ذاتی، داخلی اور سماجی حیثیتوں سے ساتھ ایک بار پھر عوام کی جانب سے پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ [illegible] ایک مرتبہ پھر قومی ہے۔ کی انداز پر [illegible] ایک مرتبہ پھر قومی ہو جائے تاکہ ہم اپنی اصل [illegible] سے [illegible] سے صرف باخبر ہو جائیں بلکہ ایک عملی تربیت [illegible] سے [illegible] حاصل ہو جائے۔

خاتمے سے پہلے امروہہ فاؤنڈیشن کی خدمات کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے جو آج اس پروگرام کا قیام اتنے خراب موسم کے باوجود کامیابی سے کیا۔

امروہہ فاؤنڈیشن 10 سال سے دہلی اور امروہہ میں منعقد ہونے والے ادبی اور سماجی کاموں کو انجام دے رہی ہے کورونا میں بھی کافی امداد کی ہے۔ طلبا کی فیس غریبوں کی تعلیم، شادی وغیرہ کے لیے مالی امداد پیش کر رہا ہے۔ چینل زاہل آور کے ذریعہ ہر ہفتہ آن لائن مشاعرہ کرنا بھی امروہہ فاؤنڈیشن کا ایک اہم ادبی قدم ہے۔

بہت شکر گزار ہوں اس فاؤنڈیشن اور تمام سامعین کی بالخصوص جناب صدر محترم ڈاکٹر واسع صاحب، جناب تقی عابدی صاحب مہمان خصوصی کی اور مہمان محترم جناب شمیم رسول صاحب کی۔ پروفیسر حسنین اختر صاحب شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی، جناب کلیم الحفیظ صاحب شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اور جناب نظر عباس صاحب سے علاوہ یہاں موجود تمام بزرگ، خرد سامعین حضرات کی۔ شکریہ

سید ناظر حسن زیدی

نذرانۂ دل

اردو اور فارسی ادب کی تنقید میں ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا جو مقام معین ہو چکا ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ انیس، اقبال اور میر حسن پر ان کے مقالوں کی دل آویزی اور افادیت مسلّم ہے۔ یہ سب ان کی عرق ریزی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ادبیات کی بارگاہ میں ان کی سالہا سال کی تحقیق نہایت مستند اور خیال افروز ہے۔ ہم اس سے متعارف ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے فارسی اور اردو ادب میں نہایت محترم سمجھے جاتے ہیں۔ بارگاہِ ادب میں ان کی تحریریں "نذرانۂ دل" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بہت بیش قیمت تنقیدی سرمایہ ہے تاہم سال کی وضاحتوں کے بعد عابدی صاحب نے اپنی تمام علمی تحقیقات سے بلند تر ایک اور قیمتی خزانہ پیش کیا ہے جو فنی کاوش سے کہیں بڑھ کر اہمیت و حیثیت رکھتا ہے یہ عقیدت و ارادت کے مقدس جذبے سے سرشار ہوئے ہیں۔ یہ تین عقیدت اور محبت پر مشتمل شعر جو آپ نے ہاتھ میں ان کی قلبی کیفیات کے غماز ہیں۔ ان کے الفاظ میں ان جوہر پاروں کو جو دل کی عمیق تہوں سے نظر فروز ہوتے ہیں۔

I till many a gem of purest ray serene.

The dark unfathomed caves of ocean bear

کہا جائے تو بالکل درست ہے۔ ان مطبوعات کو ہی سرورق "نذرانۂ دل" بتاتے ہیں ہم اس پارۂ تصنیف کا نام "جوہر معرفت" رکھتے ہیں۔ کتاب کا یہ عنوان میرے تجویز کردہ ہے یا مصنف کا یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہ عنوان عقیدت کا جذبہ پورے جوش و جمال کے ساتھ موجزن ہے۔ یقین ہے صاحب ذوق قاری اس احساس و محبت میں ہمارے ہم نوا ہوں گے۔

[illegible] ہمارے ذہن پر ثبت ہو چکے ہیں۔

[illegible]

مادر آں قافلہ سالار عشق — مادر آں مرکز پرکار عشق

[illegible]

[illegible] کرنا بہت آسان ہوگا۔

[illegible]
زیر شمشیر جو کرتے ہیں عبادت تیری

•••

محمدؐ کا مقام و مرتبہ ہو جائے گا روشن
اگر حیدرؑ کے رتبہ کا تجھے اقرار ہو جائے

•••

حق کا عشق تو چہروں سے ایسا ظاہر ہے
سب لفافے میں جیسے جواب رکھتے ہیں

•••

بہت پسے ہوئے ہیں مرحب و عنتر زمانے میں
الٰہی ذوالفقار حیدرؑ کا وار ہو جائے

•••

کسی کو کیسے سُلاتے رسولؐ بستر پر
گلاب کی جگہ آخر گلاب رکھتے ہیں

•••

دیکھو تلی سے ہاتھ میں وتر کا جام ہے
کیوں کہ یہی تو شاعرِ خیرالانامؐ ہے

•••

اختیارِ شوق اتنا ہوگیا ہے موت پر
جب تلک جیتے نہ آئیں وہ نکل سکتے نہیں

•••

جب بھی حق کی مدح میں اٹھا مجھے
ہفت قلزم ہو گیا اور پی گیا نہیں

•••

اس واسطے ولا کی مہک ہے کلام میں
لکھواتے ہیں امامؑ لکھے جا رہا ہوں میں

قارئین ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ مصنف نے کلام میں ادبی محاسن کس حسن و خوبی سے جمع فرمائے ہیں۔ اسی لئے ان کا یہ مجموعہ کلام اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یقین ہے کہ ادبی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

محمد حسن حسرت

عصر حاضر میں اُردو زبان و ادب کے بے تاج بادشاہ ڈاکٹر سید تقی عابدی..... ایک تعارف

آج کی یہ محفل جس مہمان شخصیت کے لیے سجائی گئی ہے وہ ہیں اردو زبان و ادب کے بے تاج بادشاہ اور عالمی شہرت یافتہ شخصیت ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب۔ ہم سب پہلے ڈاکٹر صاحب کو اور زمین دب دبیر میں خلوص و محبت بھرتن تشریف آوری پر ان کی اقتدا کرنے والوں سے خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کا شریہ ادا کرتے ہیں۔

ساقی صاحب کی فرمائش ہے کہ میں اس نابغہ روزگار مہمان کی جناب ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف پیش کروں۔

کچھ بھی جیسے اردو زبان و ادب سے ادنیٰ طالب علم سے بھی ڈاکٹر تقی عابدی کی ذات گرامی کا تعارف نہیں لیکن آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے جب پہلے پہل اخبار سے مخاطب ہیں۔ آپ نے محبت سے ساتھ ساتھ جس میدان میں بھی قدم رکھا ہے وہ اردو ادب کا شعبہ ہے۔ آپ اردو ادب سے سمندر سے غواص ہیں، تحقیق سے مرد میدان ہیں، تنقید سے رازدان ہیں اور فن نگاری سے شہسوار ہیں۔ آپ جہاں محبت سے عمر کے لوگوں سے دوستانہ رویہ رکھتے ہیں وہاں شاعری اور نثر کی تحقیق و تنقید و فن سے اہل ذوق سے فکری و روحانی امراض کا علاج بھی کرتے رہتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ان میں بہادری، شجاعت، نڈر پن پیدا ہوا ہے جہاں عمر نے زندگی کی آٹھ بہاریں دیکھی تھیں جہاں عمر کے آٹھ سال ہی سے محمد حسین آزاد کا خیال آتا ہے جہاں عمر کے آٹھ سال ہی سے

سرسید، باغ و بہار والے میر امن سب اسی گلشن کے رنگ برنگ پھول ہی تو تھے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی بھی اسی گلشن کے سدا بہار پھول بن کر اردو ادب کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس ماحول میں تعلیم حاصل کی جس کی بدولت شستہ زبان، ادبی چاشنی اور بلند فکر کا ہونا، فطری امر ہے۔ پھر حیدرآباد سے اس نے ایم بی بی ایس، ایم ایس، ایم ایڈ سے ایف سی اے پی اور فیلڈ سے ایف سی آر پی کی پیشہ ورانہ ڈگریاں حاصل کیں۔ اب آپ مستقل طور پر فیلڈ میں رہائش پذیر ہیں لیکن پیشہ ورانہ خدمات سے وہ آپ پاکستان، ہندوستان، ایران، برطانیہ اور امریکہ جیسے ملکوں میں علم و ادب سے محبت رکھنے والوں کو فوقتاً فوقتاً علمی و ادبی دورے کرتے رہتے ہیں۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق آپ چونسٹھ کتابوں کے خالق ہیں۔ آپ کی یہ تمام اردو زبان کے مستند شعرا کے کلام پر تحقیق و تنقید کا احاطہ کرتی ہیں۔ گویا آپ وہ ادیب سے ایک ہیں جنھوں نے امیر خسرو سے لے کر جوش ملیح آبادی تک اور غالب و اقبال سے لے کر فیض احمد فیض تک اردو کے ان نامور شاعروں کا احاطہ کیا ہے۔ جن پر اب تک اردو کے جید نقاد رہے ہیں۔ علمی شہرت یافتہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے گلشن اردو کی بیداری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ غالبیات، اقبالیات، میریات، انیسیات اور اردو کے دیگر اہم شعرا، حالی، شبلی اور جوش وغیرہ کے فکر و فن اور اردو شاعری کے اصناف و رموز سے متعلق مختلف موضوعات پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے علمی و ادبی مقالوں میں بے شمار حقائق پیش کیے ہیں اور اچھوتے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کے مقالات اور لیکچرز دلچسپ، اثر انگیز اور زور دار نظم ہیں۔ دقیق علمی مباحث اور ادبی نکات کی عقدہ کشائی ان کے لیکچرز اور مقالوں کا خاصہ ہے۔ غالبیات سے لے کر اقبالیات سے رازداں، فیض شناسی میں یکتائے روزگار اور انیس و میر کی شاعری کے رموز سے واقف کار ڈاکٹر سید تقی عابدی کی زیارت مجھے کئی بار نصیب ہوئی ہے لیکن ان کی شخصیت، ان کا علم اور ان کی تحقیق ہمارے دلوں میں ایک عرصے سے آباد ہیں۔ یہ سب سے پہلے آپ کی محبت کی تحریریں، مقالے اور انٹرویز ہمارے کانوں میں رس گھولتے رہے ہیں۔ 2014ء میں ڈاکٹر صاحب کی جانب سے ہمارے دوست بشارت ملک کے پاس چند کتابوں کے ساتھ ایک خط اور بشارت

ساقی نے یہ تاثر ہمارے شاعروں اور ادیبوں سے درمیان تقسیم کیا۔ عابدی صاحب کی تازہ کتاب "فیض شناسی" میرے ہاتھ میں آئی۔ پڑھ کر بڑا لطف آیا اور میں ڈاکٹر صاحب کی اس موضوع پر کامل دسترس اور محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے "دیوان سالک و کلام فیض" کا تحفہ بھی تین دن پہلے موصول ہوا تھا۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی دنیا کی بیس سے زیادہ یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر اور لیکچرار کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ اب تک پاکستان، انڈیا، یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے مختلف اداروں نے آپ کو دو درجن سے زیادہ ادبی اعزازات سے نوازا ہے۔ آپ کے بارے میں چھپنے والی کتابوں اور جرائد کے خصوصی نمبروں کی تعداد بیس سے زائد ہے۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر آپ کی زندگی اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چھ تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے چار تحقیقی مقالے پاکستانی یونیورسٹیوں میں لکھے گئے ہیں۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی تحقیق کی روشنی میں احمد فراز

سب باتیں تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

لیکن اس سے قبل میں ایک بات ڈاکٹر صاحب سے واضح کر دوں کہ پنجابی پاکستان کی قومی زبان نہیں ہے لیکن یہاں سے اس کے بولنے والے [illegible] کے برابر ہیں۔ ہماری اردو [illegible] معیار پر نہ ہو لیکن یہ طے ہے کہ اردو کی [illegible] بات سے [illegible] زبان کی آبیاری ہو رہی ہے۔ پنجابی میں [illegible] بھی نہیں ہوئی ہے کہ [illegible] نے [illegible] زبان "ب" نے [illegible] میں خوب [illegible]

کراچی اور لاہور کے اہلِ قلم اور شاعروں سے کسی طور بھی پیچھے نہیں۔ یہاں سے شاعروں اور ادیبوں کی اردو گفتگو اور تحریر شستہ و رواں ہے۔ اس لیے اردو کے ممتاز شاعر قتیل شفائی اور سید ضمیر جعفری جب سلہٹ آئے تو یہاں کے لوگوں کو شستہ اردو بولتے ہوئے سن کر خاص حیرت کا اظہار کیا۔ بی بی سی لندن کے معروف صداکار رضا علی عابدی نے اہلِ سلہٹ کی گفتگو کو رواں اردو ہونے کی سند دے دی اور کہا کہ "آپ کے لب و لہجہ پر نہ شیمی کی چھاپ ہے اور نہ پنجابی اثرات جلد یہ ایک منفرد لہجہ ہے جو جغرافیائی لحاظ سے دور رہنے کے باوجود ان سے قریب ہے۔" اس طرح اردو کے ممتاز شاعر عارف جب یہاں آئے تو انھوں نے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کی گفتگو سے لکھنؤ کی خوشبو آتی ہے۔" لطف مختصر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس علاقے میں اردو کا مستقبل تابناک و روشن ہے۔

حاضرین کی خواہش تھی کہ ہم اس موقع پر ملک کے ممتاز ادیب، نقاد اور خوب صورت لب و لہجے کے شاعر بشارت علی فاروقی کا خصوصی شکریہ ادا کریں جن کی سرپرستی اور سخاوت سے آج ڈاکٹر سید قمر علی عابدی صاحب ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں، ان کے اعزاز میں اس خوب صورت محفل کا انعقاد ہوا ہے اور ہمیں ڈاکٹر صاحب کی خوب صورت گفتگو سننے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کا ایک بار پھر شکریہ!!

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری

ڈاکٹر سید تقی عابدی

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو کی عمدہ مثال!

دنیا کے مختلف ممالک میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے کام کرنے والی جن شخصیات کو اعتبار بخشنے والوں میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام بھی قابلِ ذکر لوگوں کی فہرست میں آتا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے متوازن رویہ، علمی سنجیدگی، تحقیق سے وابستگی، تنقیدی بصیرت اور اردو اور فارسی سے گہری دلچسپی کے باعث ہندوستان کے سنجیدہ علمی اور ادبی حلقوں میں کافی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ [illegible] پر پچھلے چھ سات عشروں سے تقریباً تمام ہی ادبی رسائل میں مضامین، تبصرے اور تجزیے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی ادبی تعلیم بڑودہ اور پٹنہ میں حاصل کرنے کے بعد وہ شعر و ادب کی زلف پریشاں و سنوارنے کا پیشہ اور آخری عشق بن گئے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنی سب سے بڑی پیشہ ورانہ کامیابیوں سے بڑھ کر اپنی ادبی سرگرمیوں کی ترتیب و تدوین پر اپنا خاصا وقت صرف کرتے رہے ہیں۔ [illegible] سے بڑودہ اور مغرب میں رہ کر فارسی سے اپنی وابستگی کا بہت خوبصورت ثبوت دیا ہے۔ مختلف موضوعات پر مضامین کے مجموعوں کے علاوہ انہوں نے [illegible] کے تحت بھی کئی اہم کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان کے ایک مضمون میں [illegible] کے بعد انہوں نے [illegible] اور مذہبی موضوعات پر اپنا وقیع اور خیال افروز مضمون [illegible]

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے اہم اور غیر معمولی کارناموں میں "کلیات غالب فارسی" کی تدوین نہایت ہی قابل قدر کارنامہ ہے۔ یہ کلیات ۱۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور غالب انسٹی ٹیوٹ جیسے معتبر ادارے نے چھاپا ہے۔ اس کلیات میں موجود کلام غالب کے متن کو ہر اعتبار سے صحیح اور معتبر مانا جا سکتا ہے کیوں کہ کلیات کی تدوین سے قبل اس کے پیش نظر گیارہ قلمی نسخے اور تین مطبوعہ نسخے رہے ہیں جن کا ذکر انھوں نے دیباچہ میں کیا ہے۔

"کلیات غالب فارسی" کی جلد اول غزلیات پر مشتمل ہے جس کے ۱۰۰۰ صفحوں میں حمد، مناجات، نعت، منقبت، مرثیہ، نوحہ اور رباعیات کے علاوہ ضمائم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جلد اول کا مقدمہ تقریباً ۱۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ غالب کو فارسی ادب میں اگرچہ ان کے "دیوان غالب" کے ذریعے جانا جاتا ہے مگر غالب نے اسے "مجموعۂ بے رنگ" کہا ہے۔

فارسی بینان تماشائے ما بے رنگ رنگ
ہند زار مجموعۂ اردوئے ما بے رنگ من است

غالب اپنے فارسی کلام میں تلمیحاتی، تخلیقی اور معنوی سے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔

"کلیات غالب فارسی" کے مقدمے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے نہ صرف غالب کی فارسی شاعری میں موجود مضامین تخلیق اور غالب کے پسندیدہ موضوع بحث بنایا ہے بلکہ فارسی ادب میں ان کا مقام و مرتبہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب کی زندگی، تصنیفات اور دیگر معلومات بھی معتبر حوالوں کے ساتھ پیش کی ہیں۔ اس کلیات کی دوسری جلد میں قصائد، ترجیعات، مثنویوں کے علاوہ دیگر اصناف بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس کلیات سے غالب کا فارسی کلام مکمل طور پر اور صحت متن کے ساتھ پہلی دفعہ منظر عام پر آیا ہے۔ اس طرح غالب کی تمام قدر دانیں حاصل ہوئی ہیں۔ اس کا سہرا ڈاکٹر سید تقی عابدی کے سر جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ہدایت کی بازیافت ہے۔ مرزا سلامت علی دبیر اردو مرثیے کا نہایت ہی اہم اور معتبر نام ہے۔ انیس اور دبیر نے صنف مرثیہ کو ان بلندیوں پر پہنچا دیا ہے کہ یہ صنف کسی اور زبان میں

[illegible]

یہی زمانہ ناقدر میرے بعد سعید
مجھے بھی یاد کرے گا مرے کلام کے ساتھ

• • •

زباں کا لطف نہ آجائے تو میرا ذمہ
[illegible]

[illegible]

کی جانب سے مفت اردو اسٹول کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان کی ترویج و اشاعت پر پچھلے سو سالوں سے بچوں کو اس زبان کو سکھانے کی کوششوں کو سراہا۔ انھوں نے رکن پارلیمان پیٹر فون سیکا کو مدعو کیا جنھوں نے اپنی میونسپلٹی کے لیے اپنی جانب سے بھرپور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے ماں کی زبان کو سیکھنے کی کوششوں کو سراہا اور اپنی جانب سے ڈاکٹر تقی عابدی، ناظم الدین مقبول اور اردو اسکول سے وابستہ آصف علی و تنویر احمد پیش پیش رہے۔ مشہور شاعرہ اور مہمان خصوصی محترمہ ذکیہ غزل نے اپنے مختصر تاثرات میں بتایا "ایسی محافل نیک شگون ہیں جس میں اردو کی شخصیات کو یاد کیا جائے اور ان کے کام کو اگلی نسلوں تک پہنچایا جائے۔ مہمان خصوصی اور برادر سعید شہیدی مرحوم جناب حسن علی سید نے اس موقع پر اپنے بھائی کی غزل ترنم سے سنا کر حاضرین سے خوب داد پائی۔ "اردو کی نئی بستی" کی جانب سے جناب علی شاہ نے اس تقریب کی فلم بندی کی جو ان کے چینل پر دکھائی جائے گی۔ اس موقع پر مشہور غزل گلوکار جناب اسحاق آتش نے سعید شہیدی کی مقبول غزلوں کو سازوں کی سنگت میں خوب صورت انداز میں پیش کر کے سامعین سے زبردست داد پائی۔ اس موقع پر مہمانوں کی ضیافت لذیذ بریانی سے کی گئی اور دن کے بارہ بجے شروع ہونے والی یہ پرمغز محفل سہ پہر تین بجے تک کامیابی سے جاری رہی۔ بزمِ اردو کی جانب سے آصف علی مہاب شریف و وصاف اور سب نے کامیاب محفل سے لطف و سرور میں بھرپور حصہ لیا۔

ڈاکٹر شہباز قادری
نمبول

اُردو کا وکیل: ڈاکٹر سید تقی عابدی

اُردو ادب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ایسی بہت سی شخصیتیں ملیں گی جو اپنی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت علمی و ادبی خصوصیات کی وجہ سے اپنے عہد کی ادبی تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع قرار دیئے جاتے ہیں۔ کسی بھی تخلیق کار یا فنکار کی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنا اور اس کے فن و پر کھنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ یہ عمل اس لیے آسان ہے کہ ادب پڑھنے والے کا قوت مشاہدہ اور فنی شخصیت کے نقوش اور پہلوؤں کو بہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔ لیکن قوت مشاہدہ اور نقوش میں حق و باطل کا فرق کرنا کٹھن اور مشکل امر بن جاتا ہے۔ کسی بھی ادبی اور فنی شخصیت کی قلمی تصویریں جتنی بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کسی بھی ادبی شخصیت کی زندگی کے واقعات، حالات اور علمی و ادبی کارنامے کس وقت اور کس طرح پیش کیے جاتے ہیں جب وہ محبت اور عقیدت کے جذبات سے معمور ہوں۔ ایسے ادب میں کسی شخصیت کو زیر نظر تحریر کے موضوع کی حیثیت حاصل ہے تو وہ معروضیت سے عاری ہوتی ہے۔ طبیب اور ادب کے مریض اور محبت سے معمور اور دور سے ہمیشہ کیے جاتے ہیں۔ مشہور ہیں میری مراد ڈاکٹر سید تقی عابدی سے ہے موصوف کی شخصیت میں ایک وقت میں ایک ہی ہم معنی ایک مستند شاعر، ایک دور اندیش محقق، ایک بیدار مغز نقاد، ایک ہمہ جہت ادیب، ایک ہمہ صفت شخصیت اور ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ تقی عابدی 5 مارچ 1952ء کو بھی میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن [illegible] ہے۔ ان کے والد [illegible]

تھے اور قانون دان ہونے کی حیثیت سے ملک کے اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے ساتھ ہی ساتھ علوم شعر و ادب سے بھی وابستہ تھے۔ سبط حسن کے والد اور تقی عابدی کے نانا سید شبیر علی تھے جو کہ ایک زمیندار تھے۔ تاہم ان کا خاندان علم و ادب کا ایک گہوارہ تھا جہاں مختلف علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں جس کا تذکرہ خود واجد تقی عابدی ان الفاظ میں کرتے ہیں

"ہمارے خاندان میں رنج علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں ہمارے جد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "حق الیقین" نام کی دو سو اٹھارہ (۲۱۸) صفحات پر مبنی کتاب میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔"

تقی عابدی کا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیاء سے جا ملتا ہے جن کے خواجہ حسن نظامی ثانی اسی مناسبت سے انہیں پڑ شیخ مخاطب کرتے تھے۔ ان سے تقی عابدی کی قرابت داری اور ادب دوستی کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا علم دوست ہونا، ان کا مذہب کی طرف رجحان اور شعر و ادب کا شوق انہیں وراثت میں ملا ہے۔ اگرچہ علمی اعتبار سے تقی عابدی بنیادی طور پر علم طب سے وابستہ رہے ہیں تاہم انہیں شروع سے ہی شعر و ادب سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ تقی عابدی کو مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی تھا اور اس پر انہوں نے بچپن سے ہی عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں موصوف خود ہی فرماتے ہیں:

"ہمارے گھر میں بہت اچھی خاصی لائبریری تھی بچپن اور فراغت کے اوقات میں میں اس لائبریری سے استفادہ کرتا تھا۔"[2]

اس طرح سے بچپن سے ہی تقی عابدی کے ذہن میں پڑھنے لکھنے کی اہمیت و افادیت موجود تھی مگر حالات میسر آنے پر تقی عابدی مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد طب کے بجائے علم و ادب کے مریض بن گئے۔

وہ شعر و ادب سے ساتھ بچپن سے ہی تقی عابدی وابستہ تھے۔ ان کے والد بھی علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ ان کے زمانے میں اردو اور انگریزی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں جب کہ گھر میں ان کی مادری زبان تھی۔ اردو شعر و ادب کی روایات بھی اسی زمانے سے ان کے خاندان سے چلی آ رہی تھیں۔ ایک طویل مدت تک شعر و ادب کی مشق میں رہنے کی وجہ

بقول خود "میڈیکل کی مشکل تعلیم، ہجرت، معاشی معاملات اور ماحول کی تبدیلی" بتاتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا ہندوستان سے اور یورپ سے امریکہ میں رہ کر اردو زبان و ادب کے بال و پر سنوارنا ایک بہت بڑی خدمت ہے اردو کے حق میں پتہ نہیں کہ ہمارے بچے اردو میں لکھنا پڑھنا اور تحقیق و تدوین کا کام اس قدر مشکل نہیں جس قدر یورپ میں یہ کام وقت طلب ہے۔ اگرچہ اردو زبان اپنی خوب صورتی اور شیریں بیانی کی بدولت دنیا کے دور دراز علاقوں میں پھیل رہی ہے اور اردو کی نئی بستیوں کی تلاش افریقہ کے جنگلوں سے ہو رہی ہے کیوں کہ یہ ایک سیکولر کردار والی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان قلیل مدت میں اتنی شہرت و ہر دلعزیزی حاصل کر چکی ہے جو اسے کسی بھی تین اقوامی زبان کی ہمسری کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ زبان دنیا کی دیگر زبانوں کے لیے قابل رشک بن رہی ہے۔ یہ زبان نہ صرف بصیرت کی دل جوئی بلکہ سماعت کی بھی دلداری کا رتبہ حاصل کر چکی ہے اور اس کی شہرت عالمگیر کی ایک بڑی وجہ دوسری زبانوں کی لین دین کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے یہ تمام حالات و واقعات عاشقان اردو کے دوش پر ایک اور اہم ذمہ داری ڈالتے ہیں وہ ہے اس کے رسم الخط کی حفاظت جو اردو دانوں کے اولین فرائض میں سے ایک ہے۔ اردو رسم الخط زبان اردو کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے جسے اردو دشمن عناصر سے محفوظ رکھنا ہم سب کا اولین فرض ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تقی عابدی اردو رسم الخط کے حوالے سے ایک واضح نقطہ خیال رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اردو زبان کا رسم الخط اس کی جان، آن بان، شان اور پہچان ہے۔ اردو کے بدن پر رسم الخط کی مثال جلد کی مانند ہے اور اگر جلد کو جسم سے الگ کر لیا جائے یا نوچ لیا جائے تو بدن کا زندہ رہنا محال ہے۔

لہٰذا اردو کے رسم الخط کی حفاظت اردو زبان کے بقاء کی ضامن ہے۔ تقی عابدی کہتے ہیں کہ یورپ بلکہ ہندوستان میں بھی بیشتر لوگوں کا ماننا ہے کہ اردو کو سمجھنا آسان ہے لیکن لکھنا مشکل ہے۔ جیسے بیشتر لوگ بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے تو ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اردو رسم الخط کی تشہیر کا کام سرعت سے کیا جائے اور اسے سائنسی تقاضوں سے ہم کنار کیا جائے۔ اس وجہ سے اردو زبان و ادب کی ترویج میں یہ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے سائنس اور انگریزی زبان کے ساتھ اپنی معاشی مصروفیتوں کے باوجود اردو

زبان و ادب کے ساتھ اپنی تخلیقی و تحقیقی وابستگی قائم ہی جو اس زبان کی وسعت و جامعیت میں
یقین رکھنے کا حکم رکھتی ہے۔ وہ فارسی اور اردو زبانوں سے مکمل طور پر واقفیت رکھتے ہیں جو
انھیں اردو اور فارسی کے متن کا درجہ بھی عطا کرتا ہے۔ تقی عابدی نے اپنی خدمات کا بیان اس
فرمان فتح پوری کے حوالے سے کچھ ان لفظوں میں کرتے ہیں

''اردو اور فارسی ادب کے باب میں تقی عابدی کا مطالعہ قابل رشک حد
تک وسیع ہے۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس ہیں۔ ان کے
تاریخی و تحقیقی پس منظر سے واقف ہیں۔ ان کے نمائندہ شعرا کے مجموعی
حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ فن کی باریکیوں سے بھی اچھی طرح
کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ علم عروض، علم بیان سے اور رموز و نکات سے بھی
بے بہرہ نہیں ہیں۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ادبی خدمات میں ان کی تحقیق و تنقید میں مستند حیثیت کے حامل ان کی
شہرہ آفاق تالیفات کی ایک طویل فہرست ہے جو حسب ذیل ہے

[illegible] ''[illegible]'' [illegible] ''[illegible]'' ''[illegible]'' ''[illegible]''
''[illegible]'' ''[illegible]''

زیر تالیف "تجزیہ شکوہ جواب شکوہ"، "فنی لافانی"، "مطالعہ رباعیات فراق گورکھپوری"، "دو شاہکار نظمیں"، "اقبال کے چار مصرعے"، "رباعیات بیدل"، "باقیات فیض"۔

ان تصنیفات وتالیفات کے علاوہ بے شمار مضامین ڈاکٹر تقی عابدی کے فیض قلم سے نکل کر آئے دن دنیا بھر کے مستند جرائد ورسائل اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ یہ بات کافی حد تک حیران کن اور غور طلب ہے کہ موصوف اپنے وقت کو کس مہارت سے تصنیف میں لاتے ہیں کیوں کہ پیشے سے ایک میڈیکل ڈاکٹر اور وہ بھی سینیئر اسپیشلسٹ ترین ہسپتال (The Scarborough Hospital) میں اپنے فرائض منصبی کو حسن وخوبی نبھاتے ہوئے تحقیقی وتنقیدی تصنیفات کی ایک حیران کن تعداد کو معرض وجود میں لانا یہ اعلیٰ ترین وارفع ترین ذہنی صلاحیت کا مالک ہی کر سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تقی عابدی کی ادبی شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تحقیق وتنقید کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شعراء، ادباء اور ساتھ ہی ساتھ جدید شعراء، ادباء یہاں تک کہ فارسی کے شہرۂ آفاق شعرا حافظ جامی، رومی اور سعدی کی تخلیقات پر بھی قلم اٹھایا۔ بقول پروفیسر علی احمد فاطمی

> "ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے گراں قدر، اہم ادبی وتحقیقی کارناموں کے ذریعے ایک ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنی ایک ممتاز ومنفرد حیثیت بنالی ہے۔ انیس، دبیر، انشاء، نجم آفندی وغیرہ نیز اردو قواعد اور زبان پر جس نوعیت کی علمی وتحقیقی کتابیں رقم کی ہیں اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اہل علم وفن لگا چکے ہیں اور اپنی پسندیدگی ومعیار بندی کی مہر بھی لگا چکے ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی وادبی شخصیت مختلف جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ رہتے ہیں اردو زبان کی ترقی وترویج کا بیڑا اٹھانے والے مفکروں اور ادیبوں میں اگر کوئی شخصیت متاثر کن ہے تو وہ موصوف کی ادبی شخصیت ہے۔ اردو زبان کی ترقی وترویج سے ساتھ ساتھ عقیدت کا جو اظہار ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے وہ حیران کن ہے اس پر طرہ یہ کہ تقی عابدی کو اپنی حیات میں ہی دنیائے ادب میں شہرت دوام حاصل ہے۔ اگر چہ تقی عابدی دنیا کی

سب شمار ادبی انجمنوں نے انعام و اکرام اور اعزازات سے نوازا ہے وہیں بہت سی جامعیت میں ان کی ادبی شخصیت کے مختلف گوشوں پر سیمینار اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ ملک و بیرون ملک سے متعدد جرائد و رسائل نے بھی موصوف کی شخصیت کو اپنی زینت بنایا ہے۔ "چہار سو" راولپنڈی سے بمبئی سے نکلنے والا "شاعر" ان کے خصوصی شماروں میں "عروس سخن" "سید سخن" "مصحف فارسی" "کلیات غالب فارسی" "تجزیہ یادگار مرثیہ" اور "مصحف غزل" جیسی نادر کتابوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جو اردو ادب میں لافانی و ثانی اہمیت کی حامل ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اردو فلک کے اس درخشاں ستارے کی حیات اور کارناموں پر بہت سے محققین نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں "ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت نقاد" "سید تقی عابدی بطور اقبال شناس" "سید تقی عابدی شخصیت اور فن کا تنقیدی جائزہ" "افکار حق شعار" اور "بنام تقی عابدی" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تقی عابدی کی ادبی خدمات اور شخصیت کی عظمت کا اعتراف ہر چہار ان تمام تصانیف میں جا بجا ملتا ہے تاہم پروفیسر عبدالرحمان طارق نے اپنی کتاب "افکار حق شعار" میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ سید تقی عابدی کے فکر و فن کا منظوم جائزہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ کتاب سے چند شعار ملاحظہ ہوں

بے متاع آگہی سید تقی عابدی
معتبر دانشور سید تقی عابدی
علم و فن کی خسروی سید تقی عابدی
ایک مرد آگہی سید تقی عابدی

[illegible] سید تقی عابدی
خامہ فن [illegible] سید تقی عابدی

[illegible] سید تقی عابدی
فکر [illegible] سید تقی عابدی

[illegible] سید تقی عابدی
[illegible] سید تقی عابدی

میر و مرزا کا بیاں سید تقی عابدی
مرثیے کی ہے زباں سید تقی عابدی

محشر جذبات ہے سید تقی عابدی
قطع بدعات ہے سید تقی عابدی

زینتِ صفحات ہے سید تقی عابدی
علم کی سوغات ہے سید تقی عابدی

اہل دل، اہل نظر سید تقی عابدی
مثل انوار سحر سید تقی عابدی

دردِ دل دردِ جگر سید تقی عابدی
قطر ہائے چشمِ تر سید تقی عابدی

جانب منزل قدم سید تقی عابدی
داستان خوں رقم سید تقی عابدی

صاحب کیف قلم سید تقی عابدی
جیسے کوئی جام جم سید تقی عابدی

حاصل درد نہاں سید تقی عابدی
کامیاب و کامراں سید تقی عابدی

دشت وحشت کی اماں سید تقی عابدی
انتخاب وافراں سید تقی عابدی

قامت جانانِ جاں سید تقی عابدی
ہے یقین بے گماں سید تقی عابدی

گرچہ ہیں لاکھوں یہاں سید تقی عابدی
پر کوئی تجھ سا کہاں سید تقی عابدی

نقد فن کا سلسلہ سید تقی عابدی
رب تعالیٰ کی عطا سید تقی عابدی

آگہی کا در کھلا سید تقی عابدی
ایک دردِ لادوا سید تقی عابدی

علم کا اعلیٰ صلہ سید تقی عابدی
تو نے بے شک پایا سید تقی عابدی

عاشقی کی انتہا سید تقی عابدی
واقعاتِ کربلا سید تقی عابدی

نقص، طرزِ نقد کا سید تقی عابدی
دور تو نے کردیا سید تقی عابدی

اتنا ثابت ہوگیا سید تقی عابدی
فن کار نے تو [illegible] سید تقی عابدی

مستند دیدہ وری سید تقی عابدی
شعری نثری آذری سید تقی عابدی

لاریب ایسا خواب بھی سید تقی عابدی
[illegible] سید تقی عابدی

اب تبرو تحقیق کی سید تقی عابدی
تجھ سے ہوئی محفوظ بھی سید تقی عابدی

مذکورہ کتابوں، تجزیوں اور تبصروں میں پروفیسر سید تقی عابدی کی ادبی شخصیت کا اعتراف مختلف مشاہیر ادب نے اپنے مکاتیب "بنام تقی عابدی" میں بھی کیا ہے۔ ان خطوط میں تقی عابدی کی جو دو صد رنگ شخصیت ہمیں نظر آتی ہے وہ بین الاقوامی سطح کے معاصر شعر و ادب، تحقیق و تنقید کا ایک بلند معیار قائم کرتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر عتیق اللہ کے ان خطوط سے تقی عابدی کی ادبی شخصیت کے دو پہلو اقتباس نمونتاً پیش کیا جاتا ہے:

"[illegible] مشرقی علوم و فنون اور
[illegible] سے آپ کا گہرا تعلق ہے اور ادبی کاموں میں جو آپ

کا اظہار ہے وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل رشک ہے۔"

اسی طرح موصوف کی ادبی حیثیت کا اور اک عروج زیدی ۲۱/اپریل ۱۹۹۹ء کے ایک مکتوب میں بحوالہ ضمیر جعفری ان الفاظ میں ملتا ہے

"ہندو پاکستان کے معروف ادیب حضرت ضمیر جعفری نے عابدی صاحب کی خدمات دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جو ان عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ عابدی صاحب "نیویارک سے جیل جا لگی ہیں" اس امر سے ہم سب اہل علم بخوبی واقف ہیں۔"

بہر حال ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے بیش بہا ادبی کارناموں اور اپنی منفرد ادبی صلاحیتوں کی بنا پر اردو زبان و ادب میں ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک انجمن کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان ادب سے دور رہ کر دنیائے سائنس و طب میں رہ کر جو اردو کی مشاطگی کے فرائض انجام دیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ سرزمین وطن سے بعید دیار غیر میں اردو زبان و ادب کی محفلیں سجائیں آخر پر بقول شاعر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حواشی

۱ سید تقی عابدی شخصیت اور فن ایک مختصر جائزہ، مرتبہ زبیر صدیقی، ص ۳۱

۲ سید تقی عابدی شخصیت اور فن ایک مختصر جائزہ، واصف حسین واصف اردو ٹائمز نیویارک، ص ۱۳

۳ ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور اقبال شناس مرتبہ شاز یہ گل، ص ۱۴

۴ ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت نقاد و محقق مرتبہ محمد رکن الدین، ص ۲۰ و پوتی

۵ ای میل Taqabedi@rogers

۶ بنام تقی عابدی، مرتبہ ڈاکٹر شہناز قادری، ص ۳۸

۷ بنام تقی عابدی، مرتبہ ڈاکٹر شہناز قادری، ص ۳۹

سلطان جمیل نسیم (پاکستان)

"انشاء"

ڈاکٹر سید تقی عابدی: ایک محقق، مصنف اور شاعر

[illegible]

کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ 2001ء میں مہاجر بن کے ہیوسٹن آ گیا۔ یہاں ایک ہی میرے کرم فرما جناب اسرام بریلوی صاحب تھے۔ چنانچہ ان کی چاہت میں ایک تقریب میں پہنچا تو وہاں برادرم حمایت علی شاعر سے ملاقات ہوئی۔ اس تقریب کے دوسرے روز کسی صاحب نے اپنے گھر پر Ranch Dil میں حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام رکھی تھی۔ حمایت بھائی نے اپنے میزبان سے کہہ کے مجھے لانے لے جانے کی ذمہ داری بھی شامل کر دی۔

جب میں اس تقریب میں پہنچا تو وہاں صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر بھی موجود تھے اور ایک پاکستانی صاحب بزبان انگریزی نائن الیون (9/11) کے تناظر میں افغانستان کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کی تائید میں تقریر فرما رہے تھے۔ اس طرح دو ایک تقریریں اور ہوئیں اور گھنٹہ بھر تک میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ تقریب جناب حمایت علی شاعر کے اعزاز میں منعقد ہوئی ہے یا امریکی صدر کی حمایت کرنے پر صدر پاکستان کے فیصلے کو سراہنے کے لیے یہ اجتماع ہے۔

خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا اور شاعری شروع ہوئی۔ میرے لیے تو رنگوے شاعروں کو سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہ بھی اندازہ تھا کہ اس نجی محفل شعر خوانی میں تمام نمائندہ اور سرکردہ شعرائے کرام کو تو مدعو کیا نہیں ہوگا اور ایسا ممکن بھی نہیں تھا۔ ابتدا میں جن دس بارہ شاعروں کو سنا وہ یقیناً میزبان کے ذوق شعر فہمی پر پورے اترتے ہوں گے لیکن میرے لیے شاعری سے عبرت حاصل کرنے کو بہت کافی تھے۔ غالب، جو ہمیشہ اور ہر محفل پر سہارا دینے کے لیے موجود رہتے ہیں ان کا یہ شعر ذہن میں آیا۔

ہنگامہ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اس کے باوجود شعرائے کرام کی صورت اور اپنی حالت دیکھتے ہوئے میں نے حمایت بھائی سے اشاروں میں ہوں مجھے گھر بھجوانے کا بندوبست کیجیے۔ مگر وہ مجھے درمیان میں چھوڑ کے نہ جانے کیا دیکھنے جا رہے تھے۔ پھر خیال آیا میزبان سے گزارش کروں۔ جس راستے سے بلایا ہے اسی راستے سے واپس پہنچا دیجیے۔ لیکن غالب کی دعا کے لیے موجود تھے۔

غالبؔ، تمہی کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

بس یہ سوچ کر کہ

جب دل و دیں کر چکے نذر جیب
اب جو گزرے یا مقدر یا نصیب

(نصیر احمد ناصر)

کرسی پر ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے میزبان نے چہرے کی خوشی اور باطن کی طمانیت سے بشرے پر ناگواری کے تاثرات دھیرے دھیرے رخصت لیتے رہے۔ اس مشاعرے سے ہم معذور تھے۔ شعرائے کرام کا ایک جملے میں تعارف کرنے سے قبل اپنی وابستگیت اور سیاسی بصیرت کے ثبوت میں تقریر کرتے تھے۔ پندرہ بیس شاعروں کے بعد ایک نام کا اعلان ہوا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نظامت کا مائیک لے رہے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ اس نام کے ساتھ تو میں فکر نہیں کرتا ہوں، اور مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ شاعری بھی نظم سے نہیں کرتی۔ نہیں یہ ڈاکٹر سید تقی عابدی سے ہم نام تو نہیں ہیں۔ خیر دیکھیں یہ سنتے ہیں۔

ایک بھاری بھرکم شخصیت، سوٹ بوٹ میں ہونٹوں تک پہنچتے ہی اپنی مخصوص آواز میں فرمایا:

نظم پیش کرتا ہوں۔ عنوان ہے۔

حاضرین، خواتین و حضرات میں اس نظم کے بارے میں توضیحی کلمات نہیں کہوں گا بعد از نظم آپ دوستوں کا اور آپ خود اس نظم کی داد دینے پر مجبور ہوں گے۔ یعنی اس نظم سے پہلے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصانیف، تالیفات اور ان کے معرکہ آرا تراجم "تجزیہ یہ واقعیت" کے بارے میں مختصر پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہوتی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی ہر کتاب یوں تو ایک تفصیلی اور تجزیاتی مطالعے کی متقاضی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں اور نہ یہ کہ اس سے چند اقتباس پیش کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اب تک (۱۱) تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ جن سے ہم میں

"شہید"، "جوش مودت"، "گلشن رویا"، "رموز شاعری"، "عروس سخن"، "اقبال کے عرفانی راوی"، "انشاء اللہ خان انشا"، "اظہار حق" اور "تجزیہ یا کار انیس"۔

ادب میں تحقیقی کام کی تاریخی اہمیت رہی ہے۔ اردو ادب کی تحقیق سے تعلق رکھنے والے جب بھی تاریخی لکھی جائے گی تو نہ صرف شمالی امریکہ بلکہ پاک و ہند میں بھی نثائی ادب کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں ڈاکٹر عابدی صاحب کے نام اور کام کو نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔

"تجزیہ یا کار انیس" ایسی کتاب ہے جس کا شہرہ پوری اردو دنیا میں ہے۔ یہ کتاب میر ببر علی سلامت انیس لکھنوی کے اس مشہور مرثیے کا جائزہ ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے:

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

بقول ڈاکٹر سید تقی عابدی ان کے اس عظیم اور ضخیم تجزیے کی بنیاد پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب مرحوم کے اس مقدمے پر رکھی گئی ہے جو "شاہکار انیس" کے عنوان سے اسی مرثیے کے سلسلے میں اب نصف صدی سے بھی پہلے لکھا گیا تھا۔ اس مقدمے نے ڈاکٹر عابدی کو یہ تحریک دی کہ اس کا مکمل تجزیہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے جہاں یہ بتایا ہے کہ اس مرثیے میں 197 بند ہیں وہاں یہ حساب بھی لگایا ہے کہ 1191 اشعار ہیں اور 1182 مصرعے ہیں۔ اسی طرح 171 مختلف موضوعات کو جدول بنا کر بھی شامل کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے فارسی، عربی کے الفاظ کتنے ہیں۔ کون کون سی شاعرانہ، روایتی اصطلاحیں، صنعتیں اس مرثیہ میں برتی گئی ہیں۔

غرض ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے میر انیس کے مرثیہ کا اتنی محنت سے تجزیہ کیا ہے کہ کوئی دوسرا محقق میرے خیال میں کسی ایک مرثیہ پر اتنی محنت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اپنی اس محنت بھری محنت اور تحقیقی کام کو جس تزئین و آرائش کے ساتھ شائع کرایا ہے میرا خیال ہے وہ لوگ جو اردو زبان کی سحر طرازی سے پوری طرح واقف بھی نہ ہوں وہ بھی ہمارے عابدی صاحب کے اس تجزیے کی خوب صورت طباعت و اشاعت پر داد تحسین دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اردو میں جو چند خوب صورت کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں "مرقع چغتائی" اور "تجزیہ یا کار انیس" کے علاوہ شاید ہی کوئی تیسری ادبی کتاب مشکل ہی سے ان کے مقابل ٹھہر سکتی ہے۔

"تجزیہ یادگار انیس" جتنی خوب صورت طباعت و اشاعت کے اعتبار سے اتنی ہی فکری خوب صورتی لیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی وہ نظم ہے جو میں نے سنیڈا آنے کے بعد پہلے مشاعرے میں سنی اور جس کو سننے کے بعد احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب جس اعلیٰ پائے کے نقاد اور محقق ہیں اسی بلند پائے کے شاعر بھی ہیں اس نظم کی فکری بلندی اور خوب صورتی میں، میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔

سماعت فرمایئے۔ نظم کا عنوان ہے۔ "بچوں کی ہنسی"

بچوں کی ہنسی

کتنی معصوم ہوا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
پھول کی طرح مہکا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
تتلیوں جیسی اڑا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
گرد کو بادِ صبا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
دل سے ہر راز کے وہ کرتی ہے بچوں کی ہنسی
خواب خانوں میں جلا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
محفل حال رہا ہوا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
کتنا جیسے دعا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
ہے پھٹتے ہوئے غم کے لئے بچوں کی ہنسی

ننھے بچوں کی ہنسی

جس نے سنتے ہی ہر اک شخص کو بچپن دے دے
درد کے دیس میں جیسے کوئی ہمدرد ملے
جس نے سنتے ہوئے پھولوں کی خوشبو مہکے
چاندنی رات میں جیسے کوئی نغمہ بہکے

جس نے سنتے ہی فضا میں ہوئی پتھرائی سے
جیسے بچھڑے ہوئے معشوق کو عاشق پائے

جیسے چوٹی پہ پہاڑوں کی سحر جاگتی ہو
جیسے ہرنی کوئی گھبرائی ہوئی بھاگتی ہو
لگتا ہے جیسے بیاباں میں کوئی شمع جلی
کھل گئی دل کی کلی
سن کے بچوں کی ہنسی

میٹھی آواز میں ساغر کی کھنک بولتی ہے
چشم شفاف میں شیشے کی چمک بولتی ہے
چاندنی دشت میں دریاؤں کو بھرنے والی
روشنی گھر کی منڈیروں پہ اترنے والی
ایسا احساس ہوا
مل گئی مجھ کو خوشی
سن کے بچوں کی ہنسی

یہ تمنا ہے مری
اے خدائے ازلی
لے لے یہ میری ہنسی
جو بناوٹ سے بھری
جو دکھاوے سے بنی
جو سیاست سے بنی
دے دے پھر مجھ کو وہی
مرے بچپن کی ہنسی
مری گم گشتہ خوشی
نو بہاروں میں ڈھلی

وہ ستاروں کی کلی
جو محبت سے بھری
جو حقیقت سے سجی
بھول جاتا ہوں جسے سوچ سے میں تنگ دلی
کاش مل جائے وہ کھوئی ہوئی بچپن کی ہنسی

آئی ہاتف کی ندا از مشیت ہے یہی
جس میں تبدیلی نہیں ہوتی وہ سنت ہے یہی
وقت گزرا ہوا پلٹا ہے نہ پلٹے گا کبھی
بچپنا بچھڑے سب، یاد ہے اپنی ہنسی
آتی ہے فرشتوں کو بھی بچوں کی ہنسی

اس سے خواب میں بچوں کو ہنساتے ہیں وہی
عرش اور فرش کی ہے جب یہ پسندیدہ خوشی
[illegible] بچوں کی ہنسی

[illegible] نہیں اس دنیا میں
پیدا ہوں بھی جو سکتے نہیں اس دنیا میں
خون کابل میں رواں اس سے فلسطیں کی کلی
دیکھی جاتی نہیں اب دنیا میں بھی خوشی
ننھے بچوں کی ہنسی

جن کے سر پر ہے کھڑی
تیرہ و تار گھڑی

جو مصیبت سے بھری
روتے بچوں کو ہنسا دے یہ عبادت ہے بڑی
پونچھ دے آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسو کی لڑی
بانٹ بچوں میں خوشی
دے دے بچوں کو ہنسی

جج اکبر ہے یہی
آپ کوثر ہے یہی
نیک کاموں میں تقی
سب سے بہتر ہے یہی

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مہجری ادب کا درخشاں ستارہ ڈاکٹر تقی عابدی

[illegible] میں مقیم ہندوستانی ڈاکٹر تقی عابدی عہد حاضر میں دانشوری کی روایت کے علمبردار ہیں وہ بیک وقت ادیب، ناقد، محقق، مصنف، مترجم اور شاعر ہیں۔ پیشے سے وہ ایک معروف ڈاکٹر ہیں، اردو ادب کی تدریس اور اردو ادب و شعر سے ان کا کوئی پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے لیکن ایک غیر تہذیبی فضا میں ان کی شخصیت کی قیمت تشکیل ہوئی ہے وہ ابتدا سے ہی شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کی جانب مائل رہے۔ میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران ہی ان کی نگارشات نے اہل نظر سے داد تحسین حاصل کی۔ شعبہ طبابت میں باضابطہ ملازمت سے بعد بھی انھوں نے اپنی اس تہذیبی و تخلیقی روش کو قائم رکھا اور اردو سے محبت میں اپنی تصانیف و تالیفات سے بیش قیمت اضافہ کیا لیکن کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا اور اپنے موضوعات میں فن کی جہات میں بھی امتیازی مقام پر فائز رہے۔ وہ جرمنی میں مقیم ہیں لیکن دنیا کے کئی ممالک میں میڈیکل سے وابستہ تنظیموں اور اداروں میں بطور مہمان خطیب منسلک ہیں۔ تقی عابدی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے اردو کے معاصر شعرا کی شخصیت و فن پر بہت سی معیاری اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن میں حالی، اقبال، فیض، ناصر، جدید اردو غزل کے سو شعرا اپنا اپنا کام وغیرہ میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ تقی عابدی کا شمار عالمی سطح پر ان ہونہار شاعروں میں ہوتا ہے جو اپنی شاعری سے پیش نظر ادب میں تبدیلیاں لاتی رہتی ہیں اور ادب سے پرانے معیار و منہاج میں بھی اپنی سابقہ نظریات و اصول بدلتے رہتے ہیں لیکن ان کے عہد میں ادب کی تخلیق و تنقید کے نظریات اور اصول و ضوابط میں بہت تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں ان کی [illegible] زندگی اور ادب سے وابستہ رہنے سے قبل

تبدل کی جانب مائل ہے۔ موجودہ دور میں کسی ادب کی قدر و قیمت اور اس کے ثروت مند ہونے کے جہاں کئی معیارات ہیں وہاں اب ایک اہم معیار یہ قائم ہو گیا ہے کہ اس ادب میں ''مجری ادب'' کا سرمایہ جتنا وسیع ہوگا وہ ادب زیادہ ثروت مند تصور کیا جائے گا۔ اس کے پیچھے منطق یہ ہے کہ آج کا معاشرہ عالمی گاؤں کا معاشرہ ہے اس لیے ادب کی وسعت بھی اسی قدر ہونی چاہیے۔ یہ معیار و میزان بہت حد تک درست بھی ہے۔ موجودہ عہد میں زبان و ادب میں رابطہ داشتہ اک اور بین دین کا عمل عالمی سطح پر بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ جب ہم اس معیار پر اردو زبان و ادب کو دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اردو عالمی سطح پر مجری ادبی تخلیقات و تصنیفات سے مالا مال ہے۔ دنیا کے بڑے ممالک جیسے لندن، امریکہ، کینیڈا، جاپان، یورپ کے کئی ممالک، ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے ممالک بھی اردو کے مجری مجموعی طور پر اگر جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ان ممالک میں شعری تخلیقات زیادہ سامنے آ رہی ہیں۔ تقریباً ہر ملک میں شعراء کی بہت ہی اچھی تعداد موجود ہے لیکن نثر کی تخلیقات اور تصنیفات ان کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ تحقیق و تنقید پر تو بہت ہی کام ہو رہے ہیں۔ موجودہ منظر نامے میں تحقیق و تنقید کے اعتبار سے مجری ادب کا جائزہ لیں تو ان میں روشن ستارے کی طرح تقی عابدی کی شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ سچائی بھی یہی ہے کہ ابھی برصغیر سے باہر اردو کے ادیبوں میں تحقیق و تنقید کے میدان میں کام کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام اور اہم تحقیقی و تنقیدی کام تقی عابدی کا ہی ہے۔ اب تک ان کے پچاس سے زائد علمی، ادبی اور تحقیقی کام سامنے آ چکے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، مصر اور کئی ممالک میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی خدمات کے عوض ہند و پاک کے کئی ادبی اور علمی اداروں نے انھیں اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ وہ فارسی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ فارسی زبان میں بھی ان کی گراں قدر تصنیف ''کلیات غالب فارسی'' ہے جو ہندوستان اور ایران سے شائع ہوئی۔

تقی عابدی نے حال ہی میں خواجہ الطاف حسین حالی کا کلیات مرتب کر کے تحقیق میں بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے بہت سے ایسے کلام کو بھی اس کلیات میں

شامل کر دیا ہے جو نہیں دستیاب نہیں تھے اس کے علاوہ حالی کی شاعری سے تمام حیثیتوں و
جس خوش اسلوبی سے متعارف کرایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ انیس، دبیر، اقبال، فیض سے
ہوئے سے بھی ان کی تحقیقی تحریریں سامنے آتی رہی ہیں۔ ان شعرا سے متعلق میں انھوں نے
تقابلی تنقید اور سوانحیاتی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف میں "امجد نمبر"
ہے جو پاکستان سے شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔ گزشتہ بیس بائیس برس سے تحقیق
تحقیق و تنقید کے میدان میں جتنے کام کیے ہیں انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص
اداروں کے بغیر انھیں کیسے انجام دے سکتا ہے۔ ان کی تمام علمی و ادبی کاوشوں کو آنے والی
نسلوں کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور آنے والے دنوں میں بھی مزید کام اور وقت سے
دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی
امروہہ (یوپی)

رثائی ادب کا مسیحا

سماعت کی سرحدوں میں ایک آواز داخل ہوئی "ڈاکٹر تقی عابدی"۔ یہ بھی بصارت کے دائرے میں نقوش بن کر یہ الفاظ چمکے۔ یعنی "ڈاکٹر تقی عابدی"۔ تو فوراً ذہن کے اُفق پر رثائیت کی شفق پھیل جاتی ہے۔ اور بھی میر انیس تو بھی مرزا دبیر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی ذات والا صفات سے یوں تو دیگر ادبی تصورات بھی وابستہ ہیں۔ نعت، انشاء، غزل، اور قبل سے بھی دلچسپی ہے اور ان بحیرۂ ذخار کی تہوں میں غوطہ زنی کر کے موتی نکالنے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک ادبی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھے یا سامنے آئے بھی تھے تو پوری طرح پہچانے نہیں گئے تھے۔

لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے جتنے کم وقت میں شعرائے رثائیت یعنی میر انیس، مرزا دبیر اور فرید لکھنوی پر مختلف اور انوکھی جہات سے جتنا زیادہ کام کیا ہے وہ یقیناً قابل رشک حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ایک کتاب کی رسم اجراء کی تقریبات مختلف ممالک میں اختتام پذیر ہونے سے قبل ہی دوسری کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہوتی ہے۔

"تجزیہ یادگار مرثیہ انیس" میں میر انیس کے صرف ایک مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کو تحقیق و تنقید کے ساتھ ایسے منفرد انداز میں ترتیب دیا کہ ہم ادب کی تاریخ میں بالکل منفرد مقام دے سکتے ہیں۔ اس میں ترتیب سے سلیقے سے ساتھ ہی جو عرق ریزی کی گئی ہے وہ ایسا بھاری پتھر تھا کہ جسے چومنے کی دوسرا کوئی آسانی سے ہمت بھی نہ کرتا۔ اور اگر چومتا بھی تو صرف چوم کر چھوڑ دیتا۔ لیکن انھوں نے مرثیے کے آخری بند تک اس کام کو اسی انہماک سے انجام دیا جس سے شروع کیا تھا۔ اور حقیقت یہ

ہے کہ صرف ایک مرثیے پر اپنے زاویوں سے کام کرکے انھوں نے دنیائے ادب کے سامنے ایک محیر العقول نمونہ پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس سلسلے میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ یہ کتاب نہیں بلکہ نکات فصاحت و رموز بلاغت کا ایک سرچشمہ ہے۔ مرثیہ نگاری کی تفہیم و تحسین کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اور انیس شناسی و انیس فہمی کے باب میں ایک نادرہ کاری ہے۔

کربلائی اب سے ایک فرہوش نژاد شاعر فرید لکھنوی سے اہل علم بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فرید لکھنوی کا وہ خزانہ تلاش کر لیا اور اس سے مراثی، سلام، رثائی قطعات و دیگر کلام کی تحقیق کے بعد "اظہار حق" کے نام سے پہلے ساتھ دنیائے ادب کے حوالے کر دیا۔ آج یہ ایک گم شدہ کتاب ہندوستان میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے اور علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہے۔

ادب کی تاریخ میں آج کا دن یقیناً ایک ایسا یادگار اور بہترین دن ہے جس میں رثائی ادب کے ماہر اور بیک وقت تین مختلف حیثیتوں سے منظر عام پر آرہی ہیں۔ کسی بھی ایک فن کار پر کی جانے والی تمام کاوش، جستجو، تحقیق و تلاش، تشریح، تجزیہ اور تنقید و تبصرہ اتنے کم وقت میں منظر عام پر آنے سے بھی ایک نئی مثال قائم ہو رہی ہے۔ اور یہ تینوں کاوشیں ہمارے جس ادیب کی ہیں وہ بھی ایک ایسی شخصیت ہے جس نے اردو دنیا سے ہزاروں میل کی دوری پر رہ کر یہ سب کچھ کیا ہے جہاں کا ماحول الگ معاشرہ مختلف تہذیب جداگانہ تمدن ہے۔ ہندوستان کی تینوں ان کا صرف جنم داں رہتا ہے اور وہ عملی طور پر ان تینوں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور اور کراچی کی فضاؤں میں اپنے آپ کو رکھتے ہوئے ہیں۔ یہ کام بھی مشکل ترین کام تھا۔ بہرحال مرزا دبیر پر مندرجہ ذیل کتب کی آج 21 مارچ 2015ء کو رسم اجرا حدیث دل نرسنہ کی جانب سے انجام دی جا رہی ہے:

1 "تحقیقی مرزا دبیر" (مجموعہ کلام فارسی)

2 "مثنویات دبیر"

3. ''مجتہد نظم مرزا دبیر''
4. ''طالع مہر'' [مرزا دبیر کا غیر منقوط کلام]
5. ''سلک سلام دبیر''
6. ''ابواب المصائب'' [تصنیف مرزا دبیر، مع مقدمہ سوانح عمری و تشریح]

اور اس کے بعد ''رباعیات دبیر'' اور ''کائنات نجم'' زیر تالیف ہیں اور امید ہے وہ بھی جلد ہی منظر عام پر آئیں گے۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم ڈاکٹر تقی عابدی کو تندرست رکھے اور ثنائی ادب کے لیے ان کا یہ کار مسیحائی اسی طرح معیاری انداز میں جاری رہے کیوں کہ اس کی اشد ضرورت ہے۔ یوں تو ہر دور میں ہر قسم کا ادب جتنی تخلیق ہوا ہے سب محفوظ نہیں رہ سکا کچھ ضائع اور تلف بھی ہوتا رہا۔ لیکن جہاں تک ثنائی ادب کا سوال ہے یہ سب سے زیادہ ضائع ہوا ہے۔ اور اسے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔ آج بھی شمالی ہندوستان میں بستی بستی پرانے دیوان خانوں، عاشور خانوں، حویلیوں، کتب خانوں، عزا خانوں، الماریوں، سوز خوانوں اور تحت اللفظ خوانوں کے بستوں میں ایک گنجینہ سرمایہ غفلت کے گرد و غبار کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جسے محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری اور فرض ہے۔ اور پھر اس لیے بھی اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس کی افادیت ہمارے آج کے معاشرے کے لیے خاص طور سے بہت زیادہ ہے کیوں کہ یہ سارے کا سارا ادب اعلیٰ اخلاقیات اور تہذیب کا نمونہ ہے جس کی آج کے سماج کو خاص طور سے ضرورت ہے۔ معاشرے میں خلاقی اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے میں یہی حسینی ادب اور ثنائی ادب ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تصانیف میں اس وقت صرف ''ابواب المصائب'' زیر نظر اور زیر غور ہے۔ جو مرزا دبیر کی نظم سے زیادہ نثر کا نمونہ ہے اس کو نہ صرف ڈاکٹر تقی عابدی نے مرتب کیا ہے۔ بلکہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ کے عنوان سے ان کی حیات کا خاصا تفصیلی خاکہ بھی پیش کیا ہے اور ایک نہایت جامع مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی مشکل الفاظ کی تشریح بھی کر دی گئی ہے تاکہ آج کا عام طالب علم بھی فیض یاب ہو سکے۔

کتاب کے انتساب کے لیے جس ذات کا انتخاب کیا گیا ہے اس سلسلے میں بھی

ڈاکٹر تقی عابدی کو دینی پڑے گی یعنی یہ انتساب "عاشق اچھے امیر کبیر راجہ میوہ رام فقیر امداد کے نام" ہے۔ انتساب سے کل وہ جملے بھی ملاحظہ ہوں جن میں راجہ میوہ رام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "جو عشق محمدؐ میں ڈوب کر اجمیر قوشتی اسلام میں نجات ملی، جنھوں نے اپنی دولت سے عالی شان امام بارہ بنوا کر عزاداری کو رونق بخشی، جہاں رمضان کی شہادت کی شبوں میں دیپ مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ جو آخر عمر بے معلی جا کر مجاور روضہ حسینؑ ہوئے اور زندگی مجاورت عترت اقدس میں بسر کر کے شہادت پاکر ہمیشہ کے لیے جدِ گاہ عیشان پاک طینت بن گئے۔"

یہاں انتساب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے جو تحقیق سے بعد معلومات فراہم کی ہے وہ بھی اہم ہے اور انھوں نے جس اسلوب میں پیش کیا ہے وہ بھی دلکش ہے۔

کتاب میں مرزا دبیر کا زندگی نامہ صفحہ ۱۱ سے ۱۱۲ تک یعنی ۱۰۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں نام، تخلص، تاریخ ولادت، مقام ولادت، والد، والدہ، جد، شریک حیات، اولاد، بھائی بہن، تعلیم و تربیت، اساتذہ، مذہب، شکل، شکل و صورت، تصویر، آواز، لباس، غذا، نقل و حرکت، آداب مجلس، مجلسی، اخلاق و کردار، رسم و عادات، عبادات، مہمان نوازی، سفر و حضر، قوت حافظہ، ذہانت، خوش طبعی، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، شاعری کا آغاز، مشق سخن، پہلا قصیدہ، آخری قصیدہ، پہلا مرثیہ، آخری مرثیہ، اساتذہ، تخلص، دبیر میں تخلص کی وجہ، دبیر میں صفائی، تلمیحات، پڑھنے کا طریقہ، طریقہ تصنیف، اصلاح کا طریقہ، مرثیہ کا آغاز، مرثیہ کے اجزا، سراپا اور معلوماتی حکایات تک پوری تحقیق سے بعد بیان فرمائی ہیں۔ جس سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے "حیات دبیر" اور "شاہ نجف آبادی" "پیغمبر سخن" آن پیش کیا ہے اس سے خواہش تھی کہ مرزا دبیر کی ایک جامع اور مختصر سوانح تحقیق سے بعد مرتب کرتے۔ یہ ذمہ داری بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے سلیقے سے پوری کی ہے اور صفحہ ۱۱ سے ۱۱۲ صفحات پر تحقیق پیش کر دی ہے۔

یہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ صفحہ زندگی نامہ ہی نہیں بلکہ مختصر سیرت نامہ بھی ہے۔ یہاں اس میں پیش کی گئی حکایات سے مرزا دبیر کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

البتہ صفحہ 18 پر نواب حامد علی خاں صاحب پیرسٹ ایٹ لا و لکھنوی لکھتے ہیں جب کہ نواب حامد علی امروہوی تھے، لکھنؤ میں پیرسٹری نہ ورکی نے لیکن آبائی وطن اور ولادت وغیرہ امروہہ کی تھی۔ جیسا کہ "حیات حامد" میں دیا ہوا ہے۔ ان پیرسٹر حامد علی خاں کا ذکر نفیس نے بھی کیا ہے اور جوش ملیح آبادی نے بھی "یادوں کی بارات" میں امروہہ کا ساتھ بتایا ہے۔

"ابواب المصائب" میں ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو مرثیے میں مرزا دبیر کی 21 ایجادات یعنی اضافوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن موضوعات کا مرثیے میں مرزا دبیر کو موجد قرار دیا ہے ان میں سے چند موضوعات کے ابتدائی عناصر اور نقوش کی جھلک قبل دبیر بھی مل جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرزا دبیر نے ان موضوعات کو مرثیے میں باقاعدہ اور باضابطہ طور پر شامل یا اور وسعت دی، ان 21 ایجادات کے علاوہ مرزا دبیر کی ایک ایجاد اور بھی ہے جس وہ پہلے مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے ایک مرثیے کو عنوان بھی دیا۔ ورنہ عنوانات سے مرثیے کا باقاعدہ سلسلہ مرزا دبیر کی وفات کے بھی تقریباً 50 سال بعد شروع ہوا ہے۔ مثلاً میر امروہوی کا "سازِ حریت" یا جوش ملیح آبادی کا "حسین اور انقلاب" وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس زندگی نامے میں مرزا دبیر کی صرف زندگی ہی بیان کی ہے اس میں اختتام زندگی کا ذکر نہیں ہے اور موت کے بارے میں کچھ تحریر نہیں فرمایا۔ ایک سو پر مرزا دبیر کی اردو اور فارسی تصانیف نظم و نثر بھی شامل ہیں۔ جہاں تک کتب پر مقدمے کا سوال ہے یہ بھی ایک خاص انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اور پہلے ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن میں "ابواب المصائب" کا ذکر ہونا چاہیے تھا لیکن مصنفین کی غفلت یا عدم توجہی کے سبب قطعاً ذکر نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مرزا دبیر کی پہلی سوانح جو فارسی میں ہے یعنی "شمس الضحیٰ" کتاب کا ذکر ہے ان کا ذکر بھی مقدمہ میں حوالے کے ساتھ کر دیا ہے۔ یعنی "حیات دبیر" افضل حسین ثابت، "شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر اور باقیات دبیر" ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری "مرزا سلامت علی دبیر" ڈاکٹر محمد زماں آزردہ اور "پیام عمل" مرزا دبیر نمبر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا مضمون "اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ" وغیرہ وغیرہ میں جو "ابواب المصائب" کا ذکر ہے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔

"ابواب المصائب" کا موضوع مجالس عزا ہیں جن میں سورۂ یوسف سے واقعات کربلا کو ربط دے کر بیان کیا گیا ہے۔ اس خاص رثائی موضوع پر اسی انداز سے اس سے قبل فارسی میں ملا واعظ حسین کاشفی کی "روضۃ الشہداء" اور اس کے بعد "ربیع الحبین" اور دونوں تصانیف سے موضوع کے اعتبار سے تقابل اور موازنہ بھی کیا ہے اور تینوں تصانیف کا جائزہ لے کر نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس میں زبان و بیان، صنائع اور معنوی عبارت، صنعتوں کے استعمال، جمع الجمع کا استعمال، صرف و نحو کے اصولوں کی پابندی یا عدم پابندی اور مصنفین کے جذبہ فخر، مبالغہ اور جزوی انحصار سے بیان کا تقابل کیا ہے۔

دوسری طرف اسلوب کے اعتبار سے "ابواب المصائب" کی نثر کا "فسانۂ عجائب" کی نثر سے بھی موازنہ کیا ہے اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی نثر نگاری کی خصوصیات، خوبیوں، سادگی اور صفائی کا بیان کرکے نثر نگاری میں ان کی اہمیت اور مقام متعین کیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم اردو نثر نگاری کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ اسلوبیاتی تجزیہ انتظار حسین عابدی کی عمیق نظری کا ثبوت ہے۔ انھوں نے "ابواب المصائب" اور اردو نثر کی رتن کا ایک سنگ میل ثابت کیا ہے اور ان پر بہ تصنیف بتایا ہے۔ اس سے صاف ان کے نظر انداز کرنا کہ اس نثر پارے کا موضوع رثائی ہے یا اسلوب میں سب رنگی ہے۔

مقدمے کے علاوہ ایک باب "تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے بھی ہے۔ اس میں بھی دیباچہ نگاری اور دیباچہ نگاری کے کام کیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "ابواب المصائب"، "روضۃ الشہداء" اور "ربیع الحبین" سے علیحدہ و تحقیقی تصنیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین عابدی نے رثائی ادب کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے جو رثائی ادب کے گوشے پوشیدہ اور مخفی رہنے کی کوشش کی ہے رثائی ادب کے سلسلے میں جو باقاعدہ تحقیق چلی آتی ہے جو غیر معروف و گمنام مرثیہ نگار شعراء و ادباء کے کام کی چھان بین کا کام ہے رثائی ادب کا مطالعہ کیا ہے اس کا تجزیہ اور تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہ یقیناً نہ صرف رثائی ادب بلکہ اردو زبان و ادب کی بھی ایک عظیم خدمت ہے جس کے لیے انتظار حسین عابدی اور رثائی ادب کے محققین و ناقدین شکریہ کے مستحق ہیں۔

پروفیسر عبدالکریم خالد
لاہور

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تحقیقی شعور

تحقیق کے بارے میں اہل فن نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس کی مختلف صورتوں اور طریقہ ہائے کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام آرا اور نقطہ ہائے نظر کو یکجا کر کے اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والا عمل ہے جس میں فکر کی پوری جدوجہد کے ساتھ حقیقت کی جستجو کی جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ معروضی اور خارجی شواہد فکر کو توانائی بخش کر اسے جدوجہد پر آمادہ کرتے ہیں اور اسے ایک نہ ختم ہونے والی تحقیق کی راہ پر ڈال دیتے ہیں جس کی بھول بھلیوں میں کئی کھو جانے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن جستجو کی لگن فکر کو استوار اور غیر مستقیم راہ کو ہموار رکھنے میں مدد دیتی ہے اور تلاش حقیقت کے سفر میں ہزار ہا شجر سایہ دار بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن ان شجر ہائے سایہ دار کی خنک چھاؤں میں دم بھر کو آنکھیں موند لینا بھی سفر کا زیاں ہے۔ یہاں ستانے اور کسی نئی عافیت میں اترنے کا کوئی محل نہیں بلکہ آگے بڑھتے اور بڑھتے رہنے میں مستعد ہونا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔

نئے حقائق کو دریافت کرنا بجائے خود کسی شے کو وجود میں لانے کا عمل ہے۔ معلوم حقائق کی انوکھی اور منفرد جہت تلاش کرنا اور دستیاب معلومات کے دائرے کو وسعت دے کر اسے دائرہ در دائرہ متشکل کرنا تحقیق کی عمل داری میں شامل ہے۔ اس عمل داری کی حدیں کسی متعین صورت میں قائم نہیں رہتیں بلکہ ہر عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے سے نئے استوار ہوتیں اور ماضی کے کھنڈروں پر ایک نیا منظر نامہ ایجاد کرتی ہیں۔

تحقیق میں بنیادی اہمیت اس تاریخی شعور کو حاصل ہے جس کے بغیر ادبی بھی تحقیقی کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ تحقیق چاہے ادبی ہو یا لوکی اور، تاریخی شعور اس کے دروں میں یہ

قوت محرکہ کے طور پر سرگرم ہوتا ہے اور اسے ایک سلسلے میں پروفیسر معصوم کا نام معلوم سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے نامور ادبی محققین سے یہاں اسی تاریخی شعور سے فیضان نے ان گنت دقیقوں کو سلجھانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ تاریخی شعور فکر و تردید اور امکان کی دھند سے صاف کر کے ایک تمثال دار آئینے کی صورت بنا دیتا ہے جس سے شش جہت میں ہر منظر اجلا اور روشن نظر آتا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ ماضی سے یہ تحقیق شناس سے یہاں تاریخی شعور کی پرشمہ داری نے حقیقت کا راز کھولا ہے لیکن جن نامعلوم دہلیزوں میں ان محققین کا آغاز کرتے ہیں ان سے یہاں تاریخی شعور کی کارفرمیاں اپنی متنوع صورتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ذیل میں اس تمہید کا ایک باقاعدہ جواز موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اصلاحب سے پیشے سے منسلک ہیں اور علمی تحقیق سے شغف میں اس لیے پڑ گئے اور پیشہ اسے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے شہرت اور نامور کی معین سطحوں تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ پیشہ میں ایک پختہ وضع اور فرض شناس کے طور پر معروف ہیں۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ اپنی مصروف ترین زندگی میں انھوں نے ایک خاصے لمبے عرصے تک وقت اس کام کے لیے وقف رکھے ہیں جس کے بارے میں میں نے تمہید میں عرض کیا ہے۔ یہ کام نہ صرف یہ کہ ان سے مستقل پیشے سے وفا کی مہلت نہیں رکھتا بلکہ ذہنی اور اعصابی طور پر انتہائی تھکا دینے والا ہے۔ مزید حیرت اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اردو کے ادبی اور سوانحی مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھے جو کام متن تبصرہ صورت رہے ہیں اس کے لیے تمام سے یہاں مستقل اور رسائی قائم ہیں اور ان دارالوں کی کارکردگی بھی ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے محبت سے شاعری اور ادبی تحقیق ان کا ذوق و مطالعہ اور تصنیف ان کا شوق ہے۔ میرے خیال میں ان کا یہ ذوق و شوق ان کی بے پناہ فکری اور نظری سلاحیت اور اب شاعری کی علمی استعداد کے سبب محض ذوق و شوق کی حد تک نہیں رہا ہے۔ اس سے بہت بڑھ کر ذہنی و قلبی وابستگی اور عقیدت کی صورت اختیار کر گیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اپنی زندگی کا مقصد اور محور بنا لیا ہے۔ ان

ہے کہ محض شاعری ان کا ذوق ٹھہرے لیکن جب ہم ان کے ان بار تحقیقی کام پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک عجیب حیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ ایک انتہائی معمور الاوقات شخص سے ایسی شاندار ادبی دریافتیں کیسے ممکن ہیں لیکن ادب اور زبان سے ڈاکٹر صاحب کی کمٹمنٹ اور والہانہ وابستگی دیکھ کر اس حیرت کو آسودۂ خواب کرنا ہی پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کام کمٹمنٹ اور وابستگی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے یہاں کتنے لوگ ہیں جو اپنی کمٹمنٹ میں پکے اور وابستگی میں استواری رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی جولاں گاہ فکر میں پلنے والے ماہ و نجوم اپنی آب و تاب میں بے مثال ہیں۔ انیس، دبیر اور اقبال تو بطور خاص ان کی دریافتوں اور فکر انگیز تجزیوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ انشاء اور فانی کو بھی انھوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔

گزشتہ دو برس انھوں نے ذہنوں سے محو ہوتے ہوئے مرزا دبیر سے رازہ نیاز کرنے میں بسر کیے ہیں۔ میر انیس کے حوالے سے تو ڈاکٹر صاحب یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ مولانا شبلی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں انیس کا جو مقام و مرتبہ متعین کیا ہے، بعد کے محققین اور ناقدین نے اس میں مزید اضافے کر کے ان کی عظمت اور شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہیں لیکن دبیر کے معاملے میں وہ یہ دردمندانہ احساس رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ بہت سی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ اول تو مولانا شبلی نے موازنہ کرتے ہوئے دبیر کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں کئی اشعار ایسے ہیں جن کا دبیر سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور دبیر سے جو اشعار دیئے گئے ہیں ان سے ان کے مجموعی مقام و مرتبے کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ دوسرے یہ کہ بعد میں آنے والے محققین اور ناقدین نے بھی دبیر کو بری طرح نظر انداز کیا ہے جس سے ان کی حیثیت اور مقام مجروح ہوا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی انصاف پسند طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے عہد کے ایک بہت بڑے شاعر پر بے اعتنائی کی گرد ڈال دی جائے چنانچہ انھوں نے مرزا دبیر کو نئے سرے سے دریافت کرنے اور ان کے نظر انداز کیے گئے کام کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھایا اور اس محنت طلب کام میں ایسے منہمک ہوئے کہ دو ہی برس میں دبیر کے منظومات، مراثی، سلام،

مثنویات، رباعیات، فارسی کلام اور نثر پر مشتمل اوپر تلے چھ کتابیں ترتیب دے کر اب اس میں ایک گمشدہ کڑی کا اضافہ کر دیا ہے۔ اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے سب ہی حضرات ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس بڑے کام سے کماحقہ واقف ہیں جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

2004ء میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "مجتہد نظم مرزا دبیر" "مناقب مرزا دبیر" اور "سلام مرزا دبیر" شائع کیں جب کہ اگلے برس "مثنویات دبیر" "ابواب المصائب" اور "منتخب فارسی" منظر عام پر آگئیں۔

"مثنویات دبیر" مرزا دبیر کے حوالے سے چوتھی کتاب ہے جس میں مرزا دبیر کی کل آٹھ مثنویاں شامل کی گئی ہیں۔ اس سے پہلے محققین دبیر کی صورت میں مثنویوں کا حال معلوم تھا۔ پیشتر کتابوں میں صرف دو مثنویوں "احسن القصص" اور "معراج نامہ" کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے آغاز میں بعض ایسے معروف محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اردو مثنوی پر اپنی تحقیقی کتابوں میں بعض گمنام شعرا کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے لیکن دبیر کی مثنویاں ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے مختلف ذرائع سے دبیر کی پانچ مزید مثنویاں دریافت کی ہیں۔ ان میں سے دریافت شدہ تین مثنویوں سمیت سات مثنویوں کا مکمل متن مدون صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثنوی بے عنوان غیر مطبوعہ ہے اور مرزا دبیر کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب میں اس مخطوطے کے 11 صفحات کا عکس شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں

> "اس غیر مطبوعہ مثنوی کا دریافت سے روشناس کرانے کا سہرا ڈاکٹر [illegible] کے سر ہے۔ قلمی مثنوی کا پورا مخطوطہ مرزا دبیر کی [illegible] کے مطابق ہے جو 11 صفحات پر مشتمل ہے اور پورا مخطوطہ کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ مثنوی بے عنوان جو دبیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، مخطوطہ جسے [illegible] تحقیق و تنقید کی پرکھ کے بعد [illegible] میں ظہور میں آئیں۔ اس مثنوی کے اب تک صرف چند اشعار [illegible] کی نظر پڑا ہے [illegible] کی تحریر سے [illegible]

اشعار شاید طویل مدت تک غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے پڑھے نہ جا سکیں۔ اس لیے پہلی بار اس غیر مطبوعہ مثنوی بے عنوان کو من و عن اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔" (ص 286-287)

یہاں میں خاص طور پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ایک خاص وصف، یعنی تحقیق میں ان کی دیانت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر نیک رام نے سید مسعود حسن رضوی ادیب کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ اپنی تحریروں میں پابندی کے ساتھ دیانت برتنے کے قائل تھے۔ مصنفین اور محققین کا حوالہ دینا اور کسی موضوع پر ان سے قبل جو لوگ کام کر چکے ہیں، ان کا اعتراف کرنا بڑے ظرف کی بات ہے۔"

یہی بات پورے وثوق کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ "مثنویات دبیر" میں نو دریافت مثنویوں کا احوال بیان کرتے ہوئے وہ ان اولین دریافت کنندگان کے نام درج کرنا نہیں بھولے جنھوں نے اول اول ان مثنویوں کو دیکھا اور ان کا ذکر کیا ہے۔ دبیر کی مثنوی بے عنوان کا قلمی نسخہ ان کی ذاتی ملکیت میں ہے اور وہ آسانی کے ساتھ اس کی دریافت کا سہرا اپنے سر باندھ سکتے تھے اور ان کے اس اقدام کی باقاعدہ توجیہہ بھی موجود تھی۔ لیکن یہ بات ان کے دیانت دارانہ تحقیقی مزاج کے خلاف تھی چناں چہ انھوں نے تعارف کی پہلی سطر میں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا ذکر کر دیا۔ ان کی یہ اعلیٰ ظرفی تحقیق میں ان کے اعتبار کو قائم کرتی ہے۔

مرزا دبیر کی نثری تصنیف "ابواب المصائب" بھی ایک نادر و نایاب کتاب ہے۔ سوائے چند ایک کے اردو نثر کی معروف تواریخ میں اس کتاب کا ذکر تک موجود نہیں۔ کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں

> "ابواب المصائب" کو تصنیف ہوکر تقریباً 180 سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور اس کو مطبع یوسفی سے شائع ہوکر بھی کم از کم سو سال ہو چکے ہیں اور اس ایک سو اسی سال کی مدت میں درجنوں عمدہ تحقیقی نثری کتابیں اردو نثر کے ارتقا پر لکھی گئیں لیکن اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ تجزیہ تو دور کی بات ٹھہری اس کا نام تک نظر نہیں آتا۔ اردو نثر کی تاریخ اور اس کے ارتقا کی

چشم دید واقعات پر مشتمل چند تصانیف اور تالیف ہیں جن واقعات پر ان کی
بنیاد ہے چنانچہ اپنے تذکرہ کتاب کے دیباچہ میں اس عنوان کی تصنیف
سے چشم پوشی شریعت اسلام میں ناروا نہیں تو اور کیا ہو سکتی ہے جب کہ
اغلب و اکثر تصانیف و تذکروں میں کئی ضعیف اور مجہول کتابوں سے زیادہ
سے زیادہ حوالہ جات دیے گئے ہیں۔" (ص 35)

ڈاکٹر تقی عابدی نے "ابواب المصائب" کو مرثیوں کے فارمیٹ سے ہٹ کر
ساخت پیش کیا ہے اور اسے انیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں بھی جانے والی روایت کا
شاہکار قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ اپنی جامعیت اور ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ تاریخی
اور تحقیقی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے "ابواب المصائب" کے موضوع
اور اسلوب پر نہایت شستہ اور مدلل پیرائے میں جو مباحث پیش کی ہے وہ تحقیق و تنقید
دونوں میں ایک معیاری مثال ہے مثنوی کتاب کے تعارف کے ذیل میں یہ عنوان دیتے
ہوئے

"مرزا دبیر نے اس کتاب کے دیباچہ میں اس کتاب کی تالیف کا باعث
اور سبب تالیف بھی مرقوم فرمایا ہے اس کے اس ارشاد کی طرف
اشارہ کیا ہے کہ جس میں انھوں نے سورۂ یوسف کے ترجمہ اور تفسیر کے
ساتھ مصائب پیغمبر خدا و آیات اور احادیث کی روشنی میں ایسا ربط
خصوصی دیا ہے جس سے روضہ خوانان اہل مظلوم مستفید
ہوں اور اس خیال سے انھوں نے بطریق تازہ اور بہ حسن انداز
نظم کیا ہے۔ مرزا دبیر نے سورۂ یوسف کے واقعات کو اہل عزا
کو اس طرح جوڑا ہے کہ اس سے مدعیوں کو کاری مکان پڑ گئیں۔"
(ص 41)

یہاں مرزا دبیر کے تالیف کتاب کی سبب تحریر بھی ملاحظہ کیجیے

"جب یہ خاکسار فضل ایزد منان شہر لکھنؤ میں آیا تو میں کی
مرحومہ نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ سورۂ یوسف کی
نظم کی جائے۔ میں نے اس سے عذر کیا کہ اس کی نظم
کی

کرسی زرنگار پر بٹھلایا۔ باوجود اس حشمت کے فراق یعقوب میں مثل ابر نوبہار زار زار روتے تھے۔ اگر کوئی انصاف کرے تو سمجھے کہ حرم محترم رسولؐ خدا پر بازار شام میں کیا کیا نہ رہا ہے۔ لکھا ہے جس وقت وہ بے کسان کربلا داخل شہر شام ہوئے تو ساکنان شام فوج فوج نظارۂ اہل بیت کو آتے تھے اور گروہ گروہ مشغول تماشا ہوتے تھے۔ سہیل سعدی کہتا ہے کہ اس روز وارد شام تھا۔ دیکھا میں نے بازار آئین بندی ہے۔ آواز دف و نوبت کوچہ بہ کوچہ پیدا ہے۔ مردم لباس ہائے رنگین پہنے ہوئے ہیں۔ پوچھا میں نے، مگر آج کوئی عید ہے کہ ہم اس عید سے واقف نہیں ہیں۔ لوگوں نے کہا مجھ سے کہ اے مرد ضعیف آیا تو نہیں جانتا ہے۔

یاں آمدِ ناموس حسینؑ ابن علیؑ ہے
یہ حضرت شبیرؑ سے مرنے کی خوشی ہے

(ص:45-46)

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تیسری کتاب "مصحف فارسی" مرزا دبیرؔ کے فارسی کلام پر مشتمل ہے جس میں مرزا دبیرؔ کی 39 رباعیات، 7 قطعات، 2 سلام، 3 مخمسات، 3 مسدسات کے علاوہ دبیرؔ کے خط میں 2 غیر مطبوعہ نثری رسائل اور 4 مکتوبات شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں "مرزا دبیرؔ کا زندہ نامہ" کے عنوان سے دبیرؔ کے سوانحی حالات ایک خاص ترتیب سے رقم کیے گئے ہیں جن سے دبیرؔ کی پوری زندگی آئینہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی فارسی دانی نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں خوب جوہر دکھائے ہیں۔ تاہم اس کتاب میں انھوں نے تجزیے و تحلیل کا کام اہل علم پر چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ تینوں کتابیں اردو ادب کے لیے تحفۂ خاص کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب شناسوں کو ان کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ انھوں نے دبیرؔ کی صورت میں ایک پورے عہد کی تہذیبی صورت حال کو نہ صرف نئے سرے سے زندہ کر دیا بلکہ اس حوالے سے اردو زبان کو بھی ایک اثر انگیز تہذیبی قوت عطا کی ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھے اور وہ یونہی اردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم رہیں۔

شاہد اقبال کامران
روزنامہ "پوسٹ انٹرنیشنل"
15 دسمبر 2021ء

اسلام آباد میں دسمبر کی بہار

وہ کہتے ہیں کہ میں جب کالج میں اردو کا لیکچرر تھا تو میں یہ بھی شامل رہتے ہیں کہ وہ اقبال کے عاشق اور فیض کے مداح رہے ہیں۔ ان کے تصنیفی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست اس قدر طویل اور متنوع ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ کوئی میڈیکل ڈاکٹر، وہ بھی ہارٹ اسپیشلسٹ، ہیڈ آف میڈیسن ڈپارٹمنٹ، پی ایچ ڈی پیشہ ورانہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ اتنا وقت کیسے اپنے عشق کو کیسے نبھاتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ مسلسل کام بھی کر رہے ہیں اور عشق بھی کیے جا رہے ہیں۔ ان کا کام عشق سے کم نہیں تاہم ان کے عشق اتنے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کسی تحقیقی منصوبے کو ادھورا نہیں چھوڑتے۔

اقبال سے وہ بے حد درجہ محبت رکھتے ہیں، اور یہ محبت اقبال کی اردو شاعری سے شروع ہو کر اقبال کی فارسی شاعری سے عقیدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اقبال سے کام اور پیار کرنے کا انداز نرالا اور منفرد ہے۔ اقبالیات پر ان کی تصانیف میں "اقبال سے عرفی تک: تجزیہ شکوہ جواب شکوہ" اور "چوں مرگ آید" شامل ہیں۔ معظم الدین تحقیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد درجہ مختلف اور منفرد ہے۔ اس میں اقبال کے حوالے اور ان سے متعلق واقعات کو طبی عمل کے تناظر میں مضمون بنایا ہے اور بالکل درست کہا ہے کہ اگر اقبال سے عرفی کا شوق اور درست علاج ہو جاتا تو وہ اپنی طبعی عمر سے کم از کم تیس سال پہلے وفات نہ پاتے۔ یہی معظم تحقیق ہے میڈیکل ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ اقبال اور فیض سے متعلق یہ دونوں تحقیقی منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں۔

اقبال سے ان کی توجہ فیض احمد فیض کی طرف ہوئی ہے۔ ان کی شاعری اور فیض احمد فیض کی

مبادیات کو یکجا کر کے انھوں نے فیض شناسی کو بہت سہل کر دیا ہے۔ 2011ء میں جب ہماری یونیورسٹی میں فیض چیئر قائم کی گئی تو شروع دن سے ڈاکٹر تقی عابدی کی مشاورت اور معاونت ہمیں حاصل رہی۔ ''باقیات فیض احمد فیض'' کا منصوبہ فیض چیئر کے ساتھ مل کر بنانا، ڈاکٹر صاحب اس منصوبے پر کام کر رہے تھے، اور کام پھیلتا جا رہا تھا۔ فیض چیئر کی طرف سے اس منصوبے کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے ذمے لی گئی تھی۔ کام مکمل ہو گیا لیکن فیض چیئر کو کئی سال تک کسی قسم کے فنڈ مہیا نہیں کیے۔ کچھ ایسا ہوا کہ چانسلر آیا جو کشت سے فیض اور دیگر روشن خیال شعرا کے اشعار کشت سے پڑھتا تھا، تو فیض چیئر کو فریزر کے خانے میں رکھ کر ختم کرنے کے درپے رہا۔ ہم نے فروری 2017ء میں یک روزہ بین الاقوامی فیض کانفرنس کا منصوبہ بنایا، ہر طرح کی منظوری حاصل کی، شرکا کو دعوت نامے ارسال کر دیئے، یہ کرونا وبا سے پہلے کا قصہ ہے۔ متعلقہ بچ بھی چھوا دیا۔ کانفرنس سے چند روز پہلے وائس چانسلر کہنے لگا کہ اسے ملتوی کر دیں، میں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم ملتوی نہیں کریں گے۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ مہمان فیصل آباد پہنچ چکے ہیں۔ بہت زور سے ہنس چھوٹا سا منہ کھول کر کہنے لگا، پھر اسے وہی جملہ ایک دن میں مکمل کر لیں۔ میرا دوست جب بھی اسے دیکھتا تو مجھے پوچھتا ''یہ ہوں وی سی نے بنایا اے'' یعنی اسے وی سی نے بنایا ہے؟ خیر ہم نے سیشن بڑھا دیے اور کانفرنس اس طرح مکمل کی کہ وائس چانسلر اس کے افتتاحی اجلاس میں ''اچ ای سی'' جانے کا بہانہ کر کے غائب رہا۔ ایسی منافقت ہماری اجتماعی زندگی میں عام بلکہ رائج ہے۔ فیض چیئر کی طرف سے خاموشی دیکھ کر ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ''باقیات و نادرات فیض احمد فیض'' کا نہایت پرشکوہ ایڈیشن بک کارنر جہلم سے شائع کرایا۔ ''باقیات و نادرات فیض'' کا یہ مجموعہ خاصے کی چیز ہے۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر تقی عابدی کی محنت، شوق اور کاوش کی رسائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انیس و دبیر کے موازنے کی ادبی روایت کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان دونوں بڑے شاعروں پر نہایت وقیع کام ڈاکٹر تقی عابدی کے مفاخر کا حصہ ہے۔ غالب کے اردو فارسی کلام کی تدوین اور اب فراق گورکھپوری پر تازہ کتاب۔ یہ سب کچھ پڑھنے کے لیے اک عمر چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر تقی عابدی اپنا کام جوان کے ذوق و شوق پر مدار کرتا ہے، جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی مساعی جمیلہ

یقین آ جاتا ہے۔ ہیشہ تحقیق شیر مردوں سے خالی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر تقی عابدی ہر اعتبار سے ایک شخصیت کے مالک ہیں۔ "انجمن" پچھلی دو خاص طور پر پاکستان آئے ہوئے ہیں تاکہ "انجمن" کی تقریب رونمائی کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہو سکے۔ اسلام آباد والی تقریب ہماری یونیورسٹی میں طے پائی۔ بہر حال متعدد رکاوٹوں کے باوجود ہم نے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ انجمن اسلام انجمن نے ڈاکٹر تقی عابدی کو چند ناموں کی ایک فہرست دی کہ میری طرف سے یہ لوگ اس تقریب میں شرکت کریں گے۔ یہ فہرست مجھ تک پہنچی، اس میں وہ سب شامل تھے جن کی شرکت کا میں معلوم مقصد اسلام آباد کی ادبی تقریبات میں شرکت اور صدارت کرنا رہا۔ اس فہرست میں کچھ نام ایسے بھی تھے جن سے ہم نے بصد احترام معذرت کر لی۔ بروقت مخبری ہو گئی کہ "انجمن" کی تقریب کو ہر طرح سے ناکام کرنے کی تیاریاں ہیں۔ یونیورسٹی کے ملازمین کو منع کیا گیا کہ تقریب میں شامل نہیں ہونا۔ یہ بھی اسلام آباد میں ہمارے دوستوں اور شاگردوں نے چوری کرائی۔ ڈاکٹر تقی عابدی اور انجمن اسلام انجمن تقریب سے ایک روز پہلے شام کو یونیورسٹی پہنچ گئے۔ رات کھانے پر میں نے پہلے سے ڈاکٹر تقی عابدی کو بتا دیا کہ وہ تمام لوگ جنہیں انجمن اسلام انجمن نے مدعو کیا ہے، شامل نہیں ہو رہے۔ ان میں صرف انجمن اسلام انجمن کے عہدیدار تھے۔ ہاں جن کی کل وہ بھی آئیں گے، یہ بھی آئیں گے، جن یا نہ آنے والوں کے نام میں نے پڑھ کر سنائے۔ پھر پوچھا کہ ان سے بات ہوئی؟ کیا دعوت نامے بھیجے گئے؟ پر ہوا ہے کہ شاید نہ آئیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ پھر انجمن اسلام انجمن کے فون کرنے شروع کیے۔ ایک نمبر، دو نمبر، تین نمبر۔ کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ ہم نے کئی گھنٹوں کے وقفوں سے مختلف اوقات میں فون کیے۔ نتیجہ وہی رہا۔ کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ یہ ہے پاکستان اور خاص طور پر اسلام آباد کے ادیبوں کا قصہ، یعنی ایک اچھی خاصی محفل جو آپ نے ایک شاعر و ادیب کے اعزاز میں سجائی ہو، آپ پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے ہی ادیبوں کی پذیرائی نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ہم پاکستان سے کئی تلخ یادیں لے کر جا رہے ہیں۔ ہم نے ان کی تلخی کو کم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

خیر "امجد فہمی" کی تقریب ہوئی اور کیا شاندار تقریب رہی۔ سچ ہے دنیا میں ولی کا مرد اور کارنامہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

نورنغو میں مقیم یہ بہار آج کل پاکستان میں اتری ہوئی ہے۔ کراچی، بہاولپور، ملتان میں زبان و ادب کے قلعے فتح کرتے ہوئے اسلام آباد تشریف لائے۔ کل الحمد یونیورسٹی میں سیمینار کی صدارت کی، آج فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی راولپنڈی میں سیمینار میں شرکت اور خطاب فرما کر از راہ محبت، زحمت کرکے مجھ سے ملنے کا وقت نکالا۔ یہ وضع داری، یہ توجہ اور محبت آج کل نایاب اور ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کے ہاں فراواں ہے۔ فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی کے سیمینار کے بعد انھیں جہلم میں منعقد تقریب کی صدارت کے لیے جانا تھا، لیکن وہ تشریف لائے، اور پھر گویا بستاں حل کیا۔ کیا کیا باتیں ہوئی، سچ ہے کہ کہتے کسی کو سنیے گا، تو دیر تلک سر دھنیے گا۔ ہر سال ایک نیا علمی اور ادبی کارنامہ سامنے لاتے ہیں۔

دنیائے ادب، یعنی وہ دنیا جو ارضی سرحدوں سے ماورا ہے، کے کئی دلچسپ قصے سنائے۔ مستقبل کے کچھ منصوبے، کچھ تجویزیں اور کچھ آرزوئیں بیان ہوئیں۔ ہم سننے والے بھی اور محض باتیں کرنے والے لوگ ہیں، گویا ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید تقی عابدی کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہر وقت ایک سے زیادہ تخلیقی منصوبے جاری رکھتے ہیں۔ جتنا سوچتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی جب بھی تشریف لاتے ہیں، اپنے اطراف، جوانی زندگی کی حرارت، ولولہ، جوش اور حرکت کی برکت پھیلا دیتے ہیں۔ ہاں البتہ میری صحت کے بارے میں فکرمند ہوئے۔ میں نے بھی وہ تمام وعدے کر لیے، جن پر عمل کا امکان بوجہ تساہل کم ہے۔ جس خلوص سے انھوں نے وقت دیا، توجہ کی اور مسرور ہوئے، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

ڈاکٹر شفیع ایوب
جے این یو، نئی دہلی
9/جون 2022ء

قلمی چہرہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی

علم کا دریا ہیں، سمندر ہیں، ندی ہیں، جی ہاں، سید تقی عابدی ہیں۔ پیشے سے طبیب ہیں، سب مشن خطیب ہیں۔ اردو کے چمن میں باغبان ہیں، اردو والوں سے رشتہ ہے، بیدار میں میتھم ہیں۔ بزم مرثیہ میں ناظم دلیر ہیں، اردو کے عاشق غیور ہیں۔ ریاضت سے دھنی، معیار ضبط ہیں تقی عابدی۔ علم رنج الوقت ہیں تقی عابدی۔ اک علمی کتاب ہیں تقی عابدی، تاریخ کا سنہرا باب ہیں تقی عابدی۔ گویا ہوں تو روح سے تشنہ لبی پہلو سے دیدار کرتے ہیں، گفتگو کا سب سے ہنر قبال ہیں، غالب شناس بھی ہیں۔ خوب صورت بھی ہیں، خوش لباس بھی ہیں۔ کبھی سوٹ تو کبھی شیروانی۔ دیار غیر میں اسلاف کی نشانی۔ تقریب کیسی ہو کوئی ہو موضوع یادِ پانی۔ اگرچہ سفر ان کے لیے خسارہ ہے۔ مگر زمین بندہ پرور شخصیت پارا ہے۔ ہم نے جب پکارا، یا آ گئے ہیں۔ ان سے خاص ہوتے ہیں خوبصورت رہتے ہیں۔ یہ محبت کے رشتوں کا احترام کرتے ہیں۔ یہ ہر نام بعد احترام کرتے ہیں۔ نظر رکھتے ہیں تحقیق کے ہر اوراق پر۔ تنقید کی ہر بات پر۔ نظر رہتی ہے جس پر اک عمل باب ہے۔ ہر کی نظر رکھتے ہیں شاعر شیدائیہ پر۔ تبصرہ کی ہر ایک ہیں۔

تقی کی شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ ہمہ جہت ہے۔ یہ علم ان کا ہے۔ صبر سے ہیں۔ یہ آل اللہ کی محبت میں ہے۔ سیاست کی نظر ہیں۔ تحقیق میں ہے۔ تقی ہیں ہم سے تقی ہیں بلند ہے۔ ہر ہیں۔ سب ہیں باتوں سے

ابھی قرار آیا تھا۔ کہ ہم نے نیرنگ سرحدی کا سراغ پایا تھا۔ پوچھا جناب نریش نے ہم کہاں تک پہنچے۔ کہا میں نے کہ "تعمیر یاس" سے "تعمیر بقا" تک پہنچے۔ یاس سے بقا تک تعمیر اک سفر ہے۔ یہ "تعمیر یاس" سے "تعمیر بقا" کا سفر ہے۔

کبھی موجوں سے الجھے، کبھی دریا کنارے چلے گئے۔ ادائے خاص سے زلف یتی سنوارے چلے گئے۔ معصومہ اور رویا آپ کی تصنیف خاص ہیں۔ رضا مرتضیٰ بھی دل کے پاس ہیں۔ کئی ملکوں میں رہے، فکر عالم گیر رکھتے ہیں۔ دماغوں میں جہاں دل میں یاد شبیہ رکھتے ہیں۔ امریکہ و کینیڈا، لندن و ایران کی باتیں۔ کہ دل کو گرماتی ہیں وہ ہندستان کی باتیں۔ یاد سید سبط نبی، یعنی اجداد کی یادیں۔ بھی دلی بھی حیدرآباد کی یادیں۔ یہ یادیں اب بھی دل کو لبھاتی ہیں۔ کینیڈا سے نہیں کھینچ لاتی ہیں۔

سید تقی عابدی بے مثال خطیب ہیں۔ خوش فکر شاعر ہیں، ادیب ہیں۔ عالمی امن و آشتی کے نقیب ہیں۔ محسن ملک و قوم ہیں، حبیب ہیں۔ بقول خود ادب کے مریض اور صحت کے طبیب ہیں۔ ناقد و ادب ہیں، محقق ہیں، معالج ہیں۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہندی نژاد ہیں، رفیق ایران ہیں۔ فاتح دلی و فاتح تہران ہیں۔ تضمین "کلیات غالب فارسی" کا اجرا تہران میں کیا۔ اہل فارس کو حیران ایران میں کیا۔ حافظ و سعدی پہ لکھی اور قلم توڑ کے رکھ دیا۔ فلسفۂ رومی و جامی کا عرق نچوڑ کے رکھ دیا۔ اہل فارس ہیں فریفتہ اس ہندی نژاد پر۔ سیکڑوں شیریں مرثیں اس فرہاد پر۔ مگر یہ مریض، انائی عشق کے دریا کے کنارے کنارے چلا گیا۔ اپنی جنس میں بس زلف یتی سنوارے چلا گیا۔ ریاضت کر رہے ہیں در عدنان پر بیٹھے۔ پڑھ کر چلے علم و دانش، مسند عرفان پر بیٹھے۔ حسین و جمیل تقی صاحب، خوش پوش، شکیل تقی صاحب، کتابوں کے رسیا، رات دن تپسیا، تحقیق و تنقید کے ستون، حصول علم کا جنون، کیا ہے کتنے ارمانوں کا خون، تب بنے ہیں ماہر علم و فنون۔

بظاہر بہت سنجیدہ، اندر سے ظرافت کا پلندہ، لطائف کا ذخیرہ خاص رکھتے ہیں۔ تبسم کا خزانہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ شوخی، ظرافت کا بہت اعلیٰ معیار رکھتے ہیں۔ دماغ تازہ دار دل بیدار رکھتے ہیں۔ دل میں نہ جانے کس کس کا پیار رکھتے ہیں۔ محبت میں کچھ نقد، کچھ ادھار رکھتے ہیں۔ ادائے بے نیازی ہے، مگر خوب خبر رکھتے ہیں۔ اچھے اور برے سب پہ نظر

رکھتے ہیں۔ قصیدہ، مرثیہ و مثنوی لکھتے ہیں، مگر غزلوں کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ نہ جانے کیوں یہ غزلوں کو اداس رکھتے ہیں۔ غزل سے بات کرتے ہیں، غزل کو پاس رکھتے ہیں۔ مگر یہ "کام" بھی زمانے سے چھپا کر کرتے ہیں۔

سید تقی عابدی کے فکر و فن پر لکھا جا رہا ہے۔ ان کی طرز و ادا پر سخن پر لکھا جا رہا ہے۔ کچھ احباب نے لکھا، کچھ خواتین نے لکھوائی۔ یہ تخلیقی کتاب رئیس الدین نے لکھوائی۔ لکھنے اور لکھوانے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ دنیائے سخن پر سید تقی عابدی کا رعب طاری ہے۔

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
سابق صدر شعبۂ اُردو
یونی ورسٹی آف حیدرآباد

ایک فرد یا ادارہ.....ڈاکٹر تقی عابدی

میں ممبئی کے رضوی کالج کے کانفرنس ہال میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر عباس عالم رضوی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک میرے بھانجے نادیز کے ڈاکٹر شجاعت علی اور ان کے ساتھ کے آٹھ دس اشخاص کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ان سے یہ کہہ رہے تھے۔

آپ لوگ اگر کھانے کے لیے ان کے ساتھ جا رہے ہیں تو یہ بتا دیں تاکہ مجھے اتنے آدمیوں کے کھانے کا انتظام نہ کرنا پڑے۔

ڈاکٹر شجاعت نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے، مجھ سے ڈاکٹر عباس عالم نے کہا کہ "آپ لوگ تو شاید نہیں جائیں گے؟"

میں نے کہا: "اے بھیا! جانا کہاں ہے؟"

انھوں نے کہا "ڈاکٹر تقی عابدی نے شرکاء سیمینار کو رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ آپ نے اور ڈاکٹر علی حیدر نے شاید معذرت کر لی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں یہ درست ہے۔" عباس عالم بھی چلے گئے۔

دو گھنٹے بعد جب سب لوگ لوٹے تو میں نے شجاعت سے پوچھا "کیوں بھائی؟ کیسا رہا ڈنر؟" شجاعت نے بہت ایمانداری سے بتایا "زیادہ قسم کے کھانے نہیں تھے۔" سالن مرغ کے، ایک تندوری، سیخ کباب، شامی کباب، کلاٹ کے کباب، رائیتہ، دہی بڑے اور قلاقند"

میں نے علی حیدر کی طرف دیکھا۔ ان کے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور پھر ہم لوگ کانفرنس کی طرف سے جو مرغ اور بریانی تھا اسے کھا کے سو گئے۔

لیکن میں یہ سوچتا رہا کہ میں نے اور علی حیدر نے غلطی کی کہ اتنا اچھا کھانا نہیں

کھایا۔ یہ تو ایک طرح سے کفرانِ نعمت ہو گیا اور ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ کھانے کی دعوت دینے والے ڈاکٹر تقی عابدی ہیں کون؟

صبح میں نے عباس عالم سے پوچھا۔ ان کے جواب دینے کے انداز میں تھوڑی سی حیرت تھی گویا یہ جانتے ہوں، ارے آپ ڈاکٹر تقی عابدی کو نہیں جانتے"

طرفین نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر تقی عابدی بچے کے اور ہم لوگوں سے بیس سال کا تفاوت رکھتے ہیں۔ جب تک میں دہلی میں رہا آئی جہاں میں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو دیکھا تھا۔ وہاں کانفرنس کے اختتام پر سے اکثر ایک عزیز کے اور پھر وہ دہلی تھی وہاں رشتہ داروں کی دعوت یا ایک کاوش سی آیا تھی۔ وہاں مجھے اپنے ساتھ لیتے چلے تھے۔ وہیں یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر تقی عابدی سیتاپور میں رہتے ہیں۔ اور اردو کو مقدس دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں۔

ایک بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر تقی عابدی خسیس نہیں تھے۔ اس لیے دل ہی دل میں ان سے بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

پھر دوسری کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ اس بار میں نے ان کو شاید وہ اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ یقین ہو گیا کہ یہ مقالہ خود اس شخص کا لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے مختصر سی تعارفی تقریر بھی کی۔ میں نے یہ جانا کہ ڈاکٹر تقی عابدی بچوں کی معصومیت سے ساتھ اپنی تعریف سن کر محظوظ ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم کی تعریف سے بعد میں نے غور سے اس شخص کو دیکھا جس نے جسم پر شیروانی بالکل میرانیس کے مسدس کی طرح سے معلوم ہو رہی تھی۔ اور مجھے اس پر حیرت تھی کہ اتنی شاندار شیروانی سیتاپور میں کہاں سے آئی۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ تقی عابدی خاندانی کانگریسی اور کانگریسیوں سے لیے آتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد اور دہلی سے متعلق ہیں۔

ان کی آواز میں قدرے لکنت تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ غالباً اس لیے یہ کانفرنس میں حیدرآباد سے تھے اور دہلی کی ملازمت اور دہلی سیتاپور آنے جانے کا خرچ وہ کیا کرتے ہوں گے۔ آپ، اعظم گڑھ اطراف میں بولتے ہیں۔

ان کے یہاں ان کا اپنا طرز استدلال تھا۔ وہ دیانت پر قائم رہتے تھے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ، ایک ایک لفظ ناپ تول کر ادا کر رہے تھے۔ پوری ذمہ داری کے ساتھ، مرزا دبیر کو صرف مثبت انداز میں پیش کر رہے تھے۔ اور اس کا بھی خیال رکھا تھا کہ مرزا دبیر کو میر انیس پر فوقیت نہ حاصل ہونے پائے۔

اسی طرح کانفرنسوں میں، میں انھیں سنتا رہا۔ کبھی ملاقات رہی، دراصل ان کو اس طرح دیکھتے رہتے تھے۔ جیسے ان کی جیب میں کینیڈا کا ٹکٹ ہے یا پھر نوٹوں کی گڈیاں۔

لیکن جو بات قابل غور تھی اور جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا وہ یہ کہ نہ تو ان کے لہجے میں جھلاہٹ آتی تھی نہ چہرے سے اضطراب ظاہر ہوتا تھا۔ وہ سب لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اس انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ کچھ باتیں خاص طور سے نوٹ کی تھیں مثلاً یہ کہ غیر ضروری باتیں نہیں کرتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ ایک بار بھی انھوں نے اپنے بارے میں جو اچھا نہیں لکھا یا۔ اصل میں جب آدمی زیادہ پڑھ لکھ جاتا ہے اور اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے درمیان وہ ہے۔ وہ اس سے بہت کم پڑھے لکھے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی کہہ دینے میں مضائقہ نہیں ہے۔

وہ بانکیالوجی کے "پروفیسر" ہو جاتے ہیں۔ یعنی عرف عام میں ڈینگ مارتے ہیں۔ اور خودستائی کے مریض ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح سے لوگوں کو مرعوب کریں اور اپنی علمیت کا سکہ جمائیں۔

ڈاکٹر عابدی کے یہاں یہ پہلو بہت نمایاں تھا کہ وہ اس صفت سے بالکل مبرا تھے۔ وہ یہ تو ضرور بتاتے تھے وہ کتنے موضوعات پر کام کر رہے ہیں اور یہ کہ ان کی ذاتی لائبریری میں کس کس کتاب کا قدیم ترین متن ہے۔ لیکن کہیں بھی ان کی گفتگو میں انانیت نہیں جھلکتی تھی۔

الہ آباد کے ایک جلسے میں استاد محترم ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ان پر جارحانہ انداز میں کچھ درست اعتراضات کیے۔ بعض جگہ استاد بھی تقاضائے بشریت کا شکار ہوئے لیکن ڈاکٹر عابدی نے نہایت متانت، سنجیدگی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو یہ کہہ کے گویا قبول کیا کہ میرا مطالعہ محدود ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس میں مزید وسعت ہو۔

اس طرح کے واقعات سے ان کا پورا کردار سامنے آجاتا ہے۔ ادبی اعتراضات پر چیں بہ جبیں ہونا، پڑ پڑ کرنا، جھلانا، جیسے وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ ان پر ایسے اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں جو معلمی پر مبنی ہوتے ہیں۔

لیکن وہ یہ اعتراض پر ایسے مسکرا بہت اچھا مزہ یا سب کو جواب دے دیتے ہیں۔

''میں ضرور دیکھوں گا۔''

''آپ نے متوجہ کیا۔''

''میں ممنون ہوں۔''

میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں سے سنوں شاید ''مشکور'' کہا ہیں لیکن وہ ممنون ہی کہتے رہے۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں الفاظ کے انتخاب کا بھی سلیقہ ہے اور وہ لفظ کو معنی پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

یہ سارے پہلو بعد میں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں ان سے ملاقات کے ردعمل کے طور پر سامنے آئے۔ لیکن جو قربت مجھے حاصل نہ رہی جاننے والے وہ سب تحفظ رکھنے والے شخص نہیں ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا حصار بند نہیں ہے۔ اس ترکیب سے چوٹیے نہیں۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ ہمارے ان کی معنویت بہت اہم ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ہی سب کچھ لے جاتے ہیں اور خود اپنی تنہائیوں کے قلعے میں بند رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم محفوظ ہیں۔ وہی ان کا پوشیدہ پن بار بار ایسے لوگوں کو انگریزی میں (Reserved) کہا جاتا ہے۔ میری بدقسمتی ہے میں انگریزی سے بہت کم واقف ہوں۔

ریزرو کا مزاج میں یہ تو خاصہ Reserve ہوتی ہے۔ ہر شخصیت کو اس طرح سے خانوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ تنہا ہی سب قلعہ بندی حالات یا اپنی ذات میں بعض فوائد سے ساری قلعہ بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس لیے ادبی دنیا میں ہے کہیں میں Reserve نہیں۔ ملتے ہیں، خوش اخلاقی میں، لیکن بڑھ کے ملتے ہیں۔ اور اپنے ذاتی غم کا کسی پر تعلق سے تاثر میں سنجیدگی ضرور ہوتی ہے۔ اظہار مطلب میں ملتا ہے۔ لیکن وہ ذاتی طرح

سے ایک شعر یاد ہے۔

رسمِ تعظیم نہ رُسوا ہوجائے
اتنا مت جھکیے کہ سجدہ ہوجائے

اسی سبب ان کی گلابی شخصیت کے رہ بہت مشہد کی کلیاں منڈلا پاتی ہیں ان کے مزاج میں شائستگی، نفاست ضرور ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ یہ ضرور سرحدوں تک پہنچ سکے۔ دراصل ان کے یہاں چھچھورا پن نہیں ہے۔ وہ فرقہ جنس زباں مایہ تو نہیں سمجھتے مگر اتنے ارزاں بھی نہیں ہیں کہ ہر کس وناکس ان کے حلقہ احباب میں باریاب ہوجائے۔

ڈاکٹر علی حیدر نے مجھے متوجہ کیا کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر ضرور روشنی ڈالیے کہ ایک شخص حیدرآباد اور دہلی کا تربیت یافتہ ہے۔ ان تہذیبی اقدار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جب کہ ان کی ساری زندگی امریکہ، کینیڈا، لندن اور یورپ میں گزری ہے۔ لیکن نہ تو ان کے لہجے میں نہ عادتوں میں نہ اقوال میں اور نہ ہی مزاج، نہ سرشت میں کوئی ایسی تبدیلی آئی جو ہندوستانیت سے انھیں الگ کردے۔

آپ گھنٹوں بات کرتے رہیں۔ نہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ آدمی اپنے اپنی رہائش کے اعتبار سے یورپین ہے۔ وہی مہذب و متین لہجہ جو اتر پردیش کے ساتھ مخصوص ہے وہی آپ کو ڈاکٹر تقی عابدی سے سنائی دے گا۔ وہ ان تہذیبی اقدار کو ور اس تہذیب کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتے جو انھیں گنگا کے پانی سے دھل کر اور جمنا کے پانی سے نکھر کر ملی ہے۔ وہ اس لحاظ سے اثاثہ ہیں کہ ان سے مل کے یوپی کی قدیم تہذیب کا نمونہ اور ایک روشن شمع سامنے آجاتی ہے۔

بے اختیار زبان پر یہ مصرعہ آجاتا ہے۔

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہیں ہم

اور ایسا لگتا ہے جیسے منظر نے انھیں کے لیے کہا تھا۔

"یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ"

ایک پہلو اور عرض کرنا ہے۔ دورِ حاضر میں کسی فرد کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ صرف یہ نہ دیکھا جائے اس میں کیا صفات ہیں بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کن کن نعمتوں

سے بڑی ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے خدا کے فضل سے اختر زرد و نہیں لکھا۔ بلکہ یہ سمجھتے کہ اپنی اہلیہ کے علاوہ کسی کی اختر کو نہ جانا نہ تا کا۔ وہ صرف اسی سلسلے میں مضبوط کردار کے آدمی ہیں بلکہ دوسری انسانی صفات سے متصف ہیں۔ ہمدرد، دل نواز اور لوگوں کے کام آنے والے شخص ہیں۔ وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بھی ان سے حاجت بیان نہ کرنے پائے۔ اس سے پہلے کہ وہ بیان کرے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

ہمارے دوست ڈاکٹر علی حیدر نجمی جو کہ مجھے پیار سے "خطاب" کہتے ہیں۔ اور مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کو "خطاب" دیتے ہیں اس آدمی کو آپ یہ خطاب دیں گے۔ علی حیدر اتنی زور سے ڈانٹ کر پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی جواب بھی میرے ذہن میں ہوتا تو وہ فراموش ہو جاتا۔ میری خاموشی پر ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہوتا ہے۔ یہ خاموشی ہے پر تکمیل اعتراف کا۔ اور مجھے ان کی بات ماننی پڑتی ہے اس لیے ڈاکٹر عابدی اپنے مشاغل کے اعتبار سے بھی ایک منفرد شخصیت ہیں لیکن جب وہ کانفرنس میں آتے ہیں تو اس وقت ان کی حیثیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ ان کی سب سے زیادہ شہرت "مرتب متن" کی حیثیت سے ہے۔

ان کی ساری کتابوں کے نام مجھے بھی یاد ہیں پر قلم ہوں۔

ڈاکٹر عابدی شاعر بھی ہیں۔ اور میری یہ قسمت کہ مجھے ان کا ایک شعر بھی یاد نہ ہو۔ وہ علم بیان اور علم بدیع پر بھی دسترس رکھتے ہیں یہ وہ موضوع ہیں جس سے شاعر اپنی آبیاری کا سامان کرتا ہے۔ اور شاعر اپنی خامیوں کو تاویلوں، علم بدیع و بیان سے وقتیت کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت خواہ بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے یہاں تحقیقی شعور بالکل اسی طرح سے لیا ہے جس طرح ونیا رسٹیوں سے پروفیسر حضرات میں ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پروفیسر صاحبان تحقیق کو Retreeship اور Examinership کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عابدی سے یہاں اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔

وہ بڑی شان اور آن بان سے سب کے سامنے اپنے قول پر قائم ہیں۔ یہ ہمارے

پہلو اپنی جگہ پر لیکن اُردو کی ادبی دُنیا میں ان کا شمار صف اول کے محققین میں ہوتا ہے۔

وہ قاضی عبدالودود کی طرح ریاضی محقق نہیں ہیں۔ نہ وہ اقلیدس کے خطوط اور نہ ہی فیثا غورث کی اشکال (Pythagoras Theorem) سنتے ہیں۔

ان کے یہاں تلاش ہے۔ دریافت ہے اور فراموش شدہ متون کی بازیافت ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست سے ہر کوئی واقف ہے۔ مجھے الگ سے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالنی ہے۔

وہ اب تک ادب کی صرف ایک صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ ہے ''رثائی ادب'' عام لوگوں کی طرح سے ان کی تحقیق ''تو چہ محسوس'' تحقیق نہیں ہے کہ جہاں ایک لفظ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے ٹھ لے کر دوڑ پڑے۔ بلکہ وہ بہت ہی متین انداز میں ادب کی صرف ایک صنف یعنی مرثیہ پر اپنے تحقیقی کارنامے بھی پیش کرتے رہے۔ اور ان کی بعض دریافتیں ایسی ہیں۔ جو انھیں ہمیشہ ادب میں زندہ رکھیں گی۔ ان کا علمی، ادبی سرمایہ اس اعتبار سے قابل اعتبار ہے کہ انھوں نے صرف رثائی ادب کو اپنا میدان بنایا۔ اور اسی جگہ قلم اٹھایا۔ جہاں ان کے پاس معلومات کا بیش قیمت خزانہ تھا۔ اور اس سلسلے میں جو ان کا مجموعی کردار رہا ہے یعنی جزوی اور حسیت سے بریدہ ہی کردار یہاں بھی نظر آتا ہے۔

ان کی تحقیق میں بھی سنجیدگی نہیں ہے۔ فضول خرچی بھی نہیں ہے۔ وہ تعین اور (Disc pline) کے ساتھ تحقیق کے میدان میں سرگرم رہتے ہیں۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا تجزیہ بذات خود تحقیق کا ایک موضوع ہے۔ بلکہ مجموعی اعتبار سے جیسا عرض کیا گیا۔ وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ صرف موضوع سے متعلق رہیں۔

ادھر ادھر کی پیش نہ ہائیں اور جن موضوعات سے انھیں دلچسپی نہیں ہے اس پر قلم نہ اٹھائیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی اُردو تحقیق کے لیے خصوصاً ''رثائی ادب'' کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ افتخار ہیں۔ انھوں نے اب تک ساٹھ کے قریب تالیفات پیش کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر مستند اور پایۂ اعتبار سے مستحکم تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور اسی لیے ڈاکٹر تقی عابدی اردو تحقیق کے دور حاضر کے ایک اہم متون ہیں اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا۔

سید افتخار حیدر

(تعارفی مضمون برائے جلسہ ادبی ایوارڈ ایسٹرن نیوز، ٹورنٹو، کینیڈا)

ڈاکٹر سید تقی عابدی

وہ اردو کی مجلسوں میں اردو بولنے والے ڈاکٹر جناب سید تقی عابدی صاحب سے میرا تعارف ان کے مضامین کے علاوہ میرے بڑے بھائی جناب ڈاکٹر سید جاوید حیدر صاحب کا احسان ہے۔ بھائی صاحب کا حکم صادر ہوا کہ میں اس دشت جنوں کے مسافر سے ضرور ملوں۔ ساتھ ہی انھوں نے میری شاعری کے دونوں مجموعے "صبح دل" اور "سوز ازل" بھی انھیں بھیج دیے۔ لیکن ایک ہوش و حواس کے ایسے کی دشت ویراں میں صاحب جنوں کی تلاش بڑا کٹھن میں خدا ڈھونڈنے سے نہیں ہوتی۔ صاحب جنوں بھی ایسا جو ہمیشہ سے بحر قلزم کا پاسبان ہو۔ اگرچہ میں خود بھی خرد کی گتھیاں سلجھائے بغیر اپنے صاحب جنوں ہونے پر بضد تھا لیکن تحیر اور دنگی کی بھی حد ہوتی ہے اور مجھے حضرت سید شاہ صاحب کی یہ نصیحت بھول چکی تھی کہ "شیخ صاحب راستے کا دعویٰ ایسی نہیں ہوتا" اور یہ سیدھے بغیر نہ کبھی کسی کا کام نکلا ہے اور نہ نکل سکتا ہے۔ مجھے بھی جناب پروفیسر عون احمد زیدی صاحب کی دعا سے سیدھے راستے میں مدد ملی اور میرے مشفق حضرت علی مایا السلام سے حسن ولایت پر جناب ڈاکٹر تقی عابدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت سے آج تک انھوں نے میری پذیرائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ دشت جنوں میں قدم قدم راستے نہیں ہوا کرتے۔ یہاں تو صرف جذبات، احساسات اور خیالات کا تعین رہتا ہے۔ جذبہ اور آگہی سے بھرا ہوا

اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کی طرف وہ دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

آخر کار وہ اور میں خود چل کر ہمارے قطب شمالی (نیو مارکیٹ) میں آباد ہوئے۔

اب جس کی ہمت ہے اور وسائل میسر ہیں جا کر مل لیا کرے، عشق کی راہ کوئی آسان تھوڑی ہوتی ہے۔ جب سے آپ یہاں آئے ہیں، اتنی بار خود نظر نہیں آئے جتنی بار ان کے کارہائے نمایاں کے جلوے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کرتے رہے۔ انشاء، اقبال، انیس، دبیر سے ان کو کہاں فرصت جو ادھر ادھر دیکھتے۔ "سوز ازل" کا شعر ہے ؎

ان کو زیبائش سے کب فرصت ملی، جو دیکھتے
کس قدر ہے اس طرف عشاق کی حالت زبوں

وہ شہر سے اس لیے بھی دور چلے گئے کہ

اب کہاں، وہ سنگ ریزی اور دشنام عدو
حیدر اس کوچے میں اب کس کام آئے گا جنوں

ایک بہت بڑے مکان کے بہت ہی چھوٹے سے کمرے میں ایک چھوٹی سی چارپائی کے ساتھ ایک کلرک مارکہ میز کرسی پر نہایت عاجزانہ انداز میں صحرا اس سے بھی کشادہ وسعت خیال لیے، تخلیق، تحقیق، تنقید، ترتیب و تالیف کا عمل عبادت کرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی بات ہو جائے تو حالات حاضرہ سے بے نیاز، کسی نہ کسی کتاب، جس پر کام کر رہے ہوتے ہیں، اس کے محاسن کو ایسی داستان چھیڑ دیتے ہیں کہ آپ اگر خود بھی وہ کتاب پڑھ لیتے تو ایسے باریک نکات تک آپ کی رسائی شاید ہی ہوتی۔ آپ کے ساغر میں پورے کا پورا میخانہ انڈیل دینا چاہتے ہیں۔ ایسے ایسے تڑپا دینے والے پہلو اجاگر کرتے ہیں کہ انسان ان کی قلبی کیفیات اور ان کے پاکیزہ جذبات کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک دن فرمانے لگے "حیدر بھائی! چادر کے موضوع پر اس سے بڑا شعر میری نظر سے نہیں گزرا جو موسس لکھنوی کہہ گئے ہیں وہ شعر یوں ہے ؎

ردائے بنت زہراؑ لوٹنے کو لوٹ لی لیکن
پشیماں بھی ہوئے ہوں گے چادر دیکھنے والے

سوائے کائنات کی معصومہ صاحبزادی کی چادر تطہیر کو مال غنیمت سمجھ کر لوٹنے والے ملعونوں کی ایسی پشیمانی کا علاج جہنم میں آگ کے سوا بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک روز فرید لکھنوی صاحب کے فن شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان

کا ایک کمال فن پر فوقیت مصرع سنایا کہ

گردن کے ساتھ کٹتا ہے رستہ بہشت کا

ان سے جب کبھی بات ہو تو یہ پوچھنا نہیں پڑتا کہ ان پر آن کل کس تخلیق کا جنون سوار ہے۔ ان کی گفتگو خود بخود خوب صورت اور فیصلہ کن انداز میں اس شوق جاری ہو جاتی ہے۔

آپ کا ندرِ فکر و عمل یہ کہ ارمغانِ اقبال سے دشت جنوں میں ملاقات ہو جائے تو "اقبال سے عرفانی زاویے" جیسی عارفانہ تصنیف شائع ہو جاتی ہے اور سرمایۂ سخن میں اقبال سے دو سے پہلو میں جا بیٹھیں تو "شکوہ، جواب شکوہ کا تجزیہ" پیش کر دیتے ہیں۔ "اقبال سے عرفانی زاویے" میں شامل مضامین سے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیں "اقبال کی [illegible] "علامہ اقبال فنی رموز" "علامہ اقبال اور بیدل رموز" "علامہ اقبال کی تخلیقی شاعری" "اقبال کا تصورِ زمان و مکان"۔ ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کتاب سے بازار میں جنس کے خریدار ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء پر کتاب لکھنے کی وجہ [illegible] مشہور ادبی شخصیت سے منسوب کرنے کی بجائے آپ کی صاحب دیوان شاعرہ ہونے سے نام یا درستی کی تختہ مشق کا ایک عجیب و غریب تعارف کروایا۔ اس تختہ مشق کتاب کے دوران (1)(2) ہے پی ایچ ڈی طلبہ بنفسِ نفیس آپ کے گھر تشریف لے آئے اور آپ کا تعارف کروایا (شعر میں کتاب اور طلبہ کی نسبت غور طلب ہے)

بندہ پوتا ہے انشا
شک نہیں اس کی خاکساری میں

[illegible] صاحب دیوان شاعرہ کی قریب سے دیکھیں ان کی ذات میں وہ جذبے سب سے نمایاں نظر آتے ہیں جو [illegible] سے اردو زبان۔ پنجتن پاک اور اس اہلبیت علیہ السلام سے تعلق نے اور اردو زبان سے والہانہ عشق سے اظہار کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے پیار کرتے ہیں۔ آپ کی تصانیف "رموزِ شاعری" اور "اقبال اور اردو زبان" سے آپ کی والہانہ محبت کی دلیل ہیں۔

اپنی زبان دانی کو اظہار عشق کا ذریعہ بنانے کا بہترین مظاہرہ انھوں نے اپنی تالیف ''یادگار انیس'' میں کیا ہے۔ میر انیس کے ایک مشہور ترین مرثیے کو اپنے ممدوح کے عقیدت مندانہ طواف کا بہانہ بنا کر ڈاکٹر صاحب، اس مرثیے کے بند کے حسن کو چوستے چلے گئے اور ایک کتاب مرتب ہوتی چلی گئی۔ عشق سوا یہ کام ممکن نہیں، 804 صفحات پر مشتمل ہر اعتبار سے خوب صورت ترین کتاب میں حیات انیس، میر انیس مشابہ شعر و ادب کی نظر میں، یادگار مرثیہ کے متعلقات، شہدائے کربلا کی تعداد کی نسبت سے مرثیہ کے 72 منتخب اشعار اور پھر ان میں سے منتخب نورتن اشعار جیسے

قرآنِ رحل زیں سے سر فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

اور پھر ان نورتنوں میں سے ایک حاصل مرثیہ شعر

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا
اُمت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداً

ایک بیٹی کا اپنے باپ سے، اسی کی امت کے ہاتھوں کیے جانے والے اس قدر بھیانک ظلم کا بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔ جنگل، فاطمہ، صدا، امت، لوٹ اور وا محمداً کے الفاظ میں اتنی بڑی داستان کو جس سادگی، خوب صورتی اور جامعیت کے ساتھ پرو دیا گیا ہے وہ محض انیس ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ پر اعتراضات کے جوابات، تجزیے کی مکمل جدول جس میں مرثیہ کے 2129 محاسن اور صنعتوں کی تعداد درج ہے۔ عربی ترجمے کا نمونہ، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کا کیا ہوا مکمل انگریزی ترجمہ ایسے لگتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے انیس کے مرثیے کو اپنی جیب میں خوردبین کے نیچے رکھا ہو ہو۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ کوئی ان کا ذرہ برابر بھی مددگار ہوا ہوگا تو اس کی جزا اسے داد و تحسین ضرور عطا کریں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی کتابوں پر انتہائی موقر اور نامور اساتذہ نے تبصرے کیے ہیں، جن کے ہوتے ہوئے اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس علمی سرمائے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ یہ کتابیں ہر گھر اور ہر لائبریری کی زینت بن سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل فہرست میں ان کی کتابوں کے ناموں سے ہی آپ کو ڈاکٹر صاحب کے

مضامین کی نوعیت اور ان کی علمی ادبی وسعت کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔

1	''شہید''	(1982ء
2	''جوش مودت''	(1999ء
3	''کاشن ریا''	(2000ء
4	''رمز شاعری''	(2000ء
5	''عروض تین''	(2000ء
6	''اقبال کے عرفانی زاویے''	(2001ء
7	''نشاط النساء نشاط''	(2001ء
8	''تجزیہ یا کارانیس''	(2002ء
9.	''اظہار حق''	(2003ء
10	''[illegible]''	(2004ء
11.	''مجتہد نظم مرزا دبیر''	(2004ء
12.	''سلک سلام دبیر''	(2004ء

زیر اشاعت کتابیں:-

1. تجزیہ شکوہ جواب شکوہ
2. ابواب المصائب: مرزا دبیر
3. [illegible]
4. [illegible]

[illegible]

پیش کیا ہے۔ اپنے ان کلمات تحسین کو میں ڈاکٹر صاحب کے ہی دو عمدہ اشعار پر ان کے زور قلم میں خ فے کی دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

چاند سورج تیری تسبیح کے دانوں کی طرح
گردش چرخ میں کرتے ہیں عبادت تیری

•••

ایسی نورانی نظر دے دے تقی کو مہدی
جس سے وہ کرتا رہے ہر جا زیارت تیری

علی احمد فاطمی

ڈاکٹر سید تقی عابدی پر دو کتابیں

اس میں شک نہیں کہ پندرہ بیس برسوں میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اپنی انتھک محنت، تحقیق، تنقید سے تعلق سے گہری عرق ریزی، علم و ادب کی غیر معمولی معلومات پھر مختلف موضوعات پر کتابوں کی اشاعت نے پوری اردو دنیا کو حیران کر دیا ہے اور بعض لوگوں کو پریشان بھی۔ حیرت کی بات تو ہے کہ ایک ہی وقت میں فکشن، تنقید پر یکساں کام کرتے ہیں تو دوسری طرف غالب، اقبال، فیض، جگر، رشید، حالی، اقبال، فیض وغیرہ پر بھی مستند کام کر جاتے ہیں۔ شاعری کی ہر صنف پر بھی لکھتے اور شاعری بھی کرتے رہے، علمی ادارہ کانگریس کا انعقاد کرتے اور دوسرے کام کرنے والوں کا اعتراف اور حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ یہ سب کچھ ایک انسان کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن تحقیق و تنقید، تصنیف، صداقتوں اور حقیقتوں کا عرفان حاصل کرنا اور بات ہے اور ان کتابوں کا اہل علم و دانش کے درمیان مقبول ہونا اس سے بھی بڑی بات ہے یہ قوت اور ہمت ہی مجھ میں ہے کہ ان کاموں کا حساب کتاب کرے، ان کا تجزیہ کرے اور اس کی پذیرائی بھی کرے۔

یہ ممکن ہے کہ یہ عمل کسی کے لیے تماشہ ہو لیکن تقی عابدی کی خدمات سے جو لوگ واقف ہیں وہ ان کی کتابوں کو بڑی گہری نظر سے پڑھتے ہیں ان میں ایک پختہ تلاش اور جستجو کی لگن نظر آتی ہے۔ یہ کتابیں ہیں، ان کی ڈاکٹر تقی عابدی حیثیت اور شخصیت کی تحقیق، ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور قلم کار۔

قابل مسرت یہ ہے کہ ان میں سے ایک کتاب پہلی بار ہندوستان سے شائع ہوئی ہے اور دوسری پاکستان میں۔ پہلی کتاب تقی عابدی سے علمی و ادبی کارنامہ کی

شہرت عالمی ہو چکی ہے۔ اور کیوں نہ ہو ان کی اصل اقامت کینیڈا میں رہی ہے۔ ان کا ایک قدم کینیڈا میں رہتا ہے لیکن دوسرا پاکستان میں، ہندوستان میں۔ امریکہ میں غرض کہ جہاں جہاں اردو ہے وہیں وہیں ڈاکٹر تقی عابدی کے جلوے ہیں۔ صرف ماہ قوں یا رابطوں پر نہیں بلکہ اپنے کاموں سے، کتابوں سے۔ یہ بڑی بات ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں، لیکن یہ بھی ہے کہ نصیب آسمان سے نہیں اترتا ہے۔ ہمہ دان رات کی غیر معمولی ریاضتوں، محنتوں، لگن جاں فشانی سے بنتا ہے۔ تب جا کر یہ اعتراف ہے ورنہ اپنے آپ میں غرق یہ خود غرض دنیا کب کس کا آسانی سے اعتراف کرتی ہے۔ آیئے ان کتابوں کا تعارف پیش کریں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پہلی کتاب "ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت نقاد و محقق" ہے۔ جسے لکھا ہے نوجوان ادیب محمد رکن الدین جو شعبہ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو دو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن یہ تحقیقی مقالہ کی پی ایچ ڈی والے ابواب نہیں ہیں بلکہ ایک ایک باب جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگار کی یہ مجبوری بھی ہے اس لیے کہ کتابوں کی فہرست اور کاموں کی طوالت اسے مجبور کرتی ہے۔ ابتداء مصنف محقق کے تعارف کا یہ انداز دیکھیے۔

"تقی عابدی پیشہ سے طبیب (ڈاکٹر) ہیں۔ موجودہ وقت میں فزیشین (Physician) کے ساتھ ساتھ اعضائے انسانی (Intern) اور ماہر امراض قلب ہیں اور طبابت کے پیشے سے ہیں۔ عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے خاص طور پر تحقیق و تنقید ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ تحقیق و تنقید، تدوین و ترتیب کی صورت میں اب تک ان کی (۱۰) سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ابھی حال ہی "کلیات حالی" کی شکل میں سات جلدوں میں الطاف حسن حالی کی فن و شخصیت، تصانیف اور نقد و شاعری پر مشتمل اب تک کی سب سے مستند اور معتبر کتاب شائع ہو چکی ہے جو اردو ادب میں حالی فہمی کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ تقی عابدی موجودہ وقت میں اردو تحقیق و تنقید میں بہت مستند و معتبر نام ہے۔"

ان جملوں سے صد فی صد اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یہ اندازہ بھی لگایا

جا سکتا ہے۔ ایک محقق یا تجزیہ نگار کے لیے عابدی صاحب کے تمام کاموں کا احاطہ کس قدر مشکل کام ہے تاہم اس نوجوان نے اپنی بساط بھر اوّل "کلیات غالب فارسی" کا تجزیہ تیس صفحات میں جائزہ لیا ہے۔ 15 صفحات میں فیض کی ایک مرثیہ کا 15 صفحات میں "رباعیات فیض" کا تجزیہ کیا۔ بارہ صفحات میں رباعیات اور بارہ صفحات میں تحقیق لکھنوی کا ذکر ہے۔ علامہ اقبال پر لکھی گئی کتاب "چوں مرگ آید" دس صفحات، "کائنات نجم" پر دس صفحات، اور رشید لکھنوی پر بارہ صفحات، دوسرا باب میں یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرے باب میں "عرض حال" تیس صفحات، "ذکر یاران" 26 صفحات، "سید فخر" 21 صفحات، "قبلہ پروفیسر زاہدی" 20 صفحات، "رموز شاعری" 16 صفحات اور "فیض فہمی" 20 صفحات ہے۔ اس میں حامی فہمی سے متعلق کتابوں کا ذکر تو ہے لیکن تجزیہ نہیں۔ اس سے باوجود اس کتاب کی ضخامت تقریباً 367 صفحات ہوئی ہے۔ ابتداء میں تقریباً 8 صفحات میں عابدی سے اقوال و موقف پیش کیے گئے ہیں۔ درمیان میں مصنف نے بحیثیت مجموعی اپنے نتائج اور تجزیہ بھی کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"عابدی صاحب نے تحقیق اصول و نظریات کی پابندی کی ہے۔ ان کی تمام تحقیقی تصنیفات و تالیفات میں ان اصولوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔"

اسی ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں

"عابدی صاحب نے تحقیق کے جن اصولوں کو اپنے تحقیقی کام کی بنیاد بنایا ہے ان کی پابندی کرتے ہوئے چند برسوں کے اندر انہوں نے متعدد تحقیقی کتابیں پیش کر کے تحقیق کے میدان میں اپنے لیے جگہ بنالی ہے۔"

یہ سب تحقیق کے بارے میں ہے اب ذرا ان کی تنقید کے بارے میں بھی کچھ کہتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر سید عابدی کی تنقید میں متوازن اور متوسط تنقید کی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر سید عابدی کا شمار ہندوستان میں ان چند تنقید نگاروں میں ہوتا ہے جن کے یہاں نظریاتی تنقید سے زیادہ عملی تنقید کا اچھا نمونہ ملتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں عملی تنقید کی اہمیت حاصل ہے۔"

آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں

"عہد حاضر میں سائنسی طریقہ کار بھی عملی تنقید میں کافی معاون و مددگار ہے۔ جسے جدید تنقید کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تقی عابدی نے بھی اپنے تنقیدی مضامین میں جدید تنقیدی نظریات سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔"

نوجوان مصنف نے خود بھی ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سادہ اور اثباتی رخ اپنایا ہے جو ضروری تھا اس لیے کہ عابدی صاحب اصناف کلاسیک کے محقق و ناقد ہیں۔ جدید تھیوری مابعد جدید سیاق و سباق سے ان کو جانچنا پرکھنا مناسب نہ ہوتا۔ عابدی صاحب کی مختلف و متنوع کتابوں کو ایک کتاب میں سمیٹنا و محاسبہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن رکن الدین نے اس مشکل مرحلہ کو بہ آسانی طے کرلیا۔ شاید نوجوان کی اسی محنت اور لگن کو دیکھ کر ان کے استاد پروفیسر خواجہ اکرام الدین یہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔

"ڈاکٹر تقی عابدی پر لکھی گئی کتاب رکن الدین کی عظیم تحقیقی کاوش ہے جس میں تقی عابدی کی جملہ تصنیفات و تالیفات اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب تقی عابدی کی ادبی خدمات کے باب میں دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگی۔ میں بھی اس نوجوان کو اس مشکل کام کے انجام دینے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ زیر تبصرہ کتاب پاکستان کی شائع شدہ پہلی کتاب ہے جو اسلام آباد کے ایک کالج میں لیکچرار ہیں اور پی ایچ ڈی کر رہی ہیں جن کے استاد پروفیسر شاہد اقبال کامران ہیں جو اقبالیات کے ماہر ہیں، غالباً اسی لیے انھوں نے اپنی شاگردہ سے تقی عابدی کی اقبال شناسی پر کام کروایا اور شاذیہ نے نہایت عمدہ طریقے سے یہ کام انجام بھی دیا۔ 32() صفحات پر مشتمل اس مقالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب کا تعلق تقی عابدی کی سوانح سے ہے لیکن اس سوانحی باب میں بھی مصنفہ نے عابدی صاحب کی "انیس شناسی"، "غالب شناسی" اور "فیض فہمی" وغیرہ کا ذکر کرکے ایک طرح سے اقبال شناسی کے لیے علمی پس منظر تیار کیا ہے۔ اس کے فوراً بعد مصنفہ نے عابدی صاحب کے اقبال کے تعلق سے ان کی پہلی کتاب "چوں مرگ آید" کا توضیحی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا

ہے جو بے حد اہم ہے۔ "چوں مرگ آید" اپنے آپ میں اقبالیات کے سلسلے میں ایک منفرد کتاب ہے جو شعبۂ اقبالیات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس اقبال کی عمر کے آخر میں مختلف امراض کا تعاقب کرتا ہے۔ چوں کہ ڈاکٹر عابدی پیشے سے ڈاکٹر ہیں اس لیے یہاں ان کا قلم اور ذہن خوب چلا ہے اور بڑی باریکیوں سے اقبال کے امراض کا تجزیہ کیا ہے۔ نیز ان کے شوق، مطالعہ، عادتیں بھی جھلک آئے ہیں۔ شاید ہی کسی مصنف نے اقبال کے آخری ایام کا اس تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جس سے اقبال کے ان سے متعلق مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

باب سوم میں اقبال سے متعلق عابدی صاحب کی دوسری کتاب "اقبال کے عرفانی زاویے" ہے۔ اس کتاب کا تعلق مذہبیات سے ہے اور عقائد اقبال سے، اقبال کا عشق رسول اور آل رسول۔ مصنف نے اپنے طور پر اقبال کی نظموں اور قصیدوں کا تجزیہ کیا ہے۔ یہاں بھی قدم قدم پر حوالے ہیں اور مستند حوالے۔ بعد میں تقی عابدی، لیکن تقی عابدی کے ساتھ ساتھ دیگر علماء کے بیانات بھی ہیں۔ کہیں کہیں ایسے جملے بھی ملتے ہیں۔

"ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی نعتیہ شاعری میں یہ واضح کیا کہ آپ کی تعلیمات سب سے پہلے مسلمان عورتوں کو آپ نے برابری کے حقوق دلوائے۔ اقبال کو بھی عورت کی آزادی اور حقوق سے خاص شغف تھا۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ازدواجی زندگی، اقبال پر تہمت شراب نوشی وغیرہ۔ اقبال اور عالمی صورت حال کے عنوان کے تحت اقبال اور مسئلہ فلسطین، اقبال اور حیدرآباد کے موضوعات پر بھی عابدی صاحب نے مضامین قلم بند کیے ہیں۔

سب سے آخر میں شاذیہ گل نے تقی عابدی کی علمی زندگی میں مطالعہ اقبال کی اہمیت و معنویت کیا ہے اس پر فرانگیز اور نتیجہ خیز گفتگو کی ہے۔ "چوں مرگ آید" کے بارے میں شاذیہ کی رائے ہے۔

"اس کتاب کا لفظ لفظ خطوط کے مستند آئینے میں پڑھ کر مرتب کیا گیا ہے جو اقبالیات کے طالب علموں کے لیے ایک بڑی قدر سرمایہ ہے۔"

دوسری کتاب "اقبال کے عرفانی زاویے" کے بارے میں رائے ہے۔ "ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "اقبال کے عرفانی زاویے" علامہ محمد اقبال پر اکتیس متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں 180 صفحات ہیں۔ اس کتاب میں تقی عابدی نے اقبال کی فکر کو مکمل جامعیت کے ساتھ رقم کیا ہے۔

اور آخری جملہ تو واقعی حیرت میں ڈالتا ہے

"کینیڈا میں بیٹھ کر اردو کے ایک شخنیم ذخیرے کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں۔ اقبال کی فکر اور شخصیت پر تقی عابدی نے بہت ہی سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہے۔"

تقی عابدی جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں پوری سنجیدگی اور لگن سے انجام کو پہنچاتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔ کینیڈا میں میں نے خود ان کے ذاتی کتب خانے سے فیض حاصل کیا ہے۔ ایسا مرتب اور خانہ بند کتب خانہ میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ ان کا کتب خانہ، ان کا کام کرنے کا طریقہ، ایک ایک چیز پر نگاہ دنیا کے دوسرے کتب خانوں پر ان کی نگاہ، ان سے رشتے اور رابطے غرض کہ سب کے سب حیرت انگیز بھی اور سبق آموز بھی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کام اسی جنون اور لگن سے ہی ہوتے ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ تقی عابدی کے بڑے کاموں کا معرفتی اور تحقیقی جائزہ لیا جائے جس کا سلسلہ ان دو کتابوں سے شروع ہو چکا ہے۔ میں ان دونوں کتابوں کے مصنفین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر شہناز قادری
جموں

اُردو میں مہجری ادب
کا پہلا مجموعۂ مکاتیب ''بنامِ تقی عابدی''

مکتوب نگاری کا فن اردو کے نثری سرمائے کا ایک لطیف ترین فن ہے۔ مکاتیب کی ترتیب و تدوین کا کام اردو ادب میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ مکاتیب کی وہ مرتبہ تحریریں ہیں جن میں ہمیں مشاہیر ادب کی زندگی کے گوشوں پر ان کی مکاتیب کو پڑھنے کے بعد ان سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ مکتوب نویس اپنے خط میں مکتوب الیہ کی ادبی شخصیت کے تئیں دلوں سے بے تکلف پروہ کرتا ہے اور ان کے سامنے تخلیقات جانب نظر اور جانب توجہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ جہاں تک علمی و ادبی شخصیات کی بھی تعلق ہے ان کے ضمن میں خطوط ایک معتبر ترین حوالہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مکاتیب کی ترتیب و اشاعت اس نے بھی فیصلہ ہم ہے کہ اس سے جہاں مکتوب نویس کی تحریر کا جائزہ لیا جاتا ہے وہیں مکتوب الیہ کی شخصیت و فن پر بھی پہلو بہ پہلو روشنی پڑتی ہے۔

زیر نظر کتاب بنام تقی عابدی ان خطوط پر مشتمل ہے جو سید تقی حسن عابدی (تقی عابدی) کے نام مشاہیر ادب نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے ہیں۔ ان خطوط میں تقریباً ڈھائی سو خطوط ایسے ہیں جو تقی عابدی کے قبل مطبوعہ نام تحریر کیے گئے ہیں۔ ان خطوط پر اعتبار ان کے لیے ہیں کہ ان میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جن پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ان خطوط کے بارے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ خطوط مشاہیر ادب نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے ہیں جن میں ولی ترتیب نہیں پائی جاتی ہے۔

بذریعہ وائس میپ، ای۔میل، فیس بک وغیرہ سے ملا ہو۔ ایک اور اہم بات "مکاتیب بنام تقی عابدی" کے بارے میں یہاں بتانا لازمی ہے کہ تقی عابدی سے نام خط و تحریر کا ایک لمبا سلسلہ کئی دہائیوں سے چلا آرہا ہے لیکن اسے ادب کی بدنصیبی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ موصوف نے اپنے نام لکھے گئے خطوط کی ایک بڑی تعداد وقتاً فوقتاً تلف کر دی یعنی ان خطوط کو سنبھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے ہم ایک اہم ادبی سرمایے سے محروم ہو گئے۔ البتہ اب جتنے خطوط محفوظ تھے انھیں منظر عام پر لانے کی کافی وجہیں ہیں اسی لیے ان کی ترتیب و تدوین کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان خطوط کی اشاعت سے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہ خطوط مکتوب نویسی کے اسرار و رموز کی عمدہ مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ اس کے لیے علاوہ مکتوب نگاروں کے سابقہ تحریر سے قارئین کو آگاہی بھی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خطوط علم و ادب کا ایک بیش قیمت اثاثہ بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں مکتوب الیہم یعنی دور حاضر کے ایک بہت ہی رشید و ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ خطوط موصوف کے فن اور شخصیت کے تمام گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ بات بڑے ہی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ خطوط ادب اردو کا ایک پوشیدہ خزانہ تھے جسے منظر عام پر لانا از حد لازمی تھا۔

یوں تو مشاہیر و اکابرین ادب نے ہر قسم کے خطوط ڈاکٹر سید تقی عابدی کے نام تحریر کیے ہیں جن میں نجی، سرکاری، ادبی وغیرہ شامل ہیں تاہم زیر نظر کتاب میں خصوصاً ادبی نوعیت کے خطوط کو ہی خاص طور پر جگہ دی گئی ہے۔ ان خطوط میں مکتوب نویسی کے فن کے تقاضے بھی جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں اگرچہ طویل خطوط کی مثالیں بھی شامل ہے تاہم مختصر کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ طویل ادبی خطوط میں ڈاکٹر جمال الدین کے تحریر کردہ خطوط کے حوالے کو اس ضمن میں مثال کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً وہ خط جو ڈاکٹر جمال الدین نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو 12 رجولائی 2000ء میں ارسال کیا تھا۔ اس طویل خط سے قارئین ایک تو ڈاکٹر جمال کی عروض دانی سے واقف ہو جائیں گے تو دوسری طرف ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی شخصیت سے واقفیت حاصل کریں گے۔ یہ خط فن عروض کے سلسلے میں ایک مکمل اور مدلل

حوالے کا حکم رکھتا ہے اور اس کے مطالعے سے قارئین کو مرحوم والی کے سلسلے میں اضافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح پتہ خطوط سے مکتوب نویسی میں اختصار کی عمدہ مثالیں سامنے آتی ہیں۔ ایسے خطوط میں ڈاکٹر عتیق انجم کا 30 دسمبر 2010ء کا تحریر کردہ خط اور عزیز قریشی 05 دسمبر 2010ء وغیرہ جیسے خطوط کے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں زیر نظر کتاب "بنام قمر صدیقی عابدی" میں ایسے خطوط بھی شامل ہیں جن میں مکتوب نگار اپنی دلی خواہشات اور اپنے جذبات و احساسات مکتوب الیہ سے تین منظوم رسماً کرتے ہیں جو مکتوب نویسی کی دنیا میں ایک منفرد و قیمتی اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسے منفرد خطوط میں سے یہ خط 31 مئی 2010ء کا بشیر تمنا (جے پور) کا پیش پذیر بذریعہ پروفیسر سید رضا نمونتاً پیش ہے:

عزت مآب جناب ڈاکٹر سید قمر صدیقی عابدی ظلہ العالی کی نذر

ادب کے مطلع انور کا استقبال کرتے ہیں
شگفتہ جذبۂ اطہر کا استقبال کرتے ہیں
سخن کی صبح کے اختر کا استقبال کرتے ہیں
قمر صدیقی عابدی برتر کا استقبال کرتے ہیں
مداح فاتح خیبر کا استقبال کرتے ہیں
فدائے حیدر صفدر کا استقبال کرتے ہیں
نظر آتا ہے جن میں حضرت اقبال کا پرتو
ہم ایسی فکر کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں
خدا شاہد ہے یہ کہتے ہوئے کہتے ہیں
سخن فہم و سخن پرور کا استقبال کرتے ہیں
بہت کشمیر کے اہل ادب کو ناز ہے اس پر
حسین تخلیق کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں
بہت ممنون ہے جن کا [illegible] نہیں ملتا
مرے اشعار ہر منظر کا استقبال کرتے ہیں

زہے قسمت بشیر آتم کے یہ ساعت بھی آنی ہے
محقق کے حسیں جوہر کا استقبال کرتے ہیں

(شمیم، 31 مئی 2010ء)

اس کے علاوہ "بنام تقی عابدی" کے خطوط ہمیں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی حیات اور شخصیت سے بخوبی واقف کراتے ہیں۔ تقی عابدی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تہہ دار شخصیت میں بیک وقت ایک طبیب، شاعر، محقق، تخلیق کار اور تجزیہ نگار وغیرہ کی بے شمار جہتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ زیر نظر خطوط میں ان تمام جہتوں کی عکاسی اور تصویر کشی دیکھی جا سکتی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی اپنے ایک خط میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شخصیت کے تئیں یوں رقم طراز ہیں:

"سائنس اور طب مغربی سے وابستگی کے باوجود مشرقی علم و دانش اور اردو ادبیات سے آپ کا جو گہرا تعلق ہے اور ادبی کاموں میں جو آپ کا انہماک ہے وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل رشک ہے۔"

تقی عابدی کے نام لکھے گئے خطوط میں ادب اور طب کا ایک بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ خطوط یقیناً تقی عابدی کے بہت بڑا شیدا ہونے کی بین دلیل فراہم کرتے ہیں۔ مشاہیر ادب ان خطوط میں تقی عابدی کی ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر حیران نظر آتے ہیں۔ پیش ہے اس ضمن میں 18 دسمبر 2008ء میں لکھا گیا اردو زبان و ادب کے مستند ادیب خلیق انجم کا یہ خط:

"آپ کی تقریر سن کر حیرت ہوئی کہ آپ اپنے پیشے کے اعتبار سے اتنے مصروف ڈاکٹر اور پھر بھی اردو اور فارسی ادب پر آپ کی اتنی گہری نظر ہے۔ غالب کے فارسی کلام کا جس طرح سے آپ نے تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے وہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"بنام تقی عابدی" فن مکتوب نویسی میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔ اس میں شامل مکاتیب ایک پوشیدہ علمی و ادبی خزانہ ہے۔ ان خطوط کی ادبی اہمیت تو مسلم ہے ہی مگر تاریخی اعتبار سے بھی یہ خطوط ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں نعیم راشد کے

خطوط سے چند سطور ملاحظہ ہو

"شہر برہان پور جسے دارالسرور اور باب الجنان اور مدینۃ الاولیا بھی کہا جاتا ہے۔ شہنشاہ جہاں نے شہزادگی کے زمانے میں جب وہ شہزادہ خرم تھے۔ اس شہر میں اور زین کر کے سال گزارے ہیں۔ وہ سال بادشاہت کے زمانے میں بھی برہان پور میں رہے اور ارجمند بانو ممتاز محل بھی یہیں ہوا اور ان کے جسد خاکی کو 6 ماہ یہاں رکھنے کے بعد آگرہ لے جا کر تاج محل میں دفنایا گیا۔"

بہر حال ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے بیش بہا ادبی کارناموں اور ادبی خدمات کی صلاحیتوں کی بنا پر اردو زبان و ادب میں ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک انجمن کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے دور دراز دنیائے سائنس و طب میں رہ کر جو خدمات انجام دی ہیں۔ اتنی ہی نہیں بلکہ سرزمین وطن سے دور رہ کر بیرونی ممالک میں اردو زبان و ادب کی خدمات کی ہیں۔ ان کی انھیں صلاحیتوں کی بنا پر عرفان زیدی 21 اپریل 2000ء سے اپنے مکتوب میں یوں رقمطراز ہیں

"ہندوستان سے معروف ادیب حضرت نعیم جعفری نے عابدی صاحب کی خدمات گنتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ عابدی صاحب "نیویارک سے ٹیکساس جاتے ہیں اس راستے میں علم و خوبی وقف ہیں کہ علم و ادب بیان رہ علم و ادب کے ذریعے زندگی گزارتے ہیں۔"

چند خطوط نمونتاً ملاحظہ ہوں۔

خط نمبر:1

23۔مارچ 1998ء

جوہر میر

نیویارک

نذر جناب ابوطالب علیہ السلام

بے سایہ کے لیے نہ کوئی سائباں بنا
تھا ایک، دوسرا ابوطالبؑ کہاں بنا

یہ ابتدائے عہد نبوت کی بات ہے
میرے نبی کا دشمن جاں اک جہاں بنا

کانوں میں جب قریش نے رکھ لی تھیں انگلیاں
وہ کون تھا جو میرے نبیؐ کی زباں بنا

وہ کون تھا جو سینہ سپر روز و شب رہا
وہ کون تھا جو دعوت حق کی اذاں بنا

کذب و ریائے شور میں جب چپ تھے سورما
تھا کون احتجاج کا کوہ گراں بنا

جب جرم تھا تعلق خاطر رسولؐ سے
شہر خدا میں ایک وہی نعت خواں بنا

تھا یہ بھی اُس کی ہیبت ایماں کا معجزہ
ہر سنگ راہ خاک در آستاں بنا

وہ کس کا گھر تھا جس میں رسالت تھی مہماں
ٹلے کا یک فنی بھی نہ جب میزباں بنا

وہ کون تھا، کیا تھا مقرر جسے ولی
تھا کون جو نبی کا مرے عقد خواں بنا

ہر اک سخن میں جس کے نبوت تھی ہم سفیر
ہر کاروانِ عشق کا جو ساربان بنا

جوہر جو تیر سینۂ باطل میں گڑ گیا
اُس تیر کے لیے ابوطالبؑ کماں بنا

خط نمبر: ۲

محترم جناب سید تقی عابدی صاحب

السلام علیکم

"فیلٹ" پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والا آن

ان تحقیقی میگزین ہے جو گزشتہ تین سالوں سے ایسے حقائق منظرِ عام پر لا رہا ہے جنھیں خوف یا خوف سے باعث یا تو چھپایا جاتا ہے یا پھر مصلحتوں کے تحت انھیں منظرِ عام پر نہیں لایا جاتا۔ فیبٹ کی اسی پالیسی کے باعث اسے اندرون ملک سے اعلیٰ سیاسی، سماجی اور صوفی حلقوں سے علاوہ بیرونِ ملک کی ایک بڑی تعداد کی طرف سے بھی پذیرائی مل رہی ہے۔ فیبٹ نے روحانیت میں تحقیق کی جو بنیاد رکھی ہے اسے کوئی اور میگزین فالو نہیں کر سکا۔ اس حوالے پر ہم اپنے رب العزت کے شکر گزار ہیں۔ فیبٹ جہاں دوسرے تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے وہاں ادب کے میدان میں بھی تحقیقی اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

فیبٹ اس سلسلے میں بیرونِ ملک مقیم معروف ادیبوں اور شعراء کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں فیبٹ آپ کا انٹرویو بھی کرنا چاہتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات اپنی چند تصاویر کے ساتھ ان ٹچ یا Tiff, Jiff, JPG فارمیٹ میں جلد سے جلد بھجوا دیں۔

آپ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنا چاہیں یا کچھ پوچھنا چاہیں تو بلا تکلف رابطہ بھی کر سکتے ہیں۔

میں آپ کے اس سلسلے میں آپ کے جواب کا جلد انتظار کروں گا۔

مقبول ارشد

ایڈیٹر فیبٹ، لاہور

پاکستان

سوالنامہ

- اپنے بارے میں کچھ بتائیں
- لکھنے کا آغاز کب اور کیسے کیا؟
- بچپن میں کن ادیبوں سے زیادہ متاثر تھے؟
- اب تک کی تمام کتابوں کے نام بتائیں؟
- پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟
- پہلی کتاب کے بعد آپ کے جذبات کیا تھے؟

- کینیڈا میں کب سے مقیم ہیں؟
- یہاں جب آئے تھے تو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا؟
- ادب کی کس صنف کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ یہ زیادہ پڑھی جاتی ہے؟
- معاشرے میں کتاب کلچر دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟
- کیا آپ ادبی گروہ بندی کے قائل ہیں اور کیا آپ کے خیال میں یہ گروہ بندیاں ادب کو نقصان نہیں پہنچا رہیں؟
- آپ کے پسندیدہ شاعر اور ادیب کون سے ہیں؟
- آپ پاکستان اور انڈیا میں کن شاعروں اور ادیبوں سے متاثر ہیں؟
- آپ کا کیا خیال ہے کہ بہتر ادب کہاں تخلیق ہو رہا ہے؟
- نئے لکھنے والوں میں کون بہتر شاعری کر رہا ہے اور کون بہتر نثر لکھ رہا ہے؟
- یہاں کے میڈیا کے بارے میں کچھ بتائیں؟
- کوئی پیغام جو آپ پاکستان کی حکومت، یہاں کے شاعروں، ادیبوں اور عوام کو دینا چاہتے ہیں؟

خط نمبر: ۳

برادر مرتقی عابدی صاحب! السلام علیکم

مکتوب گرامی مورخہ 26 اپریل موصول ہوا۔ شکریہ۔ خوشی ہوئی کہ آپ شاہکار انیس کا پاکٹ ایڈیشن شائع کرنے پر تیار ہیں۔ یہ ایڈیشن بھی ان شاء اللہ بہت مقبول ہوگا۔

آپ کی اشاعتی پروگرام میں مولوی خیرات احمد محب (میر سلطان کے والد) کی کتاب ''مطلع انوار'' شامل ہونا چاہیے۔ یہ میر انیس کی شاعری کا عمدہ مطالعہ ہے۔ یہ مختصر کتاب ہے اور اس کی اشاعت زیادہ نہیں ہوئی۔ سید افضل حسین ثابت کی حیات دبیر کا کاغذ اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ جلد ہی یہ فنا ہو جائے گی۔ اس کا کم از کم پہلا حصہ (سوانح) شائع ہو جانا چاہیے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب کا جواب لکھنا چنداں چنداں ضروری نہیں اس کتاب کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

میر انیس پر ہونے والے کاموں کی ایک فہرست عبد القوی دسنوی نے "انیس نامہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے بھی اس موضوع پر اچھا کام کیا ہے جو رسالہ دانش کے انیس نمبر میں شائع ہوا ہے اور غالباً "شاہ یہ ہے انیس" کے نام سے بھی کتابی صورت میں چھپا ہے۔

مجالس عزا میں پڑھنے کے لیے مراثی انیس سے منتخب بندوں کی اشاعت کا خیال بہت اچھا ہے۔ ان کے ساتھ انیس کے حالات اور رباعیوں کا بھی انتخاب شائع ہونا چاہیے۔

رجائی صاحب کے تحفظ کا مبارک کام آپ نے شروع کیا ہے۔ اس سے مرثیے پر کام کرنے والوں کو بہت مدد ملے گی۔ سرکار کیتی سے حوصلہ افزائی کا حساب نہیں۔ سید علی احمد خاں جو وارث سے پاس ہوا ہے وہ اسے چھپوانا چاہتے ہیں۔ ان سے براہ راست رابطہ کیجیے۔ پتہ: انیس باؤس، چوبدری محلہ، چوک لکھنؤ۔ 3(11)(1)22 ہے۔

آپ کا ایک بار ہندوستان آنا ضروری ہے۔ یہاں کافی چیزیں مل سکتی ہیں اور آپ سے ملاقات کی میری خواہش بھی پوری ہو سکتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے مضمون روانہ کر دیا ہے۔ میر انیس کی سوانح عمری مکمل کر چکا ہوں۔ پبلشر تک وغیرہ ہو چکی ہے۔ قریب انشاء اللہ شائع ہو جائے گی۔

[illegible] صاحب سے میرے یہاں ہندوستان سے [illegible] چند نام اور [illegible] ہے [illegible] اختر عابدی صاحب شرکت کریں گے۔

آپ انیس اور مرثیے کے لیے بہت کام کر رہے ہیں۔ خدا توفیقات زیادہ کرے۔ امید ہے مزاج بہ خیر ہوگا!

آپ کا

نیر مسعود

13 مئی 2002ء

"ادبستان" دیال روڈ

سیاق و ارتباطِ حروف

PDF BOOK COMPANY

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

خط نمبر:۴

برادرم محترم۔ سلام عرض

ایک عرصہ سے آپ لوگوں کی خیریت نہیں ملی۔ میں نے آپ کی کتاب پر تفصیلی تبصرہ روانہ کیا تھا۔ اس کی رسید بھی نہیں ملی۔ یقین ہے کہ تبصرہ آپ کو مل بھی گیا ہوگا۔ میری کتاب "اقبال اور رپورتاژ" زیر طبع ہے جلد ہی منظر عام پر آئے گی۔

اس درمیان جوش بانی شائع ہو گیا۔ جلد ہی آپ کو ملے گا۔ دہلی کے جوش سیمینار میں اس کا اجراء ہوا۔ شاہد بھائی صاحب نے بتایا کہ آپ اقبال پر سیمینار کرنے والے ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ جوش کی باری ہوئی لیکن خیر اقبال کو ہر طرح اولیت ہے۔ اس کے بعد ہی سہی اقبال سیمینار کے لیے ہم لوگوں کے لائق کوئی خدمت ہو تو بھائی جان کو سلام عرض۔

مخلص

پروفیسر علی احمد فاطمی

خط نمبر:۵

محترم سید تقی عابدی صاحب سلام و نیاز!

آپ کی خیریت کی اطلاع اخبارات سے ملتی ہے۔ ادب میں فعالیت کی مثال دیکھنی ہو تو ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ میری نئی کتاب "دہلیز پر پھول" کے چند نسخے ہوائی ڈاک سے پہنچے تھے جو فوراً ختم ہو گئے۔ بحری ڈاک سے مرسلہ کتابیں اب ملی ہیں تو احباب کو روانہ کر رہا ہوں۔ چنانچہ ایک نسخہ آپ کی نذر ہے۔ رسید اور رائے سے مطلع فرمایئے گا۔ نیز حال میں شائع شدہ میری غزلوں پر ایک مضمون کے ساتھ کچھ متعلقہ تبصرہ اور اقتباسات کی نقلیں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

امید ہے آپ جملہ افراد خانہ سمیت بخیر ہوں گے۔

مخلص

24 فروری 2006ء

سید ذکی عالم شاہین

ناشر، پبلیشر[1]

نام ڈاکٹر سید تقی عابدی

1119۔ سیکرٹریٹ روڈ۔ نیو مارکیٹ

اونٹریو، ایل تھری ایکس ون ایم فور

مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ناچیز کی ایک حقیر کوشش ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسی عظیم شخصیت سے دنیائے اردو ادب کو روشناس کرانے کی، ڈاکٹر تقی عابدی کے خطوط میں متنی و مطالب کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا منظر عام پر لانے کا مقصد یہی ہے کہ اب سے اس عظیم سپہ سالار (تقی عابدی) اور علم کے اس عظیم شاہکار یعنی خطوط تقی عابدی و قارئین کے سامنے لایا جائے تاکہ علم و ادب کے شائقین اس سے مستفید ہو سکیں۔

مجھے امید ہے کہ اس حقیر کوشش کو دنیائے علم و ادب میں سراہا جائے گا۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف[10]

حواشی

1. بنام تقی عابدی، مرتبہ: ڈاکٹر شہناز قادری، ص ۱۰۳
2. ایضاً، ص ۱۸۹
3. ایضاً، ص ۱۰۲
4. ایضاً، ص ۲۹۱
5. ایضاً، ص ۱۹۹
6. ایضاً، ص ۲۵_۲۹
7. ایضاً، ص ۲۹_۳۰
8. ایضاً، ص ۳۰
9. ایضاً، ص ۳۹
10. ایضاً، ص ۳۰

ڈاکٹر سید کلیم اصغر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ماہر خسرو و غالب: ڈاکٹر سید تقی عابدی

تقی عابدی کہتے ہیں ''میں صحت کا طبیب، ادب کا مریض، اردو کا عیال اور فارسی کا عاشق ہوں۔'' شاید اسی لیے وہ اپنی چالیس سالہ ادبی خدمات سے دوران اب تک (61) کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ جس کی تفصیل میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اقبالیات، غالبیات، انیسیات، دبیریات، حالی اور فیض پر تحریر کردہ کتابوں سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں۔

تقی عابدی مغرب اور مشرق کی ملی جلی طرز سے متحقق ہیں۔ وہ بیک وقت پروفیسر آف میڈیسن ہیں، جموں یونیورسٹی سے تاحیات پروفیسر، مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد اور تلنگانہ یونیورسٹی، تلنگانہ میں وزیٹنگ پروفیسر سے سرفراز ہوئے۔ آپ کی زندگی کے بارے میں زیادہ بات نہ کرتے ہوئے ان کی تحقیق سے ہونے والے ادبی فوائد پر گفتگو کی جارہی ہے۔ مغربی تحقیق کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر چیز کو پوری طرح سے تحقیق کرنے کے بعد قبول کیا جاتا ہے جب کہ مشرقی تحقیق میں عام طور سے بڑے لوگوں سے جو چیز منسوب ہوتی ہے اس پر کسی قسم کی کوئی تحقیق نہیں ہوتی۔

امیر خسرو پر گفتگو کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈاکٹر عابدی کا فارسی کے حوالے سے سب سے پہلا کام 1981ء میں مرتضیٰ مطہری ایران کے نامور عالم، دانشور کی کتاب ''شہید'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ایران سے اردو میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح تقریباً پچاس ہزار سے زیادہ کاپیاں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب تقریباً 42 صفحات پر مشتمل ہے۔ جو شہید مرتضیٰ مطہری کی شب عاشور کو حسینیہ ارشاد تہران کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ جسے ڈاکٹر عابدی نے سازمان تبلیغات اسلامی

ایران کے شعبہ تعلیم کے کہنے پر ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمہ کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی اور ستائش ہوئی تھی۔ یہ نہایت نفیس اردو ترجمہ ہوا۔ ایران کے علاوہ ہندوپاک کے اکثر دانشور اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

امیر خسرو کے حوالے سے ہندوستان میں مستند اور معتبر کتابوں میں علامہ شبلی نعمانی کی "حیات خسرو" بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اگرچہ سو صفحات سے کم ہے۔ لیکن دانشور اس کتاب سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں خسرو کی زندگی اور ان کے فن سے متعلق تمام اہم کائنات و نہایت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے بعض حوالوں کی تحقیقی چھان بین نہیں کی گئی۔ مثلاً علامہ شبلی نعمانی تحریر کرتے ہیں

"امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں جن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی بڑی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے یہ مجنوں ہوئیں۔ اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

ای زعفت گلندہ برقع نور
ہم عفیفہ بنام و ہم مستور

•••

کاش ماہ تو ہم بچہ بودی
در رحم طفل ہشت مہ بودی

•••

لیک چون دادۂ خدائے رواست
با خدادادگان ستیزہ خطاست

•••

من پدر لتم آنچہ یزدان داد
کانچہ او داد باز نتوان داد

•••

پدرم زمادر است آخر
مادرم نیز دختر است آخر[3]

سو سال سے تقریباً یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے اور سب لوگ اس کو نقل کر رہے ہیں۔ سو سال سے ہمارے خسرو شناسوں نے یہ احسان ہی نہیں دیا کہ چار پانچ جملے خسرو کو ایک شخص بے سواد اور عورت کے وجود سے متنفر بتاتے ہیں۔ اب جو لوگوں نے جدید کام شروع کیا تو انھوں نے خسرو کے انسان پرست اور انسان دوست ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیے۔ ان کے مطابق خسرو تو بیٹی کے پیدا ہونے پر نوحہ پڑھتے ہیں، اظہار رنج کرتے ہیں۔ تو وہ کس طرح ایک ہمدرد اور اچھے انسان ہو سکتے ہیں۔ عرب بھی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔

یہی کام خسرو نے کیا ہے

کاش ماہ تو ہم بچہ بودی
در رحم طفل ہشت مہ بودی

(یعنی کاش تو بھی بیٹا ہوتی اور رحم مادر میں ابھی آٹھ مہینے کی ہوتی)

عام طور سے آٹھ مہینے کا بچہ زندہ نہیں رہتا۔

یہاں پر تقی عابدی لکھتے ہیں:

''اس ایک شعر نے خسرو کی انسانی، اخلاقی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی قدروں پر سوالیہ نشان لگا دیا کہ خسرو بھی عرب کے دور جاہلیت کے قبیلوں کی طرح بیٹی کے وجود کو ننگ و شان اور خاندانی ننگ سمجھتے تھے۔''

یہاں چند نکات قابل توجہ ہیں:

1. علامہ شبلی کا یہ شعر مثنوی مجنوں و لیلیٰ کا نہیں بلکہ مثنوی مطلع الانوار سے ہے۔
2. جس لڑکی کے لیے وہ نوحہ پڑھ رہے ہیں وہ سات سال کی نہیں بلکہ سات مہینے کی تھی۔
3. علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ خسرو کو بڑا رنج ہوا یہ بات صحیح نہیں ہے ایک بہت بڑا الزام ہے جو خسرو پر لگا۔
4. یہ خسرو کا اسلوب تھا کہ جو معاشرے کی برائیاں تھیں ان کو اپنے اوپر لے کر اس کی صفائی پیش کرتے تھے یعنی جب خسرو کی بیٹی پیدا ہوئی تو اس زمانے میں ہر شخص کی

خواہش ہوتی تھی کہ اس سے صرف بیٹا ہی پیدا ہو۔ بیٹی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔
خسرو نے بھی اسی لیے اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے کہا تھا

ای زعفت گلندہ برقع نور
ہم عفیفہ بنام وہم مستور

یعنی خسرو نے اس شعر میں اس زمانے کے طور طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام طور پر معاشرے میں رائج تھے معاشرے کی تنگ نظری کی طرف اشارہ کرتے خسرو آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں اے بیٹی تو، تو میرے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز ہے، تو ہمارے خاندان، جو ایک بیٹی سے محروم ہے اس کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہوتی ہے۔ جس طرح بیٹی کی وجہ سے ماں کی قدر ہوتی ہے اسی طرح بیٹی کی وجہ سے خاندان کی قدر ہے۔ بیٹی تیرے بچے میری آنکھوں پر ہوں۔ بیٹی تو ہے کہ جو خدا بیٹے سے بھی بڑھ کر دیتا ہے۔ آخر میری ماں بھی تو بیٹی ہی تھیں۔ میرا باپ بھی تو بیٹی ہی سے پیدا ہوا تھا۔

تقی عابدی نے اپنے مضمون "کلام خسرو میں مقام زن اور حقوق زن" میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ خسرو نے جو کہ اس شعر کو علامہ شبلی نے "حیات خسرو" میں درج کی ہیں پڑھتے ہیں۔ ہماری تحقیق کی رو سے درست نہیں ہے۔ کیونکہ خسرو نے تو بیٹی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ اشعار مطلع انوار سے ہیں اور نہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خسرو کا اسلوب ہے۔ تقی عابدی نے خسرو شناسی کے خانہ کی طور پر ان آٹھ میں شعر پر تکیہ کیا ہے۔ انہوں نے خسرو کی پوری مثنوی پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ عام طور سے مطالعہ کیا ہے وہ سے کل رہتے ہوئے خسرو نے صرف ایک صاحبزادی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب کہ ان کو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام مستورہ دوسری کا نام عفیفہ تھا۔ تقی عابدی نے ان کی مثنوی سے دوسری بیٹی کا نام عفیفہ کشید کیا ہے جو مستورہ ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ خسرو نے اس شعر میں عورت کے حجاب اور اس کے فوائد سے متعلق [illegible] شعر کہے ہیں۔ تقی عابدی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

یوں تقی عابدی کی تحقیق مفروضوں کی بنیاد پر ہے۔ وہ کسی موضوع کو اس کی تہہ تک نہیں پہنچتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا معیار ہے کہ [illegible] تحقیق کی

سے آگے نہیں بڑھتی جو اس دانشور نے لکھ دیا وہ حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ تحقیق کے معنی کھوج کے ہیں۔ ذاکر تقی عابدی اپنے اس مضمون "کلام خسرو میں مقام زن اور حقوق زن" میں تحریر کرتے ہیں:

"ہماری اس تحریر کا مقصد یہ بھی ہے کہ صحیح تحقیقی نکات قارئین تک پہنچ جائیں۔ اگرچہ شبلی نعمانی نے "حیات خسرو" میں ڈیڑھ دو صفحات اس موضوع پر لکھے ہیں لیکن تقریباً دو درجن کتابوں اور مقالوں میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے، جس سے خسرو کے صنف نازک سے متعلق خیالات سے غلط فہمی پیدا ہوئی جو خسرو جیسے انسان دوست شاعر کے ساتھ انصاف نہیں۔ یہ مسائل "حیات خسرو" کے بعض جملوں، محدود نمونہ برداری اور تقریباً دو سو آٹھ اشعار سے صرف آٹھ منتخب اشعار پیش کرنے سے پیدا ہوئے۔ ہم جانتے ہیں شبلی مرحوم نے ستاون برس کی عمر میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ستاون انجمنیں مل کر نہیں کر سکتیں لیکن یہ ہر دور کے ادیبوں، محققوں کا ادبی، تحقیقی اور اخلاقی فرض ہے کہ کسی بھی ایسی سہل انگاری نشاندہی کریں جس سے حقیقت اور صداقت حل کر سامنے آجائے ورنہ ابرو کی آرائش میں آنکھ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور سچ کا اجلا دامن داغ دار ہو جاتا ہے۔"[8]

لہٰذا یہ ناقدین ادب کی ذمہ داری تھی اور ہے کہ ان واقعات پر از سر نو غور کر کے حقیقت کو آشکار کریں۔ خسرو پر جو مورت مخالف ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے اس کو خسرو ہی کے اشعار سے واضح کرنا محققین کا کام ہے۔ خسرو نے جہاں ایک طرف بیٹیوں کی تعریف کی وہاں دوسری جانب ماں کی عظمت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ خسرو نے ایک مرثیہ اپنی ماں کی موت پر لکھا ہے جس میں ماں کے قدموں میں بہشت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ خسرو نے بھی اپنے اشعار میں ماں کے پیر کے نیچے بہشت کا ذکر کیا ہے۔ خسرو کہتے ہیں

ہر جا کہ زپای تو غبار یست
ما زار بہشت یادگار یست[9]

محسن نے اردو میں انیسؔ نے بھی ماں کے پیر کے نیچے جنت کا تصور خسرو ہی سے اخذ کیا ہو۔ "کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔"

تقی عابدی نے اس ۱۶ صفحات کے مضمون میں ان اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے بیٹیوں کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں خسرو نے کئی مقامات پر بیٹیوں کو بیٹوں سے افضل بتایا ہے۔

تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق خسرو اپنی سات سالہ بیٹی مستورہ کو اپنے باغ کا خوب ترین میوہ کہتے ہیں۔

خوب ترین میوہ زباغ دلم[10]

ایک جگہ خسرو اپنی مثنوی کے درج ذیل شعر میں بیٹی کو فخر سے کہتے ہیں

گرچہ اخوان تو نیک اختر اند
نی ز تو در دیدۂ بہتر اند[11]

اگرچہ تیرے بھائی سب نیک صفات ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میری نظر میں تجھ سے بہتر نہیں

ایک اور مقام پر اپنی مثنوی میں تقی عابدی نے مرد و زن کا موازنہ کرتے ہوئے اس شعر کو نقل کیا ہے

مرد اگر یک فراخہ کار کند
زن یکف بانوئی ہزار کند[12]

مرد اگر ایک فراخ کام کرتا ہے تو عورت اپنی ایک ہی قوت سے ہزار کام کرتی ہے۔

نہ جانے تقی نے ایسے کتنے اشعار خسرو سے نکالے ہیں جس سے عورت کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس اس تحقیق کو نہیں کی۔ تقی عابدی نے ان تمام نکات کی طرف ان صفحات میں توجہ دلائی ہے اور اپنی تحقیق کو مغربی اور مشرقی طرز کی تحقیق قرار دیا ہے۔

ان تمام نکات سے تقی عابدی نے اٹھائے ہیں۔ اب یہاں پر ہم تقی عابدی کی کتاب شائع کرنے والے ادارے کا ذکر کرتے ہیں۔ کتاب شائع کی ہے اترقی عابدی

کا ایک معتبر موضوع ہے۔ تقی عابدی نے غالب کے حوالے سے 2006ء میں دہلی سے ''غالب دیوان نعت و منقبت'' شائع کیا۔ جس میں غالب کی حمد، نعت و منقبت ترجمے کے ساتھ پیش کیں۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے البتہ ڈاکٹر عابدی کی ویب سائٹ www.drtaqiabedi.com پر سوفٹ کاپی ''غالب دیوان نعت و منقبت'' کے نام سے موجود ہے۔ صفحہ نمبر 51 پر ایک جدول دیا گیا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اس میں نعتیں، منقبتیں، حمدیں کتنی ہیں۔ یہ تمام معلومات اس جدول میں موجود ہیں۔ ابھی تک کسی نے ''غالب کا دیوان نعت و منقبت'' شائع نہیں کیا۔ اس میں کل اشعار کی تعداد 2888 ہے۔ ابھی تک غالب کی صرف ایک نعت کا ذکر ہی ملتا تھا لیکن تقی عابدی نے بتایا کہ غالب کی آٹھ نعتیں ہیں، دو حمدیں تین مناجاتیں اور سولہ منقبتیں ہیں۔ غالب کے اردو اور فارسی کے مذہبی اشعار جو حمد و نعت، مرثیہ اور مناجات پر مشتمل ہیں ان کی تعداد 2888 ہے۔ جدول میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ غالب کی فارسی حمد و مناجات کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ غالب کا ''معراج نامہ'' 281 اشعار پر مشتمل ہے جس سے عوام تو کیا خواص بھی ناآشنا تھے۔ تقی عابدی کی وجہ سے لوگوں نے اس پر مطلع ہوئے ہیں۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ تقی عابدی نے بتایا کہ علامہ اقبال نے اپنے غالب کو ''جاوید نامہ'' میں اسی بنیاد پر اسی فلک پر رکھا ہے۔ جس کا ذکر ''معراج نامہ'' میں غالب کر چکے ہیں کہ کعبہ کے اطراف میرے اجداد صف بنا کر کھڑے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے ''معراج نامہ'' سے اقبال واقف تھے مگر اقبال نے غالب کے ''معراج نامہ'' کا ذکر نہیں کیا۔ اقبال نے ''جاوید نامہ'' کی جب تصنیف میں تین کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک ابوالعلاء معری کی ''الغفران'' دوسرے دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' اور تیسری ابن العربی کی ''فتوحات مکیہ''۔

دوسری بات یہ کہ تقی عابدی کیوں کہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور کئی مقالات ادب اور میڈیسن سے متعلق لکھ چکے ہیں اس لیے وہ مغربی اور مشرقی تحقیقی اور تنقیدی نظریہ کو سامنے رکھ کر کتابیں لکھتے ہیں اسی وجہ سے ان کے ہر صفحے پر حوالہ ملتا ہے۔ جب کہ یہ عادت ہمارے برصغیر میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے جو پورا کریڈٹ اپنے اوپر لینا چاہتے ہیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کا انداز مغرب و مشرق سے ملا جلا انداز ہے۔ مشرق میں ایک اور خوبی باقی

رہتی ہے۔ تقی سب کو پوری طرح سے نتیجے تک نہیں پہنچاتے جب کہ مغرب میں وہ نتیجے پر پہنچ کر اپنا نظریہ بھی پیش کرتے ہیں۔ تقی عابدی اپنی تحقیق و تنقید میں حوالہ جات اور نتائج کے ساتھ مسئلہ قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنا نظریہ پیش کرے۔ لیکن وہ اپنی رائے دینے سے گریز نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے تقی عابدی کی تنقید میں متانت حاصل رہتی ہے۔

تقی عابدی کا غالبیات کے عنوان پر ایک اہم کارنامہ 2008ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے تحت "کلیات غالب فارسی" کی تدوین اور ترتیب ہے وہ صحت سے متن کے ساتھ تقی عابدی نے تصحیح کے دوران (جدول) بنایا اور غالب کے قطعات، رباعیات، ترجیع بند اور قصائد و فیہ وغیرہ کی پوری تفصیل ان جدول میں بیان کی۔ غالب کے کل اشعار کی تعداد اس کلیات میں 11337 بتائی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کلیات تصحیح ہونے کے بعد اظہار نظر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس موجودہ میں ایک جملہ دانستہ تقی عابدی کی تصحیح کلمات سے متعلق کلیات کی روشنی سے ثابت کیا ہے جو کام پروفیسر نذیر احسن عابدی سے شروع کیا تھا وہ کام تقی عابدی نے مکمل کیا۔

پھر تقی عابدی کی تحقیق و تنقید کات پر بحث کی جاتی ہے۔ غالب ایک مقام پر لکھتے ہیں

غالب سوختہ جان گرچہ نویسد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شان

اگرچہ غالب مذکورہ کی شمار سے قابل نہیں لیکن پھر بھی بزم سخن میں ان عظیم شعرا کا ہمدم و ہم نفس ہے۔

غالب کا یہ شعر غالب سے شائقین و محبان غالب کی عقیدت شعری جانتے ہیں نہ نہیں آیا۔ تقی عابدی نے غالب کی اس عقیدت کی وجہ سے غالب میں غالب کی وفات پر "مرثیہ غالب" میں قاری میں غالب کی عقیدت کا جائزہ لیا ہے۔ تقی عابدی "کلیات غالب فارسی" کے صفحہ 40 پر لکھتے ہیں

"مولانا حالی نے جو خود برصغیر کی شاعری کے ناقد اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں جن کی شاہکار تصنیف "یادگار غالب" عمدہ ترین غالب شناسی پر ریویو مانی جاتی ہے، کہتے ہیں:

"قدسی و صائب و امیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

• • •

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

• • •

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسمان سے کیا نسبت"

یہ ہے وہ تقابل جسے تقی عابدی نے پیش کیا ہے۔

غالب پر ایران میں قابل قدر کام نہیں ہوا کیوں کہ ایرانیوں نے غالب کو زیادہ اہمیت نہیں دی اس لیے کم کام ہوا۔ ڈاکٹر حسن حائری نے غالب پر چھ کام کیا ہے۔ حسن حائری نے "تحول فارسی در شبہ قارہ" کے عنوان سے مضمون خیال میں غالب کے طرز بیان اور سبک کے متعلق اس طرح لکھا ہے۔ جس کو تقی عابدی نے "کلیات غالب فارسی" کے ص 33 پر نقل کیا ہے:

"بدون تردید غالب در شمار نویسندگانی است کہ در تحول نثر فارسی شبہ قارہ موثر افتادہ او با نگارش "پنج آہنگ"، "دستنبو"، "مہر نیم روزی"، "درفش کاویانی" در زمینہ حای نثر "منشیانہ" تاریخی، علمی، ادبی و انتقادی شیوہ ی دل بست، روشن، ل پذیر و بلی دل انگیز عرض دا است۔ بدان سان کہ صاحب نظران راقبول افتادہ است و سبک شناسان را مطلوب تا جای کہ می توان گفت کہ او "شیوۂ نگارشی اختراع کرد کہ بہ نام "سبک غالب" معروف شد"۔

"غالب کا شمار کسی تعارف کے بغیر ان قلم کاروں میں ہوتا ہے جن کا کام برصغیر کی فارسی نگاری کے ارتقا میں خاص اثر رکھتا ہے۔ غالب نے اپنی تصانیف "پنج آہنگ"، "دستنبو"، "مہر نیم روز"، "درفش کاویانی" اور "مکاتیب" میں تاریخی، علمی، ادبی اور انتقادی دلچسپ پیرایوں اور طریقہ کار اختیار کیے۔ فارسی کے اساتذہ نے قبول کیا اور یہ غالب کا اسلوب ان کے سب کی پہچان بن گیا۔ سب شاعران نے قبول کیا چنانچہ غالب کے ایجاد کردہ طرز بیان کا نام "سبک غالب" کے نام سے معروف ہوا۔"

حسن حائری غالب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ غالب کے یہاں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ کہیں ایک جگہ لکھتے ہیں میں ایرانیوں کو استاد مانتا ہوں اور دوسری جگہ لکھتے ہیں ایرانی یا ہیں؟ تی حامدی کاشمیری میں حسن حائری کے غالب سے متعلق تضاد کے سلسلے میں درج ذیل اشعار کا حوالہ دیتے ہیں۔

غالب نے مقتوی با مخالف میں فارسی زبان کی سند کو ایرانی شاعروں سے منسوب کیا ہے۔ غالب معمولی ہندوستانی شعرا کو اہمیت نہیں دیتے۔

کہ زاصل زبان نبود قتیل
ہر گز از اصفہان نبود قتیل
ایں زبان خاص اہل ایران است
مشکل ما دہل ایران است

•••

سخن است آشکار و پنہان نیست
دہلی و لکھنو ز ایران است

•••

دامن از کف کنم چگونہ رہا
طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روحِ و رواں معنی را
آن ظہوریؔ جہاں معنی را[19]

قتیلؔ اہلِ زبان نہیں وہ اصفہانی نہیں فارسی زبان ایران کی زبان ہے۔ اور اس کی سند ایرانیوں سے ملے گی۔ یہ بات روشن ہے کہ دہلی اور لکھنؤ ایران نہیں ہو سکتے اس لیے طالبؔ آملی، عرفیؔ شیرازی اور نظیریؔ نیشاپوری کا میں دامن نہیں چھوڑ سکتا خصوصاً ظہوریؔ جو خود ایک جہانِ معنی ہوتے ہوئے معنی آفرینی کی روح و جان ہے۔

یہاں غالبؔ کہہ رہے ہیں کہ میں ایرانیوں کو سند مانتا ہوں، استاد مانتا ہوں اور دوسری جگہ دیکھئے کیا کہتے ہیں:

شیخ شوکت عرفیؔ کہ بود شیرازی
مشو اسیرِ جلالی کہ بود خوانساری

•••

بہ مومنات خیالم در آی تا بینی
روانِ فروز برو دو شہای زناریؔ[20]

غالبؔ کہتے ہیں عرفیؔ کو شیرازی ہونے کی بنا پر اور اسیرؔ کو خوانساری ہونے کی وجہ سے اہمیت مت دو۔ میرے "مومنات خیال" میں آ کر دیکھو کہ میری دوش سے کیسے تجلی نکل رہی ہے۔

حامدی کہتے ہیں غالبؔ کا تضاد یہی ہے کہ ایک طرف کہہ رہے ہیں معنی آفرینی جو میرے پاس ہیں نہ عرفیؔ کے پاس ہیں نہ زلالیؔ کے پاس۔ وہیں دوسری طرف کہہ رہے ہیں زبان میں ایرانیوں کو استاد مانتا ہوں۔ اور ایک مقام پر کہہ رہے ہیں کہ

زلہ بردار کس چرا باشم
من ہمایم مگس چرا باشم

"میں کیوں کسی کے دسترخوان کے بچے ٹکڑوں پر زندگی کروں، میں ہما ہوں تو پھر مگسی کی زندگی کیوں بسر کروں"[21]

اسی تضاد کا ذکر غنی عابدی نے کرتے جواب میں کہا کہ یہاں مسئلہ تضاد کا نہیں ہے

غالب یہ بھی کہتے ہیں کہ لسانیات اور ہیئت میں ایرانیوں کو استاد مانتا ہوں۔ یعنی قصیدہ، مرثیہ، غزل یہ سب ہمارے ایران سے آئے ہیں لیکن جہاں تک معنی آفرینی کا تعلق ہے وہ ہماری رگوں سے جڑا ہوا ہے۔ ہماری ہندی سے جڑا ہے تو یہ ضروری نہیں ہے۔

تقی عابدی نے حسن عابدی کے اس تضاد کا جواب ایران کے تاریخ وحدت میں کلیات فارسی کی رسم رونمائی کے موقع پر دیا جب یہ کتاب ایران سے شائع ہوئی تو ایرانیوں نے اس کے مقدمے کا فارسی میں ترجمہ کرا کر تہران سے بھی شائع کی اور اس کی رسم رونمائی تہران کے مشہور آڈیٹوریم تاریخ وحدت میں ہندوستان سے سفارت کے ساتھ ایران کی معزز شخصیات کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ اس طرح سے اور بھی بہت سے نکات ہیں جو تقی عابدی نے مقدمے میں پیش کیے ہیں۔

تقی عابدی نے اس مقدمے میں کئی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

یعنی دوسرے شعرا سے غالب کا انداز بیان جداگانہ ہے۔ غالب کے انداز بیان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے قواعدی الفاظ کی معلومات ہو۔ یعنی ایک ایرانی اور ہندوستانی طرح سے ان کے اصل معنی تک پہنچ سکتا۔ جس کو بہت سی مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ فارسی سے اردو تک تقی عابدی نے "مصحف فارسی" "شائع کی" علاوہ ازیں ایک کتاب "اقبال کے عرفانی زاویے" کے عنوان سے بھی شائع ہوئی۔ جس میں [illegible] فارسی اشعار کا تقریباً اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ترانہ کے علاوہ حمد کا فارسی دیوان بھی جو تقریباً چھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ حال ہی تقی عابدی کی چار کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں "مسدس حالی"، "کلیات حالی"، "حالی فہمی"، "بچوں سے حالی" شامل ہیں اور تین زیر طبع ہیں۔

[illegible] ہندوستان سے ہزاروں کلومیٹر دور نیوزی لینڈ میں بیٹھ کر ڈاکٹر تقی عابدی اردو ادب سے فارسی کی خدمت بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

مختلف یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر عابدی پر [illegible] Phil اور PhD وغیرہ پر مقالے

لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔

جہاں تک غالب کا مسئلہ ہے اگر ہمارے ناقد چاہتے ہیں کہ غالب کو شیکسپیئر، ہومر وغیرہ کے مقابل کھڑا کریں تو انھیں غالب کے فارسی اشعار کو سمجھنا ہوگا۔ بغیر فارسی کے غالب کا اردو کلام اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ غالب اپنے اردو کے اشعار کی بنا پر غالب نہیں بلکہ غالب کو غالب بنانے میں ان کے فارسی شعر کا بھی دخل ہے۔

غالب خود فرماتے ہیں:

فارسی بین تا ببینی نقش ہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

•••

حواشی اور منابع:-

۱۔ ''شہید''، استاد مرتضیٰ مطہری، سازمان تبلیغات اسلامیہ شعبہ بین الملل ایران، ۱۴۰۳ھ

۲۔ ''حیات خسرو''، مولانا شبلی مرحوم، ادبی پریس لکھنؤ، بھارت 1922ء

۳۔ ایضاً، ص 24

۴۔ ماہنامہ ''انشاء''، صفحہ 66، مطبوعہ کلکتہ، بھارت 2015ء، ایڈیٹر ف س اعجاز

۵۔ ''خمسۂ امیر خسرو دہلوی''، ص 142، انتشارات شایق، مطبوعہ تہران، ۱۳۶۲ف، ایران

۶۔ ماہنامہ ''انشاء''، مضمون سید تقی عابدی، ص 69، مطبوعہ کلکتہ، بھارت، ایڈیٹر ف س اعجاز

۷۔ ایضاً، ص 70

۸۔ ایضاً

۹۔ ''حیات خسرو''، مولانا شبلی مرحوم، ص 26، ادبی پریس لکھنؤ، بھارت، 1922ء

۱۰۔ ماہنامہ ''انشاء''، ص ، مطبوعہ کلکتہ، بھارت، ایڈیٹر ف س اعجاز

۱۱۔ ''قصہ امیر حمزہ دہلوی''، انتشارات شایق، مطبوعہ تہران ۱۳۶۲ف، ایران

۱۲۔ ''قصہ امیر حمزہ دہلوی''، انتشارات شایق، مطبوعہ تہران ۱۳۶۲ف، ایران

۱۳۔ ''غالب دیوان غزلیات و منقبت''، سید تقی عابدی، شاہد پبلیکیشن، دہلی، 2006ء

۱۴۔ ''غالب دیوان غزلیات و منقبت''، ص 100، شاہد پبلیکیشن، دہلی، 2006ء

۱۵۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، اصیلا پریس، دہلی، 2008ء

۱۶۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص 13، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء

۱۷۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص 31، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس، دہلی، 2008ء

۱۸۔ ''مقالات خیابانی'' محمد حسن حائری، ص 19، موسسہ امیر کبیر تہران ۱۳۷۱ف

۱۹۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص 34، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء

۲۰۔ ''دیوان غالب''، ص 11، تحقیق و تصحیح تقی عابدی، انتشارات بازا ۱۳۸۹ف

۲۱۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص 34، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء

۲۲۔ ''مصحف فارسی'' [illegible] شاہد پبلیکیشن

زاہدہ حنا
روزنامہ "ایکسپریس" لاہور
13 نومبر 2019ء

جاوید نامہ: ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر میں

نومبر اور دسمبر وہ مہینے ہوتے ہیں جب ہمارے یہاں ادبی محفلوں اور سیمیناروں کی بہار ہوجاتی ہے۔ وہ ادیب اور دانشور جو مختلف براعظموں سے آتے ہیں، ان کی بات ایک طرف رہی، ہندوستان سے آنے والے ادیبوں اور دانشوروں سے ملک اور شہر کی فضا خوش گوار ہوجاتی ہے۔ مختلف موضوعات پر بحث مباحثے ہوتے ہیں، ماحول میں جان ڈال دیتا ہے۔ لوگ منتظر رہتے ہیں کہ اب انھیں کس کی تازہ کتاب سننے کو ملے گی اور کس کے خیالات سے وہ استفادہ کریں گے۔

اس برس ماحول پر قدرے سناٹا ہے اور یہ اس کی سیاست ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سیاسی کشیدگی ادیبوں کی آمد و رفت پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیے تو ڈاکٹر تقی عابدی کی پاکستان آمد باد نسیم کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ وہ پیدا ہندوستان میں ہوئے، کینیڈا کی شہریت اختیار کی، یہی سبب ہے کہ وہ پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان دنوں وہ پاکستان میں ہیں۔ کبھی کراچی یونیورسٹی میں لیکچر دے رہے ہیں اور کبھی انجمن ترقی اردو کے "اردو باغ" میں افکار اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اور کبھی لاہور کی ادبی محفلوں میں شریک ہو رہے ہیں۔

پیشہ ان کا دل جگر کے زخم سینا ہے اور شوق انھیں اردو اور فارسی کے شعر و ادب میں اپنے جوہر دکھانا ہے۔ چند دنوں پہلے وہ "اردو باغ" آئے اور وہاں انھوں نے علامہ اقبال کے اہم ترین فارسی کلام "جاوید نامہ" پر ایک توسیعی لکچر دیا۔ ان کی باتیں پر ہجوم محفل نے ذوق و شوق سے سنیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ موضوع کتنا ہی ثقیل کیوں نہ ہو، بولنے والا اگر

موضوع کو پانی کرے تو وہ اس کی بات سننے میں منہمک رہتے ہیں۔

انھوں نے اپنی تحقیقی اور تخلیقی سفر حضرت امیر خسرو کی شاعری کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور سمجھانے سے شروع کیا تھا۔ 2010ء میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی، شکاگو میں انھوں نے "اقبال کے عرفانی زاویے" پر گفتگو کی۔ جامعہ اسلامیہ، دہلی میں ان کا توسیعی لکچر "حقوق انسان کا عالمی خسروانہ" کے موضوع پر تھا جس کی بہت شہرت ہوئی۔

2018ء میں انھوں نے کراچی اور لاہور میں اقبال اور فیض پر توسیعی لکچر دیے۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی نے 2018ء میں عبدالرحمن بجنوری پر یہ حاصل گفتگو کی۔ حیدرآباد میں مولانا آزاد یونیورسٹی میں انھوں نے برصغیر کے اہم شاعر کلیات آرزو پر 2018ء میں کلیدی خطبہ دیا۔

2018ء میں ہی انھوں نے فیض انٹرنیشنل فیسٹیول لاہور میں شرکت کی اور اسی تسلسل میں وہ ہمیں اقبال اکادمی، لاہور میں "مغرب میں اقبال شناسی کی روایت" کے موضوع پر لکچر دیتے سنائی دیتے ہیں۔ انھوں نے غالب کا فارسی کلام مرتب کیا، اسی طرح ہندو شعرا کی منتخب، مرزا رسوا کی منتخب کیے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی رباعیات کو مرتب کرنا اور ان کا تجزیہ عابدی صاحب کا بڑا اہم کام ہے۔ ان کی ضخیم کتاب "فیض فہمی" فیض صاحب کی زندگی اور شاعری پر ایک شاہکار ہے اور اب وہ فیض کی باقیات مرتب کر رہے ہیں۔

ان سے اس مختصر تعارف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے زندگی کس طرح محنت و کوشش اور بڑے شاعروں سے اشعار کی ریس کرتے ہوئے بسر کی۔ وہ یوپی میں پیدا ہوئے، تین سال کی عمر سے حیدرآباد میں رہے۔ وہاں انھوں نے اپنی تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی سے مکمل کی اور پھر مغرب کا رخ کیا۔

ہم جاوید نامہ پر نظر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظم مناجات سے شروع ہوتی ہے اور جاوید (ان کے بیٹے کا نام) سے خطاب پر تمام ہوتی ہے۔ شاعر ایک شام دریائے نیکر کے کنارے ٹہل رہا ہے اور وہ اس سے اشعار کہلوا رہا ہے۔ شام کا منظر بھی نمودار ہوتا ہے۔

قلب اور روح کا مکالمہ چلتا ہے۔ وہ مختلف فلکوں کی سیر کرتے ہیں۔ ان

افلاک پر ان کی ملاقات کئی ارواحِ جلیلہ اور ارواحِ خبیثہ سے ہوتی ہے۔ ''جاوید نامہ'' کا وہ حصہ بطورِ خاص توجہ کا طالب ہے جس میں اقبال کی ملاقات فلکِ مشتری میں غالب، حسین ابن منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ سے ہوتی ہے۔ اس سیر میں ''انا الحق'' پر اور ''خودی'' پر بحث ہوتی ہے۔ ہمارے دانشوروں نے ''جاوید نامہ'' کی اس سیر پر خصوصی توجہ دی ہے۔ یہی وہ سیر ہے جس میں اقبال جدید سیاست کے اہم کرداروں کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا کہنا ہے کہ علامہ نے کبھی صرف ایسی شاعری نہیں کی جو ادب برائے ادب ہو۔ اسی لیے ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر میں خواجہ حسن نظامی کی طرح نثر لکھ سکتا تو کبھی شاعری کو اپنے پیام کا ذریعہ نہیں بناتا۔ علامہ صرف فن برائے فن کے قائل نہ تھے بلکہ فن کی قدر تو انسانیت کے جوہر منوانے کے قائل تھے۔

علامہ شاعرِ انسانیت ہیں، اقبال شاعرِ حیات ہیں، اپنے ایک خط میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں ''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔'' اقبال کا مقصد انسان کو بلندیوں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ نیابتِ الٰہی کا فریضہ ادا کر سکے اور دنیا میں صحیح معنوں میں حکومتِ الٰہیہ قائم ہو سکے۔ اقبال کے پاس انسانی عظمت کا اقرار خدائی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ جب جب عظیم اول کے بعد کمزور ملکوں کو پامال کیا جا رہا تھا، اس وقت یہ اشعار انسانی اقدار کے نقیب بن کر ظاہر ہوئے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی
کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

یعنی کوئی دنیا میں کسی کا محتاج نہ رہے اور دینِ الٰہی کا اصلی پیغام یہی ہے۔ کیوں کہ بقول مولانا روم:

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

جو چیز شیر ان کو لومڑی صفت بنا دیتی ہے، وہ صرف اور صرف ضرورت اور احتیاج ہے۔ قبل اس کے کہ ہم علامہ کے خوابوں میں، وہ انسان کی خودی کو ارتقا کے منازل پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں

منکرِ حق نزد مُلّا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر تر است

یعنی اللہ کا منکر مُلّا کے نزدیک کافر ہے اور اپنی خودی کا منکر اور انکار کرنے والا میری نظر میں بڑا کافر ہے۔ پھر فرماتے ہیں

آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آنچہ در آدم نگنجد عالم است

یعنی عالم اور جہان میں آدمی سما نہیں سکتا لیکن آدمی میں عالم اور جہان سما سکتے ہیں یعنی انسان کے مقابلے میں جہان ہیچ ہے۔ آفاق انسان سے چھوٹے اور فرد ہیں۔ بشریہ انسان بیداری اور خودی کی بلندی پر ہو۔ علامہ کے نظریے کے تحت بیداری دل اصلی ایمان ہے۔ فرماتے ہیں

کافری بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دینداری کہ خفت اندر حرم

یعنی ایک کافر بیداری کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اس مسلمان سے بہتر ہے جو حرم میں سویا ہوا ہے۔ اسی بات کو جاوید نامہ میں فرماتے ہیں

دینِ حق از کافری رسوا تر است
زانکہ مُلّا مومن کافر گر است
دینِ کافر فکر و تدبیر جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

یعنی دین حق کفر سے رسوا تر ہو جاتا ہے کیونکہ ملا مومن کافر گر ہے

رہا ہے۔ انھیں کفر کی تعلیم دے رہا ہے۔ ایک طرف کافر، جہاد اور ژالی کی فکر اور تدبیر میں مشغول ہیں تو دوسری طرف ہمارا مُلّا مسلمانوں میں اللہ کے نام پر فساد برپا کر رہا ہے۔

''جاوید نامہ'' کو علامہ مصور کروانے کے بھی خواہش مند تھے، چناں چہ اپنے مکتوب 31 مارچ 1933 میں لکھتے ہیں ''اہم کام یہ ہے کہ ''جاوید نامہ'' کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ گر ترجمہ ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور بنا دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصور کے لیے عمدہ مسالہ ہے۔''

پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ 25 جون 1933 میں کاظمی کو لکھتے ہیں ''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف ''جاوید نامہ'' ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور شبیہ آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے مگر اس کے لیے مہارت فن کے علاوہ ایمان اور صرف کثیر کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصور اقبال ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔ پوری مہارت فن کے بعد آپ نے ''جاوید نامہ'' پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

اس روز ''جاوید نامہ'' کے موضوع پر جناب شاداب احسانی، جناب عقیل عباس جعفری اور ڈاکٹر رخسانہ صبا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدر انجمن جناب جمیل جالبی نے مختصر اً گفتگو کو سمیٹا اور ایک یادگار محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

اشفاق حسین
ہیوسٹن

انشا فہمی کا ایک سنگِ میل

یوں تو اردو کی نئی بستیوں خصوصاً شمالی امریکہ میں شعر و شاعری نے چراغ بہت بعد میں جلائے ہیں لیکن نثر کے میدان میں ابھی بڑی گنجائش پائی جاتی ہے۔

تخلیقی ادب تخلیق کرنے والے اپنے آپ کو صرف تخلیقِ شعر تک ہی محدود نہیں رکھتے ہیں۔ یہ شعر و ادب کے اردو کے مخصوص سماجی حالات کی روشنی میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی اپنا کر اپنے اظہار کا ذریعہ حاصل کر لیا اور اس کی شاخوں پر بہت سے نئے نئے اور رنگا رنگ پھول کھلائے۔ لیکن اس زبان کا دامن نثر کے سرمائے سے ابھی بھی مالا مال نہیں ہے۔ صرف تخلیق ہی نہیں بلکہ تنقید و تحقیق کے لحاظ سے بھی اس زبان میں بڑی آب و تاب کے ساتھ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ البتہ شمالی امریکہ میں بیٹھ کر لکھنے والے شاعری کے مقابلے میں نثر کی طرف بہت کم توجہ دے رہے ہیں اور اب یہاں سے ادبی رسالوں میں نثر کی کاوشوں کے نمونے بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ منظر بہت زیادہ امید افزا نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ توجہ ضرور ہے۔ اس منظر میں تخلیقی نثر کی رشتہ کاریوں کو جن میں ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، سفرنامہ وغیرہ شامل ہیں، ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ مستثنیات کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو تخلیق کا میدان بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہیوسٹن میں مقیم اردو زبان و ادب کے ایک خدمت گار سید تقی عابدی صاحب نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا تعلق اس دیار سے ہے جہاں سے تحقیق و تنقید کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کی تحقیقی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس میدان میں ان کی خدمات پر ان کے تحقیقی مرتبے کی سند بھی موجود ہیں۔ یہی بات قابلِ

انھوں نے تن تنہا اس میدان میں جو کام کیا ہے اس نے شمالی امریکہ کے تحقیقی منظر نامے کو خاصا معتبر بنا دیا ہے۔ زیر نظر تصنیف "شاعر شیریں بیاں انشا اللہ خاں انشا" بھی ایک ایسی یادگار تحقیقی کتاب ہے اور اس کے مطالعے کے بعد یقین یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی امریکہ میں اردو کا تحقیقی سرمایہ اگرچہ مقدار میں کم ہے مگر معیار میں یقیناً کسی طرح بھی کم رتبہ نہیں ہے۔

کسی بھی مورخ یا محقق کے کام کو دو طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ مصنف نے مرحلہ وار مکمل تحقیق کے بعد کوئی نتیجہ نکالا ہے اور اپنی رائے قائم کی یا یہ کہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کے نتیجے میں پہلے سے قائم کی ہوئی کسی رائے کے اثبات میں دلیلیں پیش کی ہیں؟ انشا اللہ خاں انشا کے بارے میں ڈاکٹر تقی عابدی کا پیمانہ دوسری طرح کی شراب سے بھرا ہوا ہے۔ اسے انشا سے ان کی ایک عقیدت خاص کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں ایک غیر جانبدار محقق بھی پردہ چاک جاتا ہے اور ایک چاہنے والے اور مداح کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ بحر حال تحقیقی فضا کے طلب گاروں کے لیے یہ صورت کوئی بہت خوش آئند صورت نہیں لیکن اس سے بہت زیادہ پڑھنے والوں کا خیال ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ جس کے بارے میں لکھ رہا ہو اس کی شخصیت کے طلسم سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر لے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب بھی انشا کی شخصیت میں پائی جانے والی محبوبیت کے طلسم سے خود کو علیحدہ نہ کر سکے۔ یہ خصوصیت جہاں ایک طرف ان کی اپنی شخصیت کے شفاف ہونے کی دلیل ہے تو دوسری طرف خود انشا کی شخصیت کو بھی ابھارتی ہے۔ ایسے موقعہ پر وہ فیض کی زبان میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ۔

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

اس پسندیدگی اور محبت بلکہ عقیدت کے باوجود ان کی تحقیق کہیں بھی اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ وہ شروع سے آخر تک معروضی انداز میں انشا کے فن، ان کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے پڑھنے والے کو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں جسے وہ تحقیقات انشا کے سلسلے میں سیدھا اور سچا راستہ سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ایک صفحے، ایک ایک

نظر اور ایک ایک حرف پر دیوانہ ہونے والے کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جس طرح پرندے اپنے بچوں کو اپنی چونچ سے دانہ کھلاتے ہیں بالکل اسی طرح عابدی صاحب آشا کے بارے میں ایک ایک معلومات ایک ایک جزئیات اور ایک ایک پہلو کو اپنے قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں۔ اس پورے عمل میں آپ ان سے متفق نہ ہوں تب بھی ان کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر قمر رئیس عابدی صاحب نے آشا کا مطالعہ بہت عمیق اور گہری جامعیت سے کیا ہے۔ ان کا مرکزی نقطۂ نظر یہ ہے کہ آشا کی شاعری اور ان کے فن پر تنقیدی اور تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ آشا کی تخلیقی کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ آشا کا شمار اردو کے ان گنے چنے شاعروں میں ہوتا ہے جو دو دہائی صدی سے اردو شاعری کے اس دامن کو اپنے خون جگر سے سینچ رہے ہیں لیکن ان تمام شاعروں میں آشا کے فن پر سب سے کم کام ہوا ہے۔ تذکرہ نگاروں، تنقید نگاروں اور محققوں نے آشا اور ان کے تخلیقی سے ساتھ معرکہ آرائی پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے لیکن ان کے فن پر ایک دو گنے چنے جملے لکھ کر آشا پر ہی نہیں بلکہ تمام اردو شاعری پر ظلم کیا ہے۔ "تذکرہ ہندی گویاں" میں محققین تو خیر ہی تھے وہ بھی کیا تھے" نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کا گلشن بے خار" جو دراصل گلشن بے کار ہے اس میں ہے کہ اس میں ہے صرف چند شاعروں پر تبصرہ ہے۔ جن میں خود نواب مصطفیٰ اور ان کے چار ہم عصر غالب، مومن، آزردہ اور محبوبی اور دو شاعرات جن میں شیفتہ اور مومن کی محبوبائیں بھی شامل ہیں۔

ان چند سطروں میں عابدی صاحب نے آشا کے فن اور شخصیت پر قلم اٹھانے والے تمام بڑے بڑے نقادوں اور محققین کی بے رخی سے متعلق بڑا ہی اہم سوال اٹھایا ہے اس پر ان کی حق بجانب اور مبنی بر صداقت دلائل بھی ہوں۔ لیکن یہ معاملہ صرف جذباتی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس سے تحقیق کی سنگین نوعیت کی بھی کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ انھوں نے پورے عمل سے ساتھ شیفتہ اور آزردہ کی مثال دے کر اپنی بات کہی ہے۔ اس باب میں عابدی صاحب کا استدلال یہ ہے کہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں جب ایسا فنی معیار رکھا جو انیسویں صدی کے نقادوں کے

ادب کی شریعت میں منسوخ نہ ہو گا۔ بقول شیفتہ "انشا بہ صنف سخن راہ طریق راسخہ گفتہ" یہ طریق سے مراد قدما کا طریقہ کار ہے۔ یعنی شیفتہ، انشا نے نابغہ روزگار تخلیق کار کو خود اپنے جیسا استدلالی شاعر سمجھ لیا جو لکیر کا فقیر اور قدما کا مرید ہو کر رہ جاتا۔

اسی طرح عابدی صاحب نے آزاد پر بھی بڑی زیادتی کی ہے۔ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں فراق کے شاگرد بیتاب سے سنے ہوئے سخن سے جائز نہ سمجھا کہ "انشاءاللہ خان انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے اور شاعری کو سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبویا۔" بقول عابدی صاحب یہ جملہ غلط بیانی ہے اس لیے کہ انشا ولی عالم کے یہ بادشاہ یا مصور و معمار نہ تھے بلکہ ان کا فضل و کمال ان کی شاعری ہی تھی اور اسی سے ان کی نثری تخلیق بھی وجود میں آئی اور آج دو سو سال گزرنے کے بعد بھی انشا صرف شعر و ادب کی تخلیق سے ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انشا کی شخصیت نابغہ روزگار تھی اور ایسی شخصیت نہ کسی کے بنائے ہوئے راستے پر آنکھ بند کر کے چلتی ہے اور نہ ہی کسی سے رہنمائی کی طالب ہوتی ہے۔ البتہ دوسرے ان کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنے کہ انشا کے دہلی معرکے بہت مشہور ہیں ایک معرکہ ان کا میر قدرت اللہ قاسم سے ہوا اس معرکے کو اگر مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اپنی راہ خود تلاش کرنے والا کون ہے اور کون دوسروں کی راہ پر چلتا ہے؟ انشا نے کسی مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کی ردیف تھی "پانچوں" انشا کی ذہن اور طباع شخصیت نے ردیف کو نبھانے کا حق ادا کر دیا۔ چند اشعار جو عابدی صاحب نے نقل کیے ہیں انھیں میں دوبارہ نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ جینئس اور غیر جینئس کا فرق واضح ہو سکے۔

چشم و ادا و غمزہ شوخی و ناز پانچوں
دشمن ہیں میرے جی کے بندہ نواز پانچوں

•••

آرام و صبر و طاقت ہوش و حیا کہاں پھر
بے دل کے ساتھ یہ بھی اس عشوہ ساز پانچوں

مت پوچھ کار آشفتہ ہجر و وصال میں کچھ
صبر و جنوں و وحشت بجز و نیاز پانچوں

کہتے ہیں کہ آشفتہ کی اس قدر اکلاکی پر انھیں سب حد درجہ ملی اور ان کے حریفوں نے
منہ کی کھائی۔ چنانچہ اسی مشاعرے میں قدرت اللہ قاسم نے اپنا زور بخت آزمانے کے
لیے "ساتوں" کی ردیف میں غزل کہی۔ ظاہر ہے کہ یہ چبے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبانا تھا
مگر اصل چیلنج تو آشفتہ نے اپنی قدر اکلاکی کے بل بوتے پر جو "نوں" اور پھر یکی
نہیں بلکہ "بیسوں" اور "تیسوں" جیسی مشکل ترین زمینوں میں غزلیں کہیں۔ کہنے کا مقصد
یہ ہے کہ جو آدمی فطرتاً طباع اور ذہین ہوتا ہے وہ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔

آشفتہ کے ساتھ صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر بہت
دور تک چلے گئے۔ اس طرح چند دوستوں کا خیال ہے اور شاید کسی حد تک میرے نزدیک یہ صحیح
بھی ہے۔ آشفتہ میں جو اصلی جوہر تھے وہ پوری طرح سامنے نہ آسکے۔ اس کے برخلاف تمنا
عابدی صاحب کا خیال ہے کہ ان کے جوہر سامنے تو آئے مگر ان کے مخالفین نے ان پر پردہ
ڈال دیا۔ عابدی صاحب اپنی رائے پر کامل یقین رکھتے ہیں اس لیے آشفتہ پر یہ
تنقیدی مقالہ لکھ کر انھوں نے اپنی انا پسندی اور حق پرستی کا کھلا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اس
محنت، لگن اور تحقیق کے کام پر میں انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔

تقی عابدی مشاہیر کی نظر میں

نثار احمد فاروقی:-(دہلی) 8/اگست 2006ء

تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہوا عزیزم ڈاکٹر شاہد حسین نے آپ کی کتاب "تجزیہ یادگار انیس" کا ایک نسخہ آپ کی جانب سے بطور ہدیہ عنایت کیا۔ نہایت ممنون ہوں کہ اس بیش بہا ادبی سوغات کے لیے آپ نے اس ناچیز کو بھی یاد رکھا۔ کتاب کی تعریف سے قلم عاجز ہے، الفاظ گنگ ہیں، زباں لال ہے۔ ظاہری حسن و جمال بھی بے مثال ہے، مگر یہ تو زیادہ خرچ کرنے سے پیدا کیا جا سکتا ہے کہ آپ سونے کے حروف میں کتاب چھپوا دیں۔ اس کا اصلی حسن وہ جذبہ اور گہری عقیدت ہے جو آپ کو موضوعِ کتاب سے ہے اور میر انیس مرحوم یقیناً اس قدر دانی کے سچے حقدار تھے۔ اس کتاب میں ان کے بارے میں اتنی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ جو بہت سی کتابوں سے سب نیاز کر دیتی ہیں۔ پھر مرثیہ انیس کا تجزیہ جس عالمانہ ژرف نگاہی، دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی سے کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ آج تک اردو تو کیا انگریزی کے کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب کے فن کا تجزیہ ایسی عمیق نگاہ سے نہیں کیا گیا۔ ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتاب میرے ذخیرہ میں لعل شب چراغ کی طرح چمکتی رہے گی اور آپ کی یاد دلاتی رہے گی۔

•••

شان الحق حقی:-(کراچی، پاکستان) 10/فروری 2007ء

اس بار سینیڈ کے سفر میں سب سے بڑی کامیابی اگر کوئی تھی تو وہ آپ کے دولت کدے کی سیر تھی۔ جنت ارضی کہا جائے تو مبالغہ ہرگز نہ ہوگا۔ آپ کی نسبت میں پہلے سے بہت کچھ جانتے کا دعویٰ تو تھا مگر آپ کے ذخیرۂ علمی اور ان کی نسبت آپ کی توجہ، لگاؤ اور

اشتیاق، پیار اور ادب سے دل ہی دل میں بہت سی دعائیں باندھ لیتی ہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کی توانائیاں اسی طرح بحال رکھیں اور اس میں مزید ترقی و برکت عطا فرمائیں۔ آمین

یہ بات جو میں آپ سے کہنا چاہ رہی تھی اب تحریر کرنے کی جسارت کر رہی ہوں کہ آپ جس پائے کے معروف طبیب اور ادیب ہیں، اپنے وقت کی اس طرح قدر نہیں کرتے۔ ادباء اور شعراء کے لیے آپ جس طرح ہر وقت اور ہر گھڑی جس بے دریغی سے وقت اور وسائل لٹاتے ہیں اس کی وہ زمرہ میں ہرگز نہیں دے سکتا اور نہ ہی اور کوئی کرنے کی اجازت دینا چاہوں گا۔ اس حقیر فقیر نے سرسری طور پر آپ کی ان کتب کی جانب اشارہ کیا تھا جن سے یہ عاجز محروم ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری کتب اتنے بھاری بھرکم پارسل سے گفٹ لکھ کر براستہ پاکستان ارسال فرمائیں جب کہ میرا ایڈریس آتا جاتا رہتا ہے۔ بہرحال میں اس عنایات خاص کے لیے بے حد شکر گزار ہوں اور آپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو بھی۔ قدرت نے محبت ہی تو عطا کی ہے کتب کی بابت خدا جانے یہ بھید کب پتہ چلے گا۔

...

شبنم رومانی — میں آپ کی شخصیت فن کے حوالے "کشکول رومانی" کی تقریب رونمائی سے زمانے کی ناچیز رائے میں یہ بے نظیر انیس سو بیاسی آپ سے حاصل کار نامے نے اپنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آپ سمندر پار مقیم ہاشمان رہ میں فال واضل مقام پر ہیں ہیں پر فائز رہ چکے ہیں۔ شخصیت کے حوالے سے میری امیدیں آپ کی ذات کی نسبت بڑھ گئی ہیں۔ زمانے آج کل آپ کی توجہ کا مرکز و محور قبلہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اس کار دشوار سے جس قدر جلد ممکن ہو سرخرو ہو کر نکل آئیں اور کشکول رومانی میں نئے باب کا اضافہ کریں۔

...

گیان چند جین — (ایڈیلیڈ، آسٹریلیا) 4 جون 2002ء

یہ زمانے آپ کی شہرت و ناموری کی بدولت تھے۔ مگر اب آپ برادرم

تابش خانزادہ کے ہمراہ عزیزی گلزار جاوید کے جریدے "چہار سو" نے گلزار جاوید سے زیادہ محترمی ضمیر جعفری مرحوم کا جریدہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ خاص اشاعت کے لیے مسودات اور تصویر طلب کرنے کی غرض سے تشریف لائے اور اپنی دو تازہ تصانیف "سخن" اور "انشاء اللہ خاں انشاء" پیش کیں تو میری خوشی کی انتہا آپ یا برادرم تابش صاحب ہی لگا سکتے ہیں۔ میری نظریں آپ کی تازہ اور تدوین کتاب میر انیس کے تجزیے پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا کرے آپ اس نادر کتاب کو میری رخصتی سے قبل منظر عام پر لے آئیں تاکہ اس کے مداحین میں ایک اور نام کا اضافہ ہو سکے۔

...

محسن بھوپالی:- (کراچی، پاکستان) 14 رجون 1999ء

آج کا دن میرے لیے آپ کی بلند اقبال کتب کی شکل میں خوش قسمت دن ثابت ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں برادرم گلزار جاوید کا شکریہ ادا کروں یا آپ کے روبرو اظہار سپاس کروں کہ آپ نے کس قدر اہم اور نایاب کتب کا تحفہ عطا فرمایا ہے۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں یا ان کتب کا طلب گار۔ آپ کے پاس حافظ اور خسرو سے عقیدت کا جو انداز ہے وہ انوکھا نرالا نہ ہوتے ہوئے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ضرور ہے۔ آپ نے ان بلند قامت شعراء کی شاعری کو جس تنقیدی بصیرت کے آئینے میں جانچا اور پرکھا ہے اس سے آپ کی اردو اور فارسی کے کلاسیکی اور جدید شاعری کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری کی آبرو میر، غالب، انیس اور دبیر کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پر آپ کی جو نظر اور اس کے جو مختلف پہلو میں انھیں نہایت بصیرت افروز کہا جا سکتا ہے اور انھیں اردو ادب میں خصوصی اضافے کی حیثیت کا حامل بھی گردانا جا سکتا ہے۔ آپ کی شاعری، تنقید، تحقیق کی متنوع جہات کا تقاضا ہے کہ تمام علمی اور ادبی ادارے اور افراد آپ کی بجا اور بھرپور حوصلہ افزائی فرمائیں اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ بھی نہیں اردو ادب اور شاعری کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔

...

باقر زیدی:- ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام دنیائے اردو میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ان کا یہ مقام ان کی انتھک محنت، لگاتار کوشش، گہری لگن اور ایک باوقار ادبی ورثے اور مسلسل جذبۂ عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ ہمیشہ بہتر سے بہتر کی جستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہے انھیں اب بلند ممتاز اور نمایاں درجہ حاصل ہے۔ تحقیق، تنقید کے بڑے اہم قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو زبان کے مضبوط اور جید منتقدوں ہندوستان اور پاکستان سے دور رہ کر بھی جو احترام و اعتبار انھوں نے کمایا ہے وہ لائق تحسین ہی نہیں قابل رشک اور قابل تقلید بھی ہیں۔

...

صبا اکبرآبادی:- چوتھائی صدی سے زائد ادب نو کا زمانہ ادب میں ایک طرف سے فراموش کیا ہوا جو حصہ ہے اس پر ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے اپنی جولانی طبع کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی ادب کے بانیوں، معماروں اور معماروں کی نسبت جس قدر جستجو، اشتیاق اور تڑپ کام میں لاکر نئے نئے نکات دریافت کیے ہیں اس کے باعث یہ فراموش شدہ صنف ادب ایک بار پھر سے زندہ اور توانا ہو گئی ہے۔

...

احمد ندیم قاسمی:- ڈاکٹر سید تقی عابدی سچے عاشق اردو، اچھے مرثیہ شناس، اچھے محقق اور اچھے نقاد ہیں۔ ان کا اشتیاق اور لگن دیکھ کر ان پر پیار بھی آتا ہے اور غصہ کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آخر سے اور میں نے کام سے اس قدر والہانہ شغل کی، لکھنے میں آتا ہے اس لیے تقی عابدی صاحب کا احترام واجب ہوتا ہے کہ انھوں نے دیار غیر میں جس اخلاص سے اردو ادب کا پودا لگایا ہے، جس محبت سے اس کی آبیاری کر رہے ہیں ایک نہ ایک دن یہ پودا ناز سے پھل اور برکت کا درخت اختیار کرے گا۔

...

پروفیسر صغرا مہدی:- ڈاکٹر تقی عابدی کا نام [illegible] سے نیا نہیں ہے۔ موصوف کا پیشہ [illegible] ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں اور ان کا کلام بھی شائع ہوا ہے۔ ہندوستان آ کر یہاں بھی تحقیق کا کام کرنے والوں سے تعلق قائم کرتے رہتے ہیں۔ موصوف کا

خاص میدان رثائی ادب ہے۔ دو سال پہلے آپ ہندوستان تشریف لائے تھے ساتھ میں اپنی مرتب کی ہوئی کتاب ''تجزیہ یادگار انیس'' بھی لائے تھے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ تقی عابدی صاحب کے اعزاز میں جگہ جگہ انیس پر سیمینار ہوئے انھوں نے لوگوں کو انیس پر مزید کام کرنے پر اکسایا۔ ماہرین انیس سے رابطہ قائم کیا۔ ہم سمجھے موصوف ''انیسیے'' ہیں۔ مگر ابھی حال میں شاہد پبلی کیشنز دریا گنج سے تین ضخیم کتابیں موصوف ہوئیں۔ جو تقی عابدی نے بہت عرق ریزی اور عالمانہ انداز میں مرتب کی ہیں۔ اور بہت صحت اور خوب صورتی سے شائع ہوئی ہیں۔ (1) ''مثنویات دبیر''، (2) ''ابواب المصائب''، (3) ''مصحف فارسی''۔

ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ موصوف کا شمار انیس کے ان مداحوں میں نہیں ہے جو اپنے پیروں کو ازاتے ہیں ہندوستان میں بھی دبیر پر کچھ کام ہو رہا ہے اور ماہرین دبیر یہاں بھی موجود ہیں مگر مذکورہ بالا تینوں کتابیں میں جو معلومات دبیر کی سوانح اور شاعری و نثر کے بارے میں فراہم ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اب تک کی تحقیق میں کس قدر کمی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ تینوں کتابیں اردو اور فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ہم مشکور ہیں تقی عابدی صاحب کے کہ وہ دیار غیر میں بھی رہ کر اپنی زبان و ادب کو نہیں بھولے۔ اور گاہے گاہے ہندوستان آ کر ہم لوگوں کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ تحقیق ایسی ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ مرحلہ شوق طے نہ ہو اور وہ اسی طرح بے مثال علمی کارنامے انجام دیتے رہیں۔

...

ہلال نقوی:۔ مرثیے کے محقق اعظم مسعود حسن رضوی ادیب نے 1943ء میں شاہکار انیس کے نام سے انیس کا جو مرثیہ پوری اردو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا آج تقریباً ساٹھ سال بعد اسی مرثیے کو ڈاکٹر تقی عابدی نے فنی و لسانی تشریحات کے ساتھ ایک ایسے نئے زاویے سے اجاگر کیا ہے کہ اہل تحقیق حیران ہیں! یہ حیرانی انیس کی شعری عظمت کی تہہ داریوں پر بھی ہے اور ڈاکٹر تقی عابدی کی فنی و تحقیقی بصیرتوں پر بھی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اس حیران کن ادبی خدمت نے انیس پر لکھتے پڑھتے سوچنے اور سمجھنے کے کئی دریچے کھول

...

پروفیسر گوپی چند نارنگ ادب کی دنیا عموماً نہیں اپنی ہی دنیا ہے۔ یہاں نام نہیں کام بولتا ہے۔ یہاں خود نام کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن ان کا نام چلتے دیر نہیں لگتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کی آبرو ان لوگوں سے ہے جو خلوص نیت اور لگن سے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، اور بڑی خاموشی سے ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں انھوں نے جو ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عمر کے اعتبار سے ریٹائرمنٹ کی حد میں ہیں لیکن جس طرح ان سے مربوط ادب سے ہیں۔ اس کے پیش نظر میں انھوں نے ایک کے بعد ایک جو مطبوعات پیش کی ہیں وہ ان سے بہت کچھ توقعات وابستہ کر سکتی ہیں۔ فکشن تنقید، تنقید، شاعری، فکشن تنقید، تنقید، شاعری، فکشن تنقید، تنقید، شاعری،

جاتے ہیں۔ آپ کی شہرت کی خاصی پہچان انیس شناسی کرائی جاتی ہے۔ حالاں کہ آپ نے مرزا دبیر پر بھی بہت کام کیا ہے اور بہت سے نئے نکات سامنے لائے ہیں جن سے اختلاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ انیس و دبیر کے علاوہ آپ نے انشاء اللہ خاں انشاء، نجم آفندی اور علامہ اقبال پر بھی دقیق نگاہی سے کام لیا ہے لہٰذا یہ صرف نظر کرنا تقی عابدی سے نہیں بلکہ اردو ادب سے ناانصافی شمار ہوگی۔

•••

احمد فراز:- تقی عابدی کچھ نہ بھی کرتے تو اساتذہ شعراء کی خدمت کے عوض بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے نہ صرف کچھ کرنے کی ٹھانی بلکہ بہت کچھ کر بھی گزرے اور آئندہ بھی ان سے بہت کچھ سرزد ہونے کے امکان رد نہیں کیا جا سکتا۔

•••

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی:- (حیدرآباد، انڈیا) ہمیں اپنی شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کو لازمی طور پر زندہ رکھنا ہوگا۔ اردو زبان بڑی ثروت مند اور علمی، ادبی خزانوں سے مالا مال زبان ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم میر، غالب، اقبال کی سربلندی کے ساتھ اپنے جوہر نایاب جو اردو زبان و ادب کی سربلندی و سرفرازی کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں کی عزت افزائی سے قطعی غفلت نہ برتیں۔ میرے لیے یہ امر بہت ہی خوش و اطمینان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے تن تنہا اپنی زبان، ادب اور فراموش کردہ اہل قلم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل احترام بھی ہیں اور اعتبار کی حامل بھی۔ میں اردو زبان و ادب سے وابستہ احباب سے استدعا کروں گا کہ آپ اپنے درمیان موجود اس جوہر نایاب کی جس قدر بھی عزت افزائی کر سکتے ہیں کیجیے اور جو احباب کچھ نہیں کر سکتے ان کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی درازیٔ عمر کے لیے دست دعا دراز کریں۔

•••

تیر مسعود (لکھنؤ)۔ رثائی ادب کے خدمت گزاروں میں اس وقت ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام سرفہرست ہے۔ وہ اس سلسلے میں کئی کتابیں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کر چکے ہیں اور ابھی کئی کتابیں تیاری کے مراحل میں ہیں۔ ان کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ یہ ہے کہ وہ

مرزا دبیر کا تمام کلام مظم و منثر مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے

1. "سلک سلام دبیر" (سلاموں کا کلیات) 2. "طلع مبر" (بے نقط کلام)
3. "مجتہد نظم مرزا دبیر" 4. "مثنویات دبیر"
5. "باب المصائب" 6. "مصحف فارسی"

یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس وقت وہ مرزا دبیر کی تمام رباعیوں کی جمع آوری کے کام میں مصروف ہیں جس میں ہر رباعی کا تنقیدی تجزیہ بھی ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔ اس سے بعد انشاء اللہ مرزا دبیر کا کلیات مراثی آئے گا۔

مرزا دبیر کا بیشتر کلام "دفتر ماتم" کی جلدوں میں شائع ہوا تھا لیکن یہ جلدیں بہت کم یاب اور نا پید ہو چکی ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے ان جلدوں میں شامل کلام سے علاوہ مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ کلام اور دوسری جنگوں سے شائع ہونے والا کلام بھی یکجا کر دیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاتھوں مرزا صاحب کا حق ادا ہو رہا ہے۔

"باب المصائب" مرزا صاحب کی نثری تصنیف ہے جس میں قرآن مجید کے "حسن قصص" یعنی قصہ حضرت یوسف کو امام حسین کے حالات سے ربط دیا ہے اور قصہ یوسف اور واقعہ کربلا میں مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ یہ کتاب مرزا صاحب نے ۱۲۴۵ھ میں لکھی۔ اس کی نثر بہت عمدہ ہے۔ اردو نثر کی تاریخ میں "باب المصائب" کا نام بھی شامل ہونا چاہیے۔ یہ کتاب مرزا صاحب کی بیک وقت دو اور کی "فسانہ عجائب" سے صرف پانچ برس بعد تصنیف ہوئی ہے اور اردو نثر کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔

"باب المصائب" میں شامل مراثی جا بجا نظم سے تزئین کی گئی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس میں مرثیے کا فنی بند نہیں ہے (مرثیے کے مجموعے نظر نہیں آیا) یہ منظومات خاص اس کتاب کے لیے لکھے گئے ہیں۔

اس طرح یہ کتاب مرزا دبیر سے صرف یہ نثر میں مکمل کرتی اور اس لیے نثر میں وہ سب کچھ ہے جو مرزا صاحب کے مراثی میں ملتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کو امام حسین کا معجزہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

خدا بخش لائبریری تقی عابدی صاحب کے ہاتھوں مرزا صاحب کے بقیہ آثار بھی اسی

طرح مرتب ہو کر آ جائیں۔ یہ اُردو ادب، رثائیات اور مرزا دبیر کی بڑی خدمت ہوگی۔

...

مشکور حسین یاد:- علامہ اقبال پر کچھ لکھنا آسان تو اس لیے ہے کہ علامہ کے شعر و ادب اور فکر و نظر کے بہت سے پہلو ہیں لیکن علامہ پر کچھ لکھنا مشکل اس لیے ہے کہ علامہ کے ان فکری اور فنی پہلوؤں پر سوچ سمجھ کر ہی لکھنے سے کچھ بات بنتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اس ضمن میں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یوں تو علامہ کے فن اور شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے لیکن سوچے سمجھے بغیر نہیں۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ انھوں نے جس موضوع کو لیا ہے اس کے ساتھ حتی الامکان انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی سعی و جہد سے باعث تقی عابدی صاحب کے مضامین میں ایک اپنے ہی انداز کی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اب خواہ اقبال کو مفسر قرآن کی حیثیت سے دیکھا ہو یا عاشق رسول کی حیثیت سے انھوں نے انصاف کا دامن ہاتھ سے کہیں نہیں جانے دیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ علم و عرفان کے موضوعات کے ساتھ ساتھ تقی عابدی نے خالصتہً فلسفیانہ موضوع زمان و مکان پر گفتگو کرتے ہوئے بھی اپنی طرف سے پوری پوری احتیاط سے کام لیا ہے اور کچھ جہاں انھوں نے علامہ کے ہم سفر اکابرین سلیمان ندوی، حسن نظامی، راس مسعود، مہاراجہ کشن پرشاد سے علامہ کے ذاتی تعلقات اور علمی روابط کے ضمن میں بات کی ہے، وہاں بھی انھوں نے اپنی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے غرض اپنی اس کتاب میں مصنف نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی یہ قابل مطالعہ کتاب ہے اور ایک کتاب کی سب سے بڑی اور بنیادی خوبی بھی یہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ اسے پڑھ کر قاری کو اپنے انداز کا ایک لطف حاصل ہو۔ سو ڈاکٹر تقی عابدی نے قارئین اقبال کے لیے یہ سامان ضرور بہم پہنچا دیا ہے۔ باقی ''اقبال کے عرفانی زاویے'' تو آپ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم کر سکیں گے کہ زاویے کتنی کتنی ڈگری کے ہیں اور ہمارے ذہنوں کو اقبال فہمی میں کتنی کتنی وسعتیں عطا کرتے ہیں۔

...

امجد اسلام امجد:- ڈاکٹر تقی عابدی کی شاعری کا صحیح طف وہی وہ لوگ ہیں جو انھیں ذاتی طور پر جانتے اور ان سے تعلق خاطر رکھتے ہیں کہ وہ شاعروں سے اس اقلیمی زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود بھی اپنی شاعری جیسے ہوتے ہیں۔ تقی عابدی ایک پڑھے لکھے، مہذب، علم دوست، ادب شناس، خوش مذاق اور خوش گفتار انسان ہیں ان کا حیدرآبادی لہجہ، الفاظ کا مخصوص چناؤ اور استعمال، رکھ رکھاؤ اور چھلکتا ہو خلوص ایسی خوبیاں ہیں جو ان کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہیں۔

وہ بھی دوسرے مشرقی روایت پسند شاعروں کی طرح اپنے شعری مضامین ہوں یا ترکیب اور زبان و بیان سے متعلق ہر چیز پر کلاسیکی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں سادگی، مقصدیت اور اپنے موضوع سے جذباتی اور فکری سطح پر اس قدر جڑے ہوتے ہیں کہ بعض اوقات وہ اپنے تخلیقی جوش میں فنی حد بندیوں سے بھی صرف نظر کر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری "شوق اظہار" کی ہر وہ پرستش کرتی ہوئی قارئین اور سامعین سے کلام کرتی ہے اور بہت سطحی نظر میں صرف چشم خریدار پر احسان رہ جانے سے بھی شاعر مطمئن ہو جاتی ہے۔ سو ایسے شعر کہنے والے اور پیارے شخص اور اپنی پوری خلوص اور سچے طلب شاعری کا احترام کرنے والوں سے کرنا چاہیے۔

محمد حامد انصاری - آپ کا تخلیقی سفر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی "فیض فہمی" ہمارے اس پسندیدہ موضوع پر ایک قابل قدر کتاب ہے۔ اس تحفے کے لیے میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خلیق انجم - ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے آپ کی مرتبہ کتاب "فیض فہمی" عنایت فرمائی، کتاب دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے جس لگن اور محنت سے فیض پر یہ کتاب تیار کی ہے، وہ قابل داد ہے۔ اس کتاب میں فیض کی شخصیت، سیرت اور ادبی خدمات پر آپ نے بیس سے زائد مضامین جمع کیے ہیں۔ ان سے بعد فیض کا شاید ہی کوئی گوشہ باقی رہ گیا ہو۔ اس کتاب میں فیض کا جو مجسمہ بنتا ہے، اس لحاظ سے "فیض فہمی" فیض سے شائقین کے لیے فیض سے بہتر واقفیت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کے لیے خدا سے آپ کو ثواب ملے گا۔ یہ خوب صورت کتاب دیکھ کر اپنے تاثرات اور معیار

طباعت کے اعتبار سے بھی کیسی خوب صورت ہے! اس کتاب کو دیکھ کر میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم، تندرست اور سلامت رکھے اور آپ ادب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں۔

میں اقبال، دبیر، انیس، تعشق لکھنوی اور غالب پر آپ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میری زندگی کا بڑا حصہ مطالعہ غالب میں گزرا ہے، اس لیے آپ کے مرتبہ ''کلیات فارسی'' کی دو جلدوں کے دیدار سے محروم ہونے پر مجھے افسوس ہے۔ آپ پبلشر کو میرا پتا لکھ دیجیے، کلیات کی جو بھی قیمت ہوگی، پیش کر دوں گا۔

پچھلی دفعہ جب آپ ہندوستان تشریف لائے تھے تو آپ نے بتایا تھا کہ فیض کے بعد اب آپ کے سامنے اقبال کے ''شکوہ اور جواب شکوہ'' پر بھی ایک ضخیم کتاب شائع کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع پر اقبال کی نظموں کے علاوہ وہ مضامین بھی شامل ہوں گے جو اردو کے نقادوں نے اس موضوع پر لکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بھی اردو میں اپنی مثال آپ ہوگی۔

آپ میرے چھوٹے بھائی ہیں، اس لیے ایک دو باتیں کہنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کتاب کی اشاعت پر آپ کی خطیر رقم خرچ ہوئی ہے، لیکن فیض کے اپنی محبت اور عقیدت کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ فیض کی شاعری اور اس کی خصوصیات عوام تک پہنچ سکیں، آپ نے اس کتاب کی کوئی قیمت نہیں رکھی۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ قیمت شائع نہ کرنے کی وجہ سے کتاب کی وقعت کم ہو جاتی ہے، پھر ادیب کے علاوہ انجمن کے پبلشر اور بک سیلر کی حیثیت سے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اس کتاب کا اشتہار دیں گے تو اردو والے معلوم کرنا چاہیں گے کہ یہ کتاب کہاں سے اور کس قیمت پر دستیاب ہوگی؟ جب ہم اس کتاب کا اشتہار دیں گے۔ (''ہماری زبان'' کے تازہ شمارے میں یہ اشتہار دے بھی رہے ہیں) تو قارئین پریشان ہوں گے کہ یہ کتاب کہاں سے منگوائیں۔ یہ بات بہت اچھی ہے کہ آپ نے یہ کتاب مفت تقسیم کرنے کے لیے چھاپی ہے۔ یقیناً یہ فیض سے آپ کی محبت اور فراخ دلی کا ثبوت ہے۔ لیکن عام قارئین آپ کے اس جذبے کو قدر کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ کیوں کہ انھیں یہ عادت ہی نہیں کہ آرٹ پیپر

پر اتنی خوب صورت اور ۴۲۴ صفحات پر مشتمل یہ بیش قیمت کتاب مفت تقسیم کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری باتیں ناگوار نہیں گزریں گی۔ یوں کہ میں نے جو باتیں کہی ہیں، اس میں میرا خلوص اور محبت شامل ہے۔

میں جانتا ہوں کہ جب آپ دہلی آتے ہیں تو فیہ معمول مصروف ہوتے ہیں لیکن میں چاہتا ہے کہ اب آپ جب دہلی آئیں تو ایک روز حضرت تشریف لائیں یا مجھے ٹیلی فون کر دیجئے۔ آپ جہاں ہوں گے حاضر ہو جاؤں گا۔ یقین جانئے کہ میں آپ کا مشتاق اور معتقد ہوں۔ اس لیے آپ سے ملاقات کی ہمیشہ تمنا رہتی ہے۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور خدا آپ کو ایسی ہی عظیم کام کرنے کی توفیق دیتا رہے۔ (آمین)

ڈاکٹر نیر مقصود۔ نیئر یہ تاثر بہت سوں نے بیان کیا ہے کہ اقبال اور غالب کے بعد اب سے زیادہ اہم شخصیت غالب سے بھی زیادہ دلکش معمار تھے بعد والی بڑا کام نہیں ہوا۔ اس حافظ جی نے فیہ معمولی اور محنت اور لگن سے کام کیا ہے۔ شاکر انیس کے تجزیے میں جو بند سے نظموں کی تعداد اور مدت کی تفصیل اور دوسرے جملہ امور سے کتاب دانیس شناسی کا بہت اہم ذریعہ کتابیات اور ضمیمہ بھی۔ اس کتاب سے انیس کی زبان اور استعمال الفاظ پر کام کرنے والوں کو بھی فیہ معمولی مدد ملے گی۔ آپ کی اس کتاب کی سب سے زیادہ اہم خوبی یہ ہے کہ آپ نے ان کی نیت میں آپ دیکھ لیا ہوں کہ "چہ بسیار خواہد پدید آید" آپ سے معلوم ہوا کہ ہر حق تلفی اور ان سے بے حد متاثر ہوں لیکن تجزیہ شاکر انیس آپ کا کارنامہ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ ایسے اور بھی کارنامے انجام دیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری۔ مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ میں نے شہر کے مشاعروں میں شرکت کی، کتابوں کی دکانوں سے کتابیں خریدیں، مگر یہ کارنامہ میرے علم میں نہیں آیا۔ جب آج کی صدارت شاکر انیس کے حوالے کی گئی تو اس سے علم ہوا کہ ان کی پوری زندگی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ آپ نے ان کی تحقیق کی ہے۔ یہ بیشتر موضوع (۱۸۱۷ء) وقت ہیں سے ہے۔ ان کی بھاری بھرکم اور ضخیم کتابیں دیکھ کر میں خود بھی اب کام کرنے والوں میں سے ہوں جنہوں نے ۱۰۰ چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف کی ہیں۔ میں یہ بات اس

تردید پورے مطالعہ ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایسی مفید، مستند اور معلومات افزا کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ صحیفہ اب چودہ باب پر مشتمل ہے۔ آخری تین باب نہایت اہم ہیں جو نہایت دیدہ ریزی اور محنت شاقہ سے مرتب کیے گئے۔ تیرھواں باب "تجزیہ کامل" حاصل کتاب ہے اس میں ڈاکٹر صاحب نے ہر بند کے سامنے پورے صفحے میں تجزیہ کیا اور وہ شعری محاسن دکھائے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی نے انھیں حیات جاودانی سے ہمکنار کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب والا تبار کی تالیف و اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اور انھیں ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے ایسا شاندار اور بے مثال کام کیا جو آج تک کسی سے نہ ہو سکا۔ اگر اردو لٹریچر اور مرثیہ کی تاریخ مرتب رقم کی جائے تو ڈاکٹر صاحب کا نام ممتاز ماہرین ادبیات میں سرفہرست ہوگا۔

سید عاشور کاظمی:۔ فی زمانہ تحقیق و تنقید کا ایک انداز یہ ہے کہ اکابرین نقد و نظر کی آرا تلاش کی جائیں انھیں ایک جگہ نقل کر کے فریضہ تحقیق ادا کیا جائے۔ دوسرا انداز یہ ہے کہ تحقیق جستجو سے حاصل کردہ آرا سامنے رکھ کر کثرت آرا سے اتفاق کرتے اپنی رائے جلی حروف میں لکھ کر خود کو صاحب الرائے محقق ثابت کیا جائے لیکن بیسویں صدی میں ایک فرد واحد صفت محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیس کے صرف ایک مرثیے میں (۲۱۹) محاسن اور صفتوں کی نشاندہی کر کے عالمانہ تنقید کے نئے راستے متعین کر دیئے ہیں۔ مجھے امید ہے ڈاکٹر تقی عابدی آپ کی اس تحقیق کے بعد اکیسویں صدی میں میر انیس پر جو کام ہوگا اور جو ادبی تنقید کی جائے معنوی کام ہوگا۔

(میر انیس کے دو سو سالہ عالمی کانفرنس جو غالب اکیڈمی کے تحت ٹورنٹو میں منائی گئی)

ڈاکٹر بلال نقوی:۔ میں یہ بات فخر کے ساتھ پاکستان میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ٹورنٹو کینیڈا میں دو مجالس دیکھے۔ ایک نیاز حسین بخاری اور دوسرے ڈاکٹر تقی عابدی کی شاہکار تصنیف "تجزیہ یادگار انیس" میں نیاز حسین بخاری تو اپنے ساتھ نہیں لا سکتا تھا لیکن "تجزیہ میر انیس" ضرور اپنے ساتھ لایا ہوں۔

عابد جعفری:۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی سے شناسائی ایک مدت طویل پر پھیلی ہوئی ہے ان کا شمار شمالی امریکہ کے ان چند سنجیدہ لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ جو شہرت، نام و نمود یا عظمت و بلند اقبالی کے لیے نہیں لکھتے بلکہ اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنا ان کی سرشت بھی ہے اور ورثہ بھی۔

تجربے سے ہمیں بتایا ہے کہ لکھنے والا ہی قابل مطالعہ ہوتا ہے جو لکھے اور زیادہ پڑھے۔ یہاں کہ اس بات کا ثبوت کہ لکھنے والے کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ اس کی تحریریں فراہم کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سید آلی عابدی کی تحریریں بلاشبہ ان کے وسعت مطالعہ کی مظہر ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ پہلے ان کی افادیت و اہمیت پر اچھی طرح غور کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحریر کردہ مضامین موضوعیت اور علمیت کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اور ان کی اثر پذیری دو چند ہو جاتی ہے۔ وہ موضوع کے انتخاب اور اس میں نیا پن یا جدت پیدا کرنے کے فن سے بھی واقف ہیں۔ چناں چہ ان کی تحریریں اپنے موضوعات کے اعتبار سے ہمیشہ منفرد، متنوع اور اچھوتی ہیں اور قاری پر فہم و ادراک کے نئے در وا کرتی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بعض ظاہر غیر اہم موضوعات پر اس ہنرمندی سے مضامین تحریر کیے ہیں کہ ان کے مطالعے کے بعد وہ موضوعات بے حد اہم نظر آنے لگتے ہیں مثلاً "علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد" "علامہ اقبال کا تصور زمان و مکاں" "اقبال کے علامے کے مرثیے" "علامہ اقبال کا شاہین" وغیرہ اسی طرح بعض ایسے موضوعات پر مضامین تحریر کیے ہیں جو اکثر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ "علامہ بہزاد حسین" "اقبال اور عشق علی" "اقبال کے چند نامعلوم شاگرد" "اقبال عاشق حسین" اور "مرزا غالب کا سلام اور مرثیہ" وغیرہ۔

ڈاکٹر آلی عابدی کے مضامین کی ایک اور خصوصیت جو براہ راست ان پر اثر کرتی ہے ان مضامین میں ان کا تنقیدی انداز فکر ہے۔

وہ تحقیق کی طرف سے تنقید کی طرف آتے ہیں اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تحقیق کی راہ سے تنقید کی طرف آتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ تنقید کے داخلی، تاریخی، تہذیبی اور نفسیاتی پہلوؤں سے وہ تحقیق جدید تنقید کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور جیسا کہ ایڈیٹ نے صحیح کہا ہے "زمانہ حال میں تنقید کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔" یہ ضروری ہے کہ جدید تنقید میں دوسرے علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے بھی استفادہ کیا جائے۔ ڈاکٹر آلی عابدی کی توجہ اس طرف بھی ہے اور انھوں نے خاص طور پر ڈاکٹر جانسن کے سوانح نگار بوسویل کے بارے میں اپنی کتاب "جدید رائے تنقید" میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے

فتگو فرمائی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا سائنسی علوم سے گہرا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مختلف موضوعات کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھنے کا سائنسی عمل موجود ہے اور ان تجربات سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں انھیں ادبی پیرائے میں بیان کر دینے کا بھی۔ ان کے تحریر کردہ مضامین کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ ڈاکٹر اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی تشریحات کی ضرورت کے قائل بھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو و فارسی کے اہم شعرا جیسے وحی، حافظ، میر، انیس، غالب اور دبیر کے فن پر بھی اہم مضامین قلم بند کیے ہیں اور ان شعرا کو نئے انداز سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان مضامین کی اہمیت اور ان کے علمی و ادبی معیار کے علاوہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے پھوٹ کر منظر عام پر آئے ہیں جو سائنسی خلوص اور محبت سے لبریز ہے اور جس میں بغض و عناد، تعصب کا شائبہ تک نہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے عقائد میں بھی بڑے مستحکم ہیں جن سے ان کی فکر ظاہر ہو کر مزید روشن ہوتی ہے۔ اور وہ اس روشنی و تمام تر یہ اذہان میں داخل کرنے انھیں بھی منور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل مستحسن ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ظاہر اذہان ہی علوم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑے موضوعات کی انتخاب بندی کی اور انھیں عام فہم انداز میں تحریر کیا تاکہ عوام الناس ان مضامین سے استفادہ کر سکیں۔ نیویارک کے اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کا دائرہ قارئین بہت وسیع ہے اور لوگ انھیں بڑی رضا و رغبت سے مطالعہ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی شمالی امریکہ کے ایک ایسے محترم اردو اہل قلم ہیں جنھیں نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور جن کی اردو زبان و ادب کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کو یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پروفیسر جنک پانڈے:- میرے لیے یہ بے حد خوشی کا موقع ہے کہ میں ایک ایسی شخصیت کی ادبی تخلیق سے آپ کو ایسے شخص سے متعارف کرا رہا ہوں جو رہتے تو کینیڈا میں ہیں مگر ان کا دل ہر پل ہندوستان کے لیے دھڑکتا ہے ان کے سلسلے میں اقبال کا یہ شعر پوری طور پر صحیح

نیا ہے۔

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو ہمیں وہیں پر دل ہو جہاں ہمارا

یہ شعر ڈاکٹر تقی عابدی کے لیے صد فی صد صحیح ہے۔ کینیڈا میں رہتے ہوئے انھوں نے نہ تو حیدرآباد کو بھلایا اور نہ ہی ہندوستانی تہذیب اور ادب کو۔ خاص طور سے آپ اردو ادب سے جڑے رہے۔ ریسرچ کا وہ کام جسے کئی لوگ مل کر پورا نہیں کر سکتے ڈاکٹر عابدی نے اکیلے پورا کیا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر پر ان کی بلند پایہ تنقیدیں ہیں اور اب تک جو نہ کھلے تھے یا گئے ہیں۔ چودہ تحقیقی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کو مرثیہ سے بے حد دلچسپی ہے جو مثنوی کی حد تک ہے۔

"کائنات نجم" یعنی نجم کی دنیا ایک کتاب ہے جس میں مشہور شاعر علامہ نجم آفندی کی غزلیں، قطعات، نوحے، سلام وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔ ضخامت کے لحاظ سے یہ دو جلدوں میں تیار کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں 944 صفحے اور دوسری جلد میں 814 صفحات ہیں۔ نجم آفندی کا تعلق حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے تھا۔ انھوں نے 195 غزلیں لکھیں ہیں جو اس کتاب میں موجود ہیں۔

نجم صاحب 1903ء میں ہمارے اتر پردیش صوبہ میں پیدا ہوئے اور ان کے بزرگ (جد) حیدرآباد میں رہتے۔ بچپن آنے پر اپنے والد صاحب کے ساتھ حیدرآباد گئے۔ ان کا انتقال 1975ء میں ہوا۔

جو جاتا ہے یہ دنیا آدمی میری نظروں سے وہ اوجھل تو ہو جاتا ہے مگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے ہم سے جدا ہو کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ نجم صاحب اپنی شاعری کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ ملک کی آزادی کی تحریک سے جڑے رہے اور جیل بھی گئے۔ مگر وطن کی محبت ان کے دل میں بسی رہی۔ ان کی نظم "قیدی کا راگ" کے یہ مصرعے دیکھیے جو انھوں نے جیل میں لکھے تھے۔

ان قیدی کا رگ سے یہ بچن بولتے ہے
سونے کا سب تک جاگ پڑی بچن بولتے ہے

انھوں نے مزدوروں کے حالات پر نظمیں کہیں۔ کسانوں کو نعرہ دیا "مزدوری آواز" نظم میں لکھتے ہیں:

مجھ سے نفرت کیوں ہے بچو، میں اگر مزدور ہوں
کیا تمھیں یہ وہم ہے، انسانیت سے دور ہوں

•••

میرے ہی دم سے ہے، جو کچھ ہے تمہارے آس پاس
یہ مکان، یہ باغ، یہ بستر، یہ برتن، یہ لباس

•••

میں نے لوہے کو ڈھالا، میں نے توڑے ہیں پہاڑ
میں نے گلشن کر دیا، ورنہ یہ دنیا تھی اُجاڑ

نجم صاحب سرمایہ داری نظام کے خلاف تھے۔ یہ مصرعے دیکھئے۔

ان کا حق کیا ہے دولت دُنیا پر
جن کو کبھی سوچنے کی زحمت بھی نہ ہو

کربلا کے شہیدوں پر ان کی شاعری مرکوز ہے ان کا یہ شعر مشہور ہوا۔

جاں نثاروں نے ترے کردئے جنگل آباد
خاک اڑتی تھی شہیدان وفا سے پہلے

آج میں اس کتاب کی اجراء کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی کو مبارک باد دیتا ہوں اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ ان کا یہ ادبی سفر جاری رہے۔ یہ ادیب و محقق کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب طبیب بھی ہیں۔

اس جلسہ کے نویں ڈاکٹر فضل ہاشمی کو میں دعا میں دینا چاہوں گا جن کی کوشش سے یہ ادبی جلسہ ممکن ہو سکا۔ ڈاکٹر ہاشمی خود بھی میر انیس پر ریسرچ کر چکے ہیں اور اب "شعریات انیس" پر کام کر رہے ہیں۔

آخر میں آپ سبھی لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ۔

افتخار امام صدیقی
ایڈیٹر "شاعر" ممبئی
نومبر ۲۰۱۹ء

"فن کار اب بھی مستور ہے"

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے ادبی مکالمہ

س : ابتدائے آغاز میں آپ اپنے خاندانی پس منظر و افتخار کے ساتھ بیان کیجئے؟

ج : میرا تعلق امروہہ سے متصل سادات کی بستی نوگانواں سادات سے ہے۔ ہمارا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے اور ہمارا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیاء سے ہوتا ہوا امام زین العابدینؑ سے جا ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نسبت سے ہمارے اپنے رشتہ دار بھی رہتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں دینی علوم سے بہرہ ور علماء گزرے ہیں۔ میرے ذاتی کتب خانہ میں ہمارے جدِ امجد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی قلمی کتاب "تحقیق الیقین" کی سو سو سال پرانی کتاب موجود ہے۔ تقسیم ہند کے پانچ سال بعد ۱۹۵۲ء میں میری پیدائش ہوئی لیکن بچپن کی سات دہائیاں میرا وطن حیدرآباد ہی رہا جہاں میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد تعلیمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۸۸ء میں

س : کچھ اپنے تعلیمی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالیے؟

ج : ثانوی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ سے شروع کرکے علوم اسلامیہ میں عالیہ تک تعلیم حاصل کی لیکن بچپن ہی سے شعر و ادب سے جو شغف میرے بدن میں بہتے ہوئے خون کا حصہ بن چکا تھا اس کے زیر اثر میں طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب کی طرف راغب ہوا۔ بچپن ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی رہی اور اسکول و کالج میں اپنے ہم جماعتوں و ہم جماعت طلبہ کے مقابلہ میں شعر و ادب کی محفلوں میں اول آتا رہا۔

میرے والد سیشن جج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گوشہ نشین شاعر بھی تھے۔ میں مغربی ممالک میں پڑھنے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے دوران شاعری سے کنارہ کشی کر کے صرف جرنلزم اور صحافت سے علاقہ میں شامل رہا اگرچہ سولہ اٹھارہ برس کی عمر سے حیدر آباد دکن سے مؤقر روزنامہ "سیاست" کے علاوہ دوسرے مجلوں میں طبعی مضامین سلسلہ وار للکھتا رہا جو پسند کیے گئے۔ روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر مرحوم عابد علی خان اور جانشین ایڈیٹر محبوب حسین جگر ہمیشہ میری عزت افزائی کرتے اور میرے مضامین کو سرخیوں سے شائع کرتے جس کا مثبت اثر یہ نثری مضامین میری شناخت بن گئے۔

مغربی دنیا میں ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ شاعری کا دولہ شباب پر پہنچا چنانچہ اب اسی نثر و نظم یا شعر و ادب کے دوراہے پر زندگی کا سفر جاری و ساری ہے۔

س : آپ نے باقاعدہ شعر کہنا کب شروع کیا اور کیا کسی استاد سے باقاعدہ اصلاح لی؟ آپ کی عروض پر کتاب "رموز شاعری" تصنیف کرنے کی وجہ کیا تھی؟

ج : بے قاعدہ شعر کہنا یا بعض موقعوں پر تک بندی کرنے کا شغل تو مدرسے اور کالج کے ابتدائی دور کی تلخ اور شیریں یادیں ہیں۔ فطری شاعری جو ایک قدرتی چشمہ کی طرف سے سینے سے ابل پڑتی تھی مجھے شعر گوئی کے علاوہ بیت بازی کے مقابلوں، شعر و سخن کی محفلوں میں شریک کرتی رہتی تھی چنانچہ اسکول میں اگرچہ شاعری کا ماحول نہ تھا، کالج میں بھی شعر و ادب کا گزر نہ تھا لیکن وہاں میں شعر گفتنی کی شمع روشن تھی۔ جیسے ہی تعلیم اور معاش کی بندشوں سے ذرا مہلت ملی تو شاعری کی چاندنی پھیلنے لگی اور بہت کم عرصے میں شرق و غرب میں شعری محافل میں پذیرائی ہونے لگی۔

میری شاعری میں چوں کہ قدرتی اور فطرتی ذوق شامل رہا اس لیے کبھی اس فن کو علمی سطح پر پرکھنے کی کوششیں میں نے نہیں کیں۔ اس لیے شاعری میں میرا کوئی استاد نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ ابتدا میں علوم و عروض و قافیہ سے بے خبر شعر کہنے پر بعض اوقات تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا، جس کی طرف

قدیم کرنے میں نے بذات خود علوم عروض وقافیہ اور شعر و ادب سے مربوط دیگر علوم کا
دقیق مطالعہ کیا اور آخر کار شعر کی تقطیع میرے لیے مدرسی وہ تحقیق بن گئی جس پر
طلبائے حروف تہجی کی مشق کیا کرتے تھے اس فن پر دسترس حاصل کرنے میں نے
ایک آسان کتاب "رموز شاعری" تصنیف کی جس میں اردو کے مروجہ اوزان کی
تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی اس کے علاوہ تقطیع بجائی بھی اس میں شامل کی
تاکہ عوام، مبتدی اور مشاق سب شعر کی صحت سے واقف ہو سکیں۔

س: آپ تحقیق اور تنقید کے میدان کے شہسوار ہیں اس کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کی
وجہ سے مشاعروں کو روشن کرتے رہتے ہیں آپ کی شاعری کے مقام کا آپ کیسے
تعین کرتے ہیں؟

ج: کسی بھی شاعر سے اس کی شاعری کے مقام کا سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی سے اس
کی شیرینی کی بابت استفسار کرنا، جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ شیطان ہر شاعر کے
کان میں یہ بات پھونک دیتا ہے کہ میں مطمئن ہوں جو کچھ بھی شاعری میں میرا
مقام ہے یہ اس سے اچھی ہوئی ہرگز نہیں جس کا دعویٰ میرے بس میں نہیں۔
میں شعر کہنے کو برائے ادب اور برائے ہدف استعمال کرتا ہوں۔
شاعری کا شغف یہ ہے وہ تو صرف قدرتی چشمے کا بہتا ہوا پانی ہوتا ہے کہ
پتھروں سے ٹکراتے ہوئے، آبشاروں میں گاتے ہوئے، وادیوں میں مچلتی
جاتی ہیں یا وہ ہوتا ہے کہ جس سے تربیت شعری میں شاعر سے پیتے نہ
صرف جائز بلکہ مستحسن ہے اور بقول جمیل مظہری۔

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
یہ شے وہ ہے جب پیتے تو وہ نکل جائے آدمی کا

ہر چند قدامہ شعر کے معتقد ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

س: [illegible] کا نظریہ ہے [illegible] آپ کس طرح وقت نکال

لیتے ہیں جب کہ آپ کے پیروں سے سفر بندھے ہوئے ہیں؟

ج : سچ ہے ایک نظر سے دیکھیں تو سائنسی علم اور ادب دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے دور دکھائی دیتے ہیں لیکن جیسے دریا کا پانی ہمیشہ ان دو کناروں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتا ہے اسی طرح انسان کا ذوق شوق عزم اور ارادہ سائنس اور ادب کے کناروں کو ملا دیتا ہے۔

س : آپ کی بیگم گیتی عابدی کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے؟ کیا وہ آپ کے ادبی کاموں میں معاون بھی ہوتی ہیں؟

ج : میرا کچھ عرصہ ایران میں گزرا جہاں میں طبیب کی حیثیت سے مشغول رہا۔ اس دوران میری شادی ایرانی خاتون گیتی سے ہوئی۔ میری شریک حیات میرے اس علمی ریاضت اور قلمی جہاد میں ہمیشہ تعاون کرتی رہی۔ ہماری چار اولادیں ہیں دو بیٹیاں اور دو بیٹوں کی تمام تر تربیت اور روزانہ کے مسائل کا حل صرف میری بیگم کے سپرد رہا اور اس فرصت نے مجھے جم کر کام کرنے کا موقع دیا۔ ہمارے گھر کی زبان فارسی ہے اگرچہ ادبی فارسی میں نے ایران میں مقام سے سیکھی اور پھر تقریباً تمام فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کرکے اپنی تحقیقی اور تخلیقی سفر میں اس سے بے بہا استفادہ کیا۔ میرے تمام بچے فارسی بولنے کے ساتھ ساتھ پڑھ اور لکھ بھی سکتے ہیں اور اسی طرح اردو چوں کہ ان کی صرف پدری زبان ہے اس کو بھی بول سکتے ہیں ویسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں انھیں اردو زبان کی طرف وقتاً فوقتاً متوجہ کرتا رہتا ہوں۔

س : آپ ایک مصروف طبیب ہیں۔ اس مصروف زندگی میں شعر و ادب اور تصانیف کے لیے آپ کیسے وقت نکال لیتے ہیں؟

ج : اگر چاہ جائے تو زندگی میں وقت کی کمی نہیں۔ وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ہم بہت سے کاموں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے شغل کی تمام تر مصروفیت کے باوجود تقریباً (35) یا چالیس (40) گھنٹے ہر ہفتہ ادب پر صرف کرتا ہوں۔ ادبی مضامین پر مروقت غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ جس موضوع پر مجھے کچھ لکھنا یا کہنا

ہوا سے اپنا دامن بچھونا بنا کر ذہن میں مطالب تیار کرتا ہوں۔ چنانچہ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو مطالب باران رحمت کی طرح سفحۂ قرطاس پر اترنے لگتے ہیں۔ اس طرح سے مصروف رہنے میں بھی یہ گنجائش رہتی ہے کہ انسان اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کر سکے۔

س : اردو جہان میں صرف دو شاعر ہمیشہ بحث کا موضوع بنتے ہیں، غالب اور اقبال۔ ان دونوں پر لکھی گئی کتابوں، مرتبہ کتابوں، بکھرے ہوئے مضامین، بالخ تک کی مقدار کو ملا لیا جائے تو شاید انسائیکلوپیڈیا آف برٹینکا بھی ناکافی معلوم ہو۔ کیا سوچتے ہیں غالب و اقبال مداح سید تقی عابدی اس دنیا میں ہے؟

ج : اردو ادب سے چار عظیم شاعروں پر لکھے گئے مقالات اور کتابوں پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر تقریباً پچیس ہزار کے قریب کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مقالات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ دوسرے نمبر پر مرزا غالب ہیں جن پر تقریباً دو ہزار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میر تقی میر پر تقریباً چار سو، میر انیس پر تقریباً سات سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں آپ کا خیال صحیح ہے لیکن یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال پر لکھے گئے مقالات اور مضامین میں تکرار بہت ہے۔ بعض افراد نے صرف اس امتیاز کو حاصل کرنے کے لیے کہ وہ بھی اقبال پر تصنیف و تالیف رکھتے ہیں اس وشت میں قدم رکھا ہے ورنہ یہاں بھی تقریباً دو ہزار کتابوں کی فہرست طویل نہیں۔

س : علامہ صاحب آپ کی بدقسمتی یا خوش قسمتی کہ آپ شاعر ہیں کہ ان کی غزلوں اور نظموں نے مجھے اب تک بے تاب رکھا ہے۔ شاید آپ کے بے مثال کتب خانے میں تمام مجموعے محفوظ ہوں گے یہ صاحب اقبال کے ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔

ج : میں علامہ صاحب اپنی خوش نصیبی پر خوش ہوں کہ میں شاعروں میں رکھتا ہوں جنھوں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کا حق صرف ایک ناشر کو دیا ہے۔ میں اپنے ہر بڑے شاعر کے ساتھ رہا ہوں۔ ان کی طرح میں بھی چھوٹی چھوٹی خاص رنگ اور اپنی خاص خوشبو رکھتا ہوں۔ میں اپنے شاعر کے دامن میں اپنا خاص مقام رکھتا ہوں۔

ادب میں ریڈرشپ کی کمی کی وجہ سے بہت سے پبلشرز سیماب صاحب کے کلام کو جس طرح پیش ہونا تھا پیش نہ کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام تر کلام سیماب کا عمدہ طریقہ سے شائع ہوتا کہ اردو کے پرستار اس عظیم شاعر کے کلام اور فکر سے آشنا اور محظوظ ہو سکیں۔ میرے کتب خانے میں سیماب کے کچھ نایاب نسخے موجود ہیں جن سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتا رہتا ہوں۔

س : آپ کی کتابوں کی طویل فہرست سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ان موضوعات پر تحقیقی کام کیا ہے جس کی طرف ابھی اردو مشاہیر کی پوری توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

ج : دنیا کے ہر بڑے ادب میں شہرت اور اعتبار دو علیحدہ علیحدہ قدریں ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخصیت کو یہ دونوں اقتدار حاصل ہو سکیں چناں چہ اغلب یہ قدریں علیحدہ علیحدہ بستہ میں رکھی جاتی ہیں۔ اردو ادب اور خصوصاً لطیف ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن بہر حال قدرت ایسی کسی محنت کو ضائع نہیں ہونے دیتی اور مشہور ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے ریاضت کا ثمر مل جاتا ہے۔ اردو گلیوارے میں موجود افراد کی شناخت بدیسی اور پردیسی افراد کی نسبت اور رقابت، اردو کا شب و روز کا ماحول بالخصوص ان شخصیت کے لیے جن کی روٹی اردو سے جڑی ہوئی ہے ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جس میں شہرت کا پہلو اجاگر ہوتا ہے لیکن ان میں سے اکثر افراد بہت جلد سرنگوں اس لیے ہو جاتے ہیں کہ اس پرواز میں ان کی طاقت نہیں بلکہ دوسروں کی قوت شامل ہوتی ہے۔ ع

فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود

الحمد للہ میں اس گوشہ نشینی کے فیض و برکات سے مطمئن ہوں چوں کہ اردو کی موجودہ عظیم ہستیوں کے سامنے اعتبار رکھتا ہوں۔ ذوق و شوق اور اردو کی محبت میں دیوانگی حقیقت میں فرزانگی کا پروانہ بن جاتی ہے۔ آج کل بھارت میں اور پاکستان کی کراچی یونی ورسٹی میں اس حقیر و فقیر کے کام اور فن پر یونی ورسٹی کے طالب علم مقالے ترتیب دے رہے ہیں جو ہمت افزائی اور فن شناسی کا مثبت قدم ہے۔ میرے خیال میں ناقدین کی رائے، تبصرہ نگاروں کے اشارے شارحین کی

تشریحات اصحیفوں کے مباحثات وغیرہ سب کی اہم کام کی رہنمائی کے لیے مفید ہیں لیکن پتی اور حتمی بات یہ ہے کہ

ع بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

اور دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ اردو ادب میں ریڈر شپ یعنی مطالعہ کی عادت بہت کم ہوتی جارہی ہے۔

س : آپ نے اردو کے رثائی ادب پر عمدہ کام کیا ہے۔ خصوصاً مرزا دبیر پر۔ انیس کی ہمیشہ سے مرزا دبیر پر فوقیت حاصل ہے۔ شبلی نعمانی کا موازنہ انیس و دبیر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ فرمائیے کہ رثائی ادب کے محقق اور نقاد کی حیثیت سے آپ کی!

ج : سچ تو یہ ہے کہ ایوان مرثیہ کے دو بلند مینار انیس اور دبیر ہیں۔ انیس فلک مرثیہ کے آفتاب اور دبیر مہتاب ہیں۔ دونوں صاحبان عظیم شعرا تھے لیکن دونوں کا رنگ جدا جدا تھا۔ مفتی محمد عباس صاحب ایک نے کلام میں تلمیحات اور دوسرے کے پاس تشبیہ و استعارہ ہے۔ لوگ بھی اپنی اپنی پسند سے دو گروہوں میں بٹ گئے تھے لیکن یہ بحث انیس کے پاس واوہ ہے اور دبیر کے پاس آہ و واویلا ہے۔ غلط ہے دونوں کے پاس واوہ اور آہ کی آمیزش ہے اور یہی مرثیے کا حسن بھی ہے۔ انیس فرماتے ہیں ؎

نیچی بات ہو مضمون بھی عالی ہو وے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہو وے

یہ سچ ہے کہ انیس کے پاس سلاست شستگی اور روانی ہے دبیر کے پاس لفظوں کی شان و شوکت ایجاد کاری اور صناعی ہے جسے ہم دبیریت کہتے ہیں لیکن دونوں کے پاس اپنی اپنی تخلیقی قدرت بیانی جدت اور مہارت ہے جسے ہم جدت بیانی کہتے ہیں۔

[illegible]

کرتا ہوں۔ مرزا دبیر پر اب تک میری آٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ دبیر شناسی اُردو ادب کے لیے عموماً اور رثائی ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اُردو ادب کی فصاحت و بلاغت کو ترقی ہوئی۔ مرزا دبیر اُردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے سب زیادہ اشعار کہے، سب سے زیادہ رباعیات لکھیں، سب سے زیادہ الفاظ اُردو میں استفادہ کیے لیکن افسوس کہ موازنہ انیس اور دبیر میں علامہ شبلی نے انصاف نہیں کیا۔ دبیر کے فن، حسب، نسب، سب اور کلام پر سب رحمانہ حملے کیے گئے۔ ہمیں دبیر کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے لیکن میر انیس کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ اُردو کی ترقی اور توانائی کے لیے دبیریت کو کالجوں اور مدرسوں کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ حسن یوسف لو بازار مصر میں پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔ کوئی بھی نقاد کسی تخلیق کار کو مٹا نہیں سکتا۔ خدائے سخن میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

س : میر انیس کی شاعری اور ان کے شاہکار مرثیہ پر جو عمدہ و دیدہ زیب کتاب ہے اس کا اجمالی تعارف کروائیے؟

ج : میر انیس کے شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا تجزیہ راقم نے تقریباً آٹھ سو صفحات پر پیا جو دنیائے ادب میں مقبول ہوا۔ اس تجزیہ میں میر انیس کی حیات، شخصیت اور فن پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ مرثیہ کے ہر شعر کا جدا جدا مکمل تجزیہ کیا گیا جس میں فصاحت بلاغت، محاورے، روزمرہ، تشبیہات، استعارات، کنایات اور مجاز مرسل وغیرہ کی نشاندہی کے علاوہ صنائع لفظی اور صنائع معنوی کو بتایا گیا اور اس طرح میر انیس کی قادر الکلامی کی سند صرف ایک ہی مرثیہ سے ثابت کی گئی ہے کہ اس ایک مرثیہ میں صرف صنعتوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ ہے۔ تجزیہ کا عمل ہر شعر کو جداگانہ، پھر ہر بند کو جداگانہ اور آخیر شاہکار مرثیہ کا انگریزی ترجمہ پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے کرلیا تھا چنانچہ اس شاہکار کتاب میں

اس ترجمہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

س : ''کلیات غالب فارسی'' شاہکار کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کتاب پر اجمالی گفتگو کیجیے؟

ج : غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کی مرکزی کمیٹی نے مجھے غالب کے فارسی کلام کی تدوین اور ترتیب کی ذمہ داری سونپی چناں چہ راقم نے دقیق نگاری، دیدہ ریزی اور جانفشانی سے اس سنگین پتھر کو یک وتنہا اٹھا کر محراب عشق پر لیسا جما دیا جو آئندہ وقتوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ چودہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں مرزا غالب کا فارسی کلام ایک بسیط دیباچہ سو صفحات کے مقدمے کے ساتھ جس میں نئی سوا شعر کا ترجمہ اور تشریح بھی شامل ہے گزشتہ سال کتابی صورت میں منظر عام پر آیا جس کی رونمائی دہلی میں گورنر جنرل اور سفیر ایران وغیرہ نے کی۔ ''کلیات غالب فارسی'' میں (11337) اشعار ہیں جن کو متنی تنقید اور تاریخی تدوین اور ترتیب کے ساتھ رائج الوقت فارسی کے رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کلیات میں اختلافات نسخ بھی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے علاوہ ایک مختصر کتابیات بھی دی گئی ہے تاکہ غالب کی فارسی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ان پر تنقیدی کام کرنے والے اسکالرس کو بھی کتاب تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔

س : اردو ادب میں آپ اقبال شناسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقبال سے متعلق آپ نے کیا کیا کام کیے اور اقبال کی تصانیف پر روشنی ڈالیں گے؟

ج : علامہ اقبال سے عرفانی رشتے کی بنیاد پر راقم نے ''پیام مشرق'' تصنیف کی جس میں اقبال سے (251) خطوط جن میں ان کی بیماری، پریشانی اور [illegible] کا شدید ذکر ہے [illegible] کا شاید ہی کوئی بڑا ادیب یا شاعر ہو جس نے اس تصنیف سے اپنی ادبی سے مربوط مسائل کا ذکر نہ کیا ہو۔ اس کتاب میں اقبال کا مختصر فلسفہ اور اس سے متعلق بحث پیش کیا گیا ہے۔ عوام میں اس کتاب کی بڑی مقبولیت ہے۔ اس کتاب کو اقبال کا ذہن [illegible]

شائع کیا اور پوری کتاب میری ویب سائٹ www.dilaqiabedi.com پر پڑھی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں اس سال "تقی عابدی کی اقبال شناسی" پر ایم اے کی ڈگری پر ایک طالب کام کر رہی ہیں۔

س : آپ کی تصانیف اور تالیفات کی فہرست طولانی ہے؟ آپ نے بہت سی دیدہ زیب کتابیں اردو ادب کو پیش کی ہیں۔ آپ اپنی تصانیف کو قارئین تک کس طرح پہنچاتے ہیں؟

ج : میری (60) سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ میری سب سے پہلی کتاب فارسی کی کتاب "شہید" کا اردو میں ترجمہ تھا جو 1982ء میں تہران سے شائع کیا گیا۔ میری بعض کتابیں اقبال اکادمی لاہور، غالب انسٹیٹیوٹ دہلی، روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے علاوہ قیمہ انسانیت لاہور، اظہار اینڈ سنز لاہور اور ملتان سے شائع ہوئیں۔ بعض کتابیں دہلی اور حیدرآباد دکن سے بھی طبع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں اکادمی، انسٹیٹیوٹ اور دوسرے پبلشرز نے شائع کی ہیں وہ سب ان انجمنوں کے تحت فروخت کی جاتی ہیں بعض کتابیں جو یہ ادارے مجھے مفت دیتے ہیں وہ میں اس کتاب کے حقدار قارئین تک بلا معاوضہ پہنچا دیتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ جو کتابیں میں خود اپنے خرچ سے شائع کرتا ہوں وہ بھی بلا قیمت اس لیے اردو پرستاروں تک پہنچاتا ہوں کہ یہ سب توفیق خداوندی ہے کہ میں اپنا سرمایہ اس شریف زبان پر نچھاور کر سکوں اور شاید اسی کو ادب میں دامے، درمے اور سخنے خدمت کرنا کہتے ہیں۔ شاعر کی جملہ خواہشوں میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کا دیوان یا مجموعہ کلام دیدہ زیب شائع ہو۔ مرزا غالب نے اپنے خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال کا کلام اس زمانے کے عمدہ ترین مطبوعات میں شامل تھا چنانچہ جو دلی خواہش ان عظیم شعرا کی ان کے دلوں میں رہ گئی اس کی کسی حد تک واجب ادائی کرنے کی سعادت ان چند کتابوں کی صورت میں مجھے حاصل ہوئی۔ یقیناً اس پرآشوب اور کم فرصت کے زمانے میں کسی اردو کتاب کا مطالعہ خود مصنف یا مؤلف کے لیے اس کتاب کی قیمت تصور کیا جائے تو غلط نہیں۔

س : اقبال اور غالب آپ کے پسندیدہ شعرا ہیں؟ اور دونوں نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ اگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو کون کس پر حاوی رہے گا؟

ج : دونوں عظیم شاعر ہیں لیکن بہر حال غالب، غالب ہے۔ اقبال بڑے مقبول شاعر ہیں جو ہمیشہ غالب کے گل چیں بھی رہے۔

س : آپ نے غالب کے فارسی کلام کی تدوین کا کام بھی کیا ہے اور طباعت بھی۔ حالانکہ غالب کا فارسی کلام پہلے ہی مدون کیا جا چکا تھا۔ آپ نے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

ج : یوں تو غالب کا فارسی کلام ان کی زندگی ہی میں ان کے اردو کلام سے پہلے [1841] میں شائع ہو چکا تھا اور اس کے بعد بھی مختلف مطبوعہ نسخے چند اشعار اضافہ کر کے شائع ہوتے رہے۔ آخری بار "دیوان فارسی غالب" تقریباً تیس چالیس سال قبل [illegible] سے شائع ہوا۔ راقم نے "کلیات فارسی غالب" کو مکمل طور پر تدوین کرتے وقت [illegible] سے بسیط مقدمے کے ساتھ اور بہت سچھ اشعار کے سلیس ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کلیات میں جو غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کی طرف سے [illegible] سے شائع ہوئی بار (1137) اشعار کو پہلی تقریباً تاریخی ترتیب کے ساتھ [illegible] فارسی کے ہر صفحہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کلیات میں جو دو جلدوں میں ہے [illegible] فارسی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ فہرست اور [illegible] سوانح عمری بھی قارئین کی معلومات کے لیے کامل دیباچے اور انڈکس کے ساتھ رہی ہے تاکہ غالب کی فارسی دانی کے [illegible] میں تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے [illegible] کو اس [illegible] میں دشواری نہ ہو۔ اوپر ذکر کی گئی ضروری ہدایت [illegible] کے لیے ہیں تاکہ [illegible] "کلیات فارسی غالب" [illegible] بیسویں صدی [illegible] میں پیش [illegible] ضرورت کے مکمل کرنے کے لیے راقم نے [illegible] تاریخی [illegible] ترتیب سے [illegible] کیا ہے۔

س : غالب کی [illegible] آتی [illegible] ہیں جیسا کہ ان کی اردو غزلوں میں آپ نے [illegible] کا مرتب کیا ہے۔ غالب کے [illegible] کلام سے [illegible] غالب

اوران کی منقبت کے چند شعر مجھے بھی سنایئے؟

ج : یہ زمانے کی ستم ظریفی اور اردو کی بدبختی تھی کہ غالب کا حمدو نعتیہ، منقبتی اور رثائی کلام عوام کی نظروں سے دور رہا۔ حسن یوسف بازار مصر میں پیش ہونے کے بجائے برادران یوسف اردو کی مجرمانہ سازشوں سے قید رہا۔ لیکن نور نے ظلمت کا دامن چاک کرکے قرطاس کی سپیدی پر ظہور کیا اور راقم کی تحقیق، تدوین، تنقید اور تشریح سے یہ تحفہ جو آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے بعنوان "غالب دیوان نعت و منقبت" 2006ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں غالب کا تمام اردو اور فارسی کا وہ کلام جو ان کی حمدوں، مناجاتوں، نعتوں، منقبتوں، سلاموں، نوحوں اور مرثیہ پر مشتمل ہے ترتیب کے ساتھ منتشر کیا گیا اور اردو حصوں میں بڑی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس دیوان میں کل (2888) اشعار موجود ہیں۔ اس موقع پر ہم آپ کی نعت، منقبت کے چند اشعار بطور تبرک پیش کرتے ہیں ؎

سپاسی گزونامہ نامی شود
سخن در گزارش گرامی شود

یعنی وہ حمد کہ جس سے تحریری آبرو بڑھ جاتی ہے اور بات بیان میں وقعت پاتی ہے۔

حق جلوہ گرز طرز بیان محمدؐ ست
آری کلام حق بزبان محمدؐ ست

یعنی حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیٰؐ کے انداز بیان سے ہاں حق کا کلام محمدؐ کی زبان سے جاری ہوا۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

یعنی غالب نے حضورؐ کی ثنا خدا پر چھوڑ دیا ہے اس لیے کہ وہ صرف محمدؐ کے مقام اور مرتبہ سے واقف ہے ؎

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہؐ کے غالب گنبد بے در کھلا

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

• • •

میں قائلِ خدا و نبیؐ و امامؑ ہوں
بندہ خدا کا اور علیؑ کا غلام ہوں

• • •

جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفیٰؐ
اس جگہ تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے

س : رثائی شاعری کے سلسلے آگرہ کا نام اردو جہاں میں مکمل طور پر متعارف نہیں۔ سیماب اکبرآبادی، بزمؔ آفندی یہ تین بڑے نام ہیں۔ بزمؔ آفندی مرحوم نے سیماب صاحب کے انتخابِ کلام کا مجموعہ حسنِ کار کا دیباچہ بھی لکھا تھا۔ آپ نے دونوں مرحومین پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔ اختصار کے ساتھ ان کا تعارف مع امثلہ روا ہے۔

ج : آگرہ کی سرزمین اردو شاعری کی زرخیز زمین رہی ہے۔ آگرہ کی سیاست تاج محل سے بھی ان معنوں سے بھی ہے جنھوں نے فنِ شعر و ادب پر روشنی ڈالی۔ ایسے بہت سے نام پیدا ہوئے جو دوسری زمینوں میں اپنی عظمت کی بدولت بنے۔ میرؔ تقی میرؔ سے غالبؔ، سیمابؔ اکبرآبادی ہوں کہ بزمؔ آفندی، نجمؔ آفندی ہوں یا ان سے شاد عارفی اکبرآبادی تک سبھی نے اس گلشن میں پھول کھلائے ہیں۔ میں نے ان تمام شعرا سے رثائی ادب پر کام کیا ہے۔ میرؔ، غالبؔ، بزمؔ اور صبا اکبرآبادی کے مرثیوں پر میرے "مقالات" میں "نوحۂ بابران" اور "سید بخش" شامل ہیں۔ سیمابؔ اکبرآبادی کی رثائی شاعری پر میرا مقالہ جو ان کی شاعری کا آغاز ہی ہے، ان کی شہادت کا عمدہ نمونہ ہے بعنوان "عاشقِ امام حسینؑ" جس قدر یہ مقالہ [illegible] تنقیدات اور اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ سیمابؔ اکبرآبادی قرآن، حدیث اور تاریخ اسلام پر گہری اور دقیق نظر رکھتے تھے جس کا پرتو ان کی شاعری میں ہے جس پر راقم الحروف تحقیقی

اور تشہیری کام کرے گا۔ جب کبھی کسی فن کار پر ظلم ہوتا ہے تو ادب کی روح تڑپ جاتی ہے۔ اس پرآشوب دنیا میں حقدار کو حق نہیں ملتا چناں چہ دیگر افراد کی طرف میری بھی سعی و کوششیں یہی رہیں کہ ایسے نامور شعرا اور ادیب جن کے ساتھ اہل قلم انصاف نہ کر سکے ان کے فن اور شخصیت کو اجاگر کیا جائے۔ بیسویں صدی کے عظیم شاعر تجم آفندی کی حیات، شخصیت اور کلام پر دو جلدوں میں مشتمل سو صفحات پر مشتمل کتاب برصغیر میں مقبول ہوئی اور اس طرح وہ عظیم شاعر جس نے انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد کی جس نے مزدور، کسان اور محنت کش طبقہ کی حمایت کی اس کا تعارف اردو ادب میں اس طرح سے ہوا جس کا وہ حق رکھتا ہو چناں چہ "کائنات تجم" اس سلسلہ کی وہ کڑی ہے جو ذہن انسانی کو جلا دیتے ہوئے ہے۔ "کائنات تجم" میں ایسی نظمیں موجود ہیں جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ تجم کے دل میں محنت کش طبقہ کا درد تھا جیسے حسین آغا ؎

کیوں دل جلوں کے سب یہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آپ سے اور ہاتھواں نہ ہو

بزم آفندی کا ایک ایسا نعتیہ شعر ذہن میں آرہا ہے جس کی مثال اردو اور فارسی شاعری میں مشکل ہی سے ملے گی ؎

ایک دن عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا
ہجر وہ غم ہے خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا

ان کے فرزند تجم نے کہا ؎

صورت گر ازل نے ترے اعتبار پر
کے مشت خاک تھی جسے انساں بنا دیا

•••

ملت میں تفرقہ کا نہ سامان کیجیے
قرآن کے ورق نہ پریشان کیجیے

•••

جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے
پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجیے

•••

کچھ درد سے حسینؑ کے لے گدازِ دل
للّٰہ اپنے دل کو مسلمان کیجیے

•••

سرکارِ دو جہاں کی محبت کے نام پر
آپس کے اختلاف کو قربان کیجیے

•••

مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو
دُنیا میں اتحاد کا اعلان کیجیے

سیماب شہادت امام حسینؑ سے ملت اسلامیہ کو بچانے اور سنوارنے کا درس دیتے ہیں ؎

بالیقیں سیماب یہ ذبحِ عظیم
خوابِ ابراہیمؑ کی تعبیر ہے

مولانا جوہر نے کہا تھا

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سیماب کہتے ہیں کہ کربلا تو ہر جگہ برپا ہو سکتی ہے لیکن حسینؑ کا وہ جواں کہاں ہیں؟

"وہ جو بتے ہیں شہادت ہر زمانے میں ہو عام
"جذبہ صادق" سے ہوسکتا ہے اس کا انصرام

•••

پہنچتا ہوں ان سے، تیرہ سو برس سے آج تک
میں نہ تھا نہ سہی یہ اس جذبہ صادق سے دور

•••

کیوں خدا کی راہ میں دیتی نہیں یہ اپنی جان؟
آج بھی لاکھوں مجاہد ہیں سروڑں ہیں امام؟

•••

روح ہے اسلام کی مدت سے مرجھائی ہوئی
جوش میں آتا نہیں کیوں ان کا خون لالہ فام؟

•••

ہر طرف اسلام پر طاری ہے یکسر نہ جمود
سرفروشانہ یہ کیوں مرتے نہیں پھر اہتمام؟

•••

سب زبانی ہیں یہ باتیں، بے حقیقت سب دلیل
منصب ابن علی کا ہو چکا ہے اختتام؟

•••

سبط شاہ مشرقین، اب کوئی بن سکتا نہیں
بزم عالم میں "حسین" اب کوئی بن سکتا نہیں

س : آپ کو اگر جہاں گرد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ اپنے اسفار پر بھی کتاب "سفرنامہ تقی عابدی" ضرور لکھئے۔

ج : یوں تو میں نے درجنوں سفرناموں کو بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ میں نے جن جن ملکوں کو دیکھا ہے ان کی مختصر سی یادداشت بھی اسی زمان اور مکان میں قلم بند کر لی ہے۔ انشاءاللہ وقت ملتے ہی ان سفرناموں کو تصویر کے ساتھ پیش کروں گا۔

س : آپ کی پسندیدہ صنف شاعری کون سی ہے اور ان میں آپ نے کیا کیا عروضی تجربے کیے؟

ج : نظم میری پسندیدہ صنف ہے میں غزل کہتا ہوا بھی نظم کا شاعر ہوں پابند نظم اور آزاد نظم میں بھی میں نے غزل کی مترنم بحروں سے استفادہ کیا ہے۔ چناں چہ میری بعض نظموں میں غزل کے مصرعے ہونے لگتے ہیں جس سے نظم کا اثر دوآتشہ ہو

بتائیے۔

س : ''عروسِ سخن''، ''سبدِ سخن'' اور ''گردِ بارانِ'' کا اجمالی تعارف کروائیے؟

ج : ''عروسِ سخن''، ''سبدِ سخن'' اور ''گردِ بارانِ'' میرے مقالات کے مجموعے ہیں یہ مقالات میں نے مختلف شعر و ادب کے موضوعات پر گزشتہ دو تین دہائیوں میں مختلف اخباروں، جلسوں، سیمیناروں اور میگزینوں کے لیے لکھے جنھیں بڑی کاٹ چھانٹ کر ان کتابوں میں یکجا کیا ہے تاکہ ان موضوعات پر بھی مواد فراہم ہو سکے جو شعر و ادب میں خال خال ہیں۔

س : ''مصحفِ تغزل'' کیا ہے؟

ج : ''مصحفِ تغزل'' نجم آفندی، آبہ آبادی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں کلام کے ساتھ ساتھ اس میں کئی تنقیدی اور تاریخی مضامین جو شاعر کے فن اور شخصیت سے مربوط ہیں پیش کیے گئے ہیں۔

س : ''روپ نگار مہاری'' کیا کوئی تاریخی مشقیہ داستان ہے۔ یعنی مجنوں طرز کی داستان ہے؟

ج : ''روپ نگار مہاری'' تیمور کی پنڈت خاندان کی پڑھی لکھی خاتون تھی وہ دان محمد کی بیٹی تھی اور فضل اللہ فضلی سے پہلی کی شاگرد تھی۔ روپ نے سلام، مرثیے اور قصیدے لکھے تھے، قرعہ نے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ ان کو کتابی صورت دی جو بہت مقبول ہوئی۔

س : [illegible] کتب خانہ شخصی کتب خانوں میں بے مثال ہے'' اردو ادب کے [illegible] یہ کتب خانہ کیسے آتے ہیں اس کتب خانہ کو [illegible] ہے اس میں [illegible] کی قدیم اور کلاسیکی کتابوں کے علاوہ سینکڑوں مخطوطات بھی ہیں۔ ان کا اجمالی تعارف کروائیے؟

ج : [illegible] کتابیں ہیں [illegible] ہزار کتابیں ہیں۔ زیادہ تر کتابیں اردو شعر و ادب کی ہیں تین چار سو کتابیں فارسی شعر و ادب سے متعلق ہیں۔ ایک حصہ قلمی کتابیں تحریری علمی اور ادبی کتابیں بھی اس کتب خانے میں شامل ہیں۔

اُردو و فارسی کی زیادہ تر کتابیں کلاسیک ادب، شعر و شاعری، تنقید و تحقیق، تذکروں، سوانح عمریوں، لسانیات اور دیگر ادبی تخلیقات سے مربوط ہیں۔ شاید ہی دُنیا کی کسی ذاتی لائبریری میں انگلش ڈکشنری، ویبسٹر (Webster) کی تقریباً تمام جلدیں جو گزشتہ دو سو سال میں مختلف مقامات سے شائع ہوئی ہیں ایک جگہ میری لائبریری کی طرح جمع کی گئیں ہوں۔ نقدیہ ادب، رثائی ادب، غالبیات، اقبالیات، رسائل، میگزین، دُنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود مخطوطات کی شائع شدہ فہرستیں بھی ہماری لائبریری میں ہیں۔

کئی اُردو، فارسی اور انگریزی ادب کے مطبوعہ پہلے ایڈیشن بھی ہم نے جمع کیے ہیں۔ میرے کتب خانے کا مقصد صرف جمع آوری نہیں بلکہ ان سے دن رات استفادہ ہے اور اس سے تحقیق اور ادب پر کام کرنے والے اسکالرس کو مواد فراہم کر کے مدد کرنا بھی ہے۔ جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانہ میں چودہ سو کے لگ بھگ مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد قلمی مرثیوں، رثائی بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہیں۔ ان مخطوطات کو میں نے چالیس (40) سال کے عرصے میں جمع کیا ہے اس لیے اب ان مخطوطات کو یہاں کی یونی ورسٹی کو عطیہ کے طور پر کتب خانہ کی کتابوں کے ساتھ دینے کے لیے ضروری کارروائیوں میں مصروف ہوں۔ چوں کہ میرا تعلق تحقیق اور تنقید کے ساتھ بھی ہے اور میں نے ذاتی تجربات سے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ اُردو ادب کے یہ ذخائر تحقیق اور تنقید کے لیے ضروری ہیں اس لیے میری حیات تک یہ ذخائر میرے پاس موجود رہیں گے لیکن میرے مرنے کے بعد فوری یونی ورسٹی کے ذخائر میں ضم ہو جائیں گے تاکہ اُردو اسکالرس اس سے استفادہ کر سکیں۔ میں نے کتب خانہ اور مخطوطات سے اپنے قریبی ورثہ کے رشتہ داروں کو اس لیے بھی بے دخل کر دیا کہ اس ادبی سرمایہ تک اُردو ادب کے پرستاروں کی رسائی ہو سکے ورنہ میرے ذاتی تجربوں میں جہاں کہیں بھی نادر مخطوطات ہیں وہاں اس ذخیرہ پر خاندان کا کوئی فرد سانپ بن کر صندوق کے اوپر بیٹھا رہتا ہے اور دوسروں کو اس کے قریب بھی نہیں آنے دیتا

جس کا نتیجہ ذخیرہ دیمک کی نذر ہو جاتا ہے۔

کتب خانہ کی پرانی و نادر کتابیں اور مخطوطات تمام تر برصغیر سے جمع کی گئی ہیں۔ رثائی ادب کی کتابیں اور چھوٹی قلمی مرثیے اور قلمی رثائی بیاضیں راقم کو "جعفر زٹلی" سے علمی ذخیرہ سے حاصل ہوئی ہیں جن کی قدر کوئی خاص زیادہ بھی نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی کتابیں کیٹلاگ انہیں پہنچ سکیں اور یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔ بہر حال رثائی ادب کا یہ ذخیرہ بھی جو چند سو کتابوں پر مشتمل ہے آئندہ مغربی دنیا کی یونیورسٹی میں محفوظ رہے گا۔ گزشتہ آٹھ دس سالوں میں مخطوطات کے تحفظ اور نمبداری کی بابت جدید ٹکنالوجی نے مسئلہ بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔ بھارت میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اب مخطوطات دفنی زندگی جی رہی ہے۔ مختلف مراکز قائم ہوئے اور عالمی شہرت یافتہ کتب خانہ اپنی اپنی سرحدوں میں یہ کام عمدگی سے کر رہے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ دہلی کے معروف تاجر جناب جمعہ اماجد نے شہر دہلی میں ایک بڑا کتب خانہ اور برصغیر کے مختلف شہروں میں حسب ضرورت مخطوطات کی قیمہ کاری کے لئے جہاں ایک خود رو شکستہ خط مخطوطات کی قیمہ کاری کے کاغذ کی طرح مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ جناب جمعہ اماجد نے میرے ذاتی قدیم مخطوطات و مطبوعہ قیمتی کتب کے بھی مفید مشورے دیئے کہ میرے تمام مخطوطات و بیاضوں کی مائیکرو فلم بنوا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لوں۔ چنانچہ ان حالات میں میں نے فلم بنوانے کی کوشش کی ضرورت محسوس کی۔

کل آپ نے کئی مہینے کا تجربہ کامیاب رہا کانفرنس امریکہ اور کینیڈا میں منعقد ہوئیں اور میں نے ہر کانفرنس میں آپ شرکت کرتے ہیں اس کے بارے میں کچھ اظہار خیال کیجئے۔

ج امریکہ اور کینیڈا میں کئی کانفرنسیں ہوئیں جن کا تعلق "اردو زبان" سے تھا۔ ان کانفرنسوں کی مرکزی کمیٹی کا صدر دفتر بنیادی طور پر کینیڈا کی وجہ سے میری خدمات اور بہت بیت کمیٹی کانفرنس سے رہی

تا کہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ان کی شرکت اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ گفتگو اور اس پر سیر حاصل مباحثہ ہو سکے جو کانفرنس کا مقصد بھی تھا۔ چناں چہ ان عالمی کانفرنسوں میں میرا وجود نمایاں رہا۔ ان شمالی امریکہ عالمی کانفرنسوں کے علاوہ بھارت، پاکستان، انگلینڈ، مڈل ایسٹ کی بعض عالمی اردو کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، چوں کہ میرا تعلق اردو کی نئی بستیوں سے ہے اور ان نئی بستیوں کی حیات کا دارومدار اردو کے ہوا رہے سے ضروری ہے۔ اس لیے بھی اس ارتباطی پل کو برقرار رکھنے کی خاطر شرکت مفید ثابت ہوئی شمالی امریکہ عالمی کانفرنسوں کے اجلاس کے مضامین اور بحث و مباحثہ کے مطالب نے بھی ہمیں دوسری عالمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اکسایا۔ یہ ہمیشہ میری کوششیں رہی ہیں کہ ہر کانفرنس میں اپنا مقالہ اور اپنا مورد نظر، نظریہ پیش کرسکوں اور اس کام کے لیے ہوم ورک بھی ضروری جانتے ہوئے میں ان افراد کے گروہ میں شامل ہو گیا جن کا کانفرنس میں شرکت کا مقصد تفریح یا سیاحت نہیں بلکہ ایک علمی ادبی اور تحقیقی کاوش ہو۔ گزشتہ تیس سال مغربی دنیا میں رہتے ہوئے مختلف مقامات کی سیر آرزو نہیں رہی یہ سچ ہے کہ میں کسی بھی ادارے یا اکادمی سے سفر و حضر کے مطالبات نہیں کرتا اگر کوئی ان دعوتوں کو مہیا کردے تو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں ورنہ یہ کوئی ایسا بھاری پتھر بھی نہیں جس کو میں اٹھا نہ سکوں۔ بقول انیس ؎

کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

س : اردو کی نئی بستیوں میں امریکہ اور کینیڈا دو بڑے ممالک ہیں ان دونوں ممالک میں اردو کل آج اور کل پر روشنی ڈالیے؟

ج : اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا فروغ جاری ہے اب اردو صرف اردوئے معلی تک محدود نہیں بلکہ اردوئے محلہ میں رونق بازار ہے۔ اب اردو کا پرچم اردوئے معلی نہیں بلکہ اردوئے محلہ پر لہرا رہا ہے۔ دبستان دہلی، لکھنؤ، آگرہ، حیدرآباد، پنجاب وغیرہ میں اردو کی نشوونما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت ضروری

ہے۔ کسی دبستان کو دوسرے دبستان پر اس دور میں فوقیت حاصل نہیں اور اردو ادب عالمی شہرت کا حامل ہے۔ اب اردو کا شعر زمان و مکان کی حدوں سے نکل چکا ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

امریکہ اور یورپ میں آج کل اردو بولنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ وہاں سے درجنوں مشاعرے اور سینکڑوں ہفت روزہ اخبارات کی اردو ریڈیو پروگرامس کی علاوہ اردو ٹی وی چینل کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر اردو عالیہ کی تحقیق اور تنقید کا کام بھی ہو رہا ہے۔ راقم نے ان ہی ملکوں میں اردو کے سو سو سنوارنے کی کوششیں کی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی بعض یونی ورسٹیوں میں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ہمارے اردو کی طرح یہاں بھی اردو اب کاغذوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے آنکھوں کی زبان نہیں رہی جس کے لیے اس کی بنیاد کی تعمیر کی گئی تھی۔

س : اردو رسم الخط کی اہمیت کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج : جہاں تک اردو رسم الخط کا مسئلہ ہے میرا نقطۂ نظر بالکل صاف اور واضح ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں۔ میں اردو رسم خط کی بہ طور حفاظت کو اردو کے لیے لازمی سمجھتا ہوں۔ اردو رسم خط اردو کے جسم پر اس کی چمڑی کی مانند ہے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اردو رسم خط اردو کی آن بان اور پہچان ہے۔ اس رسم خط میں اردو تہذیب اور اردو کی علمی، ادبی اور ثقافتی اقدار شامل ہیں۔ راقم نے مختلف اردو عالمی کانفرنسوں میں واضح طور پر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ اردو رسم الخط کی حفاظت کی ذمہ داری خود اردو والوں پر ہوتی ہے۔ اردو والے اس رسم الخط کو اپنی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو کوئی اور اردو رسم خط کو ختم نہیں کر سکتی۔

[illegible] کے لیے ندن کا خواہاں تھا۔ وہاں اردو کے درمیان اردو کی ترقی کے کام شروع ہوا تو [illegible] اردو کو آج تک مرنے سے نہیں بچا سکی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

ج : میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

س : کراچی شہر میں ایک مرثیہ اکاڈمی قائم ہے لیکن ہندوستان میں لکھنؤ ایک ایسا شہر ہے جہاں اس نوع کی اکاڈمی قائم ہو سکتی تھی اردو کی نئی بستیوں کا حال کیا ہے، خاکسار کے علم میں نہیں اس موضوع پر اگر آپ روشنی ڈال سکیں تو "شاعر" کے بے شمار وہ قارئین جو رثائی شاعری پسند کرتے ہیں ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا؟

س : اردو کی نئی بستیوں میں مرثیہ نگاری ہو رہی ہے۔ مرثیہ پر درجنوں تھیسس لکھی جا چکی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ ہزار سے زیادہ مجالس اردو میں مغربی ممالک میں سالانہ ہوتی ہیں جن میں اردو سلام، مراثی، نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ عزاداری کی ضرورت کے تحت تخلیقی کام بھی ہو رہا ہے۔ جرمنی میں قبال حیدر، انگلینڈ میں رضا حسن غدیری، نیوجرسی میں شباب کاظمی، واشنگٹن میں باقر زیدی، عارف امام، سرفراز ابد، ٹورنٹو میں آصف اختر، عابد جعفری، قسیم امروہوی وغیرہ مرثیہ لکھ رہے ہیں۔

س : علامہ سیماب نے مثنوی معنوی مولانا رومی چھ جلدوں مثنوی کا اردو ترجمہ کیا تھا جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے کیا اور بھی کسی نے مذکورہ مثنوی کا اردو منظوم ترجمہ کیا ہے؟

ج : مولانا روم کی مثنوی معنوی میں تقریباً چھبیس ہزار اشعار ہیں۔ اگرچہ ہمارے درمیان نثری تراجم موجود ہیں لیکن میری دانست میں بجز علامہ سیماب کسی اور نے منظوم ترجمہ نہیں کیا۔ یہ بڑے جگر کاوی کا کام ہے میری نظر میں ان تمام جلدوں کو دوبارہ شائع ہونا چاہیئے تاکہ اردو طبقہ مولانا رومی کی شاعری اور فکر کے علاوہ سیماب کی سخن فہمی اور سخن گوئی سے مستفید ہو سکے۔

س : آپ نے فارسی زبان میں بھی دسترس حاصل کی ہے اردو کی بیشتر اصناف ایران ہی سے ہندوستان آئی ہیں بالخصوص غزل اور رباعی؟

ج : یہ بالکل سچ ہے کہ اردو غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ فارسی اور عربی زبان سے ہمیں ملے ان کی ظاہری تراکیب اور اصول وہی ہیں جو خارجی زبانوں میں ہیں لیکن جہاں تک معنی آفرینی کا تعلق ہے ان کی جڑیں ہمارے ملک کی زمین میں

رکھتی ہیں اسی لیے اس شاعری کو سبک ہندی کہتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا

مسخ شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیر جلالی کہ بود خوانساری
بہ سومنات خیالم در آی تا بینی
روان فروز برودوش ہای زناری

یعنی تم عرفی اور شوکت سے مرعوب اس لیے نہ ہو کہ ان کا تعلق شیراز سے تھا۔ تم اسیر جلالی سے اس لیے نہ ہو کہ وہ خوانسار ایران سے تھا۔ تم میری سومناتی دنیا میں آؤ اور دیکھو کہ میرے تجلیاتی روح کو گرمانے والے سومناتی خیالات ہیں جو میرے سینے پر زنار کا ندھوں پر زنار کا پڑا ہوا ہے۔

س : آپ علم و ادب سے سیاست میں اور جہاں گردی میں کلوہل وتیج سے ہزار ہا میل پرلی طرف تشریف لائیں تو آپ کس طرح کا موسم پسند کرتے ہیں۔ کس ملک کا موسم آپ کو پسند ہے"

ج : ہر ملک کا موسم کپڑوں اور رہن سہن کی ضرورت پیش نہ آئے۔

س : آپ نے ایک ایرانی خاتون سے شادی کی اور کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو کیا آپ عشق کی لذتوں سے بھی آشنا ہیں؟

ج : عشق میرے نزدیک مذہب اور زندگی کا رابطہ ہے۔

س : کس طرح کی پوشاک آپ پسند کرتے ہیں؟

ج : آپ نے خود دیکھا ہے اور تصاویر شاہد ہیں۔

س : آپ کی مرغوب غذائیں کون کون سی ہیں اور کیوں پسند ہیں؟

ج : [illegible] کا قورمہ اور ایرانی کباب۔

س : شراب میں آپ کی پسند سے شراب کون سی ہے؟

ج : چائے، کی اور فالودہ۔

س : پسندیدہ تیوہار کون سے ہیں؟

ج : [illegible]

س : اب تک کی دنیاوی زندگی سے آپ مطمئن ہیں؟

ج خدا کا شکر ہے۔ مولانا روم

ع "شکر نعمت، نعمت ات افزوں کند"

س : ہر ذی روح سوتے بھر خواب بھی دیکھتا ہے آپ نے خوب سیرت خواب کیا تھے اور اب کیا ہیں؟

ج : خواب دیکھنا میرا حق ہے۔ تعبیر کا انتظار ہے۔

س : نئے محققوں کے لیے موضوعات تجویز کیجیے۔

ج : جواب ان صفحات میں مشکل ہے۔

س : دبئی کے سفر میں ذی ذی اردو نے آپ سے ایک ملاقات بہ عنوان سے مکالمہ کیا تھا تب آپ نے (34) کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ اب آپ کی کتابیں کتنی ہیں؟

ج : میری (60) سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں زیر تالیف ہیں۔

س : از حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے قیمتی وقت میں سے خاصہ وقت مجھے دیا ہے۔ معذرت خواہ ہوں۔ اب میں جب بھی کسی عالمی مشاعرے میں سینیڈا آؤں گا تو پھر مفصل مصاحبہ کروں گا۔

ج : آپ کا انتظار رہے گا۔

(ماہنامہ "شاعر" ممبئی، اکتوبر 2019ء)

سید فاضل حسین پرویز

اُردو کی نئی بستیاں

"... زبان اُن افراد و جوڑوں کی ناقدری سے نہیں سکتی ہیں۔" تقی عابدی

ینیڈا میں مقیم حیدرآبادی ادیب، محقق، نقاد و شاعر

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے بات چیت

ہندوستان اور پاکستان کو چھوڑ کر دنیا کے کسی بھی ملک میں اُردو کا فروغ ہو رہا ہے تو اُسے اُردو کی نئی بستیاں کہا جاتا ہے۔ یہ نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں مگر امید ہے یہ نئی آبادیاں بڑی تیزی سے ساتھ اُردو کی ترقی و اشاعت کے لیے کام کیا جائے گا۔ اُردو کی نئی بستیوں کی اُردو تہذیب سے وابستگی ظاہر کرتی ہے۔ اُردو انجمنوں اور اُردو یونیورسٹیوں کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ ارتباط رکھنے اور اُردو کا سب سے بڑا مسئلہ بقائی تعلیم ہے۔ جب تک مکتب میں اُردو نہیں سکھائی جائے گی اُردو کی ترقی ممکن نہیں۔ ان خیالات کا اظہار ینیڈا میں مقیم ممتاز شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور مورخ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کیا۔

حیدرآباد کی سابق ماہر نباتات سیدہ تقی حسن عابدی کے یہاں 1952ء میں جناب سید تقی عابدی (مصنف) کے یہاں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد سے MBBS ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایم ڈی کیا۔ امریکہ میں ایف سی اے پی اور پھر ایف آر سی پی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی طبی میدان میں بہت بڑے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ 14 کتابوں کے مصنف ہیں۔ کئی کتابوں کی تالیف کر رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں 200 سے زائد مقالے پیش کر چکے ہیں۔ ان سے ملاقات کے

یہ ہے کہ اپنے تجربات کی دولت لٹا کر واپس آتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی معلومات کے بحر بیکراں ہیں۔ کسی بھی موضوع پر وہ گھنٹوں مدلل تقریر کرتے ہیں اور ان سے ملنے والوں کو کبھی بھی وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ گزشتہ دنوں مختصر سے قیام کے لیے حیدرآباد تشریف لائے تھے اس موقع پر انھوں نے ''گواہ'' کو مختصر انٹرویو دیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے یہ ادھورا رہ گیا مگر جو کچھ بھی ان سے بات چیت ہوئی اس کا خلاصہ قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ اس ملاقات کا اہتمام ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کیا تھا اور اس موقع پر ڈاکٹر شجاعت علی (ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف اردو ویشوبھارتی کالج، ناندیڑ)، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''اردو شاعروں، ادیبوں اور تخلیق کاروں کی ناقدری سے اردو کی نئی بستیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اردو کی ترقی، ترویج و اشاعت کے لیے اردو مزاج کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مشاعروں سے اردو کی ترقی نہیں ہو سکتی کیوں کہ مشاعرے اب آموزشی پلیٹ فارم نہیں رہے۔ شعرا اپنا مقام کھو چکے ہیں۔ وہ اپنی چھ شعروں کی غزل ساٹھ بار سنا کر چھ سو بار داد حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ مستقل شہرت کے لیے ایسے حضرات جن کا اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں رہتا چند ہزار روپیے خرچ کرکے ہر وہ شے خریدنا چاہتے ہیں جس کے وہ حق دار نہیں۔ یہ دراصل کاغذی شیر ہوتے ہیں جن کی اصلیت چند دن میں سامنے آجاتی ہے۔ دراصل مشاعرے بھی اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''کینیڈا میں ناظم الدین مقبول نے سندے اسکول کے ذریعہ اردو کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ نارتھ امریکہ میں پہلے سندے اسکولس کے ذریعہ اردو کا کام ہو رہا تھا مگر اب ان اسکولس پر دوسروں نے قبضہ کرکے اردو کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب تو جمعہ کے خطبات تک انگریزی میں ہونے لگے ہیں۔ صرف مجالس عزا ہی اردو میں ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''والدین کو احساس نہیں ہے کہ کس طرح اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلائی جائے تاکہ اپنی تہذیب سے ان کا رشتہ قائم رہ سکے۔ نئی نسل اردو نہ تو پڑھتی ہے اور نہ ہی بولتی ہے۔ جب تک نئی نسل کا رشتہ اردو سے جوڑا نہیں جائے گا اس

وقت تک اردو کے مستقبل سے متعلق یہ کہنا اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے لینا ہے۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "اردو رسم الخط کی تبدیلی کے لیے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت وقتاً فوقتاً تحریکات شروع کی جاتی ہیں۔ رسم الخط ہی زبان کی پہچان ہے۔ جب اسے ہی تبدیل کر دیا جائے تو پوری تہذیب ختم کر دینے کے مماثل ہے۔" انھوں نے نام نہاد دانشوروں اور ادیبوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "ان کی تخلیقات میں اردو کی اہمیت سے زیادہ خود اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے مغربی ادیبوں اور ناقدین کے حوالے دیے جاتے ہیں جس سے ان کے احساسِ کمتری کا ثبوت ملتا ہے۔ اردو سے زیادہ کس زبان میں اتنی لچک اور لہک ہے؟ اس کی ایک معمولی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ ایک شعر کی مختلف انداز میں ترنم سازی کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر مرثیہ شعر، غزل، سلام، رباعی، قطعہ، مثنوی، مطلب، مسمط اور متروک شعر۔ یہ کسی اور زبان کی مثال ضرورت ہے؟

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "اردو کی ترقی کے لیے اردو کتابیں ضروری ہیں۔ فی الحال میں ایک اچھی لائبریری میں ایک لاکھ سے زائد اردو کتابیں موجود ہیں۔ اب آہستہ آہستہ کتابوں کی چھپائی ختم کرنے کی سازش کی جا رہی ہے جو اردو کو ختم کرنے کی سازش ہوگی۔

تقی عابدی نے کہا کہ "ہمیں جاپان کی طرح تحسین پیش یا جو اردو ادب اور تاریخ میں بے مثال کام کر رہے ہیں۔

یہ سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "اردو کے کسی خدمت گزار پر تنقید کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہے۔ تنقید برائے تنقید ضروری ہے مگر اردو کی بنیادوں کا استحکام بنیادوں پر فیصلہ کرنے والی تنقید کو ناپسند کرتے ہیں۔"

گلزار جاوید
ماہنامہ "چہارسو" راولپنڈی
مئی۔جون 2009ء

براہ راست

اردو زبان اور اس سے وابستہ علوم و فنون کی ہر دلعزیزی کی بابت جس قدر بھی چاہے خوش امیدی و خوش گمانی قائم کر لیجیے حق کی بات یہ ہے کہ اردو زبان کے دعوی داروں اور اجارہ داروں کی نسبت وہ علاقے اور احباب زیادہ ایمان داری اور تندہی سے اردو کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں جہاں یہ زبان لطیف اور اس سے وابستہ ولیتے نہ صرف نامانوس، اجنبی بلکہ نامحفوظ بھی ہیں۔ جب جب بات سمندر پار مشتاقان اردو کی ہوگی تب، تب بے شمار نام اور چہرے حافظے کے پردے پر جلوہ گر ہو کر آپ کو اپنی جانب متوجہ ضرور کریں گے۔ ذرا سے غور اور تھوڑی سی فکر کے بعد جو نام سب سے زیادہ روشن، نمایاں اور بلند مقام کا حامل محسوس ہوگا وہ صرف اور صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہوگا۔ آج کی محفل ہم نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی کاوش اور کارناموں کے اقرار و اعتراف کی غرض سے صرف اس لیے سجائی ہے کہ درست وقت پر درست انداز میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا جائے بلکہ اپنی زبان اور ادب کے بہتر مستقبل کی خاطر شیدائیوں سے اُن کی پذیرائی کچھ اس انداز میں کی جائے کہ انیس، دبیر، غالب اور اقبال کی ارواح کو اتنا اطمینان تو ہو کہ اہل اردو نے اُن کی زندگی میں انھیں نہ سہی اُن کے ایک سچے عاشق اور نیازمند کو اُس کی زندگی میں بقدر ذوق سرفراز کیا۔

گلزار جاوید

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کی علمی، ادبی اور تحقیقی جہات سے باخبر حلقے آپ کی شخصیت سے اُس طور واقف نہیں جس طور آپ کے کارناموں سے آگاہ ہیں۔ کیوں نہ آج

کی نشست میں گفتگو کی ابتدا خاندانی پس منظر سے کی جائے؟

ج میرا آبائی تعلق امروہہ سے متصل سادات کی بستی نوگانواں سادات سے ہے۔ ہمارا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے اور ہمارا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیا سے جا ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی بھی اسی نسبت سے مجھے اپنا رشتہ دار کہا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان میں رسمی علوم کے بے شمار علما گزرے ہیں۔ ہمارے جد سے ہاتھ کی لکھی ہوئی "حق الیقین" نامی وہ کتاب جو ۱۲۰ سال پرانی ہے میرے پاس بھی محفوظ ہے۔ میری پیدائش البتہ دہلی میں ہوئی اور حیدرآباد میں بچپن ہی سے میرا مسکن بن گیا۔ بچپن ہی سے شعر و ادب سے خاصی دلچسپی رہی جس کے باعث اسکول و کالج کے ایام میں شعری مشغلہ جاری رہا۔

س آپ کا پیشہ اور دہلی منتقلی کے اسباب پر روشنی ڈالیے؟

ج میرے والد سید شبیر علی عابدی تک ہمارا خاندانی پیشہ زمینداری ہوا کرتا تھا۔ میرے والد سید سبط علی عابدی نے سب سے پہلے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ قانون کی ڈگری بھی حاصل کی اور دہلی میں پریکٹس کرنے لگے۔ ازاں بعد والد صاحب کا تبادلہ حیدرآباد ہوا یوں ہمارا مستقل مسکن حیدرآباد بن گیا۔

س آپ کے بڑے ہونے تک حیدرآباد کے میدان ادب اور علمی درسگاہوں کے ایام کو ہمارے لیے بیان فرمائیے؟

ج میں نے عرض کیا نہ کہ میرا ددھیال علمی و ادبی ہونے کے ناتے ننھیال والوں میں اس قدر فنی حیثیت نہیں رہا جس قدر بچپن میں ہم نے دیکھا ہے۔ میرے والد صاحب وجیہ شاعر تھے اور انہی سے یہ وصف میرے اندر بھی منتقل ہوا۔

س آپ نے باقاعدہ شعر کہنا کب اور کس طرح شروع کیا؟

ج شعر کہنا شاعری کی جس قدر تخلیقی جہت آپ سمجھتے ہیں اس قدر تو نہیں البتہ شاعری اور تک بندی میں ہوا کرتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ ماحول میں شاعری کا ماحول تھا تو ہم نے اتفاق سے کالج میں بھی شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے ہم جماعت پائے۔ یوں میرے دل میں شعر و شاعری کی نسبت خاص اہمیت

تھی اس لیے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شعر بخن کی محفل میں شرکت کرتا اور بیت بازی کے مقابلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں شاعری کو اپنی شناخت بنانا چاہتا تھا۔ جب تعلیم اور معاش کی بندشوں سے ذرا فرصت ملی اور میں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا تو بہت جلد عرصے میں بطور شاعر میری شناخت قائم ہوگئی۔

س : اب سوال بنتا ہے قلم و کتاب سے آپ کے سنجیدہ مشق سخن کے سفر کے آغاز اور اُس کے ابتدائی نتائج کا؟

ج : روزنامہ "سیاست" اور حیدرآباد کے ادبی مجلوں میں میرے مضامین کی ابتدا اُس عمر میں ہوگئی تھی جسے انگریزی میں Teen Age کہا جاتا ہے۔ روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر مرحوم عابد علی خاں اور جوائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے اور میرے مضامین کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے جس کے سبب مذکورہ مضامین میری شناخت بن گئے۔ میڈیکل کالج اور مغربی ممالک کی اعلیٰ تعلیم کے دوران شاعری سے کسی قدر کنارہ کش رہ کر جرنلزم اور صحافت کے حلقے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد میری توجہ طب سے زیادہ ادبی مضامین پر مرکوز ہوگئی اور میرے اندر سویا ہوا شاعر اور ادیب پھر سے جاگ اٹھا۔ اس دوران میرا ادبی و شعری مطالعہ شدید اور بھرپور رہا۔ ایک مدت میں کئی کئی کتابیں کھنگال ڈالتا اور اکثر کتابوں کے حاشیوں پر نوٹس بناتا اور اس طرح کئی دفتر اپنے لیے نوٹس اور مطالب کے تیار کر لیے۔

س : بیرون ملک آمد سب اور کس مقصد کے تحت کی گئی؟

ج : آپ کے سوال کا جواب میرے تعلیمی سفر کے اندر پنہاں ہے اور یہی میری بیرون ملک آمد کا واحد جواز تھا۔

س : امریکہ سے کینیڈا منتقلی کے اسباب کیا تھے؟

ج : ہر آدمی پرسکون اور پرلطیف زندگی کا متلاشی ہوا کرتا ہے۔ امریکہ کی نسبت کینیڈا کا ماحول پرسکون ہے اور صرف انچاس سال کی عمر میں جس وقت میرے موجودہ

ادارے نے مجھے پروفیسری کے اعزاز کے ساتھ یہاں کام کی دعوت دی تو میرے خاندان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ کینیڈا میں مستقل سکونت اختیار کرنا ہمارے لیے ہر لحاظ سے سودمند ہوگا۔ اس لیے اور بھی کہ میڈیسن میں داخلہ بھی بنا۔

س محترمہ عتیق عابدی سے پہلی ملاقات سے خاتون خانہ تک کی مختصر روداد آپ کے قلمی سفر میں ان کے کردار و شخصیت کی بابت کچھ فرمائیے؟

ج محترم جناب آپ کے سوال کے جواب میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ بطور طبیب جب میں ایران میں مشغول تھا تو میری خاتون خانہ سے وہیں ملاقات ہوئی اور تھوڑے عرصے بعد ہم دونوں کی رضامندی اور بڑوں کی اجازت سے ہماری شادی ہوئی۔ میری شریک حیات محترمہ نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ میرے قلمی جہاد میں ہمیشہ میری معاونت کرتی رہی ہیں اور آج بھی ان کے تعاون کے بغیر میرا ادبی سفر جاری رکھنا ناممکن ہے۔

س آپ کی فارسی زبان و ادب کی جانب توجہ میں محترمہ کا کس قدر کردار یا تعاون شامل ہے۔

ج باقاعدہ رسمی تعلیم میں نے تہران ایران کے دوران ایرانی معلم سے حاصل کی۔ اس بعد فارسی ادب اور فارسی شعرا کے کلام کا مطالعہ کرکے اپنی تحقیق اور تخلیق سے میں کسی بھی بہادر سے بے پناہ استفادہ کیا۔ بہرحال چونکہ ہمارے گھر کی زبان فارسی ہے اس لیے خاتون خانہ کا تعاون میری فارسی دانی میں لامحالہ شامل ہے۔

س محترم آپ کی ادبی مصروفیات اور آپ کی مصروفیات کی نسبت ان کی توجہ و تحقیق سے تقریباً کتنی خدمت کی ہے؟

ج ہماری چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ میرے بچے فارسی بولنے کے ساتھ کسی حد تک لکھ بھی لیتے ہیں۔ میری خصوصی توجہ سے باعث اردو زبان سمجھتے اور کچھ کچھ بول لیتے ہیں۔

س [illegible]

محافل میں سر آرمنہ ہونے والے اہل قلم کو کم سے کم اعتراف دی جاتی ہے۔ آپ کے بارے میں اس حوالے سے صورت حال کس قسم کی ہے؟

ج : گلزار صاحب! معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ آپ کا سوال مجھے کچھ کچھ Out of Date سا محسوس ہو رہا ہے۔ میری ذات سے قطع نظر پڑھے لکھے اور روشن دماغ اہل قلم کے پاس اس قسم کی مصروفیات سے لیے لازم آج کل وقت دستیاب نہیں ہے اور مغرب کی تیز رفتار زندگی میں تو اس قسم کے اشغال کا تصور بھی محال ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب! آپ علمی، ادبی و تہذیبی طور پر کس دبستان سے قربت رکھتے ہیں۔ مثلاً دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد، کراچی وغیرہ نیز ان حوالوں کی اب کوئی حیثیت ہے بھی کہ نہیں؟

ج : میں اس سوال کو بھی اس سبب لائق توجہ نہیں سمجھتا کہ جونہی کسی دائرے یا خول میں جس دن گرفتار ہوا اسی دن اس سے سیکھنے کا عمل یوں جانیے کہ تھم گیا۔ میں تمام مکاتب فکر کا احترام کرتا اور ان کی مثبت تعلیم سے فیضیاب ہونے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

س : کبھی کبھی آپ کی قلمی فتوحات دیکھ کر رشک آتا ہے کہ آپ جیسا بلند پایہ پیشہ ور طبیب تصنیف، تالیف کے لیے اس قدر وقت یوں کر نکال پاتا ہے۔ کیا آپ ہمیں اپنے نظام الاوقات سے باخبر کرنا پسند کریں گے؟

ج : اگر سچ کہا جائے تو زندگی میں وقت کی کمی نہیں ہے۔ وقت کی کمی کو بہانہ بنا کر ہم لوگ بہت سے کاموں سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود ہر ہفتے اوسطاً پینتیس سے چالیس گھنٹے لکھنے پڑھنے پر صرف کیا کرتا ہوں۔ ہر وقت میرے ذہن کے خانے میں ان موضوعات پر غور و فکر جاری رہتا ہے جن پر میں آئندہ لکھنے کی منصوبہ بندی کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے جسے میں بیٹھتے، چلتے پھرتے، خود پر طاری رکھتا ہوں معنی اور مطالب خود بخود سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور جب قرطاس و قلم لے کر

ٹپکتا ہوں تو الفاظ باران رحمت کی طرح خود بخود برسنے لگتے ہیں۔ بات صرف ذوق و شوق کی ہے۔

س رموز شاعری میں بحوالہ ڈاکٹر شان الحق حقی نہایت آسان زبان اور عام فہم انداز میں فن عروض پر روشنی ڈالی گئی ہے اول یہ کہ آپ نے فن عروض پر اس قدر مواد کہاں سے حاصل کیا اور اس مواد کے وسیلے سے شاعری میں یہ نمایاں مقام کیوں حاصل کر سکے؟

ج شاعری میں میرا کوئی باقاعدہ استاد تھا اور نہ ہے۔ علوم عروض و قافیہ سے بچپن شعر کہنے سے بعض اوقات تحسین ناشناس اور سطوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا جس کی طرف توجہ دینے میں نے از خود علوم عروض و قافیہ اور شاعری سے مربوط دیگر علوم کا تحقیقی مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر تقطیع میرے سے مدرسی و تحقیق بن گئی جن پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے ہیں۔ جب اس فن پر کچھ دسترس حاصل ہوئی تو میں نے "رموز شاعری" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں [illegible] کے ساتھ پیش کی۔ اس کے علاوہ ایران میں [illegible] جن میں شامل کی تاکہ وہ شاعر جن کو [illegible] پر عبور نہیں وہ بھی شعر کی صحت سے واقف ہو سکیں۔ ڈاکٹر شان الحق حقی مرحوم کے علاوہ دیگر کئی حضرات نے بھی اس کتاب کی آسان زبان اور عام فہم مطالب کی تعریف و تحسین کی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ شاعری میں میرا جو بھی مقام ہے اس کے اکثر و بیشتر اسباب سے جنہیں بیان میں لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف قدرتی بخشش کا ہونا ہی بتانے کا کہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے بے شمار چشمے نکلتے ہیں دریا کی روانی میں مرہون منت ہوتا ہے۔ اس قدرتی حق کی قدر سے [illegible] ہوئے ہیں جیسے مظہر کی

بقدر پیمانہ خیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
[illegible] ہے فریب تیرا [illegible] جائے آدمی کا

[illegible] جن کا میں خلوص دل سے معتقد ہوں یہ فرماتے ہیں

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

س : تیرہ ادب شناس ہستیوں کی نسبت سے ''نثر دربار اں'' نامی نادر کتاب کا احوال اور اُس میں شامل شخصیات کی نسبت سے بتائیے؟

ج : جب کبھی کسی فنکار پر ظلم ہوتا ہے تو ادب کی روح تڑپ جاتی ہے۔ اس پُر آشوب دُنیا میں حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا، چناں چہ دیگر افراد کی طرح میری بھی سعی و کوشش یہی رہی کہ ایسے نامور شعراء اور ادباء جن کے ساتھ اہل قلم انصاف نہ کر سکے ان کے فن اور شخصیت کو سامنے لایا جائے۔ اسی خواہش کے پیش نظر یہ کتاب تحریر کی گئی ہے کامیابی اور ناکامی کی بابت فیصلہ کتاب کے قارئین اور ناقدین ہی کرنے کے مجاز ہیں۔

س : ''کائنات تجمل'' آپ نے کس جذبے کے تحت ترتیب دی اور آپ کی اس کاوش سے علامہ تجمل آفندی کی شخصیت و فن کے کون سے نئے گوشے منظر عام پر آئے اور اہل علم نے اُس کی بابت کیا رائے قائم کی؟

ج : بیسویں صدی کے عظیم شاعر تجمل آفندی کی حیات، شخصیت اور کلام پر دو جلدوں میں مترجمہ سو صفحات پر مشتمل کتاب برصغیر میں مقبول ہوئی اور اس عظیم شاعر جس نے انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کی جس نے مزدور، کسان اور محنت کش طبقہ کی حمایت کی اس کا تعارف ردہ ادب میں اس طرح سے ہو جس طرح اس عظیم شاعر کا استحقاق بنتا ہے۔ چناں چہ '' کائنات تجمل'' اس سلسلے کی وہ کڑی ہے جو ذہن انسانی کو جلا بخشتے ہوئے ہے۔ '' کائنات تجمل'' میں ایسی نظمیں موجود ہیں جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ تجمل کے دل میں محنت کش طبقے کا کتنا پاس و درد تھا۔ بقول حسین آغا

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

س : انشاء اللہ خاں انشاء مرتب کی گئی کتاب میں آپ نے کیا کچھ نیا دریافت کیا اور اس

کے اثرات کس قسم کے رہے؟

ج ۔ میں نے اوپر کے سوال کے جواب میں عرض کیا ہے کہ میرا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی بھی شاعر ہو اچھا ہو، فانی ہو یا ظفر ہو یا کوئی بھی فراموش شدہ غریب شاعر ہو اس کا حق حق ادا کیا جائے جس سے خاندان میں کوئی ایسا فرد نہ ہو جو اس کتابی کا ازالہ کرنے کی سعی رہتا ہو جیسے حالی، شبلی اور اپنی نذیر احمد کے خاندان سے وہ مرتے رہے۔ انشاء اللہ خاں انشاء پر کتاب کی جذبے سے تحریر کی جو میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ سوال جہاں تک کتاب کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا ہے اس کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔

س ۔ مرزا غالب کی بہت تازہ کتاب میں مرزا غالب کی کس جہت اور کارنامے کو آپ نے بحث کا موضوع بنایا ہے؟

ج ۔ غالب اپنی بہت بڑی مرزی میں نے مجھے غالب سے فارسی کلام کی تدوین اور ترتیب کی ذمہ داری سونپی۔ چنانچہ راقم نے دقیق نگاہی، دیدہ ریزی اور جانفشانی سے کلیات غالب فارسی کا مجلس میں کئی سو شعر کا ترجمہ اور تشریح بھی شامل ہے۔ چنانچہ "کلیات غالب فارسی" میں بارہ ہزار تین سو پینتیس شعر شامل ہیں جن کی تدوین اور ترتیب کے ساتھ ساتھ راقم نے فارسی سے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ اس کلیات میں اختلافات نسخ بھی شاعری کی ہے۔ اس سے پہلے مختلف سوانح عمری غالب بھی قارئین کی معلومات سے پیش تھیں ان میں غالب کی فارسی شاعری کو مجلس سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کی فارسی شاعری کو مجلس تک چھپے میں دشواری تھی اس کتاب کی اشاعت سے مرزا غالب کی فارسی شاعری کو اردو داں طبقہ میں بھی بڑی پذیرائی انجام پائی۔

س : کلیات غالب فارسی کی تدوین کا کام کس سے کس مدت میں مکمل

پیش لفظ کے بغیر نامکمل سمجھا جائے گا۔ کیا واقعی آپ نے اس قدر طویل پیش لفظ تحریر کیا ہے؟

ج : جی ہاں! آپ کی اطلاع درست ہے۔ آپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ کے ذریعے ہی قارئین "چہار سو" یہ خوش خبری بھی سنانا چاہوں گا کہ نہ صرف "کلیات غالب فارسی" کا دیباچہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے بلکہ اس میں تقریباً جدید مطالب کے اضافے کے ساتھ بہت سے نئے صفحات کے اضافے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ جنہیں جلد ہی کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔

س : رثائی ادب کی جانب آپ کی خصوصی توجہ کے اسباب کیا ہیں؟

ج : مرزا دبیر پر میری سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ دبیر شناسی نہ صرف اردو ادب کے لیے عموماً اور رثائی ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اردو ادب کی فصاحت و بلاغت کو ترقی ہوئی۔ مرزا دبیر اردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے سب زیادہ اشعار کہے، سب سے زیادہ رباعیات لکھیں، سب سے زیادہ الفاظ اردو میں استعمال کیے۔ افسوس موازنہ انیس و دبیر میں علامہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ دبیر کے فن، حسب، نسب، سب اور کلام پر سب رمانہ حملے کیے گئے۔ ہمیں دبیر کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے لیکن میر انیس کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اردو کی ترقی اور توانائی کے لیے دبیریت کو کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ حسن یوسف دو بازار مصر میں پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔ کوئی بھی نقاد کوشش کے باوجود بھی تحقیق کار کو منا نہیں سکتا۔ خدائے سخن میر تقی میر کیا خوب فرماتے ہیں ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

س : آپ نے ایک نہایت ضخیم کتاب میر انیس کے ایک مرثیے کو عنوان بنا کر لکھ ڈالی۔ کچھ اس کی بابت ہمارے قارئین کو باخبر کیجیے؟

ج میر انیس کے شاہکار مرثیے "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا تجزیہ راقم نے قریب آٹھ سو صفحات پر کیا ہے جو اردو ادب میں کافی متنوع بھی ہوا ہے اس تجزیے میں میر انیس کی حیات، شخصیت، فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرثیے کے ہر شعر کا جدا جدا تجزیہ کیا گیا ہے جس میں فصاحت، بلاغت، استعارے، روزمرہ، تشبیہات، اقتباسات، کنایات اور مجاز مرسل کی نشاندہی کے علاوہ صنائع معنوی کو بھی سامنے لایا گیا ہے کہ میر انیس کی قدرت کلامی کی سند صرف ایک ہی مرثیے سے ثابت کی گئی ہے۔ اس ایک مرثیے میں صرف صنعتوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ ہے۔ تجزیے کا تمام تر شعر کو جداگانہ، پھر ہر بند کو جداگانہ اور آخر میں پورے مرثیے کو الگ الگ جانچا گیا ہے۔

س آپ کو مرثیہ اور مرثیہ نگار ادب کا ہی موضوع کیوں پسند آیا؟

ج اصل تو یہ سوال انہی لوگوں سے کیا جانا چاہیے جن کی جانب آپ اشارہ فرما رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ خود کو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم سمجھا ہے اور آئندہ بھی میں اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کا آرزومند ہوں۔

س آپ سے قبل پروفیسر مسعود حسن ادیب کا نام "مرثیہ" پر کام کرنے والوں میں نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ آپ اپنے کام کو پروفیسر مسعود حسن ادیب کے کام سے کس قدر مختلف اور بارآور گردانتے ہیں؟

ج انیسیات کے جس گوشے کا احاطہ پروفیسر مسعود حسن ادیب نے کیا ہے اس کی دوسری مثال ہمارے ادب میں موجود نہیں۔ اس لیے میں بھی اسی راستے پر گامزن ہوں مگر

منزل نہیں ہوں میں مگر آدمی کے ساتھ ہوں

میر انیس سے متعلق مرثیوں میں یہ اندازے کے مطابق بارہ ہزار سے زائد اشعار ہیں جن کی نشاندہی ڈاکٹر صفدر حسین، جناب ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر مسعود حسن ادیب اور ڈاکٹر محمد حسین تنویر نے کی ہے۔ ان وسیع نظر رکھنے والے محققین کی حیات میں ہی ان کے ساتھ کئی جلدوں میں مرتب کر رہا ہوں۔

س یہ بھی بڑی ہمت کے ساتھ کیا جانے والا مرثیہ پسند جزا ہے تو بھی کیا جائے

بہت حد تک متاثر ہوا ہے۔ کیا آپ مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں کسی تبدیلی کی گنجائش محسوس کرتے ہیں؟

ج : مرثیے کے کلاسیکی اجزائے ترکیبی میں چہرہ، سراپا، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن جدید مرثیہ میں لازم نہیں کہ یہ اجزا موجود ہوں۔ چناں چہ آج کے دور کی ضروریات کے تحت بعض اجزا، جس میں چہرہ، شہادت اور بین کے اشعار شامل ہیں، مرثیہ کی شناخت نظر آتے ہیں، جب کہ آمد، رجز اور جنگ جس میں تلوار، گھوڑا اور لڑائی شامل ہیں، جدید مرثیوں میں خال خال ہیں۔

س : سمٹتی، سکڑتی اُردو زبان و ادب کے آئینے میں مرثیے کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

ج : میرے اندازے کے مطابق آج کے اس دور میں تیس، چالیس افراد کسی نہ کسی طور پر مرثیہ کی صنف سے خود کو وابستہ رکھتے ہوئے ہیں جب کہ دس، بارہ افراد مربوط انداز میں مرثیہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ میں مرثیے کے مستقبل کی بابت اس لیے پُر امید ہوں کہ مرثیے میں اُردو ادب کا بہت بڑا خزانہ محفوظ ہے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو شاعر مرثیہ لکھ رہا ہے اس کی توجہ افزائی ہونی چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب صورت بات کہی ہے "اُردو ادب کی جانب سے غالب کی غزلیات اور انیس کے مرثیے دنیائے ادب کو تحفے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔"

س : علامہ اقبال سے آپ کے خصوصی تعلق و رگاؤ کے ہم عینی شاہد ہیں۔ کیا آپ اس عقیدت کی وجوہات بتانا پسند کریں گے؟

ج : علامہ اقبال برصغیر کی ایسی عبقری شخصیات میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں جنھوں نے ایک سے زائد نسلوں کو اپنے اقوال و افکار سے متاثر کیا ہے۔ بالخصوص جن گھرانوں میں علوم و فنون پہلی ترجیحات میں شامل تھا وہاں علامہ کے کلام سے نیازمندی کے ساتھ عقیدت کا کوئی نہ کوئی پہلو بھی ضرور موجود ہوتا تھا چناں چہ ہمارے گھرانے میں بھی علامہ اقبال کو ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا جس کے باعث میں بھی بچپن ہی سے علامہ اقبال کی شاعری، فلسفے اور فکر سے بے پناہ متاثر ہوا اور آج

تمنا ہوں وہ وقت گزرنے کے ساتھ اس عقیدت میں مزید پختگی آ رہی ہے۔

س آپ کے جواب کی روشنی میں یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا آپ کی عقیدت کا مرکز علامہ سے شروع ہو کر علامہ پر ہی ختم ہو جاتا ہے یا اس کے مراکز اور بھی ہیں؟

ج دیکھئے یہ سوال پھر انسانی آزادی سے پرکھنے کے متعلق ہے۔ علامہ اقبال سے عقیدت و نیازمندی بھی آپ سے یہ سوال نہیں کرتی کہ آپ دنیا کے تمام علوم و فنون سے منہ موڑ کر صرف علامہ کے حصار میں مقید ہو جائیں۔ علامہ اقبال تو خود دعوت فکر دینے والے مفکر اور دانشور ہیں۔ ہذا میرے غور و فکر کا سلسلہ بھی علامہ کی تعلیمات سے عین مطابق منسلک ہوا ہے نہ کہ انحراف۔

س اول یہ کہ علامہ کے خطوط نے آپ کی توجہ کب اور کیوں کر حاصل کی نیز یہ کہ ان خطوط میں صرف ڈاکٹر صاحبہ کا انتخاب کیوں اور کس پیمانے کے تحت کیا اور یہ انتخاب اپنی افادیت کس طرح ثابت کرتا ہے؟

ج علامہ اقبال سے عقیدت کی راہوں کی متعین ہونے کے بعد راقم نے "چوں مرد آید" تصنیف کی جس میں وہ سو کے لگ بھگ خطوط ہوا کرتے تھے جو علامہ نے مختلف اوقات میں مختلف احباب کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کا انتخاب میں نے اپنی ذاتی پسند کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ ان خطوط کا انتخاب میں نے ڈاکٹر صاحبہ کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ کیا اور یہ انتخاب اپنی افادیت اس طرح ثابت کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کا شاید ہی کوئی ہم عصر ایسا ہو جس نے اس تفصیل سے اپنی یادداشتیں اور اس سے مربوط مواد شائع کیا ہو۔ اس کتاب میں اقبال کا فلسفہ موت اور زندگی سے دوبارہ کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب کی پذیرائی عوام و خواص نے بھی کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کتاب کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے اور پوری کتاب میری ویب سائٹ www.drtaqabeh.com پر پڑھی جا سکتی ہے۔

س علامہ کے آخری ایام میں ان سے ملاقات پر آپ نے تاثرات کس قسم کے تھے؟

ج میرے تاثرات کی نوعیت ایسی ہے جو علامہ سے شخصی رشتہ رکھنے والے ہر شخص کے ہو سکتے ہیں۔ بحیثیت طالب علم میں یہ سمجھتا ہوں کہ کاش اس وقت علامہ سے ملاقات پر جدید تحقیقی نقطہ نظر سے مغربی تعلیمات کا صحیح

دیا جاتا شاید ہمیں علامہ سے مزید استفادے کا موقع میسر آ سکتا۔

س : آپ علامہ اقبال کو عالمی مفکر و دانشوروں کی صف میں کس مقام کا حامل سمجھتے ہیں اور مستقبل میں علامہ کو کس مقام پر متمکن دیکھتے ہیں؟

ج : میرا یہ مقام ہرگز نہیں ہے۔ میں تو اپنے بارے کسی قسم کی پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں پھر بھلا علامہ جیسے دیوقامت کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں البتہ! اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ علامہ کی شخصیت عظمت کی جانب گامزن ضرور رہے گی۔

س : مجموعی طور پر اگر ہم آپ سے یہ دریافت کرنا چاہیں کہ آپ کی اب تک کی کاوشات سے اردو ادب کو اور آپ کو کیا حاصل ہوا نیز مستقبل میں کیا حاصل ہونے کے امکانات ہیں تو آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

ج : سوال جہاں تک میری ذات کا ہے تو اس ضمن میں کلی طور پر مطمئن ہوں۔ میری تیس (30) سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں میرے دو شعری مجموعے "گلشن رویا" اور "جوش مودت" شامل ہیں۔ مختلف ادبی و شعری ہستیوں اور شاعری کے فنی تقاضوں، رسم الخط اور محاسن زبان، صنائع بدائع پر مختلف مضامین تین جلدوں میں مطبوعہ شکل اختیار کر چکے ہیں۔ میرے مقالات کی تین کتابیں "عروس سخن"، "ذکر درباراں" اور "سید سخن" احباب علم و ہنر کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں ان کی بابت فیصلہ ہونا باقی ہے جس کی بابت کبھی بھی میرے دل میں بے اطمینانی کے احساسات موجزن نہیں ہوئے۔

س : رام بابو سکسینہ نے "تاریخ اردو" مرتب کرتے ہوئے فرمایا تھا "اس کام میں رام بابو سکسینہ ختم ہو جائے گا اور رام رام باقی رہ جائے گا۔" آپ کی بابت اگر یہ محاورہ استعمال کیا جائے تو کیا کچھ باقی بچنے کے امکانات ہیں؟

ج : پہلی بار اس قسم کا سوال آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا ہے۔ میں بھی رام بابو سکسینہ کی پیروی میں یہی عرض کروں گا کہ سب فنا ہو جائے گا باقی جو رہے گا وہ نام خدا ہوگا۔

س : اس قدر ہمہ رنگ، ہمہ جہت اور کثیر الاطراف شخصیت ہونے کے باوجود آپ نے متعلق ہونے پر تاثر قائم نہ ہونے کے کیا اسباب ہوسکتے ہیں اور یہ کہ آپ کس حوالے سے اپنی شناخت کے آرزومند ہیں اور آپ کی آرزو کی تکمیل کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟

ج دنیا کے ہر بڑے ادب میں شہرت اور اعتبار دو علیحدہ علیحدہ قدریں ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص دونوں اقدار حاصل ہو سکیں۔ اغلب یہ قدریں علیحدہ علیحدہ وقتوں میں رہی جاتی ہیں۔ اردو ادب خصوصاً ادب لطیف اس سے مستثنیٰ ہو نہیں۔ قدرت ایزدی کی محنت کو ضائع ہونے نہیں دیتی۔ جیسے کہ مشہور ہے کہ بہترین اجرت وہ ہے جو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی ہتھیلی پر رکھ دی جائے لہٰذا میری کسی نہ کسی تخلیق میں احباب کی بے پناہ محبت، خلوص اور حوصلہ افزائی مقدار میں موجود ہے جس سے میری تمام طلب کی تسکین با آسانی ہو رہی ہے اور آپ میرے خیال سے اتفاق کریں تو یہی میری اثر پذیری میری شناخت ہے۔

س جن قدر منصوبہ بند مقصد کام آپ سرانجام دے چکے ہیں ان سے کہیں کم کام کرنے والے مختلف ادوار میں نقادین کی بحث کا موضوع ہوا کرتے ہیں جب کہ آپ کے بارے میں ابھی تک اس طرح کی کوئی پیش رفت ہمارے علم میں نہیں ہے؟

ج [illegible] ہوتی ہے جن میں موجود افراد کی شناخت دیگر افراد کی نسبت سرخ روشنائی ہوتی ہے۔ جن حلقوں کی باہمی رنجش اور رقابت اردو کا شب و روز کا موضوع خصوصاً ان تخلیقات سے ہے جن کی روٹی اردو سے جڑی ہوتی ہے ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جن میں تخلیقات کا پرتو اجاگر ہوتا ہے ان میں سے اکثر افراد اہمیت جلد حاصل کر لیتے ہیں کہ ان پر وار میں ان کی حمایت نہیں بلکہ دوسروں کی قوت شامل ہوتی ہے۔

؎ فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود

[illegible] اپنی تخلیقات سے مطمئن ہوں کہ یہ دونوں موجود تخلیقات سے [illegible] ایک قدر ہے ایک وقت

ہے۔ یہی اعتبار، یہی وقار اور یہی عزت میری اُردو زبان و ادب سے محبت بلکہ دیوانگی حقیقت میں فرزانگی کا پروانہ بن جاتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنوں اور اپنے کارناموں اور ان پر تحقیقی کام کی تفصیل بیان کروں یہ مجھے یا کسی بھی حقیقی فنکار کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ آپ کے اصرار پر اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ آج کل بھارت اور پاکستان میں اس حقیر و فقیر کے فن و شخصیت پر کام ہو رہا ہے جو میری ہمت افزائی اور فن شناسی کی جانب مثبت قدم ہے۔ میرے خیال میں ناقدین کی آراء، تبصرے، اشارے، تشریحات، مبالغات وغیرہ سب کسی اہم کام کی حوصلہ افزائی کے لیے مفید ہیں لیکن سچی اور کھری بات یہ ہے کہ

ع ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

س : یادگار انیس کا جو ترجمہ ڈیوڈ میتھیوز صاحب نے کیا ہے اس کی اشاعت اور تقسیم کس مرحلے میں ہے نیز اور کہاں کہاں تراجم ہو رہے ہیں؟

ج : ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کے منظر عام پر آنے سے قبل پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور وہ اس شاہکار کتاب میں شامل اشاعت ہے۔ سوال کے دوسرے حصے کی بابت یہی عرض کروں گا

ع : پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

س : آپ کی تخلیق کردہ کتب انتہائی دیدہ زیب اور بیش قیمت ہوتے ہوئے بھی مفت تقسیم ہونے کے باعث احباب میں آپ کی مالی حیثیت کی بابت خاص طرح کا اشتیاق پایا جاتا ہے؟

ج : جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ میری تیس سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میری سب سے پہلی کتاب ''شہید'' (فارسی) کا اردو میں ترجمہ تھا جو 1980ء میں تہران سے شائع کیا گیا۔ میری بہت سی کتابیں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، اقبال اکیڈمی لاہور، تعمیر انسانیت لاہور، اظہار اینڈ سنز لاہور اور ملتان سے شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتابیں دہلی اور حیدرآباد دکن سے بھی طبع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں اکادمی، انسٹی ٹیوٹ، انجمن اور دوسرے ادارے شائع کرتے ہیں وہ ان

ادارہ کے تحت باقاعدگی سے فروخت کی جاتی ہے۔ میرے لئے جتنی جلدیں مجھے رعایتی دی جاتی ہیں وہ میں حق بہ حقدار کے مصداق احباب کی خدمت میں بلا معاوضہ پیش کر دیتا ہوں بلکہ جو کتابیں میں اپنے خرچ سے شائع کرتا ہوں وہ بھی اپنے دوستوں، ہمدردوں اور پرستاروں کو بلا قیمت مہیا کرتا ہوں۔ یہ سب توفیق خداوندی ہے۔ میں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ لہو و لعب میں صرف کرنے کے بجائے اس شیریں زبان پر قربان کر سکوں۔ شاید اسی کو ادب میں ادنیٰ خدمت کہا جاتا ہے۔ ہر تخلیق کار کی جملہ خواہشات میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا دیوان یا مجموعہ دیدہ زیب شائع ہو۔ مرزا غالب نے اپنے خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اقبال کا کلام اپنے زمانے کی عمدہ ترین مطبوعات میں شمار ہوتا تھا۔ چناں چہ جو دلی خواہش ان عظیم شعرا کی ان کے دل میں رہ گئی اس کی حد تک واجب ادا کرنے کی سعادت ان چند کتب کی صورت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ یقیناً اس پُر آشوب اور مفروضت کے زمانے میں اردو زبان کے اہل قلم کی کتاب کا مطالعہ مصنف یا مؤلف کے بغیر خود کتاب کی قیمت تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

س دنیا کے کئی ملکوں میں اردو زبان و ادب کے نام پر کوئی کانفرنس، سیمینار یا مجلس برپا ہوتی ہے تو آپ وہاں ضرور آپ ہوتے ہیں ورنہ شرکت مکمل ہونا تو دور کی تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب آپ اپنی ذاتی خرچ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ یہاں پچھلے سال آپ کی عدم موجودگی کا سبب معلوم کرنا چاہتے ہیں؟

ج میرے ہاں پچھلے تین سال کوئی اردو کانفرنس نہیں ہوئی جس کا تعلق "نیویارک" سے ہو۔ ان کانفرنسوں کی مرکزی کمیٹی کا صدر مجھے بنایا گیا۔ اس ذمہ داری کی وجہ سے میں کوئی دعوت قبول نہیں کر سکا۔ کانفرنس سے کئی ماہ پہلے کانفرنس سے مختلف جلسوں میں شرکت اور مختلف موضوعات پر ان کی مناسبت سے مقالہ لکھنا اور اس کو پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ چناں چہ ان کانفرنسوں میں میری ذات کسی سبب نہیں رہی۔ ہاں امریکہ کی کانفرنسوں کے علاوہ بھارت،

پاکستان، برطانیہ اور مڈل ایسٹ کی بعض عالمی اردو کانفرنسز میں شرکت کرنے کا موقع اس لیے دستیاب رہا کہ میرا تعلق اردو کی نئی بستیوں سے ہے اور اردو کی ان نئی بستیوں کی حیات کا دارومدار اردو کے ہوا رے سے ضروری ہے۔ اس ارتباطی پل کو برقرار رکھنے کے لیے ان کانفرنسز میں میری شرکت مفید ثابت ہوئی۔ شمالی امریکہ کی کانفرنسز کے مضامین اور بحث و مباحثے مطالبے نے بھی میری شرکت کو دوسری عالمی کانفرنسز میں یقینی بنایا۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہر کانفرنس میں اپنا مقالہ، اپنا نظریہ اور اپنا مواد پیش کروں۔ اس کام کے لیے ہوم ورک بھی ضروری جانتے ہوئے میں ان افراد کی صف میں شامل ہوئی جن کا کانفرنسز میں شرکت کا مقصد تفریح یا سیاحت نہیں بلکہ علمی ادبی اور تحقیقی ہو۔ گزشتہ تیس سال سے مغربی دنیا میں رہتے ہوئے یہ وسیاحت کی آرزو نہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ میں کسی ادارے یا اکادمی سے سفر و حضر کے مطالبات نہیں کرتا اور کوئی اپنی مرضی اور منشا سے یہ سہولیات مہیا کرتا ہے تو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں ورنہ یہ ایسا بھاری پتھر نہیں جس کو میں اٹھا بھی نہ سکوں۔ بقول انیس

کسی کے سامنے یوں ہاتھ جوڑے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

س : آپا صاحب! آپ کی تمام تر علمی، ادبی، تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور تنظیمی مصروفیات میں شہرت کی طلب کس قدر دخل ہے؟

ج : یہ درست ہے کہ شہرت و ستائش انسان کو پر کے بغیر ہی مائل بہ پرواز کر دیا کرتی ہے مگر میرا منشا اور مقصود شہرت ہی ہوتا تو مغرب میں رہ کر ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان کے لیے اس کو حاصل کرنے کے ذرائع اور بھی ہیں۔ میں جہاں جس حال میں ہوں بلکہ جس حال میں ہوں بہت خوش ہوں۔

س : ایک زمانے میں آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کے ذخیرہ کتب میں ڈیڑھ ہزار سے زائد مخطوطات محفوظ ہیں۔ آج ان کی تعداد کتنی اور ان کی اہمیت کیا ہے؟

ج : جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانے میں چودہ سو کے

ملک بھر کے مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد قلمی مرثیوں، رثائی بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہے۔ ان مخطوطات کو میں نے تیس سال کے عرصے میں جمع کیا ہے۔ کتب خانے کی نادر کتابیں اور مخطوطات تمام برصغیر سے جمع کی گئی ہیں۔ رثائی ادب کی کتابیں اور بیشتر قلمی مرثیے اور قلمی بیاضیں راقم کو "جعفر منزل" سے حاصل ہوئی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی کتب کینیڈا نہیں پہنچ سکیں اور یہ بھی پتہ چل نہ سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔

س کینیڈا میں اردو کی سرگرمیاں اور اردو زبان و ادب سے کینیڈا کے لوگوں کی دلچسپی کی بابت کچھ آگاہی دیجیے؟

ج اردو کی بستیوں میں اردو کا فروغ جاری ہے۔ اردو اب صرف اردو معلی تک محدود نہیں بلکہ اردو محلہ میں رونق بازار ہے۔ اب اردو کا پرچم اردو معلی پر نہیں بلکہ اردو محلہ پر ہے۔ ہندستان دہلی، لکھنؤ، آگرہ، حیدرآباد، بمبئی، کراچی، فیصل آباد میں اردو کی نشوونما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندستان کا برصغیر سے ہندستان پر قطعاً فوقیت حاصل نہیں۔ اب اردو عالمی شہرت کی حامل زبان ہے۔ اب اردو کا شعر زمان و مکاں کی حدوں سے باہر نکل چکا ہے

وہ ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

س آپ نے اپنی ذاتی اور بیرونی سینیڈا کے کسی ادارے سے نام وقف کی ہوئی ہے۔ جس کا سبب ہے کہ آپ کے بعد اردو کا آپ کے خاندان میں کوئی مستقبل نہیں۔ یہ آپ کو کیوں کر خوف نہیں آتا؟

ج چوں کہ میرے اوقات تحقیق اور تنقید کے ساتھ بہت گہرائی اور میں نے ذاتی تجربات سے بھی کام لیا ہے۔ میرے پاس محفوظ ذخائر مستقبل میں تحقیق و تنقید کے بے حد کارآمد اور مفید رہیں گے لہٰذا میری حیات تک ان ذخائر سے میں استفادہ کرتا رہوں گا میرے بعد فوری طور پر یہ بھی اور ذاتی ذخائر یونیورسٹی کے ذخائر کی میں شامل ہو جائیں گے میں نے اپنی اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو بے حد مخلص رہا ہوں

لیے مناسب جانا کہ عام پرستاروں کی اس تک رسائی آسانی سے ہوسکے۔ میرے مشاہدے میں یہ تلخ حقیقت بارہا آئی ہے کہ خاندان کا کوئی فرد اس طرح سے نادر کتب خانے پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا جس کے نتیجے میں دیمک علمی ذخیروں کا مقدر بن جاتی ہے۔

س : اردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے جاری بحث کی بابت آپ کا نقطۂ نظر اور تجاویز نہایت اہمیت کی حامل ہوں گی؟

ج : اردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے چوں کہ زندہ ہے اس لیے ہر روز اس کے مسائل بنتے ہیں۔ اردو زبان کے اس قدر مختصر عرصے میں اتنی بڑی زبان بن جانے کا راز اس کا دوسری زبانوں سے لین دین ہے۔ آج یہ بیسویں شمار بندی کے لحاظ سے یہ دنیا کی چوتھی یا پانچویں بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے لحاظ سے یہ بائیسویں نمبر پر اس لیے ہے کہ ہم نے اپنی ہر بڑی زبان سندھی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، بلوچی یا ملیالم سکھوایا ہوا ہے۔ بہرحال اردو پھیل رہی ہے۔ اب یہ زیادہ تر کانوں کی زبان بن چکی ہے۔ بعض مقامات پر یہ آنکھوں کی زبان نہیں رہی ایسے نازک موقع پر اس کے رسم الخط اور اس کی تہذیب کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے۔ جہاں تک سوال اردو کے ادبا، شعرا اور ناقدین کے اختلاف رائے کا ہے اس میں کچھ اثر تو ماحول کا اور کچھ جبلّی شخصیت اثر انداز ہو رہی ہیں۔ بقول شاعر

اردو کی نزاکت میں ہے اس لیے نفاق
اردو کے چار حرف ہیں چاروں جدا جدا

س : ڈاکٹر صاحب! اپنی دانست میں ہم نے آپ کی شخصیت اور فن گفتگو کا موضوع بنانے کی دیانتدارانہ کوشش کی۔ آپ کے خیال میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہو یا آپ ہمارے قارئین سے کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہوں تو بصد شوق کہیے

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

ستیہ پال آنند

مرحوم

محترم بھائی جان!

آداب!

پرسوں جب آپ کا "ای ملتوب" پہنچا تو میں سفر میں تھا اور کل رات اپنے گھر یعنی امریکہ میں پہنچا ہوں تو سب سے پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ آپ کے مکتوب کے جواب میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

آپ کی محبت کا بھی جواب نہیں کہ آپ کو یاد رہا کہ میں نے ولی کی ابد یہ قطعہ پڑھا تھا۔ اب مجھے بھی یاد آ گیا ہے۔ نیچے تحریر کر رہا ہوں۔

تقی عابدی صاحب کی نذر

آپ شاعر بھی ہیں، حکیم بھی ہیں
شعر و حکمت کا ہے پرانا ساتھ
تقی صاحب سے فن کی یہ کہنے
روح افزا، مفرح جذبات

نیازمند
ستیہ پال آنند

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی اور ادبی خدمات اور شعور فکر و فن پر منظوم تاثرات

فخر دانشوراں ہیں تقی عابدی

فخر دانشوراں ہیں تقی عابدی
فکر و فن میں ہے جن کے نئی تازگی

اُردو دنیا میں ہیں وہ سفیر ادب
بزمِ شعر و سخن کی ہیں وہ روشنی

ندرت فکر ہے ان کے اظہار میں
نقد شعر و ادب میں ہے اک دلکشی

جس سے مسحور ہیں اہل فکر و نظر
عہد حاضر کی ہیں شخصیت عبقری

ہے ہر اک صنف پر ان کی نقد و نظر
کیوں مسلم نہ ہو اُن کی دیدہ وری

دیکھ کر یہ کتابیں کریں فیصلہ
کتنی ہے معتبر ان کی دانشوری

حرف ہے ان کی تحریر و تقریر میں
ہے جو سحر آفرینی کی جلوہ گری

ان کے برتی ہیں مداح اہل نظر
ان کی ورد زباں ہے ادب دوستی

•••

سید باقر زیدی
27 مئی 2003ء

جناب رضی حیدر فرید لکھنوی عرف سلطان صاحب کے مراثی کے مجموعے کی کتاب
بنام "اظہارِ حق" مرتبہ جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی، ٹورنٹو (کینیڈا) کا قطعہ تاریخ

"اظہارِ حق"

دل کی شب برات ہے آنکھوں کی عید ہے
یہ جو کتاب نو کی تقی کی نوید ہے
یہ دل مرثیہ یہ تقی کا مزید ہے

15+61+21+510+7+755+40+15 1424

ایسے معاملات میں فردِ وحید ہے
یہ بات کچھ شنید نہیں چشم دید ہے
اظہارِ حق کا جذبہ تقی میں شدید ہے
دے دُنیا اس کتاب کو اظہارِ حق کا نام
تصدیق میرے دعوے کی گویا مزید ہے
ہاتھ آئے کوئی نسخہ نایاب اور پھر
رہ جائے بن چھپے یہ تقی سے بعید ہے

احسان ہے ادب پہ تقی عابدی کا یہ
"اظہارِ حق" کلام جناب فرید ہے

ہر چند مرثیوں کو کہے بیسویں اک صدی
اظہار حق صباحت عصر جدید ہے

پوتے نے حق ادا کیا دادا کی ارث کا
گو یہ روش زمانہ میں اب کم پدید ہے

سچ ہے یہ بات بھی کہ عبادت سے کم نہیں
اظہار حق اشاعت حق کی کلید ہے

پائے گی اجر اس کا تو اولاد بھی ضرور
ورثہ یہ جد کا ہے تو متاع سعید ہے

18·294·419·600·108·1107 2003

اک اور زندگی ملی سلطان شعر کو
اظہارِ حق بہار حیاتِ فرید ہے

"مرتا ہے جمع جو جبر لخت لخت کو"
باقی تو ایسے شخص کا غالب مرید ہے

•••

سید باقر زیدی

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتابوں کی رونمائی

رسم اجراء کی جو بہار ہے یہ
بزم یاراں کا افتخار ہے یہ

یہ تو پچیس سال کا ہے سپاس
ہیں تقی عابدی بھی خیر سے پاس

رونمائی ہے، دو کتابوں کی
خوشبو آنے لگی گلابوں کی

اک سلامِ انیسؔ پر تنقید
دوسری ہے رباعیاتِ رشیدؔ

یوں تو اچھا ہے کُل کلام انیسؔ
دیکھئے تو ذرا، سلامِ انیسؔ

کیا غضب کے سلام لکھے ہیں
منفرد لاکلام لکھے ہیں

گر نہیں ہوتا مرثیے کا چلن
پھر بھی کہتے انھیں خدائے سخن

ہم تقی عابدی کے ساتھی ہیں
پوری ربع صدی کے ساتھی ہیں

اپنے افکار میں نفیس ہیں یہ
کیوں نہ ہوں واقف انیس ہیں یہ

ان کی الفت ہے اپنے کام کے ساتھ
سب سے ملتے ہیں احترام کے ساتھ

راستی کے افق کا منظر ہے
ان کی تنقید، حق کا مظہر ہے

جھوٹ سے پاک ہے، قلم ان کا
صدق سے باک ہے قلم ان کا

جرمِ ناقدری ڈھونڈ لاتے ہیں
حق یہ حقدار کو دلاتے ہیں

یہ ادب کا سفر مبارک ہو
ناقدانہ نظر مبارک ہو

شعر تنقید کا مبارک ہو
امریکہ سے ینیڈا تک ہو

آپ سب کا خیال کرتے ہیں
میزبانی کمال کرتے ہیں

[illegible]

روز مہمان آتے جاتے ہیں
روز کھانا انھیں کھلاتے ہیں

ان کی بیگم ہیں گرچہ ایرانی
پر بناتی ہیں خوب بریانی

ہم انھیں بھی سلام کرتے ہیں
ان کا بھی احترام کرتے ہیں

ان کے گھر میں سبھی ہوں خرم و شاد
یہ گھرانا، سدا رہے آباد

ان کو ہو، اتنا طول عمر عطا
ان کی تحریر ہو ادب کی بقا

ہو تقی کی یونہی، نگاہ کرم
رکھ سکیں ہم بھی دوستی کا بھرم

شعر اس واسطے لکھے پچیس
سال بھی دوستی کے تھے پچیس

میل کوئی نہ دل میں ہو ان سے
اُٹھو باقر گلے ملو اِن سے

•••

سید باقر زیدی

تاریخ کامل انیسؔ

یہ فکرِ نظم در و لعل یادگار انیسؔ

2002ء

خصوصی رنگ تقی عابدی بکار انیسؔ

2002ء

وہ اک عطائے سخن ہے تو یہ ہے داد سخن

2002ء

یہ آرزوئے تقی ہے وہ شاہکار انیسؔ

1427 ہجری

باقر زیدی نے ''جوشِ مودّت'' کی تاریخ یوں نکالی

علم حیات و جہل ممات
کارِ سخن ہے کارِ ثبات
ہجری تاریخ اتنی بات
جوشِ مودّت راہ نجات

---

660 + 759

1419 ہجری

◆◆◆

سید باقر زیدی
امریکہ

تجزیہ یادگارِ انیسؔ

"مرحبا تجزیہ نگارِ انیسؔ
اے نقی! اے نگاہ دار انیسؔ

2002 = 934+1068

نبض تیں واقفِ وقار انیسؔ
موسمِ گلشنِ بہارِ انیسؔ

امتیازِ قلم ہے کارِ انیسؔ
فکرِ اردو ہے شاہکارِ انیسؔ

"صاحبِ تجزیہ جزاک اللہ
محوِ گفتار رہگذارِ انیسؔ"

.2002

حل کیا اور ایک در واشد
بڑھ گیا اور اعتبارِ انیسؔ

حشر تک ہے وہ خدائے سخن
حشر تک بن گیا حصارِ انیسؔ

ہے سخن پر وہ اختیار اس کا
اہلِ اُردو میں زیرِ بار انیسؔ

ایک اک لفظ مستند مرغوب
ایک اک بیت افتخار انیسؔ

جان جاں اس لیے ہے باغِ سخن
لہلہاتا ہے لالہ زار انیسؔ

ہے جنھیں پرکھ وہ جانتے ہیں
نے سخن کی بہار عیار انیسؔ

ہر زمینِ سخن قلمرو میں
کوئی دیکھے تو اقتدار انیسؔ

لکھنؤ کا مزہ ہو جنت میں
ملے قسمت سے گر جوارِ انیسؔ

بات حالیؔ کی کتنی پتی ہے
دارِ اُردو ہوا دیارِ انیسؔ

پھول احساس کے چڑھاتے ہیں
اہلِ انصاف بر مزارِ انیسؔ

وجہ آبِ حیات ذوق کا ذکر
کم نہیں ہے گنہگارِ انیسؔ

اک شبلیؔ ہی کا موازنہ ہے
جو ہوا وجہ اعتبارِ انیسؔ

کیسی خاموشی سے گزری پچھلی صدی
اور کیا ہو سکا ہے کارِ انیسؔ

ساعتیں آئیں گی سپاس گزار
ابھی دُنیا ہے قرضدارِ انیسؔ

حق بہ حقدار کے جو داعی ہیں
ان کو ہوتا ہے پاسدارِ انیسؔ

اس کی قسمت بلندیوں کی نوید
جس نے اپنا لیا شعارِ انیسؔ

نکلے چبستؔ حالیؔ اور اقبالؔ
خوب پھیلے ہیں برگ و بارِ انیسؔ

مرثیے نے دیا خراج اسے
مرثیہ گو ہیں ورثہ دار انیسؔ

اب بھی اس کا وظیفہ جاری ہے
ہم بھی ہیں اک وظیفہ خوار انیسؔ

تجزیہ مرثیے کا ہے باقرؔ
زیبِ ناموسِ رہگذارِ انیسؔ

مرحبا تجزیہ نگارِ انیسؔ
اے تقیؔ اے نگاہ دارِ انیسؔ

1423 ہجری

• • •

ڈاکٹر جمال الدین صاحب تفہیم العروض نے ''جوش موذت'' کی یہ تاریخ نکالی۔

لکھی تقی نے موذت کے نام سے جو کتاب
ہے اس میں منقبت و حمد و نعت اور سلام
جمالؔ فکر میں تھا کس طرح ہے تاریخ
ندا یہ آئی ملا رب میں پنجتن کے نام
قوی متین ہے اور ملا دے اس میں
محمدؐ اور علی فاطمہ و حسن و حسین

قوی متین
116 + 500 = 616 (قوی متین اللہ کے اسمائے حسنہ ہیں۔)

محمدؐ اور علی فاطمہ و حسن و حسین
92+207+110+136+6+118+6+128 = 803

616 + 803 = 1419 ہجری

•••

ریاضت علی شائق سہسوانی

آبروئے وطن

آبروئے وطن ہیں تقی عابدی
رونقِ انجمن ہیں تقی عابدی
اُن سے ملنے پہ ہم پر یہ ظاہر ہوا
رہبر و فن ہیں تقی عابدی

•••

جانِ اُردو ہیں پر شانِ اُردو ہیں یہ
فخر کرتی ہے ان پر زبانِ وطن
ان کا تحقیق میں کوئی ثانی نہیں
ان پہ نازاں ہے یہ ارضِ گنگ و چمن

•••

کیے کام اُردو کی بہبود کے
بن گئے سب کے سب سنگِ میلِ وطن
کوئی اُردو کا ایسا مجاہد نہیں
روئے جس نے اس پر فدا جان و تن

•••

ریاضت علی شائق سانکھنوی

کتاب محبّت

کتاب محبّت تقی عابدی ہیں
ہر اک دل کی راحت تقی عابدی ہیں

جب اُن سے ملو گے تو محسوس ہوگا
سراپا شرافت تقی عابدی ہیں

ہر اک شخص کی ان کے ذمہ ہے عزت
سبھی کی محبت تقی عابدی ہیں

انھیں کس قدر نفرتوں سے ہے نفرت
سراپا محبت تقی عابدی ہیں

ادیب اور شاعر، محقق مقرر
یہ سر تاپا عظمت تقی عابدی ہیں

یہ اُردو کے وہ نامور ہیں محقق
کہ اُردو کی عظمت تقی عابدی ہیں

ہے کس درجہ اُردو زبان ان پہ نازاں
یہ اس کی فضیلت تقی عابدی ہیں

شرافت کو ہے کس قدر ناز ان پر
یہ فخرِ شرافت تقی عابدی ہیں

یہ شائق پہ بھی مہرباں کس قدر ہیں
یہ اس کی عقیدت تقی عابدی ہیں

•••

29.12.2021

شکیل آزاد

قطعہ تاریخ ''کائناتِ نجم''

تحقیق وتدوین: ڈاکٹر سید تقی عابدی

اس انجمن میں آج جو مہماں ہیں عابدی
ارثِ ادب میں وسعت امکاں ہیں عابدی
ناقد بھی ہیں ادیب بھی ہیں نکتہ رس بھی ہیں
روشن چراغ طاقِ دبستاں ہیں عابدی

جاری ہے اُن کا فیض ادب زور شور سے
اہلِ سخن میں نیر تاباں ہیں عابدی

جو کہہ دیا زباں سے وہ کرکے دکھا دیا
کس کو ہمارِ عزم کے انساں ہیں عابدی

کیا کام کردیا ہے انیس و دبیر پر
تحقیق کے قلم کی رگِ جاں ہیں عابدی

علم و ادب کے کتنے خزانے بچائے ہیں
اہلِ ادب کے درد کا درماں ہیں عابدی

وقت ان کا، مال ان کا، کتابیں ہماری ہیں
ہر زاوئے سے رحمت باراں ہیں عابدی

اک بے بہا خزانہ کتابوں کا گھر میں ہے
کہتا ہے کون؟ بے سر و ساماں ہیں عابدی

یہ کائنات جشن! انھیں کا کمال ہے

833

منزل بدوش جوئے پریشاں ہیں عابدی

2006 = 1173ء

ہر کام میں خلوص بھی ہے رکھ رکھاؤ بھی
کہہ دو شکیلؔ! جان دل و جاں ہیں عابدی

◆◆◆

پروفیسر حشمت علی کمال الہامی
سابق پرنسپل وصدر شعبہ اُردو، واستاد ادبیات اُردو
سفیر وزیٹنگ پروفیسر ہندستان یونی ورسٹی سکردو

ہدیۂ اخلاص ومحبت

بہ پیش گاہ محترم المقام، قابل صد احترام،
عالمی شہرت یافتہ شاعر وادیب ومحقق ونقاد ومایۂ ناز دانشور،
عزت مآب جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی

خادم اُردو زباں، اپنے تقی عابدی
عارف علم بیاں، اپنے تقی عابدی

ارفع و اعلیٰ ادیب، مشفق و عمدہ طبیب
عشق کا اونچا نشاں، اپنے تقی عابدی

وسعت تحقیق ہیں، رفعتِ تنقید ہیں
جہد کا اک آسماں، اپنے تقی عابدی

گلشن تصنیف ہیں، اُلفت تالیف ہیں
حُسن عمل کا سماں، اپنے تقی عابدی

ہوتے ہیں تخلیق کے، بحر میں، وہ غوطہ زن
پاتے ہیں لعل گراں، اپنے تقی عابدی

علم و ادب کے لیے، شعر و سخن کے لیے
رکھتے ہیں قلب طپاں اپنے تقی عابدی

غالب و اقبال، فیض، میر و انیس و دبیر
سب کے بنے راز داں، اپنے تقی عابدی

جالی و امجد، رشید، جوش کے مداح ہیں
نغمہ گر شاعراں، اپنے تقی عابدی

بکھرتے ہیں آفاق میں، دیتے ہیں درس ادب
نسب زمان و مکاں، اپنے تقی عابدی

قافلہ علم و فن، ان کا ہی، دم ساز ہے
جاتے ہیں جب بھی، جہاں، اپنے تقی عابدی

فکر و تخیل میں ہے، خرِ ادب، موج زن
صاحبِ طبعِ رواں، اپنے تقی عابدی

گاتے ہیں بُلبل، ہزار، شعلہ شرر، لالہ زار
ہوتے ہیں جب، گُل فشاں، اپنے تقی عابدی

سہہ نہیں سکتے ہیں جو، دردِ دلِ ناتواں
اُن پہ، بہت مہرباں، اپنے تقی عابدی

اُن سے ملاقات کے، سب سے تھے، ہم منتظر
سب کے بیچ اب، درمیاں، اپنے تقی عابدی

سکردو کی محفل ہے یہ، آج، ہمارے لیے
سب سے بڑا ارمغان، اپنے تقی عابدی

پختگیِ عشق ہے، اُن کا کمالِ ادب
زینتِ باغِ جناں، اپنے تقی عابدی

•••

نوٹ:- یہ منظوم یادگاری عقیدت نامہ، ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں، منعقدہ سیمینار بہ تاریخ 10 نومبر 2019، بروز اتوار، بہ مقام مشہ بروم سکردو، بہ وقت ساڑھے تین بجے پیش کیا گیا۔

بشیر آتم (جے پور)

عزت مآب جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی مدظلہ العالی کی نذر

ادب کے مطلع انور کا استقبال کرتے ہیں
شگفتہ جذبہ اصبر کا استقبال کرتے ہیں

سخن کی صبح کے اختر کا استقبال کرتے ہیں
فن عابدی برتر کا استقبال کرتے ہیں

مدائن فکر نیہ کا استقبال کرتے ہیں
فدائے ساقی کوثر کا استقبال کرتے ہیں

نظر آتے ہے جن میں حضرت اقبال کا پرتو
ہم ایسی فکر کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں

خدا شاہد کہ یہ لمحے بڑے انمول لمحے ہیں
سخن فہم و سخن پرور کا استقبال کرتے ہیں

بہت کشمیر کے اہلِ ادب کو ناز ہے اس پر
حسین تخلیق کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں

بہت افسوس ہے اس کا کہ حاضر ہو نہیں سکتا
مرے اشعار ہر منظر کا استقبال کرتے ہیں

زہے قسمت بشیر آتشؔ کہ یہ ساعت بھی آنی ہے
محقق کے حسیں جوہر کا استقبال کرتے ہیں

◆◆◆

پیش پذیر، بذریعہ پروفیسر سید رضا (کشمیر) 31 مئی 2010ء

ڈاکٹر محسن رضا رضوی
صدر شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی

2 / مارچ 2020ء

سپاس نامہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

کی اورینٹل کالج پٹنہ سٹی آمد پر

ہم آج جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
جو زیب بزم اس عالی گہر کو دیکھتے ہیں

ہم اپنے شوق کی بے تابیوں کو کیا دیکھیں
کہ حسن جلوہ بہ جلوہ گر کو دیکھتے ہیں

ابھر رہا ہے نگاہوں میں کائنات کا حسن
تقی عابدی سے دیدہ ور کو دیکھتے ہیں

ہماری بزم ادب مرکز نگاہ بنی
ہم اپنی بزم میں صاحب نظر کو دیکھتے ہیں

زباں کا حسن، ادا کا کمال، فکر کا ظرف
بیان اور بیاں کے اثر کو دیکھتے ہیں

وہ ایک ہم ہیں کہ مرتے ہیں دست قاتل پر
وہ اور ہوں گے جو زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ترے کلام کو سنتے ہیں جب بھی ہم رضوی
ادائے غالب آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

"وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

◆◆◆

ڈاکٹر پیکر جعفری اترولوی

نامور ادیب، محقق، شاعر
ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نذر

کار پیکار کو باکار بنا دیتے ہیں
سنگ الفاظ کو گفتار بنا دیتے ہیں
بات بنتے جو کوئی سخت کلامی سے قریں
اپنے لہجے سے خوش آثار بنا دیتے ہیں

•••

گفتگو ایسے سلیقے سے بھی کرتے ہیں جناب
سلم میں جہل میں دیوار بنا دیتے ہیں
یوں تو اللہ نے بخشی ہے شفا ہاتھوں میں
اپنے بیمار کو بیمار بنا دیتے ہیں

•••

علم و دانش کی جدھر جا کے اُڑائی خوشبو
خار زاروں کو بھی گلزار بنا دیتے ہیں
واقف کیفیت کرب بشر ہیں اتنا
دل کی آواز کو اشعار بنا دیتے ہیں

•••

دیکھی جاتی نہیں ناقدریٔ فن ان سے کبھی
صاحب مال کو حقدار بنا دیتے ہیں
توڑتے ہیں جو کبھی اپنی خموشی کا حصار
پھر تکلم کو بھی تلوار بنا دیتے ہیں

•••

معنی نور سے نہلا کے قلم کو اپنے
ساری تحریر کو ضوبار بنا دیتے ہیں
ہے تقی نام جو ہیں خادم اُردو پیکر
خود کو ہر دل کا خریدار بنا دیتے ہیں

•••

فیروز رشید
ناندیڑ (مہاراشٹر)

ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی

یہ میدان ادب ہے سب یہاں جوہر دکھاتے ہیں
ہزاروں لوگ آتے ہیں، ہزاروں لوگ جاتے ہیں
مگر کچھ لوگ اپنے نقش ایسے چھوڑ جاتے ہیں
مہک گلشن میں اپنی پھول جیسے چھوڑ جاتے ہیں
انہی میں اک نمایاں شخصیت باغ ادب کی ہے
یہ ہی شخصیت ہے جو بڑی محبوب سب کی ہے
تقی کے نام سے وہ شخصیت پہچان رکھتی ہے
حسن عابدی میں اک انوکھی شان رکھتی ہے
قلم کی شان ہے علم و ادب کی روشنی بھی ہے
تقی بھی ہے، حسن بھی ہے، بیان عابدی بھی ہے
قلم، اس نے اٹھایا تو گہر افکار کے چمکے
قلم اس نے اٹھایا تو کل علم و ادب مہکے
ہمیشہ ہر قدم پر نت نئے گوشے اجاگر ہے
قلم اس نے جہاں اک میدان میں اپنا اٹھایا ہے

وہ پھر تنقید ہو، تحقیق ہو، یا فلسفہ کوئی
ہو کوئی صنف آغوشِ قلم میں اس کے ہے سوئی

کمال عشق اُردو حوصلہ کچھ یوں دکھاتا ہے
نیا جب سال آتا ہے نئی تصنیف لاتا ہے

خیال اس کو کبھی آیا نہیں ہے اپنی شہرت کا
ہر اک تصنیف آئینہ ہے تحقیقی بصیرت کا

ہر اک تحریر گویا علم و فن کی ایک زینت ہے
ہر اک تصنیف اس کی اک اثاثہ بیش قیمت ہے

دھنک تحریر کی اس نے قلم کاروں پہ تانی ہے
ادب کے آسماں پر آج جن کی ضوفشانی ہے

کچھ ایسے کام کروائی ہے اس کی جستجو اس نے
نئی راہوں میں روشن ہے چراغِ اُردو اس نے

وہ حرکت کا ہے شیدائی طبیعت اس کی پارہ ہے
ادب کے آسماں کا وہ بڑا روشن ستارہ ہے

خدائے پاک لمبی عمر، ذہنی روشنی بخشے
قلم کو اُس کے، تحریروں کو اس کی، تازگی بخشے

•••

پنڈت بھوونیش کمار شرما بھون امروہوی

امروہہ فاؤنڈیشن کی جانب سے امروہہ میں
مورخہ 29 دسمبر 2021ء کو ڈاکٹر تقی عابدی صاحب
کینیڈا کے اعزاز میں کیے گئے اعزازیہ پروگرام

''ایک شام تقی عابدی کے نام'' میں پیش نذرانۂ عقیدت
قطعات

اے ہیں فرمان حیدر شخصیت ایسی عظیم
جو کہ عالی مرتبت ہیں صاحب تمکین ہیں
صاحب اخلاق ہیں اور دل کے ہیں یہ ڈاکٹر
کارنامے بھی ادب میں قابل تحسین ہیں

◆◆◆

جب سے علم و ادب کے ہیں محافظ عابدی
چار مصرعے ان پہ کہنے کا مجھے آیا خیال
آج کے اس دور میں یہ اوج کس میں ہے بھون
عابدی جیسی کوئی ہستی تو ملنی ہے محال

◆◆◆

قوم و ملت کے ہیں خادم اور اُردو کے سفیر
سج گئی ہے آج کی یہ شام ان کے نام سے
کتنی شہرت پائی ہے سبط نبی کے لعل نے
پوچھ لو تم اے بھون یہ بات خاص و عام سے

•••

عابدی صاحب ذرا اس شہر پر ڈالیں نظر
ہے زمیں یہ مصحفی کی اور سعادت کا ہے گھر
شاہ ولایت اور واسو دیو کا مسکن ہے یہ
ہیں مہذب لوگ اس کے شانتی کا ہے نگر

•••

سر زمین لکھنؤ کے جتنے ہیں اہل سخن
اُن کی تخلیقات سے ہیں عابدی بے شک خبیر
غیر سے ماحول میں رہ کر بھی پایا یہ مقام
خدمت طب ان کی اعلیٰ ذوق علمی بے نظیر

•••

مبہ امراض دل ہو کر ادب سے یہ لکا؟
اُس کی یا تعریف ہو جو ہے کمال حاصل انھیں
دیکھ کر ذوق سخن شاعر بھی حیراں ہیں بھون
شعر فہمی پر جو پایا اس قدر مائل انھیں

•••

جو ہے قابل جناب عابدی ہیں خوش کلام
کائنات جم ہی کیا اور بھی کتنے ہیں کام
ہے شغف علم و ادب سے مخلصانہ آپ کو
ان کی خدمت ادب کو ہے بھون کا بھی سلام

•••

ذیشان حیدر

ہے باغِ سخن کی نضارت تقی — عبیرِ زباں کی علامت تقی
یہ الفاظ گل کا گلستان ہے — سوہ عرضی کی جنت تقی
یہ نازِ ادب، فخرِ اُردو زباں — فصاحت کا نورِ صباحت تقی
یہ فرقِ بلاغت کا اکلیل فن — شعورِ بیاں کی طراوت تقی
خیالاتِ تازہ کی آشفتگی — ہے فہم و نظر کی شہامت تقی
یہ دارائے تحقیق و تدوینیت — فنِ شاعری کی حکومت تقی
رثائی کا یہ کعبۂ معرفت — قصیدہ کا حسن و جزالت تقی
زباں اس کی ہے نغمہ جبرئیل — ہے دینِ ہنر کی شریعت تقی

نہ کیوں فخرِ نوگانواں اس کو کہوں
ہے سلطان کا جذبِ عقیدت تقی

◆◆◆

ذیشان حیدر

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے لیے

انسان ہے ویسے تو یہ ساروں کی طرح ہے
عملی قد و قامت میں چناروں کی طرح ہے

تحقیق کی سوکھی ہوئی کھیتی پہ یہ پیہم
بارش کی برستی ہوئی دھاروں کی طرح ہے

انسان کے دکھ درد پہ لکھتے رہے جو لوگ
تو یہ خود بھی انہی درد کے ماروں کی طرح ہے

ہے فیض کا فیضان کہ پھیلی تیری خوشبو
کلزار ادب میں تو بہاروں کی طرح ہے

یہ فیض کی تحسین یہ حالی پہ ترا کام
سب میرے تنقید نگاروں کی طرح ہے

کرتے ہیں اسے پیار انیسی و دبیری
دونوں کے لیے عابدی یاروں کی طرح ہے

شفق ہو کہ ہو جاہی، فرمان کہ عاشور
میرے لیے یہ بھی انہی چاروں کی طرح ہے

تحقیق کے رہرو کو نہیں رات کا اب خوف
یہ ایک اکیلا ہی ستاروں کی طرح ہے

ہے علم اسے آج کتابوں کی اشاعت
ہے فائدہ ایسا کہ خساروں کی طرح ہے

جس درجہ اسے شعر و ادب سے ہے محبت
اس رشتے سے یہ بھی ہمیں پیاروں کی طرح ہے

ذیشان، تقی عابدی کہتے ہیں جسے لوگ
اس شخص کا ہر کام اداروں کی طرح ہے

•••

زاہد حسین لکھنوی

چند شعر اس کتاب اور آپ کی خدمات کی نظر ہیں

پڑھی جس گھڑی میں نے "نہج شرف"
تصور میں جا پہنچا سوئے نجف

علی کے محبوں کا دل کش کلام
شراب مودّت، ولا کا پیام

جواہر وہ لائے جو تھے زیر آب
وہ غوطہ زنی سے کیے بازیاب

تھا جوش ولا جس کی تعمیل کی
بڑی عرق ریزی سے تکمیل کی

دعا ہے یہ زاہد کی رب جلیل
تجھی کو ملے تو عمر طویل

رہیں آپ رہبر کامیاب
عنایت کریں مجھ کو جو نئی کتاب

◆◆◆

حشام احمد سید
منن، ٹینیسی

قصیدہ: برادرِ عزیز و محترم ڈاکٹر عابدی صاحب

ان کی تحریر و تقریر میں دلبری
فکر نو اور شگفتہ کلی تازگی

ان کی محفل ہے دانش کی جلوہ گری
ان کا معیار ہے بس ادب دوستی

چھا گئی ہو جو ابہام کی تیرگی
پھوٹتی ہے قلم سے پھر اک روشنی

جب کہ عالم میں ہو لفظوں کی ساحری
آگہی ہے تقی کو فہم باطنی

اس کو ملتی ہے تقدیس کی چاندنی
جس کا محور ہمیشہ ہوں مولا علی

بس گئی ان کے دل میں یوں حُبِ نبیؐ
حرزِ جاں ہے خدا کی فقط بندگی

ان کی نظروں میں رہتے ہیں اہلِ نظر
جب کہ ان کی بھی ہے شخصیت عبقری

دیکھتی ہے نگہ ان کی افلاک کو
سب کو تسلیم ہے ان کی دیدہ وری

ملک اٹھاتے ہیں سب ان کی تقریر سے
ہے شگفتہ ہی میں چپقلی رہبری

بزمِ دانشوراں میں یہ کہنا صحیح
ہاں تقی عابدی بس تقی عابدی

کرتے رہتے ہیں دل سے دعا یہ حشمؔ
ان کو حاصل رہے علم کی سروری

•••

ڈاکٹر خورشید خضر

1369, Elexander Dr.

Boling Brook, IL-60490

منظومِ خراجِ تحسین برادرم تقی عابدی

محبی، قسمی، تقی عابدی
رفیقی، شفیقی تقی عابدی
مصنف، مولف تقی عابدی
محقق، مفکر تقی عابدی
ٹورنٹو میں رہتے ہیں وہ مَم سے مَم
جہاں گشت ہر دم تقی عابدی
محرب، ہند و پاک اور ایران میں
امریکا، یوروپ کے ایوان میں
تقی عابدی کی کتابوں کا شور
نئی بستیوں میں ہے اُردو کا زور
انیس اور اقبال و غالب کے بعد
ہوا ''فیض فہمی'' کا شہرہ بلند
جہانِ ادب میں وہ ہیں ارجمند

بہت دھوم ہے حسن کاوش کی آج
نگارش میں یکتا تقی عابدی
"شناسائی فیض" ہر دل عزیز
ہے فیضان، حضرت تقی عابدی

•••

یہ درد!

جناب سید و حالی و غالب و اقبال
یہ دور اردو مشاہیر کا ہے روح رواں

پریم چند، انیس، فیض و جوش و مودودی
تمہاری فکر و نظر کے ہیں کتنے چارہ گراں

"یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے"
سمجھ میں آئے کا اک روز وہ نہاں ہے کہاں

•••

حسن تخلیق صورت تقی
سر بسر عشق سیرت تقی

آل رسول کے الفت تقی
مرحبا یہ سعادت تقی

کر گیا عظمت دین رسول بیاں
نکتہ داں تھا طبیعت تقی

مرثیٰ اہل بیت نبی کا شفق
کر گیا ہے بیاں بصیرت تقی

ہے یہ فکر و دانش کا خزینہ
کمال کا فصاحت و بلاغت تقی

ان کا ہر کلام موج علم و یقین
بحر جزو و کل حکمت تقی

وہ نعت نبیؐ سنا جو ہم نے
جوشؔ کھا رہی عقیدت تقی

کر گیا بیاں انیسؔ و دبیرؔ و غالبؔ
گفتار کی نزاکت میں صورت تقی

مہر کامل جاذبؔ نظر
حکیم امت کی زینت تقی

فطرتاً وہ اصل میں طبیب
کہہ گیا ادب کا مریض تقی

تاریخ میں چرچا بنا اے منیرؔ
ہر نواح میں ہے شخصیت تقی

•••

دبیر شناسی

ہوتا نہ تعارف کبھی خاقانِ سخن کا
منہ ڈھانپ کے تاریخِ ادب درد سے روتی
کرتے نہ تقی عابدی گر قوم پہ احسان
دبیر شناسی کبھی ممکن ہی نہ ہوتی

•••

مونا شہاب
واشنگٹن

تجزیہ یادگارِ انیسؔ

بزم میں روشن ہوئی ہے شمع بن کر دیکھئے
اس کے صفحات درخشاں کو الٹ کر دیکھئے

چند لفظوں میں ہے سمٹی ایک دُنیائے سخن
بند لوزے میں حقائق کا سمندر دیکھئے

کیوں کریں نہ تعریف و توصیف ارباب ادب
آج پورا چاند ہے بام ادب پر دیکھئے

لوحِ تربت نے دے دیا اپنی عقیدت کا ثبوت
کہہ رہے ہیں آج یہ سارے سخنور دیکھئے

•••

عبدالرحمٰن صدیقی
امریکہ

شاہِ سخن

اے تقی! اے اخترِ ارضِ دکن
تو نے زندہ رکھا صدیوں کا چلن

کر دکھایا تو نے تنہا وہ کمال
چاہیے جس کے لیے اک انجمن

تو نے روشن کر دیا اس نام کو
جس نے بخشی نظم اُردو کو پھبن

یعنی وہ سرمایہ اُردو زباں
وہ انیسؔ محترم شاہِ سخن

•••

نسیم فروغ
امریکہ

زورِ شباب

کیوں کر جواب ہوگا کسی لاجواب کا
فکر و نقی میں جوش ہے زورِ شباب کا
ایسی لکھی کتاب مچی دھوم چار سو
چاروں طرف ہے ذکر انہی کی کتاب کا

•••

انیس پر جو کوئی خاص کام کرتے ہیں
وہی تو فیضِ سخن اس کا عام کرتے ہیں
یہ دیکھ کر کہ ادب کو دیا ہے اس نے وقار
جو اہلِ فن ، ادب ہیں سلام کرتے ہیں

•••

عبدالغفار عزمؔ (لندن)

ہدیۂ تبریک

بتقریب اجراء ''کلیات غالبؔ فارسی'' جلد اوّل اور دوئم
کارنامہ ہائے تصنیف و تالیف و تدوین سید تقی عابدی، معروف دانشور، محقق،
ادیب، نقاد و ماہر فن زیر اہتمام اُردو سوسائٹی انیس اواے ایس
(لندن یونی ورسٹی و اُردو تحریک عالمی، یوکے)

رباعی

دل دار وہ اُردو کے سید تقی عابدی ہیں
جاں نثار وہ اُردو کے سید تقی عابدی ہیں
دانشور، نقاد و ماہر فن کے
شہسوار وہ اُردو کے سید تقی عابدی ہیں

14/اگست 2010ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی

خادم وہ شیدائی ہیں اُردو کے عظیم
سالار و مجاہد بھی ہیں اُردو کے عظیم
دانشور و نقاد و محقق شاعر
محسن تقی عابدی ہیں اُردو کے عظیم

•••

عبدالرحمان عبدؔ

سید تقی عابدی

علم و ادب کے حسن کی، نقطہ وری کی بات
ہر بزم چل رہی ہے تقی عابدی کی بات

میری زباں پہ آئی مگر ہے سبھی کی بات
خم خانۂ ادب میں عجب چاشنی کی بات

کہتے ہیں ان کے بارے میں، سب ماہران فن
یہ شخص اپنی ذات میں ہے ایک انجمن

دن ہو کہ رات ہو کبھی سوتے نہیں جناب
جانے تخیّلات سے چوریاں ہوتے نہیں جناب

دیتے ہیں اپنی رائے کو، بن کر دلیل یہ
تعریف کر رہے ہیں کتابوں کی ڈھیر یہ

اس فیصلے کی ان کو ضرورت ہی کیوں پڑی
ہر دوسری کتاب ہو پہلی سے کچھ بڑی

یہ فیصلہ ادب کے جہاں میں سبھی کا ہے
یہ آج کل کا دور تقی عابدی کا ہے

•••

6/مارچ2022ء

متین امروہوی

استقبالیہ

ہم اپنی بزم میں اہل نظر کو دیکھتے ہیں
ادب کے معنوی لعل و گہر کو دیکھتے ہیں
ہم ان کی شکل میں شمس و قمر کو دیکھتے ہیں
یہ ایک شام ہے جس میں سحر کو دیکھتے ہیں
"یہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

•••

حاضر غزل

رونق انجمن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں
بلبل نغمہ زن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

ہونٹوں پہ بات بات پر کھلتے ہیں پھول آپ کے
ہنستا ہوا چمن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

غالبؔ و میرؔ کی قسم قائم ہے آپ کا بھرم
ماہر فکر و فن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

اُردو زباں سے پیار ہے آپ کا یہ شعار ہے
میرے تو ہم سخن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

بزم ادب میں روشنی ہوتی ہے جو سو آپ سے
نور کی وہ کرن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

ایسے وفا شعار ہیں کرتے سبھی سے پیار ہیں
نازشِ انجمن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

ان کا متینؔ زیب تن فکر کا جو لباس ہے
علم کا پیرہن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

•••

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد
نیویارک

گلہائے خوش رنگ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تازہ ترین تحقیق "گلشن رعنا" اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ قمر اقبال کا مرتبہ ہے۔ یہ قمر اقبال کے لیے بڑا سرمایہ ہے اور ان کی پیش کش بہ اعتبار سے قابل ستائش اور معتبر ہے، جس کے لیے وہ دلی تحسین و مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے تقی عابدی جیسی ادب نواز اور ماہر لسانیات شخصیت میسر آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیشہ محبت کے ساتھ ساتھ اردو نثر، مقالہ نگاری اور تحقیق و تنقید میں ایک ایسا مقام پیدا کر لیا ہے جہاں سے اب پاکستان اور اردو ادب کے نامور حلقوں میں مستند تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو ہونا ہی تھا کیوں کہ مشرقی تربیت، سائنسی ذہن، اعلیٰ تعلیم اور علمی و ادبی ماحول میں پرورش پائی ہو تو اس حسین امتزاج سے کرامات کا ظہور پذیر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔

میرے مزید ڈاکٹر تقی عابدی کا شمار تقی کے ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جس کے پاس جتنے وہ بیٹھتے ہیں اور ہو جاتے بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کاوشوں اور تحقیقی مزاج سے کام لیتے ہوئے اپنی تمام تر توانائیوں کو اردو ادب کے کسی ایک گوشے کی جانب مرکوز نہیں رکھا بلکہ وہ اردو ادب کے جس پہلو پر بھی سوچنے پر مجبور ہوئے اس پر قلم اٹھایا۔ ظرافت ہو یا سنجیدہ، مزاحیہ ہو یا طنزیہ، شاعری ہو یا نثر، افسانہ ہو یا ناول، تحقیق کی بات ہو یا تنقید کی، ڈاکٹر صاحب نے ہر صنف پر قلم اٹھایا اور اس کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے اردو ادب کی ہر صنف کو اپنی طرز نگارش سے مالا مال کیا ہے اور اس حوالے سے بیش بہا قیمتی کتب تصنیف کی ہیں جن سے آنے والی نسلیں استفادہ حاصل کرتی رہیں گی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی شاعری میں فکر و مزاح کی آمیزش حاصل ہے۔ وہ اپنی بات کہنے میں

کے سوز و گداز کا رنگ دے کر اور کبھی علامہ اقبال کا داعیانہ مفکرانہ انداز دے کر نہایت شائستگی کے ساتھ برملا کہہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے

آج حیوان صفت پہنے ہیں انسانی نقاب
آج ہر ہاتھ میں رہتی ہے تمدن کی کتاب
آج ظالم کے حوالے ہے عدالت کا حساب
آج قمری کا نگہبان ہے خونخوار عقاب
ایسے عالم میں کوئی ہے جو حقیقت بولے
بند لاشوں پہ کوئی در زنداں کھولے

وہ اپنی بات محض اپنے حوالے سے نہیں کرتے بلکہ اپنے محسوسات کے وسیلے سے، اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش کی منظر کشی کرتے ہیں۔ نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

کلی کو بادۂ شبنم پلا دیا میں نے
لہو سے کانٹے کا چہرہ سجا دیا میں نے

•••

چمن کو آتش گل سے سجاتا ہوں
صدائے بانگ درا سے جگاتا ہوں

•••

خیال کو پر جبریل دے دیا میں نے
قلم میں رنگ گلستاں کو بھر لیا میں نے

•••

جو منزلوں کو ملائے وہ رہگزار ہوں میں
چمن سرشت ہوں صحرا کا برگ و بار ہوں میں

•••

صدائے کلک میں روداد زندگانی ہوں
میں کائنات کی اک ان کہی کہانی ہوں

محبت کے عنوان سے جب بات کرتے ہیں تو نظم و غزل دونوں میں اتنی سچائی سے
اظہار کرتے ہیں کہ قاری ان کے احساسات کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

بنے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
رستوں سے اگر راہنماؤں کو ہٹا دو

•••

دلوں میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی کبھی آئینہ خانہ میں بٹھا دو

•••

خود روشنی چہرے کی محبت کی زمیں پر
جو تم سے جفا کرتا ہے تم اس کو دعا دو

بچوں کی نظم کے عنوان سے ان کی نظم محبت سچائی اور انسانی ہمدردی کے جذبوں
سے سرشار ہے۔ اپنی بیٹی سے لیے گئے جو نظم "رویا" ہی ہے اس کی بھی ملاحظہ ہو

سجے ہونٹوں پہ بہاروں کا ترانہ لے کر
برف کے دور میں ساون کا زمانہ لے کر

•••

چاندنی بن کے مرے صحن میں اترتی ہے وہ
بن کے رنگین سی تتلی میں بکھرتی ہے وہ

•••

یہ ہے رویا کا اثر
ہے نئی نور نظر

•••

[illegible]
[illegible]

•••

ایسی تحریر ہے وہ
جس کی تفسیر نہیں

ڈاکٹر تقی عابدی کے اشعار پڑھ کر قاری پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے نئی نئی باتیں نئے انداز میں کہی ہیں گو وہ روایت تغزل سے دور بھی ہو سکے۔ کہتے ہیں

نظر بت تراشوں کی جن کو ملی ہے
چٹانوں کے اندر صنم دیکھتے ہیں

•••

عجب دور ہے یہ کہ لفظوں کے اندر
ادیبوں کے ٹوٹے قلم دیکھتے ہیں

•••

خم و پیچ عام کو جی نہیں چاہتا
ابھی زلف جاناں سے خم کھیلتے ہیں

•••

کچھ ایسا خوف تھا شعر و ادب کی بستی میں
میں اپنے نام کی تختی بھی گھر لگا نہ سکا

•••

کس کو صدا دوں کہ کوئی ہمنوا نہیں
کس موڑ پہ کھڑا ہوں مجھے خود پتا نہیں

•••

تم دھوپ کے صحرا میں کسے ڈھونڈ رہے ہو
یہ جھاڑ ہیں کانٹوں کے جو سایا نہیں کرتے

•••

مرے خیال سے رنگین نوا ہیں لوح و قلم
سنوارے میں نے عروس سخن کی زلف کے خم

•••

شکستِ خواب کی تعبیر بن رہا ہوں میں
فضا میں بکھرے ہوئے گیت چن رہا ہوں میں

•••

ادب کی خلعتِ زرباف بن رہا ہوں میں
حریمِ غیب کی آواز سن رہا ہوں میں

•••

اسے ترا دیکھنے سے حسن جہاں کیا
ہم عدم کی زنجیر بلائیں گے کسی دن

•••

خاموش ہیں اس وقت تری بزم میں لیکن
جو بات سنانی ہے سنائیں گے کسی دن

ہم ان کی بات سننے کے منتظر ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ یونہی بلند طرز رہیں گے
اور اس بزمِ خیال کی رونق کو اپنے منفرد رنگ سے رونق افروز کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

''گلشن رویا'' کا زندہ دل شاعر: تقی عابدی

تقی عابدی اپنے مستقل الرہائش سے بلحاظ بہت دور شمالی امریکہ اور نیویارک میں بستے ہیں۔ ظاہر دوری میں نے یوں کہا کہ باطن وہ آج بھی اپنے آبائی وطن مرزیت سے بہت قریب ہیں اور ان کا دل جنوبی ہند کے سیاسی و سماجی نشیب و فراز کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ دل کی یہ دھڑکن ایشیائی مسلم ممالک کے نشیب و فراز تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ انسانی سطح پر دنیائے اسلام کے سارے خطوں کے تغیرات سے منسلک ہو جاتی ہے۔ ایسا ہونا نہ تو بے سبب ہے اور نہ اتفاقی و لاشعوری بلکہ تقی عابدی کے افتادِ طبع کے عین مطابق ہے، سوچا سمجھا ہے اور شعوری ہے، اس لیے کہ وہ اس محدود جمہوریت یا نظام حکومت کے قائل نہیں ہیں جو وطنیت کی تنگ نظری اور علاقائی قومیتوں کی حد بندی سے جنم لے کر انسانی معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے بلکہ وہ ایسے جمہوری نظام کے قائل ہیں جو انسانی قدروں اور انسان کے بنیادی حقوق کے مستقل تحفظ کی اساس پر استوار کیا گیا ہو، چنانچہ تقی عابدی کی شاعری میں محدود وطنیت کی نہیں بلکہ عالمی وطنیت و اخوت کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ اقبال کے باشعور پرستاروں میں ہیں اور انھیں کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی ہے نہ صفاہاں نہ سمرقند

نتیجتاً ان کی شاعری جسے شاعری زندگی کا ترجمان کہنا چاہیے اور اپنے مخاطب کے حوالے سے مقامی نہیں رہتی بلکہ عالمگیر بن جاتی ہے اور پاک و ہند سے آگے بڑھ کر کشمیر، افغانستان، بوسنیا اور فلسطین کے دور دراز علاقوں کے باسیوں کو بھی اپنا مخاطب بنا لیتی ہے۔

اُردو اور فارسی ادب کے باب میں تقی عابدی کا مطالعہ قابلِ رشک حد تک وسیع ہے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس، ان کے تاریخی و ثقافتی پس منظر سے واقف اور ان کے نمائندہ شعراء کے محاسن و کمالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ وہ فن شناسی کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ عروض و علم بیان کے رموز و نکات سے بھی بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ وہ **المعجم فی المعیار اشعار العجم** کے مؤلف پروفیسر شمس قیس رازی کی تحقیق و عروض در زبان فارسی تک کی شناسائی رکھتے ہیں اور قدیم ادب کی روایتوں اور رجحانوں سے بھی اتنا ہی واقف ہیں جتنا کہ جدید سے۔ انھیں غالب اور علامہ اقبال سے خاص لگاؤ ہے اور علامہ اقبال کے فلسفہ، پیغام و عمل اور فکر و فن کے حوالے سے وہ بھی شریعتی کی طرح اقبال کے پرستار و شیدائی ہیں چنانچہ تقی عابدی کی شاعری خصوصاً ان کی نظموں میں جذبہ عمل کی جو بلند آہنگی نظر آتی ہے وہ علامہ اقبال اور ان کی شاعری کے اثرات کا ثمر ہے۔

تقی عابدی کا تازہ مجموعہ کلام "نشانِ راہ" طرح طرح کے پھولوں اور پھلوں سے سجا ہوا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ نعت، منقبت، قطعات بھی پیش کیے گئے ہیں اور سب میں فکر و فن کی قابلِ قدر جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ نظموں میں فی زمانہ نظم، تسمیہ، فریاد مسجد اقصیٰ، روشنی، جستجو، تقی ابدال، عید الفطر اور خالص فکری نظم سے بچوں کی بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آخر الذکر نظم "بچوں کی دنیا" ایک فکر انگیز اور خوب صورت نظم ہے جس میں اپنے معاشرے کی مذہبی اور فکری تنزلی پر بڑی دردمندی سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس نظم کا ایک اندازِ خاص ہے جو پڑھنے والے کو اپنے سحر میں باندھ لیتا ہے اور دیر تک اپنے حصار میں لیے رہتا ہے۔

تقی عابدی کی غزلیں بھی چھوٹی بحروں میں ہیں اور جذبات کے آبشار کا مہیب رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ اس جزو تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ بس چند منتخب شعر دیتے چلیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ فکر و فن اور جذبات و محسوسات کی پرتقی عابدی کی غزل کا کیا روپ ہوتا ہے۔

وہ آنسوؤں میں مجھ کو بہا کر چلے گئے
سیلاب میری آنکھ کا لیکن رکا نہیں

•••

موت پر مجھ کو اختیار نہیں
اس لیے اس کا انتظار نہیں

•••

مثلِ خوشبو کسی پہ بار نہیں
میں کسی دوش پر سوار نہیں

•••

درد میرا ہے کچھ، دوا ہے کچھ
میں نے مانگا تھا کچھ، دیا ہے کچھ

•••

اٹھایا جس کو خدا نے کوئی گرا نہ سکا
گرایا جس کو خدا نے کوئی اٹھا نہ سکا

•••

ہر شعر اس غزل کا ہے تیرے لیے مگر
کس کو غزل سناؤں ترے روٹھنے کے بعد

•••

اپنا دکھڑا سنا کے دیکھ لیا
جگ کو خود پر ہنسا کے دیکھ لیا

•••

دن ہمارے اجاڑ تھی محفل
اس نے سب کو بلا کے دیکھ لیا

•••

نیزے پہ اُسی سر کو اٹھاتے ہیں تمنّی جو
شیطان کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں جاتا

•••

دل میں تو ہے ہر اک سمت روا ہے سجدہ
سر جھکنے میرا جدھر جب وہ ادھر ہو جائے گا

ان اشعار میں جو چیز مشترک ہے وہ جذبے کی صداقت اور بیان کی سادگی ہے۔ ہر چند کہ محض اشعار نہایت فکر انگیز ہیں۔ لیکن شاعر کی قدرِ اکائی کی معرفت بات ایسی سادگی سے کہہ دی گئی ہے کہ یہ بیت میر تقی میر یاد آ جاتے ہیں۔ میر کا کہنا ہے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

یہ وہی صورت تمنّی عابدی سے شاعر مذکور ہوئی ہے۔ نہیں ہیں مشکل تراکیب و الفاظ کا استعمال، نہ استعارات و کنایات کا غیر ضروری ابہام، سیدھے جذبے سے بہہ اور بہاؤ کے وقت ہر خیال و احساس اپنی لفظی پیکر اپنے ساتھ لاتا ہے اور شعر کی صورت میں ایسا مکمل و مؤثر بن جاتا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس کی داد دینے پر مجبور پاتا ہے۔ شاعر کے خوش ذوقی اور سخن فہمی کی توفیق بطور عطیہ الٰہی میسر ہوئی ہو۔ میری دعا ہے کہ تمنّی عابدی کا "گلشن رویا" سدا شاداب و آباد رہے اور اس کی تعبیرات رویائے صادقہ کی طرح صادق و مثل وظیفہ بن جائیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی
الہ آباد

انشاءاللہ خاں انشاؔ: ایک جائزہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی طبعی طور پر شاعر اور تخلیق کار ہیں اور پیشے سے ڈاکٹر ہیں۔ لیکن اپنے غیر معمولی علمی و ادبی ذوق و شوق کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ تحقیق و تنقید ان کے نمایاں میدان ہیں خاص طور پر تحقیق۔ جہاں انھوں نے اپنی غیر معمولی تجسس آمیز مزاجی کیفیت اور تلاش حقیقت کے حوالے سے کئی غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ویسے تو انھوں نے ''رموز شاعری'' اور ''عروس سخن'' جیسی کتابیں لکھ کر اپنی زبان دانی بلکہ ہمہ دانی کے ثبوت فراہم کیے ہیں اور مرثیہ بالخصوص دبیر پر ان کے یادگار و لازوال کام نے انھیں جو شہرت و حیثیت بخشی وہ بڑے بڑوں کے نصیب میں نہیں آتی۔ دیار غیر میں وسائل کی کمی اور ذرائع کی قلت کے باوجود وہ کلاسیکی ادب کے خزانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور پوری منصوبہ بندی، عرق ریزی کے ساتھ جس نوع کے کام کرتے رہتے ہیں اس نے انھیں ایک عمدہ معتبر محقق کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ سائنس کے طالب علم ہونے کی وجہ سے عابدی صاحب کا انداز سائنسی اور معروضی ہوتا ہے وہ اسی موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ دبیر پر ان کا غیر معمولی کام ان کے اسی خیال و جذبہ کی تائید کرتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اردو تنقید و تحقیق نے جو سلوک انیس کے ساتھ برتا ہے وہ دبیر کے ساتھ نہیں جب کہ دبیر بھی اسی حق و انصاف کے مستحق ہیں۔ دبیر پر غیر معمولی کام نے پوری اردو دنیا (بشمول مشرق و مغرب) کو حیرت میں ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے اب عابدی صاحب کا مقام اعتبار و استناد کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ اسی سلسلے کی اگلی کڑی ہے ان کی کتاب ''انشاءاللہ خان انشاؔ'' اس کتاب کے لکھنے کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ وہ خود وجہ

تالیف کی ابتدا یوں کرتے ہیں:

"اگرچہ انشاؔ کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں کیا جاتا ہے لیکن دوسرے عظیم شاعروں یعنی میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کی بہ نسبت انشاؔ کی حیات، شخصیت اور فن پر کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اردو تذکروں، تاریخوں، قدیم اور جدید تحریروں میں انشاؔ پر جو اظہار خیال ہوا ہے وہ بے طرفانہ نہیں بلکہ معاندانہ بھی ہے جس میں تقریباً ساری توانائی ان کی ادبی معرکہ آرائی کو ثابت کرنے میں صرف کی جاتی ہے۔"

ممتاز شاعر و ادیب اشفاق حسین نے اس کتاب پر تقریظ لکھی ہے۔ انھوں نے اس کام کی ستائش تو خوب کی ہے لیکن انشاؔ کے نظرانداز ہونے کے پہلو اور اسباب بھی تلاش کیے ہیں۔

انشاؔ نے جو کارنامے انجام دیے ہیں تقی عابدی صاحب نے بڑے سلیقہ و ہنرمندی کے ساتھ اس کی ترتیب و تدوین کی ہے اور معروضی نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز بابو رائے سے ہوتا ہے جس میں پیدائش سے لے کر وفات اور آغاز شعر سے لے کر جملہ تصنیفات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں لیکن عابدی صاحب نے تمام تر تاریخ و تحقیق و نظر میں رکھ کر ترتیب تیار کی ہے۔ اس کے بعد شہر زندگی، آتش استخوان، حمدیہ اقدار، نعتیہ شاعری، منقبتی کلام کے علاوہ شاعری تصنیفات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان سب کی اشاعت، طباعت، جلد بندی وغیرہ کے علاوہ ان پر عام و مختلف تاثرات بھی ناقدانہ نظر سے لکھے ہیں مثلاً یہ ملاحظہ ہو

"انشاؔ نے تقریباً ہر صنف میں منقبتی شعر کہے ہیں چوں کہ انشاؔ کا زیادہ کلام ضائع ہو گیا اس لیے ہمارے پاس ان کے رباعی، اب یعنی مرثیہ، سلام اور نوحہ وغیرہ نہیں۔ فارسی اور اردو میں رباعی کی ہیئت میں حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی اشعار کی ہیں۔ شاید ہی عربی، فارسی اور اردو میں کوئی ایسی اور کوئی رباعی ہو جس میں چاروں مصرعوں میں تینوں نعت، منقبت اور سلام کی ساتھ میں نظم کیا گیا ہو۔ انشاؔ کی مجرد بیانی

اور قادرالکلامی نہیں تو اور کیا ہے۔" (ص ۸۲)

یا

"انشاء کو عربی زبان پر وہ قادرالکلامی حاصل تھی کہ وہ جس طرح جس لفظ سے کام لینا چاہتے تھے وہ ان کی تخلیق کی مخلوق بن کر ان کے قلم کے زیر فرمان آجاتے۔ دیوان بے نقط میں عربی فقروں کی ردیفیں قافیوں کے ساتھ اس طرح نبھائی ہیں کہ اس سے بہتر قافیے اور ردیف کی جوڑیں ایک ساتھ نہیں جڑ سکتیں۔"

"رانی کیتکی کی کہانی" کے بارے میں بھی لکھتے ہیں

"انشاء کی یہ کہانی آسان اور سلیس زبان میں ہے۔ اس کہانی میں ہندوستانی سماج کے زندہ مرقع شاہ ورخ میں تمدن کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔"

اس کے علاوہ اس کتاب میں انشاء کے ان کارناموں کا ذکر ہے جہاں انشاء کی استادی، قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے مثلاً نو شعروں میں پھیلتے مقامات کے نام، ایک غزل میں اکسٹھ قسمیں بغیر نقطہ غزلیں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ مثلاً معرکے، مناظرے، قصیدے، ان کی عربی دانی، ان کی سادگی اور سادہ لوحی وغیرہ وغیرہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان تمام امور کو پوری دیانت داری، ایمانداری سے حقائق کی روشنی میں اس طرح جانچا اور پرکھا ہے کہ انشاء کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے مکمل کارنامے روز روشن کی طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اتنی نزاکتوں اور گہرائیوں کے ساتھ انشاء کا مطالعہ اور معروضی تجزیہ اب تک ہمارے سامنے نہیں ہوا تھا۔ تقی عابدی کی یہ کتاب اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے اور ایک انوکھے اور البیلے شاعر کے ساتھ مکمل انصاف کرتی ہے۔

چلتے چلتے ایک بار اور انشاء جتنے خانوں اور معرکوں میں تقسیم ہوں لیکن ان کی اصل اور بنیادی حیثیت ایک غزل گو کی زیادہ بنتی ہے لیکن اس شعبہ میں بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جہاں سودا، درد، مصحفی جیسے اساتذہ کا طوطی بول رہا تھا ایسے میں انشاء کی خود پسندی، انانیت یا دربار کی وابستگی اور اس سے متعلق

ذہانت، شرافت وغیرہ نے ان صفتوں سے دور رکھا پھر ان کی غزلوں کی سبک روی، شوخی، شرارت اور تجربہ کاری نے پتہ نہیں کیوں تنقید کی سنجیدہ روش پر آنے سے روکا ہے۔ ان کی شاعری کو چوچو چاٹی کی شاعری زیادہ قرار دیا گیا جب کہ یہ بات پورے طور پر سچ نہیں ہے۔ اگر ایک طرف ان کے یہاں ایسے اشعار ہیں ؎

ہے تیرا گال گال بوسہ کا
کیوں نہ کیجیے سوال بوسہ کا

•••

پتہ اشارہ جو یہ ہم نے ملاقات کے وقت
ملا کہ رہتے کے دن ہے ابھی رات کے وقت

ایسے شعر بھی ہیں ؎

یہ لال لال ڈورے ہیں فصل گل میں
نرگس نے تیرے ساقی یاں گل کا منھ چڑھایا

•••

فشاں کا وہ عالم ہے اس چاند سے مکھڑے میں
جوں وقت سحر افشاں سورج کی کرن نکلے

•••

کبھی ہم جو پھر نہ ملوں گے جلیں گے
قدم آپ رکھتے میری چشم تر پر

اس سے علاوہ ذیل کے تین اشعار بھی دیکھیے ؎

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد تو ان سے ہو لعنت کریں شیطان پر

•••

یہ موقع اس غزل کی تشبیب کے ہے جی
میں اگر خط غلامی لکھ دوں اس احسان پر

پر نہ تھے اس پر بھی پروانوں سے کچھ پوچھیے ۔
کیا غضب ہوتا اگر پاتا نہیں انسان، پر

یہ غزل ؎

مجھے رونا آتا ہے شمع سحر پر
کہ بیداری اب مستند ہے سفر پر

•••

مرے در دل نے فقیرانہ صدا دی
لگائی ہے جا عرش اعظم کے در پر

•••

جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو
مطول کو دے مار تو مختصر پر

•••

کچھ اک صاف صاف ایسے کلمہ اشعار
کہ وہ ماریں چشمک صفائے گہر پر

اور اس غزل نے شہرت سے تمام دنیا کو توڑ دیئے ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

•••

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے اس میں تصوف، فکر و فلسفہ کے ایسے ایسے رنگ دکھائی دیں گے جو صرف فنی بنا کے حوالے سے ہی نہیں تہذیب و ثقافت اور معاشرت کے حوالے سے بھی آئینہ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں اس عہد کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، بود و باش نظر آئے گی۔ حرمان و یاس کی ایک ایسی کیفیت جو اکثر دل بہلاوے کی غرض سے

[illegible] حسن پرستی اور بھی کبھی جنس، جسم کے سہارے تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کوشش حسن پرست یا بدل ہوسکتے تو عقیدت سے لے کر ان کے متصوفانہ کلامی بلاغت و عقیدت کی فضا کا پیغام دیتی ہے۔

شاعری میں سارا سچ نہیں ہوتا ہے جو سچائی دیتا ہے۔ زندگی کی حقیقت، معاشرہ کی صداقت اور شاعر کی ذہنی کیفیت میں ایک بڑا بے نام سا رشتہ ہوتا ہے۔ نامعلوم سا اور نہ سمجھ میں آنے والا [illegible] رشتہ حقیقت کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔

اس کتاب میں اشاراتی انداز میں اشعار کو سماجی و تاریخی حوالوں سے سمجھنے کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔ تحقیق کی رو سے ایسے حوالے زیادہ ہیں جہاں سے تنقید کا سفر شروع ہوتا ہے۔

اشاریہ بلاشبہ ایک مفید و مستند کتاب ہے جسے اردو تحقیق کی دنیا تحقیقی حلقوں کے لیے ایک معلوماتی کام و یقیناً سراہے گی اور مناسب مقام حاصل کرے گی۔ میں ان کی اس غیر معمولی کاوش و محنت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

نسخۂ دیانت

علامہ اقبال (1877ء۔1938ء) بیسویں صدی کے عظیم ترین مفکر اور فلسفی شاعر تھے اور میری نظر میں بیسویں صدی اقبال کی صدی کہلائے گی۔ ان کا نثری اور شعری کلام اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ایک ایسے فلسفہ حیات کا حامل ہے جس نے تمام عالم انسانیت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس حکیمانہ کلام کا تقاضہ ہے کہ اسے ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے رمز شناس اور نکتہ سنج محقق میسر آتے رہیں، جو اپنے ذوق سلیم اور اپنی مخلصانہ کاوشوں کو بروئے کار لا کر فکر و فلسفہ اس خزینہ ہائے گراں مایہ موتی چن کر قندِ مکرر کرتے رہیں۔ زیر نظر نسخہ "اقبال کے عرفانی و فکری زاویوں کا مجموعہ" ایک ایسا ہی تحفہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ڈاکٹر عابدی صاحب نے جس ادبی دیانت داری، محققانہ صلاحیت اور مطالعے کی گہرائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ نہایت ہی قابل تحسین و ستائش ہے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دلدادگان اقبال اور اقبالیات کے طلبہ کے ساتھ ساتھ دنیائے اردو ادب کے اہل نظر حضرات بھی اس مجموعہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

حضرت علامہ کی شخصیت اور ان کے کلام کے بارے میں بہت کچھ تحریر ہونے کے باوجود ابھی بہت کچھ تحریر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ باقیات اقبال کے معیار اور ضخامت دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ علامہ موصوف نے اپنے کلام کی تشہیر اور اشاعت میں جس احتیاط اور مصلحت کوشی سے کام لیا اس سے ان کی ذات کے کئی احسن پہلو عوام الناس سے پنہاں رہے۔ اس میں وقت کی سیاسیات مذہبی رجحانات اور دیگر عناصر کا عمل دخل کتنا تھا یہ تو قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور کا انگریز نواز اور پنڈت نواز ماحول اس فرزند اسلام کو کیسے برداشت کرتا جس کی نگاہ میں ایک نئی تازہ کا نقشہ جگمگا رہا تھا اور جو ایک نئے زمانے کی

طلوع کے خواب دیکھ رہا تھا۔

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
(مسجد قرطبہ)

بقول "حضرت فرمان فتح پوری" اقبال سب کے لیے "اقبال کو بیشتر کتابوں میں اب تک جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اقبال کے مطالعہ کی راہیں ہموار کرنے کی بجائے مغالطے پیدا کرتا ہے۔ بہت سے مصنفین نے اقبال کے حقیقی افکار سے گریز کرکے اور اپنے متعصبانہ نقطۂ نظر سے تابع ہو کر پیام اقبال کو ایسا چوں چوں کا مربہ بنا دیا ہے کہ اس کا مطالعہ نہ صرف اقبالیات سے بے بہرہ بلکہ اہل نقد و نظر کے لیے بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔"

ان حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ موجودہ نسل بلکہ آئندہ نسلوں کو براہ راست کلام و پیام اقبال سے باقاعدہ متعارف کرایا جائے۔ اس کام کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے کسی نظریہ سے متاثر ہوئے بغیر ناقدین کی آراء کے تجزیہ سے بالاتر رہ کر اقبال کے کلام تک پہنچایا جائے۔ اس کام کے لیے بڑی دیانت داری، اقبال شناسی اور مخلصانہ محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا احساس وقت گزر جانے کے بعد ہوا تو کیا فائدہ۔ اقبال کا یہ شعر ہم پر صادق آئے گا۔

بے میری شمع کی محفل ہے گدازی ہی نہیں
صبح کے میں جس دم غبار کوئے رسوائی ہوا
(باقیات اقبال)

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی یہ تحقیق اس ضمن میں ایک ایسا ہی احسن اقدام ہے۔ گو یہ مجموعہ کسی جامعیت یا حتمیت کا دعویٰ نہیں کرتا نہ ہی یہ اس بار کا متحمل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے قارئین یقیناً مستفیض بھی ہوں گے اور ان کے اقبال شناسی کے اشتیاق میں اضافہ بھی ہوگا۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے بارے میں تحریری مواد کے بطور مطالعہ اور اس کے تحقیقی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں علامہ کے بارے میں قیاس آرائیاں اور غلط فہمیاں خطرناک حد تک موجود پائی جاتی ہیں، اس کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کہیں ایک موضوع پر علامہ کے خیالات یا ان کی رائے معلوم کرنا مقصود ہو تو یہ مواد یکجا میسر نہیں آتا۔ اگر یکجا بھی جائے تو وہ بغیر تصدیق اور بغیر حوالہ جات ہوتا ہے، جسے آج کا سائنسی ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اس میدان پر پورا اترنے کے لیے لازم ہے کہ محقق نہایت احتیاط، محنت، بھرپور مطالعہ اور چھان بین کے بعد کوئی رائے پیش کرے اور اس ضمن میں کسی بھی معلوماتی عنصر کو نظر انداز نہ کرے۔ یہ اقبال شناسی کا تقاضا ہے۔ اقبال خود ہر فن میں کمال کے داعی تھے۔

انسان کو فکر چاہیے ہر دم کمال کی
کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

ڈاکٹر تقی عابدی نے اسی کمال کی جستجو میں اپنا قلم اٹھایا ہے اور اسی ادبی ذہانت اور مخلصانہ کاوش کا مظاہرہ کیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ علامہ کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو اس مجموعہ میں زیر بحث لایا گیا ہے ان کے لیے دلائل اور تحریری ثبوت فراہم کرنا ایسی دستاویزات کا متقاضی تھا جو قدرے ناپید ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ذمہ داری سے ان لوازمات کو نبھایا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بابائے ظرافت جناب ضمیر جعفری مرحوم جنھوں نے ڈاکٹر عابدی کو "نیویارک کے جمیل جالبی" کا خطاب دیا تھا اگر آج حیات ہوتے اور ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کے معمول کو دیکھتے تو وہ انھیں "کتابی کیڑا" نہیں "کتابی مگرمچھ" کہتے۔ وہ اس لیے کہ ورق گردانی اور کتب خوانی میں جو سبک رفتاری انھوں نے دکھائی ہے وہ خیرہ کر دینے والی بات ہے کہ اس برق رفتار ماحول اور پیشہ

طب کی تو نگوں معروفیات کے باوجود اتنا پختہ اتنے کم وقت میں کر دکھایا۔ دبستان اردو سے ہزار ہا میل دور نیوزی لینڈ جیسے ملک میں بیٹھ کر اردو کتابوں سے ایک ضخیم مقالے کا حصول کی مجبوری سے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مدبرانہ مضمون، کلام اور متعدد اردو کے معتبر جرائد اور رسالوں میں باقاعدگی سے چھپتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی شخصیت تنقید اور تحقیق کے حوالے سے اردو ادبی حلقوں میں ممتاز و معتبر مانی جاتی ہے۔ اقبال کے حوالے سے اتنے سنجیدہ اور نازک موضوعات پر طبع آزمائی کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ عابدی صاحب نے یہ کر دکھایا ہے جس کے لیے وہ لائق مبارک باد ہیں۔

(حسن اتفاق دیکھئے کہ اظہار خیال کی یہ سعادت مجھے ہوا ہے ان لمحات میں نصیب ہو رہی ہے جو تمام ہر صفحہ کے لیے مژدۂ آزادی بن کر آئے تھے۔ رہے تن اس کی جانب سے خط سے پا آزادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علامہ اقبال آزادی کے پیامبر بھی تھے، منادی آزادی کے خضر راہ بھی اور مجاہد آزادی کے علمبردار بھی۔ انسانی حقوق کے تحفظ میں ان کا پیام بجا طور پر انسانیت کی متاع ہے۔)

آخر میں اپنی حوالے سے اتنی بات کہوں گا کہ اس تحقیق سے ڈاکٹر عابدی کو ایک منفرد و ممتاز فہرست میں شامل کر کے انھیں ایک نیا تشخص عطا کیا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال سے وہ تعلق قائم کیا ہے جس سے انھیں اب کلام و پیام اقبال کی طرح ہدیت ہو گئی ہے۔ اقبال خود کہتے ہیں کہ

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھئے
میں جس سے ہاتھ ملا لے ممن نہیں شکست

ظاہر ہے یہ مژدہ خود اقبال کی جانب سے ڈاکٹر عابدی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اقبال سے والہانہ تعلق ہی قلم حضرت کے لیے باعث افتخار نہیں باعث نصرت بھی ہو گا۔ ہماری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا اقبال سے تعلق ہمیشہ استوار رہے اور وہ اس وابستگی کا اظہار اپنی تخلیقات کی صورت میں آئندہ بھی بہت سی نئی راہیں روشن کرتے رہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے''

''بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو'' بننے والے کہتے ہیں۔ ممکن ہے چند ایک بگڑے ہوئے شاعر مرثیہ گو بن بھی گئے ہوں لیکن جب شاعری نکھرتی سنورتی ہے، سج دھج جاتی ہے، تب، کتاب کی حامل ہوتی ہے فصاحت بلاغت کی حدوں کو پار کر جاتی ہے اور شعر و ادب کے عروج و اقبال کی منتہاؤں تک رسائی حاصل کر لیتی ہے کہ اونچے اونچے معیارات بھی معمولی لگتے ہیں تو انیس جیسا مرثیہ گو پیدا ہوتا ہے۔ یہ شاعری کا بگاڑ نہیں بناؤ ہے، سوجھ سنگھار کے ساتھ، اپنی تمام تر رنگینیوں، رعنائیوں، برنائیوں اور تابانیوں کو لیے ہوئے۔ حقیقت کچھ ایسی ہے کہ ہم نے ایک مدت تک مرثیے و شعری و ادبی زاویوں سے انکاری نہیں اس کو ادب میں وہ جگہ ہی نہیں دی جس کا وہ استحقاق رکھتا ہے بلکہ بقول ڈاکٹر سید تقی عابدی ''مرثیوں کا مقصد صرف گریہ و بکا اور ثواب دارین حاصل کرنا قرار دیتے تھے۔'' بعد میں اور جو بھی ہوا ہو علامہ شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' تصنیف کر کے مرثیے سے ادبی انصاف کیا۔ کہا جاتا ہے شبلی نے دبیر پر انیس کو ترجیح دی۔ ایسا ہے بھی اور نہیں بھی۔ شبلی نے ادبی اور فنی جن اصولوں کو کام میں لایا اس کے نتیجے میں کچھ ایسا ہی ہونا تھا اور یہ حق بجانب بھی ہے۔ دبیر کی شاعرانہ صلاحیتوں ان کی قادر الکلامی اور ادبی ہنرمندی میں کس کو کلام ہے۔ دبیر کے مرثیہ نگاری میں عالی مرتبت کے باوصف انیس، انیس ہیں اور اس کا ہر کوئی اعتراف کرے گا۔ شبلی کو کاموں کے بعد مرثیے پر ادبی زاویوں سے بھی توجہ دی جانے لگی۔ یونی ورسٹیوں کے نصابات میں بھی انھیں شامل کیا گیا اور ہمارے ناقدین نے بھی ان کا مطالعہ اور تجزیہ شروع کیا۔ بے شمار مضامین اور کئی کتابیں سامنے آئیں۔ انیس اور دبیر ہی پر نہیں اور مرثیہ نگاروں پر بھی لکھا گیا۔ دکن میں

مرثیٰ کا جائزہ لیا اور لکھنؤ اور شمالی ہند کے مرثیے بھی توجہ پائے۔ لیکن اب جو کتاب منظر عام پر آئی ہے وہ اپنی نوعیت کی ہے، انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

"تجزیہ یا کارانیس" جب قطع کی مسافت شب آفتاب سے" ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کی ترتیب، تحقیق اور تنقید کے فرائض انجام دیے ہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں۔ پیدا ہوئے دہلی میں، ایم بی بی ایس یہ حیدرآباد سے، ایم ایس برطانیہ سے، ایف سی اے پی امریکہ سے اور ایف آر سی پی سنگاپور سے۔ اور ان دنوں سنگاپور ہی کے ایک مشہور ہسپتال ہی سے وابستہ ہیں۔ یقیناً تعجب کی بات ہے کہ اپنی بے انتہا پیشہ ورانہ مصروفیت کے باوجود شعر و ادب سے غیر معمولی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تاحال "شہید"، "جوش مودت"، "گلشن رویا"، "اقبال کے عرفانی زاویے"، "انشاء اللہ خاں انشا" جیسی تین تصنیف کی ہیں اور زیر ترتیب ہے "مراثی فرید لکھنوی"، "تجزیہ یا کار انیس" لائق توجہ کتاب ہے۔ ظاہری طور پر دیدہ زیب، آراستہ پیراستہ، بڑی سائز کے کاغذ، صحت پر مشتمل حاشیہ، طباعت اور متاثر کن جلد۔ لائق مبارکباد ہے کہ اس کتاب کا اصل موضوع انیس کا صرف ایک مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب سے" ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مرثیہ پر جو اس لائق تھا بھی خصوصی توجہ دی ہے لیکن یہ کتاب محض انیس کی مرثیہ گوئی پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مقدمہ قبال کاظمی کی تحقیق، پروفیسر آغا حیدری کے مقدمہ اور سید باقر زیدی، عاشور کاظمی اور حسین نقوی کی تحریروں کے علاوہ خود سید تقی عابدی (مرتب) کے پیش لفظ سے اس کتاب کی اشاعت سے اس منظر اور پس پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس باب پر مشتمل اس کتاب میں یا نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا کہ کسی ایسے شخص نے جس کی زندگی اور مصروفیات کی نوعیت، جامع مراثی انیس کا حامل دلی کارنامہ انجام دیا ہے۔ تاریخی، معاشرتی، فنی اور ادبی زاویوں سے ایسا فیصلہ معمولی تجزیہ کے بعد ہی صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جاتا ہے۔ تحقیق ہو، تنقید، تقی عابدی نے قدرے تنقید سے خود کو مرعوب کیا ہے۔ ان کی تنقید و تحلیل پیش پا افتادہ ہے۔ عمومی طور پر یہ کتاب معروضی تنقید

ہے۔ انیس کے سنہ پیدائش کے بارے ہی میں ہمارے ہاں اتفاق نہیں۔ مختلف اصحاب نے جو تعین کی ہیں۔ تقی عابدی نے ان سب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ انیس کی تاریخ ولادت 1802ء اور 1803ء کے درمیان کوئی تاریخ متعین کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ حالات زندگی کے ذیل میں انیس کی تعلیم و تربیت، اساتذہ، شاعری کی ابتدا، حلیہ، وضع، لباس، پابندی اوقات، اخلاق، کردار، نازک مزاجی، شعری ذخیرہ، ان کی غزل گوئی، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی کام، ورزش، منبر پر نشست اور پڑھنے کا انداز، مختلف مجالس، عظیم آباد اور حیدرآباد کے سفر، حالات، وفات اور تدفین کے بارے میں خاصی احتیاط اور موثق حوالوں سے تحریر کیا ہے۔ وہ یہ امر بھی بیان کرتے ہیں لیکن تقی عابدی نے بھی انیس کی ایک جامع اور معتبر سوانح ترتیب دی ہے۔ انیسویں اور بیسویں کی باتیں اپنی جگہ لیکن دبیر کے تعلق سے انیس کی صاف دلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''میر انیس مشاہیر ادب'' کے زیر عنوان غالب سے لے کر ڈاکٹر بلال نقوی تک کی آرا شامل ہیں۔ انیس ہی کے ایک مرثیہ پر نہیں کسی اور کے صرف ایک مرثیہ، قصیدہ یا کسی نظم پر ایسا تفصیلی تجزیہ شاید ہی کسی نے کیا ہو اور زبانوں میں بھی ایسی چیز کم ملے گی۔ چنانچہ مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کے متعلقات یعنی وجہ تصنیف، یہ مرثیہ کب اور کہاں پڑھا گیا، مرثیہ کے بندوں اور مطلعوں میں اختلافات مرثیہ کی اشاعت، مرثیہ کے مطلع اور الفاظ کے استعمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ اشخاص مرثیہ کے بارے میں بھی تحریر ہے۔ مرثیہ پر اعتراضات کے تحت کلیم الدین احمد وغیرہ کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے اور پروفیسر مسعود حسین ادیب، سید اختر علی تلہری اور مرزا جعفر حسین نے اپنے اپنے طور پر اس مرثیہ کا جو مطالعہ کیا ہے اس کو شامل کتاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کتاب کے کینوس کو خاصا کشادہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے جس محنت اور باریک بینی کے ساتھ یہ کام کیا ہے اس کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے تجزیہ کے طریق کار کو نہایت صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ایک اہم باب ہے۔ دسواں باب ''معجز بیانی'' اس لیے خصوصیت کا حامل ہے کہ تقی عابدی نے اس باب کو ''میر انیس ایک عظیم شاعر تھے اس لیے ان کی شاعری بھی عظیم ہے۔'' کے جملے سے شروع کرتے ہوئے انیس کی منظر نگاری، مرقع نگاری، رزم نگاری، جذبات

نگاری، نفسیات نگاری اور بیان نگاری وغیرہ پر تنقیدی عمدگی اور خوب صورتی سے تبصرہ کیا ہے کہ صرف اس مرثیہ کے لیے نہیں، انیس کے کل مراثی کے مطالعے کے ضمن میں ایسے صفحات اہمیت رکھتے ہیں۔ تقی عابدی کو علم بیان اور علم بدیع پر جو دسترس حاصل ہے وہ گیارہویں باب "محسن شعر" سے ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے استادانہ مہارت کے ساتھ یکجا بیان اور رواں دواں بحث میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور صنائع معنوی و لفظی پر شستہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور مثالیں بھی اسی مرثیہ سے دی گئی ہیں کہ مرثیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خوبیاں خود بخود قاری کے سامنے آجائیں۔ اسی کے ساتھ یہ معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہیں کہ اس مرثیہ میں کل 197 بند ہیں، جملہ اشعار کی تعداد 591 ہے۔ تقی عابدی نے الفاظ شماری بھی کی ہے۔ مرثیہ میں جملہ الفاظ 9517 ہیں جن میں اردو الفاظ 5813 یعنی 61 فی صد، فارسی الفاظ 1948 یعنی 20 فی صد اور عربی الفاظ 1760 یعنی 19 فی صد ہیں۔ اسی طرح اس مرثیہ میں جملہ حروف کی تعداد 29236 ہے۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ کل تشبیہات استعارات اور کنایات وغیرہ کی تعداد بھی دی گئی ہے۔ نیز خصوصی جدولوں میں یہ ساری چیزیں ہر بند سے ہر شعر کے حوالے سے درج ہیں۔ مزید یہ کہ ایک صفحہ پر مرثیہ کا ایک بند تحریر کرتے ہوئے اس کے مقابل سے صفحہ پر اس بند کے ہر شعر میں مستعمل صنائع معنوی و صنائع لفظی و پیش کرتے ہوئے ان میں وضاحت و بلاغت کی طرف اشارہ دیا ہے اور بھی کئی حسن بیان و بھی دکھایا ہے۔ تقی عابدی کا انہماک اور خلاص ہر جگہ جلوہ دکھاتا ہے۔ مرثیہ سے منتخب اشعار بھی دیے ہیں اور مراثی کے مطبوعہ مجموعوں کے سرورق سے عکس بھی۔ اور حاصل مرثیہ شعر بھی جو یہ ہے۔

بانگ سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداؐ

تقی نے اس مرثیہ کے فارسی اور عربی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مرثیہ کے ابتدائی حصہ کا عربی میں ترجمہ [illegible] صاحب مرحوم نے کیا تھا۔ تقی عابدی نے اصل مرثیہ کے تمام بند اور ان کے مقابل عربی ترجمے کے بند شامل کتاب کیے ہیں۔ انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala کے عنوان پر فیروز الدین منصور نے کیا ہے جس پہلی طبع

پر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ نئی نسل اُردو سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ انگریزی ترجمے کی شمولیت کی افادیت میں کلام نہیں۔ ذیلی ضمنی طور پر اور باتیں بھی سامنے آئی ہیں مثلاً اس مرثیہ کے 118 ویں بند کے آخری مصرعہ "پانی نہ وہاں میں اترا تھا سایہ کی چاہ سے" پر مسلسل ساٹھ سال بحث جاری رہی تقریباً دو سو سے زائد افراد نے حصہ لیا۔ بقول تقی عابدی "اگر ان مکاتیب اور مضامین کو یکجا کیا جائے تو اس مصرعہ پر پوری ایک کتاب تالیف کی جا سکتی ہے۔" (ص 163) اسی طرح ایک دوسرے مرثیہ کے مطلع کے مصرعہ اولیٰ "آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے" پر شیفتہ کا تبصرہ یہاں یہ بھی عرض کروں کہ اتنے اہتمام، بلکہ ترک واحتشام سے شائع ہونے والی کتاب میں یہیں یہیں ہی کمپوزنگ کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ صفحہ 163 پر "پانی نہ وہاں ۔۔۔ اٹھا" کو مرثیہ کے بند (117) کا آخری مصرعہ لکھا گیا ہے جب کہ یہ بند (118) کا آخری مصرعہ ہے۔ اسی طرح صفحہ (242) پر "محاسن شعر" کے تحت تشبیہ Simile و استعارہ Metaphor لکھا گیا ہے لیکن صفحہ (252) پر استعارہ کے بارے میں درج کیا گیا ہے کہ "اسے انگریزی میں Smile کہتے ہیں۔" ظاہر ہے یہاں Metaphor ہونا تھا۔

مرثیوں پر انیس اور انیس کے مرثیوں پر اور لکھا جانے کا، بہت کچھ لکھا جانے کا لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس ذوق وشوق کے ساتھ یہ کام کیا ہے، اس نوعیت کے کام تا حال تو ہوئے نہیں اور آئندہ بھی پتہ نہیں زیادہ شاید ہی ہوں۔ اُردو مرثیہ کی تاریخ بالخصوص "انیسیات" میں اس کا وزن وقار کا تعین بتدریج لگایا جائے گا۔

علامہ اعجاز فرخ
حیدرآباد

ڈاکٹر تقی عابدی اور انیسؔ شناسی

جس طرح غالبؔ کے ساتھ عبدالرحمان بجنوری کا تصور ابھرتا ہے، اسی طرح انیسؔ کے ساتھ شبلی نعمانی کا بھی خیال آتا ہے۔ شبلی کی کاوش نے بہت سارے افکار دیے اور ہموار کردی۔ اس سلسلے میں امداد امام اثر، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر علی جواد زیدی، صالحہ عابد حسین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر نذیر میتھیوز، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر عتیل رضوی، پروفیسر کلیم الدین اور بہت سارے نام ایسے ہیں جنھیں میں طوالت کے خوف سے پر لکھ نہیں پا رہا ہوں، ورنہ تو خود یہ ایک دفتر بن جاتے۔ ان تمام نے کلام انیسؔ پر بہت غور کیا، بہت کچھ لکھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت ساری وہ جہات بھی نگاہ میں ابھر آئیں جو نوزائیدہ تھیں۔ یہ جہات مستقبل میں بھی غور و فکر کرنے والوں کو نئے نئے زاویوں سے روشناس کراتی رہیں گی۔ یہ وصف اردو کے دوسرے شعراء غالبؔ اور اقبالؔ سے پایا جاتا ہے اور باقی رہے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خیال کی ترسیل کے لیے ایک عمارتی کی حیثیت رکھتا ہے، آہنگ پر وہ مکمل ہوتا ہے۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوجاتا ہے کہ خیال کی ترسیل ہو جاتی ہے اور کبھی نہ ہو پائے تو تاثر خیال سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ ادیب و شاعر کی ہر تخلیق اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب اس کی قلم میں تخلیق سے وابستہ شخصیت کے تمام خانوں کی طرح اپنے نام، نسب، قبیلے، صفات، خصائص، محاسن، عیوب، اوصاف قدوقامت، رنگ روپ، آہنگ اور لہجے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ادیب و شاعر کی یہ صفت ان پر حکمرانی کرتی ہے جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ پڑھنے والوں سے وابستہ رہتا ہے۔ ہر پڑھنے والے کا یہ انداز بھی ان کو وجود میں لانے کا سبب بن جاتا ہے۔ شاید یہ بات بھی بار بار کہی جانے سے کچھ نہ کچھ نئی ہوتی ہی ہیں جب تک کچھ نہ کچھ

نہ ہو لفظ اپنے سارے اوصاف کے باوجود اثر پذیری سے محروم رہتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنی جگہ کوئی مستقبل معنی نہیں رکھتا بلکہ اپنے محل استعمال سے معنی پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بھی دیکھی گئی کہ کوئی کم حرفی، چھوٹا سا لفظ اپنے جلو میں ہزاروں معنی کا ترجمان ہو جاتا ہے اور نوزمعنی و مطالب باقی رہ جاتے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پہلا مصرعہ تو صاف ہے اور شرح کا محتاج نہیں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اشارت اور عبارت دونوں واضح ہیں اور اپنے معنی مدعا کا اظہار بھی رکھتے ہیں لیکن یہ بخت سہ حرفی لفظ ''ادا'' اپنے جلو میں ہزار ہا معنی رکھنے کے باوجود قاری کے ذہن کو ایک ایسی رنگین خیال کی طرف ملتفت کر دیتا ہے جو ابھی اپنے کردار پن کو لفظ کے قالب در آہنگ کے سپرد کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ بڑا شعر وہ ہوتا ہے جو ایک شعر میں اور بڑا ادیب ایک جملے میں کائنات کو سمیٹ لے لیکن سب سے بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو ایک لفظ میں کائنات کو سمیٹ لے۔ مومن خان مومن کا شعر ہے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس کو سادہ بیانی کہیے، سہل ممتنع کہیے، مومن کی ساری لطافت اور کمال فن اس ایک شعر میں موجود ہے، گویا مومن نے ایک شعر میں کیفیت سمیٹ لی ہے۔ مومن نے ''گویا'' ذو معنی سہی لیکن جس طرح غالب کے شعر میں ''ادا'' جہان معنی کو سمیٹے ہوئے ہے۔

اسی طرح سے میر انیس کے مرثیہ کا ایک مصرع ملاحظہ ہو

''آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے''

اس ایک لفظ ''تنہائی'' کی معنویت اور وسعت کے لیے لغت اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس ایک مصرعے اور ایک لفظ ''تنہائی'' کے بعد میر انیس کو مرثیہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ایک مصرع مکمل مرثیہ ہے اور یہ لفظ ''تنہائی'' جملہ جہان

درد و الم کو سمیٹے ہوئے ہے اور یہی مرثیہ کا مدعا بھی ہے اور اس کی انتہا بھی۔

بالعموم میدان ادب میں اور خصوصاً مرثیہ کی شرح و بسط میں ڈاکٹر تقی عابدی کا نام خوش اعتباری کے سارے اوزمات لیے ہوئے ہے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ تمام فنون الگ الگ صلاحیتوں کے متقاضی ہیں۔ تحقیق، جستجو، تلاش مسلسل باریک بینی، عرق ریزی سے پیسوا صرف سعی پیہم اور مستقل مزاجی ہی مدد نہیں ہوتی بلکہ تمنائے جنوں بھی کرتی ہے تاکہ دشت الاحاصل میں حاصل تلاش ہو جائے۔ جہات فیض پر بہت کام ہو چکا لیکن ڈاکٹر تقی عابدی اس بات کے قائل نظر نہیں آتے کہ

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

وہ پہلے دبیز تہوں میں ان زمینوں کی زرخیزی کو تلاش کرنا چاہتے ہیں جس میں بھی بے شمار دفینے اور انمول خزانے موجود ہیں۔ انھیں فکر سخن، خامہ خونچکاں سخن، عزم صمیم نے مقابل کیا ہے، سامنے وسعت افلاک سخن۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی شخصیت اور فن پر نقد و نظر کرنے والوں نے اس نکتہ پر توجہ دی ہے کہ وہ پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں اور ذوق کے اعتبار سے ادیب، شاعر، محقق و نقاد ہیں۔ دونوں رنگ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور ان میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ میری نظر میں یہ دراصل یوں ہے کہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

ڈاکٹر تقی عابدی دراصل انسانوں کے مسیحا اور دردوں کے چارہ گر ہیں۔ ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی خیال ہے کہ

یہ سوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
تو یہ سودائی دل سودائی پروانہ ہے

یہ بات اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر تقی نے انھیں مسیحائی دردوں پر کمر باندھ لی ہے۔

عجیب پہیلی ہے کہ جب حسن بیدار ہو تو عشق کو قرار بھی نہیں اور بیداریٔ حسن سے نکھار میں لذت نگاہ بھی ہے۔ میں اس پہیلی کو بوجھنا نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی پہیلی کو پہیلی ہی چھوڑ دینا اچھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ ان کے خاندان سے بھی واقف ہوں۔ اس خاندان میں سب ہی ہونہار بلکہ یگانے روزگار ہیں۔ وہ دور افتادہ ہیں لیکن محبت فاصلوں کی اسیر نہیں ہوتی۔ اور آج تو فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ آواز دوست اور دیدار یار اب کوئی افسانہ ماضی نہیں رہا۔ اب کہاں وہ بات کہ

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

اب تو نامہ بر اور صبا دونوں زیر دام ہیں۔ ویسے دل قریب ہوں تو دوریاں کوئی معنی بھی نہیں رکھتیں۔

مرثیہ، مرثیہ کا آغاز، ارتقا، اس کی ہیئت، اجزائے ترکیب میں اس کا حصہ، مشابہ مرثیہ گو شعرا، محاسن، ان سب پر گفتگو ہو چکی ہے۔ نقادان فن نے دفتر کے دفتر لکھ چھوڑے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہے اور نہ میں اس وقت ڈاکٹر تقی عابدی کی کاوشوں پر تفصیلی مضمون لکھ سکتا ہوں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے مرثیہ شناسی اور انیس شناسی میں محبتوں کے وسیلے سے غلو کیا ہے اور یہ بھی نہیں کہ انھوں نے بعض نقادوں کی طرح سفاک رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کی تحریریں اور خیالات عدل کے منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امجد علی شہری نے حیات انیس میں ان کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں بتائی ہے۔ امیر احمد علوی نے چودہ سو کے قریب بتلائی۔ شاہ عظیم آبادی نے ایک ہزار مرثیوں سے زیادہ کی روایت کی ہے۔ میں اس وقت مولانا محمد حسین آزاد اور "آب حیات" میں انیس کے دس ہزار مرثیوں کی تعداد پر غور کرنا نہیں چاہتا۔ محمد حسین آزاد کی نثر نگاری پر حرف گیری کرنا آپ بے بہرہ ہونے کے مماثل ہے لیکن وہ تحقیق کے آدمی نہیں ثابت ہوئے۔ ان کی بیشتر روایات خوش اعتباری کے میزان پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے ان تمام سے پرے مرثیوں کی تعداد 250 بتلائی ہے۔ پروفیسر نیر مسعود کے مطابق مطبوعہ مرثیوں کی تعداد دو سو ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گراں قدر تحقیق

ے بعد 3 | 2 مراثی، 103 سلام، 4 | نوحے اور ولی در جن کچھ منا جات اور تضمینات، 579
رباعیات وہ حصہ تحقیق قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی جواہر پسند نگاہ نے اس امر کو بھی غور
سے دیکھا ہے کہ جہاں بعض لوگ زیادہ الفاظ و شاعری میں استعمال کی بنیاد پر نظیر اکبر آبادی
کو انیس سے بڑا شاعر تصور کرتے ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے نظیر اکبر آبادی کے کلیات کا
مطالعہ کیا جو 1922ء میں چھپا تھا۔ اس سے انیس کے کلام کا موازنہ کرنے پر تحریر فرماتے ہیں
کہ نظیر کے پاس 7(۱۱۱) اشعار ہیں تو انیس کے پاس مطبوعہ غیر مطبوعہ تقریباً 8 ہزار
اشعار ہیں۔ تقی عابدی صاحب کی نظر فن عروض پر بہت گہری ہے۔ وہ انیس کے مرثیوں کی
بحروں کے تعلق سے رقمطراز ہیں کہ انیس کے مطبوعہ مرثیے خفیف سے اوزان اخرب،
مضارع، مجتث، مضارع، اخرب، مضارع، مجتث میں 8 مرثیے، خفیف مضارع سے اوزان اخرب، مضارع، مجتث میں
52 مرثیے، خفیف سے اوزان میں 93 مرثیے اور خفیف سے اوزان میں 3 یا 4 مرثیے
موجود ہیں۔

میر انیس پر بہت کچھ لکھا گیا، بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، بہت کچھ لکھا جانا ہے۔ انیس
کی شاعرانہ عظمت ہمالیہ ہے۔ بہت نقد و نظر کے ساتھ ساتھ مضامین و رہتی ہیں لیکن جو
چیز ڈاکٹر تقی عابدی کو دیگر ناقدین و محققین سے منفرد و ممتاز کرتی ہے، وہ رباعیات انیس پر
نقد اور یادگار مرثیہ "لب تشنہ کی مسافت شب آفتاب سے" کی شمولیت ہے۔

"رباعیات انیس کا اجمالی تذکرہ" میں ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک عمومی مطالعہ پیش کیا ہے
رباعی کی عربی اصل سے، ان کی نظر میں ہیئتی تنوع ہے۔ رباعی کا وزن فارسی ہے
عربوں نے اسے اپنی زبان سے لیا۔ اس بات کی توثیق محمود علی حیدر نظم طباطبائی کے
اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "رباعی فارسی والوں کا ایجاد کیا ہوا ایک وزن ہے" پروفیسر محمد
شفیع رباعی کا یہ خیال ہے کہ صنف شاعری میں رباعی اور مثنوی ہیئتوں کی ایجاد تسلیم کی جاتی
ہے۔ محمد حمید الرحمن خاں نے رباعی و عربی نژاد بتانے کی کوشش کی ہے۔ ان سے علاوہ
خاندان کی پیدائش بتلاتے ہیں۔ تقی عابدی نے مختلف دلائل سے اسے ثابت کیا ہے کہ
رباعی ایرانی اصل کی ہیئت ہے۔ رباعیات کی بحث میں تقی عابدی کی تحقیق قابل
داد ہے۔ انھوں نے 2008ء تک میں رحلت فرمانے والے شعراء و محققین سے مجموعہ

''مکاشفات الاسرار'' کی اٹھارہ سو رباعیات اور ''مخزن الاسرار'' میں ۱۱۱۱ رباعیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن انیس کے سلسلے میں انھوں نے رباعیات میں کافی عرق ریزی کی ہے۔ میر انیس کے کلام کی تاثیر کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ان کی رباعیات کے بعض مصرعے ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے۔ مثلاً

''کانٹوں کو بنائے پھول چن لیتا ہوں''

''جس طرح چراغ آگے نابینا ہے''

''نادان ہے جو آپ کو دانا سمجھے''

''اس ہاتھ کو اس ہاتھ کا محتاج نہ کر''

ڈاکٹر تقی عابدی انیس سے شغف رکھتے ہیں انھوں نے جتنی توجہ مرثیہ پر صرف کی ہے، اتنی رباعیات پر صرف نہیں کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیس کے واسطے میر عارف کے فرزند سید یوسف حسین کے قلمی خاندانی نسخوں سے مطبوعہ رباعیات سے تقابل کا اہم کام بھی کیا۔ فضلی نول کشور کی شائع کردہ ''مراثی انیس'' کی پہلی جلد میں ۱۸۱ رباعیات ہیں، ان میں ۱۱ رباعیات میں اختلاط ہیں۔ تقی عابدی نے نہ صرف ان کی نشاندہی کی ہے بلکہ پہلو بہ پہلو صحیح اور مستند مصرعے بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً

''بے'' زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے

کے بجائے

''لے'' زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
یہ قبر کی منزل بھی ''تب'' بھاری ہے
یہ قبر کی منزل بھی ''غضب'' بھاری ہے

مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ میں ڈاکٹر تقی عابدی کی اس کاوش کو جہاں انھوں نے میر انیس کی وہ رباعیات جن کا ترجمہ دیگر زبانوں میں ہو، پیش کرتا، لیکن حیران ہوں مضمون میں کیا کیا لکھوں، لیکن یہ لکھے بغیر چارہ نہیں کہ ڈاکٹر عابدی نے جس شاعر پر بھی لکھا، اس کا منصفانہ تجزیہ کیا اور یہ چاہا کہ شاعر کو اس کا صحیح مقام ملے۔ خود انیس کے سلسلے میں نقادانِ اردو نے جس طرح انھیں نظر انداز کیا، ان پر اعتراضات کیے، اس کے بعد یہ ضروری تھا کہ

از رفوگر مرثیہ انیس کا باریک بینی سے تجزیہ کرکے نہ صرف حقائق کو آشکار کیا جائے بلکہ اس میں وہ پہلو بھی تلاش کیے جائیں جو ہنوز اوجھل تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا شاہکار کارنامہ ان کی کتاب "یادگار انیس" ہے۔ جو انیس سے معرکۃ الآرا مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کی شرح ہے۔ یہ کتاب سن 2012ء عیسوی میں مرثیہ فاؤنڈیشن شمیم سے شائع ہوئی۔ اور ڈاکٹر ابو حیدری کاظمی کی زیر نگرانی شائع ہوئی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تقی عابدی صاحب سے میری رسم و راہ ابھی ہی تھی۔ میں یہ کتاب حاصل نہ کر سکا۔ میرے ایک دوست نے مجھے وہ کتاب مستعار دی اور وہ بھی صرف دس دن کے لیے۔ گیارہویں دن جب وہ بس نہیں کتاب واپس کرنے میرے گھر آ گئے تو میں اس قیمتی کتاب کے ساتھ فرار نہ ہو جانا اور وہ اس بیش قیمت سرمایہ سے محروم ہو جائیں۔ مجھے ان کا یہ طور پن بر نہیں معلوم ہوا۔ در اصل کتابوں کی حفاظت اسی طرح کی جاتی ہے۔ بچپن میں میرا حافظہ بہت قوی تھا۔ پڑھ لیتا تھا تو برسوں بھولتا نہیں تھا۔ لیکن یہ کتاب پہلی تھی جس کے بعض اندراجات نے تحیر کی لذت سے آشنا کیا۔ میں نے نوٹس لکھے۔ اپنے خیالات پر بار بار غور کیا۔ اپنے آپ کو سمجھایا۔ اپنی رائے تحریر کی۔ ان نوٹس کو میں نے "انیس شناسی" کتاب میں محفوظ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی اس کتاب کو دیکھ لیا کرتا تھا کہ وہ نوٹس محفوظ ہیں کہ نہیں۔ دراصل میر انیس کا وہ مرثیہ ہے جس میں میر انیس کی ابھی کیفیت کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کتاب کی اس تجزیہ میں ڈاکٹر تقی عابدی پر سید الشہداء کی مرثیہ خوانی کا پرتو نظر آتا ہے۔

پروفیسر سید محمد حسین رضوی نے بیسویں صدی کے عظیم انیسیات ہیں۔ ساری عمر کلام انیس کے باغ و بہار گلشن میں گزاری ہے۔ اپنی محتاط بیانی سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ پروفیسر سید محمد حسین رضوی نے انیس سے متعلق جو کارنامہ انجام دیا ہے جو عبدالرحمن بجنوری نے غالب سے متعلق یا ڈاکٹر تقی عابدی نے انیس سے متعلق تحقیق و تجزیہ کیے ہیں ان کی تحریروں کا جواب نہیں ہوتا ہے۔ لیکن "یادگار انیس" جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" سے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی

میر انیس کے تمام مرثیے پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ یہ مرثیہ پڑھ لے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میر انیس کے مرثیوں میں یہ مرثیہ کمال پر ہے۔ شاید اس بات سے اتفاق کیا جائے کہ فن کار کے عروج یا شہرت میں اس کے نقاد کا بڑا دخل ہے۔ نقاد اور شارحین فن نئے زاویے تلاش کر کے منظر عام پر لے آتے ہیں اور پھر

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

علامہ شبلی نعمانی کی موازنہ انیس و دبیر کے سو سال بعد ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ بیش بہا تصنیف ''تجزیہ یادگار انیس'' اردو ادب میں ایک غیر معمولی اور قیمتی اضافہ بلکہ ایک سنگ میل ثابت ہوا ہے۔ شبلی کی نظر نے اتنی گہرائی سے حسن مرثیہ کا جائزہ نہیں لیا۔ جس باریک بینی سے ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کو دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے گہرائے اور مرثیہ سے فطری محبت کا بھی اثر ہے۔ ویسے میں ان کے ذوق مطالعہ کا معترف تو ہوں ہی لیکن مرثیہ اور چیز ہے اور غواصی اور مچھیاں بھر بھر کے در شہوار اچھالنا اور ہے۔

انیس کا یہ مرثیہ 197 بند پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب 800 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان 800 صفحات میں ڈیوڈ میتھیوز کا انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala اور مولانا سید علی نقی صاحب کا 30 بندوں کا عربی ترجمہ بھی شامل ہے، جس طرح یہ مرثیہ میر انیس کے تمام مرثیوں کا نچوڑ اور عطر ہے، اسی طرح ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کتاب بھی انیسیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں 33 عنوانات کے تحت میر انیس کی زندگی اور فن کا شاید ہی کوئی شعبہ چھوٹ گیا ہو۔ اس کتاب میں صرف ایک مرثیہ پر جس طرح ڈاکٹر تقی عابدی نے نظر کی ہے، اس کا اجمالی خاکہ کچھ یوں ہے

کل 197 بند، اشعار 591، مصرعے 1182، الفاظ 9517، اردو الفاظ 5813، فارسی الفاظ 1948، عربی الفاظ 1769، اردو الفاظ کا فیصد 61 فیصد، فارسی الفاظ بیس فیصد، عربی الفاظ انیس فیصد، کل حروف 29236، اضافات 621، جدید تراکیب 111، محاورات 511، جدید محاورے 85، تشبیہات 86، استعارے 45، کنایات 105، صنعت مراعات النظیر 245، صنعت تضمین المزدوج 177، صنعت طباق 154، صنعت مبالغہ

88، صنعت تکریر 71، صنعت تتن 66، ایہام 52، صنعت تجنیس 36، تسمیط الصفات 35، حسن تعلیل 35، صنعت تنسیق تفریق و تقسیم 34، ترجمہ الفاظ 30، صنعت ذوقافیتین 29، متفرق صنائع جن کی تعداد 30 سے زیادہ ہیں 182۔

میں چاہتا تو یہ تھا کہ اس "یادگار انیس" کا مکمل تجزیہ لکھوں، لیکن یہ بار ہاں۔ مصر کا بازار ہے، یوسف کے خریدار ہیں اور میرے پاس صرف دن بھر کا کام ہے۔ یادگار انیس کو مرے ہوئے 150 سال ہوئے۔ یاد آئی، بہت شدت سے یاد آئی۔ انیس کے ہوتے ہوئے اخلاقی عابدی کی کاوشیں یاد آئیں۔ چند سطور لکھ دیے۔

انیس اور ہم کا تجزیہ نہیں، کچھ چنے

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

سید باقر زیدی
واشنگٹن

یادگار مرثیہ: یادگار تجزیہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام ذہنی سے اردو میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ان کا یہ مقام ان کی انتھک محنت، لگاتار کوشش، گہری لگن اور ایک باعزم، سرگرم اور مسلسل جذبہ عمل کا حاصلہ ہے۔ چھوٹ کرتے رہنے کی لگن اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت سرگردانی نے انھیں اب بلند ممتاز اور نمایاں درجہ عطا کیا ہے۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں وہ نووارد سہی لیکن بڑے اہم قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو زبان کے مضبوط اور کہنہ مشقوں ہندوستان اور پاکستان سے دور رہ کر بھی جو اعتبار و اعتبار انھوں نے حاصل کیا ہے وہ لائق تحسین ہی نہیں قابل رشک اور قابل تقلید بھی ہے۔ پانچ سال کی قلیل مدت میں اتنا کچھ حاصل کر لینے کی ایک فقید المثال مظہر انھوں نے قائم کی ہے۔ کام، کام اور کام ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ فراغت یا بیکاری کا کوئی لمحہ ان کے حصہ میں نہیں آیا۔ کیوں کہ پیشہ کے اعتبار سے معالج ہیں اس لیے اس طرف بھی ان کی مشغولیت اور ذمہ داریاں کچھ کم نہیں۔ ماشاء اللہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے شفیق باپ ہیں۔ ایک ہی بیوی کے سہی مگر ہمہ اوقات یعنی فل ٹائم شوہر ہیں۔ وسیع حلقہ احباب کے مالک ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مخلص دوست اور ایک ہمدرد انسان ہیں حق شعاری اور راست گوئی ان کے سرشت میں شامل ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ایک منصف کے بیٹے ہیں۔ لگتا ہے باپ کا منصب بیٹے کے مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ شاید اسی لیے وہ ادبی تبصروں اور تنقیدی مقالوں میں بے باک اور بے لاگ نظر آتے ہیں۔

اقبالیات پر ان کے مقالے "اقبال کے عرفانی زاویے" کے عنوان سے ایک کتاب کی صورت پا چکے ہیں قبول خاص و عام ہوئے۔ انشاء اللہ خاں انشاء پر ان کی تحقیق و کاوشیں

...ای جا چکی ہیں۔ تقی عابدی اپنی مصروف زندگی سے شب و روز میں ...دیم اغراضی کے باوجود اب تک نئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور ان کی طبیعت ابھی یہ نہیں۔ صاحب نفحۃ الیمن کا ارشاد ہے کہ ''اہل کمال خواہش مند ہیں جو یہ نہیں ہوتے تو اب علم اور طلب گار دنیا۔'' تقی عابدی کائنات کے اس قول کی پہلی تفسیر ہی سے فرد ہیں۔ علم کی اس تشنگی اور طلب نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ دنیائے اردو کو ایک ...ثانی اور شاہکار تحفہ ''تجزیہ یا کار انیس'' کی صورت میں پیش کر سکیں۔ اردو ادب پر یہ احسان ہونے کے علاوہ یہ انیس سے اس قدر شغف کی ...یکی بھی ہے جس کا بوجھ اردو کے قلم کاروں نے جانے بوجھ کر محسوس نہیں کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کام کی ابتدا گزشتہ صدی کے آخری مہینوں میں کر دی تھی اور اس اعتبار سے جانے جاتے پچھلی صدی کا خراج تحسین کہا جا سکتا ہے۔ 1910ء کا شبلی کا موازنہ انیس، بیسویں صدی کا کارنامہ تھا تو یہ تجزیہ اکیسویں صدی کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تقی عابدی کا تجزیہ ان کے تحقیقی کام کا ثمر ہے جس سے نتیجے میں انیس کے مجموعی قلمی مزید خوبیاں منظر عام پر آئیں اور ابھی خدا جانے کیا کچھ ہے جو تقی کے پردۂ میں اوجھل ہے۔ تقی عابدی کی کتاب انیس کے یہ کارنامے ''جب قطب کی مسافت شب آفتاب سے'' کا مکمل تجزیہ ہے۔ یہ کتاب حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں صوری اور معنوی اعتبار سے جاذب نظر ہے۔ یہ ایک فل سکیپ اور چوڑی 14×11 صفحات پر مشتمل یہ ایک شاہکار تخلیق ہے۔ پہلے صفحہ پر میر انیس کی ایک یادگار تصویر کا عکس ہے جو بھی دلت پر بنوائی گئی تھی۔ اس کی پشت پر یہ خوب صورت انیس دونوں سے متعلق ہے کا عکس ہے اور یکجا مکمل کتاب کا انتساب بیسویں صدی کے سب سے بڑے محقق لسانیات پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام ہے پھر مصنف کی تصاویر، حواشی اور فہرست مضامین۔ اس کتاب سے متعلق جناب ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا قطعہ تاریخ اور ایک نظم بعنوان ''تجزیہ یا کار انیس'' جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا مکتوب، حسین انجم کی نظم اور اقبال کاظمی کی نظم و تقریظ ...ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تقریظ اور میر انیس کی تحریر کا عکس پھر چار صفحات پر مشتمل مقدمہ جو ڈاکٹر اکبر حیدری نے تحریر کیا ہے پھر تین صفحات پر مصنف کا پیش لفظ اور ان سب تمہیدی مباحث کے بعد اصل تقی عابدی کا میر انیس پر ایک طویل، جامع، مدلل اور پرشکوہ

مقالہ جو بارہ ابواب پر پھیلا ہوا ہے اور ان عنوانات کا حامل ہے۔ (1) ''حیات میر انیس''، (2) ''میر انیس مشابہ شعرء ادب کی نظر میں''، (3) ''یادگار مرثیے سے متعلقات''، (4) ''مرثیہ کے منتخب اشعار''، (5) ''نمونہ جات مطبوعہ مراثی''، (6) ''اشخاص مرثیہ''، (7) ''مرثیہ پر اعتراضات''، (8) ''مرثیہ کے تجزیاتی نمونے''، (9) ''مرثیہ کے تجزیہ کار کا طریقہ''، (10) ''تجزیہ بیانی''، (11) ''محاسن مرثیہ''۔ یہ گیارہ ابواب انیس شناسی کا بہترین ذریعہ ہیں جو بھی چاہے ایک قاری انیس سے متعلق ان کی ذات اور فن کے حوالے سے جاننا چاہتا ہے وہ سب یہاں موجود ہے۔ 209 صفحات پر پھیلے ہوئے یہ ابواب بذات خود ایک کتاب ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ بارہواں باب مرثیہ کی تجزیہ کی Statistics پر مبنی ہے۔ یہ جدول بھی بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے تیار کیا گیا ہے اور وہ تمام 2129 محاسن کلام اور صنعتیں جنھیں فاضل مصنف نے اس تجزیہ میں دریافت کیا ہے وہ بند کے نمبر کے ساتھ تفصیلاً درج ہیں جو 68 صفحات کا احاطہ کرتی ہیں۔ جدول کے بعد دائیں صفحہ پر انیس کے مرثیہ کا بند اور بائیں صفحہ پر مصنف کی محققانہ دیدہ وری کتاب کا یہ حصہ 394 صفحات کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہندوستان کے ایک نابغہ اسکالر اور جید عالم سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی کے عربی نظم میں ترجمہ کیے ہوئے اس مرثیہ کے ۳۰ بند ابتدائی خوشنما عربی خطاط میں موجود ہیں اور اس طرح اس کو اس قدر علمی سرمایے کو بھی تحفظ کر دیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں Dr. David Mathews کا اس مرثیہ کا ترجمہ The Battle of Karbala بھی شامل ہے پوری کتاب ایک انتہائی دیدہ زیب اور خوب صورت پانچ رنگوں کے حاشیہ کے ساتھ Art Paper پر چھپی ہے جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب انیس کے کمال سخن وقار اور احترام کی حامل ہے کسی بھی فن کار نے کسی ایک فن پارے پر اتنا جامع اور مضبوط خراج تحسین شاید اس سے بہتر ممکن نہیں ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سے کیا کام لے اور یہ بات تقی عابدی کی ساری زندگی کے فخر کا باعث ہے کہ اللہ نے اس کام کے لیے انھیں چنا۔

یہ تجزیہ بھی اپنی جگہ یادگار ہے
کار تقی عنایت پروردگار ہے

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس شہ پارے کی تخلیق میں ان کی بیگم یقی عابدی کی خراج تحسین پیش نہ کیا جائے کہ وہ اس تخلیق کے لیے من سب فرصت، خوش گوار ماحول اور ذہنی آسودگی فراہم نہ کرتی رہتیں تو اتنا بڑا کام ممکن نہ ہوتا اس لیے میں یقی تقی عابدی کو اور خود اردو ادب کو اس تحقیق و تخلیق پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور دست بہ دعا ہوں کہ اللہ انھیں اس سے بھی آگے منزلیں طے کرنے کی توفیق عطا کرے۔ یہ پتہ کوئی اور در شہسوار صدف سے باہر آنے کا منتظر ہو۔

از ہیچ سخنوری نہ آید ایں کار
واللہ کہ اے تقی تو کارے کردی

اور آخر میں یہ حرف سپاس ان سب خوب صورت ذہنوں کے نام جنھوں نے اس شام کو تقی عابدی کے یادگار تجزیے کی روشنائی سے اس پذیرائی کو بھی یادگار بنایا۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

کلام انیسؔ کی ایک نئی خوبی کا انکشاف

کلام انیسؔ کے بحرِ ذخار میں بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جن کی طرف ناقدین نے توجہ نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کا مقالہ "آرائہ کلام" تجزیہ یا "گارِ مرثیہ" واقعی قابلِ رشک ہے کہ انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ انیسؔ کے شعری محاسن کی طرف غور و فکر کیا اور تک بھگ ایک سو خوبیاں بیان کیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر انیسؔ شناسوں کے لیے نئی ہیں۔

انیسؔ کی بیتیں لاجواب اور غیر معمولی انفرادیت کی حامل ہیں۔ جس طرح استادانہ رباعی میں چوتھا مصرعہ افکار و معنی کے اعتبار سے حاوی اور حاصلِ کلام ہوتا ہے، اسی طرح انیسؔ کے مسدس میں بیت (پانچواں اور چھٹا مصرعہ) مضمون اور بلند خیالی کی وجہ سے مربوط اور جاذبِ نظر ہوتی ہے۔ ہم مدت دراز سے ان شعروں کی طرف غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انیسؔ کی اکثر بیتوں میں یکساں نقطے ہوتے ہیں۔ یعنی جتنے نقطے پانچویں مصرعے میں ہیں اتنے ہی چھٹے مصرعے میں ہوتے ہیں۔ اس خوبی کا نام صنعت مساوی النقاط رکھا گیا ہے۔ اس کا ذکر ہم نے آج سے کوئی تیس سال قبل اپنے دوستوں سے کیا۔ انھوں نے اسے پسند کیا۔ اُس زمانے میں ہم محمود آباد ہاؤس میں مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ ایک قلمی مرثیہ سامنے تھا اس کے حاشیے میں بیت کے ساتھ "مساوی النقاط" لکھا تھا۔ اس کے بعد ہم نے انیسؔ کی اکثر بیتوں پر غور کیا اور اس صنعت کو دریافت کیا۔ ذیل میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے = ۲۲
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے = ۲۲

۲۔ نیزے اٹھا کے جنگ پہ اسوار چل گئے = ۱۷
کالے نشاں سپاہ سیہ رو میں کھل گئے = ۱۷

۳۔ تھپکا جو شیر شوق میں دریا کی سے گیے = ۲۵
سے کی تری تیغوں کی موجوں نے پی گیے = ۲۵

۴۔ جلتی رہی پر شمع ہ شمال و جنوب کے = ۲۱
یا یا لڑے ہیں شمع کے بال میں ڈوب کے = ۲۱

۵۔ دامن میں رکھ لیے جو محبت علی کی ہے = ۱۶
ہمت ہے فاطمہ کی امانت علی کی ہے = ۱۶

۶۔ سر جا ملا جو شمع کیواں جناب کا = ۱۱
سمجھا اثر یہ برق آفتاب کا = ۱۱

۷۔ قرآن سے میاں ہے بزرگی امام کی = ۱۶
ہاں قسم خدا نے اسی صبح و شام کی = ۱۶

۸۔ انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں = ۱۵
صفر تمہارے خوں کا ٹھکانا کہیں نہیں = ۱۵

۹۔ [illegible] قبول ، چشم فوق خدا میں پایا = ۱۸
[illegible] خاک شفا میں پایا = ۱۸

۱۰۔ [illegible] پیٹے سے قطب پلٹتے ہیں = ۲۶
[illegible] ستارے چمکتے ہیں = ۲۶

۱۱۔ [illegible] شہدا میں ہوگا = ۱۵
شب ، تو محبت محبوب خدا میں ہوگا = ۱۵

۱۲۔ خوش خو ، خوش خرام ، خوش اندام و خوش لجام = ۲۰
گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام = ۲۰

۱۳۔ رکھ دیے جو سم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا = ۱۲
پیارا فرس ہے راکب دوش رسولؐ کا = ۱۲

۱۴۔ [illegible] = ۱۸
[illegible] = ۱۸

۱۵۔ جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا = ۱۳
دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا = ۱۳
۱۶۔ پنجہ نہ تھا نشاں ثریا مآب کا = ۱۹
تھا فرق جبریل پہ تاج آفتاب کا = ۱۹
۱۷۔ آتی ہے اڑکے گرد یمین و یسار سے = ۱۷
یسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے = ۱۷
۱۸۔ یہ کہیں تم تو سد سکندر و توڑ دیے = ۱۴
لو ہم کو چاہتے ہو تو در کو چھوڑ دیے = ۱۴

---

۱ چاندگن عموماً ''چار چاند لگانا'' یا ''چار چاند لگنا'' بولا جاتا ہے۔ رونق اور منزلت بڑھانا ہے اور چار چاند لگنا، رونق اور منزلت بڑھنا۔ لفظ چار کے ساتھ محاورہ کا دائرۂ عمل کسی خاص چیز تک محدود ہو جاتا ہے۔ اور خیال میں وسعت نہیں رہتی۔ انیس نے محاورے میں تصرف کر کے اس پہلو کو نکال دیا۔ ''جنگل کو چاند لگ گئے'' یعنی پورا جنگل چہرے کے نور سے منور ہو گیا۔ چار کے اضافے سے خیال محدود ہو جاتا ہے۔ اثر لکھنوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا۔ غالباً ۱۹۳۵ء میں پورا سورج گہن ہوا تھا۔ میں الٰہ آباد میں تھا اور میں اپنے بنگلے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر درخت کی پتیوں کا سایہ بجائے پتی کی شکل کا ہونے کے ہلال کے مانند تھا اور بے اختیار انیس کا مصرعہ زبان پر جاری ہوا۔

۲ ''جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے'' (فرہنگ اثر ص 214، جلد دوم)

انیس کے بیان محاورے میں ایسے استادانہ تصرف کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں:

کودکی، پیری، جوانی دیکھ لی
تین دن کی زندگانی دیکھ لی

''محاورہ''، ''دو دن'' کی یا ''چار دن'' کی زندگی ہے۔ چوں کہ عمر کے تین دور دکھانے تھے۔ کودکی، پیری، جوانی۔ لہٰذا تین دن کی زندگانی، دو دن یا چار دن

کہتے۔ تو ایک دن کم یا ایک دن زیادہ پڑتا۔ ایک نکتہ اور ذہن میں آیا۔ چار اور دو = چھ کا اوسط کیا ہوا؟ تین۔ محاوروں میں ایسا دور تصرف ہر شخص کا کام نہیں۔ انیس پر اردو زبان جتنا ناز کرے بجا ہے۔ حالی کی رباعی یاد آتی ہے۔

اُردو کو راج چار سو تیرا ہے
ملکوں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا

زبان کے علمبردار سے بھی انیس و خدائے سخن کہتے ہیں۔ اردو سخن کے خاص مخصوص زبان تھی۔ تاج کہتے تھے۔ اردو سیکھنی ہو تو میر ضاحک سے کہہ جا کر سیکھو۔

پروفیسر آبر حیدری کشمیری

تجزیہ مرثیہ یادگارِ انیسؔ

''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے''

دنیائے اردو اور خصوصاً اہل لکھنؤ کو یہ مژدہ سن کر یقیناً حیرانی کن مسرت ہوگی کہ سینیئر اے مشہور و معروف ڈاکٹر سید تقی عابدی (ایم ایس) کی ایک معرکہ آراء تصنیف جو آج تک چشم بشر نے نہیں دیکھی ہوگی۔ انشاء اللہ فروری 2013ء میں منظر عام پر آئے گی۔ کتاب جولائی میں چھپ چکی ہے۔ اب اس کی رسم اجرا سب سے پہلے میر انیسؔ کے شہر لکھنؤ میں ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی کی صدارت میں قرار پائی ہے۔ کتاب پر مختصر تبصرہ کرنے سے قبل پروفیسر مسعود حسن رضوی کا وہ مقولہ بیان کرنا مناسب ہوگا جو مرحوم نے آج سے 80 سال پہلے نواب نصیر حسین خیالؔ سے سنا تھا۔ مرحوم شاہکار انیسؔ میں لکھتے ہیں کہ۔

> ''ایک مدت ہوئی نواب نصیر حسین خان مرحوم (1931ء) نے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک مرتبہ کسی معزز اور ذی علم انگریز سے اردو ادب کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا ''اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟'' خیالؔ صاحب نے جواب دیا ''انیسؔ'' اس نے کہا کہ ''میں اس شاعر کے کلیات (مجموعہ کلام) سے اپنے کتب خانہ کو زینت دینا چاہتا ہوں۔'' خیالؔ مرحوم نے مطبع نول کشوری چھپی ہوئی انیسؔ کی جلدیں خرید کر پیش کیں۔ اس نے سب سے اچھے ایڈیشن کی فرمائش کی۔ مگر اس سے بہتر ایڈیشن تھا کہاں؟ خیالؔ کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ وہ انگریز یورپ کے شاعروں کے اچھے سے اچھے ایڈیشن دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے لگا ''معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ کا اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دینا آپ کی ذاتی اور انفرادی

راے ہے۔ ورنہ نہیں ممکن ہے کہ ایک زبان کے بہترین شاعر کے کلام کا اس سے بہتر ایڈیشن موجود نہ ہو۔" اس کی بات سے خیال صاحب اور بھی شرمندہ ہوے۔ کئی سال ہوے میں نے یہ واقعہ مرزا محمد جواد صاحب مالک مطبع نظامی لکھنؤ سے بیان کیا اور انھوں نے ارادہ کر لیا کہ انیس کا کل کلام نہ سہی تو کم سے کم ایک مرثیہ اس صورت میں شائع کریں جو اس شاعر اعظم کے شایان شان ہو اور جس میں کتابت اور طباعت کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیٰ درجے کی تصویریں بھی شامل ہوں۔"

شاہکار انیس نادر و نایاب ہے۔ ڈاکٹر عابدی صاحب کئی سال اس کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے۔ آخر کار بڑی مشکل سے زرکثیر یعنی ہزاروں روپے صرف کر کے ایک نسخہ حاصل کیا۔ اسی کا مکمل تجزیہ زیر بحث کتاب ہے۔ اگر مسعود صاحب زندہ ہوتے اور یہ کتاب دیکھتے تو عابدی صاحب کے ہاتھ چوم لیتے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اردو کے ممتاز شاعر اور نثر نگار بھی ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رثائی ادب کے بھی ماہر ہیں۔ موصوف میر انیس کے مخلص شیدائیوں کے صف اول کی ممتاز شخصیت میں ہیں۔ انھوں نے دو سال قبل سید محمد رشید (جنرل منیجر) لکھنؤ کا خیر و عافیت حاصل کرنے کے لیے فون کیا اور اسے جدید سائنسی طور پر محفوظ کرایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے انیس کے مشہور مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا تحقیقی تنقیدی جائزہ جس عرق ریزی اور شرف بینی کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہر بند کے ساتھ ہر شعر میں (۱۱۶ سے ۱۱۹) سطروں میں تجزیہ اس مہارت سے کیا گیا ہے کہ رثائی ادب میں ڈاکٹر صاحب کے کمال کو ماننا پڑتا ہے۔ یہ ضخیم کتاب فرانس آرٹ پیپر پر بیحد خوب صورت رنگین و زرنگار تصویروں سے مزین ہے۔ اور مجھے اس کتاب کے بارے میں دلی ملال رہے گا کہ میں نے یہ بیش قیمت کتاب ڈاکٹر عابدی کی کتاب "تجزیہ مرثیہ یادگار انیس" جس میں صاف ستھری پرکشش اور جاذب نظر

مثال کتاب دنیائے ادب میں آج تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ کتاب کا وزن 3 کلو سے زائد ہے۔ اس کی اشاعت پر دس لاکھ سے زیادہ روپے کی لاگت آچکی ہے۔ کتاب انتہائی نامساعد حالات میں سری نگر میں مرتب کرنے شدت پسندی میں دلی میں میری نگرانی میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ابتداء میں میر انیس اور ان کے مقبرے کے فوٹوز ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر مسعود حسن کے نام انتساب مع تصویر درج ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر نیر مسعود کا رائی نامہ، تاریخ کامل انیس، "تجزیہ یادگار انیس" (سید باقر زیدی امریکا) سید عاشور کاظمی (لندن)، حسین انجم (مدیر "طلوع افکار" کراچی)، سید اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی)، کی منظوم تقریظیں اور راقم الحروف کا مقدمہ شامل ہیں۔ پھر ڈاکٹر تقی عابدی کا معرکہ آرا اور معلومات افزا دیباچہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جا بجا پر درج ذیل شعر کی ترجمانی کی ہے:

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

کتاب 14 ابواب پر مشتمل ہے۔ باب 11، 12، 13 غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ تیرہواں باب "تجزیہ کامل یادگار مرثیہ" حاصل کتاب ہے۔ اس میں مرثیہ کے (97 بند) ہر بند کے (3 شعر) کا ایک ایک صفحے میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ یعنی بند کے پہلے، دوسرے اور تیسرے شعر میں کل الفاظ کی تعداد، عربی، فارسی، اردو ہندی کے الفاظ اور حروف کی تعداد کے علاوہ لغات، صنائع لفظی، صنائع معنوی، فصاحت و بلاغت کا بیان اور محاسن بیان کی خوبیاں نمایاں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ذوق تحقیق اور جدید طرز فکر کی داد دیجیے کہ انھوں نے مرثیے کے کل الفاظ کا شمار بھی کیا ہے۔ یعنی الفاظ کی تعداد بشمول تکرار 9493 ہے۔ ان میں عربی کے 1769، فارسی کے 1948 اور اردو کے 5776 استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر ان الفاظ کا تناسب بھی نکالا ہے۔ عربی الفاظ 19 فیصد، فارسی 20 فیصد اور اردو 61 فیصد۔

چودھویں باب میں سرکار سید العلماء سید علی نقی قبلہ کے زیر نظر مرثیے کے 30 بندوں کا منظوم عربی ترجمہ اور لندن یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کا

منظوم انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala (1994) شامل کیے تھے تاکہ دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ سکیں۔ مسز زیدی نے کینیڈا کے سیمینار میں فخر سے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی کی کتاب نے میرے منظوم ترجمہ کو حیات جاودانی بخشی ہے۔''

یہ اطلاع مسرت بخش ہے کہ ڈاکٹر عابدی کینیڈا سے واپسی کے دو مہینے کے بعد جنوری کے آخر میں ہندوستان آرہے ہیں۔ فروری 2003ء میں کتاب کی رسم اجراء کا انعقاد کیا جائے گا۔ لکھنؤ جلسے کی صدارت انشاء اللہ ڈاکٹر سید مسعود الحسن صاحب سے۔ دہلی میں 31 جنوری سے 3 فروری 2003ء کو ''حدیث دل'' کے مصنف سید محمود نقوی کے زیر اہتمام ہوگا۔ کتاب کی رونمائی 7 فروری کو قرار پائی ہے۔ وہ جلسے حیدرآباد میں عابدی صاحب کے وطن مالوف میں بھی ہوں گے ہندوستان کے بعد کتاب کی رسم افتتاح پاکستان سے ہوگی۔ ان سیمیناروں میں جناب اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن) کے زیر اہتمام اسی پیمانے پر کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہوں گے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کینیڈا کے امریکہ کے انٹرنیشنل سیمینار کی ترتیب میں ڈاکٹر عابدی صاحب کی کتاب ''تجزیہ یادگار مرثیہ انیس'' کی رسم اجراء عمل پذیر ہوئی۔ کینیڈا میں رسم اجراء سے قبل یونی ورسٹی کے بڑے ہال میں ڈاکٹر موصوف کے نادر الوجود ذخیرۂ مراثی کے اہم اور قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی نمائش بھی کی گئی۔

ڈاکٹر عابدی کی ان مقبول عام اور بیش قیمت کتاب کی اشاعت اور خدمت میر انیس کی جہت سے اردو تحقیقی و تنقیدی ادب میں نہ صرف گراں مایہ اضافہ ہوگا بلکہ اردو زبان کی ان مخطوطات کی حفاظت و نمائش شدہ اور شکستہ زبان کی آبرو بڑھ جائے گی۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبدؔ
نیویارک

''تجزیہ یادگارِ انیسؔ''

انیسؔ سے جو نسبت تقیؔ نے جوڑی ہے
تقیؔ کا نام رہے گا تقیؔ کے بعد بھی اب

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کو میں بہت ذاتی طور سے جانتا ہوں۔ وہ میرے ہم پیشہ اور ہم ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ میرے بہت دوست اور رفیق کار بھی ہیں۔ ایک عرصہ تک مجھے ان کی ہمسائیگی کا اعزاز بھی رہا ہے جب وہ نیویارک میں مقیم تھے اور اس حوالے سے ہماری بیگمات بھی ایک دوسرے سے خوب متعارف ہیں۔ میں ایک مدت سے ان کی ادبی سرگرمیوں اور ان کے ادبی سفر کی رفتار سے متاثر رہا ہوں مگر ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' مرثیہ جیسے شاہکار کے بعد ان کی ادبی پرواز ان بلندیوں کی اس سطح پر لے آئی ہے کہ مجھے بے ساختہ کہنا پڑ رہا ہے کہ خدا نے انھیں نہایت بلند اور مخصوص عنایات سے نوازا ہے۔

ظہورِ شوق کی رہتی ہے دنیا منتظر صدیوں
برستا ہے بہت نیساں، گہر ہوتے ہیں کم پیدا

ڈاکٹر صاحب کے اس کارنامے نے اردو ادب کو ایک نئی طرز اور ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ میں نے جدت کے حوالے سے کئی اہل قلم حضرات کی نگارشات کا مطالعہ کیا ہے مگر میری نظر میں اگر کوئی سوچ یا کوئی کام صحیح معنوں میں جدت کے زمرے میں شامل کیے جانے کے لائق ہے تو وہ کام ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کا یہ شاہکار ''تجزیہ یادگار مرثیہ'' ہے۔ موصوف نے میر انیسؔ کے ایک مرثیہ کو موضوع بنا کر ادبی دنیا کو اتنا جامع اور ضخیم علمی ذخیرہ

ہیا رہا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔

تحقیق کی دنیا میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آپ کسی تخلیق یا کتاب یا کسی شخصیت کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں تو آپ اس کے بارے میں موجود مضامین اور تبصرہ جات کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر اپنی ایک رائے قائم کرکے اپنے تحقیقی تصورات لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شاید یہ خوبی ہے کہ انھوں نے [illegible] بند کے اس مرثیے کو براہ راست پڑھا ہے اور پوسٹ مارٹم یا Pathologist نے کس طرح اس مشہور زمانہ مرثیے کی Autopsy کی ہے اس کے بارے میں انھوں نے کسی سے نہیں سنا بلکہ خود پڑھا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کو پرکھا ہے اور خاطر خواہ نشاندہی کی ہے۔ تین چار برس کی محنت سے وہ اس مرثیے کو نہیں بلکہ اپنے تئیں اب وہ اس مرثیے سے حافظ بھی ہیں۔ انھوں نے میر انیس کے اس مرثیے کی جب تحقیق کی مسافت شب آفتاب سے شروع کی تھی تو بلاغت، فصاحت، صنعت، محاورہ، ضرب المثل، تشبیہ، استعارہ، صوتی کیفیات، اسلوب، بیان، ترکیب، حسن بندش، الفاظ کی روانی، سلاست، برجستگی وغیرہ کی تحقیق سے تحقیق کی منزل تک پہنچے تھے، تقابلی، تعریفی، تمثیلی، کارکی، امیر یائی، جدت کاری وغیرہ کی تحقیق ہو چکی ہے۔ انھوں نے اس مرثیے کے بند کے بارے میں کہیں بتایا ہے کہ اس میں کتنے الفاظ یا حروف ہیں، حرفی یا لفظی بندش میں کتنے استعارات، تشبیہات، کنایات وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ شعر میں کتنی اضافتیں استعمال ہوئی ہیں یا صنعت کا رفو ہے اور میر انیس نے یہ اعلیٰ بندشیں کیسے کی ہیں۔ ہر کام وقت طلب، محنت طلب اور تحقیق طلب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام کیا ہے ان کے لیے یہ نہایت فطری اور سہل ہوا۔

[illegible] کتاب میں جس [illegible] جلد میں ان کی یہ کتاب شامل ہے اس میں پندرہ بیس مضامین ہیں جن میں سے بیشتر میں میر انیس کے اس شاہکار مرثیے کے بارے میں تحقیقی مضامین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مرثیے کے

تراجم کو بھی اس کتاب میں جمع کیا ہے۔ پہلا تین بندوں کا منظوم عربی ترجمہ سید علمدار حسین جناب مولانا سید علی نقی کے قلم سے ہے جو لگ بھگ ساٹھ برس پہلے کا ہے اور معدوم ہو چکا ہے انگریزی منظوم ترجمہ ایک انگلش نژاد انشور اور معلم آنریبل جناب ایوا میتھیوز کے قلم سے ہے جو ماضی قریب میں The Battle of Karbala کی کتاب کی صورت میں چھپا تھا۔ ان دونوں توضیحی تراجم کی ثنویت اس شاہکار کو اور بھی جامع بنا دیتی ہے۔ کتاب میں اس یادگار مرثیہ سے متعلقات، میر انیس کے بارے میں شاعر شعر و ادب کی رائے، مرثیہ پر اعتراضات اور اس یادگار مرثیہ کی تجزیاتی و فنیہ سے موضوعات نہایت احسن طریقہ سے نبھائے گئے ہیں۔ موصوف نے مرثیے کے تجزیاتی ہونے اور تجزیہ کا طریقے کار بھی مفصل طریقے سے قلم بند کیا ہے۔ جس سے مصنف کے بارے میں قاری کو مکمل معلومات میسر آتی ہیں۔

دانائی کا جہان ہے روشن کتاب سے
بنتا ہے ذہن علم کا مخزن کتاب سے

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی اس تخلیق کے مطالعے سے اردو ادب کے طالب علم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رثائی ادب یعنی صنف مرثیہ گوئی اردو ادب کا اہم اور وسیع الدامن جزو ہے۔ مرثیہ کے اندر تغزل بھی ہے اور قصیدہ گوئی بھی۔ یہ محض آہ و زاری، بین اور اظہار غم و اندوہ کا نام نہیں۔ اردو ادب سے اگر رثائی ادب کو نکال دیا جائے یا اسے میر انیس جیسے عظیم شعراء کی تخلیقات سے محروم کر دیا جائے تو یہ ادب نامکمل اور کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب پر اور اردو کے اس دور کے طلباء پر احسان کیا ہے کہ انھوں نے رثائی ادب کے ایک شاہکار کو نہایت عالمانہ انداز میں متعارف کرایا ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری صاحب نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ میں بلا خوف و تردد کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب ادبیات اردو کے ایک اعلیٰ شاعر، نثر نگار، ممتاز ناقد اور بہت اچھے محقق ہیں۔ انھیں علم عروض کے علاوہ علم بیان و معانی میں بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ فطری علمی استعداد و اللہ کی دین اسی کو کہتے ہیں۔

مجھے پروفیسر صاحب کی رائے سے سو فیصد اتفاق ہے، میری نظر میں ڈاکٹر صاحب

سے اس کارنامے نے میر انیس کی ادبی شخصیت کو ہی نہیں خود رثائی ادب یعنی مرثیہ گوئی کو از سر نو حیات بخشی ہے۔ اس حوالے سے میں انہیں محسن المرثیہ سمجھتا ہوں۔

ساتھ ہی ساتھ میں انہیں اس شاہکار کی تخلیق پہ مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے ارادہ اس شاہکار کا چھوٹے سائز کا ایڈیشن بھی شائع کریں گے تاکہ یہ شاہکار ایک عام قاری تک پہنچ سکے۔ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔

زیبہ صدیقی

تجزیہ یادگارِ انیسؔ

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

انیسؔ سے جو نسبت تقی نے جوڑی ہے
تقی کا نام رہے گا تقی سے بعد بھی اب

تحقیق کی دنیا میں اکثر یوں ہوتا آیا ہے کہ آپ کسی تخلیق یا کسی کتاب یا کسی شخصیت کے بارے میں تحقیق کرنے نکلیں تو آپ اس بارے میں موجود مضامین اور آرا کا مطالعہ کرکے مواد جمع کرکے اپنے لفظوں میں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور کچھ اس بنیاد پر اپنی ایک رائے قائم کرکے اپنے آپ کو محقق تصور کرنے لگتے ہیں۔ تقی عابدی کے اس شاہکار کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے (1971) بند کے اس مرثیہ کو حرف حرف چھانا ہے ایک بورڈ سرٹی فائیڈ Pathologist نے کس طرح اس مشہور زمانہ مرثیہ کی Autopsy کی ہے۔ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے کو الگ الگ کرکے انھیں ہر پہلو سے دیکھا ہے ان کے جزا و اقسام کو پرکھا اور الفاظ کی گہرائی کی نشاندہی کی ہے۔ تین چار برس کی اس محنت کے دوران یہ مرثیہ انھیں یاد ہو گیا تقی عابدی اس مرثیے کے حافظ ہیں۔

تقی عابدی کا مرثیے سے ایک قلبی تعلق رہا ہے اور اس قلبی تعلق کا سبب ظاہر ہے کہ واقعہ کربلا اور اہل بیت سے محبت ہے مگر تقی عابدی کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہے جو مرثیے اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔ تقی عابدی نے مرثیوں کو سنا، مرثیوں کو پڑھا اور مرثیوں کی فکر اس کی سماعت سے دل اور دماغ تک کا سفر کرتی چلی گئی وہ مرثیوں پر روئے ضرور مگر ان کو معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں اور ان کا ذہن محسوسات کا

تجزیہ بھی کرتا رہا اور تقی عابدی نے یقین کر لیا کہ واقعہ کربلا ایک عالمی سانحہ ہے اس عالمی سانحے پر میر انیس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تقی عابدی بڑے متاثر تھے اور اسی تاثر نے تقی عابدی کو مرثیہ نگاری اور میر انیس کا مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا۔ تقی عابدی سے ہماں میر انیس کا یہ اولین مطالعہ ہے۔

یہ کتاب انیس کے معروف مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا ژرف کاوی پر مبنی تحقیقی مطالعہ و تنقیدی محاسبہ اور شعریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے۔ مرثیہ انیس میں اس مرثیے کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چناں چہ ناقدین کی اکثریت نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیے کو شاہ اندھی سن جا رہے ہیں۔

نامور محقق سید حسن رضوی ادیب نے "شاہکار انیس" کے نام سے 1943ء میں اس مرثیہ کا انگریزی ترجمہ پیش کیا تھا جس کے مقدمہ سے ساتھ شائع ہوا۔ میتھیو نے اس کا انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala کے نام سے شائع کیا جب کہ "حسن علی امید" نے منظوم اردو ترجمہ کے قالب میں اسے ڈھالا۔

تقی عابدی کی کتاب "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" 825 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب 2018ء میں پوری کتاب فران آرٹ پیپر پر چار خوب صورت رنگوں اور ہارڈ بائنڈنگ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ وزن 2 کلو سے زائد ہے۔ کتاب کی رسم رونمائی 2018ء میں آبِ حیدری تعمیری کی نگرانی میں ادا کی گئی۔ کتاب میں مرثیہ کے بند کے معنی 32 سے 40 صفحات میں ان بند کا تجزیہ کی مہارت سے شامل ہے۔ کتاب میں 197 بند کے علاوہ آخر میں 48 صفحات پر مشتمل مرثیہ کا انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala منظوم پورے مرثیہ کا ترجمہ شامل ہے۔ اس سے پہلے سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی قبلہ مرحوم نے 81 بند پر مرثیہ کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔

تقی عابدی نے اس کتاب سے فراغت کے بعد اپنے استاد محترم پروفیسر حسن عباس نظر کی کتاب "مرثیہ انیس" کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر مسعود حسن کی تاریخ گوئی، شبلی، مجتبیٰ حسین، نیر مسعود، سید ہاشم رضا زیدی مرثیہ، سید عاشور کاظمی (لندن)،

حسین انجم (مدیر "طلوعِ افکار" کراچی)، سید اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی) کی منظوم نظمیں اور تقی عابدی کا مقدمہ موجود ہے۔ تجزیہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں میر انیس کی حیات کا بیان ہے جو کہ صفحہ 18 سے لے کر 68 تک پھیلا ہے۔ جس میں انیس کی داستانِ حیات رقم کی گئی ہے۔ اس باب میں 37 ذیلی عنوانات ہیں جس میں ان کی ولادت سے وفات تک اس کے علاوہ ان کی پیدائش کا اختلافی معاملہ بھی زیرِ بحث آتا ہے۔ انیس کی زندگی کے مختلف گوشوں ان کے بچپن سن سے اندازہ اطوار کا تحقیقی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ انیس اور ان کے خاندان کے بارے میں نہ ورثی معلومات اور واقف مستند حوالوں کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ میر انیس کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"میر انیس نے گیارہ برس کی عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔"

شاعری کی ابتداء میں غزل گوئی کی طرف مائل تھے۔ تقی عابدی انیس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"شیخ ناسخ نے میر ببر علی کا تخلص حزیں سے بدل کر انیس کر دیا۔ اس واقعہ کی تائید میں سید عبدی حسن احسن "واقعات انیس" میں لکھتے ہیں کہ جب انیس نے اپنے والد کی موجودگی میں ناسخ کے سامنے اپنی غزل کا شعر پڑھا

کھل باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

ناسخ جھوم گئے اور فرمایا "اے فرزند رشید آپ یادگار خاندان ہوں گے اور یاد رکھیے کا ایک زمانہ یہ آئے گا کہ ان کی زبان اور ان کی شاعری کی عالم گیر شہرت ہوں، مگر بجائے حزیں کے کوئی اور خلص ہونا چاہیے والد کی رضامندی سے ناسخ نے میر ببر علی کا خلص انیس رکھ دیا۔"

میر انیس کے کلام کے بارے میں تقی عابدی لکھتے ہیں کہ

"آج اگرچہ اردو ادب کے دامن میں میر انیس کے دو سو سے زائد مراثی سوا سو سلام اور چھ سو کے قریب رباعیات موجود ہیں لیکن غزلوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادب کی جدید تحقیقات کی روشنی میں میر انیس

سے صرف چالیس غزل کے شعر مختلف تذکروں بیاضوں اور مرثیوں کی جلدوں سے جمع کیے ہیں۔ ان چار پوری غزلیں اور ایک ادھی غزل اور پانچ منفرد شعر میر انیس کے تغزل کے نمونے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام اشعار میر صاحب کا غیر منتخب کلام ہے مگر اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ میر انیس و غزل گوئی میں دست گاہ تام اور قدرت کامل حاصل تھی۔

شہید عشق ہوئے قیس نامور کی طرح
جہاں میں نام ہمی ہم نے پیدا کیا ہنر کی طرح

•••

ہتھوں سے آنکھیں اٹھ چکی ہیں غضب کے صدمے سہہ چکے ہیں
ہوئی ہے برباد زندگانی جسے وہ ہم اپنے پا چکے ہیں

•••

رہا تن میں نہ خوں باقی کیا موسم جوانی کا
شباب آخر ہوا روشن چراغ زندگانی کا

باب ۱۰۰ میں میر انیس کے کلام کے حوالے سے تقریباً 75 مشاہیر شعر و ادب کے بیانات ہیں جو میر انیس کی قدر دانی میں ہیں۔ مشاہیر میں غالب، ناسخ، آتش، داغ، میر مشاہیر شعر و ادب شامل ہیں۔

تیسرے باب میں یادگار مرثیے سے متعلقات کا جائزہ لیا ہے مرثیے کی تاریخ تصنیف نہیں معلوم نہیں تاریخ اور کتابوں کے حوالوں سے یہ تحقیق معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ اس مرثیہ کے آخری بند کے مصرعوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرثیہ میر انیس کی ضعیفی کے زمانے کا ہے۔

[illegible] سے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند
[illegible] یہ چند بند (ص ۶۲)

تیسرے باب میں مرثیہ کی تصنیف سے متعلق [illegible] پڑھنے پر بھی تحقیق کی ہے۔ [illegible] میں یہ مرثیہ [illegible] بار پڑھا گیا۔ [illegible] میں پہلی بار

دوسری بار 1870ء میں یہ مرثیہ پڑھا گیا۔ مرثیہ کے بندوں اور مصرعوں میں اختلاف کے حوالے سے تقی عابدی نے اس کی تفصیل معتبر دلیلوں کے حوالوں سے پیش کی ہے۔ یہ مرثیہ بحر مضارع کے وزن میں ہے اور اس مرثیے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کے تمام بند مردف ہیں کچھ بند ردیف رکھتے ہیں اس کے علاوہ 47 بند مکمل مردف ہیں یعنی اس مرثیے کے 200 اشعار مردف اور 208 غیر مردف ہیں۔ تقی عابدی کہتے ہیں کہ

> اس مرثیے کی ایک خصوصیت یہ انیس کی زبان و الفاظ پر قدرت کا ہے
> اس ایک 196 بند کے مرثیے میں کل الفاظ جن میں تکرار شامل ہے ان کی
> تعداد 9493 ہے۔ عربی زبان کی تعداد 1577 ہے، اردو الفاظ میں
> ہندی کے الفاظ بھی شامل ہیں ہم نے ان دونوں اردو اور ہندی میں اس لیے
> جدا نہیں کیا کیوں کہ اردو خود ہندی کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ اس مرثیے میں
> (61 فیصد) الفاظ اردو میں (20 فیصد) الفاظ فارسی اور (19 فیصد)
> الفاظ عربی زبان کے ہیں۔ انیس نے مرثیوں، سلاموں اور رباعیوں،
> قصیدوں اور نوحوں میں کتنے الفاظ استعمال کیے اس کا تعین کرنا آسان
> نہیں جیسا کہ خود اپنے مرثیے میں فرماتے ہیں جس کا مطلع ہے ؎
> "جب شاہ کو فرصت نہ ملی خوف خدا کی"

•••

کر لیجیے شمار اس کا محاسب نہ یہ چاہا
جو کچھ تھا مہندس کا طریقہ وہ بنایا

•••

دی کلک نے آواز کہ ہاں عقل نہ آیا
لشکر کی سیاہی سے لکھا جائے سیاہا

•••

تحریر خط و خال کا اب دھیان نہیں ہے
ذروں کا یہ گننا ہے کچھ آسان نہیں ہے

(ص 191)

میر انیس نے اس مرثیے میں بیس سے زیادہ قرآنی آیات کے ٹکڑے یا مرکب الفاظ یا عربی کے تلمیحات بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی اجنبیت یا غیر مانوسی ظاہر نہیں ہوتی۔

صف میں ہوا جو نعرہ قد قامت الصلوٰۃ
بسم اللہ کے جیسے ہوئے ویسے شہ نماز (ص 100)

تقی عابدی میر انیس کی منظر نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"میر انیس الفاظ کے بادشاہ تھے، منظر نگاری جب کرتے خود منظر بن جاتے تھے مرقع نگاری کرتے ہیں۔ انیس الفاظ کے ذریعے سے جذبات کی کیفیت پیدا کرتے تھے یہاں پڑھنے والے کو منظر دکھائی دیتے تھے خود فرماتے ہیں۔

خوں بستہ نظر آئے جو دھاوں صف جنگ
دکھلا دوں ہر ورق میں مرقع لڑائی کا

انیس کی قادر الکلامی اور معجز بیانی اس مرثیے میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اس مرثیے میں انیس نے نہ صرف ماحول کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ جنگ کے مرحلوں، خصوصیات اور مختلف شعبوں کے بارے میں بتایا ہے اس میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوئی۔

تب صدا میں پٹخریاں جیسے پتول میں
بجلی چھپی ہوئی ہے ریاض رسول میں (ص 102)

انیس کے ہاں منظر نگاری کی وسعت پائی جاتی ہے۔ چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ انیس نے مختلف جذبات کا اندازہ ان شعروں سے بھی لگا سکتے ہیں جہاں وہ چیونٹی کی حیات سمجھ کر فرماتے ہیں کہ

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ میں چیونٹی بھی بچا کے چلے (ص 103)

انیس کا ہاں تشبیہات کے میدان میں بھی ان کی طرز نمایاں نظر آتا ہے۔

یوں تھے خدنگ ظلِ الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں سیمی کے جسم پر

اُردو شاعری میں رزم نگاری کے میدان کے شہسوار میر انیس ہی ہیں ؎

نخل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
منہ کس طرف تھے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی

•••

بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

اس مرثیہ میں انیس نے تین بند میں اس سے زیادہ گھوڑوں کے نام کے ساتھ ان کے اسم خاص کو بھی بیان کیا۔

"اترا ہے پھر زمیں پر براق آسمان سے"

انیس نے اس مرثیہ میں صرف تیر کمان اور اس سے متعلق جزئیات کے لیے ستر سے زیادہ الفاظ استعمال کیے۔

اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی نے چل کرے
تیر اور تن میں گڑ کے جب منہ کے بل گرے

انیس کے مرثیہ میں جنگی لوازمات کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور قاری تقریباً تمام لوازم حرب سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

"قلب و جناح و میمنہ و میسرہ تباہ"

انیس نے مرثیے کے چہرے میں صبح کی دلکشی کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا اور اس میں پینتالیس (45) سے زیادہ عنوانات سے وادی مینو اساس کو مزین کیا گیا ہے۔

انیس نے سچے اور باوقار الفاظ استعمال کر کے امام حسینؑ اور ان کے رفیقوں کے حسن خلاق، اعمال، افعال کو اس طرح دکھایا کہ وہ لوگوں کے لیے قابل تقلید نمونے بن گئے۔ ستر اشعار میں 40 اوصاف حمیدہ کو اس طرح جمع کیا کہ انسانوں پر فرشتوں کا گمان ہوتا ہے۔

"حوروں کا قول تھا یہ ملک ہیں بشر نہیں"

انیس کے اس مرثیہ میں کل 344 بار امام حسینؑ اور ان کے خاندان، اصحاب اور

پیغمبر اسلام کے نام، القاب اور نسبتیں وغیرہ ملتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی دشمنان اور ظالمان میں بھی 7 نام نظر آتے ہیں۔

مرثیے کے چوتھے باب میں مرثیہ میں سے بہتر (72) اشعار منتخب ہیے جو مرثیے کے ۶۸۸ اشعار میں سے لیے گئے ہیں انھیں تقی عابدی نے "بہتر جواہر" سے موسوم کیا طوالت کے پیش نظر صرف (۳۰) اشعار پیش ہیں۔

ہم وہ ہیں غم کریں گے تمام جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

•••

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

•••

جلوہ تھا تابہ عرش معلی حسینؑ کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلی حسینؑ کا

•••

اب چھوڑیو نہ دشت بلا میں حسینؑ کو
یا فاطمہؑ پھپھا کہ ۔ میں حسینؑ کو

پانچویں باب میں انیس کے پہلے والے مرثیوں کی جدولوں کا عکس اور ان سے چھاپ خانے کا احوال درج ہے۔ پہلا مرثیہ کب اور کہاں سے شائع ہوا اس نے مرتب یا ناشر کو۔

چھٹا باب اشخاص مرثیہ کی تفصیل اور ان کا مختصر تعارف پر مشتمل ہے۔ ساتویں باب مرثیہ پر کیے گئے اعتراضات اور ان کے جوابات پر مبنی ہے۔ اعتراضات کرنے والوں میں مہدی افتخار، نسیم، پرفیسر گیان چند اور دیگر شامل ہیں۔ آٹھواں باب مرثیہ کے تجزیاتی نمونے کے لیے ہے۔ اس میں مختلف اہل قلم کے تجزیاتی بیانات کو شامل کیا گیا ہے۔ اعتراضات کا خوف اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انیس کے

مرثیے کی واقعہ نگاری، منظر نگاری، سیرت نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، تشبیہ کی ندرت، صنعتوں کا استعمال، تجزیات، تبصرہ مکمل تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ ویسے بھی یہ موضوعات ایسے نہیں ہیں کہ ہم ان 2-3 صفحات پر لکھ کر ان کا حق ادا کر سکیں۔ فن باب مرثیہ کے تجزیہ کے طریقہ کار کے موضوع پر ہے اس سلسلے میں تقی عابدی لکھتے ہیں کہ۔

''ہمارے زیر نظر مرثیہ 196 بند پر مشتمل ہے۔ بذات خود ایک واحد نظم ہوتے ہوئے بھی اپنے دامن میں 196 مختلف نظمیں یا 588 مختصر نظموں کو احاطہ کیے ہوئے ہیں، اس لیے ہم نے اس مرثیے کو ہر بند بہ مصرع کی آزادانہ تشریح کی ہے۔''

اس مضمون میں تقی عابدی نے مرثیے کو سمجھنے اور اس سے محاسن کو پرکھنے کے ساتھ مرثیے میں فصاحت کلام پر سیر حاصل بحث کی اور مرثیے میں فصاحت و بلاغت پر دوسرے اہل قلم کی رائے اور اقوال کو شامل کیا۔ محاورات کے استعمال کے حوالے سے تقی عابدی کہتے ہیں:

''اس ایک مرثیہ میں چھ سو (600) سے زیادہ محاورات نظر آتے ہیں۔''

بعض جگہ ایک بند میں چار چار محاورے استعمال ہوتے ہیں جس سے انیس کی محاورات پر مہارت کا پتہ چلتا ہے۔''

''دنیا سے جو شہید اٹھے ''سرخ رو اٹھے'' (سرخ رو اٹھنا)

انیس کے اس مرثیے میں کل اضافات 587 ہیں جن میں ایک اچھی تعداد نئی ترکیبات کی ہے۔ باقی ابواب کا ایک مختصر اجمالی جائزہ پیش ہے۔

انیس کا ایک شعر ہے۔

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھاتے یہ جتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

شعر کا تبصرہ تقی عابدی یوں فرماتے ہیں کہ

''شعر میں حسن ادا کی جدت دیکھئے۔ جہاں وقت سحر ہر چیز حمد خدا میں مصروف ہے۔ وہاں چیونٹی بھی دعا میں محو نظر آتی ہے۔ چیونٹی کو روز بھی

لوگ دیکھتے ہیں۔ یہ اتنی حقیر شے ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں روز پامال ہو جاتی ہیں لیکن باوجود حقیر ہونے کے انیس نے یہاں اس کی بھی وقعت ہے۔ ذرا اس مشاہدے (Observation) کی وسعت کو دیکھئے کہ ہم لوگ اکثر و بیشتر چیونٹیوں کو پچھلے پاؤں قائم رکھتے ہوئے اگلے پاؤں اٹھاتے ہوئے کسی دانے کو لے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن یہ بھی ذہن میں نہ آیا ہوگا کہ اس اندراج کا استعمال ایسی شان و شوکت اور دلیری سے کیا جا سکتا ہے۔"

ایک اور جگہ چیونٹی کی زندگی کو یوں رقم فرماتے ہیں کہ

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

ایک جگہ لکھتے ہیں

"دقیق نیچر کا مطالعہ منظر شی کی جان ہے۔ مچھلیوں کی جلد کس نے نہیں دیکھی پانی میں سانس لیتی ہوئی مچھلیوں کے منہ کس نے نہیں دیکھے، نہنگ سمندری جانوروں میں ہوتے ہیں کس نے نہیں سنا۔ موتی دریا یا سمندر کی تہ میں ہوتے ہیں کس نے نہیں دیکھے لیکن جب میر انیس نے ان کو دیکھا تو دوسروں کی نظر میں دیکھا۔ چنانچہ ان مشاہدات و حسن تعلیل کے زیور سے آراستہ کر کے اس طرح پیش کیا کہ حسن کلام دوبالا ہو گیا۔ ملاحظہ ہو"

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
منہ کھولے چیرتی پھرتی تھیں لیکن اس قدر

•••

بھرتی تھی موج چھوڑ سے دریا کی تہ میں سیپ
تھے تہ نشیں نہنگ، مگر آب تھے جگر

•••

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑتے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

غرضیکہ یہ بند کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں متعدد صنعتوں کے علاوہ کئی صنعتیں بھی ہیں۔ سب سے اہم صنعت مبالغہ کی ہے۔ جس کو فن تنقید نگاری نے بانی ارکان نے شاعری کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا۔ یہی وہ صنعت ہے کہ جس سے شاعر اور مورخ میں فرق کا تعین ہوتا ہے۔ انیس شاعر تھے مورخ نہیں۔ بند میں تعداد الفاظ 46 اور حروف 146 ہیں۔

انیس کو اپنے ممدوح مظلوم کربلائی قدر و منزلت کا اتنا احساس تھا کہ وہ ان کی شان کے خلاف ذرا بھی سبکی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ میدان جنگ میں امام کو دھوپ کی تمازت سے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ انھوں نے دھوپ کی شدت کو شاہی ساز و سامان میں بدل کر آفتاب کو چھتری کے طور پر سایہ فگن قرار دیا ہے۔ بند کی ٹیپ ملاحظہ ہو

چلتی ہے لو حرارت خورشید سے بہ چند
مرجھا گئے ہیں ظل ہما میں ہیں پر سپند

•••

جھیلوں میں ہیں درند، درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسولؐ کا فرزند ارجمند

•••

غربت میں بے کسی ہے شہ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہراؑ کے ماہ پر

یہ ذیل کے بند کے ٹیپ کی نزاکت اور طرز ادا کو دیکھئے کہ امام کی بے سر و سامانی کو عالم غربت میں کس شاہانہ تجمل اور شان مظہریت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سر پہ لگائے تھا پسر سعدؑ چتر زر
خادم کئی تھے مروحہ جنباں اِدھر اُدھر

•••

کرتے تھے آپ پاش مکرر زمیں کو تر
فرزند فاطمہؑ پہ نہ تھا سایہ شجر

•••

وہ دھوپ دہشت کی وہ جلال آفتاب کا
سو نولا گیا تھا رنگ مبارک جناب کا

یہ شعر بھی قابل توجہ ہے۔

پرتو فگن تھا نور رسالت مآبؐ کا
سر پہ کا تھا چتر زری آفتاب کا

مرثیے میں یہ شعر یوں لکھا ہے۔

قرآن رحل زیں سے سرفش نہ پڑا
دیوار جب گئی طرش نہ پڑا

تقی عابدی نے اس شعر میں ایک نیا گوشہ نکالا ہے۔ جو گو یا قیامت سے نظر سے بھی زیادہ ہونے کے باوجود ہوتے ہیں کہ

"میر انیس کے کلام کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ واقعہ کو بیان کرتے ہوئے واقعیت کو فوت نہیں ہونے دیتے وہ خیال اور الفاظ کے جادو سے واقف ہیں۔ امام مظلومؑ آخری وقت گھوڑے سے زمین پر گرے لیکن انیس نے لفظ "گرے" میں جو بجلی بھر دی ہے اس کو دیکھ کر سننے والے اب تک تڑپ اٹھتے ہیں۔ امام زخموں کی تاب نہ لاکر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے جو واقعہ نہیں۔ تشریف لانا ایک اختیاری فعل ہے اور گرنا ایک بے اختیار عمل۔ میر انیس واقعہ کی ایک طرف تو اس کی تمام جزئیات کا احترام کرتے ہیں دوسری طرف وہ واقعہ کی تاثیر کی ذمہ داری بھی۔ چنانچہ انھوں نے اس لفظ "گرے" کی جگہ لفظ "گرے" کا انتخاب کیا جو قرآن، عرش اور رعب سے تشبیہ دے کر ان سب کو ایک ہی جگہ سے سمیٹ کر ایک ہی لفظ "گرے" کا احساس

نہیں ہوتا اس طرح میر صاحب نے "تجزیاتی سے واقعہ کاری کے آداب سکھائے۔"

باب 11، 12، 13 میں محسن مرثیہ، فہرست کامل جدول بہ ترتیب شعر، بند مرثیہ اور تجزیہ یادگار مرثیہ۔ یہ تینوں ابواب انیس شناسی کے لیے دعوت فکری متقاضی ہیں۔ ان میں بعض ایسے گوشے پہلی مرتبہ دریافت کیے گئے جو پہلی نظر سے نہیں نظر آتے ہیں۔

انیس کے پاس الفاظ و معانی کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اگر ان محسن کلام و ولی، پڑھنا چاہتا ہے تو تقی عابدی کا تجزیہ دیکھ سکتا ہے۔ اس میں محاورات کی تعداد 1000، علم بیان کے محاسن کی تعداد 251، علم بدیع کی صنعتوں کی تعداد 1286 یعنی کل محاسن اور صنعتوں کی مجموعی تعداد 2129 ہے۔ علم معانی و بیان، علوم مشرقیہ میں نہایت پیچیدہ اور مشکل فن ہے۔ اس فن کا سورج عرصہ دراز سے یہاں سے غروب ہو چکا ہے۔ اب خوش قسمتی سے تقی عابدی کے ذوق سلیم کی بدولت مغرب میں طلوع ہونے کا ہے۔ حالانکہ اب نے انیس و تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ خود انیس کو اس فن پر ناز تھا

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں

تقی عابدی نے انیس کے زیر نظر مرثیے میں ایسی تشبیہات کی نشاندہی کی ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے ان تشبیہات کو اس سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ جمع کیا ہے کہ انیس کا شعر بے ساختہ یاد آتا ہے ؎

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ذیل میں چند مثالیں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ یہ تشبیہات اگرچہ پڑھنے میں مشکل نظر آتی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہایت شاندار اور مسرت افزا ہیں۔

1 تشبیہ حسی بصری اس تشبیہ کو کہتے ہیں جو قوت باصرہ سے محسوس کی جاتی ہے، مثال

قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہو، یوں تھے شہ حجاز

پہلے مصرعے میں قرآن کی سطریں، جماعت کی صفیں، دوسرے میں بسم اللہ سے حجاز یعنی امام نماز

2 تشبیہ کی تیسری وہ تشبیہ جس کا تعلق سننے سے ہو، مثلاً

"گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آگئی"

یہاں رسولؐ کی صدا سے اذان کی آواز مراد ہے۔

3 تشبیہ کی چوتھی وہ تشبیہ جس کا تعلق سونگھنے سے ہو، مثلاً

"خوشبو سے جن کی خلد تھی جنگل کا عرض و طول"

(خوشبو، جنگل، خلد کی مہک کی طرح)

4 تشبیہ مذوقی جس تشبیہ کا تعلق چکھنے سے ہو، مثلاً

"سوئی زبانیں شہد فصاحت سے کامیاب"

تشبیہ مرکب حسی مذوقی کی یہ مثال بھی دیکھئے

"لہجوں پہ شاعران عرب تھے مرے ہوئے

پستے لبوں سے وہ جو نمک سے بھرے ہوئے"

5 تشبیہ کی پانچویں قسم تشبیہ کا تعلق چھونے سے ہے، مثلاً

آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر

گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

قمر امروہوی نے یہ صنعت مرثیے میں کم و بیش ہر بند میں استعمال کی ہے دیکھئے میں یہ صنعت ہماری ہر مدد کرتی ہے لیکن معنی بہت آسان۔ یعنی شاعری میں قوافی سے علاوہ پہلے خاص قوافی بھی ہوتے ہیں مثلاً

سر کو جھکا، پڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس

تیسرا باب "تجزیہ" کا ہے۔ مرثیہ حاصل کتاب ہے۔ اس میں تمام ابواب نے اپنے مطالعات کا نچوڑ بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثلاً میں ایک بند کا خلاصہ مختصر ترین الفاظ میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے یہ تجزیہ فارسی اور عربی ادب کے گہرے مطالعے کے بعد کیا ہے۔ یہ ایک کامیاب تجزیہ کا نمونہ ہے۔

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لہک
شربت جس سے اطلس زنگاری فق

•••

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک

•••

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

پہلے مصرع میں سبزہ صحرا میں صنعت تضاد ہے۔ ٹھنڈی اور زنگاری میں صنعت الم دوج ہے۔ دوسرے مصرعے میں اطلس زنگاری فق استعارہ ہے آسمان سے۔ تیسرے مصرعے میں درختوں اور پھولوں میں تضمن لم دوج ہے درختوں، پھولوں، برگ گل، مہک اور شبنم میں صنعت مراعات النظیر ہے۔

تیسرے شعر میں صنعت حشو ہے۔ یعنی دوسرا مصرعہ پہلے نہ رکھنے سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ آخری مصرعے میں رہے تھے میں تضمن الم دوج ہے اور پورا مصرعہ حسن تعلیل سے تزئین ہے۔ آخری شعر میں متعدد صنعتیں ہیں ایک صنعت وہ ہے جس کے موجد تقی عابدی ہیں۔ اس کا نام انھوں نے "مساوی الاقطاع" رکھا ہے۔ یعنی جتنے ٹکڑے پہلے مصرع میں ہیں اتنے ہی دوسرے میں ہوتے ہیں یہاں مصرع اول میں 22 اور مصرعہ دوم میں بھی اتنے ہی ہیں مرثیے میں اس صنعت کے بہت سے شعر ہیں۔

تقی عابدی نے میر انیس سے اس مرثیے "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کے ہر مصرعہ اور ہر بند کو بلاغت و فصاحت، تشبیہات، مجاز، مرسل، کنایات، صنائع لفظی تمثیلات و محاورات، صوتی کیفیت، اسلوب حسن بیان، ترتیب و تسلسل، حسن بندش، الفاظ کی روانی، صفائی، سلاست، شگفتگی وغیرہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ اس شاہکار انیس کی منظر نگاری واقع نگاری تمثیل نگاری المیہ بیانی، جدت نگاری اور سماجی عناصر کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اس مرثیے کے ہر بند کے بارے میں ہمیں بتایا ہے کہ اس میں حروف کی تعداد کیا

ہے تقی الفاظ یا حروف اردو عربی یا فارسی زبان میں ہیں اس بند میں کیا ترکیب، استعارات، محاورے، کنایات وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ ہر شعر میں کتنی اضافتیں استعمال ہوئی ہیں یا صنعت کا رفرما ہے اور میر انیس نے کیا اسلوب اور کیا فنی بندشیں پیش کی ہیں۔ ہر کام وقت طلب، محنت طلب اور تحقیق طلب تھا تقی عابدی نے اس انداز سے اسے سرانجام دیا جیسے ان کے لیے یہ نہایت فطری اور سہل ہو۔

تقی عابدی کی اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے اردو ادب کے طالب علم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رثائی ادب یعنی صنعت مرثیہ گوئی اردو ادب کا اہم اور وسیع الدامن جزو ہے۔ مرثیہ سے اندر تغزل بھی ہے اور قصیدہ گوئی بھی۔ یہ محض آہ و زاری، بین اور اظہار غم ـــــ کا نام نہیں۔ اردو ادب سے اگر رثائی ادب کو نکال دیا جائے یا سے میر انیس جیسے عظیم شاعر کی تخلیقات سے محروم کر دیا جائے تو یہ ادب مکمل طور پر کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔ تقی عابدی نے اردو ادب پر اور اردو کے اس دور کے طلبہ پر احسان کیا ہے کہ انھوں نے رثائی ادب کے ایک شاہکار کو نہایت عالمانہ انداز میں متعارف کرایا ہے۔

سید باقر زیدی

تالیف اور صاحبِ تالیف

ڈاکٹر تقی عابدی پیشہ کے اعتبار سے طبیب ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں متعدد ڈاکٹر سید یار عباس (مرحوم)، اس سے پیشے سے وابستہ کئی شخص و زبان و ادب سے مشاغل میں اتنا مصروف نہیں دیکھا۔ جتنی توجہ، جتنا وقت اور جتنی محنت وہ اپنی مشاغل میں صرف کرتے ہیں لائق آفرین تو ہے لائق تقلید بھی ہے۔ ایک کتاب کا ان کا پہلا (Commitment) کی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تمام فرائض بھی اسی تندہی سے انجام دیتے ہیں اور نصف شب کے بعد ختم ہونے والی تمام محافل و مجالس شعر و سخن میں مسلسل شرکت اور اس کے بعد دو گھنٹے کی طویل ڈرائیونگ سے اپنے گھر ارلنگ آئی لینڈ پہنچنے کے عادی رہے ہیں اور یہ بات اور بھی قابل ستائش ہے کہ ان کی شریک حیات جو ایک ایرانی خاتون ہیں اردو سے زیادہ شغف نہ رکھتے ہوئے بھی ان کی ان تمام مصروفیات میں شانہ بشانہ ہوتی ہیں اس لیے میں تقی عابدی کی کامیابیوں میں انھیں برابر کا شریک سمجھتا ہوں۔

گزشتہ تقریباً دس سالوں میں، میں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو پہلے بحیثیت شاعر پھر بحیثیت شاعر اور ناظم اور تین چار سال سے بحیثیت محقق اور مقالہ نگار دیکھا۔ سنا اور پڑھا ہے۔ نظم اور نثر یکساں جوش اور روانی سے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ جو جی میں ٹھان لیتے ہیں کر کے رہتے ہیں کوئی مشکل انھیں ان کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔ جو کام کرتے ہیں سلیقے سے کرتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے گزشتہ سالوں میں انھوں نے خود اعتمادی سے مسلسل عمل سے گزر کر مسلسل محنت انتھک کوشش اور عمیق مطالعہ کے زور پر بڑے میدان سر کیے ہیں۔ بیسیوں تحقیقی مقالے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب علوم شاعری پر ان کی زیر نظر کتاب "رموز شاعری" ان کے عزم جانفشانی اور کام کی لگن کا ناقابل تردید ثبوت ہے

کہ یہ کتاب دوسروں کے لیے ایک نظیر قائم کرتی ہے کہ اگر جذبہ صادق ہو تو کتاب علم کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

اگرچہ اس کتاب کا نفس مضمون دلچسپی سے خالی بہ خاصا خشک ہے تاہم آسان اور دلچسپ بنانے میں انھوں نے حتی المقدور کوشش کی ہے اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اصطلاحات کی لمبائی اور فارسی شعر کی مثالیں بعض جگہ بوجھل بنا دیتی ہیں لیکن بار خاطر نہیں ہوتیں۔

ایسی ہی کتاب کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جا رہی تھی بالخصوص امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں جہاں ارباب سخن باوجود مشکلوں اور محرومیوں کے زبان و ادب کی خدمت میں کوشاں ہیں مراجعتیں مناسب انداز میں بشکل کتاب یا کسی استاد فن کی صورت میں میسر نہیں ہیں۔ فی جاوید نے اس کتاب کی تالیف سے اس صورت حال کا ازالہ کرنے کی بڑی جامع کوشش کی ہے جسے بنظر تحسان نہ دیکھنا بڑی حق تلفی ہوگی۔ کتاب کے آخر میں دی ہوئی فہرست تالیفات بتاتی ہے کہ ان کی جمع آوری مطالعہ اور کتابوں سے مراجعت کرنے میں کس قدر جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ مشکل ہی سے کہیں نظر آتی ہے۔ اپنی اس مشکل کے بارے میں وہ خود رقمطراز ہیں کہ "میری کوشش یہ رہی ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے قدیم و جدید کتاب خانوں کی شعری دولت سے زمین و آسمان روشن ہو جائیں۔"

مجھے قوی امید ہے کہ ان کی یہ کتاب اردو ادب میں ایک مفید کتاب کی حیثیت سے بہت جلد پسندیدگی اور مقبولیت حاصل کر لے گی اور اساتذہ و طلبہ اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ میں کتاب کے مصنف اور ان کے علم و فضل کی قدر کرتا ہوں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

اظہارِ حق

چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک کتاب ملی۔ دیکھتے ہی جو خیال آیا وہ یہ کہ انیس یا انیس کے مرثیوں کے بارے میں ہوں گی۔ نہایت دیدہ زیب اور متاثر کن جلد۔ سنہری حروف میں کتاب اور صاحب کتاب کا نام۔ غیر معمولی عمدہ، آرٹ پیپر پر ساری کتاب۔ ہمہ رنگی طباعت، تصاویر اور زیادہ جاذب نظر، کتاب کا نام تھا۔ ''تجزیہ یادگار انیس'' جب صبح کی مسافت شب آفتاب نے'' اور جب ذرا ورق الٹے تو معلوم ہوا یہ صرف انیس کے مذکورہ ایک مرثیہ کا مختلف ادبی اور فنی زاویوں سے تجزیہ ہے۔ ایک بھگ (800) صفحات پر مشتمل اس تجزیہ میں کن کن پہلوؤں کو کام میں لایا نہیں گیا۔ غرض یہ کتاب پڑھنے کے بھی لائق ہے اور دیکھنے کے بھی۔ ابھی یہ کتاب ذہن پر چھائی ہوئی تھی کہ اس کے مرتب، محقق اور مؤلف ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ایک اور کتاب پیش کر دی۔ ''اظہار حق'' ''اظہار حق'' کی نوعیت جدا ہے اور یہ رضی حیدر سلطان صاحب فرید لکھنوی کے مراثی، سلام اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔ فرید لکھنوی لکھنؤ کے ان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہار انیس کے آخری پھولوں میں تھے۔ ان کے خاندان اور ادبی پس منظر کے بارے میں بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ فرید لکھنوی میر انیس کے منجھلے بھائی میر اس کے پڑپوتے تھے اور پیارے صاحب رشید ان کے ماموں۔ فرید کا سنہ ولادت 1892ء اور تاریخ وفات 26 دسمبر 1968ء بتائی جاتی ہے۔ فرید نے (75) سال کی عمر پائی۔ ہوا کچھ ایسا کہ اپنی زندگی کے آخری (25) برسوں میں انھوں نے کوئی مرثیہ نہیں کہا بلکہ پڑھا بھی نہیں۔ فرید کا شعری سرمایہ یقیناً خاطر خواہ ہوگا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ایک دو تعارفی نوعیت کے مضامین ملتے ہیں لیکن از حد مختصر، نامکمل اور اغلاط سے بھرپور۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا (40) فیصد کلام تو یقیناً ضائع ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی ہی، جو پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں، قدرت نے شعر و ادب کا چسکا ایسا ذوق و بیت کیا ہے کہ انھوں نے جہاں اور کام کیے فرید کے انتقال کے تیرہ (۱۳) سال بعد ان کے کلام کو تلاش کرنا شروع کیا اور انھیں بہ وقت تمام اس قدر کامیابی ہوئی کہ فرید کے (۱۲۶) مرثیے، (۱۲۱) سلام اور (۳۶) رباعیات دریافت ہوئے۔

تقی عابدی نے ان سب دستیاب شدہ کو توجہ اور محنت کے ساتھ جانچا، پرکھا اور تحقیق، تنقید کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں کتابی صورت دی۔ تاکہ فرید کے بارے میں جو دو ایک مضامین شائع ہوئے ان کے خلا کو ذمہ داری کے ساتھ شائع کرتے ہوئے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں فرید کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے

"فرید لکھنوی کا شمار میدان مرثیہ کے شہسواروں میں کیا جانا چاہیے، یوں کہ فرید نے مرثیہ دیوں میں لکھتا ہے۔ ان کے مرثیہ کلاسیک مرثیوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ یوں کہ تقریباً ہر مرثیہ میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد رجز، جنگ، شہادت اور بین یعنی تمام اجزائے مرثیہ موجود شامل رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان اجزائے مرثیہ میں "بوستان خیال" کا رنگ و بو رچا بسا ہے۔" (ص 4)

ڈاکٹر تقی عابدی نے فرید کے حالات پر بڑی عرق ریزی سے تحقیق کی ہے۔ فرید کے بارے میں سنی سنائی باتوں کو بھی یہ مضامین سے جو ہم بھی سنتے ہیں۔ ان کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کو اس خصوص میں بڑی محنت و کاوش کرنی پڑی ہوگی اس کا قیاس ہم بخوبی کر سکتے ہیں جو اس نوعیت کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

تقی عابدی نے تحقیق و تدوین کے بعد اس کی اشاعت کا فریضہ بھی اپنے ذمہ لیا اور (۱۱۱) صفحات پر مشتمل یہ کتاب ہے جس کی پیرزنگ اور طباعت و اشاعت فرحان (پرنٹرز) نے عمل میں لائی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے بھی ڈاکٹر تقی عابدی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے ان کے پاس (۱۱۴) مرثیوں کے مخطوطات موجود ہیں۔ تقی ہے وہ ان مخطوطات کا جائزہ لیتے رہیں گے اور ان میں سے

تحقیق شدہ اور موثق مخطوطات کی اشاعت عمل میں آئے گی۔

''اظہار حق'' کی رسم اجراء امریکہ، پاکستان اور ہندوستان کے بعض شہروں سے علاوہ لکھنؤ میں ہو چکی اور ظاہر ہے فرید لکھنوی اور تقی عابدی دونوں کا تعلق حیدرآباد سے ہے اس خصوصاً اس لیے یہاں بھی اس کی رسم اجراء عمل میں آنی تھی اور یہ رسم انجام پائی۔ ۱۰ راگست کو شام ساڑھے سات بجے۔ قبلہ سہیل آفندی صاحب نے رسم اجراء انجام دیتے ہوئے فرمایا کہ ''کسی ملک کی سیاست کا اثر اس ملک کے عام حالات پر بھی پڑتا ہے۔ مرثیہ بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ مورخ، تاریخی واقعات قلم بند کرتا ہے، لیکن شاعر وہ لکھتا ہے جو مورخ نہیں لکھتا۔ جہاں مورخ کا قلم رک جاتا ہے، وہاں شاعر کا قلم چلنے لگتا ہے جو تخلیقی مقالہ نگار مورخ چھوڑ جاتا ہے، شاعر اس کو پورا کرتا ہے۔''

سہیل آفندی صاحب نے کہا کہ ''رثائی ادب کی ہمارے معاشرہ میں بڑی اہمیت ہے اور اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خوشی کے اظہار کے لیے ہماری زبان میں چند الفاظ ہیں لیکن غم کے اظہار کے لیے کئی الفاظ۔ غم کے اظہار کے لیے یہ زبان مخصوص کشادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''کربلا ایک ایسا موضوع ہے جس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اعلیٰ انسانی اقدار کربلا میں موجود ہیں اور ان سب کو مرثیہ میں موضوع بنایا گیا ہے۔'' جناب سہیل آفندی صاحب نے کہا کہ ''رثائی ادب کا آغاز ہابیل کی شہادت سے ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر سید حسن اختر نے جو فرید کے پوتے ہیں خطبہ استقبالیہ دیتے ہوئے مقررین اور سامعین کا خیر مقدم کیا اور کتاب ''اظہار حق'' کی اشاعت کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''فرید لکھنوی کے مرثیے بستوں میں بند تھے، نہ جانے کیا ہو جاتا اگر تقی عابدی نے انھیں تحقیق اور ڈیڑھ سال کی سخت محنت کے بعد موجودہ صورت میں نہ پیش کیا ہوتا۔'' انھوں نے بتایا کہ ''شمالی امریکہ میں شائع ہونے والی اتنی ضخیم یہ پہلی کتاب ہے۔'' لکھنؤ میں اس کی رسم اجراء انجام پائی اور یہ تقریب کامیاب رہی۔ تقی عابدی صاحب نے فرید لکھنوی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے فرید کی شخصیت اور ان کے کلام کو حیات جاودانی حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر ہاشم حسن سعید نے کہا کہ "تحقیقی اعتبار سے "اظہار حق" کو اہمیت حاصل ہے۔ حالیہ عرصہ میں ہندوستان میں بھی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی۔" انھوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو مبارک باد دی کہ "ان کا یہ کام اوروں کے لیے لائق تقلید ہے۔"

ہاشم حسن سعید نے کہا کہ "ہندوستانی جامعات میں جو تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں، "اظہار حق" کی روشنی میں دیکھیں تو وہ نہایت معمولی معلوم ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر تقی عابدی نے اولین ماخذات سے استفادہ کیا ہے اور تحقیق کے فرائض بخوبی انجام دیے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ "فرید لکھنوی کا سلسلہ میر انیس سے ملتا ہے ان کے مراثی بھی مثال آپ ہیں۔" تقی عابدی نے فنی اعتبار سے فرید کے مراثی کا جائزہ لیا ہے۔

ہاشم حسن سعید نے اس سمت توجہ دلائی کہ "رزمیہ (EPIC) کا عنوان خاصا وسیع ہوتا ہے۔ ہمارے ان مرثیوں کو رزمیہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں رزم کاری ان مراثی میں ضرور ملتی ہے اور انیس کے پاس بھی۔ فرید کے پاس انیس کے اثرات واضح ہیں۔" دبیر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ہاشم حسن سعید نے کہا کہ "انیس اور دبیر دونوں بڑے شاعر تھے۔ ہماری شاعری میں ان دونوں کی اہمیت ہے۔"

پروفیسر صادق نقوی نے فنی زاویوں سے مرثیوں پر تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ "ہمارے ادب نے اردو شاعری میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے اور ہمارے ادب میں مرثیہ کو مرکزیت حاصل ہے۔" انھوں نے کہا کہ "مرثیہ کا آغاز دکن میں ہوا۔ مرثیہ نگاری میں دکن کے مرزا محمد (22) شعرا کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہاں سے مرثیہ غزل کی ہیئت میں تحریر کیے گئے۔ مرثیہ دکن سے لکھنؤ اور دہلی پہنچا۔ شمالی ہند میں مرثیہ نے اپنی ہیئت بدلی اور مسدس کی ہیئت اختیار کی۔ مرثیہ نے اجزا اور زمانے کے ساتھ ساتھ بتدریج ترتیب پائے۔ حیدرآباد میں مرثیہ آج بھی زندہ ہے اور ہر سال کئی شاعر مکمل مراثی پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صادق نقوی نے کہا کہ "مرثیہ وہی شاعر کہہ سکتا ہے جس کے پاس الفاظ کا خزانہ ہو۔ خیال ذہن میں آئے اور اس کو مناسب الفاظ کا جامہ پہنایا جائے۔ خیال گم ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرثیہ نے الفاظ کو استعمال کرنا سکھایا۔" ڈاکٹر صادق نقوی نے مرثیہ میں سراپا نگاری اور بہاریہ شاعری سے متعلق بھی

تفصیل سے گفتگو کی۔

''اظہار حق'' کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے فرید لکھنوی کے شعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ادب اور تاریخ دونوں زاویوں سے اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے اس کارنامہ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے فرید لکھنوی کو بہار انیس کے آخری پھولوں میں شمار کرکے، رد و شاعری میں گویا ان کا مقام متعین کر دیا ہے۔ فرید لکھنوی کو انیس اور دبیر سے عقیدت تھی۔ ''اظہار حق'' کے نئی اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر جلیلی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے رثائی ادب کی بازیافت کی ہے۔ لکھنؤ کے ادب کے تحفظ کی یہ ایک قابل ستائش کوشش ہے۔''

ڈاکٹر سید حسن اختر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ ''یہ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ ٹورنٹو (کینیڈا) سے وہ اپنے ہمراہ اس کی نئی جلدیں نہیں لے آ سکے اور جتنی جلدیں آئی تھیں وہ لکھنؤ اور حیدرآباد میں تقسیم کر دی گئیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ''اظہار حق'' کا ہندوستانی ایڈیشن شائع ہو۔ یہ کم قیمت ایڈیشن یقیناً جلد دستیاب ہوگا اور مراثی کے شائقین اس سے استفادہ کر سکیں گے۔''

یہ منتخبہ محفل رات دیر گئے اختتام کو پہنچی۔ بعد ازاں محفل شعر منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے فرمائی۔ شائقین شعر و ادب کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

ذکرِ دُرِّ باران

ڈاکٹر تقی عابدی پیدا ہوئے دہلی میں ایم بی بی ایس تک تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی اور مزید اعلیٰ تعلیم امریکہ اور کینیڈا میں۔ لیکن اردو زبان اور شعر و ادب سے تعلق سے ترتیب، تالیف اور تحقیق و تنقید کا ذوق حیدرآباد میں بھی رہا۔ دہلی میں بھی اور امریکہ و کینیڈا میں بھی۔ جن لوگوں نے کینیڈا میں ان کی رہائش اور ڈاکٹری پیشہ بھی ہے وہ ان سے اردو ذوق کے رشک اٹھاتے ہیں۔ تقی عابدی ہیں تو طب سے ڈاکٹر لیکن ان کے ادبی ذوق و کیف، شعر و ادب سے ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) سے حقیقت نظر آتے ہیں۔ اپنی طبابت کی مصروفیات سے وقت نکال لینا اور شعر و ادب کی دنیا میں گراں مایہ خدمات انجام دینا کچھ ایسا ہی ہے جیسے نہایت سنجیدہ، تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر ڈاکٹر تقی عابدی کی تالیفیں سامنے آچکی ہیں جن میں سے چند ایک کے نام ہیں۔ "اظہار فن"، "تجزیہ و تاثر"، "انتخاب"، "مشنویات دبیر"، "کائنات فکر"، "اقبال کے عرفانی زاویے"، "انشاء اللہ خاں انشاء"، "مرزا شوق"، "عورتوں کی زبان"، "چوں مرد آید" ڈاکٹر تقی عابدی نے جہاں مختلف موضوعات پر تفصیل اور تجزیہ سے کام لیا ہے وہاں مختلف موضوعات پر مختصر سے کام سے اپنی قدرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ویسے جہاں اور جب تقاضہ تھا اس کا التزام کیا ہے۔ "در باران" (تحقیق تنقیدی روشنی میں) ان کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں مختلف ادبی، تہذیبی اور سماجی و فنی موضوعات پر حسب گنجائش قلم اٹھایا ہے۔ اظہار نظر پر مبنی مضامین کی اس کتاب میں کل (28) اٹھائیس مضامین ہیں۔ مختصر سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں ضرورت کے اختصار سے۔ بعض موضوعات ایسے ہیں جن پر تحقیق کا حق ڈاکٹر تقی عابدی ہی ادا کر سکتے تھے۔ مثلاً "نیویارک" جیسی میں دیوان غالب کا نایاب

نسخہ۔ ظاہر ہے یہ ایسے ہی نسخے سے ممکن تھا جو اثر و پیشتر نیویارک یا ہیری سے استفادہ کرتا ہو۔ بہر کیف تقی عابدی نے 1803ء میں آگرہ میں مطبوعہ "دیوان غالب" کے اس نسخہ کو ڈھونڈ نکالا۔ یہی نہیں اردو دنیا سے اس کو متعارف کرنے کا سہرا بھی ڈاکٹر عابدی کے سر ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضمون میں دیوان کی جملہ صفحات کی تعداد، ہر صفحہ پر سطروں کی تعداد اور اس میں کل اشعار کی تعداد بھی لکھی ہے۔ دنیا غالب کی دیگر میں شائع شدہ غالب کے دیوانوں کی اشاعت کی تفصیل سے یہ مضمون اور وقیع ہو گیا ہے۔ غالب پر اور مضامین بھی ہیں۔ مثلاً "غالب کے اشعار کے معنی خود غالب سے پوچھئے"، "غالب اور ذوق" اور "غالب غزل پر غالب ہوتے ہوئے بھی میر سے مغلوب کیوں؟" ان مضامین سے مصنف کی غالب سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ "غالب کے اشعار کے معنی خود غالب سے پوچھئے" والے مضمون میں تقی عابدی نے غالب کے اپنے شاگردوں اور احباب کو تحریر کردہ خطوط میں اپنے اشعار کی جو تفہیم کی ہے اور معنی و مطالب تحریر کیا ہے ان کو پیش کر دیا ہے اس سلسلے میں عبدالرزاق شاکر، چودھری عبدالغفور، عبدالجمیل جنون، منشی پیارے لال اور منشی نبی بخش حقیر کے مولومہ خطوط سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یوں غالب اشعار کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔ دوسرا مضمون "شمالی امریکہ کے پہلے کلاسک اردو شاعر مظفر شکوہ کے بارے میں" اردو کی نئی بستیوں کے بارے میں ہم چند کہ ہم خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ اپنی جگہ انفرادیت اور اہمیت رکھتی ہیں۔ مظفر شکوہ کے حالات زندگی تفصیل سے تحریر کرتے ہوئے انھیں باقی اردو دنیا سے روشناس کرایا گیا ہے۔ ان کی شعری صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے مراسم کن ادبی شخصیات سے رہے اور انھوں نے کن سے استفادہ کیا اس کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔ مظفر شکوہ کی ادبی اور تہذیبی تربیت ظاہر ہے برصغیر میں ہوئی۔ وہ (28) برس کے ہوں گے کہ امریکہ روانہ ہوئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس زمانہ تک ان کا شعری ذوق جلا پا چکا تھا۔ وہ اردو شاعری میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ امریکہ میں انھوں نے اپنا ادبی و شعری سفر جاری رکھا، اگرچہ ان کا ابتدائی کلام تقسیم ہند کے وقت ہنگاموں کی نذر ہو گیا لیکن امریکہ میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ دو مجموعوں "غبار

ناتواں" اور "پیمانہ دل" کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ علاوہ ازیں "پیمانہ دل" میں "بادہ و شیشہ" کے عنوان سے 1947ء سے پہلے کے کلام سے پانچ غزلیں، چھ نظمیں اور فرد کے زیر عنوان گیارہ رباعیات اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ تقی عابدی نے ان دونوں مجموعوں کا بہ امعان نظر مطالعہ کرتے ہوئے مفلس شکوہی کی شاعری پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ مضمون طویل ہے لیکن عابدی صاحب سے خواہش ہوگی کہ وہ مفلس شکوہی کا غیر مطبوعہ کلام بھی تلاش کریں اور اپنے مزید مفصل "مقدمہ" کے ساتھ اردو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ امریکہ میں اور اردو شاعر بھی ہوں گے ان کی طرف بھی توجہ دی جا سکتی ہے۔ مفلس شکوہی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جہاں عارض و گیسو عجیب دنیا ہے
کہ جس میں شام بھی ہے ساتھ ہی سحر بھی ہے

•••

نہ تحیر نہ تماشا نہ تمنا نہ گریز
چارہ گر کیا یہی انداز جنوں ہوتا ہے

•••

وعدہ کر کے جو ہر روز بھلا دیتے ہیں
کبھی جھوٹے سے ہی وعدہ وفا بھی تو کریں

•••

صبح تک منتظر رہے انجم
تم نہ آئے تمام رات کٹی

•••

رکھے جاتے رہے ہر عصر کے بازار میں ہم
پر کبھی آ نہ سکے چشم خریدار میں ہم

"نگار بہاراں" کی خصوصیت یہ ہے مضامین کا تنوع ہے۔ شعرا نے کائنات اور عصری موضوعات، نظریات، رجحانات سے تعلق رکھنے والے موضوعات اختیار کیے

ساتھ لیکن جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقی عابدی نے قلم اٹھایا ہے۔ اور تک بھگ ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی خاص بات ملے گی۔ جس کو تقی عابدی کی تحقیق یا تنقید کا حاصل کہنا چاہیے جیسے ترقی پسندی کے بارے میں۔ ایک مضمون میں اس تحریک کے پیدا ہونے کی وجوہات ہے تو دوسرے میں ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کے بارے میں اظہار خیال ہے۔ نعتیہ شاعری پر بھی ایک سے زاید مضامین ہیں ہے۔ انشا کی نعتیہ شاعری کا جائزہ بھی ہے اور اردو نعت کے ارتقائی سفر کی داستان بھی ہے اور ان دونوں پہلوؤں پر نشین چیزیں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ انشا کی نعتیہ شاعری کے بارے میں تقی عابدی رقم طراز ہیں "انشا کی نعتیہ شاعری کا سرسری جائزہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان کے اشعار حضورؐ کے جمال، جلال، کمال، خصائل اور اقدار سے مہریز ہیں۔ حضورؐ کی آل سے لے کر بال تک کی مدحت ان کے شعروں میں نظر آتی ہے۔" (ص ۲)

ویسے انشا کی حیات، تصنیفات اور شخصیت پر مضمون بھی اردو میں انشا پر لکھے جانے والے چند عمدہ مضامین میں شمار ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی "انشا کا منتخب کلام"، "انشا اور مصحفی کی معرکہ آرائی کا عادلانہ تجزیہ"، "انشا اور مصحفی اور "انشا کا شاہکار دیوان بے نقط" کے مطالعے سے تقی عابدی کی انشا پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ نعت کے ذیل میں "جوش کی مرثیہ نگاری"، "کل دستہ مناقب مولا علیؑ"، "ملا محتشم کاشی کا مرثیہ"، "رباعی "شاہ است حسینؑ" کا مختصر تجزیہ"، "منقبت تاریخ اور تحقیق کے آئینہ میں"، "عظمت حسینؑ غیر مسلم شعراء کی نظر میں" اور "قرآنی شیرازی کا شاہکار مرثیہ" جیسے مضامین پڑھنے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے عقیدت کے دامن کو تھامے ہوئے فنی اور ادبی تقاضوں کو بہ تمام و کمال ملحوظ رکھا ہے۔ "گہر ہائے دری" کے مضامین میں زیادہ تر اختصار سے کام لیا گیا ہے، بعض مقامات پر تو انھوں نے نہایت لفظی نمود و نمائش پیش کی ہیں۔ "رباعی شاہ است حسینؑ کا مختصر تجزیہ" مختصر ہے لیکن انھوں نے رباعی کے مفہوم کو نہایت کمال کے ساتھ ان چند سطروں میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ رباعی ذہن میں رکھئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں "رباعی کا پہلا مصرع، شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ، امام حسینؑ کی شخصیت کا مختصر تعارف کراتا ہے۔ دوسرا مصرع "دیں است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ" امام حسینؑ کی سیرت

اور اسوہ حسنہ کی تفسیر ہے۔ باقی تین مضامین "سرمد، دلدادۂ درد پرست" "امام حسین کی شہادت عظمیٰ اور فلسفہ شہادت کا نمونہ ہے اور آخری مضمون "حقا کہ بنائے لا الہ است حسین" امام حسین کے ابدی کارنامہ معرکہ کربلا کا تابندہ سند ہے۔" (ص 165-166) ملاحظہ کیجیے۔ کتنے اطمینان اور تحمل کے ساتھ انھوں نے اس بے مثال رباعی کا مطلب بیان کر دیا ہے۔ اردو والے اس پر کتنا ناز کرتے ہیں۔ سرمد کے بارے میں ۱۰، تین مضامین مل جائیں گے۔ "سرمد کے لٹے حق کی زبانی" چھپ چکی ہیں اس کے علاوہ "سرمد کا ابدی کارنامہ" اور "محمد اقبال اور سرمد" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے اور سرمد کے ذہن کی بہت سی گتھیاں سامنے آتے ہیں۔ اقبال پر سرمد کے حوالے سے ایک مضمون سے قطع نظر یہ اور مضمون "علامہ اقبال کی دو نظمیں" ملے گا۔ اختر ترقی پسند شاعروں میں مجاز، سردار جعفری پر مضامین عصری شعری منظر نامہ میں رنگ بھرتے ہیں۔ سردار جعفری کے بارے میں لکھتے ہوئے قمر رئیس نے بتایا ہے کہ سردار جعفری کی مرثیہ گوئی اور پھر ان کی ترقی پسندی پر نظر ڈالی ہے اور مجموعی طور پر سردار جعفری کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ "سردار جعفری ایک فطری شاعر ہیں اور ان کی شاعری ان کی دیگر ادبی صلاحیتوں پر چھائی ہوئی ہے۔"

"نادر زبان" میں "اردو شاعری میں مرثیہ اور ان" "نظم طباطبائی کی نظم اور غزلیات" "محمود چھاپہ" (ان کی مفید اور بچوں کی تربیت)، "قرۃ العین طاہرہ" اور "اردو زبان کی بعض تحقیقی" جیسے موضوعات پر بھی مضامین ہیں۔ ان کے کئی مضامین فرہنگ میں بھی مزید تفصیل سے متعلق ہوں گے تب نہیں، ڈاکٹر تقی عابدی ان موضوعات پر مزید فکر کریں گے۔

فرحت آرا حیدری
سری نگر (جموں کشمیر)

تصانیفِ دبیر اور تقی عابدی

مرزا دبیر اعلیٰ پائے کے اردو مرثیہ گو شاعر تھے۔ انھوں نے ہر صنف میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے مرثیے، سلام، قطعات، رباعیات اور قصیدے کہے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں آٹھ مثنویات بھی ہیں۔ ان کا سارا کلام اعلیٰ پائے کا ہے اور زبان فصیح ہے اور سب سے زیادہ قابل تعریف یہ بات ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں فصاحت، بلاغت، روانی اور سلاست ہے۔ سنتے ہیں ان کی آواز بھی اچھی تھی اور مرثیہ پڑھنے کا انداز بھی۔ اس بات کو انھوں نے اپنی رباعی میں بیان کیا ہے ؎

ناحق نہ چیخنا نہ چلانا ہے
بے کار نہ ہر بند پر بتلانا ہے
ابن شہ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں
صد شکر کہ پڑھنا میرا مردانا ہے

مرزا دبیر نے عربی، فارسی باقاعدہ پڑھی تھی۔ ان کا شمار علماء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے 12 سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اپنے والد کے کہنے سے جب میر ضمیر کو اپنا یہ قطعہ سنایا ؎

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرائے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سن کر میر ضمیر اور تمام حاضرین بیک زبان اٹھے اور بولے۔ صاحبزادے!

صاحبزادے ماشاء اللہ چشم بددور آپ نے باپ کی طبیعت پائی ہے۔ اس کے بعد تقریباً دس سال مرزا دبیر، میر ضمیر کی شاگردی میں رہے۔ میر ضمیر لکھنوی کو خود اس بات پر فخر تھا کہ وہ ہیں اور ہونہار مرزا دبیر کے استاد ہیں۔ اس مضمون کو انھوں نے اپنی ایک رباعی میں پیش کیا ہے۔

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے
اب کہتے ہیں استاد دبیر آیا ہے
کردی میری پیری نے مگر قدر سوا
اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

مرزا دبیر کی ولادت ابتدائی ۱۱۱۱ھ ۱۲۱۸ ہجری میں ہوئی۔ مقام ولادت دہلی ہے۔ بعد میں وہ لکھنؤ میں رہنے لگے اور وفات ۱۲۹۲ ہجری میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے اور بیٹی تھی۔ ان کے بڑے بیٹے مرزا سلامت بھی بلند پایہ اردو مرثیہ گو شاعر تھے۔

زیر نظر مضمون میں ہم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی صرف تین تصانیف "ابواب المصائب"، "منتخبات دبیر" اور "تصحیف فارسی" کا ہی تذکرہ کریں گے۔

۱۔ "ابواب المصائب" مرزا دبیر نے اپنی تصنیف "ابواب المصائب" میں سورۂ یوسف اور حضرت یوسف کے حالات اور مصائب کی مثال دے کر مصائب شہدائے کربلا کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ دل سوز بیان نثر و نظم دونوں ہی میں کیا ہے۔ مرزا دبیر "ابواب المصائب" نثر کی تصنیف سے اور یہ کتاب اس زمانے میں تصنیف کی گئی جس زمانے میں نثر شاعرانہ انداز میں لکھی جاتی تھی اور قافیہ اور قافیہ والے ساتھ شاعرانہ صنعتوں سے مالا مال تھی۔ ابتدا میں نثر کا اسلوب یہی تھا۔ پہلے عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے جاتے تھے۔ مرزا دبیر نے "ابواب المصائب" میں صاف ستھرا اور سادہ زبان استعمال کرکے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ یعنی انھوں نے بھی زیادہ تر فارسی نثر کا اسلوب اختیار کیا ہے اور کہیں کہیں عبارت میں رواں نثر کا اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ یہ کتاب نثر میں ہے مگر ساتھ ہی ساتھ نظم میں بھی حضرت یوسف اور واقعات کربلا کے مصائب بیان کیے ہیں۔ یوں بھی پہلے نثر اور نظم ملا کر لکھنے کا دستور تھا۔ مصائب بھی نثر میں بعض شاعرانہ طرز میں

پڑھتے ہیں:

کتاب "ابواب المصائب" بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تصنیف کی گئی تھی۔ بادشاہ بڑی عقیدت اور مودت کے ساتھ محرم میں تعزیہ داری اربعین تک کرتے تھے۔ اس کے بعد آٹھ ربیع الاول تک عزاداری کی جاتی تھی۔

مرزا دبیر کہتے ہیں کہ یہ تائید غیبی ہے کہ تم نے سورۂ یوسف کے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ مصائب امام حسینؑ کو آیات اور احادیث کی روشنی میں ایسا بہ خصوصی دیا ہے جس سے اردو سے واقف عزاداران حسینؑ مستفید اور غمگین و اشکبار واقعات پر آنسو بہا رہے ہیں۔

ہر چند کہ یوسفؑ پہ ہوئی آفت بے داد
پر ماتم شبیرؑ سے فریاد ہے فریاد

•••

یوسف کوئی ساعت رہا اس دشت میں پیاسا
پیاسا کئی دن تک رہا احمدؐ کا نواسا

حضرت یوسف کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا ہے حضرت یوسف سے بہت زیادہ امام حسینؑ پر ظلم و ستم کیے گئے اور آپ نے سب کچھ برداشت کرکے اپنے بھائی، بیٹوں، بھتیجوں کی قربانیاں پیش کیں اور ایمان کی حفاظت کے لیے اپنی جان و مال اور گھر بار سب چھوڑ دیا۔ یزید جیت کر ہار گیا اور امام حسینؑ ہار کر جیت گئے۔ اُن کا نام ان کا دین قیامت تک باقی رہے گا۔

خدا نے قصۂ یوسفؑ کو جو کہا احسن
سو بزم عقل میں یہ شمع راز ہے روشن

•••

کہ اس میں حال حسینؑ و حسنؑ کا ہے مذکور
اسی سے قصۂ احسن ہوا ہے وہ مشہور

حضرت یعقوبؑ کے بارہ فرزند تھے۔ وہ سب بیٹوں سے زیادہ حضرت یوسفؑ کو چاہتے تھے۔ ایک دن یوسفؑ نے اپنے بابا سے بیان کیا کہ میں خواب میں دیکھتا ہے کہ

آفتاب اور مہتاب اور گیارہ ستارے اتر کے مجھے سجدہ کیے۔ حضرت یعقوب نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تم حکومت اور نبوت پاؤ گے۔ یہ بات کی اور نے بھی سن لی تو بھائیوں کو بھی خبر ہوگئی۔ سب بھائی سن کر جل گئے اور حسد کی وجہ سے بھائی کے دشمن بن گئے۔ حضرت یوسف کو باپ سے جدا کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ وہ باپ سے اصرار کرے یوسف کو صحرا کی سیر کرانے لے جائیں اور وہیں لے جا کر اسے ختم کر دیں حضرت یعقوب نے بڑی مشکل سے اجازت دی اور رخصت کرتے وقت کہا کہ

اے پسر تیرے لگے ہیں اب نکلنے دانت
تجھ سے بچھڑے ہوئے دیکھے کب ملتے ہیں

کی نثر: جب حضرت امام حسین بیمار کربلا سے رخصت ہونے لگے تو حضرت زینب نے رو کر فرمایا۔

بیمار ہوں اے میرے مسیحا نہ بچوں گا
بعد آپ کے جیتا نہ جیوں گا
وہ بیکسی حرم کی وہ رخصت حسین کی
پردیس میں وداع شہ مشرقین کی

بھائیوں نے یوسف کو صحرا میں جا کر نہ پانی دیا نہ کھانا دیا۔ کنویں کے پاس لے گئے تھے یوسف پیاسے تھے مگر پانی نہ دیا۔ پھر انہیں کنویں میں اتارنے کی رسی سے ہاتھ پاؤں باندھ کر کنویں میں ڈال دیا۔ اللہ نے جبرئیل کو بھیج کر حفاظت فرمائی۔ بھائی یہ کہہ کر کہ بھائی کا خون کیسے کریں گے واپس آ گئے اور باپ سے کہا "بابا! یوسف کو بھیڑیے نے کھا لیا۔" یہ سن کر حضرت یعقوب بہت روئے اور کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے یقین نہیں میرا یوسف زندہ ہوگا۔"

میان چاہ تھا یوسف کو ایک باپ کا غم
دل حسینؑ کو واللہ تھے ہزار الم

قافلے کی صحرا میں ایک کارواں آیا۔ انہوں نے پانی بھرنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا تو اس میں حضرت یوسف نکل آئے۔ دونوں حسین نے

دیکھ رہے تھے اسے ہم لے جائیں گے۔ ہم کو اس سے فائدہ ہوگا۔ اتنے میں یوسف کے بھائی آ گئے اور کہنے لگے یہ ہمارا غلام ہے۔ خریدو گے تو اسے دیدیں گے۔ ان لوگوں نے سو درہم میں خرید لیا۔ شہر مصر پہونچ کر اس کو بہترین پوشاک پہنا کر اسے بازار میں نیلام کیا۔ زلیخا نے عزیز مصر سے کہا کہ اسے خرید لیجیے۔ عزیز مصر نے خرید لیا اور زلیخا سے کہا کہ اس کو بہت اچھی طرح رکھنا۔ زلیخا نے اسے بہت آرام سے رکھا۔ کچھ عرصہ کے بعد زلیخا اس سے ناراض ہو گئیں اور الزام لگا کر اسے قید میں ڈلوا دیا۔

حضرت یعقوب بیٹے کے لیے رویا کرتے تھے اور حضرت یوسف بھی باپ سے ملنے کے لیے بے قرار تھے اور رویا کرتے تھے۔ حضرت یوسف کی ایک بہن تھی اس کا نام دنیا تھا وہ بڑی نیک اور دیندار تھی۔ وہ بھی حضرت زینب کی طرح بھائی کو بہت چاہتی تھی اس نے باپ سے کہا "بابا آپ نے یوسف جیسے بچوں کو خارجیے بھائیوں کے ساتھ کیوں بھیج دیا۔ میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔" یہ کہہ کر رونے لگی ؎

غرض کہ دیکھ کے یوسف کا حال رویا میں
سیاہ ہوگئی دنیا نگاہ دنیا میں

شب عاشور حضرت زینب نے بھی یہ خواب دیکھا تھا وہ بھی بہت روتی تھیں اور ہمیشہ بین کر کے روتی رہیں ؎

قتل ہوتا نہ حسینؑ اور نہ لٹتی زینبؑ
کاش امت کی شفاعت کا نہ وعدہ ہوتا

•••

شمر چڑھتا پہ فاطمہؑ کے سینے پر
زندہ عالم میں جو شبیرؑ کا نانا ہوتا

حضرت یوسف کو جب قیدی بنایا گیا تو مصر میں آپ کے سارے چاہنے والے روئے تھے ؎

پڑی جو بیڑیاں یوسف کے پائے زیبا میں
خروش ہوگیا برپا تمام دنیا میں

مگر افسوس ہے کہ ؎

سجاد سا قیدی نہ ولی دنیا میں
طوق گردن میں رسن ہاتھ میں بیڑی پا میں

•••

سب سے حسین زینب مظلوم سے رہا
یہ ظلم اہلبیت پہ اللہ کی پناہ

•••

یہ قیدی میں سب سے نرالا ہے
قلب جہاں میں اب بے پدر ہمارا ہے

حضرت یعقوب و یوسف کی بہن ڈینا دونوں باپ بیٹی یوسف سے بے قرار رہتے تھے اور زار زار روتے تھے مرا تا روئے کہ حضرت یعقوب نابینا ہو گئے ؎

جلد آ کہ یہ بابا تیرا مشتاق ہے یوسف
وقت میں تری زینت بھی اب شاق ہے یوسف

حضرت فاطمہ اور رسول اللہ امام حسین کو شہید ہوتے دیکھ کر بہت روتے تھے۔ سب نہ حسین کو چاہتے تھے۔ پھر بھی وہ حسین کی شہادت پر راضی برضا رہے ؎

یہ ہے سر شاہ دیں سے اپنے لپٹا یا
رسول رو رہے ہیں تب کہ ان کو نیند آ

•••

سر حسین نہیں کانا میرا سر کانا
علی و فخر دو زہرا کا ہے جگر کانا

•••

زینب کی یہ فریاد تھی ہے میرے بھائی
میں روتی ہوں تجھ سے پہ تو رونے نہیں پائی

•••

ہوئی بلند صدا رن میں واحسینؑ کی
ہوا یقیں کہ قیامت خدا نے برپا کی

•••

اے بے وطن حسینؑ سکینہؑ ترے فدا
اللہ میری فکر نہ تم کو رہی ذرا

•••

مارے طمانچے شمر نے میرا گوہر لیا
تم نے میری حرف سے جدا سخت سزا یا

حضرت یوسف کے ساتھ قید خانے میں دو قیدی اور تھے۔ ان دونوں نے اپنے خواب حضرت یوسف سے بیان کیے۔ آپ نے خواب کی یہ تعبیر دی کہ تم رہا ہو کر بادشاہ کے ساقی بنو گے اور دوسرے سے کہا تم کو پھانسی ہوگی۔ عزیز مصر نے بھی خواب دیکھا اور اپنے درباریوں سے تعبیر پوچھی تو اس ساقی نے کہا کہ قید خانے میں ایک یوسف ہیں وہ خواب کی تعبیر بتاتے ہیں۔ عزیز مصر کے خواب کی بھی تعبیر بتائی۔ تو اس نے سوچا کہ یوسف بہت عالم ہیں اور خدا کے نیک بندے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سوچ کر عزیز مصر نے یوسف کو رہا کر کے اپنے محل میں بہت ہی عزت و احترام سے رکھا۔

عزیز مصر کے بعد حضرت یوسف کو حکومت بھی مل گئی اور نبوت بھی۔ قحط کے زمانے میں حضرت یوسف کے بھائی مصر میں غلہ خریدنے آئے تو حضرت یوسف نے انھیں پہچان لیا اور باپ کی خیریت پوچھی۔ کہا وہ نابینا ہو گئے ہیں۔ پھر کچھ پہچان کر پوچھا آپ یوسف ہیں۔ ہاں! میں یوسف ہی ہوں۔ اور میرا پیرہن لے جاؤ بابا کو دینا۔ یہودا بھائی سب سے غنیمت تھا۔ وہ جلدی سے باپ کے پاس پیرہن لے کر پہنچا اور کہا۔ بابا یوسف کو حکومت بھی مل گئی اور نبوت بھی۔ انھوں نے آپ کو بلوایا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے پیرہن آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا، اسی وقت آپ کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ پھر سب لوگ مصر گئے۔ مصر پہنچتے ہی بھائیوں نے معافی مانگی۔ حضرت یوسف نے معاف کر دیا۔

حضرت یوسف سب کو اپنے محل میں لے گئے۔ ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور گیارہ

بھائی سجدے میں گر گئے۔ اس طرح حضرت یوسف کے خواب کی تعبیر پوری ہوئی۔ سب مل گئے اور بڑی خوشی رہنے سہنے لگے۔

وصال یوسف زہرا سے خوش ہوئے یعقوب
پڑا یہ غل کہ محبوب سے محبوب ملا

•••

گلے سے باپ کے جس دم وہ نور عین ملا
پکارے حضرت یوسف کہ آج چین ملا
بے افسوس جناب فاطمہ یوں فریاد کرتی تھیں۔
اے وائے غضب ہائے ستم وائے مقدر
یعقوب سے یوسف چھنا تجھ سے علی اصغر

•••

یعقوب سے یوسف تو ملا پھر بھی دوبارہ
واحسرتا دردا میرا اکبر گیا مارا

•••

یوسف کا پسر کون تھا اکبر کے برابر
بچہ کہاں مارا گیا اصغر کے برابر

مانا جاتا ہے کہ امام حسین کی شہادت کے بعد اہل حرم پر بہت ہی ظلم کیے گئے۔ قیدی بنایا گیا۔ شام کوفہ سے بارہ میل تک سر ننگے پاؤں لایا گیا۔ یہاں قید خانے میں سکینہ خواب میں ایک بار اپنے بابا سے ملیں اور اتنا روئیں کہ اپنے بابا کی پاس چلی گئیں۔ جب اہل حرم قید سے رہا ہوئے اور مدینہ جانے کی اجازت ملی تو آپ نے اپنے بابا حسین کا مدینے کی خواہش ظاہر کی۔

گو فاطمہ کے رونے پر اب عرش ہلے گا
شبیر کا سر تو نہ ملا نہ ملے گا

سید سجاد مدینہ سے اور سب اہل حرم روتے ہوئے مدینہ سدھارے۔ اور جب

جب مدینہ پہونچے ہیں

رو کر کہا ہانو نے کہ اے فاطمہ صغرا
یہ پوچھتی ہو آہ نہ بھائی ہیں نہ بابا

• • •

فرزند نبیؐ سید عالی گیا مارا
اے شہر مدینہ تیرا والی گیا مارا

• • •

حسینؑ بے وطن و بے کفن سلام علیک
غریب و بے کس و تشنہ دہن سلام علیک

مرزا دبیر کی تصنیف "ابواب المصائب" ، جواب ہے اور شہر کی حروف سے ملتے والی کتاب ہے۔ یہی کوئی کتاب جس میں حضرت یوسف اور امام حسینؑ کے مصائب کا موازنہ کیا گیا ہو ہماری نظر سے نہیں گزری۔

۲۔ "مثنویات دبیر" مرزا دبیر کی "مثنویات دبیر" بھی بہترین تصنیف ہے۔ اس کتاب میں آٹھ مثنویات ہیں۔ پہلی مثنوی "حسن المقصد" میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کی ولادت فضائل اور معجزات کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی کے الفاظ شاندار اور پرشکوہ ہیں۔ زبان و بیان رواں و شستہ ہے۔ کردار نگاری بھی اعلیٰ پائے کی ہے۔ معصومین علیہم السلام کے جذبات قلوب کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔ اور منظر نگاری بھی خوب تر اور دلکش ہے۔

دوسری مثنوی "معراج نامہ" ہے۔ اس کو لکھ کر مرزا دبیر نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ بس اس سے زیادہ کہنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

تیسری مثنوی "اسناد سورۂ احمد و چہاردہ معصومین علیہم السلام" ہے۔ اس مثنوی میں سورۂ الحمد کی شان، ثبوت، اسناد و دینی فائدے بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں حمد خدا اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کے فضائل ہیں۔ یہ بھی بہترین مثنوی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر بھی زبان و بیان میں سادگی اور روانی

ہے۔اس مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

دلا حمد عبود معراج ہے
کہ الحمد قرآن کا تاج ہے

چوتھی مثنوی ''شہادت امیر المومنین'' کے بارے میں ہے۔ اور شہادت پر مرثیہ لکھا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو بیانیہ مثنوی کہتے ہیں اور یہ مثنوی چھوٹی بھی ہے۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

یارو نہیں ہے مرثیہ پڑھنے کی احتیاج
دُنیا میں انتقال امیرِ عرب ہے آج

پانچویں مثنوی ''عزائے حیدر کرار بہ فرمودۂ دشوار کہ روز عید ست'' ہے۔ اس مثنوی میں بتایا گیا ہے کہ حضرت علی کی شہادت کے دس روز بعد عید فطر آئی۔ اس لیے امیر المومنین کے ماتم عید نہیں منائی گئی۔ اس مثنوی کا ایک شعر ہے ؎

عید کی تیاریاں ہیں جابجا
[illegible] ہے ماتم بپا

چھٹی مثنوی ''تاریخ وفات چہاردہ معصومین'' کے بارے میں ہے۔ اس میں چہاردہ معصومین کی ولادت کی تاریخ اور چہاردہ معصومین کی وفات کی تاریخ ہے۔

ساتویں مثنوی ''واقعہ شہادت علی اکبر'' ہے۔ اس میں علی اکبر کا سراپا جوانی، حسن و شباب اور جنگ میں کارنامے اور شہادت کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔ یہ بھی بیانیہ مثنوی ہے۔

آٹھویں مثنوی ہے [illegible] اور اخلاقی ہے۔

۳۔ ''مصحف فارسی'' مرزا دبیر کی تصنیف ''مصحف فارسی'' میں مرزا دبیر کے فارسی کلام کا مجموعہ درج ہے۔ رباعیات، مخمسات اور مسدسات وغیرہ فارسی میں نظم کیے گئے ہیں۔ فارسی جاننے والوں کے لیے بہترین کتاب ہے اور اسی کتاب میں مرزا سلامت علی دبیر کا زندگی نامہ بھی ہے۔ جو عابدی صاحب نے دریافت کیا ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ ہے۔ [illegible] نہیں ملتی ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے [illegible] تلاش کیا۔ انھوں نے ان نسخوں کو شائع نہیں کیا بلکہ ان پر تحقیقی بحث

ی ہے۔ انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں بڑی قدر اور معرکہ آرا تنقید سے لکھے ہیں۔ مرزا دبیر کی سوانح عمری بھی بہترین انداز میں لکھی ہے اور تشریح بھی اچھی طرح سمجھائی ہے۔ تحقیق و تدوین اور ترتیب کا کام بڑی محنت اور جانفشانی سے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ اور تفصیل کے ساتھ مرزا دبیر کی فنی خوبیوں کو اجاگر کر کے قارئین کو بتایا ہے کہ مرزا دبیر نے اردو میں سب سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ وہ قادرالکلام تھے۔ انھوں نے مرثیے کے فن معیار کو بلند کیا۔ ان کی جدت پسندی، پرشکوہ طرز سخن اور فنی و بیان کے اعتبار سے ان کے کلام کو معراج کمال حاصل ہوا مرزا دبیر کو میر انیس سے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ بقول عمر انصاری ؎

نام جن کا کہ ہے انیس و دبیر
آسمانِ ادب کے تارے ہیں

•••

کس کو کہیے قمر کے خورشید
دونوں ہی نور کے منارے ہیں

بہرکیف ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ان کتابوں کو شائع کر کے ایک بڑا کارنامہ ہی انجام نہیں دیا بلکہ مرزا دبیر کی روح کو بھی شاد کیا اور خود بھی ثواب دارین حاصل کیا۔ وہ انیس شناس ہی نہیں دبیر شناس بھی ہیں۔

میرزا کوکب قدر
کلکتہ

''مثنویات دبیر''، ''ابواب المصائب'' اور ''مصحف فارسی''

مرزا سلامت علی دبیر کی یہ تینوں تالیفیں ''مثنویات دبیر''، ''ابواب المصائب'' اور ''مصحف فارسی'' حسن طباعت سے قطع نظر اپنی مثال آپ ہیں ہی نفس مضمون کے لحاظ سے بھی لاجواب ہیں۔ ان سے مرتب پیشے کے اعتبار سے طبیب اور ادبی ذوق کے لحاظ سے ایک تخلیقی اور تجدیدی ادب کی اشاعت میں حصہ لینے والے ہیں، جس کے لئے اہل نیت کی قدر دانی کے مستحق ہیں۔ موصوف کی یہ خصوصی کوشش، وسیع مطالعہ اور دقیقہ رسی سے اندازہ کرنے کے لئے یہ تالیفیں کافی سے زیادہ کافی ہیں۔

زیر تبصرہ مرثیہ کی تنقیدی تاریخ کا یہ خصوصی اسلوب ہے اور اسی لئے وہ ان مثنویوں کی تحقیق پر تحقیق کرتے ہوئے محقق کاوشوں کا ذکر تو ضرور کرتے ہیں لیکن اس پہلو پر توجہ دینا ضروری نہیں جانتے کہ تحقیق کرنے والے نے ایسا کیوں کیا۔ چنانچہ مثنوی ''احسن القصص'' پر اظہار بیان چند جملوں کا پورا بیان نقل کیا ہے (ص 17) سوائے اس آخری جملے کے

''عرفان نامہ'' کے بارے میں بھی بعد معلومات موصوف پروفیسر مسعود حسن رضوی سے فراہم کیں۔

شاید اس سے کہ وہ موصوف کا نام مزید بحث نہیں چاہتے جیسا کہ چند جملوں کے بعد انہوں نے مختلف اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

''یہ مثنویات اب میں یہاں نمایاں نہ ہوتیں اس کی وجہ ان مثنویوں کا

موضوع نہیں ادیبوں کی سہل انگاریاں ہیں جن کا ہم کسی دوسرے مقام پر
ذکر کریں گے۔"

حقیقت یہی ہے کہ مثنویات کا موضوع اور ادیبوں کی سہل پسندی دونوں ہی مثنویات دبیر کے "عمیق مطالعہ" سے روکتی رہیں اور ایک آدھ دانش ور جن کو ڈاکٹر جیسن یا کندن لال کندن تو کیا دبیر کے ہم عقیدہ و ہم مسلک ڈاکٹر سید محمد عقیل اور ڈاکٹر سلیمان حسین وہ محقق ہیں جن کو صرف دو مثنویوں کی اہمیت کی تلاش ہی سرگرداں تھی۔ ان کا ادبی اور تنقیدی تجزیہ وہ بھاری پتھر تھا جسے چوم کے چھوڑ دینا ہی مناسب نظر آیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ "احسن القصص" اور "معراج نامہ" سے چار ہزار اشعار سے علاوہ پانچ اور چھوٹی چھوٹی مثنویوں کا جن کے اشعار کی مجموعی تعداد (۱۱۰۰) ہے توجہ کے قابل سمجھا اور ہر مثنوی کے تعارف کے طور پر ایک دیباچہ لکھا۔ آٹھویں مثنوی "مثنوی بے عنوان" کی دریافت کا سہرا تو ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ کے سر ہے لیکن اس کے مکمل متن (۱۱۶ صفحے) کی فوٹو کاپی کا شائع کرنا کہ "دبیر" کی تحریر سے بھی واقف ہوں اور جو مخطوطات کے پڑھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اس کے پڑھنے میں مددگار ہوں کسی صاحب ذوق اور صاحب حیثیت محقق کا کام ہے جو حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا شیدائی ہے۔

دبیر کا نثری کارنامہ جو ان کی مذکورہ بالا مثنویوں کی طرح اہل قلم کی بے اعتنائی کا شکار ہوا کتاب "ابواب المصائب" ہے (مطبوعہ مطبع یوسفی، دہلی)۔ اسے اردو نثر کے ارتقاء خصوصاً دبستان لکھنؤ کی خدمات میں ممتاز جگہ ملنا چاہیے تھی لیکن اسے اردو ادب کی تاریخ کا المیہ کہیے یا کچھ اور، ہم کسی بھی جامع حیثیت فن کار کی کسی ایک حیثیت کو ترجیح دیتے ہوئے اگر اس کی دوسری خدمات کو بالکل ہی فراموش نہیں کرتے تو قابل ذکر بھی نہیں جانتے۔ دبیر اگر مرثیہ نگار تھے تو صرف مرثیہ نگار تھے اور وہ بھی مسدس کی ہیئت میں۔ اگر وہی موضوع مثنوی کی شکل میں نمودپذیر ہوا تو اس ثانوی حیثیت کے ذکر سے حاصل؟ اور پھر اگر وہی موضوع دبیر کی بالکل ابتدائی شہرت کے زمانے میں "ابواب المصائب" کی منظوم نثر کی صورت میں نمودار ہوا تو اس کے ذکر سے فائدہ؟ بالخصوص ایسی حالت میں جب مصنف نے خود اسے اہمیت نہ دی ہو اور جب یہ مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آیا ایک دوسرے دبستان

کی چھاپ لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر صفدر حسن، ڈاکٹر آزاد اور ڈاکٹر نذیر حسین فاروقی کا "آداب المطالعہ" کی بازیافت کے سلسلے میں کام ڈاکٹر تقی عابدی کے کام سے پیشتر قابل ستائش نہیں کہ کاشانۂ اردو ادب سے ان جدید محققوں نے اس گمشدہ ادب پارے کی اہمیت کو واضح کیا اور ڈاکٹر تقی عابدی نے غالب کے ان جوہر شناسوں کی شناسائی کی داد دیتے ہوئے اس کی شناخت اور تشریح کا وہ کام اپنے ذمے لیا جو صلہ اور ستائش کی طلب سے بے نیاز ادارے ہی کر سکتے ہیں۔

ع "این کارِ از تو آید و مرداں چنیں کنند"

بیدل کے متفرق فارسی کلام کو یکجا کرنے کے فاضل مرتب نے اس مجموعے کا "نسخۂ فارسی" نام رکھا جو سلسلہ بیدل کی اس چھٹی کڑی کے لیے بہت موزوں ہے۔ بلاشبہ ایسے نادر و نایاب کلام کا اس آب و تاب سے جامع ضابطہ بیدل شناسی ہونا اسے حیات و فن بیدل کے "بیدل کا زندگی نامہ" کے عنوان سے بیدل کی زندگی کی خاص خاص باتوں و فنی رنگینیوں کے پہلو میں ایسی خوبی سے پیش کیا ہے کہ قدم قدم پر تمثیل خود بخود آئینہ ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اس آئینہ ہونے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ خرابیاں بھی بہ یک نظر سامنے آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیدل کا ایک قطعہ اس طرح نقل ہوا ہے:

کی کا کندو نہیں پہ نام ہوتا ہے — کی کی ہم کا بہ یہ جام ہوتا ہے
تب سے ہے یہ نیا کہ جس میں شام و سحر — کی کا وچ کی کا مقام ہوتا ہے

تین صفحات کے بعد اس آخری قطعہ بفیہ کی معقول سبب کے ایک دفعہ پھر پیش کیا ہے لیکن تیسرے مصرعے میں "میں" کی جگہ "کی" درج ہے۔ بیدل کے اس قدر کے کلام میں ہر خط و کتابت جاننے والے کو "میں" اور "کی" کی جگہوں جیسی غلطیاں بھی بیشتر کھٹکتی رہتی ہیں اور بیشتر کھٹکتی رہیں گی۔ امید رکھنا چاہیے کہ پہلے مصرعے میں بیدل نے کندو میں نکتہ یوں کہا ہے کہ یہاں کا بتدائی کام ہے لیکن کندو میں ساقط ہونے سے قبح نظر پیدا ہو گیا۔ کاف کاف کی تین دفعہ متواتر تکرار سے تنافر حروف کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی" کا نکتہ بھی پتے کا ہے جو کلام ہمارے بزرگوں نے ہمیں بیش خوانی کے لیے دیا تھا اس میں جا بجا کندے کا نکتہ درج تھا۔ یہ بیدل کی تنافر کا نکتہ تھا یا کلام میں

، پیہ نے خود نظر ثانی کی تھی ،

کلاسیکی متون کو پیش کرتے وقت یہ بات سے ہے کہ ان کی صحت کا خیال رکھا جائے اور اس طرح کا مطالبہ اگرچہ نامنصفانہ ہے کہ تلاش، تحقیق اور تحریر پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی پروف ریڈنگ پر بھی دیدہ ریزی کریں۔ ان کی پیش کش کا افادی پہلو بہر حال مجروح ہوا ہے کہ افسوس مندرجہ بالا کتابوں میں سے ولی کتاب اس سہو نظر سے خالی نہیں۔ آفسیٹ کی پلیٹوں پر ہاتھ سے بنی ہوئی تصحیح سے آثار فراہم کرتے ہیں کہ طباعت کا یہ شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا۔ لیکن جب متعارف متون میں اختلاف کی نشاندہی ممکن ہے تو ایسے متون کے بارے میں کوئی کیا کہے جنہیں چند خوش نصیبوں نے ہی دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر ص 3 پر یہ مشہور مصرع ؎

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

بغیر واؤ معطوفہ کے درج ہے جب کہ خواہ زبردستی سے تاریخ نکالیے خواہ جملہ محض سے جیسوی، واؤ کا وجود لازمی ہے اور ص 18 پر دونوں جملہ یہ مصرعہ واؤ کے ساتھ لکھا ہے۔ ان باتوں کی وضاحت طوالت اور اصل موضوع سے گریز کا سبب بنتی، لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ پیہ کا طبعزاد معرکۃ الآرا قطعہ تاریخ ملا محمد نعیم ندیم اصفہانی کے قطعہ تاریخ سے مستفاد ہے جو انھوں نے آصف الدولہ کے انتقال پر کہا تھا اور وزیر السلطان نواب امیر علی خاں امیر کے بیان کے مطابق آصف الدولہ کی قبر پر کندہ تھا۔ آخر کار میں یہ دو شعر اسی قطعے سے پیش خدمت ہیں ؎

لکھنؤ بی آصف است و آسمان بی آفتاب
شہر یوناں بی مسیح و طور سینا بی کلیم

•••

نقش بند کاف دنوں بر تربت آصف نوشت
جنۃ روتہ، و ریحانہ، و جنات نعیم
(وزیر نامہ) ۱۲۱۲ھ

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی
ممبئی

شوقِ کلام و بیؔ

دہلی میں پیدا ہونے والے اور حیدرآباد میں مقیم، ہندوستانی نژاد ادیب و شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی، ناولوں کی تعداد کے اعتبار سے بھلے ہی ایک شاندار طبیب ہوں لیکن کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک ایسی مدرس ادیب ہیں، جن کا ذوق و شوق تحقیق و تنقید سے اور مزاج اور ذوق تاریخ عرفانی اور روحانی۔ اس کا اظہار ان کی اُن تصانیف سے ہوتا ہے جن میں مذہبی عقیدہ و اعتقادات کے ساتھ ساتھ روحانی اور عرفانی ادب کا ذکر بھی شامل ہے۔ مثلاً ''جوشِ محبت''، ''سلام بیؔ''، ''تجزیہ یادگار انیسؔ''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ''، ''رباعیاتِ بیؔ'' وغیرہ وغیرہ۔ اس جن بلند تحقیق نے مختلف سمتوں میں دشت نوردی کی ہے۔ جن میں سلام، مرثیہ، رباعی وغیرہ کے علاوہ چند نثری اصناف بھی شامل ہیں۔ اور اب ان کا یہ شوق کلام بیؔ سے متعلق اس سلسلہ مطبوعات سے متشکل ہے جس کی تین جلدیں حال ہی میں منظر عام پر آئی ہیں۔ زیر نظر کتاب ''مثنویاتِ بیؔ'' اس سلسلے کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں قاری کی تفہیم اور موضوع کی مناسبت سے ایک باب ''مثنوی۔ ایک اہم صنفِ سخن'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں صنف مثنوی کی فنی و معنوی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس کی ہیئت، اور ان کے بحور، مثنوی ساخت، حسن و لوازم اور معیار نقد پر مختلف حوالوں کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک مثنوی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ دوسری تمام اصناف سخن میں اپنی انفرادی خصوصیت سے باعث ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یکتا نے اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام فنونِ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید زیادہ وسیع زیادہ ہمہ گیر ہے۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ

اُردو کی ابتدائی نظمیں بھی مثنویوں کی شکل میں ملتی ہیں۔ مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ برہان الدین جانم کے چکی نامے، ولی دیوری کی روضۃ الشہدا اور قطبن کی مرکاوتی وغیرہ لیکن تعجب یہ ہے کہ جتنی طبع زاد، غیر طبع زاد یا ماخوذ اور ترجمہ شدہ مثنویاں اُردو میں لکھی گئیں، اتنی تنقیدی کتابیں اس صنف پر نہیں ملتیں۔ پھر بھی اطمینان قلب کے لیے یہ امر کافی ہے کہ جو کام مثنویوں پر ابتداء سے آج تک ہوا ہے وہ اپنی اپنی جگہ لائق توجہ اور قابل قدر ہے۔ مثلاً ''اُردو مثنوی کا ارتقاء'' (عبدالقادر سروری)، ''تاریخ مثنویات اردو'' (جلال الدین احمد جعفری)، ''اُردو مثنویات'' (امیر احمد علوی)، ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' (ڈاکٹر کیلان چند جین)، ''اُردو مثنوی۔ ایک عمومی مطالعہ'' (اظہر علی فاروقی)، ''اُردو مثنوی کا ارتقاء۔ شمالی ہند میں'' (سید محمد عقیل)، ''اردو کی دو قدیم مثنویاں (نائب حسین نقوی)، ''اردو کی تین مثنویاں'' (خان رشید)، ''اُردو کی منظوم داستانیں (فرمان فتح پوری)، ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں'' (ڈاکٹر روپی چند نارنگ)، اور ''شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں'' (ڈاکٹر کندن لال کندن) وغیرہ۔ ان میں سے بیشتر ترجمے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے پاس موجود ہیں لیکن ایک اہم نام علی جواد زیدی کا ہے جن کی کتاب ''مثنوی نگاری'' (مطبوعات سلسلہ اتر پردیش نمبر ۲) جس میں اتر پردیش کی مثنویوں پر تحقیقی کام ملتا ہے اور جس میں صنف مثنوی سے متعلق ایک بسیط اور وقیع مقدمہ شامل ہے۔ غالباً ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر سے نہیں گزر سکی یا انھیں دستیاب نہیں ہو سکی، ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ کیوں کہ موضوع سے متعلق براہ راست تنقیدی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر عابدی نے ان تنقیدی کاوشات کو بھی پیش نظر رکھا ہے جس میں ضمناً مثنوی کے فن پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق''، مولانا حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری''، علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' وغیرہ۔

بہ چند کہ مثنوی کی اصطلاح عربی سے لی گئی۔ اور یہ ''مزدوجہ'' یعنی دو دو ہم قافیہ مصرعوں کے جوڑی دار اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جس کی خوبی تسلسل بیان اور ترتیب واقعات ہے، لیکن اس کا فروغ ایران میں ہوا۔ اُردو پر اس کے دہرے اثرات ملتے ہیں۔ فارسی مثنویات کی مروجہ سات بحروں کے جن پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بحث کی ہے اور سنسکرت کی طویل رزمیہ نظموں کی جو ''دوہا کوش'' کی روایت سے وابستہ رہیں، اُردو والوں

نے ان میں اضافہ کر کے مثنوی بحروں کی تعداد گیارہ تک پہنچا دی۔ بعض نقادوں نے تو موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کے لیے بحریں بھی مخصوص کر دیں۔ تقی عابدی نے ان مروجہ سات بحروں کے ارکان بھی تحریر کیے ہیں جو اردو مثنویوں میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

بہر حال اردو میں مثنوی ادب، افر مقدار میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اردو کی اولین مثنوی کون سی ہے۔ اعتقاد، زمانے کے ساتھ ساتھ تحقیق غرض بھی آگے بڑھتی جا رہی ہے اس لیے اس ضمن میں نقادوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل حضرت بابا فرید شکر گنج کے ان صوفیانہ اشعار میں اردو مثنوی کا پہلا نقش دیکھتے ہیں جو ۱۲۷۳ء کی تحریر ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک
پیش رو اصفیا کے ہوتے نوک

•••

خاک لانے سے گر خدا پائیں
گائیں بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اردو کی اولین مثنوی بھی دکن کے شاعر خواجگی کی "مدھو مالتی" (۱۴۲۷ء۔ ۱۴۶۵ء) ہے۔ جب کہ علی جواد زیدی "مثنوی کاری" میں ملا داؤد کی مثنوی "چندائن" (۷۸۱ھ مطابق 1379-80ء) کی نشاندہی کرتے ہیں جو کہ ورچند سے ملتے جلتے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سید محمد عقیل کے حوالے سے بابا فرید شکر گنج کی مثنوی کو اولین مثنوی قرار دیا ہے۔ یہ خیال بیسویں صدی کے اواخر اور انیسویں کے اوائل میں مثنوی نگاروں نے ہیئت کی جو تبدیلی کی جس کی وجہ سے مثنوی اور نظم کا فرق ختم ہو گیا، ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی ڈاکٹر چندائن اور سید محمد عقیل کی طرح اس دور کی نظموں کو مثنوی کی بحث سے خارج کر دیا ہے۔

چوں کہ مثنوی میں موضوع کی شاعری قید نہیں ہوتی اس میں ایک تنوع ملتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی دیگر نقادوں کی طرح موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں۔ مذہبی مثنویاں کا ذکر کیا ہے اور مثنویات میں غیر مذہبی مثنویوں سے

زمرے ہی میں رکھا ہے۔

صنف مثنوی سے قطع نظر ایک پورے باب میں انھوں نے اس بات پر اظہار تاسف کیا ہے کہ ہمارے اکثر ناقدین اور محققین نے سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے ''مثنویات دبیر'' کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا۔ سب سے زیادہ شکوہ انھیں معاصرانہ امداد اور اثر کی ''بے خبری'' سے ہے۔ جنھوں نے دبیر کی مثنوی نگاری سے انکار فرمایا ہے۔ اس سے زیادہ وہ انھیں اس بات کا ہے کہ خود دبستان دبیر کے شعرا نے بھی اس طرف غفلت برتی، یہاں تک کہ چودھری سید نظیر الحسن فوق کی ''میزان'' مرزا دبیر کی شاعری پر مفصل بحث کے باوجود دبیر کی مثنویات کے ذکر سے خالی ہے۔ اوج لکھنوی کے شاگرد سید فراز حسین نبیہ لکھنوی، جنھوں نے مرزا دبیر کے چودہ عدیم النظیر مرثیوں کو ''سبع مثانی'' عنوان سے مرتب کیا، اس میں بھی ''مثنویات دبیر'' کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اور بعض حضرات نے ذکر کیا بھی ہے تو سرسری اس جہان سے گزر گئے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی کے مطابق ان مزرخین میں مرزا دبیر کی پہلی سوانح حیات ''شمس الضحیٰ'' کے مصنف معاوی فدا علی بھی شامل ہیں۔ جن نقادوں یا محققوں نے دبیر کی طرف دو مثنویوں ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کا تذکرہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ابو حیدری، ڈاکٹر سید سلیمان حسین (مثنویات دبستان، لکھنؤ) اور ڈاکٹر سید محمد عقیل ہیں جنھوں نے اپنی کتاب ضمیمہ نمبر ۱ میں دبیر کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایک ایک دو دو جملے میں۔ ''حیات دبیر'' کے مصنف ثابت حسین کو ڈاکٹر تقی عابدی اس لیے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ دبیر سے واقفیت کے باوجود ان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' دو الگ الگ مثنویاں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے انھیں گلہ ہے کہ انھوں نے امیر اللہ تسلیم کی مثنویات کے بارے میں تو پچیس سے زیادہ صفحات میں تبصرہ کیا ہے اور ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کو صرف ڈیڑھ صفحے کے قابل سمجھا۔ جب کہ ان مثنویوں پر ڈیڑھ سو صفحات لکھے جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر لندن، ال کندن سے وہ اس لیے شکوہ کناں ہیں انھوں نے ''جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویوں'' میں سو کے قریب تاریخی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے لیکن مرزا دبیر کی مثنویات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ناچیز کا خیال ہے کہ اس ضمن میں ڈاکٹر تقی

عابدی کو انہ کندن لال کو انہ گوپی چند نارنگ کی طرح جن سے نام یہ کتاب منسوب کی گئی ہے، مستثنیٰ قرار دینا چاہیے یوں کہ دونوں کا موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جس طرح انہ گوپی چند نارنگ کا موضوع "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" ہیں جن میں مقامی موضوعات کی بنیاد پر مثنویوں کو جن چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان میں پہلی قسم ان مذہبی مثنویوں کی ہے جو ہندوستانی قصوں سے ماخوذ ہیں لہذا "مثنویات دیپ" اس میں شامل نہیں کی جا سکتی تھیں کہ وہ ہندوستانی قصوں کی نہیں، اسلامی اور خصوصاً شیعی عقائد کی تشریح کرتی ہیں اس طرح انہ کندن لال کندن کا موضوع تاریخی مثنویاں ہیں جب کہ عابدی خود اس کا اقرار کرتے ہیں کہ "مثنویات دیپ" کا شمار مذہبی مثنویوں میں ہونا چاہیے تھا جس ضمن تاریخ خود رقم بند ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ غیر مطبوعہ مثنوی جس کا موضوع سراسر تاریخی ہے۔ ابھی تحقیق کی منزلوں میں ہے، غالباً اسی لیے اس کا ذکر نہ انہ نارنگ سے ہاں ملتا ہے اور نہ انہ کندن سے۔ البتہ انہ تقی عابدی ان محققین اور ناقدین سے گلہ گزار ہونے میں حق بجانب ہیں جنھوں نے دیپ کی مثنویوں کا ذکر تو کیا مگر وہ بھی سرسری انداز میں۔ محققین و ناقدین سے بھی جن کا شمار "مثنویات دیپ" میں کیا جا سکتا ہے، دیپ کی جس مثنوی کا انکشاف "مختار نامہ" سے متعلق سے کیا ہے وہ بھی دراصل "معراج نامہ" ہی کا ایک نام ہے جو عماد الدین دیدہ شاہ میں ان کی ملکہ ممتاز الدہر کی فرمائش پر لکھی گئی اور اسی نسبت سے ان سے منسوب ہو کر "مختار نامہ" نام پایا۔ اسی طرح انہ کاظم علی خان نے دیپ کی تیسری مثنوی کا ذکر "نشر عشق" کی شعوری جلد میں شامل ہے، کا ذکر کرتے ہیں مگر اس سے متعلق خاطر خواہ معلومات نہیں دے پائے ہیں۔ انہ تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اس مثنوی کا پورا نام "اسرار عشق" ہے۔ اس سلسلہ میں فضل علی فضلی کا مرتبہ "مجموعہ فضلی" جو مختلف چھوٹے چھوٹے مجموعوں پر مشتمل ہے، اس سے بھی کافی مدد ملی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل کئی غیر مطبوعہ مثنویوں سے انہ تقی عابدی نے "نشر عشق" کی جلد سے دیپ کی مزید چار مثنویاں دریافت کی ہیں۔ فضل علی فضلی کی ان کاوشوں سے نتیجہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ دیپ کی مثنویوں کی تعداد گیارہ نہیں بلکہ پندرہ مثنویاں ہیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ''احسن القصص''

۲۔ ''معراج نامہ'' یا ''ممتاز نامہ''

۳۔ ''اسامی سورۂ احمد و فضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام، دریافت کاظم علی خاں''

۴۔ ''ولادت و وفات حضرات چہاردہ معصوم علیہم السلام''

۵۔ ''غیر مطبوعہ مثنوی''

۶۔ ''مثنوی شہادت امیر المومنین، دریافت پروفیسر آزردہ''

۷۔ ''مثنوی واقعۂ شہادت علی اکبرؑ''

۸۔ ''مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرۂ ماہ شوال کہ روز عید است''

ان مثنویات کے مضمونات کی تفصیل یوں ہے۔ ''احسن القصص'' ایک طوالانی مثنوی ہے جس میں تین ہزار تین سو سولہ اشعار ہیں اور اس میں چہاردہ معصومین کی ولادت اور معجزات قصوں میں نظم کیے گئے۔

''معراج نامہ'' چھ سو چوراسی اشعار پر مشتمل ہے اس میں معراج نبوی اور آئمہ اثنا عشر کے فضائل رقم کیے گئے ہیں۔ دیبے کے علاوہ اس موضوع پر دیگر شعرا نے بھی مثنویاں کہیں مثلاً مظفر علی اسیر کی ''معراج الفضائل''، منیر شکوہ آبادی کی ''معراج المصلین'' اور میر ضمیر کی ''ریحان معراج'' وغیرہ ان میں رسولؐ و آئمہ اثنا عشر کے فضائل، مناقب اور معجزات نظم کیے گئے ہیں۔ دیبے کا ''معراج نامہ'' شعری اور فنی اعتبار سے قابل قدر کارنامہ ہے۔ بے عنوان مطبوعہ مثنوی سماجی حالات پر ہے اس میں پانچ سو انھتر اشعار ہیں۔ مثنوی شہادت علی اکبر میں اکسٹھ اشعار ہیں۔ البتہ نو دریافت مثنویاں مثلاً مثنوی شہادت امیر المومنین (چودہ اشعار) اور ''مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرۂ ماہ شوال کہ روز عید است'' (سولہ اشعار) مثنویوں سے زیادہ صنف ماتم کے قریب ہیں ان میں بیدیہ رنگ پایا جاتا ہے اور عام طور پر دیبے کی یہ مثنویاں ماتم کے طور پر ہی مجالس عزا میں ماتمی لے میں پڑھی جاتی ہیں۔ خصوصاً اول الذکر جس کا یہ شعر دیبے کے مصرعے کی طرح ماتم کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے۔

یہ رات مرتضیٰ کی شہادت کی رات ہے
زہراؑ کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات ہے

اس طرح مثنوی مرزا حیدر قرار بھی عید کے موقع پر حضرت علی کے دسویں کی یاد میں ماتم کا انداز لیے ہوئے ہے۔ اور مادر عباس جناب ام البنین کی جانب سے فریادی ماتم کی شکل ہے ملاحظہ ہو

نام بیوہ اب ہمارا ہوگیا
آج دسواں بھی تمہارا ہوگیا

مثنوی تاریخ وفات حضرت چہاردہ معصوم کی ادبی اہمیت سے قطع نظر یہ مثنوی محض اس غرض سے ہی لکھی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس بہانے سے چودہ معصومین کی وفات کی تاریخیں حفظ کر لیں۔ لہذا اس مثنوی کو مذہبی سے زیادہ تدریسی یا فنکلی مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ بقول علی جواد زیدی شاعر نے یہ مثنوی صرف اس لیے لکھی کہ پڑھنے والوں کو منظوم ہونے کی وجہ سے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ ایک مثنویوں کی قدر خاصی ہے جن میں عقیدہ، فقہ وغیرہ سے متعلق معلومات کو بحر و قافیہ کے سانچوں میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اعتقاد علی عابدی نے اس مثنوی کے ضمن میں خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ممکن ہے کسی سبب سے بعض محققین نے انھیں قابل اعتنا نہ سمجھا ہو۔ بہر حال یہ مثنوی ابتدا میں [illegible] کا تقیدی جائزہ اور تاریخی و تحقیقی حال قلم بند کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی خطوطی فرہنگ بھی ذیلی حاشیوں میں درج ہے۔ اس دریافت سے ایک نیا ادبی خزانہ سامنے آتا ہے جو ایک اہم مقام حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ ایک قادر الکلام مثنوی نگار بھی ہے جو جانا جا سکتا ہے کہ "بیاض" کے اس باب میں یہ تحقیقی کاوش اعتقاد علی عابدی کا یہ شاہکار ایک کارنامہ ہے اور یہ سے اچھی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی
سابق صدر شعبۂ اُردو و فارسی
(بمبئی یونی ورسٹی)

آفتابِ مرثیہ گوئی مرزا دبیرؔ کا نثری شاہکار

انگریزی زبان کے معروف انشائیہ نگار فرانسس بیکن (Francis Bacon)، (1561ء تا 1626ء) نے آج سے صدیوں پہلے کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں جو اصول وضع کیے تھے وہ زمان و مکان کی رفعت میں آج تک نہ گھٹے۔ اس دانشور نے کہا تھا کہ کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں صرف چکھا جاتا ہے جب کہ بعض ایسی ہیں جنھیں نگل لیا جاتا ہے، لیکن چند تصانیف اس قابل ہیں کہ انھیں چبا چبا کر ہضم بھی کر لیا جائے۔ یہ اور ذم برآوردہ ادبی نقاد، مذہبی پیشوا اور انشائیہ نویس جان رسکن (John Ruskin)، (1819ء تا 1900ء) کا قول ہے کہ مطالعے کے دوران ہمیں عام کتاب (A Book) کے بجائے مخصوص کتاب (The Book) ہی پڑھنا چاہیے، مخصوص کتاب سے اُس کی مراد صحف آسمانی، سیرت علماء و فضلاء اور اقوال حکماء و فلاسفہ ہے۔ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں نے کتابوں کی تقسیم نظم و نثر یا دیگر اصناف علوم کی بنیاد پر نہیں کی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر ہم آفتاب مرثیہ گوئی، مرزا سلامت علی دبیرؔ کو ایک مخصوص کتاب یا اَلکتاب کہہ کر پکاریں تو اسے شاعرانہ تعریف و تحسین یا "مدلل مداحی" ہرگز نہ سمجھنا چاہیے۔ آیئے ہم اس بلند مرتبہ مشہور نثری تصنیف کا کسی قدر باستیعاب مطالعہ کریں۔ تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ یہ مخصوص کتاب بہ اعتبار متن کن علمی و ادبی خصوصیات کی حامل ہے؟

"ابواب المصائب" اگرچہ مرزا دبیرؔ کی ایک نادر روزگار نثری تصنیف ہے لیکن اسے بالکل نئے اور سائنٹفک انداز ترتیب و تحشیہ کے ساتھ میرے محترم کرم فرما اور اردو کے محقق بے بدل جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی مقیم حال کینیڈا نے اپنے تفصیلی مقدمہ مع سوانح عمری مصنف اور عالمانہ تشریح مطالب کے ساتھ 2004ء میں بعنوان کلام دبیر جلد پنجم شائع فرمایا

ہے۔ ایک سو پچاس صفحات کو محیط سفید و روشن کاغذ پر بے عیب کمپوزنگ سے مزین اس نفیس علم و حکمت کی طباعت شاہد پبلی کیشنز نئی دہلی نے انجام دی ہے۔

اس تمہید سے بعد ہم اصل کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں

"الحمد للہ رب العالمین کے اعانت عنایت پروردگار اور تائید امام الابرار علیہم السلام سے ان سطور لطافت بخور کی تحریر سے انشراح حاصل ہوا۔ جب التماس اس بندہ خوان لوث بے سوادی اور ہیچ مدان دبستان بی استعدادی کا خدمت ارباب فصاحت و اصحاب بلاغت میں یہ ہے اگرچہ یہ مجموعہ پریشان مثل میرے نامہ عصیاں کے حرف قبول سے معرا اور جرائم بے شمار داشت وقیقہ شناسان معنی رس کے معاف انوار اغماض سے یہ ہے کہ جہاں جا بجا دفعہ خطا میں کارفرما ہیں بخدمے بزرگوار سے نشاط خواں اور تردد بے قیاس میں یہ تحریر تمام و بخجلت ما ناکام مدت بیست سنہ میں اس خوشخط نے یہ اوراق سفید سیاہ کیے ہیں اور اس زمانہ میں بھی شہ اسکاب و آب مجلس ہوا میں اور تحصیل سعادت ملازمت احبا میں حاضر اور موجود رہا ہے۔"

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مرزا یہ غیر روایتی طور پر ایک شاعر تھے نہ کہ نثر نگار، اردو کے رثائی ادب میں وہ بہت ہی بلند اور ممتاز مقام کے مالک تھے۔ ان کا مذہبی تلمذ اس پایہ کا تھا کہ سن سے موصوفین میں اندرونی دور ان کے ہم پلہ تھا تو وہ صرف اور صرف خدائے سخن میر ہی ہیں تھے۔ یہ زمانہ تھا کہ روایتی قسم کے تنگ نظر اور بسیار ناقدین ادب آئے دن میر انیس کے رقیب اور بدخواہ سمجھتے تھے لیکن جب میر کا ۱۸۷۴ء میں انتقال ہوا تو مرزا یہ نے ان کا قطعہ تاریخ وفات کہا

کہا جب دل نے کاش سدرہ ہے رحلت انیس
تو بولا ہے کلیم اللہ منبر ہے انیس

یہ ہے وہ مرزا یہ جسے بھائی مرزا غلام محمد نظیہ کا ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوا۔ چنانچہ میر انیس اور نظیہ دونوں کو بیک وقت یاد کرتے ہوئے مرزا یہ نے فرمایا تھا

وا دریغا، عینی و دینی دو باز و یم شکست
بے نظیر اول شدہ امسال، آخر بے انیس

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا دبیر نے جو آخری مرثیہ کہا وہ یوں تھا۔

انجیل مسیح لب شبیر ہیں، عباس

''مرزا دبیر یہ مرثیہ نظم کر رہے تھے کہ میر انیس کے انتقال کی خبر ملی۔ مرثیہ نا تمام چھوڑ دیا اور کہا کہ ''دبیر، یہ تیرا آخری مرثیہ ہے۔'' اور یہی نا تمام مرثیہ انھوں نے اپنی آخری مجلس میں ۲۵، ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ میں پڑھا تھا۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں تھا۔''

میر انیس و مرزا دبیر کے حوالے سے اوپر جو بعد ہائی معتقدانہ لکھے گئے وہ سب ربط اور مقصد نہ تھے۔ عرض یہ کرنا تھا کہ انیس کے ہم عصر مرزا دبیر جتنے بڑے نہ نگار تھے اتنے ہی اعلیٰ درجے کے شاعر اور نفیس انسان بھی تھے۔ ''ابواب المصائب'' کے اختتام پر جو قطعہ تاریخ کہا ہے اس سے ان کی قادر الکلامی اور مادہ تاریخ گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

اے زہے این کتاب حزن اثر — کہ مزین بنام آل عباست
در معانی و لفظ ہر ورقش — مخضر خون سید الشہداست
سطر سطرش بجلوۂ تاثیر — مدّ آہ جناب خیر نساء ست
ہست عاری عبارت از اغراق — چون الف ہست حرف حرف راست
در کتاب زمانہ این اوراق — یادگار دبیر بے سر و پاست
چون بہ لطف الٰہ گشت تمام — اے ہمیں لطف خضر منزل ماست
غور کردم بہ سال تالیفش — کہ ز آئین فرقۂ شعر است
ناگہاں فوج فوج آمدہ عقل — از چپ و راست داد مژدہ راست
گفت بامن کہ سال تاریخش
مصحف طاق چشم اہل عزاست (۱۲۴۵ھ)

''ابواب المصائب'' کا انتساب، بجا طور پر، عاشق دبیر، امیر بیر رایہ میوہ رام افتخار

الدولہ کے نام سے ہے جو مسلمان ہونے کے بعد آخر عمر میں رہا کے معلی تشریف لے گئے اور وہیں پیوند خاک شفاف بھی ہوئے۔ ان ہی افتخار الدولہ کے تعمیر کردہ عالی شان امام باڑے میں مرزا دبیر ہر سال اپنے نو تصنیف مراثی پڑھا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی ہی ہوئی یہ رباعی قابل ذکر ہے:

اس در پہ ہر ایک شادماں رہتا ہے
خنداں گل امید یہاں رہتا ہے
ہر فصل میں دست افتخار الدولہ
نیساں کی طرح گہر فشاں رہتا ہے[5]

کتاب مذکور کے مقدمہ میں فاضل مرتب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے قدرے تفصیل و ترشی کے ساتھ لکھا ہے:

"یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انیسویں صدی کا اس شاہکار تصنیف کو بعض کارکنوں کے خلاف میں پیٹ کر پہلے خود دبیر کے گھر والوں نے اور بعد میں غیروں نے اپنے ذاتی کتب خانوں کی الماریوں کے طاق نسیاں میں رکھ چھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے عوام تو ایک طرف خواص اور علمائے ادب سے بھی یہ اوجھل ہی رہا ہے۔ "ابواب المصائب" کو تصنیف ہوئے تقریباً (NIL) سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور اس کو طبع پہلی سے شائع ہوئے بھی تقریباً ۱۰۰ سال ہو چکے ہیں اور اس ایک سو اسی سال کی مدت میں اردو میں تحقیق و تنقید کی کتابیں اردو شعر و ادب پر لکھی گئیں لیکن اس کتابوں میں اس کا تذکرہ و تجزیہ تو درکنار بات تو یہ ہے کہ اس کا نام تک نظر نہیں آتا۔ اردو مرثیہ کی تاریخ میں اس کے ارتقا کی چشم دید گواہ صرف چند تصانیف اور تالیفات ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے تذکرے کی قلت کتاب سے ہوئی ہے کہ اس میں اس کی تصنیف سے چشم پوشی شریعت ادب میں ناممکن قرار دیا جا سکتی ہے۔ اب کہ اغلب دیگر تصانیف اور تذکروں میں کی تصنیف اور مجموعی کتابوں سے نادر نسخوں اور اق

سیاہ کیے گئے ہیں۔ یہ بھی تعجب کا مقام ہے کہ میر ضمیر کی پہلی سوانح
"شمس الضحیٰ" جو فوری میں ہے (اور جس کا ترجمہ راقم نے تقریباً تکمیل
کر لیا ہے) اس کتاب کے ذکر سے یکسر خالی ہے۔"

اب آیئے نہایت اختصار کے ساتھ ان مستند حضرات کا ذکر کریں جنھوں نے
"ابواب المصائب" کے ضمن میں اپنی معلومات اور آرا پیش کی ہیں

(۱) افضل حسین ثابت تلمیذ ضمیر اپنی کتاب "حیات ضمیر" میں لکھتے ہیں

"ایک اردو نثر کی کتاب مصائب میں، مطبع یوسفی میں چھپی ہے جس کا نام
"ابواب المصائب" ہے۔ جناب مرزا حج صاحب قبلہ سے بر سبیل
تذکرہ معلوم ہوا کہ اس کا اصل مسودہ مرزا صاحب کے کتب خانہ میں
موجود ہے۔ میرے کرم فرما سید صغیر حسین صاحب شمس، مالک مطبع یوسفی
دہلی و منیجر اخبار "اثنا عشری" دہلی کی شفقت توجہ و مہربانی سے یہ کتاب مجھے
پہنچی۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے
عہد میں یہ کتاب مرزا صاحب نے لکھی۔ حضرت یوسف کے واقعات جو
بجا لکھ کر حالات امام حسین کا پیوند لگایا ہے۔ باوصف کہ اب سے اسی
(80)، پچاسی (۸۵) سال پہلے کی تصنیف ہے مگر زبان سلیس ہے۔
عبارت میں اس زمانہ کی روش کے موافق فارسی عربی کے الفاظ بہت ہیں مگر
عبارت کو خواہ مخواہ معقد نہیں بنایا ہے اس لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔"

(۲) ڈاکٹر آبد حیدری ضمیری کا بیان

"راقم الحروف کو ضمیر کی ایک نثری تصنیف موسوم بہ "ابواب المصائب"
دستیاب ہوئی۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اب عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ "ابواب
المصائب" مرزا ضمیر نے عین عالم جوانی میں بعمر ۲۷ سال ۱۲۴۵ ہجری میں
تصنیف فرمائی۔ "ابواب المصائب" رجب علی بیگ سرور متوفی ۱۲۸۴
ہجری نے "فسانۂ عجائب" (سال تصنیف ۱۲۴۰ ہجری) کے بعد دبستان
لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ اس کی زبان سادہ اور سہل ہے اور

اس میں "فسانۂ عجائب" جیسی پُرتصنع، مقفّیٰ اور مسجع عبارت نہیں ہے۔"

(۳) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کی رائے

"دبیر نے اردو نثر میں ایک مستقل تصنیف "ابواب المصائب" یادگار چھوڑی ہے، جو کئی اعتبار سے اردو نثر کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے اور لکھنؤ کے نثری لٹریچر سے مطالعہ میں نادر چیز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب اردو نثر کی ہے گفتوں اور ناقدوں کی نظروں سے اوجھل تھی کیوں کہ اردو نثر کی تاریخ سے اہلِ دور کے بیان میں "ابواب المصائب" کا ذکر نہیں ملتا۔"

(۴) صاحب دبستانِ دبیر، ڈاکٹر نثار حسین فاروقی مرحوم رقمطراز ہیں

"مرزا صاحب نے اس کتاب کی تاریخ بھی خود ہی نکالی تھی۔

ع "تحفہ طاق چشم اہلِ عزا است" (۱۲۴۵ ہجری)۔ یہ کتاب (۱۷۸) صفحات پر شائع ہوئی تھی اور اردو نثر کی ابتدائی کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب نثر کی اس طریقے سے تعلق رکھتی ہے جسے "نثر خوانی" کہتے ہیں۔ نثر خوانی کے دستور کے مطابق جا بجا اشعار بھی چسپاں کیے گئے ہیں۔"

"ابواب المصائب" کی متنی تنقید

جناب مرزا سلامت علی دبیر، باعث تالیف اور سبب تصنیف "باب المصائب" کا حسب ذیل الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"تائید غیبی اور بالہام ربانی بندۂ حقیر، حیثیت اقلی دبیر کا یہ عزم باجزم ہوا کہ ترجمہ سورۂ یوسف کا مشتمل بمصائب جناب سید الشہداء علیہ التحیۃ والثناء بطریق تازہ اور بہ حسن و انداز روانی تحریر معجز اور حدیث "تعلموا سورۂ یوسف" جناب ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام سے متداول اشخاص زبان زد خلق میں رہے۔

نظم

حق تعالیٰ سے مجھ کو ہے امید
یہ کتاب عزا رہے جاوید
روئیں پڑھ پڑھ کے اس کو تعزیہ دار
کریں فقروں پہ دُرِ اشک نثار
آفریں شاہ خوش نہاد کریں
ہر ورق پر حسینؑ صاد کریں

برادران مومنین و شیعان ائمہ معصومین علیہم السلام پر واضح ہو کہ بندہ کی تالیف اس کتاب ''ابواب المصائب'' کی مقرر کی کیفیت نزول سورۂ یوسف علیہ السلام پر اور مطابقت مصائب یوسف آل عبا کی جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ الثناء و اہلبیت رسول خدا پر اور مصائب حسین ابن علی علیہ السلام چنانچہ تمہ کیفیت سورہ مسطور (علحدہ) مشتمل کی گئی شش باب میں۔''

اس مقام پر میرا مقصد اصلی یہ نہیں کہ حضرت نبیؑ کے ترتیب دادہ جملہ ابواب و فصول کا تفصیلی ذکر کروں لیکن اتنا ضرور ہوں گا کہ قرآن کریم میں موجود سورۂ یوسف کے حوالے سے واقعات کربلا پر روشنی ڈالنا کوئی نئی بات نہیں۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے اپنی مشہور زمانہ نثری تصنیف ''روضۃ الشہداء'' ہرات کے ایک شہزادے سید مرزا کی فرمائش پر ۹۰۸ ہجری میں تخلیق کی تھی۔ اس کتاب کے پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ سورہ یوسف کے نزول اور حضرت یوسف کے قصہ کو بیان کیا گیا ہے، لیکن بقیہ ۹ ابواب میں یہ ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس ''ابواب المصائب'' کے تمام چھ حصوں میں حضرت یوسف کے واقعہ کو بیان کرکے واقعاتی مناظرہ کیا گیا ہے۔ ایک اہم بات یہ کہ باوجودیکہ مرزا صاحب کثیر المطالعہ تھے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''ابواب المصائب'' ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ یا تفسیر ہے۔

بعینہٖ فضل علی فضل کی ''کربل کتھا'' (سال تصنیف ۱۱۴۵ ہجری) بھی مرزا صاحب

کے پیش نظر رہی ہوں، مگر ہم زبان، بیان اور مواد و ترتیب کسی بھی لحاظ سے "ابواب المصائب" کو خدانخواستہ "کربل کتھا" کا چربہ یا نقل نہیں کہہ سکتے۔ "کربل کتھا" اور "روضۃ الشہداء" نے ایران کے مذہبی شعرا محتشم کاشی اور قبل کے اشعار سے استفادہ کیا ہے جب کہ مرزا صاحب نے "ابواب المصائب" میں تقریباً پانچ سو سے زیادہ خود اپنے کہے ہوئے اشعار استعمال کیے ہیں۔

"کربل کتھا"، "روضۃ الشہداء" اور "باب المصائب" میں چند مطالب مشترک ہیں۔

1. ان سب کا موضوع شہدائے کربلا کے واقعات کا بیان ہے۔
2. تینوں میں کم و بیش حضرت یوسف کا تذکرہ اور باب المصائب کربلا ہے۔
3. تینوں کتابوں میں آیات قرآنی، احادیث نبوی اور تاریخی روایات کا بیان ہے۔
4. نثر کے ساتھ نظم بھی شامل ہے "کربل کتھا" اور "روضۃ شہداء" میں "ابواب المصائب" کے برخلاف نظموں میں طوالت پائی جاتی ہے۔
5. "ابواب المصائب" میں معتبر روایات زیادہ ہیں جب کہ "کربل کتھا" اور "روضۃ الشہداء" میں ضعیف روایات اور واقعات بھی شامل ہیں۔

آخر کلام میں بطور نمونہ ہم "ابواب المصائب" کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام اس مقدس مجموعہ میں دلکش اسلوب تحریر اور مرزا دبیر کے عالمانہ انداز نگارش سے کسی قدر آشنا ہو جائیں

"راویان اخبار بیان کرتے ہیں کہ یعقوب کے بارہ فرزند تھے۔ ان یوسف کو سب فرزندوں میں زیادہ محبت رکھتے تھے اور کثرت محبت و تربیت ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی اسی وجہ سے رشک حسد برادران یوسف پر غلبہ پائے ہوئے تھا ایک روز جبریل امین یہ فرمان لے کر امین بہشت بریں سے حضرت یعقوب کے پاس جدا جدا پیغام لے گئے کہ وہ حضرت یوسف کو خوبی سے خوب تر مشغول رکھتے اس حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو برادران یوسف کو زیادہ تر حسد ہوا اور یہ سبب رشک یہ تھا کہ حضرت یعقوب نے ایک چیز اس حضرت

خلیل سے میراث میں پہنچی تھا اور وہ پیراہن وہ تھا کہ حق تعالیٰ نے جامہ غیب سے خلیل کو درمیان آتش عنایت فرمایا تھا کہ بہ سبب اس پیراہن کے شعلہ آتش غنچہ و گل ہو گئے تھے وہ پیراہن بھی حضرت یعقوب نے یوسف کو عنایت کیا اور سر اس شہر یار خوبی کا عمامہ خلیل سے آراستہ کیا۔ جب حضرت یوسف نے اس لباس کو پہنا ایک روز اپنے باپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا ابتاہ! اس شب کو میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آفتاب و مہتاب اور گیارہ ستارے اترے اور مجھے سجدہ کیا۔ یعقوب نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمہیں نبوت اور سلطنت ہوگی۔ جب حضرت یوسف کے بھائیوں نے یہ سنا نہایت رنج ہوا اور باہم مشورہ کیا کہ یوسف کو کسی تدبیر سے جدا کیجئے اور مطابق من حفر بئرا لاخیہ عمل کیا اور اعدائے نافرجام اہل کوفہ و شام نے اس سے زیادہ امام حسین پر جفا کی باوجود اس کے کہ جناب رسول خدا نے وقت رحلت امت سے سفارش اہلبیت کی تھی اور فرمایا تھا۔

هٰذا کتابِ اللهِ و اهل بیتی لَا یفرق منها حتی یَرِدَ اِلی الحوض.

(یعنی یہ کتاب خدا کی اور یہ ہیں اہل بیت میرے جدا نہ ہوں گے یہ جدا یہاں تک کہ پہنچیں گے میرے پاس حوض پر)

قرآن سے ہمیں مری عترت سے خبردار
ہے ان کی اطاعت سبب رحمت غفار

•••

عرفان الٰہی کی نشانی ہیں یہ دونوں
باہم صفت لفظ و معانی ہیں یہ دونوں

•••

پرزے مرا دل ہوگا جو قرآن کو مٹایا
تڑپے گی مری روح جو عترت کو ستایا

ہیں آل نبی کون، سنو دل سے یہ تقریر
زہراؑ ہے، ید اللہ ہے اور شیرؑ و شبیرؑ

•••

واللہ جو ان پر کوئی بیداد کرے گا
خالق سے نبیؐ حشر میں فریاد کرے گا

مختصر یہ کہ حضرت میر انیس کا یہ نوحہ شاہکار "ابواب المصائب" بلند اخلاق، عقیدہ سے خصوصی التفات، توجہ کا طالب ہے۔ شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی،

حواشی -

۱ "خاتمہ ابواب المصائب" ص:168

۲ یہ مکمل قطعہ مرزا دبیر کی کتاب "مصحف فاطمی" مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی میں موجود ہے۔

۳ "ابواب المصائب" (مرزا دبیر کا زندگی نامہ) ص 27

۴ "ابواب المصائب" ص 47

۵ "ابواب المصائب" ص:11

۶ "ابواب المصائب" ص 33

۷ "فضل حسین قابل بیات دبیر"

۸ ڈاکٹر ابو حیدری شمیمی "شاعر عظیم مرزا سلامت علی دبیر اور باقیات دبیر"

۹ ڈاکٹر محمد زمان آزردہ "مرزا سلامت علی دبیر"

۱۰ ڈاکٹر سید حسین فاروقی "دبیر مغفل دبیر نمبر" (1936ء) "ابواب المصائب" کی تدوین میں دبیر کا حصہ

۱۱ "ابواب المصائب" (مصنفہ مرزا دبیر)، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص:51-52

ڈاکٹر معصوم شرقی

مجتہدِ نظم مرزا دبیر

اردو ادب کی تاریخ میں تمام مرثیہ گو شاعرات میں روپ مہاری کا نام سرفہرست ہے۔ ایک غیر مسلم خاتون ہونے کے باوجود سیرت رسولؐ، سردار حق، عصمت فاطمہؑ اور قربانی حسینؑ سے وہ بے حد متاثر تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع انہی ذوات مقدسہ کو بنایا۔ روپ نے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ (روپ کا انتقال 1938ء سے قبل ہو چکا تھا) ان کا شجرۂ تلمذ میر انیس سے جا ملتا ہے۔ رثائی ادب میں روپ کا مقام بہت اہم ہے۔ ان کے حالات اور کلام پردۂ خفا میں تھے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دیارِ غیر (کینیڈا) میں رہ کر روپ مہاری کے حالات اور کلام کو یکجا کر کے ایک ضخیم تحقیقی کتاب ''روپ کنوار مہاری'' (مطبوعہ پاکستان) تصنیف کر کے اردو شاعری خصوصاً رثائی ادب پر احسان کیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی اب تک بارہ کتابیں اردو حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں جن میں ''قبا کے عرفانی راہیے'' (2001ء)، ''انشاء اللہ خان انشاء'' (2001ء)، ''تجزیہ یادگار انیس'' (2002ء) اور ''سلسلہ سلام دبیر'' (2004ء) قابل ذکر ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''مجتہد نظم مرزا دبیر'' شناسی میں ایک اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہے۔ انیس پرستی نے ایک عرصے تک دبیر کو دھندلکوں میں گم رکھا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ شخصی عقیدت مندی کا غلغلہ ختم ہوا اور ادبی قدر و قیمت کے تعین کا عمل شروع ہوا۔ اس طرح اردو کی فراموش کردہ ادبی شخصیتوں کے ادبی مرتبے کو متعین کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یگانہ کا ادبی مقام متعین کیا گیا۔ دبیر کے متعلق غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ازالہ ہوا اور ان کے فنی اور ادبی کمالات نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر

آبِ حیدری، ڈاکٹر کاظم علی خان اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دبیر کے سلسلے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ لائق ستائش ہیں۔

پیش نظر کتاب میں شجرۂ مرزا دبیر سے علاوہ پابندیٔ وقت، آداب محفل، اخلاق و کردار، قناعت، خودداری، حریت، اصلاح اور دبیر کے حالات زندگی و ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے اہتمام سے قلم بند کیا ہے۔ دبیر نے شعر گوئی کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ سوانحی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے غزل سے تین دیوان مکمل کر لیے تھے۔ اس دیوان میں پچیس غزلیں بھی شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں دبیر کے مرثیوں کی تعداد ستر ہزار بتائی ہے۔ دبیر کے محققین نے مطبوعہ مراثی کی تعداد 388 بتائی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کی روشنی میں مطبوعہ مراثی کی تعداد 391 اور غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد 286، کل موجود مراثی دبیر کی تعداد 675 اور سلاموں کی تعداد 133 ہے۔ مرزا دبیر نے دو میں سے زیادہ غیر مخطوط اشعار کہے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد 557 اور غیر مخطوط رباعیات کی مجموعی تعداد 1332 ہے۔ "مقام دبیر مشاہیر سخن و ادب کی نظر میں" کے تحت فاضل محقق نے غالب، ذکی، سحر، انیس، امیر خسرو، رجب علی بیگ سرور، واجد علی شاہ، محمد حسین آزاد، بیلی نعمانی، تراب علی، میر حیدری، نگار سجاد حیدر اور گوپی چند نارنگ سے علاوہ دیگر اکابرین ادب کی آرا کو شامل کتاب کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں انتخاب کلام بھی شامل ہے۔ تشبیہات و استعارات کی ندرت، نادر ردیفوں کی تلاش اور زبان و بیان کی قدرت کاملہ مرزا دبیر کے شعری رویے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ بعض ناقدین نے لفظ و بیان کی خامی قرار دیا ہے جن انھوں نے نرم اور لطیف زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔ دبیر کے مرثیوں میں محاورہ کا برجستہ استعمال ہوا ہے۔ جن سے محاورہ کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ جزئیات نگاری کے معاملے میں دبیر کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے۔ صنائع و بدائع کا بر محل استعمال ہے۔ اس کی پیش کش دبیر کے مراثی میں خوب صورت انداز میں ہوئی ہے۔ میدان جنگ کی منظر کشی میں مرزا دبیر مختلف صنائع و بدائع مثلاً مبالغہ، مراعات النظیر، حسن تعلیل، تضاد، الف، تشبیہ سے کام لیتے ہیں۔ صنعت تضاد سے واقف دبیر کے کلام میں ملتے ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو

یہ سن کے چیختی ہوئی دوڑی وہ یک بیک
اٹھے پہ یوں گری کہ مرنے لگے فلک

• • •

کچھ پاس تھا نہ صدقے کو رونی بک بک
ماتھے سے سر ملا کے اُتارا قدم تلک

• • •

اکبر نے خط میں پوچھا یہ ہوں اے امام جی
بانو پکاری، کوکھ جلی جس کا نام ہے

ڈاکٹر تقی عابدی میدان طب کے ساتھ میدان تحقیق کے بھی شہسوار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سائنسی فکر اور سائنسی طریقہ استدلال و تحقیق کے شعبے میں بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ رثائی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ خوب صورت گیٹ اپ، عمدہ طباعت اور نفیس کاغذ پر 400 صفحات کی اس مجلد کتاب کی قیمت 195 روپے ہے جسے بقائی پبلشرز، اردو بازار، لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

توصیف احمد ڈار
شعبۂ اُردو، کشمیر یونیورسٹی

''عروسِ سخن'' کے خصوصی حوالے سے

سید تقی عابدی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات ''عروسِ سخن'' کے خصوصی حوالے سے انسانی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اور انسانی زندگی کے تقاضے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانہ اپنی ایک الگ اور منفرد منطق کا حامل ہوتا ہے۔ یہی منطق اس مخصوص عہد کے مذہب، تہذیب کے طور پر سامنے آتی ہے اور یہ شعبہ زندگی و متاثر کرتی ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کو ایک طرف چھوڑ کر اگر ہم ادبی دنیا، بالخصوص اردو کی ادبی روایت کی بات کریں تو یہاں بھی تغیر و تبدل کا یہ عمل ہر دور میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں تحقیق و تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تذکرہ نگار اپنی بساط کے مطابق شعرا و ادبا کے حالات و واقعات اور ان کے کلام پر اپنی تنقیدی رائے ظاہر کرتا تھا۔ یہ تذکرہ نگار باقاعدہ طور پر کسی تحقیقی و تنقیدی ضوابط کے پابند نہیں تھے بلکہ آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان تذکروں اور تذکرہ نگاروں کی اس آزادہ روی کو بڑے بڑے محققین ادب نے ہدفِ تنقید بنایا ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلمہ معنویت کی حامل ہے کہ یہ تذکرے اردو تحقیق و تنقید کی راہ ہموار کرنے میں اپنا ناقابلِ فراموش کردار رکھتے ہیں۔ کئی صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد آج اردو ادب میں تحقیق و تنقید ایک کامل اور باقاعدہ علوم کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ محقق و نقاد آج اپنی ایک نمایاں اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ جدید سے جدید تر ذرائع اور وسائل سے سہارے آج تحقیق و تنقید ترقی کی جن منزلوں سے ہمکنار ہوئی نظر آتی ہے اور دنیا یہ تسلیم کر چکی ہے کہ تحقیق و تنقید، تخلیقی ادب سے اتنی ہی نزدیک ہے جتنی زندہ رہنے کے لیے سانس۔ ترقی سے ان تمام

رفتار دور میں نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بہت سارے نام ایسے ہیں جو اردو تحقیق و تنقید کے میدان میں سرگرم عمل ہو کر نہایت عرق ریزی سے اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ جن کی لازوال ادبی خدمات معاصر ادبی روایت کا ایک وقیع اور ناقابل فراموش سرمایہ کا اعتبار رکھتی ہیں۔ ان ہی غیر معمولی اور مستند علمی و ادبی شخصیات میں ایک اہم نام ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار اردو دنیا کے سرفہرست قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ آپ بیک وقت کئی ایک زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ و مشاہدہ کافی گہرا اور وسیع ہے۔ آپ نے اردو اور فارسی کی کلاسیکی ادبی روایت کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کے اعلیٰ تخلیق کاروں سے متعلق جو تحقیقی و تنقیدی کارنامات اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں وہ اُن کی عالمیت، سنجیدگی اور فکری و فنی بالیدگی پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کی جو تحقیقی و تنقیدی نگارشات اب تک شائع ہو کر ادبی دنیا میں مقبول و معتبر ہو چکی ہیں ان میں ''نیفق شناسی''، ''دیوان رباعیات انیس''، ''کلیات غلام فاروق'' (جلد اول و دوم)، ''تجزیہ یادگار مرثیہ''، ''کائنات نجم'' (جلد اول و دوم)، ''مثنویات دبیر''، ''تاثیر حاتم''، ''عروس سخن''، ''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''رموز شاعری''، ''انشاء اللہ خان انشاء''، ''رباعیات دبیر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تخلیقات کے علاوہ ان کے متنوع تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے مقالات اور مضامین ملک و بیرون ملک سے معیاری ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں، جن کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ جس کسی بھی موضوع سے متعلق قلم اٹھاتے ہیں اس کا بھرپور حق ادا کرتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان اور انداز پیش کش قدرے دلکش اور متاثر کن ہیں۔ عام طور پر سہل و آسان زبان کا ہی استعمال کرتے ہیں جس سے آپ کی تحریریں قابل فہم اور متاثر کن ثابت ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں، جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے، تقی عابدی صاحب کی تحقیق و تنقید نگاری سے متعلق ''عروس سخن'' کے حوالے سے مختصر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ تحقیقی و تنقیدی تصنیف چوں کہ کم و بیش پچپن مقالات پر مشتمل ہے اس لیے طوالت کے خوف کو ملحوظ رکھتے ہوئے محض چند منتخبہ مقالات کو ہی زیر بحث لایا جائے گا۔ شعر و ادب کی دنیا میں امیر خسرو کا نام

محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ ایک جید عالم، با کمال شاعر اور باکمال ادیب گزرے ہیں۔
آپ بیک وقت اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ امیر خسرو کی حیات و شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں کے حوالے سے محققین، ناقدین ادب نے ہر دور میں بعض اہم اور متنوع گوشوں کو اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے، جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ ''عروس سخن'' میں شامل شاعت اوین تحقیقی مقالہ بعنوان ''امیر خسرو دہلوی'' بھی اسی تحقیقی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے تحقیق کے اصول و ضوابط کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے موصوف کی پیدائش، خاندانی حسب و نسب، سلاطین سے وابستگی، القاب و خطابات، وفات اور ان کی تخلیقات وغیرہ جیسے نکات پر مفصل و مدلل انداز میں بحث کی ہے۔ یوں یہ تحقیقی مقالہ خسرو شناسی کے میدان میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو کی منظوم اصناف میں نعت نگاری ایک باقاعدہ اور مستقل صنف سخن کے طور پر اپنا مقام حاصل کر چکی ہے۔ نعتیہ کلام میں نعت نگار کے مذہبی کائنات کی تعریف و تحسین، عقائد و اعمال، عظمت و فضیلت اور کرامات و معجزات وغیرہ جیسے اوصاف و نہایت عجز و انکساری کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی شعری روایت کے بغور مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے وابستہ بیشتر شعراء نے بھی حضورؐ کے فضائل و شمائل، دیدار محمدؐ کے دیدار اور آپ کے روضہ کو بوسہ کرنے میں مال فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے اور اس زمین میں بڑی رنگین کل کاریاں کی ہیں۔ نعت نگاری کے علاوہ دیگر اصناف شعر میں بھی شعراء نے احترام و عقیدت کے طور پر بے شمار اشعار تخلیق کیے ہیں جن سے نبی اکرمؐ کی فضیلت و عظمت کے دریچے کھلتے ہیں۔ ''فضائل و شمائل محمدؐ اردو شعراء کے آئینے میں'' کے عنوان سے کتاب میں شامل مقالے میں مصنف نے مذکورہ شعراء کے یہاں اس نوع کے موضوعات کی نشاندہی کر کے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اس مقالے کی اہمیت و معنویت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ محقق نے چار سو سال کی اردو شعری روایت کو کھنگال کر تقریباً سو شعراء کے کلام سے نعتیہ اشعار کا انتخاب کیا ہے، جو اس فن کے موضوعات و محیط ہیں۔ ان میں خلیق دہلوی، بیدار، آگاہ حسن بریلوی وغیرہ

ناخ، اکبر میرٹھی، میر حسن حالی، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، جوش وغیرہ جیسے مسلم وغیر مسلم شعراء شامل ہیں۔ چند ایک اشعار مثال کے لیے پیش کیے جاتے ہیں ؎

خداوند دو عالم، سنہ تیرا مداح، قرآن میں
تری تعریف ملتے کی، کہاں طاقت ہے انسان میں (یزدانی)

•••

نبی کریمؐ، شفیع امیں
رسول خدا رحمت العالمینؐ (صفقی)

•••

ورفعنا لک ذکرک پر تصدیق
سب اونچوں سے اونچی ہے، شہادت تری (حسن بریلوی)

اس مقالے میں محقق نے نعتیہ کلام کے تاریخی، عقیدت و احترام کا پاس و لحاظ، شریعت کے حدود وغیرہ جیسے نازک پہلوؤں سے متعلق بھی روشنی ڈالی ہے جو مقالے کی اہمیت اور مصنف کے تحقیقی، تنقیدی استدلال کو مزید تقویت عطا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال اردو کی شعری روایت میں ایک زندہ و جاوداں نام ہیں۔ آپ کا تمام کلام عالم انسانیت بالخصوص امت مسلمہ کی فکری تعمیر کے حوالے سے ایک بے مثل کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنے کلام (خواہ وہ فارسی ہو کہ اردو) کے ذریعے تاریخ، تعلیمات اسلام، پیغمبر ان اسلام کی جاہ و حشمت، مراحب رسولؐ کی عظمت و فضیلت کو آشکار کر کے امت مسلمہ کو غفلت شعاری سے بیدار کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ حضرت علیؓ کی مدح میں کلام اقبال میں جو کئی ایک نظمیں اور مناجات موجود ہیں انھیں یکجا کر کے مصنف کتاب نے "اقبال اور عشق علیؓ" کے عنوان کے تحت ایک تحقیقی مقالے کی صورت عطا کی ہے۔ اس مقالے میں علامہ کی جن اردو و فارسی نظموں کو زیر بحث لایا گیا ہے ان میں طلوع اسلام، اسرار و رموز خودی، جاوید نامہ، میں اور تو وغیرہ شامل ہیں۔ موصوف نے اپنے منفرد تحقیقی و تنقیدی زاویہ نگاہ کو بروئے کار لا کر مذکورہ بالا نظموں کے نمائندہ اشعار کے حوالے سے اقبال کی حضرت علیؓ سے والہانہ عقیدت اور عشق و احترام کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ دراصل مصنف قارئین کو یہ باور

سنانا چاہتے ہیں کہ علامہ نے کس طرح ایک جامع اور انوکھے اسلوب میں حضرت علی کے متعدد نام، کنیات، خطبات، القاب اور فضیلتوں وغیرہ کی تشریح کر کے ملت اسلامیہ کو دعوت فکر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

کہ ہر دانائے رموز زندگی ہست
ہر اسمائے علی داند کہ چیست

(یعنی یہ کہ اس شخص نے زندگی کے تمام رازوں کو پہچان لیا ہے جس نے حضرت علی کے ناموں کے سبب اور راز کو جان لیا)

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے" کے تحت کتاب میں جو مقالہ شامل اشاعت ہے اس میں اردو و فارسی زبان کے بلند قامت شاعر "مرزا اسد اللہ خاں غالب" کی شخصیت کے بعض اہم اور اچھوتے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غالب کی پیدائش سے لے کر تا دم آخر تک کے ایسے واقعات کو اس تحقیقی مقالے کی زینت بنایا گیا ہے جن سے اہل دنیا آج تک نابلد ہی تھی۔ خصوصاً غالب کی منفرد شخصیت کے حوالے سے جو نکات ابھارے گئے ہیں وہ موصوف کی تحقیقی صلاحیتوں اور بصیرتوں کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کتاب جہاں مرزا غالب فہمی کے سلسلے میں ایک کارآمد اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کی حیات کے مطالعے اور مشاہدے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی سے ہر شعبے میں اپنی ایک الگ اور منفرد راہ قائم رکھتے تھے۔ آپ کا مزاج، انداز افتخار، عادات و اطوار، رہن سہن یہاں تک کہ تخلیقی و تنقیدی فکر و اسلوب بھی اپنے معاصرین سے قدرے مختلف و ممیز رہے ہیں۔ خودداری و خود پسندی کی خداداد صلاحیتیں آپ کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی بیحد جھلکیاں آپ کے منثور و منظوم کلام میں جا بجا دیکھی جا سکتی ہیں۔ غالب کی خودداری اور انفرادی ذہنیت کو پیش کرتے ہوئے سید تقی عابدی لکھتے ہیں کہ

"اردو ادب کے چار عظیم شعراء میں میر تقی میر، میر انیس اور علامہ اقبال نے اپنے اپنے دور میں اپنا لوہا منوایا اور اپنے ابتدائی دور میں ان سے فیض حاصل کیا۔ لیکن مرزا غالب وہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے کسی شاعر

کی حیثیت سے، کسی کے سامنے اپنا زانوئے تلمذ نہیں کیا۔ علماء ادب اور محققین ادب نے اشارات کیے ہیں کہ مرزا غالب بعض اوقات علوم عربی، قواعد و نحو میں مصطفیٰ خان شیفتہ سے مشاورت کرتے تھے، لیکن بہر حال، کسی کے بھی شاگرد نہ رہے۔"

موصوف کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا قابل ذکر نمونہ کتاب میں شامل مقالہ "دیوان حافظ کے تراجم" ہے۔ اس مقالے سے قبل موضوع سے قبل مصنف نے ایک نہایت ہی اہم اور غور طلب مسئلے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ "کیا دیوان حافظ کے ترجموں کی ضرورت ہے؟" اور آسان و مفصل انداز میں اس دیوان کے ترجمے اور ان سے مستفید ہونے کی اشد ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ نیز ترجمے کے اسرار و رموز، اہمیت و ضرورت، مترجم کے فرائض، الفاظ کی ورے اور اصطلاح سازی میں درپیش مسائل و معاملات اور ان کے معقول و موزوں حل وغیرہ کے حوالے سے بھی دلچسپ و قابل مطالعہ بحث پیش کی گئی ہے۔ مثال کے لیے یہ مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے

> "ترجموں کی بدولت ایک تہذیب اپنے شاہکار دوسرے تمدن سے آشنا کراتی ہے، یعنی اگر چار سو سال قبل حافظ کا دیوان کا یورپ کی زبانوں میں ترجمہ نہ ہوتا تو آج مغربی دنیا میں حافظ کا نام بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ کھلی حقیقت ہے اور ہم سب کا مشاہدہ بھی کہ امریکہ کے کسی محلے کی لائبریری ایسی نہیں، جس میں حافظ کا کلام یا اس کے کلام پر پیام موجود نہ ہو۔"

اس مقالے میں محقق نے دنیا کی مختلف زبانوں میں (جن میں عربی، ترکی، فارسی، فرنچ، جرمن، انگلش، اٹالین وغیرہ شامل ہیں) "دیوان حافظ" کے منظوم و منثور تراجم اور شرحوں کی نشاندہی کرکے ان کی مقبولیت و غیر مقبولیت کے اسباب و وجوہات کو مثالوں کے سہارے ثابت کیا ہے۔ یہ استدلالی موقف آپ کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں پر دال ہے۔

اردو ادب کی شعری اصناف میں رباعی ایک مختصر مگر مقبول صنف کے بطور اپنی پہچان قائم کر چکی ہے۔ دیگر کئی شعری اصناف کی طرح یہ صنف سخن بھی اردو میں فارسی ادب ہی کی دین ہے۔ اردو ادب کے کم و بیش ہر بڑے شاعر نے اس صنف کو اپنے داخلی اور خارجی

جذبات و احساس کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ مذکورہ کتاب میں شامل مقالہ بعنوان "رثائی رباعی اردو رباعی کا تاریخی، عروضی اور تحقیقی جائزہ" میں مصنف نے اردو رباعی کی ہیئتی و تکنیکی ترجیحات، موضوعاتی تنوع، عروضی قواعد اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے کے ساتھ ساتھ اردو رباعی سے ایک اہم قدری رجحان "رثائی رباعیات" کو مناسب تحقیقی و تنقیدی انداز میں سامنے لایا ہے۔ کی ایک دستاویزی تحقیقات کی وساطت سے مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ رثائی رباعی اصل میں "مراثیوں" کی ایجاد ہے جو بعد میں فارسی سے عربی اور اردو میں منتقل ہوئی۔ اصل موضوع کے تحت محمد قلی قطب شاہ، سید وجہی، سراج دکنی سے لے کر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی تک کے نمائندہ شعراء کے یہاں موجود رثائی رباعیات کو مختلف قرطاس پر تاریخی، تحقیقی و تنقیدی مواد سے میں قابل قدر اضافہ کیا گیا ہے۔

"شاعر" کی تمیز" نامی کتاب میں شامل مقالہ بھی نوعیت کا ایک نوعی اور منفرد تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس میں سے مقالات اردو کے تحقیقی و تنقیدی سرمایے میں نہایت مستحسن قدم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اردو ادب بالخصوص اردو شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے اہل علم و قارئین کے لیے یہ مقالہ نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کی ابتدا میں قلم کار نے "شاعر" کی تعریف و تشریح کے ساتھ ساتھ اس موضوع سے متعلق خامہ فرسائی کی ہے اور مختلف مستند تحقیقات، تالیفات سے خود اخذ کردہ حل طلب سوالات کے مدلل اور تسلی بخش جوابات پیش کیے ہیں۔ شاعر کی تعریف اور اس کی خصوصیات کے حوالے سے آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ یوں ہیں

> "شعر سے معنی مراد لینا اور شعر سے معنی دریافت کرنا ہے، اور معنی میں شعر ایسے کہتے ہیں جو اول موزوں ہو، دوم معنی رکھتا ہو، سوم قافیہ رکھتا ہو، چہارم شعر یہ موزوں کام سے قصد و ارادے سے کہا ہو"

شاعر کی تعریف اور بنیادی خصوصیات سے متعلق تفصیلی گفتگو کے بعد مذکورہ مقالہ میں شعر کی [illegible] پر تاریخ ڈالی گئی ہے۔ پہلے عالمی [illegible]

وابستہ شعراء کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں اور پھر "ادب مشرقیہ" خصوصی طور پر اردو ادب کے حوالے سے شعراء کی مزید تقسیم پیش کی گئی ہے۔ جن بنیادی پہلوؤں اور عناصر کو بنیاد بنا کر شعراء کی تقسیم عمل میں لائی گئی ہے ان میں زبان، منطقہ، جنسیت، عمر، موضوعات، اصناف، زمان، محل اور مکان، نئی ریاضت، مہارت اور مشق، عدد، سرحدی، علم اور خیال، شعرا کا کلام، مذہبی اعتقادات، انداز بیان، عروض کے استعمال اور اجتناب، غیرہ شامل ہیں۔ عروض کے استعمال و اجتناب کے اعتبار سے موصوف شعرا کو درج ذیل تین زمروں میں تقسیم کرتے ہیں:

"شعرا کو عروض کے استعمال اور اجتناب کی نسبت سے عروضی شعراء اور خروجی شعراء کہہ سکتے ہیں۔ عروضی شعراء عموماً علم عروض و نحو کے تمام نکات کا لحاظ رکھتے ہیں اور عموماً ان بندشوں کی وجہ سے ان کے اشعار پھیکے ہوتے ہیں اور خروجی شعراء اپنے آپ کو مکمل ان بندشوں سے خارج رکھتے ہیں اور جو دل چاہے کہتے ہیں اور اسے شاعری میں جائز سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کناروں کے درمیان "درمیانی" شعراء ہوتے ہیں، جو عام طور سے عروض کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی قید نہیں ہوتے اور عموماً یہ زمرہ کامیاب اور اکثریت کا حامل ہوتا ہے۔"

درج بالا مقالات کے علاوہ مذکورہ کتاب میں حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو، لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی، غالب سریر خامہ نوائے سروش ہے، علامہ اقبال اور مہاراجہ کرشن پرشاد، میر تقی میر کا ارتقائی کلام، واقعہ کربلا کا تاجدار سخن۔ میر انیس اور کئی دوسرے مقالات بھی شامل اشاعت ہیں جو متفرق موضوعات کو محیط ہیں اور جن کے ہر ایک مطالعے اور مشاہدے سے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی تحقیقی، تاریخی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تمام مقالات کسی نہ کسی صورت اردو کے تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی روایت میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتے ہوئے بعض اہم فکری و فنی گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

سیاق و ارتباطِ حروف

PDF BOOK COMPANY

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

ڈاکٹر علی حیدر

اُردو تنقید اور ڈاکٹر تقی عابدی

(''عروسِ سخن'' کے حوالے سے)

عصرِ حاضر میں اردو ادبی تنقید کا ایک معروف اور مقبول نام ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہے جو بیک وقت ایک بہترین محقق، اعلیٰ نظر، عمدہ شاعر، بلند پایہ مقرر، خوش بیان مدرس، تعلیم و تعلیم (میڈیکل ڈاکٹر) اچھے فنکار اور معروف نقاد ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کی مدت اگرچہ قلیل ہے لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے علم و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی فکر و [illegible] سے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ہر ایک اپنے مطالعے و [illegible] کتاب ''عروسِ سخن'' سے لے کر [illegible] تک مختلف رجحانات پر تقی عابدی کی تنقید سے میں کی مرہونِ منت ہے۔ ان کی تنقید سے پہلے محققین ہیں۔ ان کی تنقید میں تحقیق و تجزیہ کا جو امتزاج ہے اس پر تنقید کی عمارت کھڑی ہے جیسا کہ انھوں نے خود بھی کہا ہے

> ''میری تنقید تحقیق سے آنکھیں ملاتی ہے اور شبِ تقی عابدی کی زیرِ نظر کتاب سے متعلق مضامین ان کے ایسے تنقیدی عمل ہیں جو تحقیق سے پہلو تہی نہیں کرتے۔ تحقیق تقی عابدی کے مزاج کا خاصہ ہے۔''

تقی عابدی اپنی [illegible] سے لے کر [illegible] معروف ہستی ''نوکاؤں سادات'' میں [illegible] سے [illegible] کی زبان [illegible] شوخی [illegible] سے [illegible] کی زبان سے [illegible] سے [illegible] کی [illegible] میں [illegible] ہے۔ یہ میں [illegible] نظر [illegible] کی [illegible] ہیں۔ تقی عابدی نے [illegible] کی [illegible] اور [illegible]

سے دلچسپی لینے لگے۔ شاعری کے ساتھ مضامین نویسی کا شوق بھی پیدا ہوا اور پندرہ سال کی عمر میں پہلا مضمون ''قطب شاہی گنبد'' کے نام سے روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد میں شائع ہوا۔ 1979ء کے دوران ایران جانے کا موقع ہاتھ آیا تو ایرانی ادب کے گہرے مطالعے کی جانب متوجہ ہوئے۔ فارسی اور اردو ادب کی قدروں میں غرق ہوئے ایران کے مشہور عالم ''مطہری'' کی فارسی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جس کی بے حد پزیرائی ہوئی۔ اس کے بعد فارسی و انگریزی کتب کے کئی ترجموں نے تقی عابدی کو ادب کے تنقیدی اصولوں سے بھی آشنا ہونے کے مواقع فراہم کیے جو ان کے وسیع و عمیق مطالعے اور تجربے نے ذوق طنز و تبصرہ اور اردو شعر و ادب کی پرکھ کی طرف متوجہ ہوئے۔ زیر نظر کتاب ''عروس سخن'' ان کے اسی تنقیدی عمل کا نتیجہ ہے۔

بلاشبہ ایک تنقید نگار کا یہ منصب ہوتا ہے کہ فن پارے کے مطالب و محاسن تک پہنچنے کے لیے وہ فن پارے کو ہر زاویے سے دیکھے، ہر ممکن طریقے سے اس کی پوشیدہ باریکیوں تک رسائی حاصل کرے اور اپنے مقصد کی کامیابیوں کے لیے تلاش و جستجو کی ہر ممکن کوشش کرے۔ زیر نظر کتاب کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقی عابدی کے یہاں یہ عنصر غالب نظر آتا ہے اور ان کے ہر مضمون میں تحقیقی پہلو کی اہم کارفرمائی ہے۔ اسی کی بنیاد پر وہ اپنی نکتہ سنجی اور سخن فہمی کو راہ دیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی علمی تنقید کا نمونہ ہے جہاں انھوں نے اردو شاعری کی تمام اہم اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی پر عبور حاصل کیا ہے۔ ادب کی تفہیم و تحسین کے ضمن میں ان کا نقطہ نظر بھی علامہ شبلی کی طرح رومانی نظر آتا ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ شاعری ایک وہبی جذبہ ہے جسے شاعر بے اختیار ظاہر کرتا ہے۔

''عروس سخن'' ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے جو پہلی بار 2004ء میں لاہور، پاکستان سے شائع ہوا۔ جس میں 52 مضامین شامل ہیں اور جو 339 صفحات کو محیط ہے حرف چند کے عنوان سے محسن بھوپالی کا تبصرہ بھی شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> ''عروس سخن اپنے متنوع مضامین اور نئی فکری، تحقیقی اور تنقیدی حیثیت کے سبب اردو تنقید میں اضافے کا حکم رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں

"میں نے اس مجموعے میں ان مطالب پر روشنی ڈالی ہے جو اس دور کے
سخن وروں اور سخن دانوں کے لیے باعث اطمینان ثابت ہو سکتے ہیں۔"

یہ کتاب نئی صدی کے شروع ہوتے ہی منصہ شہود پر آئی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کے مضامین پر بیسویں صدی کے اختتام کے ادب و ادب کے اثرات کا پرتو ہے۔

کتاب میں (۲۲) مضامین ہیں جن کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی بیک وقت مطالعہ ادیب، ناقد و محقق ہیں اردو شعر و ادب کے موضوعات، مباحث اور مشاہیر کا عابدی صاحب کا مطالعہ بہت ہی وسیع و عمیق ہے۔ امیر خسرو، حافظ شیراز، اقبال، غالب، انیس، دبیر سے فن پر بحثیں کی ہیں اور ان سب کی مشاہیر کی فکر، فلسفہ و کلام سے متعلق مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہے کہ امیر خسرو، اقبال، غالب، انیس، دبیر و دیگر پر بھی وہ مطالعہ کا موضوع بنا کر ان کے کلام سے ان باتوں کو اجاگر کرتے ہیں جہاں تک لوگوں کی نگاہیں نہیں پہنچی تھیں۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال کو لے لیجیے۔ اقبال ایک ایسے خوش قسمت شاعر ہے جس پر بے حساب تنقید، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین لکھے گئے ہیں مگر ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے مطالعے میں جو نئے نئے گوشے پیش کیے ہیں وہ ان کے اقبال کے مطالعے کے لیے ایک نئے زاویہ سے سوچنے کے لیے بہت سارے امکانات پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً اقبال پر مقالے کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔ اقبال اور مشرقی علی، اقبال عاشق عارف حسین، علامہ اقبال کی مثنوی (سورۂ اخلاص کا ترجمہ) علامہ اقبال اور بہار، بہار شعر پیش پیش، اقبال کا تصور زمان و مکان، علامہ اقبال کی دعا، علامہ اقبال کا شاہین، قصیدہ روح ارض، علامہ اقبال، اقبال بیسویں علامہ سے سرہو گئے۔ علامہ اقبال اور حیدرآباد، ان اور معلم اقبال، علامہ میر حسن یعنی ایک درجن مضامین ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال شناسی، اقبال فہمی، اقبال کی قبولیت پر بھی اردو کے بڑے سے بڑے علامہ اقبالیات سے بہت بہتر انداز سے غور و فکر کرنے سے وہ قابل قدر ہیں اور اقبال کی عظمت اور بلندی اور سربلندی عطا کی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے میر تقی میر کی عظمت جس کا زمانہ قائل ہے اس نے

اعتراف میں ان پر کئی طرح سے مطالعہ پیش کرے اپنی کتاب کو وقیع بنایا ہے یا غالب اور انیس و دبیر پر بھی ان کی یہ حاصل گفتگو ان کی باریک بینی کا ثبوت ہے۔ تقی عابدی کے مضامین کے اس مجموعے "عروس سخن" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقی عابدی کو اردو زبان و ادب سے کس قدر محبت ہے۔ وہ ادب کے قاری ہیں ساتھ ہی اردو ادب سے محبت کرنے والوں اور اردو کو فروغ دینے والوں سے ان کو بے حد محبت ہے وہ زیر نظر کتاب میں ادب کے ایک باریک بین پارکھ کا رویہ پیش کرتے ہیں جہاں ان کا رویہ تشریحی و توضیحی نظر آتا ہے اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر لسانی مباحث سے بھی کام لیتے ہیں۔ اپنے اس مجموعے کے توسط سے وہ اردو تنقید میں اپنا مقام بناتے ہیں۔ ان کی اس تنقیدی کاوش کو ادبی دنیا میں وقار کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

رباعیاتِ انیسؔ

اردو میں مراثی اور مرثیہ نگاروں پر ایک پچھتر برس سے بھی قبل سے تحقیق کا سلسلہ رہا ہے۔ تنقید نے بھی اس طرف توجہ دی ہے۔ مراثی کے متعلقہ موضوعات پر بھی کتنے ہی لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے بلکہ مراثی کی ترتیب، تالیف اور تدوین بھی ہوتی رہی ہے۔ مراثی کی سماجی اور تہذیبی معنویت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اب مرثیہ سے صرف مذہبی جذبات کی تسکین نہیں ہوتی اس کی سیاسی اور سماجی معنویت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" تحریر کر کے ایک نئے نظریے سے متعارف کیا۔ مذہبی جذبات کا حامل مرثیہ اس کی آفاقی معنویت پر بھی روشنی ڈالتا ہے اس کی عمر سے حیثیت پر گفتگو کی۔ یوں مرثیہ کو ایک ہمہ صنف کی حیثیت حاصل ہوئی۔

تنقید کی مدد سے انیسؔ کی پانچ سو پشت رہی ہو انیسؔ اور دبیر مختلف محاذوں پر مرثیہ کا پرچم بلند کرتے رہے۔ انفرادی طور پر بھی ان دونوں کی خدمات ناقابل فراموش رہیں۔ مراثی اور مرثیہ نگاروں پر لکھنے والوں میں شبلی واحد راہ رو اولیت حاصل ہے۔ پھر مسعود حسن رضوی ادیب، نیر مسعود، شبیہ الحسن سے ہوتا ہوا امید رشید موسوی تک پہنچتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی مرثیہ نگاروں پر کام کرنے والوں کا ایک سلسلہ ہے جن میں قابل ذکر نام سید عابدی ہیں۔ سید عابدی کا شمار انیسیوں میں ہے اور ندوہ یوں میں۔ انہوں نے ان بلند قامت مرثیہ نگاروں پر جس قدر تحقیق، تدوین، تالیف اور تنقیدی کام کیے ہیں ان سے اپنے قد کو اونچا کر لیا ہے۔ عابدی صاحب کے ناقدین میں خود ان کا مرتبہ بلند ہے۔ یہ انیسیوں کے ساتھ ساتھ کب سے ہیں یہ کہنا مشکل ہے لیکن ان کی تحقیق کا معیار ہمیشہ بلند رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے پیشہ طب کی ان کی مصروفیات اپنی جگہ خوش اسلوبی سے انجام پا جاتی ہیں۔ گزشتہ ہفتہ چند ایک روز کے لیے وہ حیدرآباد تھے جہاں ان کی تازہ تصنیف ''دیوان رباعیات انیس'' کی رسم اجراء اور سوانا آزاد کلب کے زیر اہتمام توسیعی لکچر بعنوان'' کلام انیس میں ادبی اور اخلاقی اقدار'' تھا۔ ہوٹل انمول کانٹی نینٹل میں اپنے توسیعی خطبہ کے دوران انھوں نے بتایا کہ ابھی چار پانچ کتابوں نے مسودے اشاعت کے منتظر ہیں۔ لیجیے ان کی ایک اور کتاب شائع ہو چکی ہے۔ ''دیوان رباعیات انیس'' جو 979 رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس تقریب کی صدارت فرما رہے تھے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں۔

پروفیسر محمد میاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ''اگرچہ وہ ادب کے طالب علم نہیں رہے لیکن بچپن میں انھوں نے ابتدائی جماعتوں میں اردو پڑھی ہے وہ انیس اور دبیر سے واقف ہیں۔'' پروفیسر محمد میاں نے کہا کہ ''ان کا پسندیدہ شعر

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''ادب میں تنقید کی بڑی اہمیت ہے لیکن تنقید برائے تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ تنقید سے ادب اور معاشرہ کی اصلاح و فلاح کا کام لیا جائے۔ ایسی تنقید کی اہمیت ہمیشہ رہے گی تاکہ معاشرہ کھلی فضا میں سانس لے سکے۔'' شیخ الجامعہ نے فرمایا کہ ''اردو کو ضروری اور اہم کتابوں کی ضرورت ہے۔ اردو سے دیگر زبانوں میں اور دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ یہ اردو کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔ اس طرح کام بڑھے گا اور ترقی کی صورتیں پیدا ہوں گی۔'' پروفیسر محمد میاں نے اپنے دورہ کینیڈا کے موقع پر ورنون میں تقی عابدی صاحب کی ذاتی لائبریری دیکھنے کا جو موقع ملا اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے تقی عابدی کی اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی اور تصنیف و تالیف کی مصروفیت کی ستائش کی ڈاکٹر عابدی کے پاس کینیڈا میں نایاب کتابوں کے نسخوں کے تعلق سے کہا کہ ''اگر یہ نسخے اور مخطوطات اردو یونی ورسٹی کے حوالے کردی جائیں تو زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں گے۔ اور یہ اردو کی لائق ستائش خدمت ہوگی۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطبہ میں کہا کہ "اردو تنقید نے انیس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ انیس کا مطالعہ کیجیے، ہمارے ذہن اور ضمیر کا اندازہ ہوگا۔ انیس کے مراثی کی تعداد (213) ہے اور ان مرثیوں میں اشعار کی تعداد لگ بھگ 28 ہزار ہے۔" رباعی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ "انیس رباعیات کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے مجلسوں میں رباعیات سنائیں۔ ہوتا یہ تھا کہ شاعر منبر پر مرثیہ سنانے سے قبل ایک دو رباعیات پڑھتا تھا۔ انیس نے بھی یہی طریقہ اپنایا۔ ان کی رباعیات علمی و فلسفیانہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں ان میں اخلاقی قدار کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ انیس نے ایسی رباعیات زیادہ تر فی البدیہہ ہی کہیں۔ انیس نے رباعی کے فن کے تقاضوں کو بہ صورت ملحوظ رکھا ہے۔"

پروفیسر بیگ احساس نے اپنے پر مغز قدرتے میں انیس کے خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ "انیس خاص رکھ رکھاؤ کی حامل شخصیت تھے ان کی رباعی فکر اور تفکر دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔" پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ "انیس نے کئی مجلس بھی پڑھی ہیں۔"

پروفیسر فاطمہ پروین نے اپنے صدارتی خطاب میں مرثیہ اور رباعی کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔ بیگ احساس نے کہا کہ "انیس کو حیدرآباد سے ایک خاص تعلق خاطر تھا۔ وہ حیدرآباد آئے اور یہاں مجلس پڑھیں اور اپنے مرثیے سنائے۔ حیدرآباد کے امرا، روسا اور وزرا نے انیس کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رعیت نے بھی ان کا استقبال کیا۔ انیس کو حیدرآباد سے جذباتی وابستگی تھی جس کا اندازہ ان کی رباعی

اللہ رسولؐ حق کی امداد رہے
[illegible]
[illegible]
یارب آباد حیدرآباد رہے"

پروفیسر فاطمہ پروین نے اپنے صدارتی خطاب میں سب سے پہلے اردو کی ادبی قدار کی بات کی اور تنقید پر تنقید کی۔ ان کی مساعی تھیں کہ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کے سلسلے میں

چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ انیس مراثی کے ذریعہ اخلاقی اقدار کو عام کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے معاشرہ میں رباعی کے مطالعہ کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے انیس کو سمجھنے اور انیس کو سمجھنے کے لیے ان کی رباعیات کو سمجھنا چاہیے۔ انیس کی رباعیات ان کے دور کی معاشرتی ادبی اور اخلاقی اقدار کی ترجمان ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس موقع پر معروف رباعی گو شاعر امجد حیدر آبادی کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ "اپنی رباعیات کی وجہ سے امجد کا نام مسند زندہ و پائندہ رہے گا۔ تقی عابدی کے بموجب انھوں نے امجد کی رباعی گوئی پر بھی کام شروع کر دیا ہے انشاء اللہ اس کی تکمیل جلد ہوگی اور پھر اشاعت عمل میں آئے گی۔"

پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیوں کے بارے میں جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ سچ پوچھئے تو انھوں نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ مراثی کا خاص طور پر لکھنؤ میں زور و شور رہا ہے۔ لیکن 1857ء کے بعد لکھنؤ کے حالات ہی بدل جاتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ زندگی اور زمانے میں ہونے والی تبدیلیوں کا ہر ذی روح پر اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کے منظر نامہ کا بھی ان سے دوچار ہونا تھا۔ ان تبدیلیوں کا شعر و ادب پر اثر ناگزیر رہا۔

مرثیہ پر بھی یہ تبدیلیاں موثر ہوئیں لکھنؤ میں بھی حالات ایسے رہے۔ مرثیہ کے حوالے سے انیسے اور دبیرئے شعر و ادب کی دنیا میں اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ انیس نے نہ انیسیوں کا ساتھ دیا اور نہ دبیریوں کے حق میں کچھ کہا۔ انھوں نے شعر و ادب کے حق میں ووٹ دیا۔ انھوں نے شعر و ادب کے حوالے سے شستہ و شائستہ اقدار کی تائید کی۔ انھوں نے (اور دبیر نے بھی) ادبی موسم کو خوش گوار رکھا۔ ان دونوں انیس اور دبیر کی بزرگی اور برگزیدگی اسی میں ہے۔ پروفیسر محمد میاں نے جو اس تقریب کی صدارت فرما رہے تھے اپنی دفتری مصروفیت کے سبب زیادہ وقت نہ دے سکے۔

اپنے صدارتی خطبے کے بعد انھوں نے اجازت چاہی اور پروفیسر پدم شری مجتبیٰ حسین سے خواہش کی کہ وہ تقریب کے دوسرے حصے کی صدارت کریں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے صدارتی خطاب میں اپنے انداز میں محفل کو خوش گوار بنا دیا۔ سامعین نے دیر تک

قدمتھوں سے دادِ ی۔ ابتدا میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد میاں کا تعارف کرایا اور اردو یونی ورسٹی اور اردو کی ترویج و ترقی سے متعلق ان کی مساعی کی ستائش کی۔

بانی صدر مجلس آزاد طلب مرزا پی ڈاریکٹر (P.D.L.M) ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے پروفیسر بیگ احساس کا تعارف کرایا اور تقریب کی کارروائی شائستہ انداز میں چلائی۔ آخر میں مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور یہ خوب صورت محفل اختتام کو پہنچی۔

پروفیسر بیگ احساس
حیدرآباد

دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ از ڈاکٹر تقی عابدی

میر ببر علی انیسؔ اُردو کے چار عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ بڑے شاعروں کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے، اور مزید اُن پر لکھنا کچھ دشوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ میرؔ کا حق ادا ہو سکا اور نہ میر انیسؔ کا غالبؔ اور اقبالؔ نسبتاً خوش قسمت ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے پھر ایک بار بھاری پتھر اٹھایا ہے۔ اس سے قبل وہ اقبالؔ پر ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' اور ''چوں مرگ آید'' غالبؔ پر ''غالبؔ کا دیوان نعت و منقبت'' اور ''دیوان غالبؔ فارسی''، میر انیسؔ پر ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' لکھ چکے ہیں۔ اب انھوں نے ''دیوان رباعیات انیسؔ'' ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اس دیوان کا انتساب انھوں نے ماہر انیسیات پروفیسر سید نجم مسعود کے نام کیا ہے۔ ابتداء میں حیات، فن اور شخصیت میر انیسؔ ہے۔ میر انیسؔ ''ایک واحد ایسے شاعر ہیں جن کے خاندان میں نسل در نسل آٹھ ممتاز شاعر پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق اس خاندان نے تقریباً تین صدیوں تک پہلے فارسی اور پھر اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر ضاحک، میر حسن، میر خلیق، میر مہر علی اُنس، میر نواب مونس، میر رئیسؔ، میر سلیسؔ، خورشید حسن عروجؔ کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور مختصر حالات زندگی درج کیے ہیں۔ انھوں نے نظم طباطبائی کی اس بات کو غلط ثابت کیا ہے میر انیسؔ نے محمد عسکری رئیسؔ کے نام سے مرثیہ ''نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری'' کہا اور رئیسؔ ہی کی پشت پہ شعر بھی شامل کیا ہے ؎

عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں "ویسے بھی میر ہدایت و شاعر تعلیم دیا جائے تو خود بخود انیس کی پانچویں پشت ہوتی ہے۔ اسی لیے تو وہاب صاحب عرش نے جو انیس کے پوتے تھے خود کو

ع "سات پشتوں کا شرابی ہوں تو ہوں اور نہیں" کہا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ انکشاف بھی چونکا دینے والا ہے کہ میر انیس کے مرثیوں کی ترتیب کے لیے جب "دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی" نے وہاب صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے اس بات کے لیے اس ہزار روپیوں کا مطالبہ کیا جو اشاعتی کمیٹی نے منظور نہیں کیا۔ بعد میں اس کام کو نظم طباطبائی سے پورا کیا گیا۔

وہاب صاحب عرش کے فرزند فرخ صاحب لاولد تھے۔ میر انیس کے خاندان کا سلسلہ یہاں ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر عابدی نے میر انیس کی تاریخ ولادت، سن سے ابتدائی اساتذہ، تعلیم اور شاعری کی ابتدا کے بارے میں مستند حوالوں سے تفصیلات درج کی ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ نے میر ببر علی کا تخلص تبدیل کر کے انیس رکھ دیا۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے لکھا ہے شاعری میں انیس کے کسی استاد کا نام نہیں ملتا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور امجد علی اشہری کے بیان کردہ میر انیس کے قد و قامت کی تفصیل بھی دی ہے۔ شاہ عظیم آبادی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ میر انیس نے مشہور مصور سے تصویر کھنچوائی تھی اور ایک عرصہ بعد جب فوٹو گرافی رائج ہوئی تو میر زاکر مہدی مرحوم سے اس فوٹو کی نقل آئل پینٹ سے بنوائی۔ یہ تصویر 1930ء تک شاہ عظیم آبادی کے پاس محفوظ تھی۔ میر انیس کی مستند تصویر وہ اس ہاتھی دانت کی تختی پر بنائی ہوئی مصور کی تصویر قرار دیتے ہیں۔

تقی عابدی نے انیس کی زبان، پابندی وقت، اخلاق و کردار کے متعلق بیانات کی تفصیل درج کی ہیں۔ میر انیس کی غیبت کو وارد نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر مرزا دبیر کی برائی کرنے والوں سے وہ سخت خفا ہوتے تھے۔ میر انیس کا شعری ذخیرہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے تمام محققین نے جو قدر تعداد بیان کی ہیں ان کی چھان بین کے بعد لکھا ہے کہ 1103 نوحے اور جن میں تخمیسات، مناجات

کے علاوہ رباعیات کی تعداد 579 ہے۔ انھوں نے حالی کے اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا کہ "نظیر اکبر آبادی نے شاید انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔" انتخاب بحر، مرثیوں کے مطلع، شعراء کی قدر دانی، تقلید طرز مرثیہ، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام باڑہ، منبر پر نشست اور پڑھنے کا انداز کے عنوانات سے تفصیلات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ مجلس کی تفصیلات، بیماری اور وفات کے بارے میں لکھا ہے۔

"رباعیات انیس کا اجمالی تذکرہ اور تجزیہ" کے باب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعی کو ایرانیوں کی ایجاد قرار دیا۔ انھوں نے خلیل خلیلی، محمد قیس بن رازی، اوحد کلھنوی، علی حیدر طباطبائی، محمود شیرانی، نجم الغنی، پنڈت دتاتریہ کیفی کے حوالوں سے اسے ثابت بھی کیا اور سلیمان ندوی کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ رباعی عربی کی ایجاد ہے۔ انھوں نے "حدائق" میں ابن قیس نے امام حسن قطان کے ترتیب شدہ چوبیس اوزان سے لیے جو دو شجر سے اخرم اور اخرب تیار کیے تھے انھیں پیش کیا۔ انھوں نے فارسی رباعی کے ارتقائی سفر کی نشاندہی کی اور عمر خیام، ابو سعید ابوالخیر، بابا طاہر اور سعد سلمان کو رباعی کا شاعر قرار دیا۔ اردو رباعی کے ارتقاء پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ ان کی تحقیق کے مطابق غالب نے صرف سولہ اردو رباعیاں کہی ہیں۔ علامہ اقبال کی رباعیاں، رباعی کی بحر میں نہیں ہیں، انھیں رباعی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں

> "رباعی میں جذبات سے زیادہ تجربات کا دخل ہوتا ہے، اس لیے رباعی فکر و تفکر کا سرچشمہ ہوتی ہے، چناں چہ جذباتی اشعار کی طرح اس کا اثر تیز و تند اور کوتاہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تابش سانچے میں ڈھلے کی آنچ کی طرح دھیمی مگر دراز مدت تک ذہن کو گرماتی اور روشن کرتی ہے اور پھر مشکل ہی سے ذہن سے نکلتی ہے۔ شاید اسی لیے نظموں میں رباعی سب سے زیادہ حافظے میں محفوظ رہتی ہے۔" (ص 94)

ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیس اور مرزا دبیر کی رباعیوں میں مضامین کی تکرار تلاش کی ہے اور ایسی 21 رباعیات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات کے مجموعوں کی فہرست بھی شائع کردی اور ان میں شامل رباعیات کی تعداد بھی درج کردی ہے۔ ان

مجموعوں میں ڈاکٹر عابدی نے "دیوان رباعیات انیس" کو فوقیت حاصل ہے جس میں (579) رباعیات ہیں۔

مراثی انیس مطبوعہ نول کشور پریس کی یک جلدی میں (۸۱) رباعیات ہیں جن میں (۱۰) رباعیات غلط ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے غلط مصرعے رباعیات کے دوسرے متعلقہ صحیح مصرعے درج کر دیے ہیں۔

میر انیس کی رباعیات کے فارسی اور انگریزی تراجم بھی اس دیوان میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، اخلاقی، عارفانہ، زاہدانہ، عقیدتی اور رثائی رباعیات۔ ان رباعیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے موضوعات، اسلوب، لفظیات، ہیئت، روایتی تشبیہات، استعارات، تلمیحات، ترکیب سازی، محاوروں کا استعمال، فکر، جذبے کا امتزاج، اجتماعی تہذیب، داخلیت، معنوی، دروں بینی، قوت مشاہدہ، صنعتوں کے استعمال و مشاقی کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ایک اہم کام ہے جو انتہائی عرق ریزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

میر انیس کے کلام پر بنگال کے رئیس نساخ نے نامور دس مصرعوں کو انیس سے منسوب کر دیے جو واقعتاً انیس کے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان کا جواب بھی دیا۔ آخر میں "میر انیس مشاہیر شعرا و ادب کی نظر میں" کے عنوان سے مشاہیر کی رائے اکٹھا کی ہے جن میں مرزا غالب سے لے کر فراق گورکھپوری تک بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی اس کاوش کے متعلق کہتے ہوئے کہ "پچھلے چند برسوں میں انیسیات میں جو بھی بہت قابل قدر کام ہوا ہے اس کی قدر و قیمت مسعود نے اپنے عالمانہ مقدمہ، اور ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب کی رائے میں بلاشبہ جو اس اضافے ہے ہر مرحوم ڈاکٹر سید علی جواد زیدی، جناب رضوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ کے چند مضامین استثنا قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اب تقی عابدی کی تحریروں کا اضافہ ہوا ہے جنہوں نے مذہبی کتب خانہ کی تکمیل کے لیے کتاب مرتب کی ہے۔"

میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمت میں اس عمدہ کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

سید علی احمد دانش

دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ

قفس سے تا چمن پھیلی ہوئی ہے داستاں میری
ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو سنتے ہیں فغاں میری

رباعی اُردو شاعری ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو گزشتہ چار صدیوں سے اربابِ علم و ادب کے مذاقِ شاعرانہ کا مرکزِ محور ہے۔ فارسی کے شعرا نے رباعی کو مضامین کی رنگا رنگی کے ساتھ جو اوج و عروج بخشا تھا اس کے بعد اردو جیسی نوساختہ زبان میں رباعی کے حسن و وقار میں چار چاند لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ قلی قطب شاہ کے زمانے سے میر و سودا کے عہد تک اس صنفِ سخن کے جتنے بھی نمونے دستیاب ہوتے ہیں وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ

چوم کر چھوڑ دیا اس کو خرد مندوں نے

دو صدیوں تک کسی نے اس صنفِ سخن کے سلسلے میں ریاضت کا حق ادا نہیں کیا۔ اردو مرثیے کے دورِ عروج میں مرثیہ گو شعرا نے اس صنفِ سخن کو سرنامہ کلام قرار دیا، اس طرح اس صنفِ سخن کو پھولنے اور پھلنے کا موقع فراہم ہوا۔ مرزا دبیر اور میر انیسؔ نے اس باغ میں نت نئے چمن آراستہ کیے، رباعی کی چار مصرعوں کو فردِ واحد فکر، نظر بنا دیا، اس ذیل میں رباعی کی ساخت اور اس کے محاسن کا شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لینے سے قطع نظر کرتے ہوئے رباعیاتِ انیسؔ کی طباعت کے حوالے سے بعض باتیں قارئین تک پہنچانا مناسب خیال کرتا ہوں۔

10 دسمبر 1874ء کو میر انیسؔ جنت نشین ہوئے، جس کے بعد میر صاحب کے مرثیوں کی اشاعت کا مرحلہ درپیش ہوا، کلامِ انیسؔ کی فراہمی اور تہذیب و ترتیب کی ذمہ داری کا بارِ گراں مولوی سید تصدق حسین عاشقؔ کشوری نے اٹھایا اور انھیں کے زیرِ اہتمام مطبع نول

کشور حضرت گنج لکھنؤ سے مراثی و رباعیات پر مشتمل چار جلدیں شائع ہو کر ظہور میں آئیں۔ جس کے بعد اشاعتی سلسلہ میں لکھنؤ سے مراثی کی جلدیں اور ایک جلد "مجموعہ رباعیات انیس" کے نام سے شائع کی۔

1322ھ کی میر صاحب کی 125 رباعیوں کا ایک مجموعہ سید محمد حسن بلگرامی نے پٹنہ سے اور حیدرآباد سے شائع کیا۔ چوتھائی صدی بعد محمد سید محمد عباس آصف نبیرہ کتب خانہ صاحب مجموعہ نے میر صاحب کی منتخب اخلاقی رباعیاں مرتب کر کے مجموعے کا نام "انیس الاخلاق" رکھا۔ مذکورہ مجموعہ رباعیات دارالتالیف مجموعہ باغ نے لکھنؤ سے مشہور منشی نولکشور پریس سے 1939ء میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے رباعیات کی تلاش و تجسس کا میل میں ایک اور اضافہ ہوا۔ سید علی حائری جو میر انیس سے نواسے اور محمد عباس آصف کے ہم عمر تھے ان کا زبردست تعاون عباس صاحب کو حاصل رہا۔ حائری میر انیس کے آخری تین برسوں میں ان کے ساتھ تھے محمد عباس آصف نے 1930ء سے 1948ء تک نہایت محنت و جانفشانی کے بعد میر صاحب کی جو رباعیاں فراہم کیں 1949ء میں انہوں نے شائع کیں۔

1955ء میں مشہور ادیب علی جواد زیدی نے ترقی اردو بیورو نئی دہلی سے جو مجموعہ شائع کرایا اس میں 126 رباعیوں کا اضافہ ہوا۔ اس مجموعے کی ترتیب اور رباعیات کی تلاش میں اپنے مکان پر میں نے بھی ہر طرح تعاون کیا۔

اس سلسلہ اشاعت کی تازہ ترین کڑی "دیوان رباعیات انیس" ہے جدید تحقیق و تفتیش کے ساتھ ڈاکٹر صدیق حائری نے ڈاکٹر سید شاہد حسین نئی دہلی سے زیر اہتمام شائع کرائے ہیں۔

مصنف نے ابتدائی صفحات میں میر صاحب کی تصویروں کا مقبولہ اور نادر تصویروں سے متعلق لکھا ہے جن سے کتاب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ باقی سو صفحات پر مشتمل کتاب میں حیات انیس اور شخصیت میر انیس، تعارف خاندان میر انیس، ولادت، تعلیم، تربیت، شاعری کی ابتدا، شخصیت پر ایک نظر، حلیہ، وضع و لباس، پابندی وقت، اخلاق و کردار، میر انیس کا شعری ذخیرہ، کتب و رسائل جو مراثی سے متعلق ہیں، مراثی، وقت، شعرا کی تقلید، طرز

مرثیہ، تلمذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام باڑہ، مجلس چہلم ابایہ میر ضمیر، مجالس عظیم آباد، میر انیس حیدرآباد میں، آخری مجلس، بیماری اور وفات تک کا ذکر کیا گیا ہے، جو اسی (80) صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے اس سے قبل بھی کئی اہم تصانیف شائقین ادب کی خدمت میں پیش کی ہیں جن میں "شہید" (1982ء)، "جوش مودت"، "گلشن رویا"، "اقبال کے عرفانی زاویے"، "انشاء اللہ خاں انشاء"، "رموز شاعری"، "اظہار حق" [سلطان صاحب فرید لکھنوی کے مرثیے]، "مجتہد نظم مرزا دبیر"، "طاق مہر"، "سلک سلام دبیر"، "تجزیہ یادگار انیس جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے"، "ابواب المصائب تصنیف مرزا دبیر"، "ذکر دربار ان"، "عرصہ حشر"، "مصحف فارسی دبیر"، "مثنویات دبیر"، "کائنات نجم"، "روپ کنوار کماری" [مراثی انور]، "دربار رسالت"، "فکر مسدس"، "خوشہ انجم"، "دردریائے نجف"، "تاثیر ماتم"، "نجی مایا"، "روش انقلاب"، "مصحف تغزل"، "ھوا نجم"، "تعشق لکھنوی"، "ادبی معجزہ"، "غالب دیوان نعت و منقبت"، "چوں مرگ آید"، "رباعیات دبیر"، "سبد ثمن"، "دیوان غالب فارسی"، "فیض فہمی"، "مطالعہ دبیر کی روایت"، "دیوان سلام و کلام انیس"، "تجزیہ شکوہ جواب شکوہ"، "فنی لافانی"، "مطالعہ رباعیات فراق گورکھپوری"، "اردو کی دو شاہکار نظمیں"، "اقبال کے چار مصرعے"، "رباعیات بیدل"، "باقیات و ذرات فیض احمد فیض" کے نام میرے علم میں ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی یہ گراں قدر ادبی خدمات باذوق افراد کے لیے نعمت ثابت ہوں گی۔

ہمیں یقین ہے کہ ارباب ادب میر انیس کی متذکرہ رباعیات کے مجموعہ کا مطالعہ کرتے وقت درج ذیل رباعی کی صداقت کی روشنی میں اس کا مطالعہ کریں گے۔

یوں جوہر طبع کب عیاں ہوتا ہے — پانی ہر ایک استخواں ہوتا ہے
راتوں کو کھلاتی ہے مجھے فکر سخن — تن شمع صفت صرف زباں ہوتا ہے

ڈاکٹر محمد ظفر حیدری
(ایڈیٹر ماہنامہ "حکیم امت" سری نگر)

تجزیہ "کائناتِ نجم"

نجم آفندی اردو کے باکمال شاعر تھے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا، اپنے کلام میں پیش کیا۔ ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ وہ جدید شعرا میں سے تھے اس لیے ان کے کلام میں جدیدیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد بزم آفندی مرحوم اور دوسرے اساتذہ کا کلام سے مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں استادی سے پختگی آئی تھی۔ ریاض کا نتیجہ تو اچھا ہوتا ہی ہے وہ سے وہ فن عروض میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ میر انیس نے اپنے بارے میں کہا تھا۔ "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں۔" ان کی طرح نجم بھی پشتینی شاعر تھے۔ موصوف کے والد مرزا عباس تسلیم مشہور شاعر مرزا فتیح دہلوی کے شاگرد تھے۔ اسی لیے فخریہ نجم کہتے ہیں

نجم ہوں خاص پاسے مند آرائے فتیح
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

نجم کے کلام میں روانی بھی ہے اور فصاحت بھی۔ ان کو انسان سے بڑی ہمدردی تھی۔ وہ انسان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس سے رنج و غم میں شریک رہتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کا یہ شعر اور پندِ انسان سے ہے

بہت پیام ملیں گے میرے سلام میں نجم
نگاہِ غور سے نقاد نے اگر دیکھا

نجم آفندی کو مدح [illegible] سے بڑی معرفت تھی۔ اسی عقیدت و محبت کی وجہ سے وہ مدح [illegible] پر قادر تھے۔ انھوں نے بے شمار نعتیہ اور سلامیہ شعر کہے ہیں اور تین مرثیے بھی۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا سمندر موجزن ہے۔ وہ زبان کی صفائی،

سادگی و سلاست، لطیف استعارے، تشبیہیں، درد سے ڈوبی ہوئی جذبات نگاری، بلند کردار نگاری دل کو چھو لیتی ہے۔ ان کے سلام و نوحے اس قدر مقبول ہوئے کہ زبان زد خاص و عام ہیں۔ جب تک حسینؑ کا غم باقی رہے گا، دونوں کو بقائے دوام حاصل ہے۔

سویا علیؑ کا لال دو عالم کو جیت کر
مٹھی میں کائنات تھی خنجر کے پہ تھا
عاشور کے وہ ظہر کو دنیا بھولی واقعہ
مومن کی نماز اور مجاہد کی دعا ہے
شبیرؑ کا غم زندگی فکر و نظر ہے
ملتا ہے یہاں درسِ عمل اشکِ عزا سے

نجم آفندی نے نوحے و سلام کے علاوہ حمد، نعت، قصیدے بھی کہے ہیں اور مختلف موضوعات پر نظمیں بھی۔ ان کو ہر صنفِ سخن میں یکساں دسترس حاصل تھی۔ ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ وہ شعر و سخن میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ نجم آفندی نے امام حسینؑ کی زندگی کو ایک مثالی انسان کی زندگی کے طور پیش کرکے عوامی شعور کو بیدار کیا ہے۔ وہ کربلا کے واقعہ کو اصلاحِ انسانیت کا عظیم کارنامہ سمجھتے تھے اور کربلا کے حق پرست شہیدوں کے تعمیری پہلو پیش کرتے تھے:

یہ نہ قرآں میں نہ قرآن کی تنسیخ میں ہے
روحِ احساس و عمل اسوۂ شبیرؑ میں ہے

•••

تربیت کی ذہن انسان کی غمِ شبیرؑ نے
صاحبِ دل بن گئے جو غم کے خوگر ہوگئے

•••

یہ مجلسِ غم ظلم مٹانے کے لیے ہے
دنیا کو راہ راست دکھانے کے لیے ہے

نجم آفندی ایک حساس دل رکھتے تھے جو قوم کی پسماندگی اور خستہ حالی دیکھ کر تڑپ

تھے۔ اسی لیے انھوں نے رنج و الم کو اصل حیات قرار دیا۔ ان کی شاعری کا محور حسین کی ذات ہے۔ حسین ہی نے کربلا میں آزادی، خمیر، جرأت اظہار اور دین کی قربانی پیش کیں

اے حسین ابن علی اے کار ساز حریت
تو نے مر کے زندگی جاوید کو آساں کر دیا

تجم آفندی کی شاعری کا مقصد انسان کے اصل نصب العین کی نشاندہی کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں انسانی عظمت سے بڑھ کر کسی کی عظمت نہیں ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس میں خودی کا جذبہ ہونا چاہیے

خود پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی بن گئی
تجم آخر شاعر آل حیدرؑ ہو گئے

تجم آفندی کو اردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کا کلام ہندی میں بھی ہے۔ انھوں نے ہندی زبان میں بھی نوحے، سلام اور نظمیں کہی ہیں تاکہ وہ سے مذہب تک اپنے پیغام کو پہنچا سکیں۔ ان کا کلام دعوت عمل کا درس دیتا ہے

من سانھ تھا سنسار میں ڈالے ہوئے ڈیرا
چھایا ہوا تھا پاپ کے بادل کا اندھیرا
سنسار کو تھا آپ جو اپدیش کا پیاسا
دینے کو چلا گھر سے محمدؐ کا نواسا

تجم آفندی نے حمد، نعت، منقبت، سلام میں مدح سرائی کی ہے۔ انھوں نے حمد، نعت اور قصیدے کافی تعداد میں لکھے ہیں:

توحید کا ربط کیا سخن دانی سے
مرعوب ہوں جلووں کی فراوانی سے

•••

کوششیں وہ سمجھنے کی تیرے کیوں کرتا
عرفاں ہے تیرا جسے حیرانی سے

موزوں تھے سب انبیاء، نبوت کے لیے
مخصوص محمدؐ تھے ہدایت کے لیے

•••

تا مہدیؑ دین علیؑ کی خوشبو نکلی
جو پھول بھی گلشن امامت میں کھلا

•••

اے صلِ علیٰ جلوہ جانا نہ علیؑ کا
قرآن ہی قرآن ہے افسانہ علیؑ کا

سلام و نوحے، مرثیے، حمد، نعت، قصیدے، منقبت، رباعیات، قطعات اور نظمیں نجم کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ وہ شعر و سخن کے ذریعہ محمدؐ و آل محمدؐ کی شان میں مدح و ثنا کے قسم قسم کے پھول کھلاتے رہے۔ ان کے انقلاب آفرین نوحے، سلام، وجد آفرین قصیدے بہت مقبول ہیں۔ اسی لیے وہ شاعر اہل بیتؑ کہلاتے ہیں

نجم صاحب کو راستہ دینا
مذہب عشق کے امام آئے

نجم آفندی غزل کے شاعر تھے۔ ہر شاعر فطرتاً غزل کا شاعر ہوتا ہے۔ بعد ازاں شاعر کی دوسری صنفوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ کچھ شاعر غزل ہی تک محدود رہتے ہیں اور بعض شاعر رثائی ادب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ نجم نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کی غزلیں بھی بڑی دلکش ہیں۔ کہا جاتا ہے محبت میں شک و شبہات کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ ہوتا ہے، مگر دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر محبت ہی شک میں گھر جاتی ہے۔ جب ہی تو نجم نے یہ شعر کہا

مظاہرے تو ہیں دونوں طرف محبت کے
نہ اعتبار انھیں ہے نہ اعتبار مجھے

نجم آفندی نے غزل کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ وہ ایک پختہ مشق شاعر تھے۔ چناں چہ پہلے ہی مشاعرے میں جو آگرہ میں ہوا تھا اور جس میں سیماب اکبر آبادی بھی

تھے، اس پر چھائے تھے۔ جو غزل وہاں پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے

چاندنی میں تم ذرا کھل کے نکل کر آ جاتے
فرطِ عاشق پر ترس اے کاش کچھ کھا جاتے

مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا احساس یوں دلاتے ہیں

جس قوم نے سر کی مہم کرب و بلا
اس قوم میں ملتے نہیں آثارِ حیات؟

•••

وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں
جس قوم کے ورثے میں ہو عاشور کا دن؟

•••

اسلام پیامِ امن ہے یاد رہے
سنی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو

نظم سے علامہ نجم آفندی کی نثر بھی ادبی مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے نثر میں بھی بڑے ادبی، مذہبی اور تحقیقی موضوعات پر شہ پارے قلم بند کیے ہیں۔ جس میں لغات المذہب، لغت ہے۔ نظرت علی کا مذہبی نام، قوالِ امام اور مکاشف، حسینؑ اور ہندوستان کا سجدہ اور بھی تحقیقی کام انھوں نے۔ نجم آفندی کو سرپرستِ معلی، نجف اشرف اور سامرہ و نجف و دل زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے تاثرات بھی نظم کیے ہیں۔ بعنوان "اور نجف" پر لکھی ہوئی نظم کے صرف تین اشعار پیشِ خدمت ہیں

نجف میں شاعرِ گردوں حاضر ہے
وہ امیرِ سلامت، فقیر حاضر ہے

•••

سند ہے ماتمِ شبیرؑ کی خدا رکھے
پڑی ہے اس پہ جو نظر تو یہ حاضر ہے

•••

امیر ہے کوئی ایسا نہ مجھ سا غریب
غریب نجم حضور امیر حاضر ہے

نجم آفندی شاعر ہی نہیں، وہ ایک انقلابی شاعر بھی تھے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ دنیا میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔ چاہے وہ انسان اور انسانیت کی خدمت قوم رہنے کا انقلاب ہو، قومی یا مذہبی محبت کے لیے انقلاب ہو یا انگریز حکومت کے لیے انقلاب ہو وہ انقلابی لڑائی میں جیل بھی گئے اور جیل میں بھی شاعری کرتے رہے۔

نجمی کا اپدیش چنچل ہو دھرم چنچل ہو دیش چنچل ہو
کاہے نین نیر بہائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن میرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں

نجم آفندی وطن پرست تھے، مگر جب انھیں ہندوستان میں چین نہیں ملا تو وہ غم روزگار سے کچھ آرام پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں مشہور معروف ادیبوں، شاعروں اور خطیبوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں شائع ہوتا رہتا تھا، مگر ان کو وہاں بھی چین نہ ملا۔ آخرکار تنگ دستی کی حالت میں انتقال کیا۔ ان کی ولادت 1893ء میں ہوئی اور وفات 1975ء میں۔

نجم آفندی کے ہم عصر شعراء اقبال، حالی، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ تھے۔

مختصر یہ کہ نجم آفندی بہ صنف سخن کے شاعر تھے مگر ان کے نوحے اور سلام بے حد مقبول ہوئے۔ اسی لیے ان کو شاعر اہل بیت کا خطاب ملا۔ اور اس شاعر اہل بیت نے امام حسینؑ کے پیغام حق اور جدوجہد کو عام کیا۔ لوگوں میں عمل کا جذبہ پیدا کیا اور عزم و استقلال کے ساتھ طوفانوں اور چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دیا

بڑھتا تھا کفر کہ اسلام کا نشاں نہ رہے
تڑپ کے روک لیا دل پہ وار کیا کہنا

ابتداء میں نجم آفندی پر بہت کچھ لکھا گیا۔ وہ کافی مشہور و مقبول ہوئے۔ چند عرصہ

ے بعد تقاضے چھوڑ دیا تو دھیرے دھیرے لوگ ان کو بھولتے چلے گئے۔ اب لوگ تجم آفندی کو بھول کے تو ایسے وقت میں ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کو ان کی یاد آئی۔ یہ آتے ہی ڈاکٹر صاحب نے بڑی جاں فشانی سے تحقیق کر کے تجم کے کلام کو مرتب کیا اور ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اس کتاب کا نام "کائنات تجم" رکھا۔ اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ جلد اول میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں اور قطعات ہیں۔ تجم کا زندگی نامہ وغیرہ بھی ہے۔ جلد دوم میں نوحے، سلام اور مرثیے ہیں۔ تجم کا ہندی کلام ہے۔ نثری شہ پارے بھی ہیں اور تاثرات زیارت بھی۔ نسخات باترتیب 1944 اور 1984 ہیں۔ اشاعت 2010ء میں ہے۔ یہ دونوں جلدیں دیدہ زیب چھپی ہیں۔ ان کی جلد بھی پختہ اور خوب صورت ہے۔ جلد سیاہ رنگ کی ہے اور سنہری حروف اور نقش و نگار سے سجی ہوئی ہے۔ کتاب کا نام بھی خوب صورت ہے "کائنات تجم" ڈاکٹر صاحب نے بڑے سلیقے اور دلکش انداز میں اس کتاب کی ترتیب و تدوین کی ہے اور دونوں جلدوں میں جامع مقدمے بھی لکھے ہیں۔ تجم کی سوانح عمری بھی دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔ ان کی شخصیت، شخصیت اور فن سے متعلق گوشوں سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ مطالعہ کرنے سے محققین و فن کاروں کو بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے بجا فرمایا ہے:

"کائنات تجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے، صرف ورق گردانی شرط ہے، شاید یہ میری بھی عقیدت اور ارادت و محبت ہو، یہ ایک خوش گوار خوش قسمتی ہے جس سے میں "کائنات تجم" دریافت کر سکا۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ کتاب بھی نہایت خوب صورت انداز میں شائع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے تحقیق کی وادی پرخار میں چھوٹے چھوٹے کنکر سے "کائنات تجم" مرتب کر کے تجم آفندی کی محبت و عقیدت میں ایک حیرت انگیز تاج محل تعمیر کر دیا ہے۔ موصوف نے یہ کارنامہ انجام دے کر محبان اردو کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔ تجم کی بھی یہی خواہش ہے کہ

شاعر ہوں ان کا تجم جو ہیں وجہ کائنات
ممکن ہے تا ابد مرا نام و نشاں رہے

فرحت آرا حیدری
(سابق معاون ایڈیٹر ماہنامہ "حکیم الامت" سری نگر)

"روپ کنوار کماری" ایک باکمال شاعرہ

گھر کے ماحول کا اثر بچوں پر کافی پڑتا ہے۔ اچھا ماحول ہو تو بچے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ برا ماحول ہو تو بچے بھی برے بن جاتے ہیں۔ ہر گھر میں مذہبی ماحول ہوتا ہے تو بچوں کو مذہبی واقفیت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن ایسے بھی ہیں جہاں نہ سال محرم منایا جاتا ہے، مذہبی و زنانی مجالس و محافل ہوتی رہتی ہیں وہاں سے بچوں واسطہ ہی نہیں معلوم ہوتا ہے اور یہ نہیں بتا سکتے کہ امام حسینؑ کس کے بیٹے تھے؟ ان کے کتنے بھائی تھے؟ کتنی بہنیں؟ ان کے کتنے بچے تھے؟ لڑکے کتنے تھے اور لڑکیاں کتنی تھیں؟ اور نہ یہ معلوم کہ بھائی کتنے اور بھتیجے کتنے تھے؟ کیوں کہ نہ ان کے بزرگ انھیں بتاتے ہیں اور نہ انھیں خود دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں سے سوال کریں۔ ہاں کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں کہ سوال کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ بچوں سے ہمارا مطلب ہے دس سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ سال تک۔

جب اہل اسلام کے بچوں کا یہ حال ہے تو غیر مسلم بچوں کو کیا کہا جائے۔ روپ کنوار کماری ہندو پنڈت کی لڑکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے رسولؐ و آل رسولؐ کی ساری داستان کیسے معلوم ہوئی اور ان سے محبت و عقیدت کیسے ہوئی؟ بلکہ آدمؑ سے لے کر آج تک کے حالات کیسے معلوم ہوئے؟ شعر کہنا الگ بات ہے۔ یہ تو خداداد چیز ہے۔ جس کو خدا توفیق کرے وہی شعر کہہ لیتا ہے اور اصلاح بھی کروا لیتا ہے۔ عموماً شعراء غزلیں کہتے ہیں۔ غزلوں میں گل و بلبل، حسن و عشق اور ہجر و وصل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اب تو ہر موضوع سخن پر غزلیں کہی جاتی ہیں۔ بے روزگاری ہو یا دنیا کی بے ثباتی لیکن ادب عالیہ ایسا موضوع سخن ہے اس میں بغیر سوچے سمجھے کوئی اشعار نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً اگر کسی کو کربلا موضوع بحث بنانا ہے

تو اسے امام حسینؓ کی پوری داستان معلوم ہونی چاہیے۔ فلسفہ شہادت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہیے۔ حق و باطل کے فرق کی سمجھ ہونا چاہیے۔ روپ کماری وہ چیز سے واقفیت تھی۔ سب باتیں ہمیں یہ معلوم ہوا ہے ہمارے خیال میں وہ ضرور کسی ایسے انسان کی محبت میں آ گئی تھی جس نے اس کو شروع سے آخر تک کا واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ کی اہمیت سمجھائی اور کس طرح سمجھائی ہے اس کے بارے میں ہم بات چیت ہوئی۔ روپ کماری سولہ سال کی عمر سے شاعری کرنے لگی۔ وہ صرف شعر ہی نہیں کہتی تھی بلکہ اسے خدا اور رسولؐ اور مذہب اسلام سے محبت و عقیدت ہوتی تھی۔ اس کا دل اسلام کی طرف جھک گیا تھا۔ وہ کہتی ہے

خدا اور شرک سے ہے پاک جو طینت میری
ہوش آتے ہی بڑھی کفر سے نفرت میری
مے توحید تھی گھٹی میں جو شامل ساقی
اس لیے طبع ہے اسلام پہ مائل ساقی

خدا اور شرک کی آغوش میں پلا اس نے
دل بتا میں تو کوثر میں نہلایا اس نے

روپ کماری نے غزلیں تو کئی کہیں مگر غزلوں میں جو کچھ حال اس نے بتایا تھا وہ سب چیستانوں میں تھا۔ روپ کماری نے وہ سارا ایک مخمس بعنوان تاثیر یزدی دیا۔ یہ واقعات اور روایت پر مبنی مخمس ہے۔ اس مخمس میں پانچ مصرعے آرام کے ہیں یہ وہ شہرہ آفاق شعر ہے جو صرف امام حسینؓ سے نہیں بلکہ آدم سے لے کر آخر تک سے حضرت و انبیاء علیہم السلام کے واقعات سے بھی واقف ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند بندوں کے چند شعر پیش کرتے ہیں جن میں انبیاء و رسل کے نام آتے ہیں

خطاب اسی سے ملا آدمی کو انسان کا
یہی تھا ذوق فزوں تر گل جنان کا
یہی تو گل ہے مری نظم کے گلستاں کا
یہی ثنا ہے نمونہ ہمارے ایماں کا

حجاب میں محمدؐ نے جانے کیا دیکھا
اسی سے پردہ میں ہم نے مگر خدا دیکھا

•••

اسی پہ حضرت آدمؑ کو رشک آیا تھا
اسی کو لوح پہ لکھا ہوا پایا تھا
جبھی تو آپ نے اپنا بھی حق جتایا تھا
خدا کے کھیت کا گندم کہاں سے کھایا تھا
خدا جو سمجھے خطا ہے یہ ترک اولیٰ تھا
کہ اس ثنا کا سزاوار میرا مولیٰ تھا

•••

اسی ثنا سے کھلا ہے میرے کلام کا باغ
یہی ثنا ہے فرشتوں کی انجمن کا چراغ
اسی ثنا سے مرا آج عرش پر ہے دماغ
اسی ثنا کا خدا تک لگا چکی ہوں سراغ
بنا ہوئی شب معراج اس ثنا کے لیے
جو مصطفیٰؐ کے لیے تھا وہ مرتضیٰ کے لیے

•••

مسیحؑ ان کے طریقہ پہ فخر و ناز کریں
جو فہم دیکھیں تو خود نوحؑ مرحبا کہہ دیں
کلیمؑ سن کے مناجات آئیں حیرت میں
یہ حال جب ہو تو احمدؐ یہ کیوں نہ فرمادیں
بھری ہیں سب صفتیں انبیاء کی حیدرؑ میں
ہیں تو سے خصلتیں ایک میرے برادر میں

•••

جمالِ پاک میں یوسف تو صبر میں ایوبؑ
وہ قوّت ان کی کہ داؤد بھی نہیں یا خوب
خلیلِ حق کی طرح سے خوش اسلوب
وہ زہد حضرت عیسیٰ و ہو بہو مرغوب
جو دیکھو فرِ سلیماں ہیں آپ حشمت میں
بنے بنائے ہیں آدم یہ علم و حکمت میں

•••

مرثیہ "عروسِ نظم کی زینت شہِ حیدرؑ سے ہے" (ص 109)

زمانے میں تھا لقب جن کا افصح الفصحیٰ
فصاحت اور بلاغت کا جن کی تھا چرچا
سخن شناس سخن سنج صاحبِ انشاء
یہ مدحتِ و فضائل ہوئی وہ حشمت کیا
کلامِ جن سے تھے شیریں وہ رشکِ فن نہ رہے
جہانِ شعر کے وہ خسروِ سخن نہ رہے

•••

جناب خضر سے پایہ پتہ سکندر کا
نہ تخت و بخت نہ شان اب نہ شکر کا
پتہ نہ کیفے و نہ تاجِ پُر زر کا
نہ دور ہے نہ رہے اب وہ جاہ و حشمت کیا
پڑی ہے اہلِ ہنر پر یہ کیا کہ نہیں
مدحتِ جم گیا رنگ اپنا جم گیا کہ نہیں

•••

مرثیہ "حسن کا مرثیہ زلفکار لکھتی ہے" (ص 248)

چلی جو ان کی محبت میں جی سے ہو گئی وہ
ہے تجربوں کی بنا پر یہ شعر کہتی وہ

التجا آٹھ پہر ہے مری ایشور سے یہی
بڑھ کے منصور سے رکھ بات جہاں میں میری
کلمہ منہ سے نہ بے جا میرے حاشا نکلے
قطرۂ خوں سے صدا ہائے حسینا نکلے

•••

آشیانوں سے پرند آڑ گئے حیواں بھاگے
ہر طرف ساکنِ کہسار و بیاباں بھاگے
پیل تن چھپ گئے شیران نیستاں بھاگے
لرد کی طرح عدو چھوڑ کے میداں بھاگے
شور دریا پہ ہوا ہائی الیاس آئے
غل علمداروں میں ہونے لگا عباس آئے

•••

مرثیہ ''کون سا دل ہے کہ جو دل نہیں دیوانہ عشق'' (ص 337)

روپ کماری کے مرثیوں میں منظر نگاری، جذبات نگاری، ساقی نامہ، فضائل و مصائب اور بین سب ہی کچھ ہے بلکہ ہر مرثیہ میں اس نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے ہیں۔

روپ نے ایک سو بائیس (152) بند کا مرثیہ حضرت عباس کے حال میں کہا ہے۔ اس کے اٹھارہ بندوں میں عشق مجازی کا ذکر کرکے حضرت عباس کی محبت اور وفا کا تذکرہ کیا ہے اور بعد میں آپ کی شہادت پیش کی ہے:

لکھ رہی ہوں میں حقیقت میں مجازی کا جو حال
یہ بلا جان حزیں کے لیے ہر دم ہے وبال
اختلاجِ دل مضطر ہے محبت کا مآل
ہو بیاں عشق حقیقی کا ہے دشوار و محال

سچ تو یہ ہے رد تسلیم و رضا مشکل ہے
سہل ہے عشق بشر عشق خدا مشکل ہے

رونق مدینی نے ایک سو سڑسٹھ (167) بند کا مرثیہ حضرت علی کے حال میں کہا ہے۔ مرثیہ میں بڑے پرشش انداز میں حضرت علی کی مدح کی ہے۔ پورا مرثیہ فضائل پر مبنی ہے۔ آخر میں علی صفدر کی شہادت پیش کی ہے۔ شہادت سے بند بڑے رقیق ہیں۔ مرثیہ کا پہلا بند ہے

عرش فرش کی زینت شاہ حیدرؑ ہے
بیاں کا حسن لطافت ثنائے حیدرؑ ہے
گل ریاض فصاحت ثنائے حیدرؑ ہے
خدا کی عین عبادت ثنائے حیدرؑ ہے
جو حق شناس ہیں ان کو ثنا یہ بھاتی ہے
یہی ثنا تو بہشت بریں دکھاتی ہے

رونق مدینی نے تراسی (83) بند کا مرثیہ حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے حال میں کہا ہے۔ مرثیہ میں بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے فضائل بھی بیان کرتے ہوئے اپنی خوش بختی پر نازاں ہیں۔

رسول خدا کی وفات کے بعد امت والوں نے دختر رسول کو بہت ستایا۔ بڑی ایذائیں پہنچائیں۔ وہ رات دن روتی تھیں اور اتنا غم کیا کہ اسی غم میں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ مرثیہ کا پہلا بند پیش خدمت ہے

بنت احمد مختار ہیں جناب زہرا
رونق شرم حیا ہیں جناب زہرا
خلق میں حق کی ولایت ہیں جناب زہرا
پرتو مہر نبوت ہیں جناب زہرا

باپ کی طرح سے کہتے رہے ہوں
ہم نے دنیا میں یہ نہ دیکھا ہوں

روپ کماری نے دنیا کی بے ثباتی پر ایک مرثیہ کہا ہے کہ دل بیٹھ سا جاتا ہے۔ یہ مرثیہ ایک سو بائیس (122) بند کا ہے۔ اس میں دنیا کی ناپائداری پر تقریباً پینتیس (35) بند ہیں۔ آخر میں امام حسینؑ کی شہادت کا حال بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کا پہلا بند ہے

جہاں کا ورق زر نگار فانی ہے
یہ زیست چمن روزگار فانی ہے
بشر کا حسن گلوں کا سنگار فانی ہے
خزاں پکار رہی ہے بہار فانی ہے

چمن میں ہوں گے پریشاں دماغ پھولوں کے
بجھیں گے بادِ خزاں سے چراغ پھولوں کے

روپ کماری نے ایک سو سینتیس (137) بند کا مرثیہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حال میں بھی کہا ہے۔ پورے مرثیہ میں مدح و ثنا کی ہے اور آخر میں امام حسینؑ کی شہادت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو بڑے بند میں ہے۔ اس مرثیہ کے پہلے بند کا پہلا مصرعہ ہے

ع "بحر وحدت کی شناور ہے طبیعت میری"

یوں تو ہر دیب ہر شاعر نے ذکر کیا ہے کہ رسولؐ خدا کا سایہ نہیں تھا۔ یوں نہیں تھا؟ کس لیے نہیں تھا؟ کیا مصلحت تھی؟ اس بارے میں سوال و جواب کرکے روپ کماری نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں کہ رسولؐ خدا کا سایہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ہم اٹھارہ بندوں کے بجائے صرف پانچ بند پیش کریں گے

میں یہ سنتی ہوں قد پاک کا سایہ بھی نہ تھا
لاکھ کی فکر ولیکن یہ معما نہ کھلا
متعجب ہوئی میں بے حد کہ تعجب کی تھی جا
ناگہاں بڑھ کے میری عقل رسا نے یہ کہا
بھید دنیا میں کسی نے نہیں پایا ان کا
مجھ سے سن حیدر کرارؑ ہیں سایا ان کا

•••

لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا سایہ ہے معدوم
پر میں اب کہتی ہوں راز خدا سے مفہوم
چار سو خلق میں سایہ کے نہ ہونے کی ہے دھوم
لو بتاتی ہوں میں تمہیں میں جو ہے مجھ کو معلوم
قول قرآں کا ہے یہ ظل ہیں حضور
اب تو ثابت ہوا یہ نور کا سایہ بھی ہے نور

•••

سایہ کے ساتھ سائے کی طرح ذہن گیا
جستجو کرنے میں تب سایہ کی پردہ یہ کھلا
آپ سے سایہ وحدت سے جو تھا حسن ادا
اس لیے ہجر تھا مشکل ہوا دم بھر نہ جدا
جا کا نورالٰہی سے نہ ہٹ کر سایہ
رہ گیا جسم منور سے لپٹ کر سایہ

•••

[illegible] سایہ میں مانی ہوں مضامین سے میں باغ
بزم وحدت کا یہی سایۂ عالی ہے چراغ
حق سے ملتا ہوا اس سایہ کا پانی ہوں رنگ
[illegible] عرش پہ پہنچا ہے دماغ
تھی یہ معراج میں بھی ناز و ادا کی صورت
سایہ پردے میں رہا راز خدا کی صورت

•••

[illegible] سایہ سے نہ ہونے کا خلاف یہ سبب
[illegible] تھے مسلمان عرب

ہر قدم سایہ پہ رکھتے تو یہ تھا ترک ادب
اس لیے ہوئیا حسنین کی وہ شکل میں اب

کیوں نہ پیارے ہوں محمدؐ کو یہ جانی دونوں
سایۂ احمدؐ ہوں جب احمدِ ثانی دونوں

روپ کماری نے پورے مرثیہ میں حمد و ثنا کے پھول کھلائے ہیں اور اپنی دکھ درد بھری آپ بیتی بیان کی ہے:

قصہ کوتاہ یوں ہی غم میرا بٹ جاتا ہے
دن اسی مدح میں مداح کا کٹ جاتا ہے

واضح رہے روپ کماری کے کلام کی اصلاح کرنے والے وہ عظیم شعراء تھے۔ فضل رسول فضل اور نجم آفندی۔ فضل رسول نے جب دیکھا کہ روپ کماری عاشق رسولؐ و آل رسولؐ ہے اور اس نے دل سے کلمہ پڑھ لیا ہے تو انھوں نے روپ کماری کو "بیٹی فاطمہ زہراؑ" کا خطاب دیا۔

عالمی شہرت یافتہ ادیب، شاعر، فلسفی اور دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مذکورہ بالا تحقیق کرکے روپ کنوار کماری کا کلام جمع کیا اور کتاب چھپوائی جس کا نام "روپ کنوار کماری شخصیت فن اور مجموعہ کلام" رکھا۔ پروفیسر ابو حیدری شمیری اپنی کتاب "ہندو مرثیہ گو شعرا" (2004ء) میں رقمطراز ہیں کہ

"اردو مرثیہ نگاری میں محترمہ روپ کماری تخلص روپ اور کنوار میری آنکھوں میں ایک معمہ بن کے پھر رہی ہے۔ ان کے حالات زندگی مجھے کہیں نہیں دستیاب ہوئے۔ کوئی انھیں فضل رسول فضل کے تلمذ میں شامل کرتا ہے اور کوئی علامہ نجم آفندی اور اکبر الہ آبادی کے شاگردوں میں شمار کرتا ہے۔" (ص:245)

لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے زیر نظر کتاب (اشاعت 2010ء) میں بہت سے ثبوت پیش کرکے ثابت کردیا ہے کہ روپ کماری کا وجود تھا اور وہ باکمال شاعرہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بطور سند کئی سلام و مراثی بحظ روپ کنوار کماری پیش کیے ہیں۔ اس

[illegible] فضل رسول فضلی اور قلمی نسخہ مع اصلاح کو بھی شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں مزید ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں

"یہ حقیقت ہے کہ راقم کی ذاتی لائبریری واقع ورنو نیڈا میں روپ ماری کے ہاتھ سے لکھے مراثی جناب فضل رسول صاحب کے ہاتھ کی اصلاح اور اصلاح کے تعلق سے لکھے گئے تحریری خطوط خود فضل رسول صاحب کے دستخط کے ساتھ موجود ہوتے تو ثابت ہو جاتا اور حقیقت تک نہیں پہنچتی اور روپ ماری تخیلاتی پیکر بن کر اردو ادب کی خلاؤں میں گم ہو جاتی۔" (ص 34)

مذکورہ کتاب 418 صفحات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ کتاب میں روپ ماری کے پانچ مراثی اور سلام کے علاوہ روپ ماری کا تعارف اور تنقیدی کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ نیز روپ ماری کی مختصر سوانح عمری، منظوم خود نوشت اور "روپ ماری فن اور شخصیت" جیسے اہم باب بھی ہیں۔ خوشبیر ڈاکٹر تابش مہدی نے مذکورہ کتاب شامل [illegible]

روپ ماری [illegible] بھی تین مہمان لیے ہیں۔

عطیہ شبیر جعفری
ٹورنٹو (کینیڈا)

مرثیہ نگار محترمہ روپ کماری کے متعلق چند لائنیں پیش ہیں

ہندو پاکستان میں تقریباً ہر شیعہ گھرانے میں خواتین کی سوز و سلام خوانی نوحہ خوانی اور مرثیہ خوانی کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کی مرثیہ نگاری کی مثالیں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہیں۔ اگر ہیں بھی تو ان کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ایسی ہی خواتین میں ایک اہم مثال روپ کماری کی مرثیہ نگاری کی ہے۔ ان محترمہ کا تعلق یوپی کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ ہندو گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی بہت عالم و فاضل خاتون تھیں۔ قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنا نام تبدیل کر کے فاطمہ رکھ لیا تھا۔

مرثیہ اور منقبت نگاری میں ان کے استاد ہماری برادری کے بزرگ عالم اور مرثیہ نگار جناب سید فضل رسول صاحب کا تعلق اس برادری سے ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں اور جس کو مجموعی طور پر ''سادات بجھت پور اور نوح'' یا ''سادات آگرہ یا نوح'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان سادات کا تعلق موجودہ راجستھان اور یوپی کی مندرجہ ذیل بستیوں سے تھا۔ بیانہ، بجھت پور، پہرسر، سید پورہ، ہیلک، شاہ گنج آگرہ، اول، مہابن اور راہ روہ وغیرہ وغیرہ

فضل رسول صاحب کو میر انیس کے بھائی میر اُنس سے ابتدا میں اصلاح لینے کا شرف حاصل رہا تھا۔ فضل رسول صاحب کے والد ماجد جناب وزیر حسین صاحب تھے، جن کی مشہور و معروف تصنیف ''چہل مجلس شبیر'' ہے، جس کا تاریخی نام ''ذائقہ ماتم'' ہے، اس

کی تکمیل ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں ہوئی۔

جناب تقی عابدی صاحب تمام مقررین کی جانب سے مبارک باد اور خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے بعد رفیق اب سے متعلق تاریخی معلومات سے باب میں سب سے پہلے تصرف رباب مارکی سے بعد ان سے اختتام جناب فضل رضوی صاحب، ۱۰۰ فوں سے کلام اور سوانحی حالات سے اپنی اس کتاب کی مدت سے تقریباً ۲۰ سال سے ہمارے لیے ایک تاریخ مرتب کی ہے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

''غالبؔ: دیوانِ نعت و منقبت'' ایک جائزہ

تقدیسی اصناف سخن میں سوائے مرثیے کے اور کسی صنف کی بارگاہِ ادب میں اتنی پذیرائی نہیں ہوئی، جتنا کہ ان کا حق تھا۔ حالاں کہ ان کی سطروں میں بلاغت کے عمدہ نمونے پوشیدہ ہیں۔ ان کی تراکیب کی، انتخاب آفرینی اور جمالیاتی اقدار دیگر اصناف سخن سے کم نہیں، بلکہ اہل نظر کے یہاں کچھ زیادہ ہی سجائی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ناقدین شاید معتقدانہ ادب سے پہلو تہی برتنے ہی میں اپنی نجات متصور کرتے رہے ہیں۔ درآنحالیکہ افلاطون جیسا دانا جس نے اپنی جمہوریت سے شاعروں کو جلاوطن کرنے کا حکم دیا تھا، ہومر اور اس کی الیڈ سے اشعار سے منحرف ہو جانے کے باوجود ایسی شاعری جس میں حمد یا بزرگوں کی مدح و منقبت ہو قبول کر لیتا تھا۔ اس شہادت کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دنیائے ادب میں باوجود انحراف برتے جانے کے تقدیسی ادب ہی کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ یقیناً چاہے حمدیہ دواوین ہوں یا عقیدتاً پارے، منقبت و سلام کے مجامع ہوں یا مرثیہ و نوحے کلیات یہ دنیائے ادب پر ہمیشہ غالب رہیں گے، اور آج بھی ان کے تفوق سے انکار ناممکن ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے غالبؔ کا تخلص برمحل استعمال کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حمد، نعت و منقبت ایک اصناف ہیں جو غالب رہنے والی ہیں۔

ہمارے تقدیسی ادب میں شاعری کے ذیل میں حمد و مناجات، نعت و منقبت اور سلام و نوحہ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ غالبؔ نے شغل مے و بادہ کے ساتھ ہی صہبائے عقیدت مذہبی کو بھی نوش جان فرمانے کے شعوری طور پر جتن کیے ہیں۔ ان کی شوخ اور چلبلی طبیعت (جو کشاکش حیات کے ردعمل کا نتیجہ تھی) کی وجہ سے بظاہر مذہب جیسے قشقہ آمیز امر

میں بھی وہ غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن بہ باطن ان کا ایمان و ایقان بڑا پختہ تھا۔ ان کا مذہبی شعور بڑا بالیدہ تھا اور عقیدہ مذہبی ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ غالب کے یہاں دنیاوی لذت کے مضامین غیب سے اتنے نہیں اترتے جتنے مذہبی نوعیت کے مضامین ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ زیر تذکرہ کتاب "غالب دیوان لذت و منقبت" سے عیاں ہوتا ہے کہ غالب نے فارسی و اردو دونوں زبانوں میں تقدیسی اصناف پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان سارے کلام پر غالب آ گیا۔ میں مبارک باد پیش کرتا ہوں ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کو کہ انھوں نے غالب کا تقدیسی اصناف پر سارا کلام یکجا کر دیا۔

حمد نگاری کی ابتدا اس وقت سے ہوئی ہے جب عیسائیوں اور عیسائیوں نے اپنے تعبد نہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے اور کاغذ پر صنعت گروں نے نقش و نگار بنی ہوئی اینٹوں پر مذہبی شاہ پارے تخلیق کیے تھے جو نوری ہوئی قوموں سے نمونے ورثے میں ملے تھے۔ آج تو دنیا ہی بدل گئی ہے یہ روحانی نغمے بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ غالب کے یہاں نہ صرف یہ کہ حمدیہ عناصر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے بلکہ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے قرآن کی مستقل حمدیں بھی تلاش کی ہیں اور نہایت سلیقے سے ان پر اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں۔ قاری حمدوں سے زیادہ تر نعتوں کی جانب عام قاری ان سے منہ تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔

غالب کی قاری حمدوں کا بیشتر حصہ شعری قصیدہ و مثنوی ہے۔ مثنوی کی ابتدا چونکہ حمد ہی سے ہوتی ہے اس لیے شاعر کو ضابطہ کی پابندی کی خاطر حمد لکھنی پڑتی ہے، لیکن غالب نے حمد کے ابیات میں بیک وقت قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں بلاغت بھی ہے اور اللہ رب العزت کی جلالت کا اظہار بھی۔ قصیدے میں غالب نے "تمہید" کا پہلو نہایت شاندار طریقے پر نکالا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی موثر انداز میں ان کی نشاندہی کی ہے۔ دوسری حمد غالب کی ناتمام مثنوی "ابر گہربار" کی ہے۔ کتاب میں اس کا ترجمہ بڑی سلیس اور رواں دواں ہے۔

غالب نے چار بند میں حمد کہنے کا شعور دیا ہے، لیکن ابر کے عنوان سے بھی حمد کہی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے اس کی خوشنما اور دلکش تشریح بھی کامیابی سے کی ہے۔

لیے وہ بارگاہ ایزدی میں دست دعا دراز کرتے ہیں۔ دعا دراصل رفع احتیاج کے لیے اللہ برتر کے آگے طلب استعانت ہوتا ہے۔ دعا میں غایت عجز اور آہ و زاری ضروری ہے۔ تضرع و الحاح کی ایسی حالت اللہ کی ذات کو بندے کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن ۶۰) اور اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (سورہ اعراف ۵۵)۔

عابدی صاحب نے دعا کے ذیل میں ایک مناجات دعائے صباح اور دعائے حضرت سجاد کے فارسی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت سجاد امام زین العابدین کی دعا کا منظوم ترجمہ جو غالب کی رشحات قلم کا نتیجہ ہے بڑا موثر اور رقت انگیز ہے۔ یہ وہ امام ہیں جن کے فقر کے سامنے سطوت خسروی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ یہ وہ امام ہیں جن کے متعلق فرزدق نے ہشام بن عبدالملک کو کہا تھا۔

"یہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین کی اولاد ہے۔ یہ متقی پاک صاف اور سردار ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے قدم و سر حرم جانتا ہے یہ وہ شخص ہے جس کو بیت اللہ جانتا ہے۔ اس وجہ سے وہ پہچانتے ہیں۔ یہ وہ شخص ہے کہ جب حجر اسود کا بوسہ دینے کے لیے اس کے قریب جائے تو حجر اسود کو نہ اس کے ہاتھوں کا استلام کرے۔

یہ وہ شخص ہے جس نے بجز "لا الہ" کے کبھی لا نہیں کہا۔

او ہشام! اگر تو اس سے جاہل ہے تو سن کہ یہ فاطمہ کی اولاد ہے اور اس کے نانا پر نبوت ختم کر دی گئی۔ تیسرا یہ ہے کہ یہ کون ہے اس کو عیب نہیں گا سکتا۔ جس کے پہچاننے سے قرن انکار کر دیا ہے اس کو عرب جانتا ہے۔

یہ وہ شخص ہے جو شرم کی وجہ سے اپنی آنکھ نیچی رکھتا ہے اور ساری دنیا اس کی عظمت اور ہیبت سے آنکھ نیچی رکھتی ہے۔

یہی حضرت زین العابدین احرام باندھتے وقت "لبیک" اس خوف سے نہیں کہتے کہ کہیں جواب میں بارگاہ ایزدی سے "لا لبیک" کی صدا نہ آجائے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی ظاہری حالت میں خوف خداوندی کا یہ عالم

ہوتو دعا کی کیفیت میں آپ کی رقت و زاری کا کیا عالم رہتا ہوگا۔

غالب نے حضرت صاحب کی ایسی ہی ایک آخری آمیز دعا فارسی میں منتقل کیا ہے، جس میں جذب و اضطرار اور عجز و انکسار سے عاجز بندے کی سب کی سب کی نمایاں ہوتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب دعا "دعائے صباح" کا منظوم ترجمہ بھی خوب ہے۔ انا صاحب نے نہایت اہتمام سے ان کے قدیم نسخے کی عکس ریزو کاپی کاتی دلی پتا کے مخطوطہ سے ساتھ کتاب میں شامل کر دی ہے۔

اس دیوان میں غالب کی نعتوں کے ساتھ ان کا "معراج نامہ" بھی شامل ہے۔ یہ نعتیں مختلف اصناف میں لکھی گئی ہیں۔ ایک غزل کی صنف میں چار قصیدے میں اور تین مثنوی کی شکل میں ہیں۔ ایک قصیدہ خمسہ برغزل قدسی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نعتیہ رباعی دو قطعات و ارادہ کے پانچ نعتیہ اشعار بھی شامل کتاب ہیں۔

غالب نے اپنے "معراج نامے" میں فلک ان کے سیارے اور برجوں کا ذکر کیا ہے جو علم نجوم سے متعلق ہیں۔ اس قسم کی منظومات عربی، فارسی میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابن عربی کی فتوحات میں ابو العلاء معری کا رسالہ "غفران" اور فارسی میں "جاوید نامہ" وغیرہ لیکن آخر الذکر دونوں کتابیں معراج نامے نہیں ہیں۔ اردو میں اس نوع کا معراج نامہ بھی نذیر فتحپوری نے بھی لکھا تھا۔

ڈاکٹر تنویر عابدی صاحب نے غالب کی نعتیہ غزل کا تجزیہ بھی خوب کیا ہے اس نعت میں عقیدت رسول آفرینی کی چلمن سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے باقی نعتوں میں غالب کا عشق رسول نمایاں ہے۔

غالب کی فارسی نعت و منقبت کی سے تحقیقی صاحب نے غالب کی وہ مشہور نعت شامل کتاب کی ہے جس میں ان سے زمانے میں پیغمبری بیٹھی بحث "فتاح الفتح فی تہ الفتین" کی تحقیق ہے۔ بتایا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم غالب سے بڑے کا رتبے رکھتے تھے انھیں وجوہات سے بڑی مدتی۔ مولانا نے مرزا سے اصرار کیا کہ فارسی میں ہندوستان سے خلاف یہ مثنوی لکھ دیں جس میں مسئلہ "فتاح الفتح فی تہ الفتین" کی شرح و بسط سے ساتھ تحقیق کر دیں۔ مرزا نے اس فرمائش کی تعمیل میں یہ مثنوی لکھ دی۔

مگر انھوں نے نہ مانا تو چار مرزا نے ایک مثنوی لکھ کر انھیں سنائی۔ اس مثنوی میں مرزا نے "مسئلہ امتناع النظیر" کے باب میں مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا۔ اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ بعد میں مولانا کی رضا جوئی کی خاطر غالب نے مثنوی کو ان دو اشعار پر ختم کیا جن میں خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی صراحت ہے۔

منفرد اندر کمال ذاتی است　　لاجرم مثلش محال ذاتی ست

ریں عقیدت برگزیدم در اسلام　　نامہ را درمی نوردم در اسلام

اس نعت کا ظ انصاری کا کیا ہوا ترجمہ بھی خاصے کی چیز ہے۔

رہی منقبت! تو ہمارے یہاں دل تو اسے صنف شاعری ہی میں شمار نہیں کیا جاتا۔ موضوعی صنف سخن کے زمرے میں بھی اس پر کم توجہ دی گئی ہے۔ منقبت اصطلاح میں اہل بیت، اصحاب کبار اور اولیاء اللہ کی توصیف بیانی کا نام ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کا دامن منقبت کے شہ پاروں سے بھرا پڑا ہے۔ اردو ادب میں تو منقبت اہل بیت اور اصحاب کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مستقل مبسوط کتابیں دستیاب ہیں اور الحمد للہ مجتبیٰ یونیورسٹی میں رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ کی زیر نگرانی اس پر کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی اس ضمن میں یہ اولین کوشش ہے کہ آپ نے غالب کی منقبتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ منقبت سے متعلق بعض اصطلاحات کی وضاحت بھی اسی ضمن ہی اس میں ہو جاتی تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا۔ مثلاً "اہل بیت، اثنا عشری نظام، یوم غدیر، نادعلی مظہر اللہ وجہہ، انگشتری علی، شیر خدا، وغیرہ وغیرہ کہ ان میں سے بعض کا استعمال باقی کے "معراج نامے" جیسے معراج ناموں میں بھی ہوا ہے، اور منظوم سیرت رسولؐ میں بھی۔ عام قاری ہی نہیں بلکہ بعض اساتذہ بھی ان کے معنی و مفاہیم سے لاعلم ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ غالب کی منقبتی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور منقبت کی باریکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

سلام و نوحے ابھی تحقیق کے منتظر ہیں۔ 15-10 سال قبل انجمن یونیورسٹی میں سلام نگاری پر کام ہوا تھا لیکن وہ صرف مقالے میں بند رہا۔ منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب سابقین اولین میں شمار ہوتے ہیں۔

غالب نے زمانے کی صعوبتیں خوب جھیلی تھیں۔ اس لیے بعض اوقات تغزل میں

بھی نوٹس کی رقت پیدا ہو جاتی تھی۔ کلکتہ کا ہوا کہ یہ اپنی غزل کی ردیف و قافیہ بائے
بائے، اور روتے ہوئے رزمیہ کرتے ہوئے بائے بائے یوں میں قافیہ بائے بائے اس قبیل
کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طبیعت ہی افسردہ ہو تو
فن بطور تقلید کے میں چھچھورے پن کا اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس
ضمن میں بھی غالب کے نوٹس کی نشاندہی کی ہے۔

کتاب کے تین حصے ہیں غالب سے متعلق چند مضامین بھی انتہائی معلومات
افزا ہیں۔ نہایت باریک بینی سے آپ نے تحقیق کر کے غالب کی زندگی کے مختلف گوشوں کو
اجاگر کیا ہے۔ میں ایک بار پھر ڈاکٹر صدیقی عابدی کو ہدیہ تبریک پیش کرتے اپنے مضمون کو
ختم کرتا ہوں۔ وما علینا الا البلاغ. وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب
العالمین۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

تقی عابدی اور ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت''

غالبؔ کا دیوان نعت و منقبت ڈاکٹر تقی عابدی صاحب (کینیڈا) کا گرانمایہ شاہکار ہے جو دسمبر 2011ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ کتاب بڑے سائز (29×19 سنٹی میٹر) میں نہایت مضبوط، خوب صورت جلد، عمدہ اور دبیز کاغذ پر 521 صفحات پر مشتمل ہے۔ غالبؔ پر ایسی ضخیم اور معلوماتی کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ تین چار برسوں میں رثائی ادب پر ''تجزیہ یا کارانیس''، ''مثنویات دبیر''، ''ابواب المصائب''، ''روپ سنوار کربلا کی'' اور ''کائنات غم'' کے بلند و بالا کارنامے پیش کر کے شہرت عامہ اور بقائے دوام کا تاج پہن کر اردو دنیا میں اپنی مقبولیت کا سکہ بٹھا دیا۔

ڈاکٹر صاحب کسی یونی ورسٹی کے اردو فارسی کے استاد نہیں بلکہ ماہر طب یعنی معالج ہیں۔ ان پر اپنے پیشہ کے ارغم ایک ذوق غالب ہوا ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تین درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک اور بلند پایہ کتاب ''سبد سخن'' اعلیٰ درجہ کے کاغذ اور خوب صورت جلد کے ساتھ شائع ہوئی۔ کتاب مذکور کے تمیں تحقیقی اور تنقیدی مقالات پر مشتمل 383 صفحوں میں ہے۔ سبھی مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔

غالبؔ پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حکومت ہند نے اس عظیم شاعر اور آزاد خیال انسان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے لیے غالبؔ انسٹیٹیوٹ محض اس لیے قائم کیا تھا کہ غالبؔ کے ہمہ جہت پہلوؤں پر تحقیق کر کے روشن کیا جائے۔ ابتدائی چند برسوں میں تھوڑا بہت کام ہونے لگا تھا، لیکن اب سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اگر یہ ادارہ ڈاکٹر عابدی صاحب کے زیر نظر کارنامہ کو ہاتھ میں لیتا تو برسوں تک مکمل نہ ہو جاتا۔ میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا

ہوں کہ انہوں صاحب کا یہ بے مثال کارنامہ غالبیات میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہے۔ پاکستان میں بھی "ادارۂ یادگار غالب" کراچی میں قائم کیا گیا۔ وہاں بھی غالب پر کتابیں چھپی ہیں۔ لیکن ایک بھاری بھرکم کتاب تحقیقی مواد کے اعتبار سے وہاں بھی نظر نہیں آتی ہے۔ برصغیر میں آج تک ادبی حلقوں میں "دیوان غالب" اور "خطوط غالب" ہی نظر آتے تھے اس لیے کہ غالب کی فارسی تصانیف سے اردو والے بے واقف نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ ان کی قدر و منزلت پر کوئی کام کیا جاتا۔

میں نے چند سال قبل بینڈ امیں انہوں صاحب کا بے نظیر کتب خانہ دیکھا۔ اس میں اردو و فارسی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے جس سے موصوف شب و روز استفادہ کرتے رہتے ہیں اور وہ تھوڑے سے عرصہ میں کوئی ضخیم کتاب مرتب کریں تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ جو بھی کتاب وہ لکھتے ہیں اس میں ان کے خلوص کے ساتھ ساتھ محنت و مشقت کا کام بھی کارفرما رہتا ہے۔ نہ معلوم وہ تحقیقی وشوں واجبہ کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے رہتے ہیں۔ آج کل ہمارے ہاں میں تحقیقی ادب کا فقدان ہے۔ لوگ محنت نہیں کرتے ہیں بلکہ آسان طریقوں سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مجھے کئی یونیورسٹی میں کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ کئی مقام پر ایسے نوجوان پڑھانے پر مامور ہیں جن کو میں نکما کہتا ہوں۔ ان کی تحقیق میں کبھی وہ وقت نہیں آتا۔ مقصد یہ کہ غالب پر طالب علموں کے تحقیقی دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

انہوں صاحب پہلے ادیب ہیں جنھوں نے غالب کے اس پوشیدہ ادب کو نہایت دیدہ ریزی سے پیش کیا جس میں غالب نے معلومات و جوابات کی بنا پر نظر انداز کیا تھا۔ یعنی غالب کا وہ فارسی ادب جس میں انھوں نے ہم عصر محمد آل محمد کی شان میں کل ۱۰۰ قصیدے پیش کیے تھے۔ مرتب نے غالب کے خطوط سے اس قسم کے تقریظی جملے بھی تلاش کر کے کتاب میں دیے ہیں جن سے ان کے تہذیبی معتقدات روشن ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ غالب کا یہ ان محبت و عقیدت محمد و آل محمد کے موضوع پر غالبیات میں پہلا کارنامہ ہے۔

انہوں صاحب نے راقم الحروف کو بذریعہ خط و کتابت میں فون پر اطلاع دی تھی کہ

وہ اس کتاب کی رسم رونمائی دہلی کے علاوہ الہ آباد اور لکھنؤ وغیرہ مقامات پر کروا چکے ہیں اور وہ لکھنؤ 20 دسمبر کو پہنچ رہے ہیں لہٰذا میر لکھنؤ میں ہونا ضروری ہے۔ کتاب 18 دسمبر 2006ء کی رات میں موصول ہوئی۔ ''حرفے چند'' نورنو (سینیڈا) میں 28 نومبر 2006ء کو لکھا گیا تھا۔ اتنے قلیل وقت میں کتاب کا دہلی میں اشاعت پذیر ہونا معجزے سے کم نہیں ہے۔ بہرحال میں نے پوری کتاب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی۔ ڈاکٹر صاحب 20 دسمبر کو لکھنؤ پہنچے۔ دوسرے دن 21 دسمبر کو لکھنؤ یونیورسٹی میں جناب پروفیسر آر پی سنگھ وائس چانسلر کی صدارت میں کتاب کی رسم رونمائی ایک بڑے ادبی جلسے میں قرار پائی۔ پروفیسر ولی الحق انصاری مہمان خصوصی تھے۔ مقررین میں پروفیسر انیس اشفاق، شارب ردولوی، شاہ عبدالسلام شمس تبریزندوی اور کاظم علی خان تھے۔ راقم حروف نے مقالہ پڑھا۔ آخر میں ڈاکٹر عابدی صاحب نے اپنی طویل تقریر میں پوری کتاب کا مختصر جائزہ لیا تھا۔ کتاب کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں -

صفحہ 8 ''رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے''

صفحہ 10 ''حرفے چند'' میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ''غالب کی نعت و منقبت کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا بحر بیکراں کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں۔ پھر بھی اس سنگ گراں کو میں نے یکہ و تنہا بلند کرکے محراب عشق پر جمادیا ہے۔ میری زبان اور میرے بیان پر فارسی کی گہری چھاپ ہے جو شاید میرے فارسی مطالعہ اور ذہنی ماحول کی وجہ سے ہے۔ راقم نے بعض مقامات پر خود فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور بعض مقامات پر اگر فارسی ترجمہ حاصل ہوا تو شکریہ کے ساتھ اس بیاض عشق میں شامل کیا۔''

صفحہ 43-13: ''غالب کا زندگی نامہ''

صفحہ 44 ''جدول دیوان نعت و منقبت'' کے تحت کل اشعار کی تعداد 2888 (اشعار فارسی 2649، اشعار اردو 239)

صفحہ 51-45 جدول دیوان نعت و منقبت

صفحہ 60-52 غالب اور ذوق (ادبی معرکہ یا ادبی مغالطہ)

صفحہ 85-61 غالب غزل پر ہوتے ہوئے میر سے مغلوب کیوں۔

صفحہ 86-88 نیویارک لائبریری میں دیوان غالب کا نایاب نسخہ

صفحہ 89-96 غالب کی حمد پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ۔ اس کے بعد غالب کی فارسی حمد کے 52 شعر۔ حمد عرفی کی زمین میں ہے مطلع یہ ہے ؎

اے ز وہم غیر عنقا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

صفحہ 98-104 "مثنوی نامہ معصوم" پر ایک بار پھر تبصرہ

ترجمہ: "حمد کہ جس سے تحریر آہستہ بڑھ جاتی ہے اور بات بیان میں وسعت پاتی ہے۔

صفحہ 139-144 غالب کی فاتحہ اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں "ہر قرآن مجید سے پہلے سورہ حمد کی تلاوت کرتے ہیں اس لیے اس کو فاتحہ پڑھنا یا فاتحہ خوانی کرنا بھی کہتے ہیں۔ برصغیر کے اسلامی ماحول میں شہدا کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ پڑھنے کا رواج پرانا ہے جس میں شربت اور مٹھائی پر فاتحہ پڑھ کر تقسیم کی جاتی ہے۔ یہاں فاتحہ پڑھنے والے قبر کے کتبے سے ہو کر باتوں کو اٹھا کر [illegible] میں سورۂ حمد پڑھنے کے بعد پڑھی جانی والی دعائیہ شعر پڑھتا ہے۔ غالب کے فارسی کلام میں ایسی دو فاتحہ ہمیں نظر آتی ہیں۔ پہلی فاتحہ میں (۱۰) اشعار اور دوسری فاتحہ میں (۱۱) اشعار ہیں۔"

اس کے بعد دونوں فاتحہ میں پہلا معصومین کی شان میں غالب کے بہترین اشعار کی جداں مرتب کی ہے۔ حضور ارمغانش میں کہتے ہیں ؎

بزم بخشائے کہ گر جوشد بہار رحمتش
بر فلک خویش لرزد چوں دل مجرم عذاب

(یعنی جب بخشش کی رحمت بخشنے کے لیے جوش میں آتی ہے تو خود اپنا ہی دل اور آسمان کانپ جاتا ہے جیسے کہ مجرم کا دل عذاب سے ڈرتے ہے۔)

دوسری فاتحہ میں کہتے ہیں ؎

حرمت جان محمدؐ بیک نظر کن سوئے من
یا علیؑ یا مرتضیٰؑ یا بوالحسنؑ یا بوترابؑ

دوسری فاتحہ میں دعا کرتے ہیں۔ اس کے سبھی اشعار کی مفصل تشریح محاسن کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ دو اشعار کی تشریح چھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو

حق جلوہ گرز طرزِ بیانِ محمدؐست
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐست

اس شعر کا ترجمہ اور وضاحت یوں کی گئی ۔ ''حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیٰؐ کے انداز بیان سے، ہاں حق کا کلام محمدؐ کی زبان سے جاری ہوا۔'' (تشریح و محاسن) خدائی معرفت اور دین اسلام حضرت محمدؐ کی گفتگو ہی سے ظاہر ہوئے اور بے شک قرآن کریم اور احادیث قدسی کو ہم نے محمدؐ کی زبان سے ہی سنا۔ مصرعہ اولیٰ میں ترکیب ''طرز بیاں'' غالبؔ کا منفرد ''طرزِ بیان'' ہے اور یہی پورے شعر کی جان بھی ہے۔ مسلمانوں سے ہٹ کر قریش کے کفار اور مدینہ کے مشرکین بھی اس بات سے قائل تھے کہ پیغمبر اسلامؐ سچے، امین اور صادق تھے۔ ان کی زبان سے کبھی غلط یا جھوٹا بیان ادا نہ ہوا۔ یہی محمدؐ کا طرز بیان تھا اور یہی محمدؐ کے لہجے کا اثر بھی تھا کہ جو شخص بھی انھیں سنتا تھا وہ دل سے ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا۔ اسی لیے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کو جب لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے سنا کسی تامل اور شک کے فوراً قبول کیا اور ان کو من و عن محفوظ کیا۔ مختصر الفاظ میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو، دین خدا کو اور کلام خدا کو محمدؐ کے ذریعہ سے پہچانا۔ غالبؔ نے اس شعر میں سورۂ النجم کی آیت تین اور چار سے استفادہ کیا کہ ''اور نہ اپنی خواہش سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ تو حکم خدا کہتے ہیں جو بھیجا جاتا ہے۔'' اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کی دو مثالیں ہیں یعنی بیان، زبان اور کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ حق، کلام حق اور محمدؐ کو بھی ایک ہی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر میں صنعت تلمیح ہے جس میں حق سے مراد ھوالحق، حق تعالیٰ اور کلام حق سے مراد قرآن مجید ہے۔ پورا شعر صنعت تعلیق میں ہے۔

صنعت مسجع متوازی میں دونوں قافیے ''بیان اور زبان'' ہیں جو ہم وزن ہم عدد اور

حروف روی میں برابر ہیں۔

صفحہ 189-220 "غالب کا معراج نامہ" ہے۔ اس کا جو تجزیہ انھوں صاحب نے کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"فارسی اور اردو ادب میں اب تک معراج نامہ کو لیجیے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ موضوع کا تسلسل مطالب کا ہجوم اور ہر گوشہ واقعات، مناظر اور مکالمات کو نظم کرنے میں سہولت کی خاطر عموماً دوسری ہیئت پر مثنوی کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہم نے "مثنویات دبیر" میں دبیر کے معراج نامہ، جس میں کل 1084 اشعار ہیں تفصیلی تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ یہ مثنوی 1837ء سے قبل کی تصنیف ہے۔ یعنی دبیر کا معراج نامہ بھی تقریباً اسی وقت کی تخلیق ہے جب غالب "مثنوی ابر گہربار" میں معراج نامہ لکھ رہے تھے۔ اور دبیر کے معراج نامے کے ساتھ بھی وہ انصاف نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس کے شعری محاسن، اور مضامین اور قدر و قیمت کے بارے میں ابھی تک خاموشی ہے۔ اردو کی نئی بحثوں میں ہمیں یہ ضخیم مثنوی "دبیر کا معراج" نظر آتی ہے، جس کی دبیر سے کامیابی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد انھوں صاحب نے معراج نامہ کا آغاز یہ نقل میں چند ابتدائی اور آخری شعر درج کیے جاتے ہیں۔

[illegible] شب جوش لیل و نہار

"شب معراج کا ذکر کرتے ہوئے شاعر بتاتا ہے۔ زمانے کے خیال میں وہ رات ہی ہے جو قمر اور رمضان کا حاصل ہوتی ہے۔ اور پھر مسلسل بیس پچیس اشعار میں رات کی تاریکی، رات کی روشنی، رات کی روشنی کا نوشتے نذر میں بیان ہے۔ اشعار تشبیہات اور استعارات میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ غرض غالب نے شب معراج سے روشنی حاصل کی، دبیر نے روشنی سے روشنی پیدا کی۔ مثلاً

[illegible] ہمہ روز خور انگشت شد

اس مبارک دن کو رات نے پہلے تو سورج کے نور سے دن بھر خود کو دھویا اور نور سے ذرے ذرے میں خورشید کی چمک بھر دی۔

کہ نگاہ درود سروشاں سروش
در آں بیکراں قلزم افگند جوش

اتنے میں فرشتوں کا فرشتہ (جبریل) وارد ہوا اور اس کی آمد سے نور کا بے کراں سمندر ابل پڑا اور پھر جبریل کی تعریف کہ وہ خدا تعالیٰ کا سب سے بڑا دربان ہے جس کی بدولت روح اور عقل کا کام چلتا ہے جو رموز حق سے واقف ہے وہ پیغمبر آخرؐ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

خداوند گیتی خریدار تست
شبست ایں ولے روز بازار تست

نہ زمین اور آسمان کا مالک آپ کا طلب گار ہے اگرچہ جسے کو یہ رات کا وقت ہے۔ لیکن آپ کے لیے یہی روز بازار ہے۔ ناز برداری کے لیے آپ کو زحمت نہ ہوئی۔ آپ کے لیے موسیٰ کی طرح سے کلام کی تکرار نہیں ہوئی۔ آپ کی تو یہ حالت ہے کہ وحی نے جو خدا سے تقاضا کیا تھا، اے خدا مجھ کو اپنا جلوہ دکھا دے وہی تقاضا خداوند یت آپ سے کر رہا ہے۔

اب معراج نامہ کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں۔

بگوشش ز بطع وفا گوش او ۔۔۔ نہاں میم او حلقہ گوش او

چوں کہ فطرت احمدی میں وفا بھری تھی۔ میم کا فاصدان کی بندگی کا اظہار بن گیا۔

نہ رفتہ برون پائے از نقش پائے
کہ کردہ قدم بر قدم گاہ جائے

جتنی دیر میں نشان قدم سے قدم اٹھے۔ اتنی ہی دیر میں وہ اپنے مسکن پر آ گئے۔

شرارے کہ از سنگ آں آستاں
بدر جست از نعل برق جہاں

جو چنگاری ان کے آستانے کے پتھر سے برق کی نعل کی رگڑ سے نکلی (جب برق آپ کو لینے آیا تھا)

خوشش قدم در ره آمد بود
که آمد ز بالا بہ پستی فرود

[illegible] راہ پر [illegible] [illegible] کا [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

سحر گہ کہ وقت تجوش رسید
ز ہم نام یزداں درودش رسید

[illegible] [illegible] [illegible] (نماز کا وقت آیا تو انہیں خدائے ہم نام (خلق) کی طرف سے درود کی آواز آئی۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

خلق [illegible] [illegible] [illegible] (خدا کے بعد) خلق سے من ایک اور خوشی کا سبب ہو گیا۔

شب از بادۂ قدس ساغر گرفت
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

جمال خلق چشمۂ نوش بود
[illegible] ہم از بادۂ دوش بود

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

چو چشمت و ہر چشم را بنشست
ولی انچہ بینند [illegible]

آنکھیں دو ہیں ہر ایک کی نظر جدا جدا ہے لیکن دونوں آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ حقیقت ایک ہی ہے۔

نہ خدا ہوتی در نبی و امام علیہ الصلوۃ علیہ السلام

ایک نبی نے ایک امام ان سے درمیان ولی ہوتی نہیں ہے۔ نبی پر درود ہو حق پر سلام۔ اس کے بعد صفحہ 331 تا 817 محمدؐ و آل محمدؐ کی منقبتیں اور نعتیں ہیں۔ چنانچہ "غالب کی منقبت" کے زیر عنوان واضح صاحب کا ایک طویل مضمون ہے۔ ذیل میں چند جملے اقتباس کے طور پر لکھتے ہیں۔

"غالب کے فارسی اور اردو کلام میں منقبتی اشعار بصورت قصیدہ، غزل، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس، رباعی، مثنوی، قطعہ اور منفرد اشعار بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ غالب کے منقبتی اشعار میں غضب کا جوش ہے۔ ظ انصاری کے لفظوں میں "حضرت علیؑ کا نام زبان پر آجائے تو غالب کی روح جھوم اٹھتی ہے۔ غالب نے منقبت عبادات و فضائل میں سے صرف دو چیزیں لے لی ہیں۔ ایک توحید و نبوت اور دوسرے نبیؐ اور آل نبیؐ کی محبت اور اس کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے ہم نے اس مضمون میں غالب کے منقبتی قصائد و منقبتوں سے اس لیے ایک نہیں کیا کہ منقبت خود قصیدہ کی ایک قسم ہے۔ منقبت کسی کی توصیف، ثناء یا تعریف کرنا ہے۔ شاید ثواب دارین کی خاطر غالب نے اپنے کلام کا ایک بڑا حصہ عشق محمدؐ و آل محمدؐ سے چھلکتے ہوئے ابدی اشعار کی تصنیف کے لیے وقف کر دیا اور خصوصاً حضرت علیؑ کی مدح سرائی و نماز عشق جان کر تمام عمر اسی عبادت میں صرف کر دی۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

علی آں ز دودمان نبیؐ را فروغ
علی آں ید اللہ را کف بخشش

"علی وہ ہیں کہ نبی کا کاندھا ان کی سواری بنا۔ علی وہ ہیں کہ ان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔"

کتاب میں غالب کا "قصیدہ غدیریہ" بھی ہے۔ قصیدہ کے بارے میں بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کی شان نزول مشہور عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی کے رسالہ "معارف" جلد ۱۰، نمبر ۴ بابت اپریل 1922ء میں حافظ احمد علی خاں رام پوری ناظم کتب خانہ رام پور نے اپنے مضمون "سراج الدین ظفر شاہ دہلی اور مرزا غالب کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق" میں دو قسطوں میں بیان کی ہے۔ اس کی تفصیلات ہم نے "اورنگ آباد" مطبوعہ ادارہ یادگار غالب، کراچی 2002ء میں درج کی ہیں۔ "مضمون میں "واقعہ علم" بادشاہ دہلی کے نصب کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے ایما پر غالب نے ایک سو نام مثنوی ۱۲۷۰ھ (1854ء) میں لکھی۔ اس سے لکھنؤ کے مجتہد العصر سلطان العلماء سید محمد شاہ اور نبی اللہ غالب سے خفا ہو گئے۔ اسی زمانے میں چند وجوہ سے بعد کی 1854ء میں لکھنؤ میں وبا سے خوف شدید قحط کا ورود ہوا۔ اس کی پذیرائی لکھنؤ کے عوام و خواص سے علاوہ متعدد اخبارات میں ہوئی۔ جب غالب کو اس تحریک کی اطلاع ملی تو اپنی مختصر سی مثنوی بے نام لکھنے پر پریشان ہوئے اور زیر نظر قصیدہ لکھ کر اپنے مخلص دوست سلطان العلماء کی خدمت میں خط کے ساتھ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے روانہ کیا۔ موصوف نے اسے اپنی سفارش کے ساتھ بادشاہ واجد علی شاہ کے پاس بھیج دیا۔ اور یہی سبب ہے کہ قصیدہ کے ابتدائی اشعار نہایت سست ہیں۔ بادشاہ نے قصیدہ کو پسند کیا اور غالب والی مراد سے ملے۔ غالب نے قصیدہ غدیر کی تشبیب کی زمین میں لکھا تھا۔ مطلع یہ ہے۔ "از خود رفتہ ام بربندی چہ گویم کام جاں بینی۔"

ذیل میں لکھنؤ اور واجد علی شاہ کی مناسبت سے پسند اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی
کہ در وے آدم آل عبا را ساربان بینی
بود تا تکیہ گاہ ناز آمرزش پژوہاں را
نہ تنہا سجدہ ہا بر خاک او مشکل کشا بینی

فیضے زاں زیارت گاہ بر روئے زمیں بارد
کہ خاک لکھنؤ را مردم چشم جہاں بینی
مگر در خواب دادند آہی سلطان عالم را
کہ سوئے شاہ از پیش شہنشاہ ارمغاں بینی

مقطع کس زور و شور سے بیان کیا گیا ہے ؎

دریں خوابی کہ بینی چشمہ حیوان بتاریکی
سواد نظم و نثر غالب معجز بیاں بینی

راقم حروف نے اس بلند پایہ کتاب سے جو پورا استفادہ کیا۔ اور غالب معجز بیاں کے پرستاروں اور محب اردو کے میکساروں کے لیے اس بہار بے خزاں کا مطالعہ کرنا بے حد مفید ہوگا۔ اس کے مطالعہ سے غالب کے معتقدات کے بارے میں صحیح واقفیت ہوگی۔ جس عرق ریزی اور جانفشانی سے فاضلہ تقی عابدی سمہ نے اس دفتر بے مثال کو شب و روز مرتب کر کے علیہ طبع سے آراستہ کیا ہے اس کے لیے میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اسے پڑھئے، لطف اندوز ہوئے اور اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے۔

ف س اعجاز
دہلی

غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت

سید تقی عابدی حسن عابدی یہ غیر مقیم ہندوستانی یعنی NRI ہیں۔ پیشے سے طبی معالج۔ ایم بی بی ایس حیدرآباد، آندھرا پردیش سے کرنے کے بعد MS برطانیہ سے، ایف سی اے پی امریکہ سے اور FRCP آسٹریلیا سے کی۔

لیکن ادب سے ان کا خاص ہاتھ یہ ہے کہ آپ کا ذوق خاص شاعری، ادبی تحقیق، تنقید ہے۔ ہندوستان سے بعد آپ کا قیام ایران، برطانیہ اور نیویارک میں رہا ہے۔ اب آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ ان سے طبی و ادبی شوق کی پرورش بھی ان کی عمر کے اس حصے میں ہوئی جو ان ممالک میں گزارا جہاں سے زیادہ تر کتابوں کے مصنف ہیں۔ اقبال، اشفاق اللہ خان شاد، مرزا دبیر، مجروح سلطان پوری، فراق گورکھپوری، لکھنؤ پر آپ نے بڑی حیثیت سے تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کارناموں میں اقبال کی "شکوہ جواب شکوہ" کا تجزیہ، "رباعیات دبیر"، "فانی فن اور تجزیہ رباعیات فانی" اور "چکبستی" خصوصی قابل ذکر ہیں۔ مضامین کا ایک مجموعہ "سیدھی بات" بھی شائع ہوا ہے۔

"غالب دیوان نعت و منقبت" سید تقی عابدی صاحب کا 10th تصنیف پر مشتمل تازہ ترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ ان کی یہ کتاب اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس موضوع پر غالب کی نہ صرف اردو اور فارسی شعری تخلیقات بلکہ نثری تحریریں بھی اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔

کتاب سے ایک چوتھائی صفحات غالب کی فارسی و اردو غزلوں، رباعیات، قطعات، فارسی مثنوی، مدحیہ کلمات کی شان میں کہی گئی منتخب قصیدوں، امام عابدی، حضرت عباس سے متعلق مرثیوں، سلاموں اور نوحوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ

چند صفحات پر عبدالباری آسی، کالی داس گپتا رضا اور حافظ انصاری کی تحریریں وقف کی گئی ہے۔ غالب کی فارسی مثنوی "ابر گہر بار" حافظ انصاری کا اردو ترجمہ بڑی خوش سلیقگی سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کل 72 میں سے 18 مضامین خود تقی عابدی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب کا مقصد مصنف کے اپنے مضامین سے واضح ہوتا ہے۔ نعت و منقبت کے حوالے سے غالب کے اول فارسی اور ثانیاً اردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنانے کی پہلی کوشش سید تقی عابدی نے کی ہے۔

بہترین ریسرچ سے تنقید کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ تقی عابدی صاحب کے نئے مضامین اور چند مضامین کے اجزا تحقیق و تنقید کے میدان میں ان کی اصول پسندی کا نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ غالب کے فارسی نعتیہ، منقبتی کلام کا اردو ترجمہ و تشریح عابدی صاحب کی ترجمہ و تفسیر کی صلاحیت کا روشن ثبوت ہے۔ "غالب دیوان نعت و منقبت" کی وجہ سے پہلی بار غالب کی نعتیں اور منقبتیں، قصائد اور سلام وغیرہ سے محققین کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔ غالب فطرت کی فن کارانہ دانشوری کا ایک بہترین نمونہ ہے جس کی کامیاب نقالی کی کوشش ناممکن نظر آتی ہے۔ غالب کی مضبوطیت تہہ در تہہ ہے۔ اسی لیے کلام غالب کے تشریحی پہلو بھی ان گنت ہیں۔ لیکن نعتوں، منقبتوں وغیرہ کے معنوی تموں Enrichment پر اگر شک نہ بھی کیا جائے تو ان کی مضبوطیت غالب کے متصوفانہ کلام سے کمتر درجے کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اور بزرگان دین کو موضوع بناتے وقت یا انھیں اپنا مخاطب سمجھتے ہوئے شاعر کو قصد اور احتیاط محدود ہو جانا پڑتا ہے۔ عرفی کے فرمان "با خدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار" میں ایک تلقین ہے وہ اسی شعوری محرک کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پیغمبروں اور بزرگان دین کی بارگاہ میں عقیدتیں مجرم ہونا اور میلی ہونا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے غالب کے اس کلام کے ترجمہ اور تشریح پر کتاب مقدس کے پاکیزہ سائے تو لہراتے نظر آتے ہیں لیکن غالب کی اصل شاعرانہ فکر کے جلوے اس میں کم نظر آتے ہیں۔ تو کیا ترک رسوم کا کیش اپنانے والا غالب نئے موحد ہونے پر ناز تھا مسلک کے نام پر اپنے عقیدے اور عقیدے کے اظہار میں ایک عام روایت پسند اور عاجز سا بندہ تھا۔ یہ سوال بھی اٹھایا جانا چاہیے تھا لیکن اس سوال کو جذبہ

کی طاقت ور رو بہا لے گئی۔ ابتدا فارسی حمدیہ مثنوی "ہر گہ بار" ایک انتہائی ارفع درجے کا کلام ہے جس میں خدا کی ثنا از حد لطیف ہے۔ ظاہر ہے حمد ہر مسلک سے اونچی اور تمام مسلکوں میں مساوی طور پر قابل قبول سمجھی جاتی ہے۔ مثنوی "ہر گہ بار" کا اردو ترجمہ انصاری نے بڑے جذبے سے کیا ہے۔ اس سے سلیس اور پاکیزہ ترجمہ میں رواں شاعری ہو جاتی ہے۔ لفظ لفظ شبنم کا قطرہ معلوم ہوتا ہے۔

سید تقی عابدی نے غالب کی حمد، نعتوں اور منقبتوں کے ترجمے الگ الگ باب میں مختلف زاویوں سے کیے ہیں۔ ان کا تجزیاتی طریقہ بڑی حد تک سائنسی ہے اور کسی نئی منطقی راہ پر ہمیں لے چلتا ہے۔ میں بہت اختصار سے ان کے ایک مضمون "غالب کی منقبت" صفحہ 181 سے ایک حوالہ دینا چاہوں گا۔ ابتداء میں الطاف انصاری کا ایک فقرہ تقی عابدی نے نقل کیا ہے۔ "حضرت علی کا نام زبان پر آجائے تو غالب کی روح مجسم وجد بن جاتی ہے۔" پھر "یادگار غالب" سے حالی کی یہ عبارت تحریر کی ہے کہ "غالب نے تمام معجزات و فضائل میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور نبی کی محبت اور اس کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔" آگے چل کر مصنف نے ڈاکٹر فرمانی سے غالب کے صوفی نظریہ حیات کو مانتے ہوئے اپنی تائید و تعبیر علمی سے بیان کی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں

"وہ صوفی انسان "Superman" کا تصور جو نطشے نے گوئٹے فلاسفر سے لیا اپنے نظریات میں عروج پر پہنچایا اسی غالب کی تخلیق میں حضرت علی کی صورت و سیرت میں موجود تھا جس کا عکس غالب کی فارسی کی اس غزل میں ملتا ہے جسے طاہر قہر نے "جاوید نامہ" کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بدان رطل گراں بگردانیم
ز حیدریم من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

ترجمہ آؤ تاکہ آسمان کی گردش کو پلٹ دیں، تقدیر جو بھی جا چکی بدل دیں، تو اور میں جیدری ہیں اور یہ ہمارے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں اور ہم نے ڈوبتے سورج کو پکڑ لیا ہو۔"

اب دیکھئے موضوع کا محور مسلمہ ہی سہی لیکن اس پر تنقید کا دامن ماورائے مسلک ہے اور نتیجے کے پہنچنے تک رسائی حاصل کرنے میں آزاد ہے۔ اور جس طرح غالب خود بندگی میں "آزاد اور خود بین" تھا اسی طرح سید تقی عابدی نے اپنی تنقید کو آزاد اور خود بین بنانے کی جا بجا کوشش کی ہے۔

"غالب کی حمد" عنوان کے تحت اپنے مضمون میں عابدی صاحب لکھتے ہیں "ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ اردو فارسی کے اس عظیم شاعر کی حمدوں کے بارے میں کوئی خاطر خواہ تحقیقی و تنقیدی کام تو ایک طرف اس حمدیہ کلام سے عوام نہیں، بلکہ خواص بھی ناآشنا ہیں۔" اور واقعی تقی عابدی اپنی پہلی نظر کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں جو "غالب، دیوان نعت، منقبت" جیسا شاہکار منظر عام پر لے آئی۔

غالب کے دیوان نعت و منقبت کے جدول کو عابدی صاحب نے اپنی کتاب میں خاص جگہ دی ہے۔ اس کے مطابق غالب کے فارسی منتخب اشعار کی تعداد 2649 ہیں، جب کہ اردو میں صرف 239 ہیں۔

غالب پر بنی فلموں نے لوگوں کو غالب کی زندگی میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ہے، لیکن فلم کے پردے پر دکھائی گئی غالب کی زندگی تفریحی بخش زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ادب میں تحقیق کرنے والے غالب کی زندگی میں اپنے اپنے طور پر دلچسپی لیتے ہیں۔ تقی عابدی کی اس کتاب کا سب سے دلچسپ باب غالب کا زندگی نامہ ہے جو 31 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غالب کے مذہب پر 11 صفحات میں جو روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقی عابدی کی اس کتاب کا نظریہ اسی سے متعین ہوتا ہے۔ الطاف حسین حالی، مالک رام، کالی داس گپتا رضا، میکش اکبر آبادی، جوش ملسیانی، پروفیسر ابرٹ تھائی لے، پروفیسر انا ماری شمل، پروفیسر الی سندر ابوسانی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، ادیب رائے پوری وغیرہ کے غالب کے مذہب کے بارے میں نظریات اور بیانات اقتباس کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان

سے یہ ثابت ہے کہ غالب اہل تشیع تھے لیکن ان کا حلقہ احباب بیشتر اہل تسنن پر مشتمل تھا۔ غالب نے نقش پر حکیم محمود خاں اور نواب ضیاء الدین نے ان کی آخری رسومات سنی مسلک کے مطابق ادا کیں۔ غالباً وہ غالب وسنی نہ سمجھتے تھے۔ ایسا اس وجہ سے ہوا۔

صفحہ 33 پر غالب کے خط بنام مرزا حاتم علی مہر سے ایک اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں

"صاحب! بندہ اثنی عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر 12 کا بندہ رہتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک قبلے کے غلام ہیں۔"

آگے چل کر تقی عابدی لکھتے ہیں:

"لیکن یہ بھی واقع ہے، کہ ان کی شیعیت صرف اسی حد تک ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام دوسرے صحابہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ انہوں نے باقی صحابہ رسول وستاروں اور حضرت علی کو چاند سے تشبیہ دی ہے۔ اس کی تجسیم دوسرے لفظوں میں یوں بھی کر سکتے ہیں کہ ان کی شیعیت کا معیار کوئی شخص نہیں بلکہ وہ ہے جس

بہر حال اس بحث سے غالب کی شخصیت اور شاعری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری نظر میں شاعری خود ایک مذہب ہے۔ اور جیسا کہ پیشتر حالی کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ "غالب کا مذہب صلح کل تھا اور انھوں نے تمام مذہبات و فرائض میں سے صرف وہ چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسری نبی اور آل نبی کی محبت اور اس کو وہ نجات سمجھتے تھے۔" (صفحہ:31)

میری ناقص رائے میں غالب کی عظمت حالی کی اسی رائے سے ٹکرا پاتی ہے۔ لیکن اس کے مسلک اور اس کے اقرار و تقی عابدی کی اس کتاب کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی قلندرانہ طبیعت سے بے جا تکلفات نے پرے اٹھا دیے ہیں۔

چوں کہ یہ ایک تحقیقی کتاب ہے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی پروف ریڈنگ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مثلاً زندگی نامہ میں غالب کی پیدائش کا سال 1797 عیسوی لکھا ہے۔ یہ 1797 عیسوی ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر امام اعظم
کولکاتہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی: اقبالؔ اور غالبؔ کے مخفی گوشے

ڈاکٹر سید تقی عابدی اردو کے معروف و معتبر شاعر، نقاد، محقق اور دانشور ہیں۔ ان کی کئی معرکۃ الآرا کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔ پیشے سے ماہر امراض قلب ہیں لیکن تحقیق سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ تحقیق کرنا عرق ریزی کا کام ہے۔ تحقیق میں صرف منطق اور استدلال سے کام نہیں چلتا ہے۔ تحقیق میں حقیقت کے لیے ثبوت فراہم کرنا پڑتا ہے۔ ثبوت فراہم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ بڑا دشوار اور بھی مشکل کام ہے۔ پورے برصغیر میں سید تقی عابدی نے تحقیقی کارنامے بڑی وقعت اور اعتبار رکھتے ہیں اور انھوں نے دیدہ ور اہل نظر و اہل قلم کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ فروعی اور غیر ضروری باتوں سے ہاتھ جوڑ کر کوئی بات کہنا اور بھونڈی دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرنا ایک عام سی بات ہے لیکن عرق ریزی کرکے سند کے ساتھ کوئی نئی بات پیش کرنا اور ندرت کے ایسے پہلو تلاش کرنا جہاں تک عام فہم اور رسائی مشکل ہو ایک ایسا ہی شخص کا کام ہے۔

اقبال سے متعلق ان کی تحقیقی کتاب "چوں مرگ آید" ہے جس میں علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام ان کی علالت اور ان کی تشخیص، طب سے واقفیت، جدید میڈیکل سائنس سے استفادہ اور دیگر کئی پہلوؤں والی کتاب میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی وہ تمام باتیں جو غیر مستند تھیں ان کو رد کیا گیا ہے۔ سید تقی عابدی چوں کہ خود بھی مریض ہیں بیماری اور اس کی علامتوں سے اثرات نیز اس کی صورت سے واقف ہیں اس لیے ایسی باتیں جو خود اقبال سے اپنی قربت ثابت کرنے کی کوشش میں علامہ اقبال سے منسوب کر دی گئی تھیں ان پر سب سے پہلے عابدی نے ہی لکھا ہے۔ چند اقتباسات یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ہم یہاں پر عادلانہ قضاوت کر کے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اگر یہ کوتاہیاں علاج کے راستے میں حائل نہ ہوتیں تو علامہ کا علاج شاید کامیاب رہتا اور یہ چراغ جو بقول خود اقبالؔ ''بار پر تاران شب دارم ستیزم'' ظلمت اور اندھیرا پھیلانے والوں سے نبرد آزما تھا اور چند مدت اپنی روشنی سے فیض پہنچاتا۔'' (عنوان تشخیص اور علاج کی کوتاہیاں، ص:110)

''ایسا لگتا ہے چڑیا کو مارنے کے لیے توپ استعمال کی گئی۔ چنانچہ چڑیا تو اڑ گئی لیکن دیوار گر گئی۔ بھوپال میں تین برقی دورے کیے علامہ نے اپنے خط میں Ultra Violet Rays کا فسل لکھا ہے غیر ضروری اگر نہیں تو ضروری بھی نہیں تھے۔ یہاں علامہ کی زندگی اور موت کا سوال نہ تھا اس غیر کنٹرول ابتدائی برقی ایسپوژر سے کئی ضمنات ضرر ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ علاج کے بعد آواز ٹھیک نہ ہوئی لیکن علامہ کا چہرہ زرد، چہرے پر کبھی کبھار ورم، ضعف اور دمہ قلبی کا نمایاں اور زیادہ ہو گیا شاید اس علاج نے ہڈیوں پر اثر کر کے خون کو جلا دیا اور علامہ مخونی (Anemia) سے دوچار ہو گئے ہوں جس کا منفی اثر پھیپھڑوں اور قلب پر پڑا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کمزور پھیپھڑوں کو برقی علاج کی وجہ سے نقصان پہنچا اور وہ سخت ہو کر پھیلنے اور سکڑنے کی خاصیت کو کھو چکے ہوں۔ اس علت کو Pulmonary Fibrosis کہتے ہیں جو Radiation کے مضر اثرات میں شامل ہے۔'' (ص 111)

''کہتے ہیں بڑے آدمی کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مختلف خطوں میں خود علامہ اقبال نے لکھا کہ لوگ میری بیماری میں اس لیے دلچسپی لے رہے ہیں کہ تاکہ وہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے یعنی ایلوپیتھک (انگریزی دواؤں) کو طبی (یونانی دواؤں) سے کب شکست ہوتی ہے نیویارک کے ممتاز طبیب اور شاعر ڈاکٹر عبدالرحمن

عبد جو علامہ اقبال سے والہانہ محبت کرتے ہیں مجھے یہ کتابچہ کی فوٹو کاپی روانہ کی جسے انہوں نے حکیم نابینا کے نبیرہ ڈاکٹر انصاری صاحب سے حاصل کی جن سے ہم مشہور ہیں جس میں روح المذہب کے مخزونہ مخطوطہ پر مشتمل ہے کہ یہ نسخہ پانچ ہزار سال قدیم ہے جس میں سونے کو بطور دوا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کتابچے کے صفحات 30 اور 31 پر مزید لکھا ہے کہ افتخار قوم و ملت علامہ اقبال مرحوم علی اللہ مقامہ سے بایں ہمہ اس قدر بڑی پتھری تھی کہ ایکس ریز دیکھ کر ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ مریض اس کی جسامت کی تاب نہ لا کر چٹ جائے گا اور آپریشن اس لیے نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو مرنے سے قبل عارضہ تھا۔ روح المذہب کے استعمال سے صرف 24 گھنٹے میں پتھری بلا تکلیف ریزہ ریزہ ہو کر پیشاب سے خارج ہوئی۔ راقم نے درد مرد Renal Colic کے بیان میں اس پر گفتگو کی۔ اس قسم کے تجربات کو جدید طب قبول نہیں کرتی۔"

(عنوان دونوں کے نام ص 120-121)

یہ ایسا کام ہے جو تحقیق ہونے کے باوجود اغلاق کی بازیری سے احتراز کرتے ہوئے سامنے لایا گیا ہے جس سے اردو دنیا واقف تھی۔ یہ تحقیق اقبال سے متعلق اور اقبال کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال مشکل بہت قوت ارادی کے مالک تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن ڈاکٹری طریقوں اور طبی بصیرت سے اس کی مدافعت کرنے کی کوشش نہ چھوڑی۔ ان کے معمولات میں ولی فرق نہیں آیا اور زندگی کے آخری دن میں بھی وہ دینی اور علمی جذبے سے سرشار رہے۔

پیش نظر دوسری کتاب جناب غالب "دیوان نعت و منقبت" بھی خاص تحقیقی نوعیت کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم غالب دنیا نے شاعری میں اردو دیوان کی بدولت غالب ہے۔ ان سے عام طور پر غالب شعلہ غزل کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن غالب بھی بڑا سچی عاشق نبی تھے اور فارسی دونوں زبان میں غالب کی مدحت، منقبت دیکھنے کو

دیوان مرتب کیا ہے اور اس پر ناقدانہ نظر ڈال کر معین کیا ہے اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسی کتاب برصغیر میں اب تک موجود نہیں جس میں غالب کے قصیدہ، انتخابی اشعار، مرثیے اور منقبت پر علیحدہ سے بحث کی گئی ہو۔ دنیا کے سامنے غالب کو ہمیشہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تنگنائے غزل کے شعلے کا مداح غالب نے غزل کے کینوس کو وسیع کر کے دیا۔ اسی طرح غالب کے دست قدرت میں مذکور اصناف نے بھی خوب گل کھلائے ہیں۔ سید تقی عابدی نے فن، جذبہ، عقیدہ، مسلک، مذہب اور محبت ہر پہلو کا ناقدانہ و محققانہ جائزہ لیا ہے جو اردو تحقیق میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ غالب بھی معتقد میر تھے اور اس ضمن میں ڈاکٹر عابدی نے غالب کی غزل پر غالب ہوتے ہوئے بھی میر سے مغلوب کیوں ہیں؟ انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا مباحثہ پیش کیا ہے:

> ''ہم نے اس مضمون میں غالب کی مشہور غزل ''نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا'' کو منتخب کر کے اسی بحر، ردیف اور قافیہ میں کہی گئی چار متقدمین کی غزلوں سے متابعہ کیا ہے جو اب سے غالب علموں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ غالب کی اس غزل میں، جو ان کے دیوان کی سب سے پہلی غزل قرار دی گئی ہے، صرف پانچ اشعار ہیں جن کے چھ مصرعوں میں قافیے تحریر، تصویر، شبیہ، شمشیر، تقریر اور زنجیر باندھے گئے ہیں ایک ہی بحر میں ہم قافی اور ردیف اشعار کا مقابلہ اس لیے دلچسپ ہے کہ مختلف عظیم شعراء کی قوت تخیل اور فن تغزل کو کس حد تک ایک ہی معیار پر تولا جا سکے۔'' (ص:62)

ظاہر ہے ہر بڑے شاعر کی زمین میں اسے عمدہ غزل کہنے کی روایت قدیم ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے غالب نے اس روایت کو جاری رکھا۔ لیکن سب سے بڑی چونکا دینے والی بات سید تقی عابدی نے یہ کہی ہے کہ جب Paradise lost جو خالص عیسائی عقیدہ کی تشریح پر مبنی ہے، لکھ کر ملٹن عالمی شعر و ادب کا عظیم شاعر قرار پاتا ہے تو کہتے ہیں کہ غالب کی مذہبی، مسلکی شاعری کو سازشی طور پر پس پشت ڈال کر غالب کی شاعرانہ عظمت

ومحروم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر غالب کے مذہبی عقیدے اور اس کے شعر میں موجود ہیں تو اس کو بیان کرنے میں اردو کے محققین کو دشواری تھی۔ اس لیے سید تقی عابدی نے اپنا یہ فرض منصبی سمجھا کہ وہ غالب کے مذہبی عقائد اور شعری پیرایہ اظہار میں ان کا مسلک تعلق اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے اسے پیش کیا جائے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیا جائے۔ یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے اور اردو تحقیق میں ایک بڑا قدر اضافہ ہے۔

اس تصنیف کی بابت خود ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لکھا ہے کہ "سچ تو یہ ہے کہ غالب کی ذات و منقبت کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا حقیقت میں بحر بیکراں کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ پھر بھی اس سنگلاخ زمین کو میں نے تک و تاز بند کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ راقم نے بعض مقامات پر خود فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور بعض مقامات پر اردو فارسی ترجمہ حاصل ہوا تو شکریہ کے ساتھ اس بیاض عشق میں شامل کیا تاکہ یہ مقصد اور ان عاشق کے کامل قدر دانی ہو سکے۔ اس کتاب میں مرحوم ڈاکٹر خلیق انجم مرحوم عبدالباری کی ترجموں کے ساتھ ساتھ آنجہانی ڈاکٹر داس گپتا رفیق کے مقدمہ کے اقتباس بھی شامل کیا گیا ہے۔" (حرفے چند، ص 10)

سید تقی عابدی بہ حیثیت فرد، ایک ذمہ دار اور مستند محقق کی صف میں کھڑے ہیں۔ ان کا کوئی بیان محض قیاس آرائیوں پر مبنی نہیں ہے۔ تحقیق کے جملہ شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے تحقیق کے دامن میں رہتے ہیں اور بہت ہی عرق ریزی کے ساتھ۔ تو جو شے ہاتھ آتی ہے وہ تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یقین غالب

کار کاہ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
حیدرآباد، دکن

چوں مرگ آید

شاعر مشرق علامہ اقبال اُردو ہی نہیں دنیا کی اور کئی زبانوں کے ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جن کی حیات، شخصیت اور شعری و ادبی خدمات کے بارے میں بہت کچھ تحریر کیا گیا ہے۔ یوں تو آج بھی لکھا جا رہا ہے لیکن تکرار بھی اتنی ہو رہی ہے چناں چہ اب اقبال پر سنجیدگی سے قلم اٹھانے والوں کے لیے لمحۂ فکر ہے کہ وہ کس موضوع کو اختیار کریں۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے کس گوشہ و عنوان پر ہم کہ ہی ہوئی باتیں زیادہ دہرانے میں نہ آئیں۔ ہر چند کہ اقبال کی علالت اور ان کے آخری ایام زندگی پر سید نذیر نیازی، خلیفہ نذیر صوفی، جاوید اقبال، فقیر سید وحیدالدین، عبدالمجید سالک، صہبا لکھنوی، ممنون حسن خاں، غلام رسول مہر اور دیگر اصحاب قلم نے بھی قلم اٹھایا ہے لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے جو اپنے وطن سے دور کینیڈا میں مقبول میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ اقبال کے مکاتیب، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی بیماریوں اور ان کے مرض الموت کی تحقیق کرتے ہوئے ایک نیا منظر نامہ سامنے لایا ہے۔ کوئی اور شخص بھی یہ کام کر سکتا تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے تھوڑا بہت کیا بھی ہے لیکن ایک میڈیکل ڈاکٹر اور پھر سید تقی عابدی جیسے ممتاز فزیشین نے اقبال کی علالت کے بارے میں قلم اٹھاتے ہوئے، مرض، مریض اور علاج کے مختلف پہلوؤں اور باریکیوں پر نظر رکھی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کو شعر و ادب سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی اپنے پیشہ طب سے ہے۔ اس لیے انھوں نے ادبی قدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے طبی نکات پر بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ اور پھر اپنے حاصل تجزیہ و تحقیق کو بعنوان "چوں مرگ آید" کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ آخری عمر میں اقبال کے علاج کے تعلق سے کیا کمیاں رہیں۔ متعلق افراد اور خود اقبال نے مرض اور علاج کے بارے میں کہاں تساہل برتا۔ حالاں

کہ اقبال کے علاج کے سلسلے میں اس دور میں حاصل جملہ ترقی یافتہ اور جدید علاج اور ادویہ کو کام میں لایا گیا تاہم بعض باتیں ایسی رہیں جن پر جس قدر توجہ دی جانی چاہیے تھی توجہ نہیں دی گئی۔ انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس باعث مرض نے شدت اور پیچیدگی اختیار کی اور طول کھینچا۔ بچپن سے اقبال کئی عارضوں کا شکار رہے۔ جیسے عوارض چشم، عوارض سر، عوارض قلب، پھیپھڑوں کی تکالیف، درد گلو، امراض دہان، ملیریا اور مرض قبی وغیرہ۔ بعض بیماریاں بھی رہیں اور بعض تلی جاتی رہیں اور بعض نے ان کے جسم پر قبضہ جمائے رکھا۔ اس سے وجوہ بھی رہے۔ اقبال کا مزاج اور ان کی غذائی عادتیں مثلاً یہ کہ اقبال نے مرزم 1911-12 سے تک تمباکو نوشی کی، ورزش پر توجہ نہیں دی، مرغن اور چرب غذائیں دیگی بھی وغیرہ وزیادہ نمک اور مرچ کا مسلسل استعمال، کیسوں مجنوں اور شلوں کا استعمال جن میں سونے چاندی اور دیگر دھاتیں شامل ہوں جو قلب وجگر کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ یہی نہیں تلی عابدی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ "اقبال اوائل جوانی میں تپ دق اور مرگی حملوں کے علاوہ شقیقہ کا اچھا شکار رہتے تھے۔ انھیں بعض اوقات بدہضمی، سوء ہاضمہ اور تخمہ معدہ کی شکایت ہو جاتی تھی۔ فی زمانہ تمباکو نوشی کو تخمہ معدہ کی علت بتایا جاتا ہے جو اقبال کا سب سے پسندیدہ شوق تھا۔" میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تلی عابدی کے دو تین جملہ نقل کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ انھوں نے لکھا ہے "تعجب نہیں کہ اقبال کی ہر روز یونانی اور ایلوپیتھک دوائیں معدہ کی بیمار و متورم رہنے سے تخمہ پیدا کرتی ہوں۔ اقبال کی دواؤں میں شامل جوشاندہ تھا جو پتی حالت یا ان سے مرکبات سے بنا ہوتا۔ جدید تحقیقات میں یہ تمام مرکبات مرزیادہ مقداروں میں مضر ثابت ہوتے ہیں۔ تخمہ معدہ ہی سے اقبال کا معدہ مزمن ہو چکا تھا ان کی جوانی مرچی تھی اور ان کی خوراک بھی مرچ ہو چکی تھی۔" (ص 62)

"اقبال قلب سے مریض تھے ہی، قلب کی رگیں تنگ ہو جانے کی وجہ سے قلب کے عضلات وشحوم کی تغذیہ کی نارسائی سے مزمن ہو گئے تھے۔ مزید تفصیل میں گئے بغیر عرض کرنا یہ ہے کہ قلب بڑھ گیا تھا، دل بڑا ہو گیا تھا اور بدن میں پانی جمع ہونے کی وجہ سے بدہضمی متورم ہو گیا تھا۔ اقبال نے اپنی بیماریوں کے لیے ایلوپیتھک (انگریزی) علاج کرایا لیکن یہ علاج بنیادی طور پر انھیں پسند نہیں تھا۔ ان کی ناپسندیدگی وہ بھی تھی۔"

ڈاکٹر تقی عابدی کی زبانی سنئے "اقبال کے اطراف قریبی دوستوں میں شامل چند حکیم اور چند نیم حکیموں نے بھی اس نفرت کی آگ کو ہوا دی اور اقبال کو ایلوپیتھک علاج سے بدظن کر دیا۔ چناں چہ وہ بسا اوقات ایلوپیتھک علاج سے صریحاً انکار کر دیا کرتے تھے۔" بقول ڈاکٹر عابدی "جس زمانے میں علامہ مرض الموت سے فریش تھے، اسی زمانے میں لاہور میں جرمن کے دو عمدہ طبیب ڈاکٹر ژیلٹر اور ڈاکٹر کالیش مطب کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ژیلٹر نے تشخیص دی اور علاج کرنے کی خواہش کی لیکن انھیں صرف مشورہ دینے کی حد تک رسائی ملی اور ان کا علاج جو ایلوپیتھک علاج تھا نہیں کرایا گیا۔ کاش کہ انھیں علامہ کے علاج کا موقع فراہم ہوتا۔" جیسا کہ تقی عابدی لکھتے ہیں "یہ ایک افسوس ناک قدم تھا۔" ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی حیات پر تحریر کتابوں سے تو استفادہ کیا ہی ہے انھوں نے خطوط کا بھی نہایت غائر نظر سے جائزہ بھی لیا ہے۔ حتیٰ کہ کسی خط میں ایک آدھ جملہ اور چند الفاظ بھی مل گئے تو انھیں کام میں لایا ہے۔ اس طرح کوئی (251) خطوط ہیں۔ جن میں اقبال نے اپنی علالت اور دوا وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اقبال والا حق عوارض میں آواز کا بیٹھ جانا بھی ہے۔ آواز کا بیٹھ جانا ان کی آخری علالتوں میں بہت زیادہ موضوع گفتگو رہا۔ اس سے علاج کے لیے انھوں نے زیادہ اور خصوصی توجہ دی۔ جموں پال میں تین مرتبہ بجلی کا علاج ہوا۔ حتیٰ کہ وہ اس عارضہ کے لیے ویانا بھی جانا چاہتے تھے۔ اقبال و اپنی آواز کے بارے میں کتنا متردد تھے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے (30) معالجین میں سے اکثر اس کے علاج میں مہارت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں بھی اقبال کے علاج کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی آواز بیٹھ جانے کی جو علالتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے اکثر آج جدید طبی نقطۂ نظر سے مستردی جا سکتی ہیں۔ علامہ اقبال کے گردے کے درد کے بارے میں بھی انھوں نے حکیم کے علاج سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی بات کہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ اقبال کی آواز بیٹھ جانے کے علاج میں چھ غلطیاں ضرور ہوئیں۔ نہ صرف یہ کہ اقبال طب یونانی کی طرف مائل رہے بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ کسی معتقد نے کہیں ذکر کر دیا یا خط میں کسی دوا کے بارے میں لکھ دیا تو اس کے حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مثلاً سید نذیر نیازی کے خط مورخہ 22 مئی 1934ء میں لکھا "سن ہے ہندوستانی

واخانہ دہلی میں ہوئی شرکت ہے جو گلے کی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ اگر یہ بات درست ہو تو آپ وہاں سے ایک بوتل شربت بذریعہ وی پی میرے نام بھیج دیں۔" بھی لکھا "ایک ایرانی الاصل سید زادہ کی دعا سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ کیا عجب کہ آواز پھر عود کر آئے اس کا دعویٰ تو نہیں ہے۔" خوش وہ چاہتے تھے اور چہکتا ہوا آواز عود کر آجائے کہ وہ اپنی زندگی کے لگ بھگ آخری (سازے آٹھ) سال آواز کے بیٹھ جانے سے متاثر رہے۔ یہ معاملہ اس لیے بھی باعث تشویش تھا کہ اقبال کی مصروفیات، ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں بلکہ ان کا مقصد حیات متاثر ہو رہا تھا۔ انھوں نے جلسوں وغیرہ میں تقریر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ سزا کا کام بھی پہلے ہوا اور بعد میں ترک کر دیا۔ قرآن حکیم کی بہ آواز بلند تلاوت جو بہت پسند کرتے تھے بند کر دی۔ سیاست اور انتخابات میں بھی شرکت نہیں ہونے لگی اور انھوں باتوں کی ایک بات یہ کہ ان کی نفسیات پر بہت اثر پڑا اور وہ مضطرب نظر آنے لگے۔ کہا۔ آپ اپنی شخصیت سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید بیماریوں کے ان مسلسل اور مستقل حملوں سے مایوس ہو جاتا اور اپنی تاب و توانائی کھو بیٹھتا لیکن اقبال نے ایک مرد مومن کی طرح زندگی کا آخر تک سامنا کیا۔ بیماریوں کی پیچیدگیاں ہوئیں۔ کئی بار ایسے ہوا کہ ڈاکٹروں نے موت سے چند گھنٹوں قبل دوا دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب دوا دینا بے سود ہے۔ انھوں نے ہر بار مسکرا کر ڈاکٹروں سے کہا کہ میں بے ہوشی کی حالت میں مرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ وہ ہوش میں آتے ہی دوا پی لیتے تھے۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

جن احباب نے میت کو دیکھا وہ اس کی تائید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے جس زاویے سے یہ کتاب تحریر کی ہے وہ اہمیت رکھتی ہے۔ خطوط سے مواد اخذ کرنے والی کئی کتابیں ملتی ہیں لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ایک میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے یہ کتاب تحریر کی ہے۔ اقبال کی زندگی کے آخری چار سال ان کے امراض، ان کی پیچیدگیاں اور اقبال کے مرض کے ایک ایک پہلو کی نہیں ایک معالج ڈاکٹر کی حیثیت سے تفتیش کی ہے۔ یہ کتاب اقبالیات میں بلاشبہ اضافہ ہے۔

افضل خان نیئر

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''چوں مرگ آید'' پر

:-اظہار خیال:-

ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے مستند اور مشہور اردو دان کی کتاب پر تبصرہ کرنا میرے بس کی بات نہیں البتہ یہ کتاب پڑھ کر جو خیالات اور احساسات قلم ہوئے انھیں ''اظہار خیال'' کے طور پر رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ بس یہ ''اظہار خیال'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک کہنہ مشق تبصرہ نگار کے بارے میں یہ دیکھنا کہ ایک عام قاری کیا رائے قائم کرتا ہے۔

اس منفرد کتاب ''چوں مرگ آید'' کا سرورق علامہ اقبال کی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گراف پر مشتمل ہے اور بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گرافی میں بھی ایک منفرد حسن ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سرورق سادہ اور خوب صورت ہے۔

مجھے سرورق دیکھ کر یوں لگا جیسے سیاہ پس منظر میں علامہ اقبال کا منور چہرہ شب کی تاریکی میں نوید سحر دے رہا ہو۔ اس سرورق کی تصویر میں علامہ اقبال کے چہرے پر ہلکے سے تبسم کا گمان ہو رہا ہے۔

اس کتاب میں ایک ایسے ہی تبسم کا ذکر ہے جو اس کتاب کے عنوان کا باعث بنتا ہے جس کا ذکر علامہ اقبال کے نام سے تحریر کردہ باب میں موجود ہے۔

کتاب کا عنوان ''چوں مرگ آید'' چونکا دینے والا ہے لیکن بہت مناسب اور موزوں عنوان ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کتاب کو ''ایک پر خلوص گمنام حکیم'' کے نام سے منسوب کیا ہے جس کا ذکر خود علامہ نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔

جس میں علامہ کی اس عقیدت کو جو پر خلوص گمنام حکیم کے لیے ان کے دل میں تھی

اور مصنف سید تقی عابدی کے اس جذبہ قدر دانی کو جو انھوں نے اس کتاب کو جس پر خلوص گمنام حکیم کے نسخے منسوب ہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ مصنف کا یہ کتاب ان کی قدر شناسی اور انسان دوستی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کے مطبوعہ سات سو خطوط میں سے دو سو اکیاون (251) خطوط اور 18 مستند کتابوں کے حوالہ جات سے یہ کتاب رقم کی ہے۔ مصنف نے علامہ کے دس سے زائد امراض اور ان کی ذیلی شاخوں کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے 18 یونانی ادویات اور تقریباً 12 ایلوپیتھی دواؤں سے استفادہ حاصل کیا۔ انھیں ایلوپیتھی دوائیں پسند نہ تھیں جب کہ انھیں یونانی طریقہ علاج پر اعتماد تھا۔ انھیں نزلہ کی بدولت ایلوپیتھی ادویات پسند نہ تھیں بس مجبوراً لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کے بعض امراض کی تشخیص کے طریقہ ہائے علاج پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے چوں کہ مصنف پیشہ ور ڈاکٹر ہیں معلومات درست معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کی داڑھی کے بال جھڑنے لگنے سے ان کے مرض میں اضافہ تو ہوا مگر مصنف کے خیال میں پوٹک لگانے کی وجہ سے نہیں علامہ اقبال کی داڑھی آنکھوں کی بینائی ختم ہونے تھی۔

مصنف نے تحقیق و تفتیش سے اور نہایت ہی عالمانہ انداز میں اس کو ثابت کیا ہے۔ کی طرح علامہ کے دوست ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے اخراج کو علامہ اقبال نے حکیم نابینا کے علاج کی وجہ قرار دیا ہے۔ جس پر مصنف نے اپنی پیشہ ورانہ رائے دیتے ہوئے اسے مسترد کر دیا کہ یونانی ادویات سے اقبال کے دوست ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کا اخراج محض حسن اتفاق سے ہوا ہے نہیں ممکن نہیں تھا۔ اقبال کو بار بار بخار آنا ان کے کان میں بار بار بخار رہنے کی وجہ سے نہیں بلکہ کی اور وجہ سے آتا تھا۔ مصنف وجوہات تو نہیں بتلاتے لیکن ان کا اختلاف کرتے ہیں، لیکن ان کی ذاتی رائے کے مطابق محض یونانی ادویات علامہ کے لیے مضر نہیں ہوں گی۔ علامہ اقبال مصنف قلب سے بھی مریض تھے، ان کے لیے مقوی اور دھات سے مرکب ادویات کا استعمال مضر صحت ثابت ہوا۔ مصنف نے یہ بھی واضح کیا کہ علامہ ایلوپیتھی اور یونانی دواؤں کو ایک ساتھ استعمال کیا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں مختلف طریقہ ہائے علاج کی ادویات کا ایک ساتھ استعمال بھی خطرناک Reaction پیدا کر سکتا ہے۔

مصنف نے علامہ کے قلندرانہ مزاج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "وہ اپنی صحت کے سلسلہ میں تساہل اور بد پرہیزی کا بھی شکار رہے۔ مثلاً وہ ورزش اور چہل قدمی سے اجتناب برتتے تھے۔ حکماء کے منع کرنے کے باوجود چٹنی، فالودہ اور دہی شوق سے استعمال کیا کرتے تھے۔ علامہ کو چٹ پٹے اور مرغن کھانوں کا شوق تھا۔ حد اس کہ وہ مخمورات تھے۔ مگر پلاؤ اور کباب وغیرہ شوق سے کھایا کرتے۔ علامہ اقبال کثرت سے تمباکو نوشی کیا کرتے تھے۔ وہ سگریٹ اور حقہ دونوں پیتے تھے۔ بڑھی ہوئی کھانے میں تساہل برتنے ان باتوں کی وجہ سے مصنف کے خیال میں ان کی صحت خراب ہوئی۔

علامہ اقبال کے گلے کی خرابی اور ان کی آواز بیٹھ جانے کا خود علامہ کو بھی بہت دکھ تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کافی علاج بھی بجلی بھی لیکن والی طرف فائدہ نہ ہوسکا۔ مصنف نے اس طریقہ علاج پر بھی اپنی ماہرانہ رائے دیتے ہوئے نامناسب قرار دیا۔ مصنف نے علامہ اقبال کے امراض کی وجہ سے علامہ کی زندگی پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے اس کا بھی ذکر کیا۔ مصنف کو علامہ کے اس دکھ کا احساس ہے کہ وہ بہت سے کام جو وہ امت کے لیے کرنے کے خواہش مند تھے وہ علامہ کی علالت کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکے۔ علامہ نے بہت سی تکالیف برداشت کیں۔ مصنف نے اس بات کو بھی اجاگر کیا کہ علامہ اقبال کو اپنی تشویشناک علالت کا علم ہونے کے باوجود انھوں نے آخر دم تک اپنے روزمرہ کے معمولات میں فرق نہ آنے دیا۔ اس سے ان کی ہمت اور صبر و استقلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "وکٹر ایک متکلم اور ادق موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن جوں جوں کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں یہ مشکل اور ادق موضوع ایک دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیتا ہے۔ مصنف نے مستند کتابوں اور خطوط کے حوالوں سے کتاب کو اس طرح ترتیب دیا کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ علامہ کی صحبت میں موجود ہو۔ مصنف نے جہاں کتاب میں علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی ہے۔ علامہ کے معترین، معالجین اور معالجین کے تذکرے، علامہ کی علمی و ادبی سرگرمیاں ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں ان کی سیاسی سرگرمیاں ان کے سفر کے واقعات مقامی و بین الاقوامی دوستوں سے مراسلت کے تذکرہ مطالعہ کے دوران سامنے آتے ہیں۔ مصنف نے علامہ اقبال کے بارے میں

ایک اہم پہلو یہ بھی آیا کہ انھوں نے شراب نوشی کبھی نہیں کی۔ علامہ بیدار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ روحانی اقتدار کے قائل تھے مصنف کی تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ عاشق رسول تھے اور محب اہل بیت تھے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ جوں جوں کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں یہ مشکل موضوع دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیتا ہے اور قاری اپنے آپ کو علامہ کی صحبت میں موجود پاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ قاری پر وہی کیفیات طاری ہوتی ہیں جو اس وقت موجود علامہ اقبال کی صحبت میں موجود لوگوں پر ہوتی رہی ہے۔ خصوصاً اقبال کی زندگی کے آخری لمحات، علامہ اقبال کی آخری رات بیان سے جلوس جنازہ کا گزرتے ہوئے بعض اوقات قاری کو اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مصنف نے علامہ کی بیماری ان کے علاج اور تشخیص پر اپنی رائے ظاہر کی ہے لیکن یہ معاملات میں حوالہ جات دے کر ان کو بھی بڑھایا ہے۔ اس طرح کہ نہ صرف وہ ایک تاریخی دستاویز بن جاتا ہے بلکہ ایک ادبی شہ پارہ بن جاتی ہے۔

علامہ کی آخری رات میں وہ لمحات جب علامہ اپنی بہن منیرہ سے آخری ملاقات کے دوران سے صاحبہ وہ جاوید اقبال و پنانے کا واقعہ موت سے چند منٹ قبل ان کے مدبر علی بخش کی کیفیات نہایت متاثر کن ہیں۔ موت سے چند روز قبل بڑے بھائی عطا محمد کے کسی دینے پر اقبال کا یہ بیان کہ "میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا اور مرد مومن کی یہ علامت ہے کہ مرنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر تبسم ہوتا ہے۔"

مصنف نے اقبال کی وفات، جلوس جنازہ اور تدفین کی جو اس طرح بیان کیا کہ "تدفین سے واپسی پر ان کے بھائی عطا محمد میرے قریب پہنچے وہ روتے ہوئے مجمع کو ہٹاتے جاتے تھے اور کہتے تھے وہ مجھے میرے بھائی کا چہرہ دیکھنے دو۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے چہرہ پر مرنے کے بعد تبسم ہوگا۔"

بلا یقیناً اقبال کے چہرہ پر تبسم تھا۔

اقبال نے موت سے تین چار دن قبل اپنے بھائی کو یہ کہا تھا۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اور اسی شعر سے اس کتاب کا عنوان اخذ کیا گیا ہے۔

آخری باب "رومیں ہے رگِ شعر" کے عنوان سے مصنف نے خود اپنے بارے میں تحریر سے ایک خاکہ تحریر کیا ہے۔

یہ کتاب اقبال اور اردو کے پرستاروں طالب علموں خصوصاً طلبہ سے طالبات، ریسرچ اسکالرز اور علماء کے لیے بھی نہایت رہنما ثابت ہوں۔

مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔ میں مصنف اور ناشر کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

”چوں مرگ آید“

ڈاکٹر سید تقی عابدی کینیڈا کے ان معدودے چند اہل قلم میں شمار کیے جاتے ہیں جنھیں کینیڈا، امریکہ، انگلستان، بھارت اور پاکستان کے سنجیدہ اردو داں ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے شیخ التصانیف محقق، شاعر، نقاد اور مترجم ہیں۔ یہی نہیں، ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور پیشہ ورانہ مہارت بھی مثالی ہے۔ اردو اور بالخصوص غزل کی ادب کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں ان کی خدمات کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ انھوں نے اپنے چند احباب کے تعاون سے عالمی پیمانے پر ایک کیمیاوی اور غذائیوں (انٹرنیشنل ریسرچ کونسل) سے منسلک کانفرنس یا جو برصغیر سے باہر اردو کی ہم یہ کی واحد کانفرنس ہے مستقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ”چوں مرگ آید“ علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض موت کی تشخیص کے بارے میں ہے۔ کتاب کا خوب صورت نام علامہ کے فارسی شعر (نشان مرد مومن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست) سے ماخوذ ہے۔ ”چوں مرگ آید“ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریرات کی ایک نئی اور خوب کاوش اور ان کی پیشہ ورانہ طبی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اردو میں میرے علم کی حد تک یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو موجود نہیں۔ علامہ اقبال کی زندگی میں مختلف بیماریوں (مثلاً ذیابیطس، اور دردِ جوڑوں سے اور دل پر اثر انداز ہونے والے عارضے، امعاء کے تکلیف، مسوڑھوں کی سوجن، دانتوں کے درد، گلے اور کینیڈا کی) میں مبتلا رہے۔ علاج کے سلسلے میں انھوں نے تیس سے زیادہ معالجوں سے رجوع کیا جن میں چوٹی کے ڈاکٹر اور حکیم زمانہ اغراض و مقاصد سے بہرہ شامل تھے۔ سید تقی عابدی نے ایسے تمام مخطوطات اور متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کیا جو اس ضمن میں معاون

ہو سکتے تھے۔ کتاب کی آخر میں سولہ صفحات پر مشتمل علامہ اقبال کے لکھے ہوئے دو سو اکیاون (291) خطوط کی فہرست درج ہے جن میں ان کی بیماریوں کے حوالے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبار و متعلقہ کتابوں کی ایک دوسری فہرست بھی ہے۔ عابدی صاحب نے ان میں سے ہر ایک کا بغور جائزہ لینے کے بعد طبیبوں کی تشخیص اور پھر علاج کے لیے تجویز کردہ دواؤں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہیں انھوں نے علامہ اقبال کے معالج کی تشخیص اور طریق کار سے اختلاف بھی کیا ہے اور بہتر متبادل علاج کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ''تشخیص اور علاج کی کوتاہیاں'' کے تحت عابدی صاحب کا دلچسپ انداز تحریر ملاحظہ ہو:

> ''علامہ کی آواز بیٹھ جانے کے علاج میں چھ غلطیاں ضرور ہوئیں۔ ایسا لگتا ہے چڑیا کو مارنے کے لیے توپ استعمال کی گئی۔ چنانچہ چڑیا تو اڑ گئی لیکن دیوار گر گئی۔''

سید تقی عابدی صاحب نے منجملہ چند دیگر اصحاب کے اپنے نیویارک کے شاعر دوست ڈاکٹر عبدالرحمن عبد کی رائے سے بھی استفادہ کیا ہے۔ دراصل مصنف نے ایک انتہائی خشک موضوع کو اپنے قلم کے اعجاز سے اس قدر دلچسپ اور معلوماتی اعتبار سے اتنا بھرپور بنا دیا ہے کہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ دیکھو حضور اس طرح سے لکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ باتوں باتوں میں بعض اوقات بڑی گہری بات کہہ جاتے ہیں۔ کئی ذیلی تفصیلات عالمانہ تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا یہ کارنامہ اپنی نوعیت کی بے نظیر چیز ہے۔ وہ ہم سب کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب ''اقبال اکادمی'' نے شائع کی ہے۔ اس ادارے کی مطبوعات ہر طرح کے عیب سے پاک ہونا چاہئیں۔ کمپیوٹر سے حرف سازی کے سبب اب کتابت کی اغلاط کو بآسانی درست کیا جا سکتا ہے۔ ''چوں مرگ آید'' میں کئی اغلاط در آئے ہیں جو نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ دو مثالیں کافی ہوں گی۔

مثلاً حافظ شیرازی کا ایک مصرعہ ص 74 پر یوں ہے

''چوں ندیدند حقیقت در افسانہ زدند''

ص 110 پر یہ مصرعہ اس طرح درج ہے کہ خارج از بحر ہو گیا ہے۔

"چوں نا دیدن حقیقت در افسانہ زوند"

ص 120 پر حضرت نابینا رومی کی مدح مذہب کی تعریف میں علامہ کے تین اشعار پر مشتمل جو بند درج ہے اس کا پانچواں مصرعہ خارج از بحر ہو گیا ہے

"کس سے زیادہ اور یہ لفظوں میں اے لقمان ملک"

لفظ "زیادہ" بروزن "راوہ" غلط ہے۔ اور "لقمان" کی جگہ "لقماں" کا بھی متن میں معلوم نہیں کہ اصل مصرعہ کیا ہے لیکن ایک ممکن صورت یہ ہو سکتی ہے

اور یہ لفظوں زیادہ اس سے میں لقمان ملک

یا اور یہ کس سے زیادہ میں لفظوں لقمان ملک

یا اور یہ لفظوں زیادہ اس سے اے لقمان ملک

پہلی اور تیسری صورت میں لفظ "لفظوں" تشدید کے ساتھ ہے۔ لیکن نقل یہ مطابق اصل خلاف ہے۔ بہر نوع، یہ کام "اقبال اکادمی" کا ہے کہ اپنی مطبوعات کی صحت پر توجہ دے۔

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

چوں مرگ آید
ڈاکٹر سید تقی عابدی: مریض، علامہ اقبال

عصر حاضر کے ایک مشاق معالج ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جدید تحقیقات کی روشنی میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تفصیلات کا جائزہ ایک ادبی محقق کی نظر سے، اپنی تازہ تصنیف "چوں مرگ آید" مطبوعہ 2007ء میں پیش کیا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر عابدی، پیشے کے لحاظ سے طبیب ہیں، لیکن دنیائے اردو ادب میں یہ ایک بار یک بین تجزیہ نگار اور محقق کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی طبیب نے اپنے منصب کی پاسداری کرتے ہوئے، تاریخ اردو ادب میں پہلی بار کسی عظیم ادبی ہستی کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص، تحقیق اور تجزیہ۔ خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں کیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی دنیا میں اب تک کسی بھی اہم شخصیت کے حوالے سے فقط علمی، تخلیقی، فنی، فکری، شخصی اور عملی تناظر میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تحقیق سے علم و فن کی نئی راہیں دریافت ہوئیں۔ نئی جہتیں ابھریں اور نئے انکشافات نے جنم لیا۔ ان نئی دریافتوں، نئے حقائق اور نئے انکشافات کی روشنی میں، مروجہ نتائج یا نظریات پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان کے اثرات کا سرچ لائٹ کر اس کی صحیح تاویل پیش کی جاتی ہے۔ اقبال پر تحقیقی کام ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جو تا حال جاری و ساری ہے۔ علامہ پر تحقیق کے نئے نئے گوشے وا ہو چکے ہیں اور بہت سے منور ہونا باقی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عابدی نے علامہ مرحوم کے بدن کی اندرونی کارکردگی اور کیفیت کا جائزہ لے کر نہ صرف یہ کہ اقبال کے حوالے سے کی جانے والی تحقیق کے ضمن میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے

بلند آئندہ کی بھی بڑی اور اہم شخصیت پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی ایک نیا راستہ
کر دیا ہے۔ بدن کی اندرونی کارکردگی اور کیفیت کی بدنظمی کے سبب انسان کے جذبات
میں جو طلاطم پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر براہ راست اس کی کارکردگی اور تخلیقی عمل سے ظاہر
ہوتا ہے، جس کی مثال خود قریب الرحمٰن اقبال کی آخری عمر کی خاص اور بغیر کسی بناوٹ اور
ملاوٹ کی نظمیں ہیں۔

آیئے اب اوپر پیش کیے جانے والے اپنے نکات کی روشنی میں ڈاکٹر عابدی کی
کتاب "چوں مرگ آید" کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ اس کتاب کی
خصوصیت اور بنیادی چیز علامہ اقبال کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کے بدن کی اس
اندرونی کارکردگی اور کیفیت کی بدنظمی کا جائزہ لینا ہے جو مختلف بیماریوں اور مرض الموت کا
سبب بنی۔ اور اسی لیے ہم ڈاکٹر عابدی نے ایک پیشہ ور طبیب اور ممتاز اداکی محقق ہونے
کی حیثیت سے اس کتاب میں طبی معلومات، بدنی کیفیات، روحانی حقیقت کو خاص
طریقے سے برتا ہے۔ اقبال کی خوابوں سے واقفیت اور وابستگی کو بھی پیش نظر رکھا ہے، یہ
بھی بتایا ہے کہ اقبال کو زمان و مکان کے لحاظ سے کیسے زیادہ بہتر معالجین کی طبی امداد
بھی حاصل رہی، مختلف بیماریوں کے نقطۂ نظر سے، اور مستند حوالوں کی روشنی میں ڈاکٹر
عابدی نے اپنے نتائج اخذ کیے ہیں۔

میری باقاعدہ طبی تعلیم تو نہیں ہے۔ لیکن ایک قلم کار ہونے کے ناتے اپنی
معلومات میں اضافے اور اپنے شوق کی تسکین کے لیے، انسانی نفسیات اور جسمانی
ساخت اور کیفیت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے، اس ضمن میں بہت پڑھا ہے،
اس کی روشنی میں انسان پر اس کے ماحول اور مزاج کے مطابق، اپنے معاشرے، معاشی
اور سیاسی حالات سے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم اس نظریے کو اقبال پر منطبق کریں
تو پاتے ہیں کہ ان کی زندگی کے آخری دور میں بالخصوص مسلم معاشرے کی جو زبوں
حالت تھی اس کا بڑا اثر اس عظیم انسان نے قبول کیا۔ کہ جب انسانیت مریض
ہو جائے تو معالج انسانی وشفق ہوتا ہے کہ ناصحانہ حکمت و موعظت اور مشفقانہ اندازِ
تشخیص سے اس کا علاج کرے۔ وہ ان قرآنی اصلاح کی بشارت میں اپنے ہم وطنوں

اور اپنی روح کو اندیلتا ہے۔ ان کی ہدایت اور رہنمائی کا تصور اس کے قلب حساس میں تڑپ کی پیدا کرتا ہے وہ ان کی صحت کے لیے دوائیں کرتا اور دعائیں مانگتا ہے۔ ان کے مرض کی شدت اور اس کے انجام کے خیال سے اس کا جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی ہٹ دھرمی اور علاج سے انکار سے اسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ارشاد ربانی ہے وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۔ (سورہ النحل، آیت ۱۲۷) ان لوگوں کے انکار، ہٹ دھرمی اور ہٹ دھرمی سے رنجیدہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے۔ ان کی انسانیت اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ اس میں زندگی پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ان کے انجام عواقب پر دل گیر نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس پیغام حیات کو عام کرتے جاؤ۔ جن قلوب میں زندگی قبول کرنے کی ذرا سی بھی صلاحیت موجود ہے وہ "زود یا بدیر" اس پر توجہ دیں گے اور اپنے علاج پر مائل ہو جائیں گے۔ اقبال نے اپنے افکار کی بنیاد اور اساس قرآن حکیم کو بنایا اور اپنی تعبیر میں انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کی دعوت دی۔ انھوں نے مسلمانوں کو نا امیدی اور مایوسی سے نکالا اور ان کے تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہوئے مستقبل کی امید دلائی۔ درحقیقت انھوں نے عصر حاضر کے مسلمانوں کو نئی جرأت دی اور انھیں اسلامی ثقافت کے مطابق علم و دانش حاصل کرنے کی تلقین کی اور تاہم آخری کہ مسلم متقدمین فکر اور غم ہی انھیں بستر مرگ پر لے گیا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال اپنی آخری سانس تک حکیم الامت بنے رہے اور اپنی زندگی کی آخری چند گھڑیوں میں ایک ٹیلہ لینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کیوں کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ وہ فرماتے تھے کہ I want to face death اور ایسا کہتے ہوئے یقیناً ان کے پیش نظر قرآن کی یہ آیت ہوگی قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورہ الانعام، آیت ۱۶۲-۱۶۳) یعنی میرے فرائض زندگی کی ادائیگی اور اس ادائیگی کے طور طریق حتیٰ کہ میری زندگی اور میری موت، اس خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے جس نے ربوبیت عالمین کا ذمہ اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ میں اس مقصد میں کسی اور جذبہ یا مفاد کو شریک نہیں کرتا۔ اس کا مجھے حکم

دیا گیا ہے اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کے سامنے سب سے پہلے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے نہایت عرق ریزی سے ساتھ موضوع کے اعتبار سے اقبال کی آخری نظم میں لکھے ہوئے ان تاثرات اور مرض الموت کے حوالے سے نہایت مستند اور اپنی نوعیت کی پہلی دستاویز کتابی شکل میں پیش کی ہے، جس سے مطالعے سے نہ صرف عام اہل ادب کی معلومات میں اضافہ ہوگا، بلکہ اقبالیات سے خاص طالب علم بھی مستفید ہوں گے۔

خالد اقبال یاسر
''اقبالیات'' ۴۹.۳ (جولائی ۲۰۰۸ء)

''چوں مرگ آید'': ڈاکٹر تقی عابدی

اقبال کی شخصیت اور شاعری کے کئی گوشے ابھی پوشیدہ ہیں۔ ناقدین اور اقبال شناسوں نے ان کی شاعری، خطوط، شخصیت، مزاح، خطبات اور حسِ مزاح سے لے کر ان کی زندگی کے مثبت و منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، حتیٰ کہ معاصر شعرا نے اقبال کی شاعری پر اعتراضات بھی اٹھائے ہیں اور ناقدین نے ان کے اعتراضات کے مکمل وضاحت کے ساتھ جوابات بھی دیے ہیں لیکن اقبال کی زندگی میں آنے والی بیماریوں اور مرض الموت میں مبتلا ہونا، اپنے خالق حقیقی سے جا ملنے کی حقیقی داستان بہت کم لوگوں نے رقم کی ہے۔ اس حقیقت و مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ عرصہ قبل اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص کے حوالے سے منظرِ عام پر آنے والی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''چوں مرگ آید'' اس لحاظ سے ایک منفرد کاوش ہے کہ اس سے پہلے اقبال کی بیماریوں اور ان کی تشخیص و علاج کے بارے میں کوئی مستند کتاب موجود نہیں تھی۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شاعر کی طویل علالت اور مرض الموت میں مبتلا ہونے کی لمحہ بہ لمحہ روداد شامل ہے۔

یہ کتاب اقبال کے بیمار ہونے سے لے کر موت تک کے واقعات کی مکمل سرگزشت ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک انتہائی اہم کتاب ہے۔ اگرچہ اقبال شناسوں اور ان کے چاہنے والوں کے لیے کتاب کا مطالعہ بہت سے حقائق جان لینے کے ساتھ ساتھ انتہائی اذیت اور دکھ کا باعث بھی ہے کہ شاعرِ مشرق اپنی زندگی میں کیسی کیسی موذی بیماریوں سے نبرد آزما رہے اور آخرکار موت نے انھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

لیکن عمر بھر کی آخری لمحات میں بھی اقبال نے اپنے آپ کو مایوس نہیں ہونے دیا اور ایک عزم اور امید سے بیماریوں کے خلاف لڑتے رہے اور ان بیماریوں کی شدت کو زائل کرنے کے لیے استقامت سے ڈٹے رہے۔

کتاب میں اقبال کی بیماریوں سے نام، میڈیکل معائنہ، نبض اور طبی آلات کا ذکر ہے۔ اقبال سے تعلق رکھنے والے معالجین کی فہرست بھی شامل ہے۔ اقبال کے مرض کی تشخیص اور علاج میں ہونے والی کوتاہیوں پر مختصر مگر جامع طور پر لکھا گیا ہے۔ اس وقت سے اب تک اقبال کا بہترین علاج کیا گیا تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ اقبال کے معالجین نے تحقیق سے انہیں غذا کی پرہیز پر مجبور کیا اور نہ دواؤں، شعاؤں اور برقی لہروں کی وجہ سے صحت پر پڑنے والے منفی اثرات کو زائل کر سکے۔ اس سے اگلا باب "خوراک اور پرہیز" ہے جہاں اقبال کے خطوط اور مستند حوالوں سے یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ شاعر مشرق کھانے میں نفاست پسند اور مرغن خور ہونے کے باوجود تیز مسالہ، ترش، چٹ پٹی اور مرغن غذاؤں سے شوقین بھی تھے۔ اپنی پسندیدہ چیزیں کھانے کی وجہ سے وہ بعض اوقات خوش خوراکی کا مظاہرہ کرتے اور طبی پرہیز چھوڑ دیتے تھے جس کی وجہ سے بیماریوں سے افاقہ ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اس کتاب میں اقبال سے زیر استعمال رہنے والی دواؤں کے نام بھی شامل ہیں اور دواؤں سے منظر عام پر آنے کے بعد ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوا ہے جو مختلف موقعوں پر دواؤں نے پیدا کر رکھی تھیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کتاب مدلل انداز سے اقبال کی بیماری پر لکھے گئے مواد کا خلاصہ بھی پیش کرتی ہے۔ کتاب کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں مصنف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اقبال نے کیسے سال عمر پائی؟ اس بات کی تصدیق کے طور پر مصنف نے اقبال کی موت کی وجوہات اور اسباب بھی بیان کیے ہیں اور اقبال کے خاندان کے افراد کی عمریں بھی تحریر فرمائی ہیں۔ چند حیاتی اموات کے پیش نظر رکھے جائیں تو اقبال اپنے قریبی رشتہ داروں میں سب سے کم عمر تھے اور انہوں نے اپنے والد کے مقابلے میں پندرہ سال کم عمر پائی۔

یوں تو کتاب کا ایک ایک صفحہ اقبال شناس کو پڑھنا چاہیے لیکن ان معلومات

میں سے استقامت اور اُمید، گزارش امراض۔ اقبال کے قلم سے اور علامہ اقبال کی آخری رات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ استقامت اور اُمید سے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال کے عقیدے میں نا اُمیدی نہ تھی اور بقول مصنف استقامت و توکل ان کا ایمان تھا۔ ان کی زندگی میں مشکل سے مشکل مواقع بھی آئے جن میں انھوں نے انہی طریقوں سے فتح حاصل کی۔

اسی طرح گزارش امراض میں اقبال کے ۱۲ خطوط کا ذکر ہے جن میں انھوں نے اپنی بیماریوں کا ذکر کیا۔ بقول مصنف وہ اردو ادب کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے بذریعہ خطوط اپنی بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

(خلاصہ گفتگو 23 نومبر 2008ء
علامہ اقبال گلوبل فورم سیمینار)

چوں مرگ آید

"چوں مرگ آید" جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں کی ہے۔ ۵۰۰ سو پانچ صفحات پہ مشتمل اس دیدہ زیب کتاب کی اشاعت 2007ء میں اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام ہوئی۔ یہ تصنیف نئے اردو میں بالعموم اور اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں بالخصوص ایک اہم اور گرانقدر اضافہ ہے۔ میرے لیے یہ مقام مسرت و فخر ہے کہ آج حضرت علامہ کے انتقال کو ستر برس ہو چکے ہیں مگر اس مضمون پر اس نوعیت کا تفصیلی اور مدلل کام کرنے کے لیے اس سے پہلے کسی کا قلم نہ اٹھ سکا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے 18 کتب اور علامہ اقبال کے 291 ذاتی خطوط سے مواد حاصل کر کے علامہ کی علالت اور حالات مرض پر نہ صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کی زندگی کے چند ایسے مخفی گوشے بھی اجاگر کیے ہیں جو اس سے قبل عوام سے قدرے پوشیدہ تھے۔ اس مختصر تبصرے میں میں اس شاہکار کے تمام پہلوؤں پر روشنی تو نہیں ڈال سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ چند ایک باتوں کا تذکرہ کر کے آپ سے ذوق مطالعہ میں تجسس کی چنگاری سلگا کر آپ کو اشتیاق سے کتاب کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دوں۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (پیدائش 9 نومبر 1877ء) کا انتقال 61 برس کی عمر میں 21 اپریل 1938ء کو ہوا۔ قبر سے باہر شاہی مسجد لاہور میں ان کا جسد خاکی دفن ہے۔ "چوں مرگ آید" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا علاج تین سے زیادہ معالجوں نے کیا جن میں سب سے نمایاں نام حکیم نبی بخش اور ڈاکٹر الٰہی بخش کا ہے۔ یہ دونوں حضرات علامہ کے والد شیخ نور محمد کے معالج رہے تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر محمد یعقوب، ڈاکٹر عطا محمد، ڈاکٹر جمعیت سنگھ، ڈاکٹر محمد اکبر خان اور ڈاکٹر محمد اسحاق نے بھی علامہ کا علاج کیا۔ ان کے علاوہ حکیم محمد حسن قرشی، حکیم عبدالوحید خان اور حکیم محمد اجمل خان نے بھی علامہ کا علاج کیا۔ ان کے علاوہ حکیم محمد حسن قرشی، حکیم عبدالوحید خان اور حکیم محمد اجمل خان نے بھی علامہ کا علاج کیا۔

شامل تھے۔ علامہ کو داہنی آنکھ کا ضعف بصارت، درد سر، دل کے پھیلاؤ اور ضعف تنفس اور نقرس (گنٹھیا) وغیرہ کی شکایات تھیں اور آخری چند برس ان کی آواز بھی کمی کا باعث متاثر ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ مشاعروں میں اپنا کلام سنانے سے قاصر ہو گئے تھے۔ یہ بھی واضح ہے کہ ان کی عمر کے آخری پانچ برس کافی علالت میں گزرے جن میں انھیں سانس کے پھول جانے اور پاؤں متورم ہو جانے اور چھاتی کے درد نے پریشان رکھا۔ ان متعلقہ بیماریوں نے انھیں اپنے معمولات میں کافی حد تک ترمیم کرنے میں دشواریاں پیدا کیں اور وہ ان کے باعث کئی کاموں میں عملاً شامل نہ ہو سکے۔ بایں ہمہ یہ بات بھی مسلم ہے کہ ان عارضوں سے ان کے ذہن، حافظے اور ان کے تخلیقی معیار یا سوچ پر کوئی منفی اثر نہ پڑا اور وہ تادم آخر اسی باکمال سوچ اور وصاف ذہن سے اپنے رفقا سے تبادلہ خیال کرتے رہے اور شعر کہتے رہے۔

حضرت علامہ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بیماری کی علامات اور علاج وغیرہ کے بارے میں اپنے احباب اور رفقا کو خصوصاً باخبر رکھا۔ و تحاب بالاختصار یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ نے تمام عمر اپنا بیشتر علاج حکیموں سے کروایا۔ وہ ایلوپیتھک (انگریزی) طرز علاج کو کمتر سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں انگریزی دوائیں ان کی طبیعت کے غیر موافق تھیں۔ گو انھوں نے ایلوپیتھی کے تشخیصی ذریعے استعمال کیے اور احباب کی ایما اور اصرار پر ایلوپیتھک دوائیں متعدد بار استعمال کیں، وہ اپنے علاج کا اصل جزو ہومیو پیتھک علاج کے نسخوں کو ہی سمجھتے رہے۔

حضرت علامہ کے ہومیو پیتھک طرز علاج کو پسند کرنے کی وجوہات میں طب کی طویل اور شاندار تاریخ، مسلمان حکیموں اور دانشوروں کے طب میں اعلیٰ مقام اور ایلوپیتھی طرز علاج کی طفل سالی کا بڑا دخل تھا۔ اس کے باوجود، علامہ نے نیند کی گولیاں، امونیم کلورائیڈ، فروٹ سالٹ، گلسرین اور انجکشن آف Mersaly Mersyles وغیرہ جیسی انگریزی دوائیں بھی استعمال کیں۔

حضرت علامہ نے حکیم نابینا (حضرت علامہ لقمان امکنگ، حکیم عبدالوہاب صاحب) سے تادیر علاج کروایا اور ان کے مشہور زمانہ "روح الذہب" نامی نسخے بوساطت

استعمال کیا۔ خالص سونے سے تیار ہونے والے اس نسخے کے تیار کرنے میں کئی مہینے لگتے تھے لہٰذا اس کی مانگ ہمیشہ رہتی تھی۔ حکیم ناجی صاحب کے اس نسخے کی افادیت اور ترکیب استعمال وغیرہ کے بارے میں حکیم عبدالغنی انصاری صاحب نے ایک کتابچہ مرتب کیا تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مختلف امراض کے لیے مفید ہے اور اس سے دل و تقویت ملتی ہے، خون صاف کی مقدار بڑھتی ہے اور مردے میں اگر پتھری ہو تو ریزہ ریزہ ہو کر نکل جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حکیم صاحب کے اس نسخے سے بڑی امید تھی کہ انھوں نے روح الذہب کے حوالے سے حکیم صاحب مرحوم کی یہ شعر عنایت کیے:

"ہے دو روحوں کا نشیمن قالب خاکی مرا
اک سراپا شور و مستی اک سراپا تاب و تب

•••

ایک جو اللہ نے بخشی مجھے روزِ ازل
وہ کمی ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

•••

اس سے زیادہ اور کیا لکھوں میں اے تمام طب
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا حسنِ طلب"

•••

ضیق انجم
دہلی

''چوں مرگ آید''

علامہ اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص

(خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں)

سید تقی عابدی صاحب ہندوستان سے رہنے والے ہیں۔ ان کی پیدائش یکم مارچ 1952ء کو دہلی میں ہوئی تھی اور ان کے والد سبط نبی عابدی پیشے سے اعتبار سے منصف تھے۔ تقی عابدی صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گزرا تھا۔ ان کی شخصیت پر حیدرآبادی تہذیب کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد ہی سے ایم بی بی ایس کیا، پھر برطانیہ سے ایم ایس، امریکہ سے ایف سی اے پی اور کینیڈا سے ایف سی سی پی جیسے اعلیٰ ترین امتحانات طب میں پاس کیے۔ حیدرآبادی تہذیب کا سب سے نمایاں اثر ان کی شخصیت پر یہ ہوا کہ انھیں شاعری، تنقید اور تحقیق سے دلچسپی ہوئی۔ سید تقی عابدی صاحب ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیدرلینڈ اور کینیڈا میں رہے جس کی وجہ سے ان کا ذہنی افق بہت وسیع ہو گیا۔ انھوں نے سائنسی اور طبی علم میں مہارت حاصل کی۔ انھیں دنیا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ تین درجن سے زیادہ مطبوعات کے مصنف یا مؤلف ہیں جن میں سے پانچ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چھ اور کتابیں زیر تالیف ہیں جن میں سے ''تعشق لکھنوی'' منظر عام پر آ بھی چکی ہے۔

حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب علامہ اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص پر ''چوں مرگ آید'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے علامہ کے ان 251 خطوط سے استفادہ کیا ہے جو مرحوم نے اپنی بیماریوں کے سلسلے میں دوستوں،

عزیزوں اور اپنے طبیبوں و ملنے تھے۔ چوں کہ پیشے کے اعتبار سے سید تقی عابدی صاحب ایک نامور ڈاکٹر ہیں، اس لیے انھوں نے جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی تمام بیماریوں کا جائزہ لیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے علامہ کی بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے اور پھر مختلف اطباء قوم کے علامہ کی مختلف بیماریوں کا ذکر کیا ہے اور ہر بیماری کے بارے میں ماہر ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی رائے بھی دی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ پر کبھی ایپوپلیکسی، سرجری، ریڈیو تھراپی جیسے طریقہ علاج کا یا تجربہ انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کی بیماریوں کی تشخیص اور علاج میں ان کی معالجوں سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں۔ انھوں نے علامہ کی خوراک اور پرہیز کا ذکر کیا ہے۔ عابدی صاحب نے ان کبھی اور ہیوپیتھک دواؤں کے نام کی فہرست بھی دی ہے جن کا ذکر علامہ نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔

انتقال کے وقت علامہ اقبال کی عمر اٹھہتر سال اور چھ مہینے تھی۔ جب کہ ان کے والد نے تراسی سال، والدہ نے پچہتر سال، بڑے بھائی نے بیاسی سال اور چھوٹی بہن نے اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تقی عابدی صاحب کا خیال یہ ہے کہ "اقبال کی سبق آموز موت کی وجہ بچپن سے مزمن نوعیت کی قبض پسندی ہے انھوں نے کوئی ورزش نہیں کی۔ فطری مصلح Successful زندگی بتانے کو خوش ہضمی، پرہیزی غذا، ورزش اور پھیپھڑوں کی بیماریوں اور ان سے ساتھ یونانی علاج میں ذرب اثیت کے مضر اثرات تاکل ہوتے ہیں۔ ان تمام مسائل سے متعلق یہ بحث ہے۔

سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

تقی عابدی صاحب کا یہ خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی طبیعی عمر سے تیس سال پہلے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

اب سے آخر میں "شام و مشرق کا وقت آخر" "زندگی سے آخری ملاقات"، "علامہ اقبال کی آخری رات" "کاش آخری خواہش پوری ہوتی" "علامہ اقبال کا تحفہ" "علامہ اقبال کا تحفہ" جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

آخر میں اُن تمام 291 خطوط کے مستند حوالے دیے گئے ہیں جن سے تقی عابدی صاحب نے علامہ کی بیماریوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ یہاں یہ بتانا غلط نہ ہوگا کہ مشرق کا یہ عظیم مسیحا بہت بڑی تعداد میں مختلف بیماریوں کا شکار رہا۔

اقبال کی وفات کو تقریباً ستر سال گزر چکے ہیں۔ اس دوران اقبال کی شخصیت، سوانح اور فن پر بلا مبالغہ ہزاروں مضامین اور سیکڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ میری محدود معلومات کے مطابق اردو کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب یا شاعر ہو جس نے سوانح اور فن پر اردو میں اتنا زیادہ لکھا گیا ہو۔

ٹورنٹو (کینیڈا) کی علمی اور ادبی زندگی میں تقی عابدی صاحب غیر معمولی اہمیت کے مالک ہیں۔ بہت کم اردو ادب اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسے ہوں گے جن میں تقی عابدی صاحب شرکت نہ کرتے ہوں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے مہمانوں کی پذیرائی میں بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ یہ بات میں اپنے ٹورنٹو کے قیام کے خوش گوار تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں۔

غرض "چوں مرگ آید" ایک مختصر مگر انتہائی جامع کتاب ہے اور اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ تقی عابدی صاحب نے یہ کام بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ اب وہ اسی انداز کا کام غالب پر کرنا چاہتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انھیں اپنے اس مقصد میں کامیاب کرے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

''چوں مرگ آید''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے گراں قدر، اہم اور تحقیقی کارناموں سے ادبی حلقے میں ایک ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنی ایک ممتاز و منفرد حیثیت بنالی ہے۔ انیس، دبیر، آتش، بحر آفندی وغیرہ و نیز اردو قواعد اور عروض پر جس نوعیت کی علمی، تحقیقی تنقیدی کتابیں رقم کی ہیں اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اہل علم و فن لگا چکے ہیں اور اپنی پسندیدگی و معیار بندی کی مہر بھی لگا چکے ہیں۔ تازہ ترین اور زیر نظر کتاب ''چوں مرگ آید'' نہ صرف اس سلسلے کی اگلی کڑی ہے بلکہ اپنے نام اور کام کی انفرادیت اور انوکھے پن کی وجہ سے ڈاکٹر تقی عابدی کی غیر معمولی ذہانت، عرق ریزی اور تحقیق شوق کی غیر معمولی دلیل و برہان پیش کرتی ہے۔

''چوں مرگ آید'' اقبال کے ہی مصرعہ سے عنوان قائم کرکے عابدی نے اقبال کے حیات و ممات کے درمیان علامت و استعارہ سے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن پر ابھی تک کسی نے توجہ نہ دی یا بہت کم توجہ کی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مضمون ایسا تھا ہی نہیں جس پر علم تحقیق و تنقید کے ماہر حضرات توجہ مبذول کرتے اور باقاعدہ کتاب رقم کرتے، لیکن تقی عابدی کی نکتہ رس تحقیقی و تنقیدی نظر نے یہ دیکھ لیا کہ یہ مضمون کو صرف تلاش کیا جائے بلکہ علامت حیات و ممات کے حوالے سے اقبال کی مختلف پہلوؤں پر بھی اس انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ وہ ایک روشن کتاب بن جائے۔ اشاریہ، حواشی، معلومات افزا اور تحقیقی نوٹس نہیں بلکہ ایک مقالہ بھی اپنے مقالے کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں۔

''علامتی زندگی سے اس پہلو پر گفتگو چاہے جس سے ان کی ذات کا تعلق تھا اس سے کوئی فائدہ نہیں ملتا ہے اور نہ اس سے بعد خود علامہ کو کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان تمام سوالوں کا تسلی بخش جواب اس

کتاب کے ہر صفحہ پر سطر سے زیادہ بین السطور بیاض کی طرح روشن ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی انفرادیت رکھتی ہے کہ اس میں طبی معلومات، بدنی کیفیات، روحانی اعتقادات کو خاص طریقہ سے برتا گیا ہے۔ گفتگو لفظ بہ لفظ خطوں سے آئینے میں، مستند حوالوں کی روشنی میں کرکے نتائج اخذ کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے عوام ہی نہیں، اقبالیات کے خاص طالب علموں کو بھی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔"

مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اقبال، فردوسی، عطار، حافظ، جعفر زٹلی وغیرہ کی طرح بدنصیب نہ تھے کہ ان کو قتل کیا گیا یا مفلسی و بیچارگی کی موت مرتے، بلکہ اس کے برعکس اقبال ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن سے علاج کے لیے اس عہد کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر، حکیم و ید سب دست بستہ اقبال کے حضور میں ایستادہ تھے اور ہر طرح کی خدمت کو ہمہ وقت تیار رہتے۔ اس کے باوجود قسمت، فطرت نے یاوری نہ کی اور علامہ ایک نہیں کئی موذی و مہلک امراض میں گرفتار رہے اور محض اڑسٹھ باسٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ چوں کہ یہ امراض ایک دو نہیں متعدد تھے اور معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی تھے اس لیے اقبال نے ان کے علاج کی ہر طرح کی کوشش کی۔ اس ضمن میں انھوں نے قریب و بعد تمام حکیموں، ڈاکٹروں سے رابطے کیے اور خطوط لکھے۔ یہ کتاب انھیں خطوط کی حقیقتوں اور بعض بنیادی کتابوں کے تعاون سے رقم کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف رقم طراز ہیں:

"اردو فارسی ادب کا شاید ہی کوئی دوسرا عظیم شاعر ہو، جس نے علامہ کی طرح اپنی بیماری کی کیفیتوں کو لکھا ہو۔ علامہ کے مطبوعہ ساڑھے چودہ سو خطوں میں 251 خطوط ہمارے بیان کی سند ہیں۔"

ان خطوں کے حوالے سے اخذ کردہ حقائق سے بے حد اہم، دلچسپ اور معلومات افزا صداقتیں ہمارے سامنے آئی ہیں جن سے نہ صرف اقبال کے امراض بلکہ ان کی ذہنی کیفیت، گھریلو حالات اور امکانات پر قابل قدر روشنی پڑتی ہے۔ نیز ان حکما و رفقا اور خدمت گزاران کے بارے میں علم ہوتا ہے جن کے بارے میں اب تک اردو قارئین اور

اقبال پسندوں کا علم نہ برابر تھا۔ چناں چہ اسی خیال کو مصنف نے اپنے چند نکات میں سر فہرست رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اقبالیات کے جو اب علم ان چند افراد کے نام و نشان سے واقف ہیں جنھوں نے اقبال کے انتقال کے بعد اقبال کی قربت کو اپنے مقام و بلند کرنے کے لیے صرف کیا اور بات کا بتنگڑ بنایا اور خود کو اقبال کے خدمت گزاروں کی صف میں سر فہرست رکھا۔ اقبال کے مداحین میں بعض ایسے جو خصوصی طور پر اقبال کی نگاہ میں معتبر اور معتمد تھے ان کا ذکر بھی نہیں ہے۔ چناں چہ اس کتاب میں خطوں اور مستند حوالوں سے ان کی حقیقی خدمت گزاروں کے نام و کام سے بھی آشنائی ہو سکے گی۔"

اقبال کی سیرت و شخصیت، اقبال کے مطالعہ، معمولات، بیماری کی نفسیات اور پھر اقبال کی دینی بصیرت، ہمت اور استقلال کو بھی بڑے پر سوز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چوں کہ قلمی عابدی خود ڈاکٹر ہیں اس لیے انھوں نے بڑے تجربے کی بات کہی ہے۔

"اقبال نے 1931ء کے مدراس کے خطبے میں کہی بار یہ لکھا کہ جب کسی مریض کو کسی مہلک مرض کی اطلاع دی جاتی ہے تو بڑے سے بڑے بلند ارادہ شخص کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جاتی ہے یعنی جب ڈاکٹر مریض کو اس کی بیماری کے بارے میں رپورٹ دیتے ہیں اس کے بعد علاج کرتے ہیں مہلک بیماری کی تشخیص دیتے ہیں، اسی دن چند گھنٹوں بعد جو خط علامہ نے سید نذیر نیازی کو حکیم نابینا سے مشورہ کرنے کے لیے لکھا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اقبال تمام آرائش قلب اور بقیہ تشویش سے رندی و رعنائی کے مباحثہ میں مشغول ہیں۔ یہی نہیں موت سے چند گھنٹے قبل وہ مرنے کے بعد کی دنیا کے استقبال و تیاری کے لیے مرنا نہیں چاہتا۔

علامہ کے عزم، استقلال، عزائم اور حقیقت حیات اور ممات سے متعلق

اور مراحل بھی اسی دفتر میں نظر آ میں گے یوں کہ خود علامہ اپنے خط میں لکھتے ہیں

ع : ہرچہ از دوست میرسید نیکواست

بیسوی صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں موجود برصغیر میں طبی سہولتوں کا بھی پتہ چلتا ہے یوں کہ علامہ کے مرض کی جدید طبی آلات سے بھی تشخیص کی گئی تھی۔

علامہ کی آواز بیٹھ جانے، دمہ قلبی، زکام اور مرض قلب وغیرہ کی تشخیص جدید طبی اصولوں سے اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

بیماری کی وجہ سے جو صدمات اقبال کے جذبات اور زندگی کے روزمرہ مسائل پر وارد ہوئے اس کا اجمالی ذکر بھی پایا جاتا ہے۔

اس سے زیادہ ایک ادب دوست اور اقبالیات سے پرشوق قاری کے لیے یہ اہم ہے کہ ان بیماریوں کی وجہ سے اقبال وہ کام نہ کر سکے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ قدرت نے انھیں چند برس اور دیدیے ہوتے اور ان سے علمی و ادبی منصوبے پورے ہوئے ہوتے تو یقیناً ادب اور قوم کو بیش قیمتی چیزیں میسر آئی ہوتیں۔ مقدمہ کے آخر میں تقی عابدی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے اہم نکتہ جو اس مضمون سے ہمارے سامنے اجاگر ہوتا ہے وہ حکیم الامت کی کوشش جدوجہد، محنت اور خدمت خلق و امت ہے جو زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہی۔ ہم نے دیکھا ہے جب خطرہ کی گھنٹی بجتی ہے تو لوگ اپنی تمام تر شغل جس میں شاعری، رفاہی کام وغیرہ بھی شامل ہیں چھوڑ چھاڑ کر بستر علالت پر صرف افسردگی کے عالم میں موت کے منتظر رہتے ہیں۔ جب کہ علامہ جو یہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ چراغ سحری ہیں اور صرف چند دنوں یا گھنٹوں کے مہمان ہیں، لیکن انتقال کی آخری شب تک اگر ان کے نظام اوقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی انہماک اور کوشش سے امت کے کاموں میں مصروف ہیں، جیسے

انھیں پتہ ہوا ہی نہیں۔ علامہ اقبال کی یہ مثبت فکر ہی ہمارے لیے بہت بڑا
درس ہے اور چیلنج۔"

مقدمہ کے بعد کتاب کی باقاعدہ ابتدا علامہ کی بیماریوں سے ہوتی ہے جن میں سر
فہرست علامہ کی آنکھ کی بیماری ہے۔ دائیں آنکھ ضعف بصارت، دونوں آنکھوں میں موتیا
اترنا۔ اس کے علاوہ عوارض گردہ (Kidney Problem)، نقرس (Gout)، عوارض
قلب (Heart Problem)، عوارض ریوی (Lung Problem)، اس کے علاوہ
کلو، امراض دہان، بھیڑ، مرخوانی وغیرہ بیماریاں بھی تھیں۔

مصنف نے بالترتیب ان بیماریوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ مرض کیا ہے کیوں ہو
اور کیسے ہو۔ کس مرض کا علاج کس ڈاکٹر سے ہوا۔ ان ڈاکٹروں سے قبل سے یہ مراسم
رہے اور اقبال کس قدر پریشان رہے۔ ان سب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس سے اقبال
کی علالت ہی نہیں ان کی شخصیت اور حیات کے مختلف اور کارآمد گوشوں پر معنی خیز روشنی پڑتی
ہے۔ مثلاً آنکھوں کی بیماری کے بارے میں سید نذیر نیازی "دانائے راز" میں لکھتے ہیں

"قبل ۱۹۰۰ء سال کے ہوئے تو ایک بیماری کے علاج کے لیے ان کی بہ
بی (والدہ) نے ان کی دائیں آنکھ کے قریب جونکیں لگوائیں۔ جونکوں نے
فاسد خون چوس لیا۔ بیماری جاتی رہی لیکن آنکھ بینائی متاثر ہوئی۔ یہاں
تک کہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ بینائی بالکل جاتی رہی۔"

"روزگار فقیر" میں سید وحید الدین لکھتے ہیں

"اقبال کی ایک آنکھ بچپن ہی سے کمزور تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب وہ
اسسٹنٹ کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے تو طبی بورڈ نے آنکھ بینائی
کمزور ہونے کے سبب ان کو سرکاری ملازمت میں لیے جانے کی سفارش
نہیں کی۔ یہ بظاہر ایک طرح کی ناکامی تھی، مگر علامہ نے مستقبل سے
تابناک اور کامیاب ہونے کا پیش خیمہ تھی۔ سرکاری ملازمت میں وہ ہمیشہ
اور ہر جا بن سکتے تھے مگر جہان حقیقت اور خمیر شرق نہ بن سکتے۔"

ضعف بصارت سے اقبال کو کس قدر پریشانیاں ہوئی ہوں ان کا اندازہ خود

علامہ کے دو مختلف خطوط کے ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے

''میری بصارت کمزور ہو گئی ہے اس واسطے اب میری خط و کتابت جاوید کرتا ہے یا کبھی احباب آپ کا نام سیاہی سے سفید کاغذ پر لکھیں تو آپ کا خط میں خود بھی پڑھ سکوں گا .....''

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

''مجھے ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ یہ خط ایک دوست سے لکھوایا ہے۔ نظم کا ان سے دوسرا بند انتا لکھا گیا ہے۔ معاف فرمایئے۔''

خان محمد نیاز الدین خاں لکھتے ہیں:

''مجھے دردِ سر دہ کی شکایت رہی جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اوپر جاری ہے۔ جدید طبی آلات کے ذریعہ سر دہ کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ سر دہ میں پتھر ہے اور یہ عمل جراحی کے بغیر چارہ کار نہیں ہے مگر تمام اعزا اور دوست عمل جراحی کے خلاف ہیں۔ دردِ فی الحال رک گیا ہے اور میں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں چند روز قیام رہے گا۔''

فقیر وحید الدین نے لکھا ہے کہ 1928ء میں علامہ کو دردِ سر دہ کی شدت سے تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں حسب ذیل دو رباعیاں کہے جو روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع ہوئے:

وہ مرا فرصت ہوش دو سہ روزے دگرے
کہ در ایں دیر کہن بندۂ بیدار کجاست

•••

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

ایک اور دلچسپ اور سبق آموز واقعہ غلام رسول مہر نے کتاب ''درونِ خانہ'' کے

دیباچہ میں لکھی ہے

"ایک مرتبہ رمیوں میں درد کی تکلیف ہوئی اور وہ کئی روز رہتی رہی۔ میں دوپہر کے وقت وقتاً جاتے جاتے مزاج پرسی کے لیے حاضر خدمت ہوا۔ میں کلوروفارم والی کوٹھی میں ان کی خواب گاہ کے پیچھے ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ شمالی جانب تھا۔ اس میں تپش کم ہوتی تھی۔ فرش پر خوب پانی ڈلوا کر اس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں ایک اور صاحب بھی ملاقات کے لیے آئے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ یکایک مرحوم نے مجھ سے پوچھا۔

"مہاشہ صاحب! تکلیف انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے؟"

میں جواب میں حدیث جبرئیل سے وہ الفاظ دہرا دینا چاہتا تھا، جو رسول خدا نے قیامت کے سوال پر فرمائے تھے۔ یعنی

"جس سے پوچھا جائے اس کا علم پوچھنے والے سے زیادہ نہیں۔" لیکن میں پوچھتے بھی کیا پایا تھا کہ جو صاحب میرے پاس بیٹھے تھے بول اٹھے۔ "نہیں صاحب! تکلیف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔"

یہ سنتے ہی ان پر غیب سے حیرت طاری ہوئی۔ پہلے چپ لگی۔ پھر رہتے رہتے بولے "یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو میری توبہ میری توبہ..." "میں نے کیوں شکوہ کیا۔"

اس کے بعد فقرہ (۱۱۱۱) اسی مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک دانشمند ہونے کے ناتے یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ قرآن سے یہاں اس بیماری کی یہ نوعیت تھی اس کی تصدیق سے یہ قرآن سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں حکیم مومنا کو لکھتے ہیں

"اس بات کا بھی خیال رہے کہ مجھ کو جب درد قولنج بھی ہو جاتا ہے اس کی روک تھام بھی ہوتی ہے۔ اتو لنجے پر کھانے کی دوا بھی ہوتا

اور بہتر ہے۔"

ڈاکٹر جاوید اقبال بھی "زندہ رود" میں لکھتے ہیں

"اس کے بعد دردِ نقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس سے دور سے پڑتے تو لگاتار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جائیں۔"

"روزگارِ فقیر" میں وحید الدین لکھتے ہیں

"صاحب درد ہونا علامہ کی قسمت میں لکھا تھا۔ درد ہوا تو اس کی جڑ نقرس نے لے لی جو پاؤں سے انگوٹھے کے جوڑ میں ہوتا تھا۔ اس کا دورہ جب بھی پڑتا، علامہ کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا۔"

ان بیماریوں کی شہ بیماری۔ بیماریٔ قلب۔ جس کی وجہ سے وحشت، بے چینی اور نیم بے ہوشی کی حالت سی رہتی لیکن اس حالت میں بھی وہ علم اور عالم کے کیمیے میں رہتے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں

"ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ انہی ایام میں دے کے بعد دیگرے دو دورے اور پڑے۔ جدید سب ہوش کے عالم میں راقم نے انھیں دو مرتبہ اپنی خواب گاہ میں مرزا عبداللہ غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ مرزا غالب یا مولانا رومی ابھی آئے ہیں یا نہیں۔ جب کہتے کہ نہیں تو علی بخش کے اس جواب پر کہ "یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔" فرمایا "چلو ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد مصنف نے اقبال کے امتزاج قلب اور تپش کوشی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں عابدی صاحب نے اقبال کی زندگی کے چند بے حد اہم واقعات درج کیے ہیں۔ ہر چند کہ ان واقعات کا ذکر اقبال کے خطوں یا بعض اہم کتابوں سے ستنباط کیا گیا ہے لیکن فاضل مصنف نے ان کو کچھ ایسی ترتیب دی اور حقائق کو کچھ اس طرح ترتیب وار پیش کیا ہے کہ یہ کتاب اپنے آپ میں ایک زندہ رود سی لگنے لگتی ہے۔ جانے انجانے میں اقبال کی شخصیت کی کمزوریاں یا مزاجی کیفیتیں وغیرہ بھی بڑے دلچسپ انداز

میں سامنے آتی ہیں۔ مزید یہ کہ کچھ غلط فہمیاں بھی دور ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اقبال تمباکو سے علاوہ شراب نوشی بھی کرتے تھے لیکن مصنف نے بڑے دعوی سے یہ بات کہی ہے

"علامہ اقبال ہرگز شراب نوش نہ تھے بلکہ شراب نوشی کو خودکشی کے مترادف قرار دیتے تھے۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ قیام یورپ کے تین برسوں میں اور بعد میں بھی جب بھی وہ یورپ سے لوٹے انھوں نے وہسکی بالکل استعمال نہ کیا۔ چہ جائیکہ شراب"

اس دعوی کی تائید میں وہ کئی واقعات اور نئی شہادت بھی پیش کرتے ہیں جو یقین کی منزلوں کو چھوتے ہیں اور باتوں باتوں میں سیاست و مغربیت پر تبصرے بھی ہوتے چلتے ہیں جو اقبال کی ذاتی زندگی کو سمجھنے میں مدد کرتے ہی ہیں نیز ان کی شاعرانہ و مفکرانہ شخصیت کی تفہیم میں معاونت کرتے ہیں۔ اور آگے بڑھتے ہوئے مصنف نے اقبال کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً ام الحق حسین، برونکائٹس، کھانسی، دمہ، چیچک، ملیریا اور نمونیا وغیرہ کے اور حلق کی بیماریاں، آواز کا بیٹھ جانا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ آواز کا ختم ہوتے چلے جانا۔ اقبال کی نہ صرف ذاتی زندگی بلکہ ان کی ادبی و سماجی اور سیاسی زندگی پر کہ سے اثر پڑتے ہیں۔ مصنف نے 1931ء کے ایک خط کا ذکر کیا ہے۔ اقبال پر وفیسر ایس برنی کو لکھتے ہیں

"دو سال سے اوپر ہوئے جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا سیڑھیوں ہی سے کھانسی کا دورہ ہوا۔ بھی دانتے پیسنے پر زکام بند ہو گیا۔ بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے۔ بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے بالآخر بیرسٹری کا کام بھی چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی طب والوں سے علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔"

اس کے بعد جو نتیجہ نکالا وہ یوں ہے:

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی آواز تقریباً جنوری 1934ء سے بیٹھنی شروع ہو گئی تھی اور اس سے متعلق تین سال تک علاج نہ ہو سکا جس نے علامہ کی روزمرہ زندگی، سیاسی

زندگی کے ساتھ معاشی اور اقتصادی حالات پر گہرا اثر چھوڑا۔

1. علامہ نے جلسوں اور میٹنگوں میں تقریر کرنا چھوڑ دیا۔
2. علامہ نے بیرسٹری کا کام بھی پہلے کم اور بعد میں ترک کر دیا۔
3. علامہ نے قرآن پاک کی با آواز بلند تلاوت جو ہر صبح کیا کرتے چھوڑ دی۔
4. علامہ نے سیاست اور انتخابات میں بھی شرکت کم کر دی۔
5. آواز کے بیٹھ جانے کے بعد علامہ کی شخصیت بھی مجروح ہوئی اور عام طور پر علامہ غم زدہ نظر آنے لگے جس کا اثر علامہ کے احباب اور اطرافیان اس بیماری سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام کس کرب سے گزرے ہوں گے اور بہت سارے کام جو وہ کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اس بیماریوں کی وجہ سے اقبال کا سکون چھن گیا۔ نیند نہ آنے کی بیماری بھی ہو گئی۔

بیماریوں کی تفصیلات کے بعد وسط میں ان معالجین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جنھوں نے ہر طرح سے نہ صرف پیشہ وارانہ بلکہ نہایت مخلصانہ بلکہ عقیدت مندانہ طور پر اقبال کا علاج کیا جس کی وجہ سے تھوڑی بہت راحت ہو جاتی، لیکن اکثر امراض اور مہلک بیماریوں نے اقبال کو جکڑ سا دیا۔ ان ممتاز معالجین میں حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر عبدالباسط انصاری، ڈاکٹر رحمان، ڈاکٹر رام چند، ڈاکٹر احمد بخش خاں وغیرہ خاص تھے ان میں یونانی، انگریزی سبھی طرح کے معالج تھے۔

ان بیماریوں کی وجہ سے ایک طرف ان کی صحت گرتی گئی تو دوسری طرف ان کے پروگرام منسوخ ہوتے گئے۔ تلاوت سے محروم ہوئے۔ جلسے جلوس چھوٹے، خطبے نہ دے سکے۔ وکالت چھوٹی، مصنف نے بڑی دردمندی کے ساتھ ایک جگہ لکھا ہے

> ''آخری عدالت کے مہینوں میں آواز سے مایوس ہو گئے اور پھر دم کے حصوں کے ایسے رہے۔ اب اقبال کی توجہ آواز سے زیادہ تنگی نفس پر تھی۔''

ع : اے بسا آرزو کہ خاک شد

تف برتو اے چرخ پیر! تو نے اس برصغیر کی اذان صبح گاہی کی آواز کو دھیما کر دیا۔ جو ملت کو خواب گراں کر جگا رہی تھی۔

چند اقتباسات اور ملاحظہ کیجیے:

"برقی صاحب کے سلسلے میں اقبال پہلی بار 1937ء میں بھوپال میں رہے۔ اس دوران انھوں نے ریاض منزل میں سات نظمیں لکھیں "ضرب کلیم" میں موجود یہ نظمیں سلطانی، تصوف، دین، مقصد، حکومت، نگاہ اور امید کی عنوان کی روداد تازہ کرتی رہتی ہیں۔ اس قیام سے دوران بھوپال کے نواب اقبال سے بہت متاثر ہوئے اور سر راس مسعود اس نواب پر پانچ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا، جس میں انھوں نے لکھا تھا "دور حاضر کے سب سے بڑے مسلم زندہ شاعر محمد اقبال سے نام نہاد سے آپ خود واقف ہوں گے ان کا تصوف ہماری قوم کی ذہنی و فکری زندگی میں بلند ترین مقام ہے جدید مغربی تہذیب انھیں ادب و فلسفہ کا وہ بے مثل میدان میں مسلمانان ہند کی ثقافت کا نمائندہ تسلیم کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ بارہ مہینے سے وہ حلق کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اور ان کی کوئی امید باقی نہیں کہ وہ آئندہ بھی اپنی پنشن کی پریمنس جاری رکھیں گے جو ان کی معاش کا واحد وسیلہ تھی۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"بھوپال میں برقی صاحب سے ملنے کے بعد سے اقبال کی صحت پر اچھا اثر ہوا۔ یوں تو وہ علاج کے سلسلے میں مصروف تھے لیکن شیش محل میں انھوں نے قرآن حکیم پر نوٹس لکھنے کا کام بھی تیز کر دیا تھا۔ سفر اور استغراق میں ہمیشہ ان کا ساتھ رہتا۔ جب بھی موقع ملتا اور طبیعت میں تحمل کا زوال ہوتا تو شعر بھی کہتے۔ چنانچہ شیش محل کے پرسکون ماحول میں اقبال نے پانچ نظمیں لکھیں جو بانگ درا کی زینت ہیں۔ یہ نظمیں، مسجد قرطبہ، طلوع اسلام اپنے سیاسی فرزندان سے نام، جمعیت اقوام شرق اور مسجد میں وہ نظمیں ہیں جو اسی قیام کے دوران لکھی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے اس مختصر قیام کے دوران ہی مشہور احباب اور فرمائشی خطوط

کتابت بھی کی اور اس طرح سیاست اور قومی مسائل میں پوری طرح شریک بھی رہے۔"

اسی قیام کے دوران اقبال نے ایک فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" کے نام لکھنی شروع کی جو لاہور جا کر تکمیل کی۔ اس مثنوی کی بابت (29 جولائی 1936ء کو سر راس مسعود کو لکھتے ہیں

"3 اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا۔ میں نے تمہارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل سات شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ۔"

مصنف نے اقبال کے وہ فارسی اشعار بھی پیش کیے ہیں جن میں علامہ نے اپنی بیماری اور بے چارگی کا ذکر کیا ہے، وہ اشعار یوں ہیں ؎

کار این بیمار ناتواں مُرد پیش
من چوں طفلان نامہ از دارو نی خویش

•••

در نسازد با دوا ہا جان زار
تلخ و بویش ہر مشامم ناگوار

•••

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

ترجمہ: - بیماری سے چھٹکارا نہیں اور میں بچوں کی طرح کڑوی دواؤں سے گھبراتا ہوں۔ میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں چھ تیل اور میرے چراغ میں ڈال دے۔"

ان تمام اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال شعری و ادبی سطح پر کیا کیا منصوبے رکھتے تھے اور کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔ قدرت نے انھیں چند برس اور عطا کر دیئے ہوتے تو وہ یقیناً نثر اور شعری سرمایہ بھی چھوڑتے اور قرآن شریف کے نوٹس بھی تیار کرتے جو ظاہر ہے کہ معرکے کی چیز ہوتیں لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شد"

کتاب کے آخری حصہ میں عبدالحق کی وکالتیں، پریوی کونسل کی حاضریوں اور دوسری قسم کی چیزوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور پھر آخر میں ایک سوال بھی قائم کیا ہے۔ "یا اقبال نے ہمیں کیا کچھ دیا ہے؟" اور یہ بھی کہ قبل از وقت موت نے ان سے کن کن منصوبوں کو ادھورا چھوڑا، جس میں سرفہرست ہے قرآن کے نوٹس لیکن مقدمہ قرآن کا نہ ہونا مگر راس مسعود کے نام یہ خط:

"میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے مواد کو تیار کرتا رہتا جو کچھ تھے میرے زیر غور ہیں لیکن اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ خوب شروع نہیں کر سکوں گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ چند ماہ مکمل کرنے کا سامان میسر آجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹس سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمان عالم کو پیش نہیں کر سکتا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف کے نوٹ لکھنے پر صرف کر دوں گا۔"

مقدمہ قرآن کے علاوہ وہ یہ اور کتاب فراموش شدہ پیغمبر کا تحقیقی مطالعہ چاہتے تھے، نہ لکھ سکے۔ ان مہمات اور حیات نامہ پاروں کی مجبوریوں نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ وکالتوں کے بوجھ نے فرصت نہ دی۔ علی بخش کی وفاداری، ان کی خدمت گزاری، ان کی دیانت نے جائداد کی فروخت کی اجازت نہ دی۔ جس کی تفصیل مصنف نے بڑے سلیقے اور عرق ریزی سے ترتیب دی ہے جس سے ان کی آخری دور کی تکلیف، مجبوریاں اور پریشانیاں حل ہو جاتی ہیں بلکہ اقبال جیسے عظیم شاعر و مفکر کی دیوی و بے چارگی پر رونا بھی آتا ہے کہ مذہب، قوم، شاعر، خیر خواہ و زندہ رہنے والے فلسفی، مفکر و قدرت نے اتنی جلدی، آواز حرکت، عمل سے محروم کر دیا۔

یہاں تک کہ کبھی کبھی خود اقبال پر رقت طاری ہو جاتی۔ فقیر سید الدین نے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے "خدا نے مجھے زبان تو عطا کی ہے لیکن آواز سے محروم رہا۔ یہ کہتے کہتے ان پر رقت طاری ہو گئی۔" اقبال انسان تھے کبھی کبھی اس کیفیت کا طاری ہونا فطری تھا لیکن اس کیفیت کا تعلق اپنی ذات کے لیے تھا جبکہ وہ قوم و ملت کو ابھی اور بہت کچھ دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اکثر امید و نشاط کی کیفیت میں ہی رہتے۔ لوگ حیران ہوتے، سوال کرتے تو وہ کہتے:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مصنف نے علاج و معالجہ کی تفصیل تو نہیں دی ہے اس طرح کے واقعات سے اقبال کی شخصیت و شاعری پر بھی جا بجا روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کے آخری لمحات یہاں تک کہ اقبال کے جلوس جنازہ تک کو بھی اس کتاب میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور پھر سب سے آخر میں مقبرہ تک کا ذکر ملتا ہے۔ غرض کہ اسی کراں قدر کتاب میں مصنف نے نہایت عرق ریزی، دیدہ ریزی اور دیانت داری کے ساتھ اقبال سے متعلق ایسی روداد اور ایسے حقائق جمع کر دیئے ہیں جن کو اس انداز سے آج تک کوئی نہ جمع کر سکا۔ یہ سچ ہے کہ یہ حقائق، خطوں، کتابوں یا تذکروں میں بکھری ہوئی شکل میں ہیں نہ ہیں موجود تھے لیکن مصنف کی سخت جاں تلاش و تحقیق اور تخلیقی نوعیت کی ترتیب دینے کا جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب اپنی انفرادیت، اپنی حقیقت و واقفیت اور غیر معمولی ترتیب و تدوین کے ذریعہ دنیائے اقبال شناسی میں مدتوں یاد کی جائے گی۔ جس کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

محمد ممتاز راشد
مدیر اعلیٰ "خیال فن" لاہور، پاکستان

"سبدِ سخن"

(تیس تحقیقی و تنقیدی مقالات)

لاہور سے بہاولپور (پاک و ہند) سے اور بھی بہت سے علمی و ادبی رسائل نکلتے ہیں لیکن بہاولپور کی علمی و ادبی فضا میں جو مقام رسالہ "الزبیر" کو حاصل ہے وہ کسی اور رسالے کو حاصل نہیں۔ یہ رسالہ بہاولپور کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ اس رسالے کے مدیر اعلیٰ پروفیسر ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام بھی بہاولپور کے روشن ناموں میں سے ایک نام ہے۔ "سبدِ سخن" انہی کے تیس تنقیدی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ پُرمغز کتاب مجلسِ علمی سے ڈاکٹر شاہد حسین بخاری کی طرف سے ڈاک سے ایک ساتھ دیگر تین کتب کے ساتھ 23 اپریل 2008ء کو موصول ہوئی۔ دیگر کتب یہ تھیں۔

1. "تجدید نظم طباطبائی" (فن و شخصیت) 1800 صفحات ڈاکٹر سید تقی عابدی
2. "کتاب دیوان غالب: نسخۂ مہر" 820 صفحات ڈاکٹر سید تقی عابدی
3. "نادرِ روزگار فقیر" 112 صفحات (یہ کتاب ڈاکٹر سید تقی عابدی کے بارے میں ہے) پروفیسر عبدالرحمان طارق

زیرِ تبصرہ کتاب "سبدِ سخن" کا مطالعہ میں نے مہینہ بھر میں مکمل کیا۔ یوں تو اس کتاب کے مضامین کو سرسری طور پر بھی پڑھا جا سکتا تھا لیکن میں نے اس کے مباحث پر غور و فکر کرتے ہوئے اور تحریر کی خوب صورتی کا لطف لیتے ہوئے اسے مکمل کیا۔ اس کتاب میں فہرست کا صفحہ شامل نہیں ہے جس سے کتاب کے بارے میں واقف مثلاً سن اشاعت، قیمت اور ناشر وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل پیپر آرٹ پیپر پر ہے اور سرورق کا نام خوب ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے والد محترم شاہ حق تقی کے نام کیا ہے جو 2007ء میں بہاولپور میں فوت ہوئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے چند سال قبل ہی بہاولپور منتقل ہوئے تھے۔ انتساب کے بعد دو صفحات پر مصنف کے والد ہیں اور ان کے مصنف کے بارے میں قاری کو کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ مثلاً

پیدائش دہلی یکم مارچ 1962ء، تعلیم ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)، ایم ایس (برطانیہ)، ایف سی اے پی (امریکہ)، ایف آر سی پی سی (کینیڈا)، پیشہ طبابت، ذاتی شوق شاعری، ادبی تحقیق و تنقید، مطالعہ اور تصنیف و تالیف، اہلیہ عتیق، ایران، برطانیہ اور امریکہ میں بھی رہے۔ دو بیٹیاں (معصومہ اور رویا)، دو بیٹے (رضا، مرتضیٰ)، تیس کتب کے خالق ہیں جو زیادہ تر مرثیہ نگاروں کے حوالے سے ہیں۔ "سبد سخن" کے صفحہ 7 پر مصنف نے "وجہ تالیف" میں لکھا ہے کہ "عروس سخن" اور "در دربار ان" کی پذیرائی کے بعد مضامین کا یہ تیسرا مجموعہ پیش ہے جو میرے لیے مثل سرمہ جیسا ہے۔ 15 صفحات پر فہرست مشمولات ہے۔ اس کتاب میں کسی کا تحریر کردہ کوئی دیباچہ یا مصنف کا پیش لفظ شامل نہیں ہے اور مضامین کا سلسلہ فہرست مشمولات کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ سبھی مضامین ادبی شخصیات اور ادبی کتب پر لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ نائل ہی پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہ تحقیقی، تنقیدی مضامین ہیں مگر تنقید کے حوالے سے مصنف کا لب و لہجہ عام نقادوں کا سا نہیں ہے بلکہ تنقید میں بھی زیادہ تر توصیفی پہلو ہی نمایاں ہیں۔ کتاب میں شامل زیادہ مضامین مرثیہ نگاری کے تجزیوں پر مشتمل ہیں اور ان میں بھی میر انیس اور مرزا دبیر کے بارے میں زیادہ لکھا گیا ہے۔ ان کے بارے میں جگہ جگہ یہ مضامین ملتے ہیں۔ "مثنوی مرزا دبیر" میں معراج نامہ کا ادبی معیار، مرزا دبیر اور "دبیر نجف" میدان رباعی کا شہسوار مرزا سلامت علی دبیر، میر انیس کی جذبات نگاری، زبان و بیان جھلک دبیر کے کلام کی روشنی میں، تشبیہ کے پیمانوں سے دبیر کی مثنوی "احسن القصص" کی ارزش یابی، "ابواب المصائب" تصنیف مرزا دبیر، "مراثی دبیر" میں استعاراتی نظام کا ہجوم اس فہرست مضامین سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ تحریریں دبیر کے بارے میں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے اپنے مضامین میں مرزا دبیر کے سب پہلو تحقیقی کارناموں خصوصاً رباعیات کو بڑی عرق ریزی سے اجاگر کیا ہے۔ (سب سے زیادہ اردو رباعیات یعنی 1332 مرزا دبیر ہی کی ہیں۔)

"سبد سخن" میں مرثیہ کے مضامین کے بعد سب سے زیادہ مضامین علامہ اقبال کے بارے میں ہیں بلکہ صورت یہ ہے کہ اقبال کے بارے میں مصنف کی یہ تحریریں اگر جمع کی جائیں تو اقبال پر الگ سے ایک کتاب بن سکتی ہے البتہ مصنف چاہیں تو اس کتاب میں

اقبال کے بارے میں اپنے چھپے ہوئے مضامین بھی شامل کر سکتے ہیں۔ ''سدِ سخن'' میں اقبال کے بارے میں مضامین یہ ہیں۔

''علامہ اقبال اور ملک الشعراء بہار'' باہم مہربان، مصاحب اور معترف''، ''علامہ اقبال کا سچا خادم علی بخش'' (علی بخش بچپن میں علامہ اقبال کا ملازم ہوا اور چالیس سال تک علامہ کی رحلت تک ان کا خدمت گزار رہا۔)، ''علامہ اقبال کی آخری رات'' (اس میں حضرت کے ساتھ علامہ کی آخری رات میں کئی خواہش پوری ہو جاتی جو کہ ایک نعت خواں نے ایک پنجابی نعت سننے کے بارے میں تھی۔ یہ نعت علامہ کو بے حد پسند تھی۔)، ''علامہ اقبال کی تاریخ گوئی'' (اس میں وہ مرثیوں منظوم تاریخیں درج ہیں جو علامہ کے مختلف مواقع پر کہی تھیں)، ''اقبال کا فلسفہ تقدیر''، ''جاوید نامہ اقبال کا انسان سازی کا زندہ جاوید شاہکار''، ''علامہ اقبال اور علی بخش''، ''علامہ اقبال کا مقبرہ'' (از: صدر دروازہ شاہی مسجد، لاہور)۔

''سدِ سخن'' میں ان تمام مضامین میں علامہ اقبال کے فنی اور فکری محاسن کا خوبی احاطہ کیا گیا ہے۔ اب تک ان مضامین مرثیوں کے مضامین کی طرح کسی ایک جلد میں جمع نہیں ہیں بلکہ مختلف رسائل میں ان کے درمیان جگہ جگہ دیگر مضامین بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔

مرثیہ نگاری اور علامہ اقبال کے بارے میں مضامین کے علاوہ ''سدِ سخن'' میں شامل دیگر مضامین یہ ہیں ''غالب کی غیر مطبوعہ غزلوں کا تحقیقی تجزیہ''، ''اردو کا پہلا نعت گو محمد'' (میر مہدی مجروح)، ''ایک ہندو شاعر'' (باپ کو مارنے کی فلسفیانہ حقیقت'' (یہ مرثیہ نگار تھیں)، ''شیدائی کا مرثیہ بے شنیہ'' (واب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ایک مختصر جائزہ)، ''نظم اردو کا خالق مصحفی'' (اس نظم میں زبان و بیان کی مختلف منظوم تاریخیں ہیں)، ''مرثیہ کیا ہے اور اس کو کیسا ہونا چاہیے''، ''مرثیہ کا تعارف، فنی بدیوں کا ''فنی کا فنی فن''، ''غزل کی تیکنیکی پہچان''، ''حدیث دل'' (مختلف مجموعہ ''ارمغان عارف'' کا تجزیہ)، ''جدید مرثیہ میں حب الوطنی کا مختلف پہلو''، ''رہتا خوش یوں مرے والد کلیم تھے'' (باقر زیدی کے مرثیوں کے مجموعہ ''فرات فن'' کا تجزیہ)، ''حمد اور نعت کی غیر شاعری'' ان مضامین میں بھی

تین مضامین مرثیہ کے حوالے سے ہیں اس طرح کتاب کا یہی رنگ دیگر رنگوں پر حاوی نظر آتا ہے تاہم کسی بھی طرح کے مضامین ہوں مصنف نے جہاں جہاں قوامد زبان، شاعری کی صنعتوں اور دیگر فنی پہلوؤں کی روشنی میں بھی اہل ادب اور ان کی تخلیقات کا تجزیہ کیا ہے عمومی طور پر توصیفی اور تحسینی انداز کا ہے۔ ہمیں کہیں تنقیدی پہلو بھی ہیں مثلاً صفحہ 116 پر وہ لکھتے ہیں "ردیف کا استعمال شاعری پختگی اور کلام کی عظمت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگرچہ ہمارے اساتذہ شعراء نے بھی ردیف کی بابت کہیں انکاریاں کی ہیں، جہاں ردیف سے ہونے نہ ہونے سے مصرعوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر "ردیف "نہیں ہے" میں سے "ہے" کال بھی دیا جائے تو چنداں فرق نہیں ہوتا" اس کے بعد مصنف نے فانی بدایونی کی تعریفیں کی ہیں کہ ان کے ہاں ایسے عیوب نہ تھے حالاں کہ آگے جا کر انھوں نے فانی کے جو اشعار دیے ہیں ان میں بھی مذکورہ عیب موجود ہے مثلاً

دیوانہ تمہارا کوئی دیوانہ نہیں ہے یہ ان کی گلی ہے ترا غم خانہ نہیں

بلکہ فانی کے اس مطلع میں تو تنافر بالخرج کا عیب بھی موجود ہے۔ اور یہی عیوب مصنف کے دیگر ممدوحین شان الحق حقی اور میر انیس کے ہاں بھی ہیں اور ان شعراء کے یہ عیب دار اشعار بھی مصنف کی اسی کتاب میں موجود ہیں۔ بہرحال اصل بات یہی ہے کہ ایسے فنی عیوب سے کوئی شاعر بچ نہیں سکا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے عیوب کا عادی ہے کہ غیر ارادی طور پر یہ غلطی سرزد ہوئی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اس کا یہ عیب دار کلام نوعمری کے دور کا ہے کہ پختگی کے دور کا" جہاں تک ڈاکٹر سید تقی عابدی کی زیر تبصرہ کتاب "سبد سخن" کے بارے میں مجموعی تاثر کا تعلق ہے تو میں نے یہ پایا ہے کہ یہ کتاب بہت سے ادبی مباحث کا احاطہ کرتی ہے اور ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے بہت سی وسعتیں اور ابعاد سامنے لاتی ہے۔ بعض مقامات پر وہ اپنے کسی ممدوح شاعر کی حمایت میں قدرے جذباتیت کا شکار بھی نظر آتے مگر ان کی خالب تحریریں بہت متوازن اور متواضع ہیں جس کے لیے ان کی ازمی طور پر تحسین ہونی چاہیے اور اسی بنا پر بھی انھیں خاکسار کی جانب سے بھی ہدیہ تبریک۔

ح ..... اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

علامہ سید عقیل الغروی
انگلینڈ

رباعیاتِ دبیر: از ڈاکٹر سید تقی عابدی

یارب جبروتی تجھے زیبندہ ہے
ہر تن ترے سجدے میں سر افگندہ ہے
توحید کا کلمہ یہی پڑھتا ہے دبیر
جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے

اردو میں ہائیکو یا ثلاثی کی دریافت سے پہلے مختصر ترین شعری اظہار کا مستحکم ترین سانچہ رباعی ہی تھی۔ اس کی علمی اور فنی نزاکتوں سے پیش نظر سے مشکل ترین اصناف شاعری میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مخصوص اوزان اور اس کی معین ہیئت میں ذرا سی تبدیلی یا تجاوز کا نتیجہ پابندی سے انحراف کا ظرف محدود ہے لیکن اس کی فضیلت اتنی ہے کہ یہی جب ہے کہ اس میں بیشتر صنعتیں سمو دی گئی ہیں۔

ہمارے بعض محققین اس مسئلے میں خاصے اشتباہ میں مبتلا رہے ہیں کہ یہ عربی کی ایجاد ہے یا فارسی کا اختراع۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی اپنی رائے میں بالکل واضح ہیں۔ مولانا امداد امام اثر نے بھی "کاشف الحقائق" میں یہی لکھا ہے کہ "یہ صنف شاعری اہل عرب کی ایجاد ہے جیسا کہ کتب تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔" تاہم اس قضیہ میں حق محمود شیرانی ہی کے ساتھ ہے اور ایجاد رباعی کے بارے میں تمام بحثوں کا بہترین خاتمہ اور نتیجہ تحقیق ہمیں شیرانی کی اس مختصر عبارت میں مل جاتا ہے

"رباعی کی شکل ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ دوارِ قدیم یافتہ شکل ہے قدیم چار مصرعی بحور ہزج مربع خرم و اخرب میں کہی جاتی تھی۔ ان بحروں میں صدر و ابتدا میں خرب مکفوف و اخرب مکفوف کا اختلاف جائز سمجھا

جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعے میں کارفرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرع کے شروع میں مفاعیل یا مفاعلین آجاتا ہے۔ تر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے۔ جب عربی عروض فارسی میں اختیار کی گئی تو ضرورت ہے کہ ابتدا میں اشعار ہزج کے مربع لکھے جاتے ہوں۔ چنانچہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔ چوں کہ اس میں چار شعر ادا کرتے تھے اس بنا پر اس کا نام چار بیتی رکھا گیا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد جب اصول ثمنات کی دریافت نے اہل ایران کو زیادہ خوش آئند اور شائستہ اوزان سے آشنا کر دیا تو مربعات ترک کر دیے گئے اور ثمنات کو اختیار کر لیا گیا۔ اور ترانہ جو چار بیت مربع میں شامل تھا دو بیت ثمن کے قالب میں ڈھل گیا اور وہ بیتی کہلایا۔" (''مقالات محمود شیرانی'' ج ۲، ص 720)

رباعی کی صنف و ہیئت سے متعلق تاریخی اور عروضی نقطہ نظر سے اس سے زیادہ بحث و بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

تاریخ شعر و ادب میں رباعیات کے تخلیقی سرمایہ کی پہچان بین میں بھی کوتاہیاں بہت رہی ہیں۔ جس کی بنا پر ایک طرف بعض ناموں و نسبت رباعی کو وقوع شہرت حاصل ہوگئی تو دوسری طرف بعض مستشرقین تحسین و تقدیر رباعی کو یہ رباعیات کے تنقیدی جائزوں میں صحیح قدر دانی نہ ہو سکی۔ جس کی سب سے حیرت انگیز مثال سلطان رباب تصوف شیخ ابو سعید ابوالخیر سے منسوب رباعیات کا قضیہ ہے جس کا حل بفضل پروفیسر عندلیب شادانی کی ژرف کار تحقیق ہے یہ۔

اردو میں صنف رباعی کے سرمایہ سے متعلق عموماً جو رائے دی جاتی رہی ہے اس کا سب سے بڑا سبب رباعیات کے ذخیرے کی باقاعدہ اشاعت کا نہ ہو پانا ہے۔ میر سے اس مفروضہ کے کئی پہلو برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے اس اندراج سے سامنے آجائیں گے۔

''یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے رباعیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں، ایسے اور اتنے مجموعے اردو میں نظر نہیں آتے۔ لیکن کہنے والے یہ بھول جاتا

ہے کہ فارسی اور اردو کی عروض میں کتنا فرق ہے پھر بھی اردو نظم کا ذخیرہ
رباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔ میر انیس نے بہت رباعیاں کہیں اور
یہی نہیں کہ رباعی کہنے کا حق ادا کیا۔ ان کے ہاں یہ چوتھا مصرع رباعی
کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔"

اردو میں رباعیوں کے بانڈ پانے پر مجموعوں کی کمی سے متعلق سوال کا ایک جواب تو خود
یگانہ نے دیا ہے لیکن یہ مکمل جواب نہیں ہے۔ رباعیوں کے اوزان کی عدم اشاعت بھی اس
سوال کے پیدا ہونے کا ایک بڑا سبب ہے۔ خود اسی اقتباس میں یگانہ نے جن صاحب انیس کا نام
لیا ہے ان کی مرتبہ کلیات کے ساتھ دبیر کی رباعیوں کا پورا ذخیرہ نہیں تھا۔ رباعی پر
بحث و گفتگو کرنے والے بیشتر اصحاب قول بقلم کے ساتھ یہی صورت حال رکھتے ہیں۔

دبیر کی رباعیوں کا سرمایہ بڑا ہے اور بہت قیمتی ہے جس کی نظر اس پر پڑی ہے اس
نے اس کی قدر دانی ضرور کی ہے۔ اس کی ایک مثال رباعیوں پر تحقیقی تنقیدی اور تخلیقی نوعیت
کی کاوشوں سے نہایت قابل قدر کارنامے انجام دینے والے صاحب قلم پروفیسر وحید اختر
بلگرامی کی یہ تحریر ہے

"رباعی کا اپنا پارینہ و آہنگ سب سے پہلے مرزا دبیر اور میر انیس کے
ہاتھوں میں آیا۔ مرزا دبیر نے سب سے پہلے رباعی کو مذہبی اور اخلاقی مضامین
کی مناسبت سے وسعت دی۔ میر انیس نے مرزا دبیر کی بنائی زمین
کو اور وسیع کیا۔" (مقدمہ رباعی ص 46-56)

پروفیسر وحید اختر نے جو بات کہی ہے ان کے پاس اس کے دلائل ضرور
ہوں گے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ مرزا دبیر نے صنف رباعی کی طرف میر انیس سے پہلے
توجہ دی۔ یہ بات ان کی رباعیوں کی ہیت و کیفیت دونوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ناصر
علی عابدی صاحب نے اپنے پیش نظر تحقیقی کارنامے میں دبیر کی تیرہ سو رباعیوں
کی یافت کا ذکر کیا ہے کہ وہ اب اپنے اس کارنامے پر نظر ثانی کریں گے اور ان کا مرتبہ
دیوان شائع کریں گے۔ ان تعداد میں اور اضافہ کا۔ میر انیس کی رباعیوں پر تحقیق کا کام
ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ جناب علی جواد زیدی صاحب نے اپنی مرتبہ

کئی برس ہو گئے اور ابھی تک اس پر کوئی استدراک سامنے نہیں آیا۔ ان نے شائع شدہ مجموعہ "رباعیات انیس" میں رباعیوں کی تعداد چھ سو کے آس پاس ٹھہرتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے دبیر کی رباعیاں انیس سے زیادہ ہیں بلکہ موضوعات اور مضامین کے لحاظ سے بھی دبیر کو فوقیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کا مرتبہ اس مجموعہ رباعیات دبیر کا مطالعہ خود اس بات کا ثبوت فراہم کرے گا۔

دبیر نے رباعیات سے نہایت محدود معنی چوکھٹے میں خوب زور طبیعت صرف کیا۔ ان کے یہاں زبان کی چستی، مصرعوں کی برجستگی، آہنگ و عروض کا توازن، مضامین کا تنوع اور طرح طرح کا تفنن قابل دید ہے۔

"دفتر ماتم" کی بیسویں جلد میں (ص 32 تا 48) ایک ہی قافیہ و ردیف میں ان کی 29 رباعیاں ملتی ہیں، جس میں سے ایک رباعی یہ ہے

انجم نے شرف نور قمر سے پایا
اور ماہ نے خورشید سحر سے پایا
اس قافیہ و ردیف کا فیض دبیر
جس نے پایا ہمارے گھر سے پایا

اور اسی ردیف و قافیہ میں دبیر کی ایک نعتیہ رباعی بھی ملاحظہ فرمائیے

آدم نے شرف خیر بشر سے پایا
رشتہ ایماں کا اس گہر سے پایا
دو میم محمدؐ سے جہاں روشن ہے
مضموں یہ دل شمس و قمر سے پایا

ایسی اور بھی مثالیں ہیں جن میں ایک ہی ردیف و قافیہ میں دبیر نے بیسیوں رباعیاں کہہ ڈالی ہیں۔ اور یہ دبیر جیسے قادر الکلام کے لیے کوئی بہت بڑی بات نہیں۔

مرزا دبیر یا میر انیس کے کلام پر بعض حضرات موضوعات کی محدودیت اور یکسانیت کا اعتراض کرتے ہیں، ممکن ہے وہ رباعیات دبیر کے بارے میں اسی طرح کا خیال ظاہر کریں۔

یہ حضرات دراصل موضوع اور مضمون کے فرق کو بھلا دیتے ہیں۔ شعر و ادب کے موضوعات تو محدود ہی ہیں۔ یہ مضمون ہے جس میں تنوع و قلمونی ہے۔ اور یہ مضمون ہے جس کے لیے ہر دور کے شعرا اور ادیبوں نے کہا تھا

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

آپ کوئی بھی غزل کا دیوان پڑھ جائیں، موضوعات کے لحاظ سے آپ کو یکسانیت ملے گی۔ ادب و شعر کے موضوعات ہی کیا ہیں؟ یہی محبت، غم، خوشی، وصال، جدائی، جفا، وفا، دوا، مرض، شفا، بھوک، فقر، پیاس، وطن، غربت، سفر، قیام، تغیر، ثبات، زمین، زمان، آسمان، شجر، حجر وغیرہ یہ سب موضوعات ہیں۔ ایسے عنوانات کا شمار کرتے جایئے تو یہ بہت محدود ہی ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک عنوان پر سینکڑوں ہزاروں شعرا مختلف اسالیب اظہار کے فن پارے خلق کر جائیں گے۔ یہ سب شعر گوئی، سخن پردازی، یا "فن افسانہ نگاری" مضمون آفرینی یا نکتہ آفرینی ہی کی بدولت ہے اور یہ وہ ملکہ ہے جس میں ہر کہ متبدل شدید نئی اردو کی نئی نسل شعر کہہ رہی ہے۔

بے شک ہر شاعر و ادیب کے محدود موضوعات میں سے بھی اپنے لیے چند مخصوص مضامین کا انتخاب کر لیتا ہے اور اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے موضوعات کو محدود کر لیا۔ لیکن یہ کہنے سے متعلق رہنے والی بات یہ ہے کہ جس قدر انھوں نے اپنے موضوعات کو محدود کیا اسی قدر مضامین کو وسعت دی۔ اور تنوع سے آشنا کیا۔ ان کا یہ عمل کسی تنگی کا نہیں ہے۔

؎ مخلوق میں خالق مضامین ہم ہیں

اور ان کا یہ کہنا بالکل مبنی بر حقیقت ہے کہ

؎ جب حرف شناس ہوں تو ہفت خواں ہیں

اور یہ بھی حقیقت ہے۔ اردو زبان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا تو نہیں اردو کا سب سے بڑا المیہ شاعر تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن بھی اس میدان میں ان کے حریف ثابت نہ ہو سکیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مجموعہ میں رباعیوں کی موضوع وار درجہ بندی کی زحمت اٹھائی ہے۔ انھوں نے مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ، سماجی، اقتصادی اور ذاتی رباعیوں کے عنوانات قائم کیے۔ انھوں نے بہر حال "موضوعات" کی نشاندہی اور فہرست سازی کی ہے۔ مضامین کی نشاندہی اشعار سے علیحدہ کی بھی نہیں جا سکتی۔ اور ایسی کی جا سکتی ہے تو شعر کی نثر بنا دینے اور اس کی تشریح لکھنے کی صورت میں کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے رباعیات کو انتہائی عرق ریزی اور جاں فشانی سے تحقیقی نقطۂ نظر سے جمع کیا ہے۔ وہ ان رباعیات کی شرح لکھنے سے متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ ہاں ان کی اس محنت کی ستائش بھی ضروری ہے۔ انھوں نے جدید نسل کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے رباعی کے نیچے مفردات یا مشکل تراکیب کے معانی بھی لکھ دیے ہیں۔ اور ان رباعیوں میں پائی جانے والی صنعتوں کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ جس سے نہ صرف اردو کے عام قاری کے لیے رباعیوں کو سمجھ کر پڑھنے کا امکان روشن ہو گیا ہے بلکہ اردو ادبیات کے باقاعدہ طالب علموں اور معلمین کے لیے بھی استفادے کی بڑی سبیل پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بجائے خود خاصہ قابل قدر کام ہے بلکہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

بات موضوع اور مضمون کی ہو رہی تھی۔ معلوم ہے کہ انیس کا بنیادی موضوع حضرت سید الشہداء امام حسین اور ان کا معجزہ کربلا ہے۔ انیس کی رباعیوں میں سب سے زیادہ تعداد اسی موضوع پر کہی گئی رباعیوں کی ہے۔ یعنی ان کے عنوانات امام حسین، کربلا، عباس، وفا، حزن یا شہادت وغیرہ وہی رہتے ہیں۔ لیکن مضمون یقیناً بدلتا رہتا ہے۔ اور مضمون کا حال تو یہ ہے کہ کبھی صرف کسی ایک لفظ کی تبدیلی یا مصرع میں لفظ کی نشست بدل دینے سے مضمون بدل جاتا ہے۔ جب تک یہ نکات نظر میں نہ ہوں، انیس کی رباعیوں میں جو مضامین کا تنوع ہے اس میں بہت سے مقامات پر قاری محظوظ نہیں ہو سکتا۔

مضمون شعر کے لحاظ سے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ یہ لازمی نہیں کہ مضمون داخلی اور حقیقی جذبات سے عاری ہو، جیسا کہ اس شعر سے توہم پیدا ہوتا ہے

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہے
کچھ ہو نہیں گئی غزل عاشقانہ فرض

بلند مضمون داخلی اور حقیقی کیفیات سے پیدا ہونے والے اظہار کا لازمی عنصر ہوتا ہے۔ "بالیدن مضمون" ہی دراصل شاعری ہے۔ غالب کا بڑا حسین اور نہایت معنی خیز شعر ہے

اسد اٹھنِ قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمون عالی ہے

دبیر کی شہر رباعیوں جہاں مضمون آفرینی اور نکتہ پردازی کی بہترین مثالیں ہیں وہیں ان کی ذاتی سیرت اور ان کے دل کی اچھائی اور ان کی جذباتی کیفیت کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ وہ صرف ضرورت شاعری یا تقاضہ مجلس کے تحت نہیں کہی گئی ہیں۔ ایسی رباعیوں میں جو فنی اور فنی روایتیں یا صرف تفنن کی خاطر سے ہی کی ہوں۔

ہاں دبیر نے سارے کلام کی طرح ان رباعیوں میں بھی جو طرح طرح کا تفنن پایا جاتا ہے۔ اس میں بعض باتیں ایسی ضرور ہیں جن کی تحسین و ستائش Appreciation کی توقع اس دور سے عام قاری سے نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جس علمی، فنی اور تاریخی پس منظر و ماحول سے دبیر کا تعلق تھا اس میں ان باتوں کی فنی اہمیت بھی تھی۔ اور اس وقت یہ عمومی اور عوامی دلچسپی کی باتیں بھی تھیں۔ مثلاً جس طرح سے زیادہ سے زیادہ لفظی اور معنوی رعایتوں سے شاعر کلام پیدا کرتا ہے کی طرح اعداد کی رعایتوں سے بھی مرثیہ کی نکتہ آفرینیاں اور مضمون آفرینیاں کی جاتی تھیں۔ اس کی صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ استہزائی و مزاحیہ غزل سے متعلق میں ان عجائبی رعایت سے کام لیتے ہیں

ہفتہ وہ فریق حسد کے عدد سے ہیں
پنجے یہ طریق سرباحسد سے ہیں
دو حق سے دین خلق سے ایک اور مثل دیجئے
ہوں حرفِ فن میں وہ یہ نقطہ رحمت سے سازگار
ملزم اعداد میں رحمت ہیں مقتبس رحمت سے

ان دبیر کی یہ دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے۔ ظاہر ہے کہ دبیر کا محور فکر و فن جناب سید الشہداء امام حسین کی ذات مبارک اور واقعہ کربلا ہے۔ اس لیے ان کے تفنن میں بھی دبیر کی نکتہ سنجیاں زیادہ تر اسی محور پر رہتی ہیں:

"ح" نام ہے حق کی حمایت کے لیے
اور سین ہے سائل سے سخاوت کے لیے
ہیں نام حسین میں بھی یہ خوب حروف
"ی" "ن" ہیں تاریخ شہادت کے لیے

•••

دو میم جو اک لفظِ محروم میں ہیں
پیوند انھیں حرفوں کے ماتم میں ہیں
ہر میم کے چالیس عدد سے یہ کھلا
ماتم کے چہل روز دو عالم میں ہیں
("دفترِ ماتم"، ج 20، ص 70)

دبیر کی رباعیوں کا کوئی انتخاب پیش کرنا اور اس پر گفتگو کرنا اس وقت میرا مقصد نہیں ہے۔ اس تقریب کلام میں خوشی بہر تقریب ہے یعنی کہ مقدمہ ہے دبیر کی رباعیت پر میرا حاصل تنقیدی بحث و بیان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے علیحدہ مستقل کتاب درکار ہے۔ اتنی باتیں صرف ہر قبیل تذکرہ یا بطور تشبیب لکھ دیں۔ اس وقت تو میں اپنے جذبات دعائی تحریر پر مامور تھا۔ رب کریم میری دعا کو بحق حضرت سید الشہداء علیہ اسلام شرف قبول سے نوازے کہ بزرگ مرتبہ دانش مند ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کے حسن توفیق اور ان کے حسن اقبال و دولت علم میں لازوال برکت ہو۔ وہ قابل مبارک باد ہیں، یہ حسن توفیق ان کے شامل حال ہے وہ ادب و دین و دانش کی خدمت میں مشغول ہیں، صحیح ادب کی خدمت بھی خدمت دین ہے۔ رہبر معصوم کا ارشاد ہے "اَلدِّین کُلّه ادب" دین کل کا کل ادب ہے، دین ہی کل ادب ہے۔ میر انیس یا مرزا دبیر بھی وہ شعرائے ذی وقار ہیں جن کے کلام کی ادبی ارزش بھی مسلم ہے اور دینی قدر و قیمت بھی روشن ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اپنی تعلیم اور پیشے کے لحاظ سے میدان طب و جراحت کے مرد ہیں اور اپنے اقران و امثال میں فرد ہیں۔ ان کا شعبہ تخصص آزمایشات طبی کا شعبہ ہے۔ علم ایک

محیط تخلیقت ہے، نہ پڑھائے تنقید ہے نہ تحقیق۔ جب ذہن علمی تحقیق و تنقید کی لذت سے آشنا ہو جائے تو وہ جس بھی شعبہ حیات کی طرف متوجہ ہوگا اپنے مخصوص انداز نظر سے کام لے کر اس شعبے کو آزادانہ طور پر بروئے کار لائے گا۔ یہ جذبہ ہر ایک میں نہیں پایا جاتا۔ یہ ہر حال ذہن ارادہ و قوی کا تابع فرمان ہے، جس امر کی طرف ذہن راغب نہ ہوگا، ذہن بھی طالب نہ ہوگا۔ بارے الطاف حسین حالی کی آزمائشات بھی نے ساتھ ساتھ آزمائشات ادبی کی طرف بھی راغب ہوئے اور ادبی تحقیق و تنقید کا انبار لگا ڈالا۔ ان کے محبوب شاعر انیس نے کہا

لگا رہا ہوں مضامین تو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ان کا یہ حال ہے کہ کسی بھی نادر ادبی ذخیرے کی خبر ہوئی اور وہ خوشہ چینی میں مشغول ہوئے۔ بزرگان سلف کے تحقیقی کارناموں کی تحقیقی بازیافت کا کام الطاف حسین حالی نے انجام دیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اب ان کاموں کے خوشہ چینی سے بحیثیت ادبی قدر آپ کو آشنا کیا جائے گا۔

میں نے کہا ہے کہ حالی نے جس طرح عربی ادب کی تاریخ میں "ادب المفصحر" کے عنوان سے اور فارسی میں مختصر عربی ادبیات، شعر العجم اور اردو میں مقدمہ شعر و شاعری کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پیش کیے ہیں اسی طرح انگریزی ادب کی صاحب ذوق و ذوق نے اردو ادب المفصحر پیش کیا ہے۔ یہ تینوں جلدیں ملی ہیں جن کا تذکرہ الطاف حسین حالی صاحب نے اپنی دیگر تصانیف میں کیا ہے۔ ان میں جتنا تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور شاعرانہ کام ہوا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ حالی کی تنقید روایتی نہ تھی۔

حالی نے اپنی تصانیف میں اقتباسات اور خصوصیات پر بڑی خوبصورت تنقید بھی کی ہے۔ اس لیے فی الحال بطور تبرک یہاں پر ان کی چند باتیں نمونتاً پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

پروانے کو چاہیے شمع کو لو تیری ہے
عالم میں ہر ایک کو تگ و دو تیری ہے

مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

•••

آباد ہے سرکار حسینؑ ابن علیؑ
بیٹھے ہیں عزادار حسینؑ ابن علیؑ
[illegible]
دربار ہے دربار حسینؑ ابن علیؑ

•••

پروفیسر احمد علی خان
سکندرآباد

رباعیاتِ دبیر: ایک جائزہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی مدت دراز سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ اچھے شاعر اور نثر نگار بھی ہیں۔ اس دوران انھوں نے تقریباً تین درجن کتابیں تصنیف کیں۔ گزشتہ پندرہ بیس سال سے موصوف تحقیق اور تنقید کی ادب میں جو خدمات و امتیازات سے جو ہم دیکھ رہے ہیں ان کی مثال نظیر کہیں اور اردو میں نہیں مل سکتی ہے۔ اس مختصر عرصہ میں درج ذیل شاہکار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ہیں "تجزیہ یا نگار خانہ"، "مجتہد نظم مرثیہ"، "سلک مرثیہ"، "تاج مرثیہ"، "نواب امجد"، "تحفہ فارسی مرثیہ"، "مثنویات مرثیہ"، "کائنات مرثیہ"، "روپ نگار مرثیہ"، "تحقیق مثنوی"، "نواب دیوان محبت"، "مثنوی محبت"، "رباعیات مرثیہ"، "سید سخن"، "کلیات نواب فارسی"، "رباعیات انیس"، "فیض نجفی"، "فیض شاہی"، "کلیات سعید شہیدی"، "مجد نجفی" وغیرہ۔

زیرِ نظر کتاب سلسلہ کلام دبیر کی ساتویں جلد ہے جو ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق، ترتیب اور تدوین کے ساتھ 2018ء میں شائع ہوئی۔ خدا جانے ڈاکٹر صاحب نے مرزا دبیر کی کتنی تعداد رباعیات تلاش محنت و مشقت سے جمع کیں اور پھر ان کو مرتب کرکے ایک ضخیم کتاب 2018ء میں شائع کی۔ کتاب 613 صفحوں میں مضبوط جلد کے ساتھ عمدہ اور چکنے کاغذ پر آراستہ ہوئی ہے۔ اس میں 1323 رباعیات مختلف عنوانوں میں ہیں۔ ابتدا میں پیش مضامین کی فہرست (صفحہ 3) ہے۔ پھر اسی صفحے سے 33 تک تمام رباعیوں کے پہلے مصرعے درج ہیں۔ ہر رباعی کے ساتھ عنوان بھی ہے۔ مثلاً "مجتہد نظم مرثیہ"، "نظم مرثیہ" وغیرہ۔ رباعیات صفحہ 35 میں معصوم کے مطابق مختلف عنوانات "رخشِ عمر" کے تحت رقم ہیں۔ اس کے بعد "شباب"۔ پھر (صفحہ 38-47)

علامہ سید عقیل الغروی کا پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا طویل مقدمہ (48-86) ہے۔ اس میں رباعی کی تاریخ، اوزان اور فارسی رباعی گو کا مختصر تذکرہ ہے۔ صفحہ 92 سے 121 تک "مرزا دبیر کا زندگی نامہ"۔

رباعی کہنا تمام اصناف میں مشکل ہے۔ یہ اس پختہ مشق شاعر کا کام ہے جس کو وارد زبان میں ید طولیٰ حاصل ہو۔ شاعر اعظم جوش ملیح آبادی مجموعہ رباعیات "قطرہ و قلزم" میں رقم طراز ہیں "رباعی ایک بہت بڑی بلا اور نہایت جاں لیوا صنف کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک شاعر کو بے پناہ مشاقی اور نہایت دیدہ ریزی کی بدولت دریا کو کوزے میں بند کرنے کا گر نہیں آتا، اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔ قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کر کے چار مصروں میں رنج مسکون کے تمام تجربات، مشاہدات، تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا ایک نشے سے قطرے میں قلزم کو مقید کرنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے ؎

تا صد ہزار خار نہ روید از زمیں
از گل بنے کہ بہ گلستاں نہ روید از زمیں

ڈاکٹر عابدی صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ فرماتے ہیں

"رباعی ایک کٹر صنف شاعری ہے۔ چناں چہ اس ہزار برس کے عرصہ میں تین چار ہی فارسی رباعی کے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہیں جن میں عمر خیام، ابوسعید ابوالخیر، عطار اور سنائی کے نام سرفہرست ہیں۔ اگرچہ مولانا روم جو صرف اپنی مثنوی کے باعث شہرت رکھتے ہیں۔ تقریباً اٹھارہ سو رباعیات کے خالق ہیں۔" کلیات سعدی شیرازی" میں ایک سو ستر سے زیادہ رباعیات نظر آتی ہیں۔ حافظ شیرازی، جامی وغیرہ کے دواوین میں رباعیات ملتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سحابی استرآبادی جو صوفیہ اور کے ممتاز شاعر تھے۔ انھوں نے ستر ہزار سے زیادہ رباعیات کہیں لیکن ان کی رباعیوں کا مجموعہ الگ سے شائع نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی رباعیات

ضائع ہو گئیں۔ اور اب کئی رباعیات دوسری کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فارسی کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے کم و زیادہ رباعیات کہیں اور اسی کا تتبع کرتے ہوئے برصغیر میں مسعود سعد سلمان، لاہوری، امیر خسرو دہلوی، بوعلی قلندر اور سعد نے رباعیات کے گلشن کو سرسبز رکھا۔ فارسی رباعی کا شہرہ آفاق شاعر عمر خیام ہے جس کی رباعیوں کے ترجمے تقریباً تمام ہی بین الاقوامی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور انگلینڈ کے شاعر فیٹز جیرالڈ نے انگریزی ترجمے سے ان رباعیات کو ناقابل یقین شہرت بخشی۔"

اب غور کرنے کا محل ہے کہ مرزا دبیر (۱۲۱۹ھ-۱۲۹۲ھ) بارہ سال کی عمر میں تخمیہ (۱۲۳۱-۱۲۳۲ھ) کہنے لگے ہوں گے۔ میر ضاحک کے پوتے سے یہ بعید ہے کہ انھوں نے پرانے مطبوعہ اور قلمی نسخے بھی نہ دیکھے ہوں جو اس زمانے میں دستیاب تھے۔ مثال میں یہ مرثیہ لیجیے جو اس زمانے میں دستیاب تھا۔ اس کا مطلع ہے

"دشت جنگاہ میں جب آمد نوشاہ ہوئی"

۱۷ بند۔ منقول عنہ ۲۵ محرم ۱۲۴۰ھ

اس طرح کے مرثیوں میں متعدد رباعیاں ہیں جو میری نظر سے گزری ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مرثیہ گو حضرات ان رباعیوں کو مرثیہ میں شامل کر لیتے تھے۔ اس کا تذکرہ "فسانہ عجائب" (تصنیف ۱۲۴۵ھ) میں بھی ہے۔

عابدی صاحب نے اپنے مقدمہ میں فارسی شعراء کے بعد اردو شعراء کی جن رباعیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے زیادہ رباعیاں شاہ نصیر دہلوی (م-۱۲۶۱ھ) کی کتاب "مکاشف الاسرار" میں موجود ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ رضا لائبریری رامپور کے مشہور کتب خانے میں اس کا مخطوطہ بخط مصنف موجود ہے اس کی مختلف تختیوں پر نوٹ بھی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے ایک ہزار رباعیاں لکھی ہیں۔ ("رباعیات دبیر")

آخر میں دبیر کا یہ مجموعہ رباعیات مرتب کرنے پر عابدی نے ایک عظیم تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے جس عرق ریزی، محنت، شوق اور لگن کا ثبوت دیا ہے اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
روزنامہ "سیاست" حیدرآباد

رباعیاتِ دبیر

علمی و ادبی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مثال اگر کسی سے دی جا سکتی ہے تو وہ صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی ہی ہیں۔ برصغیر سے دور، بہت دور، اردو کی بستیوں میں شعر و ادب کے جو چند چراغ روشن ہیں، ان میں ڈاکٹر سید تقی عابدی ایک اہم اور امتیازی نام ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر جن پر بہت کم لکھا گیا ہے توجہ دی اور غیر معمولی تحقیق کے بعد تدوین و تالیف کر کے کئی کتابیں منظر عام پر لائیں جو شاید بہت کم لوگوں کے لئے ممکن ہوتا۔ شعر و ادب کے تعلق سے ان کے عزم و ہمت، جذبہ و شوق، لگن اور خلوص کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے تحقیق کے دشوار گزار اور اصل اور صبر طلب مقامات کو بھی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے کر لیا۔ سید تقی عابدی کی تحقیقی و تدوین و تالیف کی فہرست نہایت طویل ہے۔ صرف چند کے نام یہ ہیں۔ "انشاء اللہ خاں انشاء"، "اظہار حق"، "مجتہد نظم مرزا دبیر"، "سبک سلام دبیر"، "تجزیہ یا نکار انیس"، "مصحف فارسی دبیر"، "مثنویات دبیر"، "کائنات عجم"، "دردریائے عجم"، "تاثیر ماتم"، "تعشق لکھنوی" اور "چوں مرگ آید" وغیرہ۔ اور اب انھوں نے کلام دبیر کے سلسلے میں "رباعیات دبیر" پیش کی ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں دبیر کی اور رباعیات کا بھی پتہ چلے لیکن "رباعیات دبیر" کا یہ مجموعہ اپنی مثال آپ ہے۔

دبیر کے پہلے سوانح نگار صفدر علی ہیں۔ انھوں نے سوانح "شمس الضحیٰ" میں اور مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں رباعیات کی تعداد نہیں بتائی "حیات دبیر" کے مصنف ثابت لکھنوی نے تقریباً سوا دو سو رباعیات شائع کیں۔ خبیر لکھنوی نے بھی 197 لکھیں۔ فرمان لکھنوی نے اپنی تصنیف "اردو رباعی" میں دبیر کی رباعیوں کی تعداد دو سو کے

لک بھک بتائی۔ نفیس فاطمہ نے "دیوان سے چند رباعیات بھی یادگار ہیں" لکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب اندازے رہے۔ البتہ محمد زمان آزردہ نے "دفتر ماتم" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "دفتر ماتم" کی بیسویں جلد میں 1332 رباعیات ہیں۔ سید تقی عابدی نے مرتبہ "رباعیات دبیر" میں 1323 رباعیات ہیں۔

تقی عابدی نے دبیر کی رباعیات پر اظہار خیال کرنے سے قبل اپنے مقدمہ میں "فن رباعی و نقد" اور اردو (بلکہ عربی اور فارسی) میں رباعی گوئی پر نہایت جامعیت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ سید جمیل الغروی کا "پیش لفظ" بھی معلومات افزا ہے۔ صنف رباعی و عروض کی بحثوں سے قطع نظر سید سلیمان ندوی اور عبدالرحمٰن شرر سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے محمود شیرانی کے خیال سے اتفاق کیا ہے کہ "رباعی کی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے۔ قدیم چہار بیتی کی جو بحر ہزج مربع اخرم، اخرب میں کہی جاتی تھی۔ ان ایام میں صدر و ابتدا میں اخرب و مکفوف، خرب و صوفر کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چہار بیتی کے ہر مصرعہ میں کارفرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرع سے شعر میں مقفوں سے مقابلہ میں دوسرے مصرع کے شروع میں مشاکل یا مماثلین آجاتا ہے۔ بحر ہزج عربی میں صرف اس رکن مستعمل ہے جب عربی عروض فارسی اختیار کی تو شتر گربہ ہے۔ ابتدا میں شعرا ہزج سے عرض کئے جاتے ہوں، چنانچہ چہار بیتی بھی عرض میں کہی گئی۔" تقی عابدی نے اپنے مقدمہ میں رباعی کو ایرانیوں کی ایجاد قرار دیا ہے اور اس خصوص میں وہ مستند حوالے دیے ہیں اور بعض روایتوں کا بھی حوالہ دیتے ہوئے پہلی رباعی کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہندی میں پنگل، سنسکرت میں چھند، پشتو میں چاربیتہ اور انگریزی میں (Quatrain) رباعی سے ملتی جلتی چیز ہے۔ سید تقی عابدی نے نہایت عرق ریزی اور تحقیق سے کام لے کر اپنے مقدمہ کو وقیع اور اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اردو میں رباعی سے تعلق سے تو اس مقدمہ کی اہمیت اور فضیلت دوچند ہو جاتی ہے۔ اردو میں رباعی پر یہ ایک جامع تحریر ہے۔ انھوں نے تاجدار سلطنت محمد قلی قطب شاہ کو رباعی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ تسلیم شدہ امر ہے۔ اور پھر محمد قلی، ولی، سودا، میر، حسن، انیس، دبیر کی رباعیات کا تفصیلی جائزہ ہے۔

ذوق، داغ، شاد، جرأت، مومن، منیر شکوہ آبادی، فراق سے لے کر مہار بہ شن پرشاد، شاد کی رباعیوں کی تعداد درج کردی ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ رباعیات شاد عظیم آبادی نے لکھی ہیں "جن کی تعداد 1000 ہے" لیکن تقی عابدی کیفیت کے اعتبار سے دبیر کی رباعیات کو افضل قرار دیتے ہیں۔ ان کے بموجب شاد عظیم آبادی کی رباعیات دبیر کی رباعیات کے سامنے کیفیت میں بہت پست ہیں۔"

اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ دبیر کی رباعیات کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں اوروں نے تو کیا خود دبیر سے کہلانے والوں نے بھی توجہ نہیں کی۔ دبیر کی رباعیات کے تعلق سے سید تقی عابدی لکھتے ہیں "دبیر کی رباعیات میں بیان اور علم فہم تشبیہات، مکمل استعاراتی نظام، کنایات اور مجاز مرسل کی چاشنی نظر آتی ہے۔ علم بدائع کی تقریباً تمام عمدہ معنوی اور لفظی صنعتیں ان کے پاس موجود ہیں۔"

چناں چہ تقی عابدی نے صنعت سیاق الاعداد، صنعت تاریخ گوئی، صنعت اعداد ایہام، صنعت مذہب کلامی اور دیگر صنعتوں کے حوالے سے "رباعیات دبیر" کا جائزہ لیا ہے اور وہ بھی اس رائے سے متفق ہیں کہ اگر دبیر کی رباعیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو انھیں اردو ادب کا سب سے بڑا رباعی گو تسلیم کرنا پڑے گا۔ انیس بھی اس میدان میں ان کے حریف ثابت نہ ہوسکیں گے۔ دبیر کی استادی اور ان کی قدرت کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علامہ عقیل نے بھی اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ دبیر نے رباعی کے نہایت محدود عروضی چوکھٹے میں خوب خوب زور طبیعت صرف کیا۔ ان کے یہاں زبان کی پختگی، مصرعوں کی برجستگی، آہنگ و عروض کا توازن، مضامین کا تنوع اور طرح طرح کا تفنن قابل دید ہے۔

قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے نہ صرف رباعیات دبیر کی تحقیق، تدوین اور تہذیب کی بلکہ انھیں مختلف مضامین جیسے حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، ذاتی، اخلاقی، سماجی، اعتقادی اور رثائی میں تقسیم کرکے مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے ہیں اور جہاں جہاں ان کی تشریح بھی کردی ہے۔ یہاں تک کہ رباعیات کی جدول دیتے ہوئے لکھا ہے "دبیر اردو کا وہ تنہا عظیم شاعر ہے جس نے اپنی رباعیات میں اتنے کثیر مضامین برتے ہیں کہ راقم نے ان مضامین سے جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے ایک شجرہ اور جدول بنایا ہے تاکہ آسانی کے

ساتھ دیبا کے مضامین کی بوقلمونی کا احساس ہو سکے۔"

یہ جدول اسی زاویے سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس مضمون کے تحت رباعیات کی تعداد کتنی ہے۔ رباعیات کے اس مجموعہ کا ایک نادر پہلو یہ بھی ہے کہ سید تقی عابدی نے مرزا دبیر کا زندگی نامہ بھی شامل کر دیا ہے۔ دبیر کے حالات زندگی تفصیل سے مل جاتے ہیں اور ان کی شخصیت اور شاعری پر بیرونی ورسٹیوں میں ان سے جو کام ہوا ہے ان سے بھی دبیر کی زندگی تفصیل سے سامنے آتی ہے۔ تقی عابدی نے مرزا دبیر کا ثبوت دیتے ہوئے دبیر کے حالات زندگی، ان کی شخصیت اور فن سے کئی گوشوں کو منور کر دیا ہے۔ ان کے تخلص کے تعین اور ان کے پہلے قطعہ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ دبیر کا پہلا قطعہ جو انھوں نے میر ضمیر کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوتے وقت کہا تھا یہ ہے

کی کا بندہ بننے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی نمک کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب مزا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

دبیر کی تاریخ و مقام پیدائش، ان کے جدامجد میر ازکی، ان کی شاعرانہ عظمت، ان کی دو شادیوں اور ان کی متعدد مثنوی، دبیر کی شریک حیات جو شاہ اللہ خاں شاہ کی بیٹی تھیں۔ دبیر کا قد، ان کی تصویر، آواز، لباس، بعض عادات و اوقات، آداب محفل، حافظہ اور ان کے اخلاق و کردار کے بارے میں سید تقی عابدی نے دبیر کی سخاوت، روشن ضمیری، مسافر نوازی اور عبادت کے ضمن میں کافی مواد فراہم کر دیا ہے۔ "دبیر شاہ عظیم آبادی کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔ دبیر کی ادائیگی حاجت مندوں کی حاجت روائی اور روزہ عبادت تصور کرتے تھے۔ تقی عابدی نے رحم و مروت، سخاوت، مہمان نوازی، علم و خیرات سے تعلق سے بھی دبیر کے کئی واقعات درج کیے ہیں۔ اسی طرح ان کی مقامات، علالت، وفات، تدفین اور ان کے خصوص میں بھی بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی ذاتی زندگی ان کے پہلے اور آخری مرثیے، اپنے استاد میر ضمیر سے رنجش اور پھر صفائی، ان کے بیٹے کے انتقال اور ان کے طبیعہ تصنیف کے بارے میں بھی روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "حیات دبیر" کے مولف ثابت لکھنوی کے بیان کردہ مرزا دبیر کی ابتدائی حالات کو شامل کتاب کرتے ہوئے انیس پر دبیر کی برتری کا پہلو نکال لیا ہے۔ یہ اوراق خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں۔ انیس اور دبیر ہیں، کس زمانے میں نہیں رہے آج بھی ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مقدمہ میں دبیر کی شاعرانہ عظمت پر مہر لگائی ہے لیکن وہ نہ انیس ہیں اور نہ دبیر ہے۔ انھوں نے از حد معروضیت کے ساتھ دبیر کی رباعی گوئی پر قلم اٹھایا ہے۔ قبل ازیں انھوں نے "تجزیہ یادگار انیس" جیسی فاضلانہ و معنوی طور پر گراں قدر کتاب شائع کی ہے۔ جس سے ہمارے وہ عظیم المرتبت شاعروں کے بارے میں ان کی معروضی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں دبیر کی یہ تین رباعیات

آدم نے شرف خیر بشر سے پایا
رشتہ ایماں کا اس گہر سے پایا
دو میم محمدؐ سے جہاں روشن ہے
مضمون یہ دل شمس و قمر سے پایا

•••

جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے
تکیہ ہے جسے حق پہ تو نگر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا
دل جس کا ہے آئینہ سکندر وہ ہے

•••

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

•••

ڈاکٹر تقی عابدی اور فیض فہمی

ڈاکٹر سید تقی عابدی دنیا کے پانچ ملکوں میں رہتے ہیں، راولپنڈی سینٹ میں وزارت دفاع کی وہ بلڈنگ جسے سیریٹ II (نو) کہا جاتا ہے یا کلاسیفکس، اس عمارت سے تھوڑا فاصلے پر بائیں، راولپنڈی اسٹیٹ بینک کے سامنے ٹال میں ایک پٹرول پمپ ہے جسے پانچ نمبر لگتی ہیں شہر میں اس پمپ کو "پنج نمبری پمپ" کہا جاتا ہے، سوچتا ہوں ڈاکٹر تقی عابدی کے پانچ ملکی قیام کو اس نام سے پکارا جائے۔ "پنج ملکی" "پنج دیسی" یا "پنج سید" ہونے سے انھیں "پنج تنی" ہی رہنے دیا جائے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے لوگ ملکوں اور قوموں سے خاموش نہیں ہوتے ہیں، آپ بھارت کے شہر امروہہ کے سادات میں سے ہیں۔ امام زین العابدین کی اولاد ہونے کے ناتے عابدی کہلاتے ہیں۔ پورا نام سید تقی حسن عابدی، تخلص تقی اور ادبی نام تقی عابدی ہے۔ شاعر ہیں، صحافی، ادیب، محقق، نقاد اور مورخ بھی۔ شائع شدہ کتابوں کی تعداد پچاس سے اوپر ہے انھیں ماہر اقبالیات بھی کہا جاتا ہے، غالبیات، میریات، انیسیات اور ماہر فیضیات بھی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی یکم مارچ 1952ء کو بھارت کے شہر دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید محمد باقر عابدی نظام دکن حیدرآباد کی عدالت عظمیٰ کے جج تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد وہ بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ایم بی بی ایس حیدرآباد سندھ سے، ایم ایس جناح یونیورسٹی سے ایف سی پی ایس کراچی سے اور ایف آر سی پی سکاٹ لینڈ سے حاصل کی، ایران سے شہنشاہ پہلوی کے خلاف تحریک کے دوران ساواک کی دھمکیوں سے بچتے ہوئے بھارت کی دہلی یونیورسٹی میں جز وقتی پڑھاتے رہے اور ایک عرصہ تک وہ سعودی عرب میں بھی رہے یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے ان کی زندگی کا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کو یورپ، امریکہ، بھارت اور پاکستان کے کئی علمی، ادبی سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے ان کے حصے میں آنے والے اعزازات کی فہرست بہت طویل ہے دنیا بھر کے اردو کی سرپرستی کرنے والے اداروں اور تنظیموں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو جو پناہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال یونی ورسٹی میں ڈاکٹر عابدی کی اقبال شناسی کے عنوان سے ایم اے کا مقالہ لکھا گیا، کراچی یونی ورسٹی میں بھی ان پر ایک ایم اے ہوا، بھارت کی دہلی یونی ورسٹی نے ڈاکٹر سید تقی عابدی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کی، بھارت نے نشان امتیاز دیا، انیس سو بیاسی ایوارڈ دیئے، سال کا بہترین ایوارڈ بھی آپ کو ملا اور تاحیات کامرانیوں کے ایوارڈ کا بھی آپ ہی حق دار قرار پائے پاکستان سے اربن بورڈ نے ایسی لینس اور انٹرنیشنل لٹریری کونسل نے ایوارڈ برائے تحقیق و ادب سے بہرہ ور کیا، جینیڈا اور برطانیہ سے علاوہ ایران سے ملنے والے ایوارڈ کی بھی روداد بہت طولانی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے برصغیر کے اردو فارسی انشاء پردازوں، شاعروں، مرثیہ نگاروں اور کلاسیک ادب کے معماروں اور اس تذکرہ پر کتابیں لکھی ہیں۔

مرزا سلامت علی عرف مرزا دبیر پر ان کی صرف سات کتابیں لکھی گئی ہیں، مرزا دبیر کی حزیں جن کا تخلص شیخ ناسخ نے بدل کر انیس کر دیا تھا اور وہ میر انیس کے نام سے معروف ہوئے ان پر لکھی جانے والی کتابوں کی روداد بھی طولانی ہے، جوش ملیح آبادی، اقبال، غالب، انشاء، فراق گورکھپوری، فانی اور کئی دوسرے مشاہیر ادب پر ڈاکٹر تقی عابدی کی لکھی کتابوں کے حوالے کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ پاکستان میں ڈاکٹر تقی عابدی کے ایک نوجوان ادب شناس جناب زاہد کاظمی بہاولپور میں جن کی ابھی ریسرچ کے حتمی میں حرام کا حوالہ بن چکی ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں جاتے ہیں خاص طور سے ایران اور بھارت میں تو جہاں وہ اپنے لیے نایاب کتب حاصل کرتے ہیں وہیں میرے لیے بھی ایک سے باندھ لیتے ہیں، انھوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ساری کی ساری کتابیں مجھے دیں جو پوری دیانت اور محنت سے لکھی بھی گئیں اور پبلشر نے خوب صورتی سے شائع بھی کیں، مگر فیض احمد فیض پر ڈاکٹر عابدی کا کام کوئی دوسرا شاید ہی اس

خوبیت اور خوب صورتی سے سرسے کا۔ "فیض شناسی" اور "فیض فہمی" دو خوب صورت کتابیں ہیں، بڑے سائز میں آرٹ پیپر اور چار رنگوں میں طبع "فیض شناسی" 508 صفحات اور "فیض فہمی" ڈیڑھ ہزار صفحات و محیط ہے گزشتہ روز ڈاکٹر تقی عابدی سے ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی تو وہ بتا رہے تھے کہ انھوں نے کبھی فیض احمد فیض کو نہیں دیکھا نہیں ملاقات نہ ہو لیکن فیض کی شاعری نے ان کا مرید و بنا رکھا ہے، فیض احمد فیض کی تاریخ ولادت سرکاری کاغذات کے مطابق ہیں 7 جنوری 1911ء ہے اور ہیں 7 جنوری 1912ء ڈاکٹر عابدی نے اپنے پاکستانی دوستوں سے سیالکوٹ بلدیہ سے ریکارڈ نکلوایا تو وہاں 13 فروری 1911ء لکھا ہے، فروری کی مناسبت سے یہ فیض کی ولادت کا مہینہ بھی ہے "فیض فہمی" میں فیض احمد فیض پر لکھی جانے والی 50 کتابوں کی تفصیل بھی ہے اور ان پر 330 قلم کاروں کے مضامین بھی، فیض کے وہ انٹرویو جو معروف قلم کاروں اور صحافیوں نے لیے جن سے سارے پارسا بات تھے بھی یکجا کر دیے گئے ہیں اور یہ بہت ہی بڑی "فیض فہمی" ہے۔

"فیض فہمی" میں فیض احمد فیض اور ان کی بیگم ایلس کے درمیان نکاح کے وقت ہونے والے معاہدے کا احوال بھی ہے فیض صاحب کی بارات میں ان کے سمیت تین لوگ شامل تھے، شیخ عبداللہ نے نکاح پڑھایا تھا۔ 28 اکتوبر 1941ء کو سری نگر میں منعقد ہونے والی اس تقریب کی دعوت ایلس فیض نے مرتا پر تھوپ دیے گئے اپنے پہلے انٹرویو میں بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ نکاح کے فوری بعد مشاعرہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحریر کے رسائل، اخبارات اور کتب سے استفادہ کرنے "فیض فہمی" کی تکمیل کی اور راولپنڈی میں شائع ہونے والی 2012ء کی کتاب تھی، ڈاکٹر تقی نے تحریر کیا تھا کہ اس میں مصنف کے 37 ذاتی بڑی اہل قلم کے مضامین شامل ہیں اور "فیض" کے نام سے منصہ شہود پر آئی تھی اس کا حوالہ نہیں دیا جا سکا شاید یہی محبت تحقیق کا عمل جاری رہتا ہے اس وقت نہیں، مجھے ڈاکٹر تقی عابدی کی قلم کاری، شاعری اور محبت سے قوی امید ہے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ "فیض فہمی" کے کام سے فارغ ہو چکے ہیں اب ان کا کوئی کام نہیں ہو۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے دنیا میں اُردو زبان کی ترویج کا جو بیڑہ اٹھایا ہوا ہے اور ملکوں ملکوں اپنے پرستاروں اور قارئین میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں یوں وہ "فیض فہمی" کے ساتھ ساتھ اُردو شناسی اور انسان فہمی کا خوب صورت انداز اپنائے ہوئے ہیں فیض احمد فیض کا مسلک بھی انسان دوستی ہی تھا تبھی ڈاکٹر تقی عابدی نے "فیض فہمی" کا نام دیا ہے۔

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری
اندور

ڈاکٹر تقی عابدی کا تجدیدی کارنامہ: فیضؔ فہمی

اردو ادب کے عالمی شہرت یافتہ فن کاروں میں فیضؔ کا شمار ہوتا ہے۔ ترقی پسند شعراء کے جھرمٹ میں انھیں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک، نئے اردو ادب میں تعلق، جوش، ولولہ اور نعرے بازی سے قریب تھا۔ فیضؔ اس سے وابستہ تھے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود فیضؔ کے یہاں وہ جوش، ولولہ اور وہ کھن گرج موجود نہیں ہے۔ پھر بھی فیضؔ اپنے عہد کے اہم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اس شہرت اور مقبولیت کے پس پردہ فیضؔ کی اپنی ذاتی، شخصی صلاحیت اور اور اختراعی (Originality) پوشیدہ ہے۔ جس میں ان کے امن پسندانہ مزاج کو بڑا دخل حاصل رہا ہے۔ شاید اسی امن پسندانہ رویے کی بنا پر انھوں نے نرم و نازک اور ملائم لب و لہجہ اختیار کیا۔ ترقی پسندی کے ساتھ اپنی روایت کو قائم رکھا، ماضی سے نہاں خانوں میں جھانکا، حال پر نظر رکھتے ہوئے اس کا تجزیہ کیا اور مستقبل کے خواب بھی دیکھے۔

بلا شبہ یہ بات مسلم ہے کہ فیضؔ کی اپنی شعری کائنات ہے، جو اپنے ہم عصر شعراء سے مختلف ہے۔ ان کی شاعری جذبات، احساسات، تفکرات کا خزانہ ہے۔ غم جاناں اور غم روزگار کا آئینہ خانہ ہے، رومان اور انقلاب کا حسین سنگم ہے۔ شاعری کے مختلف ادوار سے یہاں ملتے ہیں۔ مخملی ریشمی الفاظ اور لہجے سے اکتسابی پن نے ان کے یہاں وہ تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہ تاثیر ان کے تمثیلی جذبات بھرے احساسات کی بدولت ہے۔ جس کی ترجمانی میں فیضؔ نے ایسے علامتی، دلکش اور دلنشین الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جن سے تاثرات اور تاثیر جیسی صفت پیدا ہوتی ہے۔ علامتی اور تمثیلی زبان کے استعمال سے سبب ان کی شاعری رمز و ایما معلوم ہوتی ہے۔ قاری سے ان کے تار دل و دماغ سے

ہے۔ اس کے احساسات کی تہوں کو پہنچ جاتی ہے۔

یہ سب اس لیے بھی ہے کہ فیضؔ نے جن لفظوں کا انتخاب کیا ہے، ان میں ایک طرح کی غنائیت اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ غنا یا موسیقی دنیا کی محبوب فن لطیف ہے اس لیے فیضؔ کے خیالات اور احساسات قاری کے دل میں پیوست ہونے لگتے ہیں۔ رومان، انقلاب پسند لوگوں کی غم جاناں اور غم روزگار کے ماروں کی، دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی ہے، جس کی بنا پر فیضؔ کا قاری کے جذبات اور احساسات ہم آہنگ ہونے لگتے ہیں اور فیضؔ کا قاری کے ساتھ مسلسل رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فیضؔ کے کلام کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا تو اسے بے شمار لوگوں نے پسند کیا۔ یہ فیضؔ کی مقبولیت اور کامیابی کا بین ثبوت ہے اور اس بات کی بھی روشن دلیل ہے کہ فیضؔ کو عالمی شعراء کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

ان کے علاوہ فیضؔ کی مختلف جہتیں ہیں، مختلف پہلو ہیں۔ مثلاً وہ بڑے شاعر تو تھے ہی، مدرس بھی تھے، ترقی پسند تحریک کے اہم معمار تھے، فوج کے کرنل، سیاسی کارکن، ٹریڈ یونین لیڈر، براڈ کاسٹر اور ایک روشن خیال صحافی بھی تھے۔ کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے۔ ایک شخصیت کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس ہمہ گیر کام کو انجام دینے کا عزم مصمم کیا اور کتاب "فیضؔ فہمی" کی شکل میں ایک قابل دید، لائق رشک، مناسب تقلید اور مستحق ستائش کارنامہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی، عالمی سطح پر ابھرنے والا، اردو کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ شاعر و ادیب، محقق و ناقد، ماہر ثقافتی ادب اور شگفتہ بیان مقرر کے روپ میں، حلقہ علم و ادب میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ ان پر پی ایچ ڈی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ مشت از خروارے ان کی علمی و ادبی خدمات کا مختصر ترین تعارفی خاکہ ذیل میں بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی، سیماب صفت، متجسس، پہلو دار اور نہایت سرگرم شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ہندوستانی ضمیر پوشیدہ ہے۔ وہ حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں، جو ہمارے ادب کا قدیم مرکز رہا ہے۔ یہیں سے انھوں نے ایم بی بی ایس سند پائی اور ایم ایس (برطانیہ)، ایف سی اے پی (امریکہ) ایف آر سی پی سی (کینیڈا) سے طبی

اسناد حاصل کیں۔ ہندوستان اور دیگر ممالک سے حاصل کیا ہوا علمی و طبی سرمایہ سعودی عرب، ایران، امریکہ، وغیرہ۔ فی الحال مینیڈا میں ایک طبیب کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ ایک طرف جہاں وہ جسم و صحت کے طبیب ہیں، وہیں اردو ادب کے شدید امراض کے بھی معالج ہیں۔ یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں کہ بیک وقت ایک شخصیت میں دو مختلف اور متضاد جہتیں کس طرح موجود رہ سکتی ہیں۔ معالجی مصروفیات کی زندگی میں وہ ادب کے کاموں کے لیے کس طرح وقت نکالتے ہیں اور وہ بھی شاعری، تحقیق، تنقید، تدوین، ترتیب، تالیف وغیرہ جیسے مختلف و متضاد میدان کے لیے؟ لیکن ڈاکٹر فقی عابدی، حیرت انگیز طور پر اس عمل میں برسہا برس سے مصروف عمل ہیں۔ گزشتہ تقریباً ۳۵ پینتیس برس میں ان کی تقریباً ۱۱۱ چالیس کتابیں طباعت کی روشنائی سے ہمکنار شہود پر آچکی ہیں اور یہ سفر جاری ہے۔

یہ سب کتابیں کئی اہم موضوعات اور اصناف کا احاطہ کرتی ہیں۔ جن میں حیات و شخصیات، فنون، کارہائے نمایاں، دیوان، فن کاروں کی شعری و ادبی خدمات، کلامی تشریحات، نعت، منقبت، سلام، نوحہ جات، قصیدہ، مراثی، مثنویات، منظومات، رباعیات، خطبات، مقدمات، مقالہ جات، غزلیات، جمعیات، اقبالیات اور انجمنیات (انجمن بندی) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کو مختلف اداروں اور انجمنوں نے انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا ہے۔ ایسی ہی فضیلت پر مشتمل ایک کتاب "فقی فہمی" کا ذکر میں جا بجا لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر فقی عابدی کی کتاب "فقی فہمی" 1402 صفحات پر مشتمل ہے۔ اب تک فقیات پر شائع ہونے والی کتابوں میں ہر لحاظ سے سب سے زیادہ ضخیم و جامع کتاب ہے جو کہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں شامل 162 مضامین و مقالات کے تحت فقی کی شعری و نثری خدمات، حیات و کمالات اور مختلف جہات سے تمام تر پہلوؤں پر جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔

"فقی فہمی" سے قبل ڈاکٹر فقی عابدی نے فقی کے فن و شخصیت پر لکھنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکافی رہی تھی۔ انہوں نے فقی جانب دار، فقی کی شخصیت سے متعلق پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور اس عمل میں کہیں بھی جانب داری، مدحت یا قصیدہ خوانی کی حد تک

نہیں چھوا ہے بلکہ بڑی عرق ریزی، جانفشانی، بالغ نظری اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ "فیض فہمی" مرتب کی ہے اور فیض کے متعلق مختلف ادوار کے محققین اور ناقدین کے مضامین و مقالات کو جمع کر کے اس طرح ترتیب دیا ہے گویا فیض کے متعلق بکھرے ہوئے جواہرات کا ایک بڑا قیمتی خزانہ پیش کر دیا ہے۔

جن محققین نے فیض پر کوئی تحقیقی کام کرنے کا خواب دیکھا ہوگا، "فیض فہمی" صحیح معنوں میں ان تمام خوابوں کی تعبیر ہے۔ خصوصاً ان ریسرچ سکالرس کے لیے، جو فیض پر تحقیقی کام کر رہے ہیں یا کریں گے، ان کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ پیش بہا قیمتی تحفہ ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی زیر نظر تالیف، دیگر مرتب کردہ کتابوں سے مختلف اور بہتر ہے ورنہ بیشتر یہ ہوتا ہے کہ کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی خاطر مرتبین حضرات اکثر کتابوں، مقدمہ، پیش لفظ، تعارف یا حرف اول وغیرہ وعنوانات کے ذریعے کوئی مضمون تحریر کر دیتے ہیں اور دیگر اہل قلم کے مضامین و مقالات کو شامل کر کے خود صاحب کتاب بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "فیض فہمی" دیگر مرتبہ کتابوں سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ خود انھوں نے اس کتاب میں فیض پر تقریباً (۱۹) مضامین پیش قلم کیے ہیں۔ جو تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر "فیض فہمی" سے ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین کو علیحدہ بھی کر دیا جائے تب بھی موصوف کی فیض پر باقاعدہ ایک کتاب بن سکتی ہے۔ علاوہ اس کے موصوف نے، جن ادبا کے مضامین و "فیض فہمی" میں یکجا کیا ہے، ان کے فیض پر اور بھی کئی مضامین ملتے ہیں، بلکہ چند ادبا کی فیض پر کتابیں بھی موجود ہیں لیکن جس باریک بینی کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی نے مضامین کا انتخاب کیا ہے، وہ خوب سے خوب تر ہے۔ ان سب کے علاوہ اس میں فیض کا غیر مدون کلام بھی موجود ہے، جو ان کے کلیات "نسخہ ہائے وفا" میں بھی موجود نہیں ہے نیز فیض پر لکھے گئے مضامین و مقالات اور کتب و رسائل کی ایک طویل فہرست موجود ہے، جس سے موصوف کے وسیع مطالعے اور تحقیقی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ یقیناً ان کی مرتب کردہ مضامین و مقالات اور کتب و رسائل کی فہرست، فیض پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔

فیض کو ترقی پسند تحریک کا اہم علم بردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنے عہد کے بڑے شعراء

میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن ان کی نثر نگاری اور خصوصاً صحافت سے متعلق اردو ادب میں یہ حاصل گفتگو کا فقدان نظر آتا ہے۔ جب کہ فیض کو صحافت سے بھی خاصہ کا واقعہ۔ مثال کے طور پر جب مملکت میں "اقبال چیئر" قائم ہوئی تو سب سے پہلے فیض کا ہی انتخاب کیا گیا تھا لیکن انھوں نے ادارت کو اولیت دی تھی۔ اس طرح ان کے بعد ڈاکٹر مظفر حسین برنی کا کیا گیا تھا۔ اس کی پرکھ فیض کی زندگی میں صحافت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی "فیض فہمی" میں خاطر خواہ مواد دستیاب ہے اور فیض نثر کی و صحافتی خدمات سے متعلق، جو تحقیق ہے اسے کافی حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چناں چہ ڈاکٹر تقی عابدی نے "فیض فہمی" میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جن کے بغیر "فیض شناسی" اور "فیض فہمی" نامکمل ہے۔ مثلاً فیض کو سمجھنے کے لیے ان کے سیاسی افکار کو جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عابدی کا مضمون "فیض اور ایرانی انقلاب" بڑے خاصے کی چیز ہے۔ یہی نہیں "فیض شناسی" کے لیے انھوں نے اس کتاب میں فیض کی بعض نایاب تصاویر اور خطوط کو بھی شامل کر دیا ہے، جس کے لیے میں فیض کو زیادہ نزدیک سے دیکھنے، سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے حالات، واقعات بھی خود فیض کے سامنے آجاتے ہیں۔ جو مضامین و مقالات اور کتابوں میں نہیں ملتے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی اس کتاب میں ان کتابوں کی خوبیاں اور حوالے موجود ہے۔ فیض کی ادبی، تعلیمی، نثری، صحافتی خدمات، اس کی اہمیت و افادیت، زندگی کے حالات و واقعات، سیاسی، سماجی، مذہبی افکار و خیالات اور سوانح حیات کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہو تو اردو ادب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں مل سکے گی۔

واقعی ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ بے مثال ادبی کارنامہ اردو ادب کے سرمایہ میں بیش قدر اضافہ ہے۔ جس کی اردو ادب میں یقیناً پذیرائی ہوگی۔ جس طرح فیض اپنے دور کے لیے ایک چیز تھے، اسی طرح ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ کارنامہ فیضیات پر موجود ذخیرے میں ایک چیز ہے۔ مرور ایام کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

یں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ڈاکٹر رشید گل
ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب

کا جویانِ علم اور صاحبانِ نقد و نظر کے لیے انمول تحفہ! ''فیضِ فہمی''

ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسی قد آور علمی اور ادبی شخصیت پر قلم اٹھانے کی جسارت کرنا بلا شبہ ایک بہت بڑی گستاخی اور بے ادبی متصور ہوتی۔ لیکن ایسی شخصیت کی علمی، ادبی اور تحقیقی کاوش کو نہ سراہنا بھی راقم الحروف کے نزدیک بڑے درجے کی تنگ نظری اور بخیلی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی فیض نوازی بعنوان ''فیضِ فہمی'' پر اپنے ذہنی و اپنے خیال میں مناسب، روا اور جائز سمجھتا ہوں سب سے پہلی بات جس نے بندۂ ناچیز کو مجبور کیا کہ وہ مذکورہ کتاب اور اس کے مصنف اور محقق کے حوالے سے چند سطور صفحاتِ قرطاس پر بکھیرے، وہ یہ کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا فیہ جانبدارانہ غیر متعصبانہ اور عادلانہ تبصرہ۔ محقق اور مصنف نے عبد ساز انقلابی اور رومانی شاعر کی زندگی کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ مذکورہ شاعر کی زندگی کا کوئی گوشہ یا پہلو عدم توجہی یا بے اعتنائی کا شکار نہ ہونے پائے۔ ''فیضِ فہمی'' کے مصنف و ناقد نے عالم اور عالم کے ذوقِ سلیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیض کی ذاتی زندگی اور ان کے فن شاعری اور نظریات کے متعلق مشاہیر عالم اور عہد حاضر کے نامور شاعروں ادیبوں اور نقادوں سے خصوصی مضامین لکھوا کر بڑی فیاضی سے حقِ فیض ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا یہی ایک وصف ہی ان کو صاحبانِ نقد و نظر کے ذہنوں اور دلوں میں تا قیامت مسند قدر و منزلت پر بٹھانے کے لیے کافی ہے۔ موصوف نے علاقائی و جغرافیائی حدود، بغض اور کینہ کے اندیشوں سے اٹھ کر بڑے ہی متوازن، مدبرانہ اور منصفانہ انداز میں مذکورہ کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر کے اپنی علمی ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے دورِ حاضر کے مصنفین اور

ناقدین کے لیے ایک ایسا گراں قدر اور انمول تحفہ فراہم کیا ہے۔ جو کہ نادر ہونے کے ساتھ ساتھ عدیم المثال بھی ہے۔ مذکورہ کتاب کی ضخامت، جسامت اور کتابت و طباعت، ڈاکٹر صاحب کے حسن ذوق، محنت اور عرق ریزی کی داد دینی پڑتی ہے۔ "فیض فہمی" تقریباً 1400 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں کل 102 مضامین ہیں۔ مذکورہ کتاب میں شامل 48 مضامین ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کے زور قلم کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے دنیا کے نامور مصنفین، ناقدین اور شعرا کے ساتھ ساتھ "فیض فہمی" کو فیض جیت، محبت اور محبتوں کی دھرتی کہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تو بڑا ثقیل فیہ سے بھی مذکورہ کتاب مرتب کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے باقی مشاہیر عالم کی آرا اور مضامین کو پیش کرنے کی بجائے فیض اور شعور کی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے لیے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فیض احمد فیض کی شاعری سے ایک دنیا فیضیاب ہوئی ہے۔ ان کی شاعری رومانیت اور انقلابیت کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنے انداز بیان سے سامعین اور ناقدین کو یکساں متاثر کیا ہے۔ ان سے بدترین ناقدین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ فیض نے اپنے غزل و نظم میں فارسی اور عربی کی نئی تراکیب، علامتیں اور تشبیہیں متعارف کروا کر اردو غزل کی زیبائش و آرائش میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ فیض کی شاعری معانی و مطالب کے ساتھ ساتھ خارجیت کی ایسی بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے قارئین اور سامعین کی روح جذب و کیف اور بے خودی کے عالم میں داخل ہو جاتی ہیں۔ فیض کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ دور حاضر کے تمام نامور گلوکاروں نے ان کے کلام کو بڑے خوب صورت اور منفرد انداز میں گایا ہے۔ فیض کے کلام کو خواص و عام میں مقبول کیا ہے۔ بعض ناقدین کے مطابق انھوں نے مغربی دنیا کے شعرا سے متاثر ہو کر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ ان کی شاعری مغرب کے شعرا بالخصوص تھامس ہارڈی، ایلیٹ، آرتھر سائمن، رابرٹ فراسٹ، شیلے، بیرن اور ورڈزورتھ سے متاثر ہے۔ چوتھا قدین فن کا خیال ہے کہ فیض صاحب کی نظم "تنہائی" آرتھر سائمن کے مضمون ٹرسٹ (Broken Trust) اور ہارڈی کی نظم (The Broken Appointment) سے ماخوذ ہے جب کہ فیض کی شاعری پر میر، غالب، انیس، اقبال، حسرت، مخدوم کی شاعری کے علاوہ

خسرو، عرفی، بیدل، عربی کے ابوالطیب، ابوتمام اور ابونواس کی انداز شاعری کا اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر فیضؔ مغربی اور مشرقی شاعروں سے متاثر ہیں اور ان کی چھاپ ان کے کلام میں نظر آتی ہے تو یہ کوئی عیب والی بات ہرگز نہیں۔ شاعر بالخصوص مغرب مشرق اچھے شعراء کے کلام سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دور کے حالات و واقعات علمی، ادبی اور ثقافتی تبدیلی سے اثر کو قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن فیضؔ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عشقیہ اور قومی و زمانے کے سماجی مسائل سے مفسلک رکھ پیش کیا۔ اس طرح انھوں نے اردو کی روایتی رومانوی شاعری میں نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ جس سے اردو شاعری کا دامن مزید وسیع ہوا اور فیضؔ نے ایک اپنا جدا اور منفرد انداز متعارف کروایا۔ فیضؔ نے روایتی شاعری کے گھسے پٹے بندھنے کی بجائے جدت اور انفرادیت پیدا کر کے معانی و مطالب کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ فیضؔ نے شاعری کے روایتی انداز کو بدل کر ایک نیا آہنگ اور اسلوب وضع کیا ہے اور اپنی پہچان کی ایک علیحدہ چھاپ چھوڑی ہے۔ دبیر، سودا، غالب، اقبال، نظیر، حسرت، اختر شیرانی، خسرو، عرفی، بیدل، ابوالطیب اور ابونواس کا اثر تو قبول کرتے ہیں لیکن وہ اس اثر میں خواص، عوام کے لیے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ قارئین اور سامعین و شاعری کے سحر میں اس طرح جکڑ لیتے ہیں کہ ہر شخص داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فیضؔ کے نزدیک شاعری ایک مسلسل تجربہ ہے۔ جو وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہتا ہے۔ فیضؔ نے اپنے اسلوب کے حوالے سے شاعرانہ تسلی سے ضرور کام لیا ہے۔ لیکن انھوں نے کاملیت کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا۔ مرا زمرہ راقم احروف کی نظر سے ایسا دعویٰ ہرگز نہیں گزرا۔ ان کے شعری مجموعات میں فنی نقائص اور اسقام موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبیہ ایلس کو لکھے گئے خطوط میں نقائص کا ذکر کیا ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق یہ فیضؔ صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فنی عیوب اور نقائص ہر بڑے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے بطور خاص فیضؔ صاحب کی شاعری کے فنی نقائص اور اسقام پر مضمون لکھ کر یہ تاثر دیا ہے کہ وہ خوامخواہ کسی کی تعریف نہیں کرتے بلکہ مذکورہ

شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے پہچان کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے غیر جانبدارانہ، منصفانہ، عادلانہ اور غیر متعصبانہ انداز میں غلط کی نشاندہی کرکے نہ صرف اپنی اعتباریت کا سکہ جمایا ہے بلکہ انھوں نے اردو ادب کی جس قدر خدمت کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بنیاد انزامات کی بنیاد پر ادبی تقاضوں کی کسوٹی پر کھرے انزامات کی تردید کی ہے۔ راقم الحروف کی نظر میں فنی تقاضوں، اصولوں اور ضابطوں سے انحراف ممکن نہیں لیکن شاعری میں ندرت خیالی کو بنیاد اور اساس مانا گیا ہے۔ قافیہ آرائی پر معنویت اور خلاقیت کو ترجیح دی گئی ہے۔

فیض رومانی اور انقلابی شاعر تھے۔ بعض ناقدین کے نزدیک ان کی شاعری میں روایتی انقلابی شاعروں جیسی شعلہ بیانی نظر نہیں آتی لیکن فیض دھیمے انداز میں انقلابیت کا پرچار کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری دلی جذبوں میں ہیجان پیدا کرنے کے بجائے رومانی ہے۔ جس کا انزاق نہیں بلکہ دائمی ہوتا ہے۔ محبت اور عشق کے میدان میں بھی وہ ہمیشہ پرامید رہتے ہیں۔ وہ اقبال کی طرح فراق میں جان کھپانے کے عادی نہیں بلکہ وہ وصال یار کے لیے ہمیشہ تیار اور پرامید رہتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں احساس کی شدت اور جدت اپنی تمام تر رومانی کے ساتھ موجود ہے۔ مذکورہ بالا شعر شدت جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض کی شاعری پر ان گنت شاعروں، ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں نے اپنے تاثر میں تبصرہ کیا ہے۔ ہر ایک کا تبصرہ پڑھنے سے جدت کی یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ فیض اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اپنی شاعرانہ فن کارانہ اور مدبرانہ حیثیت کو اپنے ہم عصروں سے منواتا ہے۔ ان کے بدترین ناقدین بھی ان کی انفرادیت اور جدت پسندی کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں شعریت، تغزل اور غنائیت بدرجہ تمام موجود ہے۔ فیض کی رومانی اور انقلابی شاعری نے روایتی شاعری کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک نیا فکری پتھر پھینکا ہے۔ جس سے اردو ادب میں نئی نئی لہریں اٹھتی ہیں۔ سارا سمندر ہی متلاطم ہو جاتا ہے۔

رشید حسن خان فیضؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسی امور سے ان کی آئینہ داری کرتا ہے۔ رشید حسن خان نے فیضؔ سے اس مصرعہ پر کہ'' چھ عشق یا، چھ کام کیا'' اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فیضؔ نے حقیقت بیانی کرکے سچے اور کھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ کاملیت کا دعویٰ خدائے بزرگ و برتر کی ذات کے سوا نہیں کرسکتا ہے۔ فیضؔ نے اعتراف حقیقت کیا ہے۔ جو کہ ان کی مضبوط شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔

ہر شاعر، فن کار، ادیب اور دانشور کی زندگی میں ایک بے نام تشنگی اور کمی موجود رہتی ہے۔ یہی تشنگی اور کمی اس کو مزید کام کرنے پر ابھارتی ہے۔ کسک، درد اور تڑپ کے بغیر جذبات نگاری ممکن نہیں۔ یہ امور اپنی جگہ بجا بلکہ شاعرانہ اور فن کارانہ زندگی کا حسن ہے۔

فیضؔ صاحب کی نجی، ذاتی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ ان کی شاعری اور ان کے نظریات پر ''فیضؔ فہمی'' میں سیر حاصل گفتگو ہوچکی ہے۔ ان تمام پہلوؤں اور زاویوں پر تبصرہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ راقم الحروف کا اولین مقصد مذکورہ کتاب کے مصنف اور محقق جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی کاوشوں و فکر و تحسین پیش کرنا تھا۔ کیوں کہ آج کے دور میں جہاں کتاب بینی کا شوق ناپید ہورہا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو معیاری، اعلیٰ اور فقید المثال بنانے میں بے دریغ وقت اور محنت کی خزانے لٹائے ہیں۔ مشاہیر عالم سے مضامین لکھوانا، ان کو یکجا کرنا، نادر و نایاب تصاویر و اشتہار کرنا اور ان کو مختلف عناوین کے تحت ''فیضؔ فہمی'' میں شامل کرنا اگرچہ کارِ نامکمل نہیں تو بھی کارِ دشوار ضرور ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے اپنی تحقیقی، علمی و ادبی صلاحیتوں کا استعمال نہایت سلیقے اور اچھوتے انداز میں کرکے دنیائے ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے ایک لازوال اور باعث تقلید مثال چھوڑی ہے۔ اردو ادب سے ان کا والہانہ عشق اور شعبۂ تحقیق و تنقید میں ان کا غیر متعصبانہ، غیر جانبدارانہ مخلصانہ اور عالمانہ انداز ان کو بلاشبہ اعلیٰ پایہ کے محقق اور ناقدین کی صف میں ممتاز مقام پر فائز کرتا ہے۔ عوام و خواص سے ''فیضؔ فہمی'' سے فیضیاب ہونے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے مددگار اصول بیان کرکے ہر ایک قاری کو کلام فیضؔ سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ڈاکٹر سید

تقی عابدی کی تصنیف پڑھ کر فیقی کی شاعری کے متعلق کچھ بھی ناخواندہ نہیں رہ جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دورِ حاضر کے کسی بھی شاعر، ادیب، ناقد، دانشور اور نثر نگار کا کوئی مشفق مکرم منکسر المزاج محقق، صاحبِ طرز شاعر، مصنف اور نثر نگار نہ سید تقی عابدی کی شخصیت اور علمیت سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب مدت مدید سے اپنی جان پر فیقی کی شاعری کا قرض رکھتے تھے۔ جو انھوں نے "فیقی فہمی" کی صورت میں نہایت فیاضی اور فراخدلی سے چکا دیا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی یہ کاوش قدر و ستائش کے لائق ہے۔ ہم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہم ندیم قاسمی کے یہ شعر اس مضمون کو تمام نیک خواہشات کے ساتھ بند کرتے ہیں ؎

یاد آئے تیرے پیکر کے نقوش
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

بھارت، پاکستان اور دنیا کے مختلف علاقوں کی تمام جامعات اور اداروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے عالم اور مدبر شخصیت کو اردو ادب کے شعبہ تنقید و تحقیق میں ان کی خدمات کی قدر افزائی کا موقع دینے کے لیے فوراً غور و خوض کریں گے۔ وہ اس خوشی سے جو ہزار حق امیدوار ہیں۔

پروفیسر سیدہ جعفر

ڈاکٹر تقی عابدی اور فیضؔ فہمی

فیضؔ کا نام اردو شاعری کے لیجنڈ کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔
صدیوں دلوں کے اندر ہم بولتے رہیں گے

فیضؔ کی استعارہ سازی، عصری حسیت اور انسانیت سے متوازن امتزاج، لب و لہجے کی نرمی، دل آسائی، ہیومنزم کی تابناکی اور انسانی زندگی کے جمالیات نے ان کی شاعری کو ایک ہمہ گیر اثر آفرینی عطا کی ہے۔ فیضؔ کے کلاسیکی ہندنشین رومانیت، اپنے عہد کی مزاج شناسی، لفظوں کے جمالیاتی استعمال اور انکساری و دردمندی نے انھیں انفرادیت عطا کی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیضؔ کے فن پر مختلف ادیبوں کے مضامین یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے۔ حیدرآباد میں ڈاکٹر تقی عابدی کی اس وقیع تصنیف کی رسم اجراء کے موقع پر اس ناچیز نے اپنی تقریر میں عرض کیا تھا کہ اس تصنیف کا نام "فیضؔ انسائیکلوپیڈیا" ہونا چاہیے تھا، لیکن مرتب نے انکساری سے کام لے کر اسے "فیضؔ فہمی" سے موسوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیضؔ کی زندگی کی تمام تفصیلات ان کے سوانحی حالات و واقعات زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو اردو ادب کے سرمائے میں اس سے بہتر کتاب نہیں ملے گی۔ فیضؔ کی شاعری کے مختلف گوشوں پر اردو کے صاحب نظر نقادوں نے اظہار خیال کر کے ان کے فن کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا اس انتساب سے اچھا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ فیضؔ بنیادی طور پر ہیومنزم کے شاعر تھے۔ وہ رنگ، نسل، قوم، ملت اور جغرافیائی سرحدوں سے انسان کو ماورا سمجھتے تھے۔ ذہنی تحفظات اور طبقاتی تعصبات کو ان کے نظام فکر میں جگہ نہیں مل سکی۔ اسی وسعت قلب و نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقی عابدی نے یہ گرانقدر

تصنیف پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف کے نام معنون کی ہے اور یہ دونوں بر صغیر کے دو ملکوں ہندوستان اور پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "فیض فہمی" میں اردو کے اہم نقادوں کی تحریریں جمع کر دی گئی ہیں اور فیض کے فن پر ان کے تاثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مسعود حسین خان، گوپی چند نارنگ، احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، آفتاب عابدی، قمر رئیس اور افتخار عارف وغیرہ کے مضامین نے اس تصنیف کی ادبی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے میں نے صرف چند نام لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے اس فہرست میں اضافہ کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کتاب کی حقیقی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکے۔

ڈاکٹر آفتاب عابدی نے بڑی جستجو اور کاوش کے بعد فیض کی تصویریں اور ان سے متعلقین کی تصاویر جمع کی ہیں۔ 402 صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں فیض کے سوانحی حالات اور ان کے کلام کے تمام نقوش محفوظ ہو گئے ہیں۔ فیض ایک شاعر اور نثر نگار ہی نہیں صحافی بھی تھے جس کی طرف اردو والوں نے کم توجہ دی ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر احمد علی خان کا مضمون ہمیں فیض کی ادبی شخصیت کی ایک نئی جہت سے متعارف کراتا ہے۔ شعیب ہاشمی اور A Song for this day میں انگریزی میں فیض کی شاعری اور ان سے اپنے روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں خود مرتب یعنی ڈاکٹر آفتاب عابدی کی 41 سے زیادہ تحریریں شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے انھوں نے فیض کی شاعری کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ فیض کی شاعری سے متعلق ان کے طرز تدریس کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے بڑی عرق ریزی اور ادبی بصیرت کے ساتھ فیض کی شاعری کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لیا اور تجزیہ کیا ہے پیشے کے اعتبار سے آفتاب عابدی ڈاکٹر ہیں۔ طب ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی کارکنائے تجربہ سے اور اس کے لیے انھیں بہت وقت ملا ہوگا۔ ڈاکٹر آفتاب عابدی کی متعدد تصنیفات ظاہر ہیں پر اہل نظر سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔

"شہید" "جوش محبت" "گلشن رویا" "اقبال سے عرفی زاہے" "انشا اللہ خاں انشا" "رموز شاعری" "انوار حق" "مجتبد نظم مرزا دبیر" "طالع مہر" "سلک سلام" "تجلیات کلام" "باب مصائب" "نور باران" "عروس سخن" "مصحف دل" "مثنویات" "کائنات سخن" "روپ نگار گلزار" "بہار کائنات"

''فکر مضمون''، ''خوشہ انجم''، ''ھوا لنجم''، ''تعشق للعشوی''، ''ادبی معجزہ''، ''غالب دیوان غت ومنقبت''، ''چوں مرگ آید''، ''رباعیات دبیر''، ''بدعتن''، ''کلیات غالب فارسی'' (دو جلد)، ''دیوان غالب دہلوی'' فارسی، ''مطالعہ رباعیات فراق ورکھپوری''، ''اردو شاہکار نظمیں''۔ زیر تصنیف ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ فانی الافانی''، ''اقبال کے چار مصرعے''۔ تقی عابدی کی مرتبہ ادبی کاوشیں ہیں۔ ''فیض فہمی'' ان کی ادبی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کی ترجمان ہے۔

یہ 37 تصانیف ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی بصیرت اور تنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے شاعر یا ادیب کے فن کا سرسری طور پر جائزہ نہیں لیا ہے اور تاثراتی انداز اختیار کرکے اپنی سہل انگاری کا ثبوت نہیں دیا ہے بلکہ وہ فن کار کی تخلیق کا تجزیہ کرکے سائنٹفک انداز میں نتائج اخذ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو کے مرزبوم سے دور رہ کر بھی ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہیں۔ تقی عابدی کی کوشش یہ رہی ہے کہ بیرون امریکہ کے مختلف شہروں میں اردو کو مقبول بنائیں، وہ ہندوستان میں شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد میں مختلف انجمنوں اور اداروں کی تقریب میں شرکت کے لیے دور دراز کا سفر طے کرکے جنوبی ہندوستان پہنچنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی ایک اچھے مقرر ہیں۔ بے تکان تقریر کرنے اور سامعین کو مسحور کردینے کا فن بھی ان سے سیکھیے۔ سامعین ڈاکٹر تقی عابدی کی تقریر سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کی تقریر سے دوران سامعین کو وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ انھیں متعدد شعر ازبر ہیں اور اپنی تقریر کے دوران برجستہ طور پر ان کا استعمال کرکے اپنی شگفتہ بیانی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

''فیض فہمی'' میں مرتب نے فیض کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کا کوئی گوشہ نظر انداز نہیں کیا ہے۔ فیض نے مختلف ملکوں کا دورہ کیا تھا اور وہاں کی عوامی زندگی کو سیاسی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ تمام دنیا میں عوام اور محنت کشوں کے مسائل حل طلب ہیں، کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ سحر انصاری نے ''فیض اور فلسطین'' کے عنوان سے جو مضمون سپرد قلم کیا ہے اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ فیض کی شاعری اپنے عہد کے

انسانی مسائل کی "بھرپور نمائندگی" کرتی ہے۔ فیض کے ساتھ رتھال پر یادگار ملاقات کے تاثرات "فیض میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے۔" میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یادگار ملاقات لکھتے ہیں۔ "فیض احمد فیض میرے دوست تھے اور جنگ بیروت میں میرے رفیق تھے۔ اس دہکتے جہنم میں بھی ان کے چہرے کی شادابی مسکراہٹ ماند نہیں پڑی اور ان کی آنکھیں ناقابل شکست عزم و یقین سے چمکتی رہیں۔" تقی عابدی کا مضمون "فیض اور ایرانی انقلاب" اس سلسلے میں بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ فیض نے اپنے مخطوط پر ایرانی انقلاب اور استعمار کے ہمہ گیر جامعیت و تزآفرینی کے کامیاب سیاسی حالات کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ فیض کی بہت سی تصویریں بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ تصویریں ان کی خانگی زندگی کے مختلف رخوں کی آئینہ دار ہیں۔ "فیض فہمی" میں فیض کے بعض اہم مخطوطے بھی شامل ہیں جن سے ان کی شخصیت و طرز فکر کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ تقی عابدی کا اسلوب بیان نہایت شستہ، متاثر کن، واضح اور دلآویز ہے۔ ان کی تحریروں میں فارسی الفاظ و تلمیحات اکثر جگہ صرف ہوئے ہیں، جس سے ان کی معنویت و تزآفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ "فیض فہمی" ارمغان کے سلسلے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے اور فیض کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک جامع دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں فیض کے فن کے تمام گوشوں پر بڑی معنویت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم
شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی فیض فہمی

فیض احمد فیض اردو کے سب سے بڑے شاعر نہ سہی لیکن اردو کے بڑے شاعروں میں شامل ضرور ہیں۔ فیض نے کلاسیکیت اور رومانیت کو جس سلیقے سے ایک ساتھ پیش کیا ہے کہ ایسی بہت کم مثالیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ غم جاناں کا غم دوراں سے ربط کا فن فیض کو منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ فیض پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کئی جامعات میں تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے۔ بے شمار سیمینار و سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا، بحث و مباحثے ہوئے، فنی و تکنیکی گفتگو ہوئی اور فیض کا فن مزید کھلتا گیا۔ ابھی فیض شناسی کے مختلف مراحل جاری ہیں اور جاری رہیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اردو کے نامور محقق اور نقاد ہیں۔ ان سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ طب کے ڈاکٹر ہیں مگر ادب کے مریض ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ طب اور ادب دونوں کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی اردو سے محبت اور اس کے فروغ کے لیے محنت بے مثال ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سے ہی اخلاص کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ کبھی اپنی کتابوں کو فروخت نہیں کرتے ہیں اور نہ کبھی کسی ادارے سے امداد لیتے ہیں۔ ذہنی عیاشی ادبی سیاحت ان کا مشغلہ ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد پچاس درجن سے زیادہ ہے۔ انھوں نے مرثیہ خصوصاً انیس، دبیر، جگر آفندی کے حوالے سے خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اقبال، حالی اور فیض کے فن پر اپنی توانائیاں صرف کی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کبھی بھی کسی شخصیت سے مرعوب ہو کر قلم نہیں اٹھایا ہے اور نہ مضامین میں کہیں جانب داری برتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، عمل سے لکھا اور بے لاگ لکھا اسی وجہ سے انھیں اردو کے ممتاز محققین میں شمار کیا جاتا ہے۔

فیض احمد فیض کے حوالے سے انھوں نے چالیس سے زیادہ مضامین لکھے اور

"فیض شناسی" کا ثبوت دیا لیکن ان کی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔ انھوں نے فیض پر قدیم، جدید تقریباً 121 مضامین کو یکجا کیا اور اپنے اس تالیف مضامین کو شامل کرتے ہوئے فیض پر ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جسے "فیض فہمی" کے نام سے جانتے ہے۔ فیض فہمی، چودہ سو صفحات سے زائد مشتمل کتاب 2011ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر فخر عابدی نے فیض اور ان کے افراد خاندان اور دیگر احباب کے ساتھ سینکڑوں نادر و نایاب تصاویر شامل کرکے اسے ایک دستاویزی مرقع بنا دیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف کے نام معنون کیا ہے۔ اس پروجیکٹ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

> "فیض کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر فیض فہمی پر یہ دستاویزی انسائیکلوپیڈیا تعددی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی گئی ہے تاکہ فیض کی حیات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی اقدار کا ہر زاویہ نظر سے جائزہ لیا جا سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ فیض کی حیات اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ہمارا اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ان کی شاعری کی طرز فکر اور ان کی نثر کی طرز نہاد پر یہ حاصل کلام نہ ہو سکا جس پر وہ قدیم تنقیدی، تشریحی، تفسیری اور تجزیاتی تحریریں تواتر کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔

اس کتاب میں فیض کی اسی قدر و قیمت کی دوبارہ دریافت کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ایک مستند دستاویزی تصنیف و تالیف ہو جس میں جدید مضامین کے علاوہ ان تمام مضامین کو بھی شامل کیا جائے جن سے عام و خاص استفادہ کر سکیں اور یہ کتاب محققین، تنقیدین اور اساتذہ کے لیے سودمند اور مددگار ثابت ہو سکے۔ ہم نے دانستہ طور پر "فیض فہمی" میں ان مضامین کو شامل نہیں کیا جن میں گزشتہ قدیم مطبوعات کے اور مضامین سے بہت سے حصوں کو بغیر کسی حوالے کے بغیر پیش کیا گیا تھا۔ ہمیں تکرار اور مضمون کی بازگشت سے گریز تھا، یہی وجہ ہے کہ "فیض فہمی" میں وہ اصل مضامین شامل ہیں۔

اس دفتر فکر و نظر میں وہ مضامین بھی نظر نہیں آ میں گے جن میں ''فیض شناسی'' سے زیادہ مضمون نگار کی خود شناسی موجود تھی۔ بہ قول جمیل مظہری تھوڑی بہت خود نمائی تو فطری حسن ہے۔

بقدر پیمانۂ تخیل، سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو مر نکل جائے آدمی کا''

فیض احمد فیض کی اس دستاویز سے ہر مضمون پر اظہار خیال ممکن نہیں ہے لیکن فہرست مضامین کا اندراج لازم ہے تاکہ قاری کو پتہ چلے کہ اس میں کون کون فیض شناس شامل ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

''فیض کو کیسے نہ پڑھیں۔ ایک پس ساختیاتی رویہ'' (پروفیسر گوپی چند نارنگ)، ''فیض کی انفرادیت'' (پروفیسر سید احتشام حسین)، ''فیض'' (پروفیسر کلیم الدین احمد)، ''فیض کی شعری اسلوبیات۔ تسلسل بیان اور معنیاتی وحدت'' (پروفیسر مرزا خلیل بیگ)، ''فیض کا نظریہ سخن'' (محمد صفدر میر)، ''فیض کی شعری جہات اور تعین قدر کا مسئلہ'' (پروفیسر شارب ردولوی)، ''فیض اور کلاسیکی غزل'' (شمس الرحمن فاروقی)، ''فیض سے فیض تک'' (پروفیسر آل احمد سرور)، ''فیض کی نظم'' (پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی)، ''سر وادیٔ سینا کی غزلیں'' (ڈاکٹر شان الحق حقی)، ''فیض نظریات کا شاعر'' (احمد ندیم قاسمی)، ''زنداں نامہ کا سرسری جائزہ'' (جعفر علی خان اثر لکھنوی)،

Faiz Ahmad Faiz. Remmiscences (Prof. George Fischer)

''فیض احمد فیض کی شاعری کا لسانی پہلو'' (ڈاکٹر نصرت چودھری)، ''کچھ ''دست صبا'' کے بارے میں'' (سید سجاد ظہیر)، ''فیض احمد فیض کی شاعری'' (پروفیسر سیدہ جعفر)، ''فیض احمد فیض کی غزل گوئی'' (ڈاکٹر ضیاء الحسن)، ''فیض بہ حیثیت رومانی شاعر'' (ابن فرید)، ''نظم گوئی میں فیض احمد فیض کے امتیازات'' (پروفیسر ابوالکلام قاسمی)، ''فیض احمد فیض کی شاعری'' (ظفر اقبال)، ''فیض صاحب کی ایک نظم'' (ستار طاہر)، ''فیض صاحب کا نظریۂ شاعری اور اس کی تطبیق'' (ڈاکٹر سید محمد عقیل)، ''فیض کا فن شاعری'' (ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی)، ''فیض کی شاعری کا زندہ لفظ'' (آغا سہیل)، ''دست صبا'' (ممتاز حسین)،

''فیض احمد فیض کی شاعری'' (پروفیسر شمیم حنفی)، ''فیض کی غزل'' (ڈاکٹر سلام سندیلوی)، ''غالب اور فیض'' (ڈاکٹر وزیر آغا)، ''توسیع روایت کا شاعر'' (ڈاکٹر عنوان چشتی)، ''غالب، جوش اور فیض تین آوازیں، تین لہجے'' (پروفیسر محمد علی صدیقی)، ''فیض احمد فیض'' (ڈاکٹر سعادت حسین)، ''معتدل روی گفتار کا غزل گو'' (ڈاکٹر سلیم اختر)، ''فیض احمد فیض شخصیت اور شاعری'' (نسیم احمد عباسی)، ''فیض ایک تقابلی مطالعہ'' (پروفیسر جمیل جالبی)، ''فیض کا فنی سفر اور سمت سفر'' (ڈاکٹر عتیق احمد)، ''فیض کی نظریاتی شاعری فن کے تناظر میں'' (ظہیر صدیقی)، ''فیض نقش فریادی کی روشنی میں'' (ڈاکٹر ابو محمد سحر)، ''فیض اور جدیدیت'' (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)، ''فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی افق'' (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)، ''جدید اردو شاعری میں علامت نگاری'' (ڈاکٹر تبسم کاشمیری)، ''فیض احمد فیض اور روایتی شعری زبان'' (پروفیسر محمد علی صدیقی)، ''فیض کی غزل'' (پروفیسر قمر رئیس)، ''سکندر علی وجد اور فیض کے باہمی تعلقات'' (پروفیسر مجید بیدار)، ''زندان نامہ بیک تاثر'' (شاہ عارفی)، ''نسخہ ہائے وفا'' (پروفیسر مجتبیٰ حسین)، ''فیض ایک شاعر'' (پروفیسر محمد حسن انصاری)، ''میزان ایک مطالعہ'' (ڈاکٹر صلاح الدین حیدر)، ''فیض کے شعری و نثری میلانات'' (ڈاکٹر اشفاق سلیم مرزا)، ''ادب کا ترقی پسند نظریہ'' (فیض احمد فیض)، ''ہمارے شاعر انقلاب کی حیثیت سے'' (فیض احمد فیض)، ''محنت کی عظمت کا گیت'' (فیض احمد فیض)، ''ایک یادگار تقریر'' (فیض احمد فیض)، ''ایک وطن دوست مندوب کی آواز ترجمہ پروفیسر محمد انصاری'' (ایلزبیتھ رسوف)، ''فیض احمد فیض چند مشرقی پاپولر شاعروں سے'' (ڈاکٹر حیدر بخت)، ''فیض عظیم شاعر، عظیم انسان'' (پروفیسر برار حسین)، ''فیض قریب سے دیکھا'' (اختر حسین)، ''محبت کا رشتہ'' (سلیمہ ہاشمی)،

"Do you also write poetry" (Moneeza Hashmi)

''فیض سے میری پہلی ملاقات'' (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم)، ''فیض'' (مالک رام)، ''یاد فیض'' (اندر ملہار جوشی)، ''شاعر بے مثل'' (علی عباس حسینی)، ''فیض کی باتیں، فیض کی شاعری'' (وارث علوی)، ''فیض سے ملاقات'' (کرشن چندر)، ''فیض کا غم'' (سید سبط حسن)، ''ہمارے فیض صاحب'' (فکر تونسوی)، ''معتبر ایک بات'' (علی سردار

جعفری)، ''فیض احمد فیض'' (ایس فیض)، ''فیض شاعر انسانیت'' (ڈاکٹر تارا چند رستوگی)، ''فیض اور شکیب جلالی کی وفات پر'' (ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب)، ''فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور'' (کشمیری لال ذاکر)، ''یاد یار فیض'' (قدرت اللہ شہاب)، ''سرود شبانہ'' (قرۃ العین حیدر)، ''فیض صاحب'' (شاہد احمد دہلوی)، ''پھر نظر میں پھول مہکے'' (کنہیا لال کپور)، ''یادیں فیض احمد فیض کی'' (فقیر سید صلاح الدین)، ''ادبی محبتیں'' (ضیا ساجد)، My understanding of Faiz (کرنل انور احمد)،

A song for this Day (Shoaib Hashmi)

''فیض کا کلام موسیقی کے روپ میں'' (امین ارحمن)، ''نغمات فیض'' (مرزا ظفر احسن)، ''فیض مثالی ایڈیٹر'' (آئی ای رحمن)، ''مرے دل، مرے مسافر'' ترجمہ قرۃ العین حیدر (خالد حسین)، ''فیض کی تنقیدیں ریت ہوائی ہوئی'' (مظہر امام)، ''مقدمہ نقش فریادی'' (ان م راشد)، ''فیض ایک پیاری، عظیم شخصیت'' ترجمہ سید رضا کاظمی (ڈاکٹر ملک راج آنند)، ''سلیبیں مرے دریچے میں۔ ایک مطالعہ'' (ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی)، ''تاریخ اور ادب کا باہمی ربط'' (ڈاکٹر صادق نقوی)، ''فیض اور ان کے غیر ملکی معاصرین'' (پروفیسر باب اشرفی)، ''فیض اور زنداں'' (ظفر اللہ پوشنی)، ''فیض کی مقبولیت اور قبیل'' (رام لعل)، ''فیض کا مکمل مرثیہ اور ایک مکمل سوز'' (ڈاکٹر بلال نقوی)، ''فلم اور ثقافت'' (فیض احمد فیض)، ''فیض بیتی'' (ڈاکٹر خلیق انجم)، ''فیض احمد فیض'' (خواجہ احمد عباس)، ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' (مشتاق احمد یوسفی)، ''کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا آتا تھا'' (مشتاق احمد یوسفی)، ''یہ جان تو آنی جانی ہے'' (شبنم شکیل)، ''فیض خوش نوا'' (ڈاکٹر سید حرمت الاکرام)، ''فیض کے بارے میں ایک گفتگو'' (عبد اللہ ملک)، ''فیض احمد فیض باکمال شخصیت'' (ندیم ہاشمی)، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' (ڈاکٹر ایوب مرزا)، ''فیض صد سالہ یوم پیدائش'' (عابد حسن منٹو)، ''مابعد فیضیات کا سماجی، سیاسی پس منظر'' (روش ندیم)، ''غظیات فیض'' (ڈاکٹر رؤف خیر)، ''فیض کی شاعری میں صبا کی علامت'' (پروفیسر انیس اشفاق)، ''فیض کا تنقیدی رویہ'' (پروفیسر ارتضیٰ کریم)، ''چند تذکرہ، کچھ تبصرہ'' (ظ انصاری)، ''فیض احمد فیض'' (عارف نقوی)، ''شاعر حیات و

کائنات" (ڈاکٹر شوکت سبزواری)، "شخص و عکس" (سید سجاد ظہیر)، "ہماری فیض احمد فیض کی ایک نظم" (پروفیسر فتح محمد ملک)، "فیض اور خدا شناسی" (محمد اعجاز انور)، "فیض صدیقی امیں" (پروفیسر عبدالتقوی ضیاء)، "نور نور میں فیض کی آمد" (عبدالرحیم انجان)، "فتدگان خاک کا شاعر" (قاضی جاوید)، "فیض اور فلسطین" (پروفیسر حسن عباس)، "فیض میرے دوست اور جنت حیات کے رفیق تھے" (یاسر عرفات)، "فیض ایک صحافی" (ڈاکٹر احمد علی خان)۔

"فیض فہمی" میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کے چالیس سے زیادہ مضامین شامل ہیں۔ عنوانات ملاحظہ کریں۔

"ہمیں نے رنگ غم" "فیض کا زندگی نامہ" "فیض مشاہیر کی نظر میں" "فیض" "پیمبروں کا قلندر" | "فیض کی شاعری تشریح، تجزیہ، تبصرہ" "فیض کی غزل کا مقام" "کلام فیض عربی، فارسی الفاظ و تراکیب کا قلدستہ" "فیض کی نظمیں دعائیں" "ہم فیض پر فیض کا" "دیوان فیض کی دو سو تنہائی کا جائزہ" "فیض مصور نقاش قدر خان حسن" "فیض اور اختر شیرانی کی" "شاعری کا تقابلی جائزہ" "فیض اور اقبال کی محبوب یا کردہ کی مفاہیم" "فیض اور بادہ و ساغر" "فیض کے کلام میں علامتیں" "استعارہ منفرد تجزیہ" "فیض کے انتیس سو اشعار" "فیض کی تراجم" "فیض کی تخلیقات تحقیق و تنقید کی روشنی میں" "فیض منظوم ترجمہ" "پیام مشرق" "تحقیقی مطالعہ" "فیض کا ادبی مرتبہ" "عنوان" "پریم چند" "فیض کا عقیدہ" (مستند حوالوں کی روشنی میں)، "فیض کی صحبت" "یادگاریں" "فیض خطوط کے آئینے میں" "یادگار مہمان" "فیض اور مخطوطہ زیدی" (رشتہ جو موتیوں سے استوار ہے) "فیض اور نوبل پرائز" "فیض بنام اقبال عارف" (مفید، مختصر اور مستند دستاویز) "قصہ سارتر سے اختلاف رہوں یا نہ ہوں؟" "فیض کا مرثیہ امام" "فیض نے انڈیا یا انڈیا نے فیض کی قدر کی" "اے ہم سفر" "خاکے خطوط" "فیض نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا" "فیض کے ادبی نظریات" "فیض کی لغت" "شام غربت" "فیض اور ایرانی انقلاب" "جو ہم پر گزری تھی رہے" "جدول تصانیف" "تخلیقات فیض پر ایک نظر" "فیض پر مرتب و مرتبہ کتب و رسائل" "فیض پر مرتبہ خصوصی نمبر" "فیض کا خانہ بدوش" شامل ہیں۔ اس سلسلہ کی تکمیل کے تحت ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب کا پہلا مضمون پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے جنھوں نے پس ساختیاتی رویے کے حوالے سے چند تجاویز پیش کیں کہ فیض کو کیسے نہ پڑھا جائے۔ انھوں نے فیض کی مختلف نظموں کے کلیدی الفاظ اور ان کی معنوی جہات کو روشن کیا۔ سید احتشام حسین نے ''فیض کی انفرادیت'' کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''فیض نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں ناانصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردعمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان سے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی رفعت سے باہر نہیں نکل سکتے۔''

کلیم الدین احمد کو ایک سخت گیر نقاد مانا جاتا ہے وہ انگریزی ادب اور تنقیدی تصورات کے چشمے سے اردو شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انھوں نے فیض پر ایک بھرپور مضمون اس وقت لکھا جب ان کے صرف دو مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' اور ''دست صبا'' منظر عام پر آئے تھے۔ کلیم الدین احمد نے فیض کے فنی تفاخر اور ترقی پسند تحریک کے نقطہ نظر پر بہترین رائے دی ہے وہ لکھتے ہیں

فیض کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے ''نقش فریادی'' اور ''دست صبا'' کی وہ پتلی جلدیں اور بس ان دونوں مجموعوں میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ مجھے صرف فیض کی نظموں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ فیض میں دو چیزیں ہیں جو دوسرے ترقی پسند شاعروں میں نہیں ملتیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ترقی پسند شعرا، نظم کے فنی تقاضوں کا احساس نہیں اور یہی کمی ان کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دوسری چیز جو فیض میں ملتی ہے وہ ایک قسم کا خود ضبطی ہے۔ وہ اپنے کو بے قابو نہیں رہنے دیتے اور دوسرے باغی شاعروں کی طرح اپنے غموں سے آسمان کو نہیں ہلاتے۔ وہ ترقی پسندی کا مطلب یہ نہیں سمجھتے کہ بیدار ہو بیدار ہو کا شور مچایا جائے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ ''تلوار اٹھاؤ تلوار اٹھاؤ''، ''مزدور ہیں ہم'' ''مزدور ہیں ہم''، ''ایشیا چھوڑ دو!، ایشیا چھوڑ دو!، ایشیا

چھوڑ دو'' ''بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت میرا ایمان'' اور اسی قسم کی چیزوں کی یلغار کو بہترین شاعری سمجھا جاتا ہے۔ ان کی آواز جیتی ہے، وہ دبی زبان سے بات کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ افکار و جذبات کی رو میں نہیں جاتے۔ افکار و جذبات پر ضبط کی مہریں لگاتے ہیں۔''

(ص ۶۹)

ڈاکٹر سلیمان مرزا خلیل احمد بیگ نے اسلوبیات کے حوالے سے فیض کی شاعری کا جائزہ لیا ہے جب کہ ممتاز نقاد پروفیسر شاب ردولوی نے فیض کی شعری جہات و تعین قدر کے مسئلے پر بھرپور کلامیہ قائم کیا ہے۔ انھوں نے فیض کی رومانیت و کلاسیکیت کے ضمن پر بھی سوال اٹھائے ہیں ہے فیض کی غنائیت، تشبیہات اور استعاراتی نظام کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ شاب ردولوی نے فیض کی شعری تہذیب پر دلچسپ رائے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

اول یہ کہ فیض نے غزل کی غنائیت اور رومانیت کو اثر آفرینی اور دلوں میں اتر جانے کا وسیلہ بنایا ہے۔

ان کے یہاں رومانی الفاظ و تراکیب کے استعمال کا مقصد بیان عشق و محبت نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایسے پیرائے ہیں جو شعری کیف و تاثر میں اضافہ کرتے ہیں۔ دوسرے شعرا اس طرح کے پرشور الفاظ بھی استعمال نہیں کرتے تھے، یعنی وقتی تاثر سے جب وہ دیرپا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے اور کسی مخصوص وقت، موقع یا تجربے کو وقت اور مقام time and place کی حدود سے بلند کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے شعلہ و شبنم کے جانے پہچانے کلیشے سے کام لیا اور یہ فیض کا بہت بڑا اجتہاد ہے۔ دوسرے، فیض کے یہاں ایک مخصوص شعری تہذیب ہے یہ شعری تہذیب ہمیں شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ میر، غالب اور اقبال کی عظمت میں ان کی شعری تہذیب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ فیض کی بھی اپنی شعری تہذیب ہے جو ان کے کلام میں جا بجا نمایاں ہوتی نہیں بلکہ لہو کی طرح موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بھی تر و تازگی، کی طرح کی توانائی

یا جھنجھلاہٹ نظر نہیں آتی اور یہی سبب ہے کہ بعض جگہوں پر ان کی نظم کی زبان اور غزل کی زبان میں فرق باقی نہیں رہا ہے، مثلاً

آج بازار میں پابجولاں چلو ۔ یہ بند مُلاحظہ ہوں۔

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

(ص 142)

آل احمد سرور نے "فیض سے فیض تک" کے عنوان سے ان کی منتخب نظموں کا احاطہ کیا ہے جب کہ میری استاد پروفیسر سیدہ جعفر نے فیض کی شاعری کے تحت ان کی نظموں پر بحث کی ہے۔ خصوصاً ان کی تراکیب اور استعاروں پر گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ "قدیم الفاظ و تراکیب اور استعارے فیض کی شاعری میں نئی حیثیت کے امین بن گئے ہیں اور یہ فیض کا ایک شعری اجتہاد ہے۔ فیض کی نظموں کا پورا لفظیاتی نظام اُردو کی روایتی شاعری سے مستعار ہے لیکن یہی روایتی لفظیات فیض کے کلام میں اپنے سیاق و سباق اور تخلیقی استعمال کی وجہ سے نئی معنویت کا انکشاف کرتی ہے۔" عصر حاضر کے مستند و معتبر نقاد و دانشور کلیم قاسمی نے نظم گوئی میں فیض کے امتیازات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے فیض کی مختلف نظموں کا گہرائی و گیرائی سے جائزہ لیا اور فیض کے اس ذہنی و فکری تصادم کی طرف اشارہ کیا کہ فیض ترقی پسند شاعر بننا چاہتے تھے مگر ان کی لفظیات، تراکیب و استعارے انھیں کسی اور سمت کی طرف لے چلتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

فیض کی متذکرہ اعلیٰ اور اوسط درجے کی نظموں کے اس جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مزاج کے ضبط و توازن نے انھیں اکثر ایسے اور سپاٹ اسلوبِ بیان سے کس طرح محفوظ رکھا ہے۔ لہجے کے اتار

چڑھاؤ، فضا کی آفرینی کی خوابناک کیفیت، رچاؤ اور بیان کی شگفتگی نے فیض کی نظموں میں جس توازن اور فضا کو قائم رکھا ہے اسے اردو کی کلاسیکی شاعری کی بلند پایہ فنی قدروں سے تسلسل سے جوڑا اور پیوستہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اپنی مخصوص فنکارانہ اور تراکیب کے باعث فیض کا مطالعہ کرتے وقت جس تحیر اور غیریت کا احساس ہونے لگتا ہے وہ ان کی ایک مجبوری ہے جس سے وہ "نقش فریادی" اور "دست صبا" کے بعد شاعری میں اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ "نقش فریادی" اور "دست صبا" کی نظموں اور غزلوں میں بلاشبہ بعض کلاسیکی شعرا، بالخصوص غالب کی گونج سنائی دیتی ہے، مگر یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ انھی دونوں مجموعہ کلام میں فیض کی ساری شاعرانہ صلاحیتیں ہمیں رسائی آتی تھیں، اور چوں کہ ان کے موضوعات اور جذبات کا رویہ منفرد تھا، اس لیے ان کا اظہار بھی نگارشی اور فنی ہنر مندی پر تحت البیان سے اسلوب کے باوجود ترقی پسند شاعروں میں ان کا انفرادی قد نمایاں رہا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ وہ اپنے بعض بلند پایہ ہم عصر نظم نگاروں سے تنوع اور گہرائی کی وسعت تک نہ پہنچ پائے۔" (ص:257)

مشہور نقاد جناب مشتاق احمد یوسفی کا یہ مضمون بھی شامل تصنیف ہے انھوں نے فیض کی نظموں کو غزلوں کے قریب مانا ہے۔ یہ پورا مضمون "یہ کہاں سے آئے تھے" میں فیض اور ان کے فن سے یوسفی محبت کا بین اظہار ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے مضمون میں کہیں کہیں طنز و مزاح سے کام لیا ہے لیکن کہیں کہیں وہ ہاتھ سے جاتے نہیں دیا ہے۔ انھوں نے فیض کی شخصیت، ان کی شاعری سے حوالے سے نہایت عمدہ مضمون میں اپنی تنقیدی بصیرت کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

فیض سے پہلے بھی گاتے تھے۔ ان کی آواز ان کی اپنی آواز تھی۔ ان کی آواز میں تھی اور ہے تک سنائی دے رہی ہے۔ ان کا عہد ان کی آواز سے پہچانا

جائے گا۔ اس آواز نے آج کے دکھ سے نڈھال لوگوں کو کل کے لیے
جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے یہ عہد دیکھا اور امید و
درد میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنی۔ نصف صدی قبل کہی ہوئی فیض کی نظم
''بول'' ہمارے دور کا عہد نامہ ہے، جس کے الفاظ میں رجز خوانوں کے
نفس گرم کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس سخن میں عہد عتیق کی بشارتوں کا
جادو وجلال گونج رہا ہے''۔ (ص 1153)

''فیض فہمی'' میں شامل تمام مضامین پر اظہار خیال کرنا اس مختصر سے تبصرے میں ممکن نہیں ہے چوں کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی چالیس سے زائد مضامین شامل تصنیف ہیں اس لیے ان پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضامین میں فیض فیض کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف حیات فیض کے مختلف جہات کو روشن کیا بلکہ فن کے کئی ایک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے حتی کہ فیض کے اطراف کو بھی بیان کر کے ان کی شگفتہ مزاجی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی شاعری کے حوالے سے ایک مکمل اور بھرپور مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے فیض کی مکمل شاعری کو فیض کی شاعری (تشریح، تجزیہ، تبصرہ) کا عنوان دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے فیض کی شاعری پر دیگر مشرقی، مغربی شعراء کی جو چھاپ پڑی ہے انھیں نہایت دیانت داری سے روشن کیا۔ ان نامور شعراء میں میر ہو کہ غالب، انیس ہو کہ اقبال، حافظ ہو کہ خسرو، بوالطیف ہو کہ ابونواس یا پھر براؤننگ ہو کہ کیٹس یا شیلے ہو کہ ہارڈی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے فیض کے کلام کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں یہ رائے دی کہ ''فیض نے صرف خارجی اثرات کو منظوم نہیں کیا بلکہ ان تجربوں اور مشاہدوں سے پیدا ہونے والے داخلی اور قلبی جذبات کو نظم کیا ہے جس کا اثر تندہ تیز ہونے کے ساتھ ساتھ دیرپا اور بیدار رہا۔ فیض کا یہی تخلیقی عمل انھیں ایک خاص مقام اور ایک خاص لہجہ عطا کرتا ہے۔ فیض کے کلام میں افسردگی نہیں تازہ واری اور جستجو ہے۔ ان کی نظم ہو کہ غزل یا قطعہ ان سب میں جمال اور جلال کی آمیزش سے زندگی کے مسائل کی آرائش موجود ہے۔''

اردو غزل کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جب سے اسے گلے لگایا تو کسی نے اس کی زبان بندی کی وکالت کی اس کے باوجود غزل نے خود کو سنبھالا اور پروان چڑھایا۔ ترقی پسند تحریک نے نظموں کا ایسا جال بن رکھا تھا کہ غزل سارے ہوئی تھی۔ اس تحریک کے بیشتر شعراء نے جدید نظمیں لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جو بات نظم میں ہے وہ غزل میں نہیں لیکن ترقی پسند شعراء، شہرت پاتے ہی کچھ دن چار غزلیں لکھ دیا کرتے تھے یوں کہ غزل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان شعراء میں جذبی اور مجروح نے غزل کو گلے لگایا اور یہ ثابت کیا کہ نظم یہ اپنی جگہ اور غزل کی شان و شوکت اپنی جگہ۔ فیض یوں تو نظموں سے شہرت پاتے لیکن انھوں نے بھی غزلیں کہیں اور خوب کہیں۔ فیض کی غزل کائنات اسی بیسویں تک محدود ہے لیکن نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہیں۔ زاہدہ زیدی، عابدی "فیض کی غزل کا مقام" سے عنوان سے ان کی غزل کائنات کے حدود اربعہ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کلاسیکیت، رومانیت اور جدید غزل کی روشنی میں فیض کے کلام کو جانچا اور پرکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"فیض نے پرانے جاموں میں نئی شراب پیش کی یعنی قدیم روایتی ہیئتوں کو اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا۔ ان ہیئتوں میں جدید مضامین اور نئی حسیت کو داخل کیا۔ فیض نے غزل کو دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح متروک اور مسترد نہیں کیا بلکہ اسے ایک نئے لہجے سے روشناس کرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض کی شاعری میں نظم کی طرح غزل بھی بڑی بحث اور جذبہ نمایاں ہوئی۔ فیض کی شاعری نے اپنے عہد اور آئندہ آنے والے عہد کا ایک نمایاں جدید و منفرد لہجہ دیا ہے۔ فیض سے پہلے نے نسانی ذہن و تخلیق کے طریق شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی اور آج کی صدی کا ذہن فیض سے پہلے فیض کا ذہن ہی مانا جائے گا۔" (ص ۱۳۹)

زاہدہ زیدی عابدی نے غزل سے علاوہ فیض کی نظموں پر بھی اپنے مضمون "فیض کی نظمیں" میں کی ہے۔ اس سے علاوہ زیدی عابدی نے فیض کے کلام میں

نظمیں اور اسلوب میں دیانت داری کے ساتھ کلام فیض کی کمزوریوں کو بیان کیا ہے۔ فیض کی مختلف تراکیب، استعاروں کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ لفظی اور معنوی سطح پر ان میں کچھ غلط ہیں اور کچھ میں تم ہے جیسے محبت مانند، شیرازہ اسباب، شفق کی راکھ، لہکے ہوئے ایام، درد کا چاند، سب نیل مرام وغیرہ وہ تراکیب مبہم ہیں اور ناپیدا قافیہ تائید، عید وغیرہ پر اعتراض اپنی جگہ درست ہے۔ مختلف نقادوں کی جانب سے اٹھائے گئے کلام فیض پر سوالات کا بھی واکنر تقی عابدی نے جائزہ لیا ہے اور نہایت غیر جانب داری سے کی کے اعتراض کو رد کیا ہے تو کسی کی توثیق کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''فیض ایک بڑے شاعر تھے لیکن عظیم شاعر نہ تھے جن سے کوئی دبستان منسوب ہو۔ فیض اور فیض سے مربوط چند جلسوں میں اور کچھ تحریروں میں ''فیضیات'' کی اصطلاح سننے اور پڑھنے میں آئی۔ اگر یہاں فیضیات سے مراد فیض کے فن اور شخصیت پر بات چیت ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر اس کا مطلب کوئی شاعری کا دبستان ہے تو یہ بات صحیح نہیں۔''

عصر حاضر کی سب سے بڑی دین ''تنہائی اور اس کا احساس'' ہے۔ آج ساری دنیا گلوبل ولیج میں تبدیل ہوگئی ہے۔ معلومات اور آگہی کے بے شمار ذرائع میسر ہیں مگر ''تنہائی'' انسانی زندگی کا المیہ ہے۔ موبائل اور کمپیوٹر میں وہ اس قدر غرق ہے کہ وہ ساری دنیا پر نظر رکھتا ہے مگر ذاتی طور پر وہ تنہائی کا شکار ہے اور یہ تنہائی ایک بین الاقوامی نفسیاتی مرض بن گیا ہے۔ واکنر تقی عابدی نے فیض کی دولت تنہائی پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فیض کی تنہائی میں خاص قسم کی سرشاری ہے وہ اس خلوت میں تصور جاناں اور غم دوراں کے درد کی لذت سے سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے فیض کی چند نظموں سے احساس تنہائی اور اس کے سبب و پیش کیا ہے۔ فیض کی مشہور نظم ''تنہائی'' کا شمار اردو کی ایک بہترین نظم میں ہوتا ہے۔ نو مصرعوں والی اس نظم میں تنہائی کے جو مختلف رنگ و روپ دکھائے گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ نظم کے آخری دو مصرعے تنہائی اور احساس تنہائی کا نقطۂ عروج معلوم ہوتے ہیں۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

فیض کی نظم "تنہائی" پر ڈاکٹر تقی عابدی نے نہایت بلیغ تبصرہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں

یہاں دراصل خود شاعر کی قلبی واردات کا خارجی اظہار ہوا ہے۔
اس نو مصرعوں کی نظم میں مکالمہ بندی، منظر نگاری اور خوابناکی Dreaming ہے۔ دل اور خیال کی باہمی گفتگو خارجی دائروں میں نظم کا محور بنی ہوئی ہے۔ اس پوری نظم میں صنعت ایہام و ابہام سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چناں چہ ایک طرف غم جاناں میں معشوق کا عاشق کو انتظار ہے جو تصورات سے ماضی درد و پیار سے مخلوط ہے کہ رات گزر چکی ہے، اب کھویا ہوا معشوق نہیں آسکتا۔ فیض نے آخری دو مصرعوں میں اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے وصل کی خواہش سے دائروں کو متصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس نظم کا دوسرا رخ کسی غم دوراں کی ستم رسیدہ نفس دریدہ عورت ہے جو اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنا جسم بیچتی ہے اور رات کا ہیبت کا انتظار ہے۔ یہ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا احساس لیے ہوئے ہے اور رات کی منظر نگاری نے اس میں حواس خمسہ کی قوتوں سے فی الحد ہی مر تعش بنا دیا ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری روز مرہ میں اس طرح ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔" (ص:296)

پوری کتاب ڈاکٹر تقی عابدی کی تخلیقی سوچ کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر جو نکات سامنے لائے ہیں وہ ان کا تخلیقی ابتدا ہے۔ "فیض پر فیض کا ریویو" ایک دلچسپ مضمون ہے جس میں فیض کی شاعری سے متعلق خود فیض کے ان اقوال و بیانات کو یکجا کیا ہے جو مختلف خطوط و انٹرویوز میں بیان کیے گئے ہیں۔ فیض کی شاعری سے متعلق پیرو انھوں نے مضمون "فیض" مصرعہ تو ش قدمی ہے حسن" میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے فیض کی مختلف نظموں سے متعلق پیرو تاثرات۔

ڈاکٹر تقی عابدی فیض سے ذہنی مطابقت رکھنے کے باعث فیض کی شعر و ادب سے کامل تخلیقی مطابقت رکھتے ہیں۔ جیسے فیض اور اختر شیرانی، جوش اور فیض، فیض اور

مصطفیٰ زیدی، فیض اور افتخار عارف، فیض اور ایرانی انقلاب تک کہ فیض نے جن جن کتابوں سے روشنی حاصل کی ہے ان پر بھی ایک بھرپور مضمون تحریر کرتے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ فیض کی خطوط نگاری، فیض کے لطیفے، فیض سے 72 گفتگو تک، فیض پر مرتبہ کتب و رسائل اور فیض پر مرتبہ مضامین کے ذخیرے کو بھی شامل تصنیف کرتے "فیض فہمی" نے فیض احمد فیض پر ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔ ابھی گزشتہ ہفتے پاکستان سے انھوں نے اپنی نئی کتاب "باقیات و نادرات فیض احمد فیض" کی رسم اجرا انجام دی ہے۔ فیض فیسٹول کے موقع پر اس بہترین کتاب کی رونمائی پر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ "فیض شناسی" اور "فیض فہمی" کے بعد "باقیات و نادرات فیض احمد فیض" کی پیش کشی اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کو فیض احمد فیض سے کس قدر لگاؤ اور کیسی محبت ہے اور ان کے کلام کو بین الاقوامی سطح پر پیش کرنے کے لیے وہ کیا کچھ کر رہے ہیں۔ فیض کو ڈاکٹر تقی عابدی جیسا سچا محقق، مخلص نقاد اور خیر خواہ میسر آیا ہے جو فیض کے چاہنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

"فیض فہمی" کی ضخامت اور معیار و مرتبہ کے لحاظ سے قارئین کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ نہایت خشوع و خضوع سے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ ذرا سی غفلت و لاپرواہی سے کتاب ہاتھوں سے چھوٹ جانے پر ہاتھ کی انگلیوں کا زخمی ہونا لازم ہے۔

ڈاکٹر جاوید لیے کرتی مالتی وٹھل راؤ
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

فیضؔ فہمی ایک تنقیدی مطالعہ

[illegible]

ہے یہ ہیں ان کو اپنی غزلوں میں برتا ہے اور انھیں دوبارہ مقبول کر دیا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں یہ الفاظ ترک ہو چکے تھے۔ دار و رسن، قفس و نشیمن جیسے الفاظ پر ایک پورا رومانی نظام کھڑا ہوا ہے۔ ایسے الفاظ کو فیض نے دوبارہ زندہ کیا ہے۔

فیض نے جس طرح سے ان الفاظ کو استعمال کیا اپنے معنی کے اعتبار سے معتبر ہو گئے ہیں۔ فیض کی غزل میں رموز و علائم کا نظام کلاسیکی شاعری کے تخلیقی شعور کی دین ہے۔ قفس، آشیانہ، چمن، آتش گل، صیاد، گلچیں، صبا، باغبان، بلبل، بہار، خزاں، چارہ گر، قاتل، ناصح، محتسب، شیخ، منصور، قیس، اس طرح کے دیگر علامتی اظہار سے ان کی غزل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ فیض نے علامتوں، اشاروں، کنایوں کی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ ان کے یہاں تقریباً تمام علامتیں اور تمام اشارے پرانے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر انھوں نے بڑی ہی فن کاری کے ساتھ ان سے مفہوم کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ فیض عموماً وہی اشارے اور علامتیں استعمال کرتے ہیں جن کا تعلق ماضی سے ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ایک نئے مفہوم اور ایک نئے معنی کا پہلو اجاگر کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب بیان اور لہجے میں تمام تر قدامت کے باوجود نئے پن کا احساس زندہ ہے۔

ان کے اشعار کو پڑھنے کے بعد ہمیں واضح طور پر یہ بات پتہ چلتی ہے۔ فیض کی غزلوں میں عشقیہ جذبات و احساسات اور سیاسی، سماجی شعور کی ترجمانی کے علاوہ سوز و گداز کی ایک ہلکی اور مدھم لے بھی نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں و جب سوز و گداز اور درد بھری شاعری کے طور پر دیکھتے ہیں تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی بلکہ ان کے درد اور غم کے ساتھ آنسوؤں میں جگمگاتی ہوئی ایک نئی امید نظر آتی ہے۔ فیض کی غزلیں سوز و گداز سے معمور ہوتی ہیں۔ ان میں غم کا پہلو ہر جا میں نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن ایک سوز و گداز، انفرادی اور اجتماعی رنج و غم کے حساسات اور قدم قدم پر مصیبتوں کے باوجود ان کے یہاں ایک امید کا امکان نظر آتا ہے۔ جو تکلیف دہ اور مشکل ترین مرحلوں میں امید کا حوصلہ دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ان سچائیوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ جس کی زندگی اور وقت کو ضرورت ہے۔ خود ضبطی کے ساتھ بلند حوصلہ فیض کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں انفرادیت پیدا ہوئی ہے۔

ہر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

فیض تاریکی کی اونچی دیواروں سے اس پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ آنے والے کل سے انتظار میں اپنے آج کے غم اور درد کو بھول جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اور انہیں امید کی ہوئی شمع بجھتی ہوئی نظر آتی تو انھوں نے فوراً دوسری شمع پہلے سے زیادہ اعتماد اور یقین سے ساتھ جلائی ہے۔ ان حوصلے اور امید کی بھرپور نمائندگی کے اشعار،

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

•••

اب یاد میں ترا ساتھ نہیں، اب ہاتھ میں ترا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

فیض مشکل اور مایوس کن حالات میں بھی ہمت اور حوصلہ کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ اور ہر ناکامی اور مایوسی کے بعد ایک نئی امید کے ساتھ اپنی جیت کا انتظار کرتے تھے۔ یہ امید بھرا لہجہ فیض کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی پوری شاعری میں صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غزل کا بنیادی موضوع زمانہ قدیم سے عشق اور عاشقی رہا ہے۔ اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جو تخصیص اور تشخص کا متحمل نہیں۔ اس میں حسن، لطف، رعنائی اس وقت آتی ہے جب اس کو رمزیہ انداز میں بیان کیا جائے۔ غزل دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل کہلاتا ہے۔ جس میں شاعر اپنے محسوسات کو لفظوں میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کو شاعرانہ رمزیت کا سب سے امین کہا جاتا ہے۔ یوں کہ وہ اپنی بات براہ راست انداز میں نہیں بتاتا۔ فیض کی شاعری میں رمزیت اپنے درجہ کمال تک پہنچی ہے۔ اور یہی رمزیہ پہلو ان کی عشقیہ اور سیاسی شاعری کو جاندار بنا دیتا ہے۔

زخم چھلکا کوئی، یا کوئی گل کھلا!
اشک امڈے کہ ابر بہار آگیا

فیض کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت جس کا فیض محسوس ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت

یوں تو کسی خیال کے لیے مسلسل اور مربوط بیان کے لیے مفید اور موزوں نہیں ہے۔ تسلسل کے ساتھ سے غزل کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہم پہ ورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

•••

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

•••

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی[5]

"سرِ وادیٔ سینا" کی غزلوں میں تسلسل کا یہ حسن اور بھی زیادہ نکھر گیا ہے۔ فیض کی غزلوں کا ایک امتیازی وصف ان میں طنز کی شدت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل میں امکانات کی ایک وسیع دنیا ہے۔ فیض نے بھی اپنے حالات و واردات کے ہوئے کلام میں طنز کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ فیض کی غزلوں میں طنز یہ اشعار بہت موجود ہیں۔ ان میں زندگی کا حسن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ایک طرف ادبی اور سیاسی محاذ، دوسری جانب ذاتی زندگی، اسیریت اور جمہوریت کشی کا ماحول، کھل کر بات کہنے پر پابندی، یہ سب حالات ایسے تھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں اور بالخصوص غزلوں میں طنز یہ اشعار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اس کی ہے میزان بہ دست دگراں ہے

اس طرح طنز کی نشتریت کے ساتھ ہی قاری کو تیار راستہ بناتے ہوئے عمل کو پورا کرنے کی سعی پیدا ہوتی ہے۔ ان اشعار کے طنز سے قاری کو اپنی غلطیوں کا اعتراف ہوتا ہے۔ تغزل کی سحر کاری غزل کی فضا کے لیے چاشنی کا کام کرتی ہے۔ سیاسی مضامین کا بیان ہو یا ذاتی احساسات و جذبات ہر جگہ وہ تغزل کا سہارا لیتے ہیں اس طرح وہ اپنے قاری سے ذہنی طور پر بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

فیض نے سیاسی، معاشرتی، انقلابی مضمون میں بھی تغزل سے کام لیا ہے۔ اگر فیض کی سیاسی شاعری میں تغزل کی سرمستی اور سحر کاری نہ ہوتی تو شاید وہ اسی قدر دلکش اور مسحور کن نہ ہوتی۔ فیض کے اس عظیم سرمائے نے ان کی غزلوں کو اردو غزل میں ایک مقام دلوایا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی غزلوں میں وہ تمام عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں جو غزل کی صنف کو معیاری بنانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض ایک غزل گو شاعر ہیں۔

فیض کی ادبی خدمات

فیض کی شاعری کے تقریباً آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کلیات کے علاوہ نثری مضامین کے سات مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھوں نے پانچ فلمیں تخلیق کیے ہیں اور ساتھ ہی دو فلمی گیت لکھے ہیں۔ فیض کی شاعری کا آغاز 1928ء میں انجمن اتحاد کے مشاعرے میں پہلے شعر سے ہوا۔

سب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو محنت کشِ صہبا نہیں ہوتا[8]

اس شعر میں اور اس کی بعد کی شاعری میں ایک نوجوان انسان کے دل کی آرزو، خواہش، تڑپ اور جنون شباب کی داستان بیان کی گئی ہے۔ "نقشِ فریادی" میں ابتدائی دور کی شاعری شامل ہے۔ اس دور کی شاعری میں رومان پرستی کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ فنی اعتبار سے اس میں پختگی کا اظہار نہیں ہے۔ فیض اردو نظم کے ہاتھوں میں بجتے ہوئے ستار ہیں۔ لیکن تب وہ سندھ بن کے ہیں۔ اس آواز نے ان کا وجود ختم نہیں کیا بلکہ ان کو اور بھی کامیاب بنایا۔ انھیں زندگی اور اس کے مسائل سمجھنے سے مدد ملتی ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں

"فیض کی شاعری خوابوں کی مقدس آگ ہی ہے جس نے انھیں تپایا نہیں بلکہ ان کی شخصیت و توانائی اور ان کی شاعری و تب و تاب عطا کیا ہے۔"[9]

فیض کے کلام میں حسن کاری، فکر کی گہرائی اور گیرائی ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ ہمہ جہت نظر آتی ہے۔ یہ پہلے پہلے ہمیں ایک نئی دنیا سے متعارف کراتی ہے فیض کی

میں ایک کشش ہے۔ جو قاری کو مسحور کرتی ہے۔ اور سوچ کی ایک نیا فکری زاویہ عطا کرتی ہے۔ قاری کو اپنے قول فعل سے لیے جھنجھوڑتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک نئی کیفیت اور تیور چاروں ہم کو نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں (Image) م اور (oblique) زیادہ ہے۔ فیض جہاں کہ رمز کے شاعر ہیں مگر اس کے باوجود ان کا ذہن اتنا مرتب اور فنی شعور اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ وہ نہایت واضح طور پر اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض اپنا ایک اسلوب و طرز ادا رکھتے ہیں۔ ان کا دھیما دھیما سلگتا ہوا لہجہ ایک ادا کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ لیکن عوام کے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ فیض ترقی پسند شاعر تھے ترقی پسندی سے جڑنے سے بعد بھی ان کی شاعری میں نعرہ بازی نہیں نظر نہیں آتی۔ بے شک انھوں نے اپنی شاعری کے لیے ایک منفرد انداز اپنایا ہے۔ مگر اس کو خطیبانہ ہونے سے بچائے رکھا۔ ان کے کلام کے مجموعوں کا مختصر اجائزہ لیا جائے تو انھوں نے اردو ادب میں اپنی نادر تشبیہات اور استعارات سے کس قدر اضافہ کیا ہے۔ شاعری ہو یا نثر ہو ان کا لکھنے کا انداز منفرد ہے۔ ''نقش فریادی'' میں ایک رومان پرور نوجوان کے دل جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن اس میں بھی فیض کی آرٹسٹ دیدہ نظر آتی ہے۔ ''نقش فریادی'' کی نظمیں ''سوچ'' چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز ہے، سیاسی لیڈر کے نام فیض کی ایسی نظمیں ہیں جو بیانیہ اور خطیب کھردرے لہجہ کا پتہ دیتی ہیں۔ لہجے کی تلخی، کھلاوٹ، امیجری، بلیغ ترکیب، تشبیہوں اور استعاروں سے فیض کو ایک الگ مقام دلاتی ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں۔ وصل کی راحت کے سوا

اس شعر میں فیض کی رومان پروری کے ساتھ ایک نیا درد و غم بھی دکھائی دیتا ہے۔

بقول عزیز احمد:

''موضوع سخن'' فیض کی مخصوص تراکیب اور استعاروں سے سجی نظم ہے۔
جس کے یہ دو مصرعے عزیز احمد کے مطابق 1935ء بعد کی پوری نسل کا
ذہنی میلان بن گئے۔

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگین

"نقش فریادی" کے بعد فیض کو اسیری کے دوران اپنی زندگی کچھ زیادہ ہی تبدیلیوں اور تلخیوں سے گزرنا ضروری ہو گیا۔ قید کے چار سالوں کے دوران ان کی شاعری میں ایک طرح کی پختگی پیدا ہوئی۔ اسیری کے دوران لکھی گئی شاعری کی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی۔ یہاں تک کہا گیا کہ اگر فیض کو قید و بند کی صعوبتیں نہ جھیلنا پڑتی تو دست صبا میں یہ رنگ نہ پیدا ہوتا۔ "دو آوازیں" فیض کی ایک معرکہ آرا نظم ہے۔ یہ ایک طرف سے مید، مایوسی، شکست، اندیشہ اور اجالے کے درمیان مکالمہ نظر آتا ہے۔ "شام میں تیرگی طلبوں پر" جب وطنی کا درس ہے تو "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" اپنی حسن کاری سے پڑھنے والے کو "زندان کی ایک شام" اور "زندان کی ایک صبح" منظر نگاری کا معجزہ کہا جا سکتی ہیں۔

فیض کا تیسرا مجموعہ "زندان نامہ" "دست صبا" کی توسیع دکھائی دیتا ہے۔ اس کی تمام تخلیقات قید و بند کی تحریریں ہیں۔ "ملاقات" اسے روشنیوں کے شہر ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، اس مجموعے کی نظمیں ہیں۔ ملاقات ایک طویل اور عاشقی نظم ہے۔ اس نظم میں یقین اعتماد، امید کی تابانی، فیض مختلف خوب صورت الفاظ کے استعمال سے شاہکار بنا دیتے ہیں۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
(نظم ملاقات)

"نظم ملاقات" کی سطریں ان کی فنکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس طرح ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ایک عاشقی نظم ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فیض نے یہ حساس شاعری چار جدتی سے قلم بند کرے ایک نظم کی شکل میں

ڈھال دیا ہے۔ فیض کے چوتھے مجموعے کا عنوان غالب کی تراشی ہوئی ترکیب "دست تہہ سنگ" سے ہے۔ "دست تہہ سنگ" میں نظمیں، غزلیں اور قطعات موجود ہیں۔ لیکن دست تہہ سنگ کی نظمیں غزلوں کے مقابلہ پھیکی محسوس ہوتی ہیں۔ غزلیں، پابجولاں چلو، قید، تنہائی، مدت ہوئی عورت ہوئی، رقیب سے، پاس رہو، اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن ان میں قیمتی حسن کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جو ان کے پچھلے مجموعوں کی نظموں کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

"سرِ وادیِ سینا" فیض کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ اس میں لہو کا سراغ، سرِ وادیِ سینا، دعا جیسی نظموں کو فیض کی کامیابی کہا جا سکتا ہے۔ شامِ شہرِ یاراں، میرے دل مرے مسافر، سارے سخن ہمارے، (غزلیات) "نسخہ ہائے وفا غزلیات" کی ذیل میں ہیں۔

فیض کی نثری تخلیقات میں میزان (تنقیدی مضامین) صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط)، متاعِ لوح و قلم، مہ و سال آشنائی، انتخاب پیامِ مشرق، سفرنامہ کیوبا، ہماری قومی ثقافت وغیرہ ہیں۔ فیض کے مضامین کا مجموعہ میزان میں ان کا اسلوب منفرد ہے۔ اس میں فیض کے فکری زاویے صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس کے دیباچے سے واضح ہو جاتی ہے۔ یہ مضامین ایک سنجیدہ اور ذمہ دار انسان کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس میں ادب، معاشرے اور زندگی کے کئی مسائل پر تبصرہ ملتا ہے۔ ان مضامین کی تخلیق سے پہلے مصنف نے اس موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس پر غور و خوض کے بعد ہی اس کی تخلیق کی ہے۔ بقول سحر انصاری

> "روانیِ معانی کی موزوں نشست کا مسئلہ ہے۔ الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیداوار نہیں، ان کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔"

میزان میں فیض نے تنقیدی اصطلاحات، فنی تخلیق اور تخیل اور خیالات کی شاعری جیسے موضوعات میں تخلیقی سرگرمیوں کے بعض بنیادی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ میزان میں فیض کی سادہ اور پرکشش نثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ "صلیبیں میرے دریچے میں" ایک خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس میں فیض کے اسلوب کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ جب ہم فیض کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں صاف سلیس زبان آسان الفاظ کا استعمال ملتا ہے جو کہ ہر خاص و عام کی سمجھ میں آئے۔ فیض کا نظریہ یہی رہا ہے کہ نثر ایسی ہو جو بڑے بڑے

کے لیے نہ ہو بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہو۔ صلیبیں میرے دریچے میں ذیل کا منظر

"آج کل پھر جیل کی نیم بے ہوشی کا سا عالم ہے۔ دن جیسے رینگتے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ اور آشا یاد نہیں رہتا کہ ہفتے کا کون سا دن اور مہینے کی کون سی تاریخ ہے۔ خیر یہ زیست بھی گذر جائے گی۔"

فقروں سے فیض کی نثر کی شش و محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یک مشینی مشقوں سے بچے ان کی تحریری اور تقریر میں سیدھے سادے اور براہ راست اخذ ہوتے ہیں۔ جن میں زندگی کی حرارت، توانائی، روزمرہ تجربات اور مشاہدات کا عکس ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جیسے اس میں ان کا تجربہ اتنا مکمل ہے کہ وہ اصطلاحوں سے مرعوب کرنے یا علمی علم کے بل بوتے پر تقریر کرنے کے بجائے افہام اور تفہیم کی فضا میں بولتے ہیں اور بات کرتے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر مضمون ہو اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید سے نہیں بلکہ ایسے نقطے سے کرتے ہیں جس سے بحث طلب موضوع کی سمت کی سے قاری کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے۔

فیض کی شاعری صداقت پر مبنی ہے۔ ان کے قول و عمل میں مطابقت ہے۔ ان کا کلام ان کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اشتراکی نظریات سے قائل ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی قدروں کو بھی نہیں کھویا۔ نہ تو فیض نے قدیم روایات سے ناتا توڑا اور نہ ہی ترقی پسندی سے جڑنے کے بعد شعری فکر اور شیرینی کھو بیٹھے۔ وہ بات سے بات اور انسانیت سے انسان میں اور میں سے ہم کے لیے زیادہ بامعنی نظر آتے ہیں۔ فیض نے رومانیت میں سے کلاسیکیت کا اضافہ کیا ہے وہ اہم ہے سوسائٹی ہونے کے بعد بھی ان کی انفرادیت ماند نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ ان کی چمک اور تیز ہوتی نظر آتی ہے۔ فیض ایسے اشعار میں اپنی فکر اور سوچ پر کشش نثر کے ساتھ وہ اپنی انفرادیت منوانے میں کامیاب ہیں۔ فیض کی شاعری ایک روشن مینار کا کام انجام دیتی ہے اور وہ اس طبقہ اس روشن مینار سے فیض یاب ہوتا رہے اور مستقبل میں فیض یاب ہوتا رہے گا۔

حواشی:

۱ ''فیض کی غزلوں کا امتیازی وصف فیض ایک جائزہ'' اشفاق حسین | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:158]

۲ ''معتدل لہجے کی گفتار، کا غزل کو سلیقہ'' | فیض فہمی، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 376 |

۳ ''فیض کی شاعری'' | فیض فہمی، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 106 |

۴ ''فیض کی غزلوں کا امتیازی وصف فیض ایک جائزہ'' اشفاق حسین | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:162]

۵ ''فیض احمد فیض کی غزل کوئی نیا حسن'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:234]

۶ ''فیض کی غزلوں کا امتیازی وصف فیض ایک جائزہ'' اشفاق حسین | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 169 |

۷ ''فیض احمد فیض (شخصیت اور شاعری) نسیم احمد عباسی'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 183 |

۸ ''فیض کا زندگی نامہ'' ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 19 |

۹ ''فیض سے فیض تک آل احمد سرور'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 149 |

۱۰ ''فیض کی نظم صدیق الرحمن قدوائی'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 155 |

۱۱ ''فیض احمد فیض (شخصیت اور شاعری) نسیم احمد عباسی'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:382]

۱۲ ''زنداں نامہ کا سرسری جائزہ جعفر علی خاں اثر لکھنوی'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:175]

۱۳ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' ایک مطالعہ اشفاق احمد اعظمی'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:1029]

۱۴ ''فیض ایک نثر نگار سحر انصاری'' | ''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص 155 |

میر ہاشم
اورنگ آباد، مہاراشٹر

فیضؔ فہمی کے خدوخال

راقم السطور نے شاعر فیض احمد فیضؔ کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر یہ غیر معمولی تحفہ، ڈاکٹر تقی عابدی نے، اردو زبان و ادب کو پیش کیا ہے جس کے لیے اردو کے قارئین ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرنی چاہیے بلکہ مشکور بھی ہونا چاہیے۔

سید تقی حسن عابدی جن کا ادبی نام صرف عابدی ہے، دہلی میں پیدا ہوئے، حیدر آباد (انڈیا) سے ایم بی بی ایس کیا، وہاں سے ایم ایس، امریکہ سے ایف سی پی ایس، کینیڈا سے آر سی پی۔ کینیڈا میں اپنے پیشے سے منسلک رہے ہیں لیکن ان کا قیام ہندوستان، کینیڈا اور امریکہ میں بھی رہا ہے۔ گویا وہ اس اعتبار سے ہر ملک والوں کے بھی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مریضوں کا خیال رکھتے ہیں بلکہ اردو زبان کی خیر و عافیت بھی ان سے پیش نظر رہتی ہے جس کا ثبوت نہ صرف ان کی ادبی سرگرمیاں ہیں بلکہ یہ ضخیم کتاب فیضؔ فہمی بھی ہے۔ وہ مزید پچاس کتابوں کے مصنف ہیں۔

اس کتاب میں جس کی ضخامت (۱۴۴۴) صفحات کی ہے، کل (۱۹۲) مضامین مختلف ادیبوں، شاعروں، نقادوں، دانش وروں اور فیضؔ کے عقیدت مندوں کے ہیں۔ خود صاحب کتاب کے کل (۴۰) مضامین ہیں۔ (۱۹۲) تصاویر کتاب کی زینت ہیں۔ اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر تقی نے ساتھ ہندوستان سے تاہم اب پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پاکستان سے یہ غیر معمولی اہم شخصیت جناب افتخار عارف کے نام کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے یہ انتساب بالواسطہ اردو تنقید کی عزت افزائی بھی ہے اور ہندوستان پاکستان سے بھی۔

اپنے مختصر پیش لفظ میں تقی عابدی لکھتے ہیں کہ فیضؔ کی شاعری کے طرفداروں اور ان کی شاعری کے ناقدین پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اب تک نہیں ہو سکے ہیں، کی خلا کو پر کرنے کے

لیے انھوں نے یہ کتاب تالیف بھی کی ہے اور تصنیف بھی۔

ابتدا میں صاحب کتاب نے ''فیضؔ کا زندگی نامہ'' مرتب کیا ہے، جس میں ماں باپ، بھائی بہن، تاریخ و مقام کی تفصیل اور ضروری باتیں ہیں۔ فیضؔ کے والد خان بہادر سلطان محمد خاں بیرسٹر تھے اور دولت افغانستان کے سفیر بھی رہے۔ فیضؔ کی شادی لندن نژاد جرمن خاتون ایلس جارج سے ہوئی۔ شیخ عبداللہ نے سری نگر میں نکاح پڑھایا۔ فیضؔ کی والدہ نے ایلس کا نام ''کلثوم'' رکھا۔ ''دست صبا'' کا انتساب کلثوم کے نام سے ہے۔ مسلم لاء کی رو سے طلاق کا بنیادی حق مرد کو حاصل ہے۔ لیکن یہ حق بیوی کو، دولہ کو، قاضی یا کسی بھی تیسرے شخص کو دیا جا سکتا ہے، جسے ''طلاق تفویض'' کہا گیا ہے۔ مرد اپنا یہ حق تفویض نہیں کرتا۔ فیضؔ کی بیگم غیر معمولی مثال ہے، انھوں نے یہ حق بیوی کو دیا گیا تھا۔ اس طرح فیضؔ نہ صرف ایک منفرد شاعر ہیں بلکہ ایک منفرد شوہر بھی تھے۔

اس ''زندگی نامہ'' میں امرتیا پریتم کا لیا ہوا انٹرویو کا وہ حصہ بھی ہے جو ایلس کی شادی کے بارے میں ہے۔ امرتیا نے پوچھا ''یورپ اور پنجتم کا یہ ملاپ کیسا رہا؟'' اس کے جواب میں ایلس نے کہا ''دو مختلف تہذیبوں اور دو مختلف سرزمینوں کے مرد و زن جب شادی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مرد کے لیے عورت کے دیس میں رہنا آسان نہیں ہے لیکن عورت مرد کے دیس میں رہ سکتی ہے۔ نئی دھرتی، نئے ماحول کو اپنانے کی اس میں توانائی ہوتی ہے۔ مختلف تہذیب کے لوگوں کی شادی آسان بات نہیں ہے۔'' یہاں مغرب کے رہنے والے نوجوانوں کے لیے یہ ایک نکتہ فکر ہے۔

فیضؔ کی شاعری، شخصیت، نثر نگاری وغیرہ پر کوئی سو (۱۰۰) کے قریب تبصروں، ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور معتبر ہستیوں نے مضامین لکھے ہیں۔ صاحب کتاب نے فراقؔ کے مضمون ''اردو میں عشقیہ شاعری'' سے یہ جملہ نقل کیا ہے۔

> ''فیضؔ نے ایک نیا مدرسۂ شاعری قائم کیا ہے۔ انھوں نے جس بصیرت افروز احساس و خلوص اور فنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا ہے یہ اردو شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے، نئی اور قابل قدر بھی۔''

ایک جگہ اختر حامدی رقم طراز ہیں "فیض کے جتنے انسانی ذہن اور تہذیب و طریق شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی اور آج کی صدی کا دور اقبال کے بعد فیض کا دور ہی مانا جائے گا۔"

کسی نے فیض سے کہا "میں آپ کو اقبال سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔" تو فیض نے جواب دیا "نہیں بھائی ایسا نہیں ہے۔ اصل میں پندرہویں صدی کا سب سے بڑا شاعر میر ہے، سولہویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالب اور بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔"

حیدرآباد کے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ایک سوال کے جواب میں فیض کا کہنا تھا۔ "میں نے ہندوستان اور پاکستان کی یہ اس دور میں دنیا کے کئی ممالک کی قدریں ایک سی ہیں، اس لیے آج کے فنکار کو ملکی قومی و اخلاقی سے بے تعلق ہو کر، قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر سوچنا چاہیے۔" جدیدیت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فیض نے کہا "جدیدیت ایک قدم پیچھے ہے، ادب اور زندگی دونوں سے، جدید شاعری میں ابہام کی وجہ ہے۔ جس سے باعث نفسیاتی طور پر ردعمل پیدا ہی نہیں ہوتا اور شعر، شعریت اور تاثیر سے عاری ہو جاتا ہے۔ جدید شاعری دراصل Non Poeticdam کی شاعری ہے۔"

ایک مضمون میں جو فیض پر لکھے گئے ہیں بعض نقادوں نے خلوص کے ساتھ زبان کی بعض خامیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور بعض تنقیدوں کی طرف اشارے کیے ہیں، بعض نے فنی نقطہ سے ساتھ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے بالکل کاست تمام مضامین مشکل کتاب لیے ہے تاکہ فیض فہمی کا ہر گوشہ روشن ہو جائے۔ البتہ جناب ظفر اقبال کا مضمون "فیض اور فیض کی شاعری" مکمل نظر ہے۔ ان کے خیال میں "فیض کی شاعری وراثت نے شاعری کے مستقبل اور قاری دونوں کا راستہ روک رکھا ہے۔ اپنی تمام تر مقبولیت اور اہمیت کے باوجود فیض کی شاعری ایک پرانی ہے، کہانی منتہا ہے۔ دریافت کا عمل اور حیرت کا عنصر کسی شاعری کی شرط اول ہے، فیض نے دانستہ طور پر اپنی شاعری کو ان سے محروم رکھا ہے۔" ظفر اقبال صاحب کو اس کا اختیار حاصل ہے وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کریں۔ فیض کی یا میر، غالب اور اقبال کو بھی تنقید سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا

جا سکتا۔ لیکن تنقید اور تنقیص میں فرق ہے۔

محض یہ کہہ دینا کہ شاعری عیب پرتی ہے۔ گہرائی مفقود ہے، دریافت کا عمل اور حیرت کا عنصر نہیں ہے، تنقید نہیں کہلائی جا سکتی۔ فیضؔ کے پاس فکری توانائی، لفظوں کی تازگی، خیال و نظر کی وسعت، مستقبل بینی، انسان دوستی اور غم ذات و کائنات، اور دیگر خوبیاں ہیں۔ جناب ظفر اقبال نے دانستہ طور پر ان سب سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انھوں نے بقول حضرت جوشؔ ملیح آبادی "لفظ رنگ" کو "لفظ خار" سے "چھونے کا کام انجام دیا ہے۔ عابدی صاحب نے وسیع النظری کے ساتھ تمام مضامین کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے "فیضؔ فہمی" ثبوت دیا ہے۔ "فیضؔ پرستی" کا نہیں۔

"فیضؔ فہمی" کا ایک باب "فیضؔ نے انڈیا ویز" کے عنوان سے ہے۔ انڈیا ویز ولی بیس (۲۰) سال پر محیط ہیں یعنی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۴ء تک۔ انڈیا ویز لیٹر ولی بیس (۲۰) دانشور، شاعر، ادیب و نقاد ہیں۔ سو صفحات پر مشتمل یہ انڈیا ویز خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور "فیضؔ فہمی" کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس کے مطالعے سے فیضؔ کے ذہن و دل میں جھانکنے، ان کے خیالات معلوم کرنے، ان کے نظریات سے واقف ہونے اور شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بہت کارآمد ہیں۔ مذہب کے اثرات اور اس کی ادائیوں کے بارے میں فیضؔ نے کہا "مذہب کی روایتوں کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک تو صوفیوں کا طریق اظہار ہے۔ اور دوسرا رسمی انداز ہے۔ حضرت رومیؔ میرے مرشد ہیں۔" فیضؔ کی اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؔ کی طرح فیضؔ بھی رومیؔ سے متاثر تھے۔ حضرت اقبالؔ کا شعر ہے:

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

اور

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومیؔ کبھی پیچ و تاب رازیؔ

مذہب کے تعلق سے ایک اور سوال کے جواب میں فیضؔ کا کہنا تھا کہ زندگی خدا ہی

سے پیدائی ہے۔ ساری موجودات خدا ہی کی تخلیق ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں فیض نے کہا "جب میں جیل میں تھا تو قیدیوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتا تھا۔"

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ جو لوگ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں اور جو کارل مارکس کی سائنٹفک نظریات سے حامی ہیں یا جو کمیونسٹ پارٹی سے قربت رکھتے ہیں وہ سب ایک ہی ہوتے ہیں۔ فیض کے حوالے سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جانا چاہیے۔

اچھی شاعری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟ اس سوال کے جواب میں فیض نے کہا "خدا داد ہے۔ یہ صلاحیت آدمی خود پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد نظر کی وسعت ہے اور دل کی گہرائی ہے کہ اس میں کتنی جگہ ہے۔ اگر آپ اپنی ذات تک محدود رہتے تو اس میں بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے لیکن یہ محدود قسم کی شاعری ہے۔ تین دائرے ہیں (۱) اپنی ذات کا دائرہ، (۲) معاشرے کا دائرہ، (۳) ساری دنیا کا دائرہ یا ہم عصر انسانی برادری کا دائرہ۔ ماضی سے واقفیت، ہم عصر وقت کے تقاضوں سے آگاہی اور مستقبل کے بارے میں کوئی نقطہ ان میں جس قدر وسعت ہوگی، اس کے لحاظ سے تخلیق یا حقیقت کا معیار بلند اور فنی شاہکار تمام ہوگا۔"

بہر حال مختلف اور اہم سیاسی موضوعات پر فیض سے خیالات اور آئیڈیاز کو جاننے سے یہ انٹرویوز ایک خزانہ ہوں گے ہیں اور جب آپ پڑھنا شروع کرتے ہیں تو ختم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ منظوم نذرِ عقیدت پر مشتمل ہے، نمونہ چند شعر

افتخار عارف
جو فیض سے شرف استفادہ رکھتے ہیں
کچھ اہلِ درد سے نسبت زیادہ رکھتے ہیں

•••

احمد فراز
تو کچھ نہ چھوڑ کے بھی تیرے پاس ہے وہ فن
میں جس کے ہاتھ سے دولت سبھی کی ہار گئی

•••

ادا جعفری — وہ جو آبروئے چمن بھی تھا
جو نثار سرو سمن بھی تھا
جو غرور دار و رسن بھی تھا وہ چلا گیا

•••

حمید شاہین — عنان حرف و معانی سنبھالنے والا
متاع کرب و نظموں میں ڈھالنے والا

•••

فارغ بخاری — تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز

اس کتاب میں فیض سے متعلق چند لطیفے بھی ہیں۔

یہ کتاب رائٹرس سوسی ایشن لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اور طباعت لاہور کے پریس نے کی۔ کتاب پر کہیں قیمت درج نہیں ہے اور درج بھی کیسے ہوتی، یہ انمول قیمت ہے۔ کتاب آپ کسی سے مانگ کر پڑھئے اور پھر واپس مت کیجیے۔ یہ بھی ایک طریقہ کتاب کو حاصل کرنے کا ہے۔ دوسرا طریقہ ہے۔ "فنی میڈیا" امیر زا لاہور سے طلب کیجیے جس کا پتہ، فون نمبر اور موبائل نمبر کتاب پر درج ہے۔

کتاب نہایت نفیس، دیدہ زیب، خوب صورت اور قیمتی کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے میں نے کسی اردو ادبی کتاب والے خوب صورت اور قیمتی کاغذ پر نہیں دیکھا۔ پیوزنٹ بہت عمدہ ہے۔ کتابت کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

پہلی فرصت میں اس کتاب کا مطالعہ کیجیے اور آخری فرصت تک پڑھتے جائیے۔

تابش خانزادہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''فیضِ فہمی'' پر ایک نظر

اردو ادب کے جس دور میں ہم پروان چڑھ رہے ہیں وہاں اردو زبان کو ایک جیب
ت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو جیب کٹ کرانے کے بعد حاصل کی ہوئی رقم
سے پیٹ بھرتے ہیں۔ کسی بھی میڈیکل ڈاکٹر کا تعلق اردو پڑھنے یا تھوڑا بہت لکھنے سے
زیادہ نہیں ہوتا۔ ایسے میں تقی بھائی جیسا ایک میڈیکل ڈاکٹر سامنے آتا ہے جس کا اردو
دب سے روحانی عشق ہے اور اردو ادب میں تحقیق اس کے جنون کا سرمایہ ہے۔ اس
نسان اردو ادب کی بجائے اپنی توجہ کی میڈیکل پریکٹس میں صرف کرتا تو بعید نہیں کہ اب تک
حب پی ایچ ڈی ہوتا۔ لیکن یہ دیوانہ اپنی فرصت کا ہر لمحہ اور اپنی جیب سے پیسہ خرچ
رکے بھی سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب میں میر تقی میر کے مرثیوں والے مرکاتوں سے
نکال کر اپنی دنیا میں روشناس کراتا ہے، تو کبھی علامہ اقبال کی بیاضوں پر ایک تحقیقی
کتاب تصنیف کرتا ہے اور کبھی ''فیضِ فہمی'' کی شکل میں اردو ادب کے خزانوں میں اپنی
تحقیق سے معنی پرو کر اردو ادب کو مالا مال کرتا ہے۔ بکھرے ہوئے موتیوں کو ان
مالاؤں والے دھاگوں اور اپنی دنیا سے نامور لوگوں کے بکھرے ہوئے بالوں کو بھی اپنی جیب
سے خرچ کر کے جمع کرتا ہے۔ دنیائے اردو ادب سے محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ۴۰۸
صفحات کی کتاب ''فیضِ فہمی'' پر نظر پڑتے ہی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اگر فیض خود بھی
اپنے بارے میں پڑھتے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سے بہتر اور کس سے جامع
کتاب نہ لکھی جاتی۔ میرے خیال میں محترم فیض احمد فیض پر نہ ''فیضِ فہمی'' سے پہلے اور نہ ہی
''فیضِ فہمی'' کے بعد کسی کامل تحقیق تحقیق پڑھنے کی کوئی خواہش باقی رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر تقی
عابدی نے اس کتاب کے ذریعے فیض کی ذاتی، صفاتی، عملی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور

نظریاتی شخصیت کا جس تفصیل سے احاطہ کیا ہے اس کی نظیر اردو ادب میں بہت کم ملتی ہے اور اس کا کریڈٹ ڈاکٹر عابدی کی فیضؔ سے محبت کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیقانہ صلاحیتوں کو جاتا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف فیضؔ کی شاعری بلکہ شاعری کے شانِ نزول کو بڑی ہی تندہی سے رقم کیا گیا ہے۔

فیضؔ کی ذات یا ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقات پر پھبتی سے پہلے میں اپنی کم علمی کا بیباک دل اقرار کرتا ہوں۔ نہ میں فیضؔ فہمی کا دعویدار ہوں اور نہ فیضؔ فہمی پر اپنے الفاظ میں پھبتی کہنے کا حوصلہ پاتا ہوں۔ میں سر پھٹے الفاظ لکھنے کا سزاوار ہوں بھی تو اتنا کہ میں لوگوں کو فخریہ بتاتا پھرتا ہوں کہ میں اردو ادب کے اس دور میں جیتا ہوں جس میں تقی عابدی نے اپنی تخلیقات پیش کیں اور میں تقی عابدی کو ایک دوست کی حیثیت سے جانتا ہوں لیکن ان کی پہچان میرے جیسے ایک عام سے انسان کے بس سے باہر ہے۔ میرے خیال میں آج کے دور میں اردو ادب میں تقی بھائی جیسی نظیر نہیں ملتی ہے اگر آپ کو ملے تو مجھے بتائیں۔ میں تقی بھائی کے ساتھ ان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ پروردگارِ عالم تقی بھائی کو اور ان کی کاوشوں کو تادیر سلامت رکھے۔

بیدار بخت
(ٹورنٹو)

تقی عابدی کی نئی کتاب ''فیضِ فہمی''

ٹورنٹو میں اردو ادب سے تعلق کی آبادی اتنی ہی ہوگی جتنی ہندوستان یا پاکستان کے کسی چھوٹے سے صوبے کی۔ اس چھوٹی سی آبادی میں اردو ادب کی خدمت کرنے والی تنظیمیں قائم ہوئی ہیں کہ میں تو ان کا شمار بھی بھول گیا ہوں، مگر یہیں چند ایسے لوگ بھی ہیں جو تن تنہا ادب میں ایسے کارنامے سرانجام دے رہے ہیں کہ جس کی داد ہندوستان اور پاکستان سے ادیب اور دانشور بھی دیتے ہیں۔ ان چند لوگوں میں آپ سے تقی عابدی بھی ہیں۔ میں ''آپ سے'' یوں ہمہ بانوں بن رہا ہوں کہ وہ خود کہتے ہیں۔ مجھے کہنا چاہیے ہمارے تقی عابدی بھی ہیں۔ مجھے ایک غیر متعلق شعر یاد آیا۔ جب یاد آیا ہے تو آپ بھی سن لیجیے۔ سید محمد جعفری بہت دن بعد حیدرآباد میں عندلیب شادانی سے ملے، جو نہ صرف فارسی کے عالم اور تاریخ کے بڑے ادیب تھے بلکہ ایک اچھے طرز کے شاعر بھی تھے۔ سید محمد جعفری نے ان سے مل کر یہ شعر پڑھا

عندلیب شادانی تیرا دم غنیمت ہے
تیرے بعد سے میرا نام پوچھنا غنیمت ہے

میں نے ابھی کہا کہ تقی عابدی تن تنہا کارنامے سرانجام دیتے ہیں، یہ نہیں کہ کارنامے خاموشی سے سرانجام دیتے ہیں، اس لیے خاموشی کا شمار ان کے عیب میں نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تو خاموشی سے سوتے بھی نہ ہوں گے۔ اب یہی دیکھیے نا، اردو فیضؔ پر کتاب ترتیب دینا چاہتا تو فیضؔ پر لکھے ہوئے جن مضامین کا انتخاب اس میں شامل کرنا چاہیے تھا وہ مضامین جمع ہو جاتا کہ فیضؔ کا قرض ادا ہو یا نہ ہو، ہمارے تقی عابدی کو تو بہ بانگ دہل یہ کہنا چاہیے

یہ جنوں کی جس سے ہمدے کوئی بڑھ کر

ہمارے گھر میں ایک کھانا پکانے کی انگریزی کی ضخیم کتاب ہے India Cook Book، اس کے پشتے پر کتاب کے نام کے نیچے لکھا ہے 1.9Kg، وزن کرنے پر پتا چلا کہ کتاب کا وزن یہی ہے۔ جب تقی عابدی نے اپنی نئی کتاب "فیض فہمی" مجھے بھیجی تو یہ دیکھنے کے لیے کہ کتاب میں کیا کچھ چھپا ہے، میں نے پہلے ہر صفحہ کو پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ میں عام طور سے کتاب بائیں ہاتھ میں رکھ کر پڑھتا ہوں۔ لولی چوتھائی کتاب دیکھنے کے بعد میری کلائی دکھنے لگی۔ تب آرام سے کرسی پر بیٹھ کر میز پر کتاب رکھ کر ورق گردانی جاری رکھی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ India Cook Book کے پشتے پر کتاب کا وزن کیوں درج ہے۔ میرے خیال میں "فیض فہمی" کے پشتے پر یا تو اس کا وزن 3Kg لکھنا چاہیے، یا یہ تنبیہ چھپنی چاہیے، "اگر آپ کی کلائیاں نازک ہیں یا خدانخواستہ آپ کو بواسیر کا عارضہ ہے تو یہ کتاب آپ کی صحت کے لیے مضر ہو سکتی ہے۔"

خیر یہ تو تفریح کی باتیں تھیں۔ اس کتاب کے بارے میں، میں مشورے دیتا ہوں اگر آپ کو فیض اور ان کے کلام میں دلچسپی ہے تو آپ کے کتب خانے میں ان کے شعری مجموعوں کے علاوہ اس کتاب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تقی عابدی نے بہت سلیقے سے فیض پر لکھی ساری کتابوں کا مطالعہ کر کے مضامین کا ایسا انتخاب کیا ہے جو فیض کی مدح میں بھی ہیں اور قدح میں بھی۔ فیض کے بہت مصاحبے شائع ہوئے ہیں۔ ان سب کو اگر آپ ایک نشست میں پڑھنے کی کوشش کریں تو نیند آجائے گی۔ تقی عابدی نے فیض کے سارے مصاحبوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ تکرار خارج کر دی ہے اور موضوع کا تسلسل بھی قائم رکھا ہے۔ کوئی ایک سو صفحے کا یہ مجموعہ میں نے ابھی تک پورا نہیں پڑھا، مگر جتنا پڑھا ہے اس میں لطف آگیا۔ تقی عابدی نے صرف مضامین جمع کر کے ہی کتاب تالیف نہیں کی، بلکہ اس میں ان کے خود کے لکھے ہوئے ۴۲ مضامین بھی ہیں، جن میں سے ایک یہ سو صفحے کا مصاحبوں کا مجموعہ بھی ہے۔

کتاب خوب صورت چھپی ہے۔ ہر صفحے پر ہلکے شنگرفی رنگ کا Watermark فیض کے کئی میں سے ایک بے رنگوں کی شکل میں ہے۔ "فیض فہمی" فیض کی بے شمار رنگین اور کالی سفید تصویروں، اور بہت سی پینٹنگز سے مزین ہے۔ کتاب کی ناپ اور کتابوں سے

ہوئی ہے۔ غرض یہ کہ "فیضِ فہمی" ایک کافی فیملی کتاب کی طرح خوب صورت ہے، مگر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے پڑھا بھی جائے۔ کتاب اردو ادب کی دو بڑی ہستیوں سے نام معنون ہے، ایک ہیں جناب گوپی چند نارنگ اور دوسرے جناب افتخار عارف، ہمارے لیے یہ افتخار کی بات ہے کہ گوپی چند نارنگ صاحب کی محفل میں جلوہ افروز ہیں۔

اس کتاب میں تقی عابدی نے لکھا ہے۔ "کلام خالق اور مخلوق کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک غلطی سے پاک ہے اور دوسرا خلل سے پرے۔" میں نے "فیضِ فہمی" ورق پر پہلے سے ہی بھانپ لیا ہے۔ اس خیال سے کہ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اسے آسمانی کتاب کا درجہ دے رہا ہوں، میں اس کتاب کی دوسری صفات کا بھی ذکر کرتا چلوں جن کا شمار میری ناقص رائے میں نقائص میں ہو سکتا ہے۔

ہماری پرانی ادب میں کتاب کے مصنف کا نام بغیر القاب و آداب کے لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ نثر کی ادب میں اب بھی رائج ہے۔ خدا جانے کب سے، مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا ہے کہ مصنف اپنے نام کے ساتھ القاب و خطابات بھی لکھنے لگے ہیں۔ "فیضِ فہمی" میں بھی مصنف کا نام "سید تقی عابدی" لکھا ہے۔ اگر سب نہیں جانتے "تقی عابدی" کون ہیں تو صفحہ ۱۰ پر ان کے بارے میں پوری معلومات درج ہیں۔ "وہ میں ہے، فیضِ عم" کے نام سے ان کے بارے میں ان کی ایک بہت مفید، بلکہ ضروری تحریر بھی ہے۔ یہ بھی تو وہ ساتھ ساتھ بھی نہیں ہوتے، جیسے جانے والے جاتے ہیں۔ فیضِ عم کا بھی تو یہی کہنا ہے۔

"فیضِ فہمی" میں تقی عابدی کا ایک بہت مفید مضمون "فیض کے کلام میں غلطیاں اور اس کی وجوہات" کے عنوان شامل ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ان سب مضامین و نقاد کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے فیض کے کلام پر اعتراض کیے تھے۔ اس مضمون کے مفید ہونے کے باوجود اس کے پڑھنے میں بعض وقت یہ ہوتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کا تعین نہ کر پانے پر تقی عابدی کے بجائے ان اعتراض کرنے والوں کے معترضین کے بارے میں ہیں ہیں ہیں ہیں ہیں ہیں ایسے الفاظ درج ہیں جیسے "اعتراض کیا ہے۔" "سید تقی عابدی" یا "مقتل کا ہیں غلط فہمی کا ہیں ہو جائیے۔ تقی عابدی"

قوسین میں لکھے ہوئے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقی عابدی خود بھی خلش

آتر لکھنوی ہو گئے ہوں، اس لیے کہ لہجہ مربیانہ ہو گیا ہے، اور اعتراض سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ "اعتراض صحیح ہے" کی بجائے "یہ لکھتے کہ" مجھے اس اعتراض سے اتفاق ہے" تو بات وہی رہتی مگر جملے سے مربیانہ لہجہ دور ہو جاتا۔ تقی عابدی خود اپلا ئیڈ سائنسٹ ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ادب کی بات تو دور رہی سائنس کے مفروضوں کے بارے میں بھی اتنے یقین سے اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر فیض کا یہ شعر لیتے ہیں

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

اس شعر پر جعفر علی خاں کا اعتراض ہے "دکھوں کا بہت یا کم ہونا کیا؟ بہت کی جگہ کوئی بہتر لفظ ہوتا۔" تقی عابدی اس اعتراض کو درست مانتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ لفظ "بہت" کے بہت معنی ہیں۔ اور آپ مجھ سے ہیں کہ "اگر آپ بیمار نہ ہوتے تو میں آپ کو کھانے پر بلاتا۔" اس کے جواب میں کہتا ہوں "میں بہت بیمار بھی نہیں ہوں" یہاں میں نے لفظ "بہت" فیض کی طرح "کچھ یا" کے معنوں میں استعمال کیا۔ ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بڑا ایسے لادوا نہ تھے۔ یہ تو روزمرہ ہے، اس میں میں نقص کیوں نکالی جائے؟ اتنے اچھے شعر کو فرسودہ قاعدوں کی رو سے کیوں رد کیا جائے؟

بر سبیل تذکرہ، ایسا لگتا ہے کہ تقی عابدی نے جعفر علی خاں کا مضمون شاہد ماہلی کی کتاب "فیض احمد فیض، عکس اور جہتیں" سے لیا ہے۔ اوپر لکھے ہوئے شعر کے بارے ایک ہی جملے میں جو دو غلطیاں شاہد ماہلی کی کتاب میں ہیں، وہی تقی عابدی کتاب میں بھی در آئی ہیں۔

کتاب میں غیر ضروری اضافے بھی ہیں۔ مثلاً کی فہرست کے بعد ایک فہرست ڈاکٹر سید تقی عابدی کے مضامین کی بھی ہے۔ اسی طرح کتاب کے آخر میں "فیض کے مضامین کا ذخیرہ" کے عنوان کے ذیل میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ ان اندراجات سے کتاب کا حجم تو بڑھ جاتا ہے، مگر اس کی افادیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اب جب میں نے اس کتاب کو زینی کتاب ثابت کر دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اسے صرف حاتم میں سجانے کے لیے نہیں لیں گے۔

میں صدق دل اور نہایت خلوص سے تقی عابدی کو ایسی جامع اور خوب صورت کتاب کی تصنیف و تالیف پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اب جب انھوں نے یہ کتاب شروع کر دی ہے تو ان کی توجہ دوچار اور منزلوں کی طرف بھی دلاتا چلوں۔ یہ سال مجاز کا بھی ہے، جن کی پیدائش ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہے۔ اگلا سال میر انیس کا ہے، اور اس سے اگلا سال جعفری کا، اور پھر دو سال بعد یعنی ۱۹۱۳ء اختر الایمان کا۔

خدا کرے تقی عابدی کا قلم یونہی رواں دواں رہے۔

پروفیسر بیگ احساس

فیضؔ فہمی

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بحیثیت محقق اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔ وہ مسلسل تحقیقی کام کر رہے ہیں اور اردو تحقیق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کا نیا کارنامہ ضخیم تحقیقی کتاب ''فیضؔ فہمی'' ہے۔ اقبالؔ، انشاؔ اللہ خاں انشاؔ، مرزا دبیرؔ، میر انیسؔ، غالبؔ اور تعشقؔ لکھنوی کے بعد فیضؔ کی سوانح سالگرہ کے موقع پر انھوں نے فیضؔ کی طرف توجہ دی ہے۔ سید تقی عابدی جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں۔

۱۴۲۴ صفحات کی اس کتاب میں انھوں نے فیضؔ کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ فیضؔ ہمارے عہد کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کا نام اقبالؔ کے بعد اور جوشؔ و فراقؔ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے فیضؔ کا نام ہمارے عہد کا شناخت نامہ بنتا جا رہا ہے۔ فیضؔ ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری پر ان کے سینئر نقادوں نے لکھا، ہم عصر نقادوں نے لکھا اور نئی نسل کے نقادوں نے بھی لکھا اور توقع ہے ہماری آنے والی نسلیں بھی فیضؔ کی شاعری میں اپنے زمانے کی معنویت تلاش کریں گی۔

''فیضؔ فہمی'' کو ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف کے نام معنون کیا ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں فیضؔ صاحب سے کافی قریب رہ چکی ہیں اور فیضؔ فہمی کا ثبوت اپنی علمیت کے ذریعہ فراہم کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے مختلف موضوعات پر ۱۶۲ مضامین کا انتخاب کیا جس میں خود ان کے ۴۰ مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی ان چالیس مضامین پر اپنی ایک کتاب ترتیب دے سکتے تھے لیکن ان کا مقصد فیضؔ پر ایک مکمل

کتاب پیش کرتا تھا۔ اس کتاب میں فیض پر لکھے گئے تمام اہم مضامین شامل ہیں اردو کے تقریباً مشاہیر ادب کے مضامین بلا کسی تعصب اور گروہ بندی کے صرف معیار اور افادیت کی بنیاد پر جمع کیے گئے ہیں۔ فیض احمد فیض کے حالات زندگی ابتدا میں اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے فیض کی زندگی پر مضامین کم ہیں۔ فیض کی ایلس جارج سے شادی کے موقع پر جو معاہدہ ترتیب دیا گیا وہ چونکاتا ہے۔ مجھے اس معاہدے کی رو سے اور متذکرہ شادی کے پیش نظر فیض احمد فیض اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایلس جارج سے شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد فیض کی صورت میں کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کریں گے۔ فیض احمد فیض اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ مسلمانی قانون کے تحت طلاق کا حق میں ایلس جارج منتقل کرتے ہیں۔

''نسخہ ہائے وفا'' (ضیا ساجد) اور ''فیض فہمی'' (ڈاکٹر خلیق انجم) کے علاوہ انشائیوں اور فیض کی زندگی سے ان کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ''جو میرا آشنا رہا ہے'' (فیض کے خطوط بنام فرنسز قبال کے نام) ''دامن یوسف'' (تاثراتی تجزیہ) سید قمی عابدی نے فیض کی زندگی کے نئے پہلو سامنے لائے ہیں۔ فیض کے ان ۵۵ سے زائد خطوط کو اہمیت حاصل ہے جو اقبال اور مس ایمیلیا نائٹ کے خطوط کو حاصل ہے۔ فیض کے فی انشائیوں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ سب سے خاص چیز فیض کے ''انشائیوں (۲۹ انشائیے، ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک)'' ہے۔ اسے قمی عابدی نے بڑی خوب صورتی سے ترتیب دیا ہے۔ اس میں ان تمام شخصیتوں کے خاکے ہیں جنھوں نے فیض سے انشائیے لیے تھے۔ ڈاکٹر قمی عابدی نے شخاص کے نام، تاریخ، روزنامہ جریدہ، مقام، عنوان اور دیگر تفصیلات کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ جو تحقیقی دیانت داری کا بین ثبوت ہے۔ فیض نے جو تقریریں کی ہیں انھیں بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ ایسا کام جو کسی مجموعے میں نہیں وہ بھی موجود ہے۔

قمی عابدی نے ''فیض مشاہیر ادب کی نظر میں'' کے عنوان سے ۸۲ فنکاروں کی فیض احمد فیض کے بارے میں رائے اکٹھی کی ہے۔ ان میں شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے دیے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ''یا کی ۸۲'' میں سے کالم رہتا ہے۔

لفظ ''پھولوں کا گلدستہ'' کھنتا ہے۔ اس طرح تقی عابدی نے ''فیض سے بہتر (۷۲) ادبی نثر'' بھی جمع کیے ہیں۔ تقی عابدی نے یہ انفرادیت برتی کہ یہ نثر فیض کی شاعری سے نہیں بلکہ نثر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ''شبستاں'' ۱۹ اگست سے فیض نمبر میں ۲۷ نثر شاعری کی صورت میں ہیں۔ تقی عابدی نے کلام فیض سے عربی، فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ بھی بنایا ہے۔ فیض کی غزل پر چھ مضامین اور نظموں پر چار مضامین اور نثر نگاری پر ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ فیض کی شاعری پر دس مضامین ہیں۔ فیض پر پس ساختیاتی مضمون، ان کی انفرادیت، اسلوب، تعین قدر، نظریات، لسانی پہلو، امتیازات، رومانیت، فکر، معیاتی نظم، علامت نگاری، روایتی انداز، ادبی میلانات، انسانیت، آدرش، غیر ملکی معاصرین، فلم اور ثقافت، جیل کی زندگی، نظمیات، تنقیدی رویہ، ٹیٹے اور صحافت پر مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں پر بھی علاحدہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ''نقش فریادی'' پر دو، ''دست صبا'' پر دو، ''زندان نامہ'' پر تین، ''دم کے خمبر کے اجنبی'' پر ایک، ''مرے دل مرے مسافر'' پر ایک، ''سر وادیٔ سینا'' پر ایک، ''صلیبیں مرے دریچے میں'' پر ایک مضمون شامل ہے۔ فیض کا تقابل مختلف شاعروں سے بھی کیا گیا ہے۔ ایسے مضامین میں غالب اور فیض (وزیر آغا)، غالب، جوش اور فیض تین آوازیں، تین لہجے'' (محمد علی صدیقی)، ''فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں'' (سید تقی عابدی)، ''کون بڑا، جوش یا فیض'' (تقی عابدی)، ''فیض اور مصطفیٰ زیدی'' (تقی عابدی) قابل ذکر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، مالک رام، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور انتظار حسین کے مضامین بے حد مختصر ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مضمون نغمات فیض میں ان تمام غزل کے فنکاروں کے نغمے اور نام درج کیے گئے ہیں جنھوں نے فیض کا کلام اپنی آواز میں پیش کیا۔ فیض پر مرتبہ کتب اور رسائل کی مکمل فہرست دی گئی ہے۔ جو ایک بڑا کارنامہ ہے۔ فیض کے اس مجموعے میں کتنی غزلیں اور نظمیں و قطعات ہیں ان کے اعداد و شمار بھی موجود ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے مضامین کی ترتیب میں کون سا طریقہ اپنایا اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں نہ تو حروف تہجی کے اعتبار سے مضامین یا مصنفین رکھے گئے۔ نہ موضوعات کے

اعتبار سے نہ تقدیم اور تاخیر کا خیال کیا گیا۔ ہوسکتا ہے انھوں نے مضامین سے معیار و ملحوظ رکھا ہو۔

فیض کی صد سالہ تقریب کے سلسلے میں جو بے شمار قومی و بین الاقوامی سیمینار کیے گئے ان میں بیش قیمت مضامین بھی پڑھے گئے۔ ممکن ہے وہ کتابی صورت میں شائع بھی کیے جائیں گے۔ لیکن ان تقاریب کے موقع پر سب سے قیمتی، کارآمد اور بہترین تحفہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پیش کیا ہے۔ جب تک اردو باقی رہے گی ہماری نسلیں اس اہم دستاویز سے استفادہ کرتی رہیں گی۔ فیض احمد فیض کے بارے میں اس سے جامع و قیع کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور نہ مستقبل میں اس کی توقع ہے۔ میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر جمال نقوی

تقی عابدی کی فیض فہمی

فیض احمد فیض اردو کے وہ عظیم شاعر ہیں جنھیں غالب کی طرح دنیا سے عدم توجہی کی شکایت نہیں رہی۔ کیوں کہ انھیں ان کی زندگی میں بھی بہت سی چاہتیں ملیں اور اب ان کے انتقال کے بعد بھی ادبی دنیا میں فیض صدی تقریبات اسی پیمانے پر منائی جا رہی ہیں۔

فیض کے پہلے مجموعہ کلام "نقش فریادی" نے دلوں پر وہ نقش ثبت کیا جس کی روشنی آج بھی باقی ہے۔ ۱۹۴۰ء سے آج تک ان کی شخصیت فن کے بارے میں ہر سنجیدہ اور جونیئر ادیب نے اپنی رائے تحریر کرنے میں فخر محسوس کیا ہے۔ "فیض فہمی" کے اس سفر میں سرحدیں اور رکاوٹیں آڑے نہیں آسکیں۔ اردو دنیا کے ہر خطے نے انھیں اپنا جانا اور یہی حال فیض صاحب کا بھی تھا۔ اس لیے جہاں وہ اپنے ملک کے مزدوروں، کاڑی بانوں اور پوسٹ مینوں کے لیے فکر مند رہتے تھے، وہیں ایرانی طلبا، فلسطینی مجاہدین اور افریقیوں وغیرہ کے لیے بھی انھوں نے آواز کو بلند کیا ہے۔ اور قلم کو استعمال کیا ہے۔ اس صورت حال کو ان دو مصرعوں میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

کہیں بھی خلق ہو، اس دل پہ چوٹ پڑتی ہے
بس اس لیے کہ مرا ربط کائنات سے ہے

فیض صدی تقریبات کے موقع پر جہاں ساری ادبی دنیا میں سیمینار اور کانفرنس منعقد ہوئیں، فیض میلے ترتیب دیے گئے اور ان کے فن اور شخصیت کے پس منظر میں مصوری کے مقابلے منعقد کیے گئے، وہیں ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں مصنفین نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف و تالیف کیں، بہت سے جرائد نے خاص نمبر ترتیب دیے اور میرے علم کے مطابق ہندوستان نے اس سلسلے میں اولیت حاصل کی، جہاں جنوری میں ہی

علی مسلم یونیورسٹی میں ایک فیض عالمی سیمینار منعقد ہوا اور ایک ادارہ "سمت" نے بھی قریب میں اور میرا ایف حسین کا بنایا ہوا فیض کیلنڈر شائع کیا۔ اس سے علاوہ ایک ہندی جریدہ "نیا پتہ" نے خصوصی فیض نمبر شائع کیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صدیقی کا تصنیف و تالیف کردہ ضخیم "فیض فہمی" صوری اور معنوی کے علاوہ اپنی ضخامت کے اعتبار سے ان سب پر بھاری ہے۔ ان سے اس تحقیقی کارنامے میں ۱۹۲ مضامین شامل ہیں جن میں سے ۴۲ مضامین صرف ان سے تحریر کردہ ہیں۔ اپنے ان مضامین کے بارے میں خود انہوں نے تحریر کیا ہے کہ یہ وہ مضامین ہیں جن پر کام یا اصلاح نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اس تصنیف میں مضامین کی اصلیت، حوالوں کی صداقت، ثابت کی صحت اور طباعت کی غلطیوں کا خاص خیال رکھا ہے تاکہ اس خوب صورت تخلیق کو خراب فن میں نہ جانچیں۔ اس سے پہلے چوالیس کی چھ تصنیفیں روشنی میں آئی ہیں جن سے پہلے انہوں نے متوجہ کرانے کی گزارش کی ہے تاکہ آئندہ اشاعت ان اغلاط سے پاک رہے۔

میں ہمیشہ یہ کوشش رہتا ہوں کہ جس کتاب کے بارے میں کچھ عرض کروں پہلے مکمل طور پر اس کا مطالعہ کر لیا جائے تاکہ میری ہی ہوئی بات حقیقت پر مبنی ہو۔ ۲۲۴ صفحات کی اس کتاب میں اس مختصر عرصے میں مکمل طور پر نہ پڑھ سکا۔ لیکن جتنا پڑھ پایا ہوں اس میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین اور انکشافات کے علاوہ بھی بہت سے مضامین ایسے ہیں جو میری دسترس میں نہیں آ سکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ "فیض فہمی" کی اشاعت میں ان کا مقصد یہ مستند تاریخی تصنیف و تالیف تھی جس سے عام اور خاص دونوں مستفید ہو سکیں اور یہ کتاب محققین، تحقیقین اور طلبا کے لیے سود مند اور معاون ثابت ہو۔ انہوں نے اس کو ثابت کر دکھایا ہے۔ ان کے بقول اس تصنیف میں تصانیف کی تعداد، ان کی اشاعت، قطعات، بیت، غزلوں اور ان میں شامل اشعار کی تعداد بھی شامل ہے۔ ان سے علاوہ ان کے تراجم، ڈرامے، تقریظیں، تحریریں، تقریریں اور خطوط کی تفصیلات سے فیض پر مرتب مضامین، کتب، رسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

۲۱ تصنیفات کی تفصیل دیتے ہوئے ان کی وقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ۳۰

تصنیف میں سے زیادہ تر کتابیں ایسی ہی ضخامت اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہیں جس سے ان کی اہمیت اور ادب میں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ یقیناً فیض کی اس بات پر عمل کر رہے ہیں کہ "ہم پر ورش لوح و قلم کرتے رہیں گے"۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ارادوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

پروفیسر عبدالستار روداوی

فیضؔ فہمی

خواتین وحضرات!

اس سے قبل کہ میں فیضؔ یا "فیضؔ فہمی" کے بارے میں کچھ کہوں، میں ڈاکٹر صاحب کی محمد شعبہ اردو کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے مجھے اس یادگار تقریب میں نہ صرف شریک ہونے کا موقع دیا بلکہ صدارت اور کلیدی خطبہ "فیضؔ فہمی" کی رونمائی کی بھی عزت بخشی۔ بیسویں صدی میں اقبالؔ کے بعد فیضؔ اردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت ایک پہلو دار شخصیت تھی، وہ اگرچہ بنیادی طور پر شاعر تھے مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ انھیں عالمی منظر نامے میں فکری و سیاسی اعتبار سے بھی رہنمایانہ حیثیت حاصل تھی اور ان کے اولین اور فکری حلقہ احباب میں انھیں معتبر حاصل تھا، ان کے اس اعتبار نے جو پہلو دار تقاضا عالمی سطح پر ہماری زبان اردو اور اس کے ادب کو بھی وقار بخشا۔

انیسویں صدی میں میرؔ اور غالبؔ اور بیسویں صدی میں اقبالؔ اور فیضؔ کی جو معنویت ہے، وہ ہندوستانی ادبیات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور ہندوستانی ادبیات کے پس منظر میں ان کی اہمیت و اس شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ فیضؔ ہی کے ایک دوست اور رفیق کے ساتھی سومناتھ صاحب نے لکھا کہ میرؔ، غالبؔ اور پھر اقبالؔ اور فیضؔ کی جسمانی ہندوستان کا کوئی دوسرا شاعر نہیں مرتا۔ میرے خیال میں مذکورہ چار ناموں کے ساتھ اندر ناتھ زیورؔ کا نام بھی شامل ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زیورؔ اپنی تمام تر شاعرانہ عظمت اور فکری بلندی کے باوجود ایک محدود علاقائی زبان کے شاعر تھے اور اقبالؔ اور فیضؔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی امین اردو کے شاعر تھے اور اردو بین الاقوامی ترسیل (Mass Communication) کی زبان ہے۔ جس نے مختلف

علاقوں، مختلف تہذیبوں اور اس کے بولنے والوں میں رہا اور قوم بنیا اور جو متحدہ اور غیر متحدہ ہندوستان کی قومیت کا استعارہ رہی ہے۔ اردو جہاں بھی کسی متحدہ قومیت کی علامت یا Symbol تھی۔ وہ بہت سوں کی یا مادری زبان تھی یا پھر تہذیبی زبان تھی۔ اردو شمالی ہندوستان میں عموماً مادری زبان تھی، لیکن پنجاب میں اگر یہ مادری زبان نہیں تھی تو تہذیبی یا ثانوی زبان تھی۔ پنجاب، دلی، لکھنؤ اور عظیم آباد سے بعد اردو کا مرکز تھا۔ اردو سے اسی تہذیبی مرکز سے اقبال اور فیض دونوں کا تعلق تھا اور انھیں وہ شاعروں کے حوالے سے عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کی شناخت قائم ہوئی۔

اقبال اور فیض میں بہت سی مماثلتیں ہیں۔ دونوں کا تعلق پنجاب سے ہے۔ دونوں کی تعلیم انگریزی اور عربی میں ہوئی اور دونوں عربی سے استفادہ رہے۔ دونوں کی شاعری میں وطن کی محبت، تحریک آزادی کی خوبو اور انقلابی آہنگ ہے۔ مگر اقبال بنیادی اعتبار سے فکر ساز ہیں اور فلسفیانہ مزاج رکھتے ہیں، فیض نے بھی وطن کی محبت اور تحریک آزادی سے جیسے شعروں میں نغمہ گاتے ہیں، لیکن اقبال کی بلند آہنگی اور فلسفیانہ مزاج کے برعکس ان کی شاعری میں نرمی اور گداز ہے۔ اقبال اپنے تمام تر فکری اور فنی امتیازات کے ساتھ آسمان ادب کے شہاب ثاقب ہیں، اور فیض، اقبال سے نہ صرف سب فیض حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کے فکر و فلسفہ سے، ان کے فن سے عملی طور پر نہ ہی فکری طور پر متاثر ہیں۔ چنانچہ اقبال کے انتقال کے بعد اقبال پر اپنی درد ناک نظم یا شخصی مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں، خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اقبال اپنی زندگی ہی میں لیجنڈ (Lagend) بن چکے تھے اور اقبال کی شاعرانہ و فلسفیانہ عظمت کو سمجھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، "مخزن" کا ۱۹۳۲ء اقبال نمبر سے اس کا

آغاز ہوا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اقبال فہمی کا یہ سلسلہ اقبال کی شعریت، اس کی آفاقیت، مشرق و مغرب کے فلسفوں سے ان کے رشتے اور موضوعات میں متن کی دلکشی میں اقبال فہمی کا راز پوشیدہ ہے۔ فیض فہمی بھی بیسویں صدی کے ایک شاعر کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس سلسلے میں بمبئی سے شائع ہونے والے انجمن رسالے "فن اور شخصیت" کی اپنی ایک اہمیت ہے، جس نے ۱۹۸۴ء کے قریب اپنا فیض نمبر شائع کیا۔ فیض پر فن اور شخصیت کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے متعدد رسائل نے اپنے خصوصی نمبروں سے فیض و فیضان عقیدت پیش کیا اور اس طرح فیض فہمی کا آغاز ہوا۔ ہمارے آج کے مہمان اور میرے دوست ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کتاب "فیض فہمی" جس کی رونمائی ابھی ہوئی۔ اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ اس سے قبل دہلی کے رسالے "شبستان" کا فیض نمبر بھی ایک دستاویزی تھا۔ اسی طرح میرے بزرگ اور مرحوم ناظر حسن صاحب نے اپنے رسالے "ادب و کتاب" کے گزشتہ کسی شمارے میں ایک حصہ فیض کی شاعری اور فن کے لیے مختص کیا تھا۔ اس سلسلے کی ان کی دوسری کتاب مرزا ناظر حسن کی ایک دوسری کتاب "خون ان کی شہید" تھی۔ فیض کی شخصیت اور فن و سخن کے لیے ان کی مقبولیت کے پیش نظر شمالی ہندوستان اردو ادب کی ایک بڑی تعداد ہے اور مختلف رسائل میں، اخبارات میں ہفت روزہ رسالوں میں مضامین اور نوٹس کی صورت میں مضامین کا ایک انبار ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "فیض فہمی" اس سلسلے کی ایک دستاویزی کتاب ہے۔

اردو زبان و ادب گزشتہ نصف صدی سے ہندوستان میں سکڑتی رہی، مگر اس کی مقبولیت میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی اور اردو کے تاریسن جن دو جہاں بھی گئے اپنی زبان و ساتھ لے گئے اور اس کی زلفیں سنوارنے اور اداؤں پر بھی اس کی مشاطگی کرتے رہے۔ بھارتیہ [illegible] جہاں "()" اور "^" بول پر ہی تنقید میں شاعری ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں اردو ادب، شاعری، فسانہ اور تحقیق میں عام دلچسپی کی جا رہی ہے۔ اردو کی ترقی و اشاعت کے سلسلے میں محدود پیمانے پر ہی سہی یہ کام ہو رہا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں بھی اس میں پیش پیش ہیں اور یہاں کی یونیورسٹیوں میں محدود زبان و ادب اور تحقیق کا بھی یہ کام ہو رہا ہے، جس کی ایک مثال ڈاکٹر تقی عابدی ہیں۔ ایک عرصہ تک [illegible] انگلینڈ

قریشی، احمد علی، عزیز احمد اور شان الحق حقی جیسی قد آور شخصیات نے کینیڈا میں رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے، تحقیق اور درس و تدریس کے سلسلہ میں ایک ممتاز شخصیت پروفیسر عبدالرحمن بارکر کی تھی جن کا کتب خانہ علمی و ادبی دنیا میں بہت شہرت رکھتا تھا جو ان کے انتقال کے بعد ملیشیا میں محفوظ ہے۔ بارکر صاحب نے ابو الدین صدیقی مرحوم کے اشتراک سے اردو شاعری کا انتخاب مرتب کیا، اردو ادب کی مختصر تاریخ لکھی اور غیر اردو داں حضرات کے لیے نصابی کتابیں مرتب کیں۔ مذکورہ جن شخصیات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ساری شخصیتیں اردو، انگریزی اور سماجی علوم سے تعلق رکھتی تھیں، جو اردو سے عشق کرتی تھیں اور اردو درس و تدریس ان کی پیشہ ورانہ ذمہ داری تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی حیثیت ذرا مختلف ہے، وہ پیشہ کے اعتبار سے ایک ماہر امراض قلب، سرجن اور Pathologist ہیں۔ اور طبی موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھتے ہیں، لیکن اپنی مادری زبان اردو اور اس کے ادبی تہذیبی ورثے سے ان کی شغفت غیر معمولی ہے۔ اردو زبان و ادب سے یہ دیوانگی انھیں ہر لمحہ بے چین رکھتی ہے۔ وہ اردو کے شاعر ہیں اور بلند پایہ محقق بھی ہیں، وہ بیک وقت غالب شناس بھی ہیں اور انیس شناس بھی، غالب کے کلیات فارسی کو انھوں نے مدون کیا ہے۔ یہ کام تجزیاتی نوعیت کا ہے، جس میں غالب کے فارسی کلام کے تحقیق متن کا تعین کیا گیا ہے۔ یادگار انیس میں انیس کا فکر انگیز مطالعہ ہے۔ تجم آفندی کا کلام دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ عشق لکھنوی پر ان کی تحقیق و ترتیب حوالہ جاتی ہے اور "چوں مرگ آید" اقبال کی بیماری کا سائنسی، طبی تجزیہ ہے جس نے آخر کام تمام کیا۔ مذکورہ دستاویزی کتابوں کے بعد فیض صدی کے موقع پر وہ "فیض فہمی" کے ساتھ اردو ادب کے افق پر نمودار ہیں۔ اس کتاب میں اندازاً ۱۲۰ مضامین ہیں جن میں اندازاً چالیس مضامین فیض احمد فیض کی شخصیت، شاعری، فن، ان کے تنقیدی شعور اور مکاتیب اور نثر نگاری پر ہیں، یہ سب جوے شیر لانے سے کم نہیں۔

''اردو ٹائمز'' کینیڈا

1997ء

معروف محقق شاعر ادیب مصنف
ڈاکٹر تقی عابدی کے لیے عالمی مجاہد اُردو ایوارڈ

عالمی شہرت یافتہ معروف محقق شاعر ادیب اور مصنف ڈاکٹر تقی عابدی کو اردو زبان کی بیش بہا اور لازوال خدمات کے اعتراف میں عالمی مجاہد اردو ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ انجمن جامعہ علیمیہ اسلامیہ کے وزیر محمد اشرف فاطمی نے دیا۔ اس تقریب میں محترمہ نرملا دیش پانڈے (ایم پی) نجیب زیدی، پروفیسر اختر نے ڈاکٹر تقی عابدی کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف کرایا اور کہا کہ ''سید الجبیں جدید پر روز آپ نے گزشتہ بیس سالوں میں تیس سے زائد علمی ادبی اور تحقیقی تصانیف دیے اردو کو پیش کی ہیں اور آپ کی فنی اہمیت میں اس ہزار سے زائد اردو کی کتابیں ہیں اس طرح آپ مستقل اردو سے جدید جہد میں مصروف ہیں۔''

اس موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''ہم دنیا کے کسی ملک میں بھی چلے جائیں اپنی زبان اردو اپنی تہذیب و ثقافت کو فخر سے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں کسی اجنبی دیار سے۔'' انھوں نے کہا کہ ''یوں تو مجھے دنیا کی مختلف سے ایوارڈ ملے ہیں لیکن یہ پہلی بار سلطنت اردو سے متعلق ملنے والا ایوارڈ ہے جسے ایوارڈ کمیٹی نے عالمی مشاعرے کی خدمت سے فائز کیا ہے۔'' ڈاکٹر فیاض نے اپنے صدارتی پروگرام کی صدارت ڈاکٹر عابدی نے کی۔

عدیل صدیقی

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شاندار ادبی محفل

معززین شہر کی شرکت

ویسے تو سید تقی عابدی صاحب میڈیکل ڈاکٹر ہیں، لیکن ان کے اندر چھپا ہوا انسان ایک اچھا شاعر، شاندار ادیب اور ایک بہترین محقق ہے۔ ان کی لائبریری کو دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ ان کی کمائی اور دولت کا بیشتر حصہ ان کتب کی خرید میں خرچ ہوتا ہے۔ ان کی لائبریری میں ایسی ایسی نادر کتب کا خزانہ ملا جو کم از کم کینیڈا میں نایاب ہے، غالب کے ہاتھ سے لکھے اور پینسل خطوط اور دو صد سالہ پرانی انگریزی کی ڈکشنری قابل تعریف خزانہ ہے۔ ہندو مذہب پر اردو زبان میں 11 کتب فارسی کے نایاب نسخے اسلامی کتب شعراء کے نایاب دیوان اور خود اپنی درجنوں تصانیف ثابت کر رہی ہیں کہ ڈاکٹر تقی عابدی ہمارے دور کے غالب سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور باشعور دانشور ہیں مجھے فخر ہے کہ میں ان کے دوستوں میں شامل ہوں۔ اتوار 23 اکتوبر کو یہ ادبی نشست ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔ محترمہ معروف شاعر جناب الطاف حسین حالی کی پڑپوتی ہیں۔ آپ خواجہ غلام سیدین کی بیٹی، مولانا آزاد یونیورسٹی کی سابق چانسلر اور متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

16 سال سینیڈا میں بھی رہ چکی ہیں اور اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی البرٹا کینیڈا سے لے چکی ہیں۔ حقوق زنان کی علمبردار اپنے پردادا سے بے انتہا متاثر ہیں، جنھوں نے دو صد سال قبل ماں، بہن اور بیٹیوں کے لیے بہترین شعر کہے تھے۔ محترمہ نے حالی کے اشعار کو نہ صرف انگریزی بلکہ رومن میں بھی شامل کیا ہے تاکہ اردو نہ جاننے والے بھی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں۔ کیوں کہ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید ہندوستان سے ہیں اور بالی وڈ میں

روزانہ ایک اردو ہندی کی فلم بنتی ہے لہٰذا اسکرپٹ اور گانے رومن میں لکھے جاتے ہیں۔

اس خوب صورت محفل میں ادیب شعراء، موسیقار، سیاستدان، فنکار، فنکاران، ناقدین اور ہر شعبہ فکر کے لوگ موجود تھے۔ انور قمر عابدی کے ایک سوال پر اداکارہ نے اردو میں اپنے فیورٹ پر ایک خوب صورت نظم سنائی، جب کہ موسیقار نیل رضا نے اپنے والد کے مجموعہ کلام میں سے چند نظمیں سنائیں۔ سابق مغربی پاکستان اور نوائے وقت کے معروف شاعر جناب کرامت غوری نے بھی خطاب کیا۔ صدارت کے لیے قونصل جنرل جناب عمران صدیقی کو چنا گیا تھا۔ جنہوں نے اپنے مختصر خطبہ صدارت میں اچھی باتیں کیں۔ اوارتھا لہٰذا اس ادبی محفل کو بادل نخواستہ رات ۱۱ بجے ختم کرنا پڑا۔ ادارہ ایکسپریس نیوز جناب قمر عابدی صاحب اور اس بہترین ادبی نشست منعقد کرنے پر ادارہ سے تعلق رکھنے والے معززین کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور مسلسل ایسی محفل سجانے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی دوسری تصنیف
''اظہارِ حق'' کی رسم رونمائی

''اظہارِ حق'' غیر مطبوعہ مراثی فرید لکھنوی،
شمالی امریکہ سے شائع ہونے والی پہلی ضخیم کتاب

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی تدوین اور ترتیب کے بدولت میر انیس کے پڑپوتے جناب سلطان صاحب فرید لکھنوی کے غیر مطبوعہ مراثی، سلام اور رباعیات ایک ضخیم کتاب کی شکل میں ٹورنٹو کینیڈا سے شائع ہوئے اور گزشتہ ہفتہ اس کتاب کی رونمائی انجام پائی۔ کتاب کا پہلا نسخہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر حسن رضا کو پیش کیا اور دوسرا نسخہ ڈاکٹر حسن رضا نے خلیل الرحمن کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پیش کیا۔ ''اظہارِ حق'' فرید لکھنوی کے غیر مطبوعہ 15 مراثی، 15 سلام اور 36 رباعیات کے مجموعہ کا نام ہے۔ خوش نما گرافک پریس ٹورنٹو سے شائع کیا گیا یہ ضخیم کتاب بڑے سائز پر اور 726 صفحات پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر عابدی نے بڑی تفصیل سے فرید لکھنوی کے فن شاعری پر گفتگو بھی کی ہے۔ فرید لکھنوی بہار انیس کے آخری پھولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ محفل میں موجود مہمانِ انیسیات اور صاحب تصنیف نے اس کتاب کی اہمیت پر جمالی گفتگو کی۔

طاہر احمر
''اردو منہ''

29/ نومبر 2004ء

دوستی کا آبشار نیاگرا فال

ہم جب سے گزشتہ دنوں کینیڈا میں نیاگرا فال کی زیارت کر کے آئے ہیں۔ ہمارے ہر جاننے والے، ملنے والے آبشار کا ذکر سن سن کر ہمارے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں۔ ہر شخص ہم سے آبشار کی روداد سننا چاہتا ہے۔ ہر ایک کا اصرار ہے کہ ہم اس آبشار کے بارے میں کچھ لکھیں۔ اسی کالم میں ہم نے ایک بار آبشار کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت ہم نے آبشار کی عابدی سے مدد لی تھی اور ان سے پہلے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی آبشار کا ذکر کیا ہے۔

تو پہلے ہم نیاگرا فال کی یہ کا سنئے پانی جو مظلوم کی آنکھ کا آنسو، شفق سے گلاس کا صاف شفاف پانی، شبنم، بادل، بھاپ، اولے، برف، گلیشیر، بارش، جھیل، سمندر اور دریا ہے، آبشار بھی ہے اور آبشار بھی نیاگرا فال۔ دریائے نیاگرا پر جب جھیل ایری کا پانی جھیل انٹاریو میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے گرتا ہے تو وہ ایک دلکش آبشار بن جاتا ہے۔ ہزاروں صدیوں سے گرتا گرتا یہ پانی آتشی سنگلاخ چٹانوں کو خاطر میں لائے بغیر برسوں قدرت کی خوش نقش اور دلکش کاریگری کا بے حد خوب صورت اور نادر روزگار مظاہرہ بنتے دیکھنے کے لیے سال بھر دنیا بھر سے سیاح یہاں آتے رہتے ہیں۔ اصل میں قدرت نے اس کی آبشار کو صرف دیکھنے کی چیز نہیں بنایا۔ اس کا مقصد دیکھنے والی آنکھوں کے ساتھ ساتھ سننے والے کانوں کو بھی محظوظ کرنا ہے۔ یہاں نیاگرا فال سے گرتے ہوئے پانی اور آتشی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر بہنے کے شور میں جو موسیقی ہے اسے سننے کے لیے بھی لوگ دور دور سے طوفانی سیلابی لہجوں کا نہیں آنے والی مشکل بات نہیں۔ اقبال کا یہ فارسی شعر شاید اس منظر کی عکاسی کر سکے۔

ہمت عالی تر از دریا بجوش
تا چہ سامان خاطر تر دامن شبنم بہ تست

ان گنت صدیوں سے جاری و ساری اس آبشار کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ

وہ حقیقتاً ملکوں امریکہ اور کینیڈا کے ساحلوں کو بیک وقت چھوتا ہوا گزرتا ہے۔ اسے امریکی اور کینیڈین سمتوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آبشار دو ملکوں کی دوستانہ سیاحت اور جغرافیائی سائنس کی علامت یا حقیقت بن چکا ہے۔ ہم سوچتے رہے کہ اگر اس طرح کا کوئی آبشار کسی جگہ میں ایشیا یا افریقہ کے دو پڑوسی ملکوں کی سرحد پر ہوتا تو ان کے سیاسی ماہرین یا لیڈر اسے بڑی مہارت سے سیاسی بین بازی اور دونوں ملکوں کے درمیان نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کرتے رہتے۔ ایک ملک کے سیاسی شاطر کہتے کہ یہ آبشار اور جھیل ہماری ہے اور دوسرے ملک کے "عوامی نمائندے" اور لیڈر دعویٰ کرتے کہ یہ آبشار ہمارا ہے اور اگر ہم برسر اقتدار آئے تو ہم اسے فتح کر کے اپنے ملک کا حصہ بنا لیں گے۔ خدا کی زمین پر نیلے آسمان، تیرتے ہوئے بادلوں، پر پھیلائے ہوئے بین الاقوامی سرحدوں سے بے خبر اور بے نیاز اڑتے ہوئے پرندوں، سورج کی روشنی، ہواؤں، خوشبوؤں اور بچوں کی معصومیت کی طرح پرکشش دو ملکی سرحدوں پر وہاں یہ آبشار نفرت اور جنگ کا محور بن چکا ہوتا مگر چونکہ یہ آبشار دو متمدن اور مہذب دوست ملکوں کی سرحدوں پر واقع ہے اس لیے یہ ان کی باہمی دوستی اور امن کی علامت بنا ہوا ہے۔ آج تک کسی لیڈر نے اپنے سیاسی مقصد یا قومی عزت کے لیے اس کا نام تک نہیں لیا اور اس کے برعکس یہ دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان امن، تعاون اور بھائی چارہ کا ہمہ گیر نغمہ بنا ہوا ہے۔ دوستی اور انسانیت کا نشان یہ آبشار سب کو اپنی طرف بلاتا ہے اور اسے قریب سے دیکھنے والے امریکی بھی ہیں اور کینیڈین بھی۔ وہ یہاں آ کر تمام امن پسند سیاحوں کی طرح سیاسی سرحدی شرائط پر عمل تو کرتے ہیں لیکن ان کے چہروں پر کسی طرح کی نفرت یا غرور کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ایک ساتھ اس آبشار کی گرجتی ہوئی طاقتور دھاروں کو دیکھتے۔ قریب کے بنچوں پر یا ریستورانوں میں بیٹھ کر کافی یا چائے سامنے رکھ کر گھنٹوں نیچے کے اس ارضی حسن اور وقت کا گرجتا ترانہ سنتے رہتے ہیں۔

کیا تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کے لیے اس منظر میں کوئی سبق نہیں؟ کیا ایشیا اور افریقہ کے غریب لیکن ابھرتے ہوئے ملک عقل سے اس قدر کورے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے دریاؤں، جنگلوں اور صحراؤں پر اپنا حق جمانے کے لیے نفرت، جنگ اور خوف کے ہتھیاروں کے استعمال کو ضروری سمجھتے ہیں۔ عوام کے حقوق اور ترقی کا ڈھول پیٹنے والے

لاپنی سیاستدان تو ایسے آبشاروں کی طاقت اور بجلیوں کی لہروں کو اپنی انا کے لیے استعمال کرتے ہیں اور خدا کی مشتِ زمین کے اس مشتِ کہ تخت پر قبضہ جمانے کے لیے آگ اور خون کے آبشار بہاتے گراتے ہیں۔

اب ڈاکٹر نظر کی مشہور علمی شخصیت ڈاکٹر تقی عابدی کا۔ ہم اپنے میزبان اور نرجن معصیات انصاری صاحب کے ساتھ ان سے ملنے گئے تو ہم نے ڈاکٹر صاحب کے بڑے سے خوب صورت گھر میں شاعروں اور اہل ذوق کی محفل جمی ہوئی پائی۔ پہلے تقی عابدی صاحب نے ہمیں اپنی شاندار ریسرچ لائبریری دکھائی اور اردو کے نادر قلمی نسخوں اور کابرین ادب سے متعلق اپنی ریسرچ سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس لائبریری میں اکابرین اردو مثلاً میر تقی میر، اسد اللہ غالب، میر انیس اور علامہ اقبال کے ایسے قلمی نسخے ہیں جن پر اہل علم کی نظر نہیں پڑی اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا کہ انھوں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہے کہ ان کے سارے علمی خزانے کو ڈاکٹر نظر کی لائبریری کے لیے وقف کر دیا جائے۔ ہم وہاں کئی بار مدعو کیے گئے ہیں اس لیے ہم تو بڑے شوق اور تجسس سے غالب، میر، اقبال، انیس اور دوسرے قلمی نسخوں کو دیکھتے بعد آنکھوں سے چومتے رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی ان پرانے میں اردو کے ان کابرین پر ریسرچ کا جو کام کر رہے ہیں اسی وجہ سے چراغ جلا رہے ہیں۔ وہاں کی محفل مشاعرہ کا ذکر پھر کسی لیے خیر ہو گی۔ جہاں اتنے شاعر جمع ہوں وہاں مشاعرہ ہونا لازمی ہے۔

سید انجم گوہر
''اُردو میٹ'' ٹورنٹو
30/جون 2005ء

عظیم الشان سہ روزہ اُردو کانفرنس 2005ء

(زیر اہتمام..... ''اُردو ٹائمز'')

ٹورنٹو کینیڈا میں پرستارانِ اُردو ادب کا فقید المثال اجتماع

17/جون بروز ہفتہ شمالی امریکہ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کا تاریخ ساز دن تھا۔ اس دن اُردو ادب کے پرستاروں نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اپنی زبان کی فلاح اور بقا کے لیے گلستانِ اردو میں نئے پودے لگانے کا عزم کیا اور یہ بھی عہد کیا کہ ہم اُردو ادب کے قدیم درختوں کی حفاظت کریں گے۔ اس کی جڑوں کو سوکھنے نہیں دیں گے اور ہر اس سازش اور وار کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے جو اُردو کے شانوں کو قلم کرنے کی ناپاک آرزو رکھتا ہے۔

میں جب ''اُردو ٹائمز'' کے بیورو چیف طارق خواجہ کے ہمراہ اپنے دیگر ادب دوست شخصیات ڈاکٹر مظفر وارثی، منیر صدیقی، امین حیدر، حمید اللہ خان، رحمت خان، خرم، محترمہ ڈاکٹر عطیہ قادری اور محترمہ حسینی کے ہمراہ 9:45 ایسٹ پر جا رہا تھا جس کی منزل کینیڈا کا شہر ٹورنٹو تھا۔ دوران سفر اردو کا مستقبل میری نگاہوں کے سامنے رہا۔ میں کبھی پرامید تو کبھی ناامید ہوتا رہا۔ ہر انسان کو اپنی ماں سے پیار ہوتا ہے اور زبان اس کی ماں ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا فرد بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آشیانے پر برق گرنے والی ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خوف کے پیچھے ایک عزم بھی کارفرما ہوتا ہے۔ یہی وہ عزم تھا جو ہمارے دلوں میں کارفرما تھا۔ 11 گھنٹے کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد شہر ٹورنٹو کا وہ ہوٹل ہماری نگاہوں کے سامنے تھا جس میں عظیم الشان سہ روزہ اُردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔

15 سیٹوں پر مشتمل سفید رنگ کی وین اور "اردو زبان" کی پہچان کو پارک کرنے کے بعد 10 افراد پر مشتمل قافلہ ہوٹل کے مین گیٹ سے داخل ہو گیا۔ سامنے ڈاکٹر تقی عابدی اپنے مخصوص انداز سے شیروانی میں ملبوس تیز تیز چہل قدمی کر رہے تھے۔ "جلدی چلیے کانفرنس شروع ہو چکی ہے" سب سے پہلے جو پرجوش آواز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی وہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تھی۔ ہمارے سامنے مرحلہ سامان کے حصول کا مسئلہ درپیش تھا۔

طارق خواجہ مسلسل اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہم بس افراد جس میں دو خواتین بھی شامل تھیں، سامان کے انتظار میں تھکے ہارے کھڑے رہے۔ آخر کار ہماری حالت زار پر منتظمین کو رحم آ ہی گیا۔ اب ہمارا رخ اپنے کمروں کی جانب تھا۔ تھکے ہارے ہم سب اب اس پنڈال کی طرف چلے جہاں کانفرنس کا افتتاح کیا گیا تھا۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شروع ہو چکا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کر رہے تھے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب عہد حاضر میں اردو ادب کے لیے ایک بڑا اثاثہ سرمایہ ہیں جو سرزمین ہند پر اردو ادب کو سرسبز کرنے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے کوششیں جوان ہیں۔ یہاں امید کی یقین کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہمیں اپنے ایمان کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہم یا ں زندہ ہو جائیں، یہ مسائل زندہ زبانوں کے نہیں ہوتے۔ جو زبانیں مر جاتی ہیں ان کے مسائل نہیں ہوتے۔"

سنسکرت پر وہ عالمی کانفرنس نہیں کرتا۔ ہندوستان میں اردو مسائل ہیں۔ پاکستان میں علاقائی اور دوسرے معاشرتی مسائل ہیں۔ ہمارے اوپر کانفرنس کا مقصد سچ ثابت ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے ایمان کو تازہ کرنا پڑتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زبان پر فخر کریں۔ یہ اس زبان کی خوبی نہیں ہے، یہ ہمارے اس کا وجہ پڑھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ زبان سے ادب پارے تخلیق کرتے ہیں، زبانیں کسی سے پیدا ہونے سے وجود میں آتی ہیں اور زبانیں کسی کے ختم کرنے سے ختم نہیں ہوتی ہیں۔

اس کانفرنس سے مہمان خصوصی پاکستان سے نامور محقق جو شہر اپنی سے تشریف لائے تھے۔ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیقی مضامین، مقالات اور تصنیفات ہمارے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے

اپنے مختصر خطبہ میں جو ارشادات کیے وہ موجودہ غیر یقینی حالات کے مکاس تھے۔ چند ایسے نکات پر روشنی ڈالی جو روزمرہ زندگی میں اردو سے حوالے سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس اجلاس کی بارعب نظامت ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کر رہے تھے۔ تقی صاحب کی آواز پنڈال میں گونجتی رہی۔ آواز کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ چہرے کے تاثرات بھی نمایاں ہوتے تھے جن میں آنکھوں کا استعمال غالب تھا۔ اس اجلاس میں اردو کانفرنس کے خدوخال اور تعارف کا ایک ابتدائی خاکہ بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمان عبد جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن زبان و بیان کے معاملے میں دلچسپی رکھتے ہیں، نے استقبالیہ کلمات کہے۔ تقریباً تمام مہمانانِ گرامی نے اردو کی نئی بستیوں کو آباد کرنے کے لیے اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں نئی تجاویز پیش کیں۔

ان مقررین میں وہ نامور ہستیاں بھی موجود تھیں جو بلاشک و شبہ اپنی ذات میں مکمل دبستان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کے قلم کی نوک سے ایسے عظیم اور منفرد ادبی شہ پارے تخلیق ہو چکے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ نثر، نظم، دونوں اصناف سخن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ان قلم کاروں کی دسترس سے باہر ہو یا ان کے فہم و ادراک سے خالی ہو۔ ان شخصیات میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس، عطاء الحق قاسمی، شان الحق حقی، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر مظفر فاروقی، محترمہ شکیلہ رفیق، ڈاکٹر عبداللہ، منیر سامی، نیئر جہاں آپا، شاہدہ حسن، ریحانہ روحی، عزیز قریشی، علی احمد فاطمی، رخسانہ علی عابدی، زاہد علی خان، عاشور کاظمی اور ڈاکٹر زیبا میمن شامل ہیں۔

افتتاحی اجلاس میں شکریہ کے کلمات اپنے مخصوص انداز میں جناب خلیل الرحمن جو ''اردو نامہ'' کے پبلشر ہیں، نے ادا کیے۔ انھوں نے وقت کی ضرورتوں میں اردو کے مقام کا ذکر کیا اور اپنے ادارے کی خدمات پیش کیں۔ خلیل الرحمن نے اس موقع پر پھر اپنا عزم دہرایا کہ وہ اور ان کے ساتھی ''اردو نامہ'' کے زیر اہتمام اس طرح کی ادبی محفلیں سجاتے رہیں گے۔ انھوں نے تمام حاضرینِ اردو کانفرنس اور دور دراز سے آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کیا۔ خلیل الرحمن نے ایک موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''آج کی تقریب کے اصل دولہا ڈاکٹر تقی عابدی ہیں۔ اگر یہ کینیڈا میں نہیں ہوتے تو

اتنی شاندار اردو کانفرنس کرنا ہماری بس میں نہیں تھا۔"

اردو کانفرنس مختلف اجلاسوں پر مشتمل تھی۔ ہر اجلاس اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اجلاس میں پڑھے گئے مقالے اور ان کی زبان فصیح و بلیغ عبارت سے مرصع تھی۔ مقالوں میں ادا کیے گئے بعض جملے نثر کی مانند دلوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ مقالہ نگاروں نے خیالات سے اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کو چونکا دیا۔ یہ اجلاس استقبال، تعارف و تعزیت، ادبیات اور جدید روایات، غالبیات، صحافت اور عصری تقاضے، قبائلیت، نعت اور ادبیات، اردو زبان کے ترویجی اور ترسیلی مسائل، ترقی پسند تحریک کی ادبی خدمات، اردو کی نئی بستیوں کے مسائل، اردو فکشن، مرثیہ میں ادب کے ارتقائی اقدار، خواتین کا اردو ادب کی ترقی میں موثر کردار پر مشتمل تھے۔ اختتامی اجلاس، محفل غزل اور محفل مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

ہندوستان سے آئے ہوئے نامہ قریش جو اردو ادب کے درخشاں ستارے کی مانند روشن اور تابناک ہیں۔ مختلف اجلاس میں ان کے ارشادات نہ صرف قابل سماعت تھے بلکہ تحقیقی فکر اور شوق کے آئینہ دار تھے۔ انھوں نے کہا کہ "اردو کا ماضی بہت روشن تھا۔ تخیل کی بلندی کی وجہ سے یہ عالمی زبان ہے۔ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا حال بے حال، اردو کا نظام خطرناک موڑ کی طرف جا رہا ہے۔ 50 سال سے زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ 1962ء سے 82ء تک ماسکو، بخارا اور تاشقند میں اردو پڑھائی جاتی تھی۔ غیر ملکی زبانوں میں 80 فی صد طلبہ علم انگریزی لیتے ہیں۔ ان میں اردو زبان کا بول بالا ہے۔ جرمنی اور جیسے ملک میں جہاں اردو پڑھائی جاتی تھی اب ویرانی کی فضا ہے۔"

ہندوستان سے آئے ہوئے ایک اور عالمی ادیب و پروفیسر علی فاطمی نے مختلف اجلاس میں صدارت اور شرکت کی۔ انھوں نے عہد حاضر کو اردو کے لیے برے وقت سے تعبیر کیا۔ انھوں نے مشترکہ طور پر اردو کے تہذیبی و ادبی تحفظ پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ "اردو ترقی اور جدید بنانے کی ہے۔ اب اس کا سفر شمالی امریکہ کے شہروں کی طرف ہے جس کی ایک مثال آن لائن کی یہ تنظیم انجمن کانفرنس ہے۔ محترمہ یہاں جو سینئر میں ہیں۔ وہ مسلسل اپنے عمل میں رہتے ہوئے اردو کی بے لوث خدمت کر رہی ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "یہ اردو کی آپا ہیں۔ یہ ہم سب کی آپا ہیں۔" آپا یہ جہاں نے کہا کہ "جہاں تک اردو کی ترقی اور بقا کا تعلق ہے، ابتدا میں سب سے بڑی ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔ یہ ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں سے اردو میں بات چیت کرے۔ زبانیں قوموں کے درمیان پلوں کا کام کرتی ہیں۔" انھوں نے کہا "جو کام ہم سب انجام دے رہے ہیں، اس کے لیے دیوانگی اور جنون عشق ضروری ہے۔" نسیم اختر جو نیویارک سے تشریف لائی تھیں، انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ "تنگی مٹانے کے لیے طوالت کبھی کبھی ضروری ہو جاتی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "زبان کے معاملے میں میرا موقف ڈاکٹر ہیوڈ میتھیوز سے ملتا جلتا ہے۔ زبان صرف انہی دو صفتوں میں زندہ رہتی ہے۔ ادب کیسے پیدا ہو رہا ہے اور وہ عوام میں کتنا مقبول ہو رہا ہے۔ اچھا ادب پیدا ہو رہا ہے یا نہیں، تصنیف اور تالیف کا کام جاری ہے۔ فلموں کی دنیا سے لے کر دل کی دنیا تک اردو زبان جاری ہے۔ یہ مومن کی زبان ہے، یہ یقین کی زبان ہے۔ بعض علاقوں میں انحطاط کا معاملہ ہے، بعض مقامات میں سورج کی طرح روشن ہے۔ کون جانتا ہے کہ کینیڈا میں رہنے والی ڈاکٹر تقی عابدی 20 سے 30 کتابیں لکھ دے گا۔" علامہ اقبال کے مصرعے سے انھوں نے اپنے خیالات کا اختتام کیا۔

"پیوستہ رہ شجر سے، اُمید بہار رکھ!"

اس کے بعد تقی عابدی نے ایک عظیم شخصیت کا تعارف کرایا کہ "ہمارے شہر کی شان، آن اور بان جناب محترم شان الحق حقی صاحب، میں نے بہت عرصے بعد جناب شان الحق حقی کو دیکھا تھا۔ میرے تصور میں جو ان کی تصویر تھی وہ اس سے قطعی برعکس نظر آئے۔ ان کی کمر کا خم زمین کی طرف اور ان کی بزرگی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کی شان آج بھی ان کے دم سے ہے۔ خدائے بزرگ و برتر ان کی عمر دراز فرمائے اور انھیں ہمارے درمیان اس وقت تک رکھے جب تک اردو کو ایک بار پھر سے وہی جیسے مقام نہ مل جائے۔ جہاں میر و غالب اردو کی سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔" محترم شان الحق حقی نے کہا کہ "میں یہ نہیں مانتا کہ اردو نوخیز زبان ہے۔ اردو کے آغاز کا سرا پکڑنا آسان نہیں، قیاس زیادہ ہے۔ صدیوں کے تجربات کے نچوڑ سے محاورے سے بنتے

ہیں اور کہاوتیں وجود میں آتی ہیں۔ اب اُردو ایک ایسے مرحلے میں ہے کہ تمام انڈیا کی زبانوں میں ایک زبان اُردو ہے۔ اردو ادب کو بہت فروغ ہوا ہے۔ اُردو کئی انقلابات سے گزری ہے۔ اب اس پر برا وقت ہے، زبانیں مٹ بھی جاتی ہیں، اُردو نازک دور سے گزر رہی ہے جہاں اس کی جڑیں ہیں وہاں سے وہ اکھڑ رہی ہے۔ پاکستان میں گلی محلے میں انگلش اسکول کھل گئے ہیں۔ یہ انگریزوں نے نہیں کھولے ہم نے کھولے ہیں۔ حقائق سے گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس موقع پر کہا کہ ہفت روزہ "اردو نامہ" قابل مبارک باد ہے۔ انھوں نے نئی نسل میں اُردو زبان سے رشتہ کو پختہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اخلاق اور زبان فروغ پا سکے۔" انھوں نے کہا کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی نئی نسل میں اُردو زبان کو پھیلایا جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے درمیان اتحاد کا فروغ ہو۔ جب دو اردو زبان بولنے والوں کے درمیان محبت اور پیار ہوگا تو رد عمل کے طور پر اُردو زبان کا بھی فروغ ہوگا۔ محبت بڑھتی ہے، نفرت اور دوریاں مٹ جاتی ہیں۔ اردو کو حیثیت زبان، علوم کی تعلیم میں شامل کیا جائے بصورت دیگر آپ کی تہذیب کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اس کے لیے باعمل قیادت کی ضرورت ہے۔ خلیل الرحمن کا "اردو نامہ" پورے امریکہ میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سنگ میل ثابت ہوگا۔"

"اردو نامہ" کے پیشکار جناب خلیل الرحمن نے ایک اجلاس کے موقع پر کہا کہ "اردو نامہ" کا سفر کئی برس سے جاری ہے۔ ہم انشاء اللہ جلد ہی اس کا پہلا ایڈیشن نکالیں گے۔" انھوں نے کتابوں کی پیشکش کے لیے اپنی خدمات کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ "ہم ایسے ادیبوں اور قلم کاروں کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے جو مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت سے محروم ہیں۔" جناب خلیل الرحمن نے اردو کتاب کے لیے ایوارڈ کا بھی اعلان کیا جس کا جلد ہی انتخاب کرایا جائے گا۔

تمام اجلاس میں وقتاً فوقتاً سوال و جواب کے سیشن بھی ہوتے رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن اجلاس کے صدر ادیب و شاعر موجود تھے، وہیں حاضرین میں بھی پائے کے قلم کار اور ادب نواز شخصیات موجود تھیں جنھوں نے ہر موقع پر ایسے سوالات کیے جن سے

جوابات کی اشد ضرورت تھی۔ سوال کرنے والوں میں انگلینڈ سے آئے ہوئے معروف ادیب، ناقد، استاد اور محقق ستیہ پال آنند بھی تھے۔ جنھوں نے تقریباً ہر اجلاس میں قابلِ قدر سوالات کیے۔ اکثر ان کے سوال جواب دینے والوں پر بھاری پڑ جاتے تھے۔ ایک موقع پر جب ڈاکٹر مظفر وارثی نے اپنے افسانے ''اساطیر'' کا بنیاد مذہب کے پس منظر میں ذکر کیا تو ڈاکٹر ستیہ پال آنند ناراض ہو گئے۔ جس کا انھوں نے برملا اظہار کیا اور ڈاکٹر تقی عابدی سے اس کا جواب طلب کیا۔ ڈاکٹر تقی نے اس معاملے کو اپنی ذہانت سے حل کر دیا اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر مظفر وارثی اس موقع پر خاموش رہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اس کا جواب ہو لیکن خاموش رہنا اس وقت کا تقاضا تھا۔ قارئین پوری کانفرنس کا لمحہ بہ لمحہ رپورٹنگ کی جائے اور ہر اجلاس کی تفصیل بیان کی جائے تو اخبارات کے صفحات میں یہ صد فی صد ناممکن ہے۔ ہاں اگر اردو کانفرنس پر ایک مختصر مجلہ ترتیب دیا جائے تو ایسا ممکن ہے۔ میں اس رپورٹ میں چیدہ چیدہ گفتگو آپ سے قلمی زبانی کر رہا ہوں تاکہ آپ کا اس تاریخی کانفرنس سے رابطہ ہو جائے۔ اندازے آپ خود لگا سکتے ہیں۔

جب ایک اجلاس میں ترقی پسند تحریک کی بات چلی تو اردو تاریخ کے بہت رخ سامنے آئے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر قمر رئیس نے کی۔ انھوں نے شریک مقالہ نگاروں کی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اپنے ارشادات میں کہا کہ ''جب معاشرے میں انتشار ہوتا ہے تو ترقی پسند تحریک کے ادیبوں اور شاعروں نے سامراج، طاغوتی طاقتوں اور کمرشلزم کے خلاف قلم اٹھایا اور عوام میں شعور اور بیداری پیدا کی۔ اس دور میں جو ادب تخلیق ہوا تو ردِ عمل کے طور پر کتابوں کے انبار لگ گئے۔'' اس موقع پر معروف ریڈیو براڈ کاسٹر اور بے شمار سفر ناموں کے مصنف قمر علی عباسی جو میرے اپنے کراچی کے باکمال ادیبوں میں شامل ہیں جن سے اس کانفرنس کے طفیل میری ملاقات ہوئی۔ ان کی بیگم نیلوفر عباسی جن کا مشہور زمانہ کردار ''شہ زوری'' آج بھی ذہنوں کے حوالے سے مقبول ہے، ان کے ہمراہ تھیں۔ جناب قمر علی عباسی نے ایک سوال کی شکل میں اپنی گزارشات عرض کیں۔ انھوں نے کہا ''سارا کریڈٹ آپ ترقی پسند تحریک کو نہ دیں۔ وہ شاعر اور ادیب جو ترقی پسند تحریک کا حصہ نہیں تھے، انھوں نے بھی اردو ادب کے لیے دنیا میں لازوال اور بے مثال کام کیا

ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو یہ سارا ناانصافی ہوگی۔" جس پر حال تالیوں سے گونج اٹھا۔ تالیوں کی گونج نے میرا خیال ہے کہ قمر علی عباسی کو ان کے سوال کا جواب دے دیا تھا اور اب کسی جواب کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کانفرنس میں برطانیہ سے آئے ہوئے انگریز لیکن اردو ادب کے شہسوار ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز بھی موجود تھے جو حاضرین کے لیے ایک پیغام آگہی ہے۔ وہ اردو زبان سے حسن کی علامت تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز لسانیات کے پروفیسر ہیں جو بیک وقت کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں جن میں فرانسیسی، اطالوی، روسی، ہندی، نیپالی، اردو اور فارسی شامل ہے۔ انھوں نے اس کانفرنس میں بھرپور شرکت کی اور کئی مواقع پر اپنے مقالات میں بڑا نغز نکتہ خیز اور تجویز پیش کیں۔ ڈاکٹر صاحب 17 کتابوں کے مصنف ہیں لندن یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔

اس کانفرنس میں غالبیات اور اقبالیات پر مقالہ نگاروں نے روشنی ڈالی اقبالیات کے حوالے سے صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی جب کہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر تقی عابدی شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مقالے میں علامہ اقبال کے متعلق چند نکات قابل توجہ تھے۔ ان کے اشارات قابل توجہ تھے۔ وہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے قطعات و رباعیات کو نہ مانتے سے انکار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی جب 24 اوزان کے تحت علامہ اقبال کے قطعات کو رباعیات کے پلڑے میں وزن کرتے ہیں ان کا نقطہ نظر ہے کہ صرف 4 قطعات رباعیت کے زمرے میں آتے ہیں باقی رباعیات نہیں قطعات ہیں۔ انھوں نے ایک پنجابی نعت کا بھی ذکر کیا جس کو علامہ نے کہا کہ "ایسی نعت تو میں نے کبھی نہیں سنی۔" تقی عابدی نے کہا کہ "وہ نعت کہاں ہے۔"

اس کانفرنس میں مرثیہ میں اب کے ارتقائی اقدار پر بھی ایک خصوصی اجلاس ہوا۔ اس میں بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے چونکایا۔ انھوں نے کہا کہ "انیس و دبیر مرثیہ نگاری کے فوق کا وہ عظیم ستارہ ہے جس نے ایک لاکھ 24 ہزار اشعار کہے۔" انھوں نے کہا کہ "اس صنف سخن سے شاعر نے تو ظلم کیا ہے، وہ بہت بڑا شاعر ہے لیکن اس کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ حقدار تھا۔

سید انجم جوہر
''اردو ٹائمز'' (شکاگو)

30/جون 2005ء

ٹورنٹو میں عالمی مشاعرہ و محفل غزل

بسلسلہ سہ روزہ اردو کانفرنس 2005ء

قارئین گزشتہ شمارے میں ایک تفصیلی رپورٹ بمعہ تصاویر اخبار کے مکمل دو صفحات پر مشتمل تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اردو زبان کے وہ شائقین جن کی شومئی قسمت کسی بھی وجوہ سے اس عظیم الشان اردو کانفرنس میں ممکن نہ ہو سکی، وہ ان صفحات کی ورق گردانی کر کے اپنے ذوق ادب کی تسکین کر لیں۔

میں اس کام کے ذریعے ان تمام ادب شناس افراد کا ممنون ہوں جنھوں نے اس سہ روزہ کانفرنس کی تمام روئیداد کو پسند فرمایا اور مجھے فون کر کے میری اس کاوش کو سراہا۔ گزشتہ رپورٹ میں مشاعرہ اور محفل غزل کا حال میں قلمبند نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ ان دو تقریبات کا کچھ حال رقم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

محفل غزل میں پاکستان کی غزل کا کیدمحترمہ یاسمین راشد جو میری معلومات کے مطابق امریکہ میں مقیم ہیں، محفل غزل کے لیے خاص طور پر ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے لباس، شکل اور بالوں کی بناوٹ سے اب تک وہ غزل سرا نہیں ہوئیں، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ غزل یا گیت بھی خوبی سے گا سکتی ہیں۔ وہ پوپ سنگر زیادہ معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ غزل تو درکنار کبھی ایک ردیف یا قافیہ بھی ان کے پاس سے نہیں گزرا۔

کانفرنس کے پہلے دن جب کچھ وقت باقی رہ گیا تھا، ہوٹل کے ایک ہال سے طبلے کی تھاپ سنائی دی تو میں نے طارق خواجہ ''اردو ٹائمز'' شکاگو کے بیورو چیف اور کام نگار امین حیدر سے کہا ''چلیں دیکھتے ہیں کون نغمہ سرا ہے۔'' طارق خواجہ کچھ زیادہ پرشوق نہیں

تھے۔ تکلف ہمارے ساتھ ہو لئے۔ اندر سامنے ایک ماڈرن غزل گائیکہ جن کا نام یاسمین راشد تھا، غزل کا ابتدائی راگ الاپ رہی تھیں۔ پہلے دن پتہ مشہور فنی انھوں نے سنائے۔ جناب طبلہ نواز طبلے اور تال یعنی ڈھول کو بیک وقت بجانے کی کوشش کرتے تو کبھی تبلہ نکل جاتا تھا تو کبھی تال کمزور پڑ جاتی تھی۔ اوپر سے ڈھول کو جب ایک چھڑی سے موصوف پیٹتے تھے تو یوں لگتا تھا کہ جیسے ہمارے بچپن میں نوجوان روزہ دار راتوں کو سحری کے وقت محلہ میں سحری کے وقت جگانے کے لئے ڈھول بجا کر اٹھایا کرتے تھے۔ چونکہ پہلے دن وقت کم تھا لہذا چار پانچ غزلوں تک ہی نوبت پہنچی۔ دوسرے دن تو باقاعدہ غزل کی محفل تھی۔ تمام فنکار جو پہلے دن نہیں آسکے تھے، وہ بھی نشستوں پر براجمان تھے۔ آج قدرے بہتر غزل کا سماں تھا اور ماحول بھی۔ بیک گراؤنڈ ہمارے سامنے طبلے اور ہارمونیم کے ساتھ تمام ساز میں سنگت کر رہے تھے۔ ان دو دنوں میں یہ محسوس ہوا کہ شہنشاہ غزل مہدی حسن دوبارہ جوان ہو کر غزل سرا ہونے والے ہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک صاحب بڑے بڑے بستے لئے معلوم ہوتے تھے۔ بمشکل مہدی حسن کا تعارف کرتے ہوئے کہنے لگے کہ صاحبہ تمام ہمارے فورٹونیٹ اے مہدی حسن ہیں جنھوں نے باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل کی ہے۔ جن سے استاد جناب آفتاب رضا صاحب ہیں۔ آج یہ ان کی اجازت سے پہلی بار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔

میں نے جب یہ تعارفی کلمات ناظم صاحب کے منہ سے سنے تو میں سنبھل بیٹھا یہ وہی گویا جن سے محترمہ کا موصوف نے ذکر کیا تھا۔ آج بھی پاکستان میں وہ موسیقی کے مینار نور کی مانند ہیں جن سے حاضرین موسیقی اپنے دلوں کو منور کر رہے ہیں۔ ارے وہ گائیکی اور قوالی کے فنی جو آج بھی زبان زد عام ہیں، ان کی دھنیں سہیل رعنا سے ہمیں کی تخلیق کردہ ہیں۔ مثل مہدی حسن جیسی، استاد سہیل رعنا جیسا موسیقی فن کار حاضرین کے دل موہ لیتا ہے۔ صاحبہ ہمال نے ایک پرانی بندش جو پاکستان کے نامور گلوکار سلیم رضا مرحوم نے گائی تھی، سر اور تال پر چھیڑی جس کے بول یہ تھے۔

دل بھی کرتا ہے یاد چھپ کے
نام لیتی ہے زباں تیرا

کس سے پوچھوں میں خبر تیری
کون بتلائے گا نشاں تیرا

طاہر جمال خوب صورت آواز کے ساتھ چہرے سے تاثرات مہدی حسن کی طرح دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ سخنوروں کی حرمت نروں کے حساب سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ طاہر جمال کی مونچھیں مہدی حسن سے مقابلے میں ذرا زیادہ تھیں۔ اگر ان کو ایک باریک ریکن کی صورت میں ہاکا کر لیا جاتا تو مہدی حسن سے کلی مشابہت ہو جاتی۔ اس بزم غزل میں یاسمین راشد نے طاہر جمال کا بھرپور ساتھ دیا۔ شائقین کے بے حد اصرار پر دونوں نے مشترکہ گیت گائے جو کافی پسند کیے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دونوں نے اس کے باوجود کے پہلے کبھی ایک ساتھ گیت نہیں گائے تھے، گیتوں کو خوب صورتی سے پیش کیا۔

یاسمین راشد کی آواز کافی جاندار تھی لیکن ان کے ساتھ سازندوں کا وہ تعاون نہیں دیکھا گیا جو محفل غزل کی جان ہوتا ہے۔ ہر غزل کا مکمل تاثر جو سامعین کو محظوظ کر دیتا ہے وہ قائم نہیں ہو سکا۔ یاسمین راشد نے اپنے طور پر بڑی محنت کی اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ طاہر جمال جنھوں نے باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل کی ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس پروگرام کے لیے باقاعدہ تیاری نہیں کی تھی۔ معروف گلوکار حبیب ولی محمد کی غزلیں انھوں نے بہت خوب صورتی سے گائیں۔ اس کے علاوہ ریحانہ میر کے جانشین کلیم عاجز کی خوب صورت غزل انھوں نے ان ہی کے مخصوص ترنم میں سنائی جس کے بول تھے۔

اے میرے پیارے، اے میرے زلف پریشاں والے
تجھ کو سمجھتے رہے چاک گریباں والے
چارہ فرما بھی بیمار بھی ہو جاتے ہیں
درد والے بھی بن جاتے ہیں درماں والے

میں یہاں انتظامی ادب سے منتظمین جن کے ذمہ محفل غزل کا انعقاد تھا، درخواست گزار ہوں کہ وہ اس محفل کو اور بھی خوب صورتی سے پیش کر سکتے تھے۔ چند نامور غزل گائیک کو بھی مدعو کیا جا سکتا تھا۔ سامعین میں دنیا بھر سے آئے ہوئے شاعر و ادیب موجود تھے جو نہ صرف

غزل سے مزاج کو سمجھتے تھے بلکہ نثر اور نثر سے بھی واقف تھے۔ ان کے سامنے ایک ایسا پروگرام پیش کرنے کی ضرورت تھی جس کے ذریعے اردو زبان کا وہ حسن جو غزل کی کلیکی میں چھپا ہوا ہے، ظاہر ہو جاتا۔ اس طرح سے غزل کی شان میں اضافہ ہوتا۔ مجھے امید ہے کہ لندن میں ہونے والی کانفرنس میں اس غلطی کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔

قارئین تیسرے دن افتتاحی اجلاس کے بعد ایک عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا مشاعرہ کافی تاخیر سے شروع ہوا۔ صدارت محترمہ ذاکرہ جمیل جالبی نے کی۔ شاعروں میں مجتبیٰ حسین فقیہ کا نام بھی تھا اور ثنا کوثر میرے شاعر منیر صدیقی شہر بھی شامل تھے۔ مہمان شعراء کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ اس کے علاوہ چند اور معزز شخصیات کو بھی اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ مشاعرے میں جو مہمان شاعر موجود تھے ان میں پاکستان سے ڈاکٹر فاطمہ حسن، ڈاکٹر رئیس نعمانی، ہندوستان سے شاہد ماہلی، لندن سے عاشور کاظمی، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، نسیم آفتاب اور رضا جاوید موجود تھے۔

باقی شاعر یکے اور سینئر تھے جن شعراء کرام نے شرکت کی ان میں جناب حنیف اختر، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، سید نسیم خیر، ویل نصاری، تسلیم الہی زلفی، اسد رضوی، اکرم سلطان، رشید ندیم، انور شیدا، نسیم سید، عابد معراج، ڈاکٹر مطلوب حسین، سلطین کاظمی، معراج فوزی، منیر ارشد، کمل رشی، قمر شیدا، سدا اثر، پروین شیر، فیاض تحسین، سلطان رشک، منیر سامی، طارق حسین، رفیع رضا، قمی عابدی، عابد تحسین، فضال فرید، دیپش زیدی، نظم متھالی، رفیعہ نسیم، حمیدہ رانی، انور کلیم، نسیم سید، معراج شہاب، نجم تابش، فرخ شہزاد، عزیز قریشی اور میں نے بھی اپنی شعر پڑھا اور اپنا کلام سنایا۔ مشاعرے کے نظم اللہ ڈاکٹر عابدی تھے۔ جن میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک کامیاب نظم میں ہونی چاہئیں۔ یعنی نہیں نہیں ان سے اندر سے خط بھی تابت ہوتے جس کی ایک مثال یہ عابدی صاحب بھی ہے۔ تمام شعراء کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ہر ایک کے حصہ میں تین چار منٹ سے زیادہ وقت نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر عابدی صاحب بہت سارے شاعروں کو بلا رہے تھے۔ ہم لوگ سنتے رہے تھے۔ مشاعرہ ایک بڑی بات نہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر

میں یہ قدیم خامیاں مفروضے معلوم ہوتے۔ آج میڈیا پر جس طرح سے گلوکار پیدا ہو رہے ہیں، مشاعروں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں مقامی شعراء اس عالمی مشاعرے میں اپنا کلام سنائیں گے اور وہ بھی (۱۱) سے (۱۲) اشعار پر مشتمل غزل۔ بعض شعراء نے اپنی طویل غزلیں ترنم سے بھی سنائیں۔ جب کوئی طویل غزل ترنم سے پڑھی جاتی تھی تو وہ قوالی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ان شاعروں کو پڑھانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کوئی نئی بات اور منفرد بات اٹھانے میں ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔ نئی مواقعوں پر انھوں نے اس رسم کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا کہ انھی بھی نہ ٹوٹے اور بھینس بھی مر جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام شاعروں کے نام کی پرچیاں ایک ٹوکرے میں ڈال دیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی پر جو صدارت کے فرائض سرانجام ہونے والے تھے یہ ذمہ داری ڈال دی کہ وہ ایک پرچی نکالیں اور نظامت پر فی شاعر کے حوالے کریں تاکہ وہ خوش قسمت شاعر یا شاعرہ کا نام پکار سکے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ شاعروں کے درمیان مرتبے کا مسئلہ حل ہو گیا اور دوسرا یہ کہ سب شاعر چوکنے بیٹھے رہتے کہ کب اور کسی وقت بھی ہمارا نام پکارا جا سکتا ہے ورنہ شاعر عموماً آدھے سوتے ہیں اور آدھے جاگتے ہیں اور میں نے زندگی میں ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جن کو اس وقت نیند سے اٹھایا گیا جب کلام پڑھنے کی ان کی باری آئی۔ لیکن نہیں صاحب، یہ اس ڈھب کے شاعر نہیں ہیں، یہ خود بھی جاگتے ہیں اور دوسروں کو بھی زبردستی جاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مشاعرہ جاری تھا۔ مہمان شاعرہ شاعرات پر غنودگی طاری تھی۔ شاعرات نے میک اپ کی خوب صورتی مدھم پڑنے لگی۔ حاضرین کی تعداد میں کمی واقع ہونے لگی۔ یہ صورت حال دیکھ کر جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ "میری خواہش ہے کہ میں اپنا خطبہ صدارت قبل از وقت پیش کر دوں۔" بات دراصل یہ تھی کہ ڈاکٹر جمیل جالبی مشاعرہ کی صدارت کا خاصا تجربہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہی سوچا ہوگا کہ اس سے پہلے کہ ہال حاضرین سے خالی ہو جائے میں اپنا کام تو پورا کرا لوں۔ خطبہ صدارت بھی اپنی نوعیت اور تحریر کے اعتبار سے معنی خیز تھا۔ اس خطبہ نے مشاعرہ کی صدارت کی قلعی کھول دی۔ جو نقشہ صاحب نے کھینچا، سن کر

مزہ آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کو ایسی مزاقیہ رنگ دیا جو بغیر جرمے کے صاحب صدر ہو ہی جاتی ہے۔ کیوں کہ صدر سب سے پہلے آ کر صدارت پر تشریف فرما ہوتا ہے اور سب سے آخر میں اٹھتا ہے۔ صدر کو کم و بیش تمام شعراء کا کلام سننا پڑتا ہے اور ہر اچھے برے شاعر پر داد نہیں تو کم از کم سر تو ہلانا ہی پڑتا ہے اور پورے مشاعرہ کو سننا اس کی صدارتی ذمہ داری میں شامل ہے۔

شیشے کا خوب صورت مرتبان پیلے رنگ کی پرچیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پرچیاں مرتبان کے منہ تک پہنچ چکی تھیں۔ اندازہ لگانے والوں نے اندازہ لگایا تھا کہ مقامی شاعر اپنے میزبان ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مہمان شعراء کی حالت زار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر شخص کی نظر مرتبان پر تھی کہ یہ پرچیوں سے کب خالی ہوگا اور سونے پر سہاگہ کہ دوران مشاعرہ بھی چند مزید پرچیاں بلا تکلف مرتبان میں ڈالی جا رہی تھیں۔ تقریباً 25 سے 30 شاعر و شاعرات نے خوب دل بھر کر لمبی لمبی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ جب مقامی شعراء نے مشاعرہ کی جولانی دیکھ لی تو مشاعرہ اپنی حدوں سے باہر نکلا اور ہال میں داخل ہو گیا۔ نیویارک، واشنگٹن، مشی گن اور شکاگو سے شاعروں کا آنا کار نہ آ گیا۔ ہم بھی شاعروں کی اس بھیڑ میں شامل تھے۔ شکاگو سے بزرگ شاعر منیر صدیقی شرر سے بعد ہمارا نمبر آیا۔ مونا شہاب جو شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں، اس وقت مشاعرے کی نظامت کر رہی تھیں۔ مجھے جب انھوں نے شکاگو سے نوجوان شاعر کہہ کر اسٹیج پر بلایا تو میری ساری تھکن دور ہو گئی۔ میں بہت خوش ہوا اور اپنی جوانی پر ناز کرنے لگا۔ اسٹیج پر جا کر غزل سنانے سے قبل میں نے مونا شہاب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جس پر انھوں نے کہا "معاف کیجیے میں نے پہلے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔" میں نے جواباً عرض کیا کہ "اب تو آپ نے دیکھ لیا.. ؟"

میں غزل پڑھ کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ عارف خواجہ نے میری جیب پر ہاتھ ڈالا اپنے ازلی بازو کا مظاہرہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پرچیاں جانے کا شاخسانہ ہے۔ رات بیت چکی تھی، نیند کا غلبہ تھا، شاعروں میں سب کی اپنی اپنی مصروفیات بھی تھیں اور مشاعرہ دیر تک بھی سب کو مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ جن کو سننے آئے تھے وہ ابھی تک مائک پر اپنی باری کا انتظار کر رہے

تھے۔ ریحانہ روفی اور شاہدہ حسن کے لوگ منتظر تھے اور میں بھی چاہتا تھا کہ ریحانہ روفی وطن کر جائیں۔ مجھے ان کا ایک شعر و یہ بھی بہت پسند ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

خود کریوں میں حد سے گزر جانا چاہیے
عزت سے جی نہ پائیں تو مر جانا چاہیے

بہر حال یہ فیصلہ ہوا کہ اب رخت سفر باندھا جائے۔ مشاعرہ سے اٹھ کر ہم اپنے اپنے کمروں کی طرف ہولے، بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹا گیا، سارا سامان انور مظفر فاروقی صاحب کے کمرے میں موجود تھا۔ اب ہمارا رخ اپنی سفید وین کی طرف تھا جو مشاعرے میں شرکت کے لیے ہمارے ساتھ آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سب نورانی سڑکوں پر تھے۔ راستے میں چائے اور کافی پینے کے لیے رکے تاکہ نیند کا غلبہ جو سب پر طاری تھا، اس کو بھگایا جائے۔

قارئین اس مشاعرہ کے سارے پس منظر میں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ یہ مہمان شاعر و شاعرات کو اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ سینیڈا کے تمام میزبان شعراء کا کلام سنیں۔ اگر اتنا ہی ضروری تھا تو ان شعراء تک شعر کو محدود کر دیا جاتا۔ اس طرح سے مزید وقت حاصل ہو جاتا اور مشاعرے میں دلچسپی آخر وقت تک قائم رہتی۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں دہرائی جائے گی اور مشاعرہ کا اہتمام کرتے وقت اس تجربے کو سامنے رکھا جائے گا۔

بشیر بیگ (کینیڈا)

29/جون 2010ء

کینیڈا میں حیدرآباد کمیونٹی سینٹر کے قیام کا اعلان

ڈاکٹر تقی عابدی کے اعزاز میں تقریب

حیدرآباد دکن فاؤنڈیشن کینیڈا (ایچ ڈی ایف سی) کے زیر اہتمام ڈاکٹر تقی عابدی کی اردو ادب کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے سالانہ محفل حیدرآباد کلچرل پروگرام کا انعقاد ورسیکر کنونشن سینٹر میں کیا گیا۔ مذکورہ فاؤنڈیشن حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں اور بھارتیوں پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر راقم (صدر ایچ ڈی ایف سی) نے اعلان کیا کہ ایچ ڈی ایف سی، کینیڈا میں کمیونٹی سینٹر کی قیمت کا ارادہ رکھتی ہے جس کے لیے مناسب جگہ کی تلاش ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''حیدرآباد دکن بھارت کا وہ شہر ہے جہاں شرقی و مغربی بھارت کی مخلوط ثقافتی و لسانی تہذیبوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''حیدرآبادی نژاد کینیڈین شان دار اور قابل رشک ماضی و ثقافت کے علم بردار ہیں۔ ان کی سماجی، تہذیبی، فن کارانہ جدت، سائنسی نظریے، قومیت و ثقافتی ارتقاش کا کینیڈا کی تعمیر میں کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ یہ قابل فخر ورثہ ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''نہ صرف مختلف ثقافت و پرویں میں قائم رکھیں گے، بلکہ نئی نسل کو بھی اس کا علم بردار بنائیں گے۔'' اس موقع پر پیغام و اظہار خیال میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے حیدرآباد نژاد کینیڈین ایوارڈز سے نوازا گیا۔ جس میں ڈاکٹر تقی عابدی (ادب)، بارون صدیقی (صحافت)، ڈاکٹر علی خان (برنس)، صدیق برنی (سماجی خدمات)، مرزا پرویز بیگ (سماجی رابطے) سمیت رفعت سلیم، محمد ایوب خان عابدی، شبیر بیگ، ہاشمی، روشن، حیدر، سید، نجم سعید اور زکی حسین شامل ہیں۔ پروگرام کے آخر میں کینیڈا اور امریکہ سے مختلف حیدرآبادی فن کاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ پیش کیا، جس سے شائقین نے حیدرآبادی محفل سے خوب محظوظ ہوئے۔

sherosukhan.tripod.com

ڈاکٹر تقی عابدی کی رہائش گاہ پر
پروفیسر نارنگ کی خدمات کا اعتراف

۲ راگست بروز جمعتہ ڈاکٹر تقی عابدی کی رہائش گاہ پر ایک خوب صورت شام پروفیسر نارنگ کے نام پر منعقد کی گئی۔ جس میں پروفیسر نارنگ کی اردو سے پرستی اور اردو خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر نارنگ کی جو ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ دو تین درجن کتابوں کو بھی منظر عام پر پیش کیا گیا۔ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد کی بنائی ہوئی ڈاکومینٹری جو نارنگ صاحب کے اردو سفر و تجربوں پر روشنی ڈالتی ہے اسکرین پر دکھلائی گئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو ادب کا جمالیاتی تعارف کرتے پروفیسر نارنگ کو اردو دنیا کا سب سے بڑا زندہ لیجینڈ بتایا اور ان کی لسانی، ادبی، تنقیدی شاہکار تصانیف کا حوالہ دیا۔ اسلوبیات سے لے کر ساختیات اور تجرباتی تنقیدات کا مختصر اور جامع تعارف کروایا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے تعارف کے بعد پروفیسر نارنگ نے اپنے خاص موثر لہجہ میں اردو کی لسانیات، ساختیات اور اسلوبیات پر گفتگو کی اور موجودہ دور میں اردو کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد کان پاک چیپٹر کے چیئرمین شاہد ہاشمی نے جوان نسل کی عدم موجودگی اور ان سے اردو ادب کو روشناس کرانے کی اہمیت پر زور دیا۔ جس کی ڈاکٹر نارنگ نے پرزور تائید کی۔ نیہا نریش کمار نے بھی اس بات پر تشویش کا اظہار کیا۔ منیف اشعر صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کی ہمہ جہتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اردو پرستاروں کے لیے مفید راستہ بتایا۔ منیف اشعر اور سردار علی نے انکشاف کیا کہ ٹورنٹو اور مسی ساگا میں "بزم احباب" کی جانب سے ناظم الدین مقبول اردو کی مفت تعلیم کا انتظام کر رہے ہیں۔ والدین اور بچوں کی

جانب سے بے حد تعاون ملا ہے اور تقریباً ایک سو سے زائد بچوں نے ان کلاسوں میں داخلہ لیا ہے۔ غالب اکیڈمی کے روح رواں اطہر رضوی صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تنقی عابدی کے کام کی تعریف کی۔ محفل میں موجود چند اہم شخصیات میں نیشنل بنک پاکستان کے صدر رسول احمد کلیمی، پی آئی اے کے چیئرمین نیر جمال، نثار اقبال، نسرین سید، ثریا خان اور دیگر ممتاز خواتین، ڈاکٹر شمیم منظر، پروفیسر مظفر علی، ڈاکٹر تاج غوث، سجاد حیدر، ایڈیٹر "آفاق"، امیر جعفری، سید فیاض محمد تسلیم، صلاح الدین، قمر خان، منور کلیمی، مشکور حسن اور "شعر و سخن" اردو ویب میگزین کے روح رواں سید عارفی جو ہیوسٹن میں اردو اشاعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں موجود تھے۔ یہ محفل اعتراف خدمات عشائیہ کے ساتھ شروع ہو کر رات دیر تک جاری رہی۔

8/مئی 1997ء

حضرت ستار وارثی کی نعتیہ شاعری حضور اکرمؐ سے والہانہ عقیدت
حرف معتبر کی تقریب رونمائی میں ڈاکٹر تقی عابدی،
شائستہ ایمن اور مامون ایمن کو خراج تحسین

عادل منصوری جدید لہجہ کا خوب صورت شاعر ہے۔ حمیرا رحمان عادل منصوری کے مجموعہ کلام ''حشر کی صبح درخشاں ہو'' کی تقریب رونمائی

اردو کے ممتاز نعت گو شاعر ستار وارثی کے تیسرے مجموعہ نعت ''حرف معتبر'' کی تعارفی تقریب گزشتہ ہفتہ پاکستان اسٹڈی سینٹر، یونیورسٹی آف ٹیکساس اور نظر زیدی کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام کولمبیا یونیورسٹی کے ڈی ونک ہال میں منعقد ہوئی۔ حافظ محمد سلمہ نے تلاوت کلام مجید سے تقریب کا آغاز کیا۔ ممتاز نیوز ریڈر مسز ارجمند نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ صدارت کولمبیا یونیورسٹی میں قائداعظم چیئر کے انچارج پروفیسر حسن عسکری رضوی نے کی ممتاز ادبی شخصیت سلطان محمود خان مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر معروف دانشور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''نعت گوئی شاعری میں سب سے مشکل میدان ہے کیوں کہ نعت گوئی میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''نعت کہنے کے لیے حضور اکرمؐ کی ذات سے والہانہ عقیدت سب سے اہم جزو ہے جس سے ستار وارثی مسرت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نعت گوئی میں آپ کا نام اہم تصور کیا جاتا ہے۔ محترمہ شائستہ ایمن نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''ستار وارثی کی شاعری میں حب نبی کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے وہ ایک بلند پایہ نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے رموز سے مکمل طور پر واقف تھے ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ اس کی دلیل ہے۔ نظر زیدی سوسائٹی کے سرپرست اور معروف دانشور، شاعر مامون ایمن نے اپنے مقالہ میں ''حرف معتبر'' میں شامل نعتوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ

''حضرت ستار وارثی نے حضور اکرمؐ سے سماعت فرمائی ہے ان سے جو نعتیں کہی ہیں ایک عدیم المثال کام ہے۔ یقیناً انھوں نے ایک نیا کام کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''وارثی صاحب کو اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر دسترس حاصل تھی ان کے کلام کو پڑھ کر اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے انھوں نے ''حرفِ محبت'' و نعتیہ مجموعہ ہائے کلام میں منظوم کر دیا۔'' اس سے قبل ڈاکٹر متین احمد فوزیہ نیازی اور ڈاکٹر ارحمان نے حضرت ستار وارثی کی نعتیں پیش کیں آخر میں ستار وارثی کے صاحبزادے رئیس وارثی نے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر غال قادری
''اُردو ٹائمز'' نیویارک

ڈاکٹر تقی عابدی کی رہائش گاہ پر ادبی تقریب

ڈاکٹر فرمان فتح پوری تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ محفل شعر و سخن بھی ہوئی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاعری میں عشق کے موضوع پر دلچسپ اشعار کے حوالے سے تقریر کی

معروف شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کے حال ہی میں ایک ادبی تقریب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاعری میں عشق کے موضوع پر دلچسپ اشعار کے حوالے سے تقریر کی۔ انھوں نے بہت سے فارسی کے اشعار بھی پیش کیے۔ اس کے بعد ایک محفل شعر و سخن بھی ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے علاوہ حنیف اختر، مامون ایمن، سعید صبا، زاہد شیخ، نزہت یاسمین، عبدالرحمان عبد، فرحت زاہد، دیبل انصاری، انوار قادری، ڈاکٹر شیخ، خوشنود امروہوی اور غال قادری کے علاوہ میزبان ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ یہ ادبی نشست رات گئے تک جاری رہی۔

نیوجرسی میں شاندار یوم دبیر

ڈاکٹر عابدی کی دبیر پر چھ کتابوں کی رسم رونمائی

نیوجرسی کے شہر ہملٹن کے شاندار ہال روزگارڈن میں اتوار 13 نومبر کو شام یوم دبیر کی تقریب منعقد ہوئی جس میں اردو ادب کے ممتاز شاعر اور محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیف شدہ چھ کتابیں جو عظیم شاعر مرزا سلامت علی دبیر پر لکھی گئی ہیں، ان کی رونمائی کی گئی۔ "مجتہد نظم مرزا سلامت علی دبیر" پر خطیب ممتاز جناب تلمیذ احسین صاحب نے بصیرت افروز تقریر کر کے کتاب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ شمالی امریکہ کے مشہور شاعر باقر زیدی نے مثنویات دبیر پر سیر حاصل گفتگو کی۔

دبیر کی نثری کتاب "ابواب المصائب" پر جناب محسن نقوی نے عالمانہ تجزیہ کیا۔ "سلک سلام دبیر" جو دبیر کے سلاموں پر مشتمل ہے، اس پر جناب شہاب ڈھکی نے ادبی اور انتظامی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جناب حسنین جمال نے جو اردو ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، دبیر کی ضرورت اور ادبی اور عقیدتی خدمات پر مدلل مضمون پڑھا۔

ڈاکٹر منظور رضوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ارباب ذوق ادب کی جانب سے شیلڈ پیش کی۔ جناب ڈاکٹر مظفر نظر نے دبیر سے غیر مشروط محبت کا اظہار کرتے ہوئے اردو ادب میں دبیر کے مقام کو بتایا۔ "مصنف فی ذکر دبیر" سے ڈاکٹر کامران کا مجموعہ ہے۔ جناب تلمیذ احسین اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گفتگو کا مرکز اسی تصنیف کو بنایا۔ اس تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر تقی عابدی نے تفصیلی نکات جو ادبی اور تحقیقی نوعیت کے تھے، جن سے دبیر کی عظمت، شخصیت اور فن پر وقیع معلومات حاصل ہوئیں۔ اس خوبصورت محفل کی نظامت نیوجرسی کے ہر دلعزیز ادب نواز شاعر جناب

جناب جعفری نقوی نے کی اور دبیر کے کلام پر روشنی ڈالی۔ جناب جعفری نقوی نے اپنی تالیف کردہ عمدہ کتاب "عاتمہ کے ساحل" پر سے انیس تقی عابدی کا نمونہ کلام سنایا اور اس کتاب سے احتشام کاظمی نے دبیر کا خوب صورت سلام پڑھا۔ یہ خوب صورت شام آغا شوکت جعفری کے شکریہ سے اختتام کو پہنچی اور محفل کے اختتام پر نیاز فتح پوری نے

نیویارک میں ڈاکٹر تقی عابدی کی شاہکار تصنیف "تجزیہ یادگارِ انیسؔ" کی پذیرائی

گزشتہ ہفتہ مضمون اسکول نیویارک میں ایک خوب صورت محفل پذیرائی منعقد کی گئی۔ جس کی صدارت نیویارک کی مشہور ادبی شخصیات اور تجزیہ کار ویل جناب ساجد جعفری نے کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی مصنف یادگار تجزیہ اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ اس تقریب پذیرائی میں نیویارک کے علمی اور شعری حلقوں سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ تقریب کا افتتاح جناب سعید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کے بعد جناب احتشام نقوی اور ساتھیوں نے انیسؔ کے شاہکار مرثیہ "شب قتل کی مسافت شب آفتاب سے" کے چند بندوں کو سوز خوانی کے ساتھ پیش کیا۔ نظامت جلسہ آغا جعفری جو مضمون اسکول کے پیرنٹ بھی ہیں خطبہ نظامت میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب کی افادیت اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور صدر ساجد جعفری، مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی اور مہمان اعزازی خلیل ارمان کے ساتھ جہت الاسلام مولانا قمید جہت الاسلام مولانا شبیہ رضوی آئین سے آئے ہوئے، مہمان ڈاکٹر حسن اختر واشنگٹن پر آنے کی وجہ سے نیویارک کے اہل علم خاندان سے وابستہ کالم نگار اور صحافی احتشام نقوی نے بہت پرمغز اور خوب صورت مقالہ پیش کیا جو ان کی خاص انداز بیان کے ساتھ ساتھ تجزیہ پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت کا حامل تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کی تصنیف کو ان کا عظیم کارنامہ قرار دیا جس نے انھیں امر کر دیا۔ نیویارک کے شاعر ادیب اور کالم نگار جناب نسیم اختر نے بہت مفصل مقالہ پڑھا اور تجزیہ کے کئی اہم حصوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے تجزیہ کو علامہ شبلی

کے "موازنہ انیس و دبیر" کے بعد سب سے عظیم تصنیف قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ "اس کتاب میں مغربی طرز کے استناد و اور تمام تر جزیات اور لفظ بندی کی تحلیل و تشریح موجود ہے جو آج تک اس طریقے پر نہیں کی گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر عابدی کی معجز بیانی ہے اور یہ ان کا شاہکار ہے۔ نیویارک کے صحافی، شاعر اور کالم نویس واصف حسین نے صنف مرثیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تجزیہ کو ایک بالکل مختلف ادبی شاہکار بتایا جس سے مدتوں اردو شعر و ادب کو مدد ملتی رہے گی۔ کتاب میں میر انیس کی عظمت فن اور ان کے کلام کے محاسن کی نشاندہی انیسیات کے طالب علموں کے لیے بیش قیمت ہے۔ حجت الاسلام مولانا تلمیذ الحسین صاحب جو ممتاز خطیب اور عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر انیسیات شمار کیے جاتے ہیں نے تقی عابدی کی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انیس کے کلام پر ایک خوب صورت گفتگو کی اور تجزیہ کو اس صدی کی ضرورت بتایا جس سے انیس شناسی کے لیے نئے دروازے کھلے ہیں۔ ممتاز کالم نگار اور شاعر وسیم انصاری نے تقی عابدی کے اس عظیم کارنامے پر مبارک پیش کرتے ہوئے تجزیہ پر ایک عمدہ گفتگو کی اور کہا کہ "صاحب تصنیف ڈاکٹر عابدی نے اپنی مصروف زندگی میں اپنا بیشتر ادب کی خدمت اور اردو شعر و ادب کے گیسوئے پریشان کو سنوارنے میں صرف کر دیے ہیں۔"

جناب خورشید رضا زیدی جو انیسیات کے ماہر اور وسیع مطالعہ کے حامل ہیں اس کتاب کے مختلف گوشوں پر عالمانہ گفتگو کرتے اس کام کو معجز بیانی بتایا۔ نیویارک کے مشہور طبیب ڈاکٹر منصور مرزا نے صاحب تصنیف کے اس کام کو قلمی جہاد بتایا اور تجزیہ کو مرثیے کا عام باڑوں سے باہر عوام تک رسائی کا مثبت قدم بتایا۔

"اردو ٹائمز" کے مدیر اعلیٰ خلیل الرحمان نے محفل کی خوب صورتی اور تقی عابدی کی ادبی خدمات کو سراہا اور بتایا کہ "صرف یہی کتاب نہیں بلکہ تقی عابدی 15 سال سے "اردو ٹائمز" میں خصوصی ادبی مضامین لکھ کر شمالی امریکہ میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔"

ڈاکٹر ناظر زیدی سابق پروفیسر اردو، فارسی پنجاب یونیورسٹی نے کلام انیس پر مفصل روشنی ڈالی اور اپنے خاص انداز میں ثابت کیا کہ اردو شاعری کی رونق انیس کے کلام

ے باقی ہے اور انیس کے ساتھ ناانصافی اردو ادب پر ظلم ہے۔

آخر میں سے تشریف لائے ہوئے مہمان ڈاکٹر حسن اختر نے عابدی صاحب کی عرق ریزی اور ان کی تصنیف کو اردو ادب کی خوش بختی بتایا۔ تقریب میں جناب محسن نقوی صاحب مدیر "میونسپل نیوز" جو ماہنامہ "ادبیات" بھی شمار کیے جاتے ہیں انگریزی اور اردو میں عابدی کی اس شاہکار تصنیف کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خاص لہجہ میں کلام انیس پر روشنی ڈالی اور سامعین کو محظوظ کیا۔ اس تقریب میں آغا طاہر بھائی نے بھی کلام انیس اور تصنیف پر مثبت گفتگو کی۔

محفل کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "تجزیہ یا کار انیس" جواب عالمی شہرت کی حامل ہے انیس کے فن کی عظمت اور ان کی چار پانچ سالہ محنت کا صلہ بتایا۔ انہوں نے کہا "تجزیہ ایک نیا ادبی تجربہ ہے جس میں مغربی طرز کی تنقید اور فارسی کی جھلک نمایاں ہے۔ اس تجزیہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شعر کو اکائی جان کر، پھر ہر بند کو پورے مرثیہ کو اکائی جان کر اس کی تشریح کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں Three Dimention View سے بصدق نکات کا مطالعہ ہوا ہے۔ میر انیس کے صرف ایک مرثیہ میں علم بیان کے محاسن، علم عروض کے ضوابط، روزمرہ محاورات فصاحت ہزار سے زیادہ میں نئے جدید اور اشعار کے متعلق بتایا گیا ہے۔ تشبیہات کی 42 قسمیں اور ان کے امثال صرف ایک ہی مرثیہ سے دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی نے بتایا "اگر میر انیس نے صرف ایک مرثیے میں اتنی قدرت اور خوب صورتی موجود ہے تو ان کے 213 مراثی، 1116 سلام اور 556 رباعیات میں کس قدر اردو ادب سے ارتقا کی ضمانت موجود ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے میر انیس اردو ادب کے ارتقا و ترقی کے لیے لازم تھے۔ جناب صدر نے خطبہ صدارت میں ڈاکٹر عابدی کی محنت اور کوششوں کو سراہا اور انیس و اردو کا خدمت گار بتایا۔ اس طرح یہ تقریب خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔

لندن میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتب کی تقریب اجراء

اسلامک سنٹر لندن میڈاویل میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نئی کتاب "کائنات نجم" کی تقریب اجراء منعقد ہوئی جس میں مصنف نے علامہ نجم آفندی کے حالات زندگی اُن کے فسانہ، ناول نگاری، مرثیہ نگاری، سلام، نوحہ اور غیر مطبوعہ کلام کو شائع کرکے اردو ادب میں نیا اضافہ کیا۔ ان کو خراج پیش کرنے کے لیے برطانیہ بھر سے محقق، تنقید نگار، مصنف اور اردو ادب سے محبت کرنے والی شخصیات نے شرکت کی۔ جن میں جناب سید عاشور کاظمی، سید صفدر علی ہمدانی، ڈاکٹر امیر زاہدہ، میر محفل ڈاکٹر شکیب، ڈاکٹر سہیل آغا، مظہر عباس، ڈاکٹر احسن ظفر، مولانا سید ذوالقدر رضوی، مسعود عابدی، نثار حیدر اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نمایاں نام تھے۔

تلاوت کلام الٰہی سے تقریب کا آغاز کیا اور بعد تلاوت مظہر عباس نے علامہ نجم آفندی کا سلام "شہید ظلم غریب الدیار یا لہنا، حسین درد کے پروردگار یا لہنا" پیش کیا ان کے بعد سید نثار حیدر کو یک اور سلام کے لیے دعوت دی گئی۔ بعد سلام نظم محفل نے علامہ نجم کا ایک اور "سلام میرا حضور امام لیتا جا" حاضرین کی نذر کیا اور خوب داد حاصل کی۔ اس تقریب میں دو مقالے بھی پڑھے گئے جن کے لیے محترمہ ڈاکٹر امیر زاہدہ، اور جناب سید صفدر علی ہمدانی کے نام پکارے گئے۔ محترمہ امیر نے ڈاکٹر تقی کو خراج پیش کرتے ہوئے اُردو ادب میں اضافہ کو سراہا اور علامہ مرحوم کی زندگی اور ان کے طرز تحریر پر مختصر روشنی ڈالی اور مولانا مرحوم کے مرثیہ کے اشعار بھی سامعین کی خدمت میں پیش کیے۔

بیگم ڈاکٹر امیر کے بعد مشہور مصنف، صحافی، ناقد براڈ کاسٹر، شاعر اور مرثیہ نگار جناب سید صفدر ہمدانی کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی موصوف نے جس انداز سے مولانا

اور مصنف کتاب مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی کو خراج پیش کیا یہ ان کا حصہ تھا اور اپنے مقالہ میں ان نکات کی جانب توجہ دلائی جو مصنف نے اپنے گوارہ ادب سے وابستہ ہونے والوں سے کیے۔ 1975 میں بعد انتقال علامہ نجم کا کلام مرتب کرنے کی کوشش کی اور نہ طبع ہوا اس کا سہرا جناب ڈاکٹر تقی کے سر ہے اور مولانا کو "کائنات نجم" کے دیئے سے جو زندگی دے کر خود بھی امر ہو گئے۔

صفدر ہمدانی نے اس کتاب کو ایک تحقیقی کتاب اور آنے والے زمانوں کے لیے ایک مکمل دستاویز قرار دیتے ہوئے مزید کہا کہ "سن 2006 میں شعبہ اردو ادب کے قاری کے لیے اس لیے بھی سند میل کی حیثیت رکھتا ہے ایک تو یہ کتاب "کائنات نجم" اور دوسری وہ کتاب جو کے مرثیے سے حوالے سے چھ برس پر محیط ایک تحقیقی کام ہے اور جس کے مصنف جناب سید عاشور کاظمی ہیں۔" اپنے اختتامی کلمات میں چند اشعار بطور خراج جناب نجم آفندی اور ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر کیے اور اپنے مقالے کا اختتام کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے تمام ادبی محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "کائنات نجم" جو نجم شناسی کی نئی راہ مستقبل میں پیش کرے گی اس کا نتیجہ آنے والے پچاس برس پر محیط ہے اور مرتبہ لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی ایک تحقیقی مشعل ثابت ہوگی۔" ڈاکٹر صاحب نے علامہ نجم کے مرثیے سے چند بند پیش کیے اور ان کے طرز تحریر پر گفتگو کرتے ہوئے خراج پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ نجم کی نظم "ارے" بھی سامعین کی نذر کی اور اس پر جو داد ان کو ملی وہ ان کا حصہ تھی۔

میر محفل ڈاکٹر شاہد نے علامہ نجم آفندی کے ایام زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے انھوں نے ان کے طرز زندگی اور ایام زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "علامہ کی زندگی ہم سب کے لیے درس اور مشعل راہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے بھی علامہ نجم کے شعر پر محفل کی نذر کیے۔ بعد "کائنات نجم" کی رونمائی بدست مولانا ڈاکٹر رضوی کی گئی اور کتاب مصنف نے مولانا کو پیش کی۔

مختتم پروفیسر باقر رضا نے آخر میں مختصر مگر جامع انداز میں ایک مقالہ پیش کیا۔ یہ ان اس محفل میں رونمائی کی بہت اچھی اور کامیاب کتاب کی رونمائی تھی

تھی۔ یہ کتاب جنوری 2000ء میں ملتان سے ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق، تدوین، تنقید، تشریح کی انمول کاوش ہے۔

اس کتاب میں مختصر سوانح عمری، انتخابِ کلام، منتخب کلام، ساقی ناموں کی بحث، قطعات، رباعیات، سلام اور پانچ مراثی شامل ہیں۔ اختتامِ تقریب پر ناظم محفل اور منتظم محفل جناب کاظم مرزا نے مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا اور چائے پیش کی گئی یوں یہ محفل اپنے اختتام پر پہنچی۔

ہم تجھ چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

25 اگست 2012ء

تقریبِ فیض فہمی نوٹنگھم (یوکے)

25 اگست بروز اتوار اہل قلم ڈاٹ کام کے زیر اہتمام نوٹنگھم یونے کے مقامی ہال میں عمدہ اور سیر حاصل علمی و ادبی تقریب کے انعقاد نے ثابت کر دیا کہ بیرون ملک بسنے والے پاکستانی اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کس قدر حساس اور فعال ہیں۔ تقریب فیض فہمی و نوٹنگھم عید الفطر اور 14 اگست کی خوشیوں کو سمیٹتے ہوئے فیض احمد فیض جیسی نابغہ روزگار ہستی پر لکھی گئی 1400 سے زائد صفحات پر مشتمل ڈاکٹر سید تقی عابدی (سویڈن) کی کتاب "فیض فہمی" کی رسم اجراء کرتے ہوئے مرتب کی گئی۔

یہ تقریب تین حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ "فیض فہمی" پر شرکاء کا اظہار خیال، دوسرا حصہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا توسیعی لیکچر "یہ دور فیض کا ہے" اور تیسرا حصہ "مشاعرہ بیاد فیض" تقریب فیض فہمی و نوٹنگھم کے پہلے دو حصوں کی نظامت سے فرائض محترمہ ارم رحمان قادری اور جناب شہزاد رحمان قادری نے انجام دیئے۔ دونوں نامور شخصیتوں نے فیض اور شخصیت پر "فیض فہمی" میں سے عمدہ اقتباسات اور فیض کے اشعار کوٹ کرتے محفل میں حاضرین کا لگاؤ آخر تک برقرار رکھا۔

اس تقریب میں نشستہ کا نور فیض احمد فیض رہے جنھوں نے اپنی منفرد سوچ اور انقلابی شاعری سے خاص و عام، مظلوم و محروم حوصلہ دیا اور سامراج کے چہرے سے نقاب نوچنے کی کوشش کرتے رہے۔ فیض اس حدیث نبوی پر نہ صرف خود عمل پیرا رہے۔۔۔۔ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دو۔۔۔۔ بلکہ دوسروں کو بھی اس پر عمل درآمد کی سعی و کوشش کرتے رہے۔ لیکن امن ایوارڈ یافتہ فیض نے قیدیں کاٹیں، ظلم سہے، مگر کبھی انسانیت سے منہ موڑا نہ اپنی شاعری میں سمیٹتے رہے۔ ایسے عظیم شاعر فن شخصیت

پر لکھی گئی دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی جدت اور انفرادیت کی مظہر "فیض فہمی" کے مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی ایسے وارثینِ قلم میں سے ہیں جو شہرت، نام و نمود یا عظمت و بلند اقبالی کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنا ان کی سرشت میں شامل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی اس تقریب کے صاحبِ محفل جب کہ جناب طالع مہدی (چیئرمین الحسین آئی انٹرنیشنل ٹرسٹ) صدرِ محفل اور لخت حسنین شاہ صاحب (چیئرمین مسلم ہینڈز) مہمانِ خصوصی۔ جب کہ رابعہ شفیق کیانی ڈائریکٹر ریڈیو پاک سیلوٹ اسپیشل اور محترمہ صدف مرزا، سحر فنی و شاعرہ و فنکارہ اور ڈاکٹر ابراہیم شفیق مہمانِ اعزازی رہے۔

صدرِ محفل جناب طالع مہدی نے کتاب کا سنہری ربن کاٹ کر اسے محفل کے سامنے پیش کیا اور اہلِ قلم حضرات کو اس کاوش کو سراہتے ہوئے حاضرینِ محفل کو کتاب کی مبارک باد پیش کی۔

لخت حسنین شاہ صاحب نے فیض کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ "فیض نے بات ہمیشہ غریب کی کی ہے اور وہ معاشرے کے مجبور، لاچار اور محکوم لوگوں کے حق کی بات کرنے والے انسان تھے۔"

رابعہ شفیق کیانی صاحبہ نے فیض فہمی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ "یہ کتاب فیض کی شخصیت کے ہر پہلو کا غیر جانبدارانہ طریقے سے احاطہ کرتی ہوئی منصفانہ تخلیق ہے جو بلاشبہ "فیض فہمی" ہے، فیض کی مدح سرائی نہیں ہے۔

محترمہ مہ جبین غزل انصاری نے کہا کہ "ہم اتنے فیض فہم پہلے کبھی نہیں تھے جتنے "فیض فہمی" کی بدولت ہوئے ہیں۔"

محترمہ صدف مرزا نے فیض کی مشہورِ زمانہ نظم پیش کرکے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر ابراہیم نے کتاب کو بے حد سراہا اور کہا "مجھ ناتواں سے یہ بوجھ تک اٹھتا نہیں، خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سے فیض یاب ہوسکیں۔"

انجم اعظمی نے کیا خوب صورت کہا ہے کہ "زندگی کی خوابیدہ کیفیتوں کا عکس فیض کے مصرعوں میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔" (بحوالہ فیض فہمی)

ڈاکٹر عابدی نے اپنے توسیعی لکچر میں انہی کیفیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ

"فیض نے بڑی خوب صورتی سے غم جاناں سے غم دوراں کا رشتہ جوڑا ہے۔

ع اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

ع خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

ع لوٹ جاتی ہے نظر کیا کیجیے

ڈاکٹر عابدی نے کہا ہے "اس وقت کے تنقید نگاروں نے بہت دہائی دی کہ فیض نے اچھی خاصی رومانی نظم کا مزا کرکرا کر دیا ہے۔ مگر فیض اپنے دور کے شاعر تھے اس لیے سو سال گزر جانے کے باوجود بھی یہ دور فیض کا دور معلوم ہوتا ہے۔ فیض زندہ و جاوید ہیں۔"

بلاشبہ اردو زبان و ادب کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کی جانب سے "فیض فہمی" ایک انمول تحفہ ہے، خدا ہمیں اس کتاب سے مستفید ہونے اور ڈاکٹر صاحب کے علم و فن میں ڈھیروں برکتیں عطا فرمائے۔ آمین۔۔۔

اس تقریب میں ڈاکٹر صاحب کی درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ درجنوں دوست اور زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرنے والی محترمہ ریحانہ ملک و پاکستانی کمیونٹی کی جانب سے اہل قلم جیسٹ پرفارمنس ایوارڈ بھی دیا گیا۔ محترمہ حسینہ شاہ صاحب نے ایوارڈ ریحانہ صاحبہ کو دیتے ہوئے کہا کہ "تدریس کے اس تذبذب میں والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو زبان و ادب اور کلچر کو اپنے بچوں میں منتقل کریں۔" ریحانہ صاحبہ نے ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ "اگر والدین ایسا کرنے میں اساتذہ کی مدد کریں تو یقیناً ہمارے بچے مغرب میں پروان چڑھنے کے باوجود پاکستانی روایت و اقدار سے جڑے رہیں گے۔"

محفل میں قدیر خان صاحب کی آواز اور چاند صاحب کی میوزک پیوزیشن میں بہترین فیض کی غزل اور کلام فیض پیش کیا جس نے محفل کا لطف دوبالا کر دیا۔

تقریب فیض فہمی سے دو سال پہلے ڈاکٹر صاحب کی دعوت کے بعد مشاعرہ بعنوان فیض Society Mind Creative کے تعاون سے پیش کیا گیا جس میں نامور محترمہ فرزانہ خان نینا، جناب شہزاد رحمان قادری نوید نے اپنے شاعرانہ انداز اور خوب صورت کلام سے حاضرین کا دل موہ لیا۔

محفل مشاعرہ میں ارم بتول قادری جرمنی، صدف مرزا، نمارک، جب کہ مقامی شعراء میں گلناز کوثر، سعدیہ، مہ جبیں غزل انصاری، فاروق سلہری، اشتیاق میر، سمعیہ ناز، ڈاکٹر مختار، جاوید اقبال، نعیم حیدر، مسعود احمد نے شرکت کی۔

خصوصی شکریہ، پاک فوڈز بارکین بازار، مسلم ہینڈز اور العین آئی انٹرنیشنل ٹرسٹ اور نمائندہ جیو نیوز جناب انجم میر، اے ٹو زیڈ سی ای او جناب فہیم عباس، اسٹیج ڈیزائنر اینڈ میڈیا منیجر جناب آفتاب برکت سنی اور تمام دوستوں کا شکریہ جنھوں نے فیض فہمی پروگرام کو کامیابی سے منعقد کروانے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

طارق محمود

''اُردو ٹائمز'' لندن

30/اگست 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کی اُردو ادب میں خدمات نئے جریزوں کی مانند ہے۔ پروفیسر صدیق قدوائی

فیض احمد فیض کو صوفیوں میں شمار کرتا ہوں،

ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی

فیض نے پرانے ساغروں میں نئی شراب استعمال کی ہے ڈاکٹر تقی عابدی

''فیض فہمی'' کی تقریب رونمائی سے خطاب

روزنامہ اردو ٹائمز کے معروف محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نئی کتاب ''فیض فہمی'' کی تقریب رونمائی گذشتہ اتوار کو نیسڈن کے علاقے میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کی۔ تقریب سے مہمان خصوصی جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی نے صدر کی کی۔ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی جس طرح میڈیکل پیشے سے وابستہ رہ کر اردو زبان و ادب کے لیے بڑی تندہی سے کام کر رہے ہیں ان کا یہ کارنامہ بھی اس سلسلے کی ایک اچھی مثال ہے۔'' انھوں نے کہا ''ڈاکٹر تقی عابدی نے مرزا غالب اور علامہ اقبال پر جو کام کیا وہ بھی انفرادیت میں سب سے مثال ہے۔ لیکن اب ''فیض فہمی'' کے ذریعے انہوں نے اپنا شمار پیدائشی اسکالر میں مختلف زاویوں سے فیض کی مختلف جہتوں کو اجاگر کرنے کی بدولت خود ایک کارنامہ ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی نے کہا ''میں صوفی نہیں ہوں ایک روایت کا نام ہے تو میں فیض کو صوفیوں میں شمار کرتا ہوں کیوں کہ فیض نے کسی کی برائی نہیں سنی۔'' تقریب سے خطاب میں

نہرو سنٹر کی ڈائریکٹر اور معروف ناول نگار سنگیتا بہادر نے نہایت دلکشی اور کلوکاری سے فیض احمد فیض کی مشہور نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" سے مصرعہ "تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے" پر سب کو تڑپایا اور محفل پر اپنی کلوکاری کا جادو جگا دیا۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی کاوش "فیض فہمی" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا "مجھے "فیض فہمی" مرتب کرنے میں دو سال کا عرصہ لگا ہے۔ اور اس عرق ریزی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فیض کے کلام میں جذبے کا خلوص، عمل کی خواہش اور رومانیت پائی جاتی ہے۔ فیض نے اپنی شاعری میں اردو نظم کو نیا اشاراتی آہنگ دیا ہے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا "میر تقی میر، میر انیس، مرزا غالب اور علامہ اقبال اردو کے چار عظیم، منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ فیض کا ان کے مقابلہ میں شمار نہیں ہوتا۔ لیکن ان عظیم اور بڑے شاعروں نے اپنے علم و فکر سے اردو زبان و ادب کو نئے الفاظ، معنی اور سوچ دی ہے۔ عظیم شاعر ہمیشہ ایک نئی منفرد سوچ لاتے ہیں اور خیال میں نئی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ عظیم شاعر نئی ڈکشنری فراہم کرتے ہیں، لیکن فیض نے پرانے ساغروں میں نئی شراب استعمال کی ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر لوگ لطف اٹھاتے ہیں۔ فیض کا سفر رومان سے انقلاب تک ہوا ہے۔ حبیب جالب اور جوش ملیح آبادی نے احتجاجی شاعری کی لیکن فیض کا انداز ان سے بہتر ہے۔ حسرت موہانی، احتشام حسین زیدی اور گلزار نے رومانی شاعری کی ان کے مقابلہ میں فیض بھی خوب ہیں۔ فیض ایسا شاعر ہے جو اردو ادب کو بہت کچھ دے چکا ہے۔"

تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی انڈین سائنیات نہرو یونیورسٹی دہلی کے چیئرمین نے کہا "ڈاکٹر تقی عابدی کا اردو زبان و ادب کے لیے کام کرنا، سنے جزیرے کی طرح نمودار ہونے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں اردو کے نقاد تو بہت ہیں لیکن معلومات نہیں۔ ان کے تجزیہ میں خوش مذاقی ہے۔ علم کا بوجھ نہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی تلاش و جستجو میں دنیا بھر کا سفر اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک جاسوس اپنے مشن پر ہوتا ہے۔ وہ انوکھی چیزیں تلاش کر کے اردو ادب کو دیتے ہیں اور ان کی کتابوں کا گیٹ اپ بھی شاہکار ہوتا ہے۔ "فیض فہمی" ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بے مثال دستاویز ہے۔"

طارق محمود
"نیشن" لندن
ستمبر 20..

فیضؔ نے رومان سے انقلاب کے سفر میں اُردو ادب کو نئے رنگ دیئے: ڈاکٹر تقی عابدی

ان کے کلام میں جذبوں کا خلوص اور رومانیت ملتی ہے۔
اپنی کتاب "فیضؔ فہمی" کی تقریب رونمائی سے خطاب۔
ڈاکٹر تقی نے غالب، اقبال اور فیضؔ پر مفید کام کیا شاہد عباس
ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو ادب و مفید چیزیں دی ہیں ڈاکٹر صدیق قدوائی

[illegible] ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "فیضؔ فہمی" کی تقریب رونمائی سے خطاب کر رہے تھے۔ جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کی۔ ڈاکٹر شاہد مہدی نے مزید کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی جس طرح میڈیکل پیشے سے وابستہ رہ کر اردو زبان و ادب کی بڑی تندہی سے کام کر رہے ہیں ان کا یہ کارنامہ اس کے قابل تقلید مثال ہے۔" انھوں نے کہا "ڈاکٹر تقی عابدی نے مرزا غالب اور علامہ اقبال پر جو کام کیا وہ بھی نہایت اہم اور بے مثال ہے۔ لیکن اب "فیضؔ فہمی" کے ذریعے انہوں نے فیضؔ کی شاعری میں مختلف زاویوں سے فیضؔ کی مختلف آراء کو اکٹھا کر دینا بہت خوبصورت کارنامہ ہے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی کاوش "فیضؔ فہمی" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا

''مجھے ''فیض فہمی'' مرتب کرنے میں دو سال کا عرصہ لگا ہے۔ اور اس عرق ریزی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فیض کے کلام میں جذبے کا خلوص، عمل کی خواہش اور رومانیت پائی جاتی ہے۔ فیض نے اپنی شاعری میں اردو نظم کو نیا اشاراتی آہنگ دیا ہے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا ''میر تقی میر، غالب اور علامہ اقبال اردو کے چار عظیم، منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ فیض کا ان کے مقابلہ میں شمار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان عظیم اور بڑے شاعروں نے اپنے علم و فکر سے اردو زبان و ادب کو نئے الفاظ و معنی اور سوچ دی ہے۔ عظیم شاعر ہمیشہ ایک نئی منفرد سوچ لاتے ہیں اور دنیا میں نئی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ عظیم شاعر نئی ڈکشنری فراہم کرتے ہیں، لیکن فیض نے پرانے لفظوں میں نئی شراب استعمال کی ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر لوگ لطف اٹھاتے ہیں۔ فیض کا سفر رومان سے انقلاب تک ہوا ہے۔ جیسے حبیب جالب اور جوش ملیح آبادی نے احتجاجی شاعری کی لیکن فیض کا انداز ان سے بہتر ہے۔ حسرت موہانی، مصطفیٰ زیدی اور کلیم نے رومانی شاعری کی ان کے مقابلہ میں فیض بھی خوب ہیں۔ فیض ایسا شاعر ہے جو اردو ادب کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔''

تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی انڈین انسٹیٹیوٹ نہرو یونیورسٹی کے چیئرمین نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی کا اردو زبان و ادب کے لیے کام کرنا ایک جزیرے کی طرح نمودار ہونے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں اردو کے نقاد تو بہت ہیں لیکن معلومات نہیں۔ ان کے تجزیہ میں خوش نداقی ہے۔ علم کا بوجھ نہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی تلاش ادب میں دنیا بھر کا سفر اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک جاسوس اپنے مشن پر ہوتا ہے۔ وہ انوکھی چیزیں تلاش کر کے اردو ادب کو دیتے ہیں اور ان کی کتابوں کا کیٹ اپ بھی شاہکار ہوتا ہے۔ ''فیض فہمی'' ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بے مثال دستاویز ہے۔''

تقریب کے آغاز میں ڈائریکٹر نہرو سنٹر اور معروف ناول نگار سنگیتا بہادر نے اپنی خوب صورت آواز میں فیض احمد فیض کی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' سنائی۔ تقریب میں ڈاکٹر جاوید شیخ، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر عبدالستار، ایوب اولیاء، ڈاکٹر محمد جاوید، صدف مرزا و دیگر علمی ادبی شخصیات ادیبوں، شاعروں نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد
13/ستمبر 2012ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''فیضؔ فہمی'' کی لندن میں رسم اجرا

عالمی شہرت یافتہ اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کی شاہکار کتاب ''فیضؔ فہمی'' کی رسم اجرا اسمٰعیلی مجلس لندن کے زیر اہتمام اتوار 26/اگست 2012ء کی شام نہرو سنٹر لندن میں جناب سید شاہد مہدی آئی اے ایس نائب صدر نشین انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز (آئی سی سی آر) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جناب سید شاہد مہدی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''فیضؔ پر شائع ہونے والی اب تک کی ساری کتابوں میں یہ سب سے جامع کتاب ہے اور اس میں نہ صرف نئے مضامین شامل ہیں بلکہ فیضؔ کے بارے میں مشاہیر کی بیسیوں نادر تحریریں اور فیضؔ کی نادر تصویریں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس موقع پر سنیتا بہادر آئی ایف ایس (ریٹائرڈ) سنٹر نے اپنے مسحور کن ترنم میں فیضؔ کا کلام سنایا۔ اس تقریب کی صدارت پدم شری ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی نے فرمائی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہر کام نہ صرف قابل قدر ہوتا ہے بلکہ قابل رشک بھی ہوتا ہے۔

صدف مرزا

ممتاز محقق معروف مصنف وشاعر
ڈاکٹر تقی عابدی کا دورہ یورپ

گزشتہ سال دنیا بھر میں فیضؔ کے سال کے نام سے جانا گیا اور اس سلسلے میں یورپ بھر میں منظم طور پر فیضؔ کی تقریبات کا انعقاد کیا گیا اور فیضؔ کی شاعری کے تراجم پیش کیے گئے۔ فیضؔ کے فن اور شخصیت پر کتب تحریر کی گئیں۔ لیکن فیضؔ کی زندگی اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریر کردہ ایک جامع، مفصل اور مربوط کتاب ''فیضؔ فہمی'' سال ہذا میں منظر عام پر آئی، جس نے فن پاروں اور فن شناسوں سے بھرپور توجہ اور مقبولیت کی سند حاصل کی۔ یہ منفرد اور نادر کتاب فیضؔ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اسناد اور حوالہ جات کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے تمام تر ابواب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ کتاب منظم اور باضابطہ انداز میں ایک دانشور کے شب و روز کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے فن اور شخصیت کی تفہیم تک قاری کی رہنمائی و فراہمی کرتی ہے لیکن وہ کہیں بھی شخصیت پرستی پر مائل نہیں کرتی بلکہ تمام تر ادبی دیانت داری کے ساتھ حالات و واقعات اور حقائق مربوط انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ فیضؔ کے کلام پر جو علمی و ادبی و لسانی اعتراضات کیے گئے ہیں وہ بھی صریحاً قارئین کی رسائی میں ہیں۔ بلاشبہ یہ طالب علموں اور فیضؔ پر مقالے تحریر کرنے والوں کے لیے ایک گراں قدر تحفے سے کم نہیں ہے۔

یورپ میں بھی اس کتاب کا پرشوق استقبال کیا گیا اور رسم اجراء کی تقریبات ہوئیں۔ اردو کی سب سے بڑی بستی برطانیہ سے ان پروگرامز کی ابتدا ہوئی۔

بارکن کے شہر نوٹنگھم میں بزم اہل قلم کے زیر اہتمام بین الاقوامی فیضؔ سیمینار کا

انعقاد کیا گیا۔ جس کے روح رواں شہزاد ارمان تھے۔ جس میں جرمنی سے ارم بتول، ڈنمارک سے صدف مرزا اور اسپین ریڈیو پاک سیلونا کے ڈائریکٹر راجہ شفیق یالی نے خصوصی شرکت کی۔ ریڈیو پاک سیلونا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ہر مہینے فیض انٹرنیشنل کے نام سے "فیض فہمی" "فیض شناسی" کے حوالے سے ایک پروگرام پیش کیا جس میں فیض کے خاندان اور احباب سے انٹرویوز کیے گئے اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی۔ اسی ریڈیو سے ڈاکٹر فرخ جابدی کی کتاب پر پہلا مفصل انٹرویو بھی پیش کیا گیا۔

راجہ شفیق یالی نے بھی کتاب "فیض فہمی" پر ایک خوب صورت مضمون پیش کیا۔ مانچسٹر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی طالبہ ارم بتول قادری نے "فیض فہمی" کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی اور صدف مرزا نے اس کتاب و "فیض شناسی" اور "فیض فہمی" کا ایک شاہکار قرار دیا، ایک اہم سنگ میل جس میں بے جا ستائش، بے جا مدح سرائی یا بے ترتیب تنقیدات نہیں ہیں بلکہ ادب کے شائقین و مداحین کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

مقامی شرکا میں مانچسٹر سے ڈاکٹر پرویز نے "فیض فہمی" پر بات کی جب کہ شام غزل اور مشاعرے میں برطانیہ بھر سے آئے معروف شعرا شامل تھے۔

غالباً "فیض فہمی" وہ کتاب ہے جس کی پذیرائی ہر شہر میں ہوئی۔ لندن میں نہرو سنٹر میں بھی ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت صدیق الرحمان قدوائی نے کی۔ مہمان خصوصی جناب شاہد مہدی تھے۔ نہرو سنٹر کی ڈائریکٹر محترمہ سنگیتا بہادر نے اپنے ہلکے پھلکے تعارف میں فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" پیش کی۔ نظامت کے فرائض صدف مرزا نے انجام دیے جن کو گزشتہ سال فیض امیر ورپ کی دعوت پر ڈیوزنٹ ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ تقریب میں نئے پرانے آرٹسٹ، شعرا بھی شامل تھے اور لندن کے ادبی حلقوں کی بھرپور شرکت بھی تھی۔ جن میں ڈیوڈ میتھیوز اور رضا علی عابدی، فرخ جابدی، ایوب ادیب اور ارشد عثمانی کے نام شامل ہیں۔ پروگرام کے بعد مصنف سے ملاقات بات چیت اور ان سے دستخط کے ساتھ کتاب حاصل کرنے والوں کا ذوق بھی دیدنی تھا۔

ہماری ادب محبت کی فضا میں اس شام کا اختتام ہوا۔

طارق محمود
ہفت روزہ ''اُردو ٹائمز'' انگلینڈ

مرزا غالبؔ کی شاعری برصغیر کا اچھوتا اثاثہ ہے:
ڈاکٹر سید تقی عابدی

کلام غالبؔ اُردو اور فارسی کی بے پناہ خدمات کر رہا ہے:
انسان کا شعور زبان سے پھوٹتا ہے
لندن یونیورسٹی اُردو سوسائٹی، اُردو تحریک عالمی کے اجلاس میں
مرزا غالبؔ کے فارسی کلام پر خصوصی خطاب

کلام مرزا غالبؔ برصغیر کا اچھوتا اثاثہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف علمی و ادبی شخصیت و ماہر سرجن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں اُردو سوسائٹی اور اُردو تحریک عالمی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس تقریب میں اُردو سوسائٹی سوآس اور اُردو تحریک عالمی نے انھیں اُردو ادب میں بڑا قدر ریسرچ خدمت سرانجام دینے پر خصوصی طور پر خطاب کے لیے مدعو کیا تھا اور اس موقع پر انھیں اعزازی شیلڈ دی۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر عبدالغفار عزم نے کی اور نظامت اُردو سوسائٹی کے صدر عامر خاں نے سرانجام دی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا ''کلام غالبؔ ذہانت و فطانت سے بھرپور ہے۔ ذہین و فطین شخص کا کلام عام لوگوں کی فہم سے بالا ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ کا کلام اور انداز فکر اس حد تک بلند ہے کہ نامور ناقدین و مبصرین اس کی حد تک نہیں پہنچ سکتے۔ غالبؔ کی تصانیف بہتیں ہیں اور ان کا سخن بہت زبردست ہے۔ اس کو سمجھنے اور عرق ریزی کی ضرورت ہے۔ جب آدمی ان کے کلام کو پڑھتا اور سمجھتا ہے تو احساسات میں

جذباتی ہو دوڑ جاتی ہے۔ مرزا غالب کا فارسی کے اعلیٰ ترین بزرگ ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے اور فارسی ادبیات اور ایران میں لوگ مرزا غالب کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایران میں کلام غالب سے دلچسپی بڑھ رہی ہے اردو کلام غالب میں اسی قدر دلچسپی سے رہے ہیں جس طرح جامی، عرفی، شیرازی، حافظ، نظیری، طاہر بابا فغانی ہیں۔

''نیوز ایڈیٹر'' لندن
7/جولائی 2018ء

کلامِ اقبالؔ انسان سے مربوط ہے لیکن انسان خود انسان کا ہی احترام نہیں کر رہا: ڈاکٹر سید تقی عابدی

پاکستانی ہائی کمشنر سید ابن عباس نے علامہ اقبالؔ کو ان کی اسّی ویں برسی کی مناسبت سے پاکستان ہائی کمیشن کے زیر اہتمام منعقدہ اقبالؔ کانفرنس میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہم نے اپنی غلطیوں سے علامہ اقبالؔ کو محدود کر دیا ہے حالاں کہ ان کا پیغام آفاقی ہے اُن کی شاعری میں کئی ادوار آئے ایک وقت تھا کہ انھوں نے ترانہ کا یا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

پھر انھوں نے کہا:

چین و عرب ہمارا

پھر انھوں نے مزید ایڈیشن کی

نیل کے ساحل سے تابخاکِ کاشغر

یہ جو اوراق تھے سیکولر تھے، جب کہ علامہ اقبالؔ جب یہاں طالب تھے تو ان کی سوچ میں بڑی وسعت آئی۔

ہائی کمشنر سید ابن عباس نے کہا ''آج شدید ضرورت ہے پیغامِ اقبالؔ کو نوجوانوں سے روشناس کرایا جائے۔'' انھوں نے کہا ''یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اقبالیات کے ماہر اس تقریب میں شریک ہوئے، آپ نے کتابیں لکھی ہیں، آپ کے قلم میں زور ہے نوجوانوں تک پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے لہٰذا طریقہ اختیار کیا جائے۔

گزشتہ سال قیام پاکستان کی ساٹھ سالہ تقریبات منائی گئیں، آج تقریب سے پہلے پاکستان بائی کمیشن میں بھی مجسمہ جناح کی رونمائی کی گئی ہے۔ اس تقریب سے پہلے ڈاکٹر جاوید اقبال چیئرمین اردو مرکز کا بھی شکریہ ہمارے بائی میشن کے اہلکاروں نے اس تقریب کو باوقار منعقد کرنے میں بے پناہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ سید ابن حسن نے کہا "میں اسی ماہ پاکستان واپس جا رہا ہوں یہ سفارت خانہ آپ کا ہے، ہمارا دل یہ کہتا ہے، آپ بھی اس سے وابستہ ہیں، آپ کا محبت کردار ہی پاکستان کے وقار کی ضمانت ہے، کمیونٹی نے جس طرح ہماری پذیرائی کی اس پر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ادارے اپنی حیثیت میں اہم ہوتے ہیں قومی مفاد کے لیے قائم دائم رہنے چاہئیں۔" بائی مشنہ سید ابن حسن نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی خدمات تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اردو زبان و ادب کی جو خدمات سرانجام دے رہا ہے وہ بہت مثالی ہیں۔" ڈاکٹر جاوید اقبال (اردو مرکز) نے بائی مشنہ و خواتین تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "میں پچاس سال سے یہاں قیام پذیر ہوں ہم نے سید ابن حسن جیسا سفیر نہ پہلے کبھی دیکھا اور نہ ہی دیکھیں گے۔" ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا "اقبال کی تعلیم مدرسہ میں ہوئی ان کی سوچ پر مدرسہ کا اثر ہوا تعلیمات تصوف سے بھی اثر لیا، علامہ سید حسن ایسے عالم تھے انھیں عربی فارسی زبان پر عبور تھا ان کی تربیت نے اقبال کی شاعری کو فصاحت بخشی۔"

اقبال کانگرس کے تین سیشن ہوئے پہلے سیشن کی صدارت بائی مشنہ سید ابن حسن، دوسرے سیشن کی صدارت ڈپٹی بائی میشنہ زاہد حفیظ چوہدری اور نظامت ڈاکٹر جاوید اقبال نے سرانجام دی، تیسرے سیشن میں مشاعرہ منعقد ہوا، پہلے دونوں سیشن سے خطاب کرتے ہوئے ماہرین اقبالیات پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور شعبہ اردو سے پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران نے کہا "علامہ اقبال ہمارے نمائندہ شاعر ہیں، ہر شاعر وہ ہوتا ہے جس کے کلام میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں عہدوں کی آوازیں شامل ہوں۔ اقبال قرآن کا شاعر ہے، اقبال کا بنیادی پیغام ہے کہ انسان اللہ کا نائب بن کے اپنے آپ و مشق سے پیار بیداری کرے، آج کا دور عالمگیریت کا دور ہے اپنے دور میں کی عالمگیریت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، اقبال نے کہا ہے کہ جو اپنی اقدار سے رجوع کرتا ہے

اقبال "خودی" کی سواری کی ہدایت کرتے ہیں۔ اقبال اس تصوف کی بات کرتے ہیں جو رہبانیت اور کاہلی کی طرف نہ لے جائے۔ اقبال نے نوجوانوں کو ہدایت کی ہے جو اپنے آج ماضی سے جڑا رہے گا تبھی وہ بہتر مستقبل کی نشاندہی کر سکے گا۔ ان کی نظر میں حرکت حیات ہے نیا دور جنم لے رہا ہے۔ جغرافیہ سے نکل کر کلمہ حق کہنے کی جرات کرنا چاہیے۔"

اردو ادبیات کے نامور محقق پروفیسر ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے کہا "پاکستان بائی کمیشن میں یہ ادبی قافلہ علامہ اقبال کی کتاب "بانگ درا" کی صدا ہے۔ علم کا دریا بہہ رہا ہے، جدید ٹکنالوجی کے ہتھیار علم کے پیاسوں کو میٹھا پانی پہنچا رہے ہیں، کلام اقبال انسان سے مربوط ہے لیکن آج انسان خود انسان کا بھی احترام نہیں کر رہا، اقبال کا پیغام آفاقی ہے، آگے بڑھ رہا ہے، اسرار خودی میں اقبال نے کہا یارب میرے سینہ میں باخبر دل دے وہ نظر دے کہ شراب کے نشہ میں بھی جس پر سکون اور انسانیت کی تابداری آشکار ہوا، اقبال احترام آدمیت کے قائل تھے کہ اگر آپ انسان کی رنگ نسل پر درجہ بندی کریں تو انسان نہیں، آج کا انسان اپنے آپ کو نہیں پہچان رہا، اقبال نے اسرار خودی میں کہا ہے کہ میری شاعری کا مقصد جدید اسلامی نظام تشکیل دینا ہے۔ اقبال کا بڑا مسئلہ ہے کہ کرپشن پر کھل کر بات کرتے ہیں، اسی لیے انھوں نے کہا لقمہ حلال نہیں تو طائر ہوتی کو پرواز نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے نامور محقق اکرام چغتائی نے کہا "علامہ اقبال کا جرمنی میں قیام اور مابعد طبیعات پر تحقیق بہت اہم ہے اس دور میں انھوں نے ہمعصر اکابرین کو جو خطوط لکھے وہ فکر اقبال کی عکاسی کرتے ہیں۔" پروفیسر افتخار ملک (ہاتھ یونیورسٹی) نے کہا "اقبال نے گوئٹے، برکسان، نطشے، رومی، حافظ، خیام، غزالی کی سوچ پر نظر رکھتے تھے، یورپ میں انڈسٹریل انقلاب کے بعد انسان دوڑ رہا ہے، اسے سوچ و بچار پر فریدم ہے، حضرت محمدؐ کے انتقال کے بعد اسلام فتنہ بازی کا شکار ہوا، مشرق سے منگولوں اور مغرب سے یورپی یلغار نے اسلام کو پیس کر رکھ دیا لیکن اسلام اپنی بقا اور مدافعت کرتا رہا ہے، اقبال حضرت محمدؐ کے بعد صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، انڈیا کو دہلی مسلم حکمرانوں نے بہت تحفظ دیا، سرسید نے کہا، ہمیں انگریزوں سے نہیں لڑنا، جب کہ جمال الدین افغانی نے کہا ہمیں انگریزوں سے لڑنا ہے، لیکن اقبال نے دونوں کو اکٹھا کیا، اقبال نیشنلزم کا، اعلیٰ

نہیں، آزادی و بہبود ازم کا علمبردار ہے، اہل یورپ سے اچھی چیزیں اپنانی چاہئیں، ہمارے سے نئے پرانے پھوٹتے ہیں اپنی زندگی کو دیکھیں، اپنے مسائل کو سمجھیں۔

پروفیسر خواجہ اکرام الدین نہرو یونیورسٹی دہلی نے کہا "علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں جو کردار تراشے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ نوجوان انہیں پڑھیں اور سمجھیں "بال جبریل" میں جب لفظ ابلیس سامنے آتا ہے تو ایک تصور سامنے آتا ہے کہ اپنی جرات انکار سے ابلیس نے اپنے آپ کو مرد ثابت کیا، آج کی مشکلات کا حل اقبال کی شاعری ہے، اقبال نے جس طرح ندی نالوں پہاڑوں کا ذکر کیا ہے، وہ جذباتیت ہے مگر شاعرانہ تقاضوں سے شیب و فراز کو سمجھنا ضروری ہے۔ اقبال نے ابلیس کا فلسفہ انکار جو پیش کیا ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔"

معروف براڈکاسٹر رضا علی عابدی نے کہا "علامہ اقبال کی نظم زندگی شمع کی صورت ہو، ایک بچہ بہت خوب صورت تمنا ہے، جس وہ پھول بننے کی تمنا کرتا ہے اور جس غریبوں کی حمایت کرتا ہے یوں کہ اسے معلوم ہے کہ غریبوں کا مقدمہ شروع ہونے والا ہے۔"

قبالیات کے ماہر پروفیسر شریف بقائی نے کہا "علامہ اقبال نے آیت قرآنی کو مدنظر رکھ کر شاعری کی ہے، ان کی شاعری میں فکر حدیث رواں، اقبال نے مشرق و مغربی فلاسفروں کو پڑھا تھا جو چیز اچھی ہوتی اس کو اپناتے تھے۔ انسان کو اللہ نے بنایا ہے، کسی شخص کو دوسرے فرد کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں۔" انہوں نے کہا "تقریریں تو ہوتی رہتی ہیں، ہمیں نوجوانوں کو مسجد کی طرف بلایا جائے اور ان کی کردار سازی کی جائے۔"

ڈاکٹر خلیل الرحمن (دہلی) نے کہا "علامہ اقبال نے لوٹے کا گہری نظر سے بار بار مطالعہ کیا۔ لوٹے کی خصوصیات سے متاثر ہو کر پیام مشرق لکھی، ہمیں خود اپنی نظر سے حقائق کو دیکھنا چاہئے، علامہ اقبال نے سنسکرت شاعری پڑھی تھی، سنسکرت شاعری میں ندی نالوں پہاڑوں کا بار بار ذکر ہے اور اقبال نے سنسکرت شاعری کا اثر لیا ہے، یورپ میں اس معاشرہ تھا اور اقبال نے اختلاف کیا ہے، ہر انسان نے مجھے ہدایت سے بچایا ہے۔"

ڈاکٹر عبدالرحمن عبد (نیویارک) نے کہا "اقبال کو سمجھنے کے لئے ہمیں نہ

پہنچتے رہیں۔ کلام اقبال کو سمجھنے کے لیے مسلمان اور اسلام سے شناسا ہونا ضروری ہے۔ عشق اور عقل کے مابین کش مکش۔"

ڈاکٹر آمنہ (لندن) نے کہا "اقبال نے مسجد قرطبہ کو جس عقیدت سے دیکھا ہے دراصل وہ یورپ میں اسلامی تہذیب اور مسلم کلچرل ہسٹری کی فکر مطالعہ ہے۔ کہ مشرق مغرب میں پل بن سکنے کا سامان تھا۔"

جموں یونیورسٹی انڈیا کے پروفیسر شہاب عنایت ملک نے کہا کہ "علامہ اقبال کی شاعری کو پڑھتے رہیں تو پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اقبال کا کشمیر سے تعلق رہا، دوبارہ سوا آٹھ عرصہ قیام کیا۔ کشمیر میں اقبال کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے، اقبال کو پاکستان تک محدود کرنا زیادتی ہے، اقبال نے ابتدا ہی اس بات سے کہ اقبال کا وطن ہندوستان ہے، اقبال سیکولر مائنڈ تھے، اقبال کا کسی فرقہ سے تعلق نہیں تھا۔ اقبال نے رام چندر جی پر خوب صورت نظم لکھی، المیہ تقسیم 1947ء کے بعد اقبال کا نام لینا مشکل ہو گیا، یعنی جس ناتھ آزاد نے اقبال دریافت کیا تو اب اقبال شوق سے پڑھا جانے لگا ہے۔"

ڈاکٹر نصرت مہدی (بھوپال) نے کہا "اقبال بہت دنوں بھوپال رہے، راس مسعود سے ان کے مراسم تھے اپنے قیام کے دوران انھوں نے چودہ نظمیں لکھیں، آج وہاں اردو اکیڈیمی و اقبال مرکز کے توسط سے غیر مسلم ماہرین اقبالیات کے مابین مکالمات کرائے گئے۔ تلسی داس اور اقبال کا تقابلی مطالعہ ہوا، اقبال ایک سوچ ہے جسے شوق سے پڑھا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر فاطمہ حسن انجمن ترقی اردو کراچی نے کہا "اقبال اور تصوف کا مطالعہ بہت ضروری ہے، جب ادب مسیحائی کی روش پر چل پڑے تو ڈاکٹر تقی عابدی اس کی مثال ہیں۔"

ڈپٹی ہائی کمشنر زاہد حفیظ چوہدری نے افتتاحیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "آپ سب کے بھروسہ پر اقبال کانفرنس منعقد کی گئی جتنی بڑی تعداد میں علامہ اقبال پر فکر انگیز مکالمات سنے یہ علمی تحقیق وسیع مطالعہ اور عرق ریزی کا حاصل ہے، آپ مفکرین کی علمی کاوش ہمارا اثاثہ ہے جو ہماری نوجوان نسل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔"

پاکستان ہائی کمیشن کی طرف سے آپ سب کا شکر گزار ہوں، فرحت سکریہ کی منیر

احمد، فرسٹ سکریٹری آصف خان اور دیگر سفارتی اہلکار نے ہمہ وقت مہمانوں کا انتہائی خیر سگالی سے فریضہ سرانجام دیا۔ آخری سیشن میں مشاعرہ وزیر صدارت ڈپٹی ہائی مشنر بدر حفیظ چوہدری منعقد ہوا۔ نظامت فیضان عارف، ڈاکٹر انصاری نے کلام اقبال کا سیلی سے پیش کیا، تقریب کے آغاز میں استقبالی کلمات سیکنڈ سکریٹری جواد اجمل، قاری عبدالرشید نے تلاوت قرآن فرمائی۔

ناہید ادا
(برلن)
19 / جولائی 2009ء

برلن میں ڈاکٹر تقی عابدی کے ساتھ شام اور مشاعرہ

19 / جولائی 2009ء کو جرمنی کے شہر برلن میں ایک ادبی شام اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ شام "بزم ادب برلن" کے صدر جناب علی حیدر وفا نے ادبی شام کا آغاز اپنے خطبہ صدارت سے کیا۔ جس میں انھوں نے برلن میں "بزم ادب" اور دوسری تنظیموں کی جانب سے اب تک ہونے والی ادبی کاوشوں کی مختصر تاریخ پیش کی۔ اس کے بعد برلن کی جانی پہچانی شاعرہ ناہید ادا نے پروگرام کے آغاز میں اردو کے مشہور شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات جناب ڈاکٹر تقی عابدی کو دعوت کلام دیا۔

کینیڈا سے تشریف لائے جناب ڈاکٹر تقی عابدی 35 تصانیف کے خالق ہیں۔ "اقبال کا فلسفہ تصوف" ان کے مقالے کا موضوع تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت باریک بینی سے اقبال کے فلسفے کا تحقیقی جائزہ پیش کیا۔

شام کے ٹھیک 6 بجے اس پروگرام کا آغاز ہوا۔ پروگرام کو دو حصوں میں منقسم کر کے ترتیب دیا گیا تھا۔ پہلے حصے میں مقالہ اور دوسرے حصے میں مشاعرہ رکھا گیا تھا۔ پروگرام کی صدارت، اردو کے مشہور شاعر و ادیب جناب عارف نقوی نے فرمائی۔

پروگرام کے دوسرے حصے میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے میں نظامت کے فرائض ناہید ادا نے نہایت ہی خوش گوار طریقہ سے ادا کیے۔ ناہید ادا نے روایت کے مطابق سب سے پہلے اپنا کلام سنایا۔ ناہید ادا نے یہ غزل ترنم سے سنائی۔

لاش پر کس کس کی روئے اب کوئی
یہ تماشے تو یہاں ہوتے رہے

اس کے بعد سرور غزالی نے اپنا کلام پیش کیا۔ اور وہ کچھ یوں ہے ؎

دم دم پھرے ہے مست قلندر حق ملے نہ پائے
حق کی تلاش میں حق کا جویا پھرتا آئے

حشرت معین سیمابرن کی ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں اس نے بعد نہیں دعوت کلام دیا گیا۔ ان کا یہ قطعہ بہت پسند کیا گیا۔

یہ چوڑیاں بھی کہیں حق بجو کو تکتی ہیں
ہوائے خوں سے مہکی آج شام عید
کہاں نغمۂ شیریں زباں سے ہوں جاری
لبِ فرات سسکتی ہے آج شام عید

اس کے بعد برن کے نامور دیوان شاعر جناب انور ظہیر رہبر نے مختلف مشاعرہ میں داد و داد کی خوب داد وصول کی۔ ان کے اس شعر کو بہت سراہا گیا۔

چھول جنگ کے لئے مت کلی ہے لازم
پھر بھی کلیاں ہیں کہ چپ چاپ کھلی جاتی ہیں

اب باری تھی برن کے مختار مشاعر جناب علی حیدر وفا کی، انھوں نے اپنی خوب صورت نظم سے حاضرین مشاعرہ کے دل موہ لیا۔ ان کا یہ شعر بہت سے لوگوں نے فرمائش کر کے بار بار سنا۔

شوخی دیدہ گلزار کہاں سے لاؤں
نغمۂ بلبل گلنار کہاں سے لاؤں

رخسار تجم صاحب برن کے ایک نہایت منجھے ہوئے شاعر ہیں انھوں نے یہ شعر سنایا۔

تتلیوں کے نیل ہوئے دیکھنا
سب تری خواب جھوٹے دیکھنا

اس کے بعد جناب حنیف تمنا صاحب نے اپنا کلام سنایا۔

بے ڈب سکوت بہار اب مجھے شاخ شاخ جلا دیا
میں مثل گل ہیں غنچہ رہ مجھے زخم زخم کھلا دیا

سب سے آخر میں صدر مشاعرہ جناب عارف نقوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

یہ محفل رنگ و بو ہے یہاں ہر بات نرالی ہوتی ہے
جب شمع جلے تو لو نکلے پروانہ جلے تو چھ بھی نہیں

سب سے آخر میں بزم ادب کی جانب سے سرور غزالی نے تمام مہمانوں اور مشاعرے کو کامیاب بنانے میں معاون بزم ادب کے اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

اس طرح یہ ایک خوب صورت اور یادگار شام اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس تقریب کے فوراً بعد تمام شعرائے کرام کے لیے ایک عشائیے کا اہتمام ایک ریستوران میں کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نہایت خوش گفتار اور زیبن متکلم رہیں۔ پروگرام کے بعد دیر تک وہ سامعین کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ بعد میں کھانے پر بھی سوالات اور جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔

ہائیڈل برگ (جرمنی)
20/جولائی 2009ء

جرمنی میں علامہ اقبالؔ سے اظہارِ عقیدت کی تقریب

علامہ اقبالؔ نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری جرمنی کے شہر میونخ کی ایک یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ لیکن آپ کا قیام ایک دوسرے خوب صورت شہر ہائیڈل برگ میں رہا جہاں سے دریائے "نیکر" گزرتا ہے۔ آپ اسی دریا کے کنارے ایک جگہ اکثر تشریف لے جاتے۔ آپ کی مشہور زمانہ فارسی نظم "ایک شام" اسی دریا کے کنارے لکھی گئی تھی۔ اس مقام پر وہ نظم ایک بڑے پتھر کی سل پر جرمن زبان میں ترجمے کے ساتھ کندہ ہے۔ اسی شہر میں ایک سڑک کا نام بھی "ساحل اقبال" رکھا گیا ہے۔ جس مکان میں علامہ اقبالؔ نے قیام کیا تھا اس پر ایک تختی بھی آویزاں کی گئی ہے۔ یہ ساری چیزیں علامہ اقبالؔ کی عظمت کے اعتراف میں جرمن حکومت کی جانب سے کی گئی ہیں۔

جرمنی میں مقیم ایک معروف شاعر، صحافی اور "حلقۂ ادب" جرمنی کے بانی اقبال حیدر نے علامہ اقبال سے اظہارِ عقیدت کے لیے ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ دریائے نیکر کے کنارے "ساحل اقبال" کے ایک حصے میں سبزہ زار پر سفید چادریں بچھا کر اور تکیے جما کر ایک ادبی نشست ترتیب دی گئی۔ اس تقریب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں مقیم روسی زبان کے معروف ادیب شاعر، دانشور اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سید تقی عابدی بھی وہاں شریک محفل تھے۔

تقریب کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے سید اقبال حیدر نے کہا کہ "اس کی یہ دلکش خواہش تھی کہ دریائے نیکر کے کنارے ایک شعری نشست کی جائے۔ اس بات پر وہ جس طرح فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس تقریب کا انعقاد اس وقت ممکن ہو سکا۔ بعد میں انہی سید صاحب نے علامہ اقبال کی مشہور نظم "جواب شکوہ" ترنم کے ساتھ سنائی۔ مشہور صحافی

شیخ مظفر نے کہا کہ "ہم جب بھی اپنے کسی مہمان یا بچوں کو یہاں لاتے ہیں تو علامہ اقبال کے حوالے سے ان یادگار مقامات کی تفصیل بتاتے ہیں، تاکہ اپنے قومی شاعر کی عظمت ان بچوں کے دلوں میں ابھی سے پیدا ہو اور وہ فخر محسوس کریں۔"

فرینکفرٹ، جرمنی میں نیشنل بینک آف پاکستان کے جنرل منیجر شاہد اقبال نے سید اقبال حیدر کو اس تقریب کے انعقاد پر مبارک باد دی۔ اتنے موثر اور خوب صورت انداز سے جو یاد منائی گئی وہ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہے۔ اس کے بعد شعراء کرام نے عظیم المرتبت علامہ اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

شاعروں میں سید اقبال (فرینکفرٹ)، شکیل چغتائی (برن)، حسن شاہد (پیرس)، شہزاد ارمان (ہائیڈل برگ)، ارم بتول قادری (ہائیڈل برگ)، شفیق مراد (برن)، شاہد زیدی (ہمبرگ)، ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر فرخ بیگ اور ڈاکٹر ارشد رضوی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے دریائے نیکر کے کنارے واقع "ساحل اقبال" نام دینے، علامہ کی قیام گاہ پر تختی نصب کرانے اور علامہ کو جرمن زبان سکھانے والی خاتون کی تلاش اور "ساحل اقبال" پر کلام اقبال والی سی ڈی بنوانے کی اپنی شدت کی یادوں کو تازہ کیا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس بات کا ذکر کیا کہ کس طرح علامہ اقبال نے جرمن شاعری اور فلسفے کا استفادہ کیا تھا۔ آپ نے علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا اور ان کی نظم "مسجد اقصیٰ" سنائی۔ سامعین کے پرزور اصرار پر جناب تقی عابدی نے اپنی ایک نظم بھی سنائی۔

اس تقریب میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے طلباء کے علاوہ کئی ادبی اور سماجی شخصیات نے مثلاً جناب طارق پرویز، جناب اسد اللہ خان، فرخ بیگ، ڈاکٹر ارشد رضوی، چوہدری محمد رفیق اور معروف شاعر شفیق مراد نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب سے قبل ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی طالبہ ارم بتول قادری اور ان کے بھائی نوجوان شاعر شہزاد ارمان قادری نے یونیورسٹی میں ایک تقریب کا انعقاد بھی کیا۔ تقریب کا آغاز شہزاد ارمان کی انتھک کوششوں سے بنی ایک اردو ویب سائٹ "اہل قلم ڈاٹ کام" کی رونمائی سے ہوا۔

یہ تقریب ڈاکٹر تقی عابدی کی صدارت میں ہوئی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر رشید
تھیں۔ محفل مشاعرہ کی نظامت ارم بتول اور عمران شاہ نے بڑے خوب صورت انداز میں
کی۔ ارم بتول، شہزاد ارمان، عمران شاہ، شفیق مراد، شاہد زیدی، شکیل جاذبی، سید قبال حیدر
اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنا کلام پیش کیا۔

بائیڈل برگ
(جرمنی)
22/جولائی 2009ء

ارم بتول اور شہزاد ارمان کے زیر اہتمام

ڈاکٹر تقی عابدی کے مبارک ہاتھوں
اہلِ قلم ڈاٹ کوم کی رونمائی

تقریب کی مہمان خصوصی سمن شاہ

بائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں ایک خوب صورت تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ ارم بتول نے تقریب کا آغاز کرتے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور ڈاکٹر تقی عابدی کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "پروگرام میں آپ کی شرکت کسی اعزاز سے کم نہیں۔" پھر جناب ڈاکٹر تقی عابدی کو دعوت دی کہ وہ اہل قلم ڈاٹ کوم کی رونمائی کریں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس خوب صورت ویب سائٹ کی رونمائی کی رسم ادا کی۔

اہل قلم ڈاٹ کوم کے تخلیق کار ارم بتول اور شہزاد ارمان ہیں۔ اس ویب سائٹ کا مقصد اردو ادب کی بے لوث خدمت ہے۔ اس تقریب میں معروف شاعرہ سمن شاہ خصوصی طور پر فرانس سے تشریف لائیں۔ تقریب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلا حصہ اہل قلم کی رونمائی کے حوالے سے اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر تقی عابدی کے لیکچر جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کو خصوصی دعوت دی گئی تھی اور ایک مختصر مشاعرہ کا اہتمام تھا اس مشاعرہ کی نظامت کے فرائض محترمہ سمن شاہ جو کہ پروگرام کی مہمان خصوصی بھی تھیں نے انجام دیے۔ پروگرام کے پہلے حصے کے اختتام کے بعد مہمانوں کی خاطر تواضع کی گئی، جس کے انتظامات شہزاد ارمان اور ان کی اہلیہ زیبا شہزاد نے بھرپور طریقے سے کیے۔ مہمان نوازی کی رسم ادا ہونے

کے فوراً بعد تقریب کے دوسرے حصہ کا آغاز محسن شاہ نے میزبانی کے فرائض سنبھالتے ہوئے کیا۔ اس مشاعرہ میں جرمنی میں مقیم شعرا کرام شہزاد ارمان، ارم بتول، شفیق مراد، اقبال حیدر، شاہد علی شاہد اور محسن شاہ نے اپنا کلام سنا کر محفل کی رونق دوبالا کیا۔

آخر میں جناب ڈاکٹر تقی عابدی نے شاعر مشرق علامہ اقبال پر ایک خوب صورت اور طویل معلوماتی لیکچر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کے کلام پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آخر میں ڈاکٹر تقی عابدی سے کئی حضرات نے علامہ اقبال کی شخصیت کے متعلق سوالات کیے جن کے تفصیلی جواب ڈاکٹر تقی عابدی نے دے کر ہماری معلومات میں قیمتی اضافہ کیا اور اس کے بعد حاضرین کے بے حد اصرار پر ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے اپنی ایک خوب صورت نظم "حسن مطلق" سنائی جسے سن کر تمام لوگ بہت محظوظ ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اس یادگار تقریب کا اختتام ہوا۔

ہائیڈل برگ
4/جون 2010ء

اہل قلم کے زیر اہتمام ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال سیمینار

''تذکرۂ اقبال''

اہل قلم [illegible] کے [illegible] اور تعریف ایڈیٹر کے قلم سے
4/جون 2010ء کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے [illegible] میں ''تذکرۂ اقبال''
(Iqbal Seminer) منعقد ہوا [illegible] معروف صحافی اور [illegible]
ہے۔ اردو ادب کی شاعر و مختلف موضوعات پر [illegible] پروفیسر اور [illegible]
سے [illegible] اقبالیات دانشور اور معروف شاعر [illegible] نے [illegible]

سیمینار کی نظامت کے فرائض اہل قلم انٹرنیشنل کے چیف ایڈیٹر اور [illegible] شاعر
ارمان اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی [illegible] میں [illegible] اور معروف شاعر
ارم بتول قادری نے انجام دیے۔ [illegible] سے [illegible] کا آغاز ہوا اور
ارم بتول قادری نے معزز مہمانوں کا [illegible] کرتے ہوئے کہا کہ ''اقبال واقعی زندہ
ہیں اور اقبال آج بھی ہمارے [illegible] ہیں۔ [illegible] نئی نسل کو ان کے افکار سے نئی
روشنی اور نئی زندگی ملتی ہے جہاں تک [illegible] کا تعلق ہے اس بات کی دلیل ہے۔

اقبال چیئر [illegible] کے [illegible] کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان
کی کوششوں کو سراہا، انھوں نے کہا کہ ہائیڈل برگ اور اقبال کے رشتے کو نظر انداز کرتے
ہوئے 2003ء میں اقبال چیئر کو ہائیڈل برگ سے برلن منتقل کیا جانے والا حکومت
پاکستان کا فیصلہ انتہائی غلط تھا، کیوں کہ ہائیڈل برگ کو پاکستان میں شہر اقبال کے طور پر
جانا جاتا ہے۔''

محترمہ صدف مرزا نے اپنے مقالے کے موضوع ''اقبال کے مرد مومن اور نطشے

کے سپہ سالار کا تعارفی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اقبال کا مردِ مومن تخیلی کائنات کا موجب بنتا ہے، باقی قافلہ افلاک کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں لیکن مردِ مومن تخیل کو تابندہ کائنات کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔۔۔ وہ انسان فلک کی بلندیوں پر اپنی سوچ اور عمل کی انگلیاں رکھ دیتا ہے۔

پروفیسر الطاف سید نے اپنے مضمون "اقبال کے جرمن قوم کے بارے میں تاثرات" پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اقبال، حافظ، رومی، ٹیگور اور نطشے سے بہت متاثر تھے اور اقبال جرمنی میں گوئٹے کی قبر پر حاضری کو نیچ سمجھتے تھے، اقبال نے یقیناً کہا تھا اور بالکل سچ کہا تھا کہ نطشے کا دماغ کفر کی طرف اور میں خود تھا۔ نطشے واقعی مجذوب تھا اور اس نے یورپ کے خیالات نظریات کو کوئی نیا فلسفہ دیے بغیر اتھل پتھل کر دیا ہے۔ ان میں یہ رہا ہے۔

آخر میں شعبہ اردو کے استاد عبدالقادر کی رہائی کے لئے دعائیہ نذر کرتے ہوئے ؎

آداب و علوم راہ گزر میرے ہیں
منزل در منزل یہ سفر میرے ہیں
اے فن تیری رفعت کا باعث جو بنے
پرواز وہ میری ہے وہ پر میرے ہیں

بعد ازاں ڈاکٹر تنویر عابدی نے "گوئٹے اور اقبال کے تصورِ فکری اور نظریاتی مماثلت" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ Clemous اور فارغ روزگاروں کے درمیان پہلے تو موازنہ ہی نہیں ہو سکتا جیسا کہ شعر کا ترجمہ نہیں ہو سکتا مگر ہم مجبور ہیں کہ شعر کی ترجمانی کریں، گوئٹے پر ہمارا علم محدود ہے اور ہم گوئٹے کو جتنا ہی جانتے ہیں جتنا وہ اپنے کلام سے اظہر ہے کی اور اردو ترجمے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ گوئٹے کا کلام ہوشمند اور نظم میں چالیس ضخیم جلدوں میں جرمن میں موجود ہے اس لیے گوئٹے کے کلام سے ترجمے، تحقیق اور تنقید کی شدید ضرورت ہے۔

جہاں تک علامہ کے کلام کا تعلق ہے، علامہ کے 25000 اشعار میں سے چند اشعار سے، اور وہ بھی کلیات اور دیوان، مجموعہ کتاب یا مضمون کی حد بندیوں سے ماورا کا تعلق

ادا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے عمیق مطالعے، تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ان دونوں شاعروں کے آہنگ سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے یوں کہ دریا سے دور رہ کر دریا کے اندرونی حالات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ قطرے کو چاہیے کہ وہ دریا میں مل کر دریا کے رموز سے واقف ہو، ورنہ جدا رہ کر دریا سے ایک روگر جب تک تنہا رہے گی وہ ناقص رہے گی۔'' ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''بعض نام نہاد تنقید نگاروں نے جو سب سے بڑا ظلم کیا وہ یہ ہے کہ اپنی چھوٹی سی ذہنیت کو ان پہاڑ جیسی شخصیت پر تصرف کر کے اپنے سوچ کو ان پر تھوپا جس کی وجہ سے خود بھی تنزل رہے اور ہمیں بھی تنزل کیا۔ علامہ کے ایک فارسی شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا کہ ''انسان کائنات میں نہیں سما سکتا یوں کہ کائنات چھوٹی ہے لیکن کائنات انسان میں سما سکتی ہے، گوئٹے اور اقبال کے موازنے میں جو اشعار کہے ہیں وہ صحیح نہیں بلکہ یہ اقبال کی حق بیانی ہے یوں کہ اقبال شرق کا نابغہ روزگار ہے اور گوئٹے غرب کا اور دونوں کے مسائل میں یکسانیت ہے۔ جو دونوں کے پاس آفاقیت ہے، یہاں عشق مجازی سے عشق حقیقی کا راستہ جاتا ہے، اور دونوں کے پاس انسانیت کی معراج ہے۔''

شریف اکیڈمی کے چیف ایگزیکٹو شفیق مراد نے اہل قلم ڈاٹ کام کی ایک سالہ کارکردگی پر بھرپور روشنی ڈالی اور اکیڈمی کے تحت شائع ہونے والی کتاب ''دل ہو تو ہے بھر گیا'' ڈاکٹر تقی عابدی کو پیش کی۔ اختتام پر شیخ ارمان نے معزز اسکالرز اور وائس آف جرمنی کی شعبہ اردو کی ڈائریکٹر محترمہ شور مصطفیٰ، فرینکفرٹ سے تشریف لائے ہوئے معروف شاعر اور کالم نگار سید اقبال حیدر، جناب شاہد خان اور سمیرہ مین راج ماروی، مزیدار اہتمام ضیافت پر زیب النسا ارمان کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ پروقار، خوب صورت اور تاریخی محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

مظفر شیخ
(نمائندہ جنگ)
2010ء

ہائیڈل برگ میں علامہ اقبالؔ سے اظہار عقیدت کے لیے تقریب کا انعقاد

دریائے نیکر کی وادی میں آباد قدیم شہر ہائیڈل برگ سے جرمنی کے پاکستانیوں کو ایک خاص نسبت ہے۔ مفکر پاکستان، شاعر مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے ایک سو دو سال قبل اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران چھ ماہ کا عرصہ یہاں گزارا تھا۔ اگرچہ یہ وقت انتہائی مختصر تھا مگر اس دوران اقبال نے جرمن زبان کی مزید سوجھ بوجھ حاصل کرنے، مشہور جرمن شاعروں اور دیگر فلسفیوں سے استفادہ کیا اور ماہرین اقبالیات کا کہنا ہے کہ جرمنی ہی میں اقبال نے غور و فکر اور فلسفہ گری کے وہ مراحل طے کیے جنھوں نے ان کی آئندہ شاعری اور فکری جہتیں وضع کیں جس طرح اقبال کی سوانح حیات میں ہائیڈل برگ میں قیام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جرمنی سے پاکستان اور پاکستانیوں کے رشتوں میں اقبال اور ہائیڈل برگ کا ذکر لازمی ہے۔

ہائیڈل برگ شہر نے بھی ایک سو سال قبل آنے والے مہمان کو فراموش نہیں کیا بلکہ اسے اعزاز بخشا اور اپنی تاریخ کا حصہ بنا لیا ہے۔ دریائے نیکر کے کنارے ایک سڑک کا نام "اقبال" کا نام دیا گیا ہے اور یہیں ایک وادی میں پتھر کی ایک بڑی سل پر نیکر کے کنارے کی یادگار نظم "ایک شام" کا جرمن ترجمہ کندہ کیا گیا ہے۔ جس مکان میں اقبال کا قیام رہا اس کی دیوار پر ایک یادگاری تختی آویزاں ہے۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی نے جنوبی ایشیا کی زبانوں میں اقبال فیلوشپ بھی قائم کی ہے اور دو سال قبل جرمنی میں اقبال کے قیام کے سو سال کے موقع پر ایک کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔ یہ تعلق کے لیے جرمنی آنے والے پاکستانیوں کی

بھی ہائیڈل برگ دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اور یہاں رہنے والے پاکستانی اپنے مہمانوں کو ہائیڈل برگ کی سیر کروانے کو میزبانی کے فرائض میں شامل سمجھتے ہیں۔ گزشتہ برس ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کے قیام کی یاد تازہ کرنے اور ان سے اظہار عقیدت کے لیے پورے دن کا ایک پروگرام منعقد ہوا جس کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ کینیڈا میں مقیم مشہور اور ممتاز ادیب، شاعر، دانشور اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سید تقی عابدی مہمان خصوصی تھے اور پروگرام کا ایک حصہ دریائے نیکر کے کنارے "ساحل اقبال" کے اس گوشہ میں بنے ہوئے پارک میں ایک نشست تھی جہاں اقبال کی یاد میں پتھر کی سل پر ان کی نظم کا ترجمہ کندہ ہے۔ منفرد انداز کی اس اولین تقریب کے محرک اور میزبان حلقہ ادب جرمنی کے بانی اور معروف شاعر سید اقبال حیدر تھے۔

جب کہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں ایک تقریب اور محفل مشاعرہ بزم اہل قلم کے زیر اہتمام ہوئی جس کا انتظام نوجوان پاکستانی طلباء اور شاعروں ارم بتول قادری اور شہزاد ارمان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ مقامی یونیورسٹی کے سابق طلباء، شعبہ اردو کی سربراہ ڈاکٹر سیبیلے اوسٹر ہیلڈ اور ہائیڈل برگ و دیگر شہروں سے آئے ہوئے شائقین شعر و ادب اور عقیدت مندان اقبال نے دونوں پروگراموں میں بھرپور شرکت کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے خطاب میں اقبال کے علمی و فکری سفر میں جرمنی کے سفر کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "بیگم عطیہ فیضی جو 1907ء میں اقبال کے ہمراہ ہائیڈل برگ آئی تھیں اپنی یادداشتوں میں یہ شہادت دے چکی ہیں کہ یہاں پہنچتے ہی اقبال کے انداز فکر میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اقبال ہائیڈل برگ کی پرسکون وادی کے لہلہاتے درختوں اور گھاس کی سرسبزی سے بھی فیض و وجدان حاصل کر رہے تھے۔"

خود اقبال نے مکتوبات میں یہاں تک لکھا کہ "ان کی روح ہائیڈل برگ کا سفر کرتی رہے گی۔ یہیں انھوں نے عظیم جرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے اور دوسرے فلسفیوں سے ذہنی روحانی اور فکری رشتے استوار کیے اور گوئٹے کے ہی دیوان مشرق و مغرب کے جواب میں پیام مشرق لکھی۔" "ساحل اقبال" پر گوشہ اقبال میں بیٹھے ہوئے عقیدت مندان اقبال نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے کلام اقبال کے سیاق و سباق پر گفتگو ہمہ تن گوش ہو کر سنی اور سرچشمہ

دریائے نیکر کے اس کنارے کا وہ سکون کاروں کی بھاری ٹریفک کے شور میں دب کر رہ گیا ہے، بعض لمحوں میں تو یوں محسوس ہوا کہ علامہ اقبال کی روح ان عقیدت مندوں سے درمیان ہی موجود ہے، جس کے احترام میں کبھی کبھی یہ ٹریفک کا شور بھی تھم جاتا تھا۔ شاعروں سید اقبال حیدر (فرینکفرٹ)، شکیل چغتائی (برن)، کمن شاہ (پیرس) شہزاد ارمان (بائیڈل برگ)، ارم بتول قادری (بائیڈل برگ) اور دیگر نے موقع کی مناسبت سے اقبال پر ہی اپنا اپنا کلام سنایا۔ شاہد اقبال خان نے اپنی نوعیت کی یہ پہلی محفل منعقد کرنے پر سید اقبال حیدر کو مبارک باد دی اور توقع ظاہر کی کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

بائیڈل برگ یونیورسٹی میں (۱۱) ہندی زبان میں پڑھنے والے، سابق طالب علم ڈاکٹر فرش بیگ اور ڈاکٹر ارشد رضوی بھی اس موقع پر موجود تھے انھوں نے اسی زمانہ میں نیکر کے کنارے کو ساحل اقبال کا نام دیئے، اقبال کے رہائشی مکان پر یادگاری تختی کی تنصیب، اقبال و جرمن زبان سیکھنے والی خاتون کی تلاش اور ساحل اقبال پر کلام اقبال، ان سب کو نبھانے میں اپنی شرکت کی یادوں کو تازہ کیا۔ جب ڈاکٹر تقی عابدی جرمن شاعری اور فلسفے سے اقبال کے استفادہ اور حصول وجدان کا ذکر کر رہے تھے اور شاعر مشرق اقبال کے ترانے اور رباعیاں گا رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ اقبال تو ۱۹۰۵ء میں یہاں سے اور یہاں کے درختوں کی ہوا میں اور کھاس کی سرسراہٹ و بھی حصول علم کا ذریعہ سمجھے لیکن یہ ہم جو اپنی زندگیاں یہاں پوری کر رہے ہیں اور ہماری جن نسلوں کو جرمنی کی یہ ہوا میں اور فضائیں جنہیں نصیب ہوئی ہیں کس قدر موقع سے فیض حاصل کر رہے ہیں اور یہاں تک اقبال کے فکر سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

پاکستانیوں و اپنی نسل کو اقبال سے متعارف و شناسا کرانے کے لیے بائیڈل برگ سے ساحل اقبال کا سفر روانہ ہوا جہاں اقبال کا نام اور پتھر پر کندہ کلام اقبال ہمارے لیے صرف باعث فخر و مسرت ہی نہیں چراغ راہ بھی ہونا چاہیے۔ جرمنی میں ہر ملک اور قوم کے تارکین وطن آباد ہیں لیکن یہ اعزاز پاکستانیوں کو حاصل ہے کہ ان سے ملک کا خوب چرچا بھی یہاں ہوتا رہتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مستقبل کا مورخ جرمنی میں پاکستانیوں کی تاریخ مرتب کرے گا تو یہاں سب سے پہلے آنے والے پاکستانی کا نام "محمد اقبال" ہی ملے گا۔

ساجدہ حنا (برلن)
یکم ستمبر 2011ء

''فیضؔ فہمی'' کی تقریب اجراء

''بزم ادب برلن'' کے بینر پر ڈاکٹر تقی عابدی کی تالیف کردہ کتاب ''فیضؔ فہمی'' کا جشن اجراء اور شاندار مشاعرے کا انعقاد

''بزم ادب'' کے جنرل سیکریٹری سرور غزالی اس تقریب کی نظامت فرما رہے تھے۔ معتبر اور مقتدر خواتین و حضرات ہال میں موجود تھے اور ڈاکٹر تقی عابدی کی آمد کے منتظر تھے۔ اچانک مائیک پر سرور غزالی کی آواز گونجی، ''معزز خواتین و حضرات! جس انتظار کا وقت ختم ہوا ہمارے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی تشریف لا چکے ہیں اور اب پروگرام شروع ہونا چاہتا ہے۔''

عابدی صاحب جب ہال میں داخل ہوئے تو تمام سامعین نے ان کا استقبال کیا۔ اسٹیج پر ''بزم ادب برلن'' کا بینر لگا ہوا تھا۔ ''فیضؔ فہمی'' ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب کے اجراء کا اعلان بھی نظر آ رہا تھا۔ اور تین مہمان خصوصی، ڈاکٹر تقی عابدی، شمس فریدی اور فیصل نواز چوہدری کے نام نظر آ رہے تھے۔

سرور غزالی نے پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے ہندوستان سے تشریف لائے شمس فریدی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ پھر ڈاکٹر تقی عابدی اور ناروے سے آئے مہمان فیصل نواز چوہدری، ڈپٹی ہیڈ آف کونسل (سفارت خانہ پاکستان، جرمنی) جناب مظہر جاوید ''بزم ادب برلن'' کے صدر محترم جناب ملی حیدر عابدی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ سرور غزالی نے جلسے کے آغاز پر اردو ادب میں اچھے اور غیر جانب دار نقادوں کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''تقی عابدی کی دریافت کے بعد اس کمی کا ازالہ ہو گیا ہے۔''

''بزم ادب برلن'' کے صدر علی حیدر عابدی نے اپنے خطبہ صدارت میں ڈاکٹر تقی عابدی کی برلن دوبارہ تشریف آوری پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کی دعوت پر دوبارہ برلن تشریف لائے اس پر تنظیم ''بزم ادب برلن'' ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے۔

علی حیدر عابدی نے محقق، ناقد، مصنف، شاعر تقی عابدی کی علمی اور فنی کاوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اور اس کے ساتھ انھوں نے ہندوستان سے جانے پہچانے شاعر شمس فریدی کا بھی تعارف کرایا اور کہا کہ ''دوسرے دور کے پروگرام میں مشاعرہ ہے جس کی صدارت شمس فریدی صاحب کریں گے۔ ناروے سے آئے اردو کے معروف افسانہ نگار کا تعارف کراتے ہوئے سرور غزالی سے ان کو اس پر آنے کی دعوت دی۔ ان کی مختصر تقریر کے بعد شمس فریدی صاحب سے سرور غزالی نے، جناب تقی عابدی صاحب کی خدمت میں ''بزم ادب برلن'' کی جانب سے پیش کردہ سپاس نامہ پڑھنے کی درخواست کی۔ سپاس نامہ میں اختصار کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی کے ادبی اور علمی تحقیق اور تنقیدی کاوشوں کا جامع طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ناظم جلسہ نے ''فیض فہمی'' کی رسم اجرا کے لیے پاکستان سے اپنی ہیڈ آف میشن سفارت خانہ برلن، جناب مظہر جاوید صاحب سے درخواست کی۔ ''فیض فہمی'' کی رسم اجرا کے بعد جناب مظہر جاوید صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں فیض کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی کو ان کی کتاب پر مبارک باد دی۔

سرور غزالی نے ڈاکٹر تقی عابدی کو دعوت دی کہ وہ فیض کی شاعری پر ایک توسیعی لیکچر دیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی شاعری پر ایک مبسوط تقریر کی اور فیض کی شاعری میں جان لیفس، ویم بلیک اور روزیٹی سے مماثل رنگوں کو واضح کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر فیض کی شاعری پر نہایت اہم باتوں پر مبنی تھی انھوں نے بتایا کہ فیض نے نہایت مختلف شاعری کی ہے لیکن اردو ادب میں ان کی گہری چھاپ ہے اور رہے گی۔ فیض کی شاعری دنیا سے رومانی شاعری کا نام دیا۔ پہلے دور کے آخر میں ستیہ پال آنند صاحب کا تنقیدی پیغام بنام ڈاکٹر تقی عابدی پڑھ کر سنایا گیا۔

چائے کے وقفے کے بعد دوسرے دور میں مشاعرے کا آغاز جناب شمس فریدی

صاحب کی صدارت میں ہوا۔ مشاعرے کا آغاز سرور غزالی نے اپنی آزاد نظم "سن فلاور" سے کیا۔ اس کے بعد مزاحیہ شاعر محمد ارشاد نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد ہر شاعر نے باری باری اپنا کلام سنایا انھیں ہمبرگ واپس جانا تھا اس لیے ان سے مشاعرے کے شروع میں ہی ان کا کلام سن لیا گیا۔ ان کے بعد سوشیا حق، ناہید اوا، بزم ادب کے صدر علی حیدر عابدی، فا، شکیل چغتائی، عشرت معین سیما، اقبال حیدر، تقی عابدی، حنیف تمنا اور عارف نقوی نے بھی اپنا کلام سنایا۔

مشاعرے کے اختتام پر صدر محفل جناب شمس فریدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ ان کی غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ایک چشمہ سراب تھا بس اور کچھ نہ تھا
سارا سفر عذاب تھا بس اور کچھ نہ تھا

آخر میں مخصوص مہمان ڈاکٹر تقی عابدی، شمس فریدی اور فیصل واز چوہدری کو پھولوں کے گلدستے پیش کیے گئے۔ سرور غزالی نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے تقریباً شب نے دس بجے بحسن خوبی مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا۔

تمام مہمان گرامی کو کھانے پر دعوت دی گئی۔ جس کا اہتمام شیرازی صاحب نے اپنے ریستوران میں کیا تھا۔

سیّد رضا حسین

13/مارچ 2015ء

جرمنی میں دوروزہ ادبی تقریبات

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے حوالے سے دنیا بھر میں تقریبات ہوتی رہتی ہیں مگر حکیم امت کو اس انوکھے انداز سے خراجِ عقیدت پیش کرنے کا خیال جرمنی میں مقیم معروف شاعر، ادیب اور صحافی سید اقبال حیدر کو ہی پہلے آیا اور انہوں نے تقریب کے لیے دریائے نیکر کے کنارے خوب صورت پارک کے اس گوشے کو چنا جہاں علامہ تشریف رکھتے تھے۔ شاعرِ مشرق سے چاہنے والے یہ سن کر ہوئے والی اس تقریب کا انتظار شدت سے کر رہے تھے، اور اس میں شرکت کے لیے اردو ادب کے معروف سفیر ڈاکٹر تقی عابدی خصوصی طور پر ہالینڈ سے تشریف لاتے ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی تقریب جمعہ 6 فروری کو ایشن، جرمنی میں دو روزہ ادبی تقریبات کا آغاز سرسبز و شاداب پہاڑوں کے حصار میں بہتے ہوئے دریائے نیکر کے کنارے قریب مقام "مقامِ اقبال" سے کیا گیا۔ حکیم امت ڈاکٹر اقبال کو اس منفرد انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جرمنی میں مقیم سفیرِ پاکستان جناب حسن جاوید، پریس قونسلر خدا حیدر خان سے قونصل جنرل ڈاکٹر اقبال قاضی فرینکفرٹ سے اور معروف ادیب ڈاکٹر تقی عابدی ہیلینڈ سے شریک ہوئے۔ دریائے نیکر کے کنارے ہلکی پھلکی بوندا باندی نے تقریب کا حسن دوبالا کر دیا۔ "پیغامِ اقبال اور عصری مسائل" کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سید حسن جاوید، سفیرِ پاکستان نے نہایت اہم اعلان کیا کہ ان کی خواہش ہوگی کہ جرمنی میں دریائے نیکر کے کنارے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی قیام گاہ خرید کر "اقبال میوزیم" بنائیں گے۔ اس کے لیے انہیں جرمنی میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ ہیلینڈ سے تشریف لائے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا "جرمنی اور ہالینڈ کے بارے میں شاعرِ مشرق نے اپنے قیام و اقامت

کے خوب صورت لمحات سے تعبیر کیا ہے، علامہ اقبال نے اُردو ادب کو "جاوید نامہ" اور "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" جیسی دو نایاب کتابیں عطا کی ہیں۔" قونصل جنرل آف پاکستان ڈاکٹر امتیاز قاضی نے اس خوب صورت مقام پر علامہ اقبال کی یاد منانے کی اس خوب صورت روایت پر زیورخ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے چیئرمین سید اقبال حیدر کو مبارکباد پیش کی۔

اسی سلسلے کی دوسری تقریب فرینکفرٹ کے خوب صورت ہال "ڈال ہاؤ" میں ہوئی جس میں سفیر پاکستان سید حسن جاوید کی دوسری کتاب "چائنیز سافٹ پاور کوڈ" اور اردو ادب کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کے 40 ویں ادبی شہ پارے "فیض شناسی" کی تقریب رونمائی تھی۔ کتابوں کی اس تقریب میں شرکت کے لیے فرینکفرٹ، جرمنی میں چانسلری قونصل جنرل لی یانگ نے شرکت کی اور اپنے خطاب میں کہا کہ "چین کا پاکستان کے ساتھ برادرانہ رشتہ قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" انھوں نے مزید کہا کہ "سفیر محترم جناب سید حسن جاوید نے "چائنیز سافٹ پاور کوڈ" کتاب لکھ کر ہمارا دل جیت لیا ہے۔"

قونصل جنرل آف پاکستان ڈاکٹر امتیاز قاضی صاحب نے کہا کہ "چائنیز سافٹ پاور کوڈ" اور "فیض شناسی" عالمی ادب میں خوب صورت اضافے ہے اور ان کتابوں کے مصنفین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سفیر عالمی اردو ادب ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض احمد فیض کی ادبی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی۔ تقریب کے پہلے حصے کی نظامت انتصار مہدی نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ تقریب رونمائی کے بعد محفل مشاعرہ ہوئی شعرا میں عطاء الرحمن اشرف، راجہ یوسف شفیق مراد، شازیہ نورین، طاہر عدیم، باقر زیدی، شکیل چغتائی، عاطف توقیر، سید اقبال حیدر اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا کلام سنایا اور داد تحسین حاصل کی۔ اس تقریب میں معزز مہمانان گرامی میں کمرشل قونصلر رضوان صاحب، نیشنل بینک آف پاکستان کے شاہد اقبال خان پاک جرمن پریس کلب کے سلیم بٹ، پی پی پی کے رہنما سجاد نقوی، ہوں عزیز سماجی شخصیت پرویز اختر کے علاوہ چوہدری محمد رفیق، عاصم علی، خاور علی، راشد غوری، سردار باجوہ، ڈاکٹر ایاز علی، اقبال خان، شکیلین نقوی، رانا بشیر، مشہود عارف، ریاض خان کے علاوہ کثیر تعداد میں پاکستانیوں نے شرکت کی، تقریب کے اختتام پر نقیب محفل اور میزبان سید اقبال حیدر نے معزز مہمانوں اور تقریب میں شریک شعرائے کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ پروقار تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

سید رضا حسین (فرینکفرٹ)
روزنامہ ''اودھ نامہ'' لکھنؤ
27 ستمبر 2016ء

ہائیڈل برگ میں دریائے نیکر کے کنارے محفلِ مشاعرہ

''ہائیڈل برگ'' جرمنی کا وہ خوب صورت شہر ہے جسے علامہ محمد اقبال نے جرمنی میں اپنے قیام کے لیے چنا، اور یہیں قیام کیا۔ انتہائی دلکش، خوب صورت ہرے بھرے پہاڑوں کے درمیان آباد شہر ہائیڈل برگ میں علامہ صاحب کا کمرہ آج بھی ان کے اس دور کے زیر استعمال فرنیچر کے ساتھ موجود ہے اور جرمن آثار قدیمہ کی وزارت نے اس کمرے کی دروازے پر علامہ محمد اقبال کے نام کی تختی آویزاں کر رکھی ہے اور دریائے نیکر کے کنارے ایک سڑک کو ''اقبال اوفر'' کے نام سے بھی جرمن حکومت نے تعظیماً منسوب کیا ہے۔ علامہ اقبال کو شہر ہائیڈل برگ کا اہمیت دینے کی وجہ بنا ہے۔ دریائے اسی کنارے پر پارک میں علامہ اقبال کی ایک نظم کو بڑی سی اپنی ''پتھر کی سل'' پر جرمن زبان میں ترجمے کے ساتھ موجود ہے، جو یہ نظر رکھنے والے شاعر مشرق کی یاد دلاتی ہے۔ پچھلے کئی برسوں کی طرح اس سال 2012 کی نشست میں جرمنی سے تشریف لائے اردو زبان کی عظیم شخصیت ڈاکٹر تقی عابدی نے دریائے اس کنارے ''مقام اقبال'' کا نام دیا اور اب دنیائے ادب میں دریا کا یہ کنارہ ''مقام اقبال'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی نے پچھلے 13 سال سے تواتر سے امسال بھی دریائے کنارے ہونی والی محفل کا انعقاد کیا۔ ان دوستوں چاندنی راتوں کی محفلوں سے سجا ہوا 13 ویں فرینکفرٹ نشست کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی، مہمان خصوصی جناب ندیم احمد (قونصل جنرل آف پاکستان) علامہ اسمٰعیل بخاری اور مہمان اعزازی ڈاکٹر مصباح الرحمن (ریسرچ کارڈیالوجسٹ ہیڈلبرگ یونیورسٹی، فرینکفرٹ) ڈاکٹر حسین بخاری (ایم فورٹ یونیورسٹی) سے علاوہ جرمنی سے معروف شعراء و ادبا قدیم سامعین نے شرکت کی۔ یہ نشست شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی یاد میں

منائی گئی جس میں "پیغام اقبال اور عصری مسائل" کے موضوع پر گفتگو ہوئی اور پھر بھرپور شاعری کی محفل سجی۔ اسی سلسلے کی دوسری نشست شام ۶ بجے فرینکفرٹ میں مولانا الطاف حسین حالی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ہوئی جس میں شاعر، ادیب، دانشور جناب ڈاکٹر تقی عابدی کے تازہ تین ادبی شہ پارے "کلیات حالی"، "حالی فہمی"، "مسدس حالی" کی رسم اجرا ہوئی اور مولانا الطاف حسین حالی کی اردو ادب کے لیے ناقابل فراموش خدمات پر ڈاکٹر تقی عابدی، جناب ندیم احمد، جناب ڈاکٹر مصباح الرحمن، جناب ڈاکٹر حسنین بخاری نے تفصیلی گفتگو کی۔ بعد ازاں شعرائے کرام نے اپنے کلام سے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ نیو مین ویلفیئر سوسائٹی جرمنی کے روح رواں سید اقبال حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "وہ جرمنی میں اسی طرح اردو ادب کے لیے خدمات سرانجام دیتے رہیں گے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کو یہ ادبی سرمایہ منتقل ہوتے رہے۔"

روزنامہ "جنگ"
21 اگست 2017ء

شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؔ کی یاد میں ادبی نشست

زیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی نے پچھلے برسوں کے تواتر سے امسال بھی دریا کے کنارے ہرے بھری گھاس سے مخملیں لان کو سفید چاندنی اور رنگا رنگ قمقموں سے سجا کر 13 ویں ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی، مہمان خصوصی جناب علامہ اسمٰعیل بخاری تھے۔ یہ نشست شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؔ کی یاد میں منائی گئی۔ جس میں "شاعر مشرق" کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مخصوص انداز میں افکار اقبالؔ پر گفتگو کی اور شاعری کی محفل سجی، شرکا میں انتظار مہدی، شیعہ مہدی، مدبر آسمان، پرویز زیدی، مظفر زیدی، ڈاکٹر وسیم، سلاح الدین، ڈاکٹر ارشد رضوی معروف صحافی، منور علی ور دیگر نے شرکت کی۔ زیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی کے روح رواں سید اقبال حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "وہ جرمنی میں اسی طرح اردو ادب کی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کو یہ سرمایہ منتقل ہوسکے۔"

سید رضا حسین (فرینکفرٹ)
25/اگست 2017ء

''دیوانِ سلام وکلام انیسؔ'' کی رسم اجراء

اقبالؔ اور گوئٹے کے افکار پر عالمی کانفرنس

مغرب اور مشرق کے دو شہوار گوئٹے اور اقبالؔ

شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؔ اور مغرب کے معروف مفکر، دانشور، شاعر گوئٹے کے افکار پر معلوماتی و ادبی کانفرنس کا اہتمام یورپین مینیجمنٹ ایسوسی ایشن جرمنی نے فرینکفرٹ میں کیا، جس کی صدارت قونصل جنرل ندیم احمد نے کی، مینیجمنٹ سے تشریف لائے ہوئے ادب ڈاکٹر تقی عابدی اور کمرشل قونصلر خواجہ فرخ نعیم مہمانان خصوصی تھے۔ تقریب کے پہلے حصہ میں موضوع تھا ''مغرب اور مشرق کے دو شہوار گوئٹے اور اقبالؔ'' گوئٹے اور اقبالؔ کے افکار پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے تقریب کے میزبان اور منتظم محفل سید اقبال حیدر نے کہا ''گوئٹے مشرق کے حافظ اور اقبالؔ مغرب کے گوئٹے سے مداح تھے، ''دیوان حافظ'' کا جرمنی ترجمہ ہوا، جو گوئٹے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ''دیوان حافظ'' کا مطالعہ گوئٹے کو مشرق کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ گوئٹے کی ذہنی ہجرت تھی، جسمانی نہیں، جس طرح مغرب کے گوئٹے نے حافظ سے سیکھا اسی طرح مشرق کے اقبالؔ نے مغرب کے گوئٹے سے استفادہ کیا۔''

تقی عابدی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا ''گوئٹے کی 82 سالہ زندگی اور اقبالؔ 61 سال کی زندگی اس طرح قبالؔ 24 سال چھوٹے اور اقبالؔ 1907ء میں جرمنی آئے، تین برسوں پہلے پیام مشرق میں غالبؔ کو مخاطب کرکے گوئٹے پر بات کرتے ہیں، کہ وائمر کی خاک نے، گوئٹے کے کلام نے ہم جیسوں کی آنکھوں میں روشنی پیدا کی۔ اس سے ظاہر

ہوا کہ پیرِ مشرق نے بہت کچھ شاعرِ مغرب سے حاصل کیا۔ اقبال نے اپنی مختلف کتابوں میں پانچ چھ جگہ گوئٹے کا ذکر کیا ہے۔ گوئٹے نے نپولین وغیرہ کے حملوں اور قتل و غارت سے پریشان ہو کر گوئٹے کہتا ہے کہ "چلو مشرق کے گلشن کی سیر کریں، جہاں پر انسانیت ہے، جہاں پر تہذیب ہے، جہاں پر آسودگی ہے اور جہاں پر انسانی قدریں ہیں، مشرق سے جیسی گفتگو کسی مغربی ادیب نے نہیں کی۔" اقبال اپنے اور گوئٹے کے لیے کہتے ہیں: "ہم دونوں دنائے ضمیر کائنات ہیں، ہمیشہ سے رازِ رازداں ہیں، ہم دونوں حیات اور ممات کی عظیم شخصیتیں ہیں، ہم دونوں کے خیالات خنجر کی طرح لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے ہیں، گوئٹے برجستہ طور پر شعر کہتا ہے اس کا تجزیہ کیا ہے میں خطبوں میں اپنا پیغام آپ تک پہنچاتا ہوں۔ ہم دونوں اس دنیائے راز کے رازدار ہیں۔"

معروف صحافی عرفان خان نے اپنی گفتگو میں کہا "جرمنی میں اقبال اور فکرِ اقبال کو زندہ رکھنے کا سہرا سید اقبال حیدر کے سر جاتا ہے آپ ہر سال اس سلسلے میں ادبی تقریبات منعقد کرتے ہیں۔ علامہ اقبال اور گوئٹے کی فکری ہم آہنگی میں گوئٹے کی انسان پسندی اور علم میں دلچسپی اقبال کے لیے گوئٹے کی طرف متوجہ ہونے کی اہم ترین وجہ تھی۔ گوئٹے نے اپنی شاعری میں خدا کی وحدانیت اور پیغمبر سے انسیت کا اظہار بھی جا بجا کیا ہے۔"

قونصل جنرل ندیم احمد نے صدارتی خطبہ میں کانفرنس کے میزبان سید اقبال حیدر کا شکریہ ادا کیا کہ وہ یورپ میں اردو شمع جلائے اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے مزید کہا "گوئٹے اور اقبال دونوں تاریخ میں فلسفے ادب کے حوالے سے بڑے نام ہیں دونوں کا کھوج اور تلاش ایک ہی چیز کی تھی وہ تھی انسانی خواہشات اور انسانی ضمیر۔ ان ہم موضوعات دونوں نے نثر اور نظم پر اپنے خیال کا اظہار کیا، گرمزاج دونوں کی ایک ہی تھی۔ مشرق کا رجحان روحانیت اور محسوسات کی طرف زیادہ رہا اور مغرب جسمانی خواہشات اور روز مرہ کی عملی زندگی کی طرف توجہ دیتا ہے۔" مرشل وسٹر خولپ فرنٹ فیم نے کہا کہ انہیں جرمنی میں کی تقریب میں پہلی مرتبہ شرکت کا اتفاق ہوا ہے اور اس بات پر بے پناہ مسرت ہوئی کہ یہاں اردو ادب سے اس خوب صورت زبان میں کام ہو رہا ہے اور اس کے لیے اقبال حیدر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ معروف بزنس مین اور سماجی شخصیت پرویز

اختر نے کہا "ہیومین ویلفیئر ایسوسی ایشن نے ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورت ادبی محفل سجائی، مجھے اُمید ہے اس کے روحِ رواں دیارِ غیر میں علم و ادب کی شمع اسی طرح جلائے رکھیں گے۔ تقریب کا دوسرا حصہ محفل مشاعرہ تھا اس سے پہلے نیو ادارہ ادب ڈاکٹر تقی عابدی کی 508 صفحات پر مشتمل کتاب "دیوان سلام و کلام انیس" کی رسم اجراء ہیومین ویلفیئر ایسوسی ایشن سید اقبال حیدر اور قونصل جنرل آف پاکستان ندیم احمد کے ہاتھوں ہوئی۔ محفل مشاعرہ میں جرمنی کے معروف شعراء میں وطن، رحمن اشرف، اسحاق ساجد، ارشد باشمی، مدبر آسان، سید اقبال حیدر، طاہر مجید اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا کلام سنایا، معززین شہر میں سید وجیہ الحسن جعفری، ڈاکٹر اسحاق علی، مقصود حیدر شاہ، ڈاکٹر ضیاء، ڈاکٹر مصباح الرحمن، پرویز زیدی، فخر خان، مظفر زیدی، منور علی شاہد، نذر حسین، حامد رضوی، طاہر ملک، دانیال رضا، محمود علی خان، فیصل خان کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی، آفتاب ترکی کی طرف سے سید ثقلین نقوی نے سنیئس اور ڈرنکس سے مہمانوں کی تواضع کی۔ آخر میں تقریب کے میزبان سید اقبال حیدر نے تمام مہمانوں اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

اقبال حیدر (بائیڈل برگ، جرمنی)

22/جون 2022ء

جرمنی میں دریائے نیکر کے "مقام اقبالؔ" پر شاعرِ مشرق کی یاد میں تقریب، شاندار خراجِ عقیدت

یونین ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی نے ۱۸ روزہ ادبی تقریبات کا آغاز سرسبز و شاداب پہاڑوں کے حصار میں بہتے ہوئے دریائے نیکر کے کنارے تقریب "مقام اقبالؔ" سے کیا۔ حکیم الامت شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال کو منفرد انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے پروفیسر ڈاکٹر اسلم سید اور حاجی رؤف ادب کے سفیر ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا سے شریک ہوئے۔ دریائے نیکر کے کنارے 37 درجہ حرارت کی گرمی میں پرندوں کی خوب صورتی و حسن کو محسوس کرتے، "علامہ اقبال اور ہوئے" کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے۔

اس موقع پر علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا "جرمنی بائیڈل برگ میں شاعرِ مشرق نے اپنے قیام کو رندی سے خوب صورت تخت سے تعبیر کیا۔ علامہ اقبال نے اردو ادب کو "جاوید نامہ" اسی دریائے نیکر کے کنارے بیٹھ کر دیا۔ بائیڈل برگ یونیورسٹی کی لائبریری میں اقبال کی اسی جگہ پر بیٹھے ہوئے کانسی کا مجسمہ بھی ہے اور اس خوب صورت مقام پر علامہ اقبال کی یاد منانے کی روایت پرنیون ویلفیئر ایسوسی ایشن کے چیئرمین سید اقبال حیدر نے شروع کی اور یقین دلایا کہ بائیڈل برگ کی انتظامیہ کی ادبی سرگرمیوں پر ہمیشہ حصہ لیتی رہے گی۔ رحیل بیگ نے گیت اور اقبال کی شخصیت کا ادبی تعارف پیش کیا۔

پاکستان سے آئے شاعر حسین بخاری نے علامہ اقبال کی نسبت سے تقریب سے متعلق تاثرات بیان کیے۔ پروفیسر ڈاکٹر اسلم سید نے ڈاکٹر اقبال کی شخصیت سے مختلف

پہلوؤں پر اظہار خیال کیا، خاص طور پر ان کے ہائیڈل برگ میں گذرے ہوئے ایام کی خوشگوار یادوں اور ان کے اثرات پر روشنی ڈالی۔ تقریب میں تین کتابوں کی تقریب رونمائی کی گئی۔ صحافی رحیل بیگ کی 223 صفحات کی کتاب "کالم کہانی" ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا شعبے کے پروفیسر ڈاکٹر ہارلڈ، صاحبہ رباب کی کتاب "عرفان کتاب مکتوب" پروفیسر اسلم سید اور مولانا مرزا محمد اطہر مرحوم کی 252 صفحات پر مشتمل کتاب "حیات اطہر بہ زبان اطہر" کی رونمائی بدست ڈاکٹر تقی عابدی ہوئی۔ پروگرام کے روح رواں سید اقبال حیدر نے تینوں کتابوں کو عالمی ادب میں خوب صورت اضافہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کتابوں کے مصنفین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تقریب رونمائی کے بعد محفل مشاعرہ ہوئی، شعرا میں نقیب محفل تقریب کے میزبان سید اقبال نے اپنے اشعار سنائے، ان کے بعد حیدر نقوی باقر زیدی، عدنان محسن (پاکستان)، ڈاکٹر فیصل کمال حیدری (پاکستان) طاہرہ رباب، حسنین بخاری (پاکستان)، ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنا کلام سنایا اور سامعین سے داد تحسین حاصل کی۔ تقریب میں کثیر تعداد میں محبان اردو اور محبان علامہ اقبال نے شرکت کی اور دریائے نیکر کے کنارے درختوں کے سائے تلے ایشین سنیاس سے طمانیت کی یاد تازہ کی۔ تقریب کے اختتام پر نقیب محفل اور میزبان سید اقبال حیدر نے معزز مہمانوں اور تقریب میں شریک شعرائے کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

واضح رہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے حوالے سے دنیا بھر میں تقریبات ہوتی رہتی ہیں مگر اس انداز سے خراج عقیدت پیش کرنے کا خیال جرمنی میں مقیم شاعر، ادیب اور صحافی سید اقبال حیدر کو 13 برس پہلے آیا اور انھوں نے تقریب کے لیے دریائے نیکر کے کنارے خوب صورت پارک کے اس گوشے کو چنا جہاں علامہ تشریف رکھتے تھے، شاعر مشرق کے جرمنی ہی نہیں یورپ بھر سے چاہنے والے ہائیڈل برگ میں ہر سال ہونے والی اس منفرد تقریب کا انتظار شدت سے کرتے ہیں۔

خصوصی رپورٹ

2008ء

تہران میں ڈاکٹر تقی عابدی کی ''کلیات غالبؔ فارسی'' کی تقاریب

''سازمان فرہنگ و ہنر کے جلسہ میں سفیر بھارت اور پاکستان نے کتاب کی رونمائی کی۔''

تہران کی معروف پبلشنگ کمپنی کے چیف مین ڈاکٹر امیری نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق، تدوین اور مرتبہ شاہکار کتاب ''کلیات غالب فارسی'' کو ایران میں پہلی بار بڑی تعداد میں شائع کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی مرتبہ ''کلیات غالب فارسی'' کو 2008ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے بڑے خوش طریقے پر شائع کیا ہے۔ اس کلیات میں تقی عابدی کی فارسی شاعری پر بسیط (۱۰۰) مقدمہ بھی شامل ہے۔ امیری پبلشرز نے کلیات میں موجود مقدمہ اور دوسری اردو تحریروں کو فارسی میں ترجمہ کرکے کلیات غالب ایک ہی جلد کے (۹۱۱) صفحات پر بڑے دیدہ زیب طریقہ پر شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی رونمائی وزارت فرہنگ و ہنر کی سرپرستی میں پاکستان اور بھارت کے سفیروں نے انجام دی۔ ایران میں موجود نامور غالبیات استاد محمد حسن عارفی جن کی دو کتابیں ''دیوان غزلیات غالب'' اور ''سومنات خیال'' (قصائد غالب) منظر عام پر آچکی ہیں، ڈاکٹر عابدی کی تدوینی کلیات فارسی اور اس کے بسیط مقدمہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''اس عظیم اور گرانقدر کام کے لئے غالب شناسی کی راہیں مکمل طور پر طے ہوچکی ہیں۔'' مقدمہ میں ڈاکٹر عابدی نے غالب کے کلام و فن کے جو زاویے پیش کئے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب و غالب کی فارسی شاعری کی تجزیہ کا سنگ میل قرار دیا۔ ڈاکٹر عارفی نے اپنی عالمانہ گفتگو میں غالب اور ان کی شخصیت اور شاعری پر بھی عمدہ مقالہ پیش کیا۔ بہت سراہا گیا۔

خصوصی رپورٹ

17 راگست 2008ء

''تہران میں ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف''

سازمان فرہنگ اور ارتباطات کے عالمانہ جلسہ کی مختصر روداد

تہران 17 راگست شام سے چھ بجے سازمان فرہنگ اور ارتباطات کی جانب سے سازمان نے کانفرنس ہال میں ایک خوب صورت علمی محفل ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں برپا کی گئی جس میں سب سے پہلے سازمان فرہنگ اور ارتباطات کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سلیمانی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے تفصیل سے ڈاکٹر عابدی کی فارسی ادبی خدمات خصوصی طور پر ''کلیات غالب فارسی'' اور ان کے توسط سے فارسی شعر و ادب کا برصغیر میں تعارف کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر سلیمانی نے ہندوپاک اور ایران کا علمی، تہذیبی اور ثقافتی رشتہ جو فارسی ادبیات کے ذریعہ صدیوں سے جڑا ہے کو مستحکم اور غیر فانی بتایا۔

ڈاکٹر حسن حیدری ماہر غالبیات نے غالب کی شخصیت اور فارسی شاعری پر بھرپور گفتگو کی موصوف نے ڈاکٹر عابدی کی مرتبہ ''کلیات غالب فارسی'' اور اس کے مقدمہ پر بھی سیر حاصل بات چیت کرتے کلیات و غالب شناسی کا سنگ میل قرار دیا۔ اس علمی محفل میں یونیورسٹی کے اساتذہ، شعراء، ادیب اور بڑی علمی شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر حسین مظفری، ڈاکٹر نجفی، ڈاکٹر زراری، ڈاکٹر حسن مظفری وغیرہ شامل تھے۔

اس تقریب کا کلیدی خطبہ ڈاکٹر تقی عابدی نے فارسی میں دیا، اور انھوں نے کوئی پون گھنٹے تک غالب کی فارسی شاعری کے مختلف گوشوں پر دلچسپ اور خوب صورت گفتگو کی جو پسند کی گئی۔ اس تقریب کے دوران ''کلیات غالب فارسی'' کی رونمائی ہندوپاک سے سفیروں نے انجام دی۔ یہ خوب صورت محفل فطرتی ضیافت پر ختم ہوئی۔

یونیورسٹی تہران (ایران)
25/اگست 2008ء

ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دانش گاہ تہران کے دانش کدہ زبانہا و ادبیات خارجی شعبہ اُردو زبان و ادب کا دورہ کیا

29/اگست کو ڈاکٹر سید تقی عابدی نے شعبہ اردو، دانش گاہ تہران کا دورہ کیا۔ ان کی آمد پر صدر شعبہ اردو ڈاکٹر علی بیات نے اپنی اور دیگر اساتذہ کی طرف سے دلی خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر بیات نے شعبے کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ تہران میں اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے لیے شعبے کے اساتذہ ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جہان اردو کے ہر آواز و دانشوروں اور ادیبوں کی فکری، علمی تعاون اور مشوروں کا استقبال کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے شعبے کے دیگر اساتذہ کے درمیان مختلف موضوعات پر پُر مغز اور علمی مباحثے ہوئے۔ اس وقت شعبے کی استاد محترمہ ڈاکٹر فرحی یزدان منش اور ڈاکٹر علی داودی نژاد نے مولانا حالی، مولانا شبلی اور سر سید احمد خان کی علمی خدمات کے بارے میں ان سے استفسار کیا جس پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد دیگر اساتذہ کے ساتھ میں لائبریری کا دورہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذاتی تین کتب شعبے کی لائبریرین کی خدمت میں پیش کیں۔ نیز انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ کینیڈا سے اپنی ذاتی لائبریری سے چند علمی و ادبی کتابیں ارسال فرمائیں گے۔ خاص طور پر نقاش کے وہ شمارے جو شعبے کی لائبریری میں موجود نہیں ہیں۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اردو ادب کے ممتاز محقق اور معروف ادیب ہیں جب کہ ان کا پیشہ طبابت ہے۔ وہ اس وقت اردو زبان و ادب کی تدریس، توسیع اور ترقی کے لیے مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ اب تک ان کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی کتابوں میں سے "تحقیق شناسی"، "تحقیق نامہ"، "دیوان رباعیات انیس"، "تجزیہ یادگار مرثیہ"، "کلیات غالب فارسی" (2 جلدیں)، "اقبال کے عرفانی زاویے" اور "مرزا دبیر" پڑھنے کے قابل کتابیں ہیں۔

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف تہران 1941ء میں افتتاح ہوا ہے اور اس وقت سے اب تک ہر سال مرزا 21 ایرانی نوجوان بی اے، ایم اے اردو زبان و ادب کے لیے داخلہ لیتے ہیں، نیز اس شعبے میں 2008ء سے سالانہ 6 طلبہ و طالبات ایم اے اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

تہران میں سفیرِ پاکستان ایم بی عباسی نے ''کلیاتِ غالب فارسی'' کی رونمائی کی

تہران میں متعین پاکستانی سفیر ہز ایکسیلنسی جناب ایم بی عباسی اور مسز عباسی نے ایئر پیسفک ریاض میں ڈاکٹر تقی عابدی کے اعزاز میں ایک عالیشان تقریب منعقد کی، جس میں بڑی تعداد میں پاکستانی اور ایرانی ادبی اور سیاسی عہدیدار شامل تھے۔ سفیر محترم جناب عباسی نے افطاری نوش فرمانے کے بعد اس پرشکوہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی ادبی کاوشوں کی تعریف کی اور ''کلیات غالب فارسی'' کو ان کی جانب سے عظیم تحفہ قرار دیا۔

سفیر محترم جناب عباسی نے ''کلیات غالب فارسی'' غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی مطبوعہ دو جلدوں کی رونمائی کی جب کہ مسز عباسی نے ''کلیات غالب فارسی'' مطبوعہ تہران کی نقاب کشائی کی۔ اس تقریب میں ایران کے سفیر مقیم اسلام آباد ماشاءاللہ شاکری بھی شریک تھے۔ ماشاءاللہ شاکری نے غالب کی فارسی غزل پڑھ کر محفل میں خاص سماں باندھ دیا۔ ماشاءاللہ شاکری اور دوسرے مہمانوں سے ڈائریکٹر جنرل جناب حسن منظوری نے بڑی تفصیل سے برصغیر میں فارسی شعر و ادب کا تذکرہ کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس تقریب سے بعد ایرانی ثقافتی وفد کے ارکین نے ڈاکٹر تقی عابدی، جناب سفیر پاکستان محترم عباسی، سفیر محترم ایران ماشاءاللہ شاکری اور ڈائریکٹر جناب منظوری سے ڈاکٹر تقی عابدی کی خدمات و کلیات غالب کے بارے میں تفصیلی پروگرام کیا۔

تہران میں سفیر بھارت ڈاکٹر سنجے سنگھ نے ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی رونمائی کی

تہران میں مقیم بھارت کے سفیر ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر سنجے سنگھ نے ڈاکٹر تقی عابدی کی شاہکار کتاب ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی ایک عظیم الشان تقریب میں رونمائی کی۔ سفیر بھارت نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی کا یہ کارنامہ غالب شناسی کا اہم اور یادگار کارنامہ ہے۔'' انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''فارسی شاعری سے ایشیائی ممالک کے درمیان جس میں فارسی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے ادبی، ثقافتی اور تہذیبی روابط و مزید تقویت حاصل ہوسکتی ہے۔

افتخار راغب
(جنرل سکریٹری بزم اُردو قطر)
12 دسمبر 2014ء

قطر کی قدیم ترین اُردو ادبی تنظیم "بزمِ اُردو قطر" کے زیر اہتمام

بارہواں عالمی سیمینار بعنوان "فیضؔ سیمینار"

اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے قطر میں 1959ء سے سرگرم عمل قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزم اردو قطر نے 12 دسمبر 2014ء بروز جمعہ سات بجے شب علامہ ابن خلدون ہیرئی فرینچ بن عمران کے وسیع ہال میں بارہواں عالمی سیمینار برائے فیض شناسی "فیضؔ سیمینار" کا انعقاد بہت اہتمام سے کیا۔ موجودہ دور میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ممتاز دانشور، محقق، ادیب اور شاعر جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر ایک معتبر و مستند حوالہ پوری اردو دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے "فیض شناسی" اور "فیض فہمی" کے نام سے تحقیقی کتابیں لکھ کر نہ صرف فیض احمد فیضؔ کی شاعری کی تفہیم و ترسیل کی ہے بلکہ اس حوالے سے پوری دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کی صدارت میں منعقد اس عالمی سیمینار میں ہندوستان سے تشریف لائے خوش فکر شاعر و ادیب جناب ملک العزیز کاتب کی مہمان خصوصی پر جلوہ فرما ہوئے۔ جب کہ بزم اردو قطر کے سرپرست اور بزم ہٰذا سے وابستہ معروف شخصیت جناب ظفر صدیقی نے مہمان اعزازی کی نشست کو رونق بخشی۔ نظامت کے فرائض انڈیا اردو سوسائٹی کے جناب صدر اور قطر کے معروف صاحب طرز شاعر جناب عتیق انظر نے نہایت عمدگی سے سرانجام دیے۔ تلاوت کلام اللہ کی سعادت خوش الحان صاحب علم عزیزم عبداللہ نے حاصل کی۔

بزم اردو قطر کے صدر و قطر کے معروف شاعر و ادیب جناب ڈاکٹر رفیق شاہ ادبی

نے بزم اُردو قطر کا مختصر تعارف اور خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تشریف آوری بزم اُردو قطر کے لیے خوش بختی کی بات ہے۔ قطر کے باذوق اور تعلیم یافتہ منتخب اور انتخاب سامعین کے لیے بھی ڈاکٹر تقی عابدی کی فیض احمد فیض پر گفتگو سے استفادہ کرنے اور اُن کی شاعری سے محظوظ ہونے کا یہ ایک نادر موقع ہے۔ ہم اسے برسوں یاد رکھیں گے۔"

فیض احمد فیض کا نام شعر و ادب کی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں علامہ محمد اقبال کے بعد جو نام اُبھر کر سامنے آئے ان میں نمایاں ترین نام فیض احمد فیض کا ہے۔ اردو ادب کے بہت سے ناقدین کے نزدیک فیض احمد فیض، غالب اور اقبال کے بعد اُردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ میر، غالب اور اقبال کے بعد جو داد و تحسین اور عوامی مقبولیت ان کے حصے میں آئی وہ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئی۔ ان تمیں کے عشرے میں شروع ہونے والی ان کی شاعری سن اسّی کی دہائی تک جاری رہی اور یوں ان کے کلام نے نصف صدی کا عرصہ اپنی رفعت میں لے رکھا ہے۔ فیض نے شاعری شروع کی تو اس وقت بہت سے قد آور شعراء موجود تھے جن کے درمیان خود کو منوانا آسان کام نہ تھا۔ جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ لیکن فیض کے منفرد انداز نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان کی شعری تصانیف میں "نقش فریادی"، "دست صبا"، "زنداں نامہ"، "دست تہ سنگ"، "سرِ وادیٔ سینا"، "شامِ شہرِ یاراں"، "میرے دل میرے مسافر" اور "نسخہ ہائے وفا" ہیں۔ فیض کی شاعری میں جمال، محبت، ہجر، وفا کے ساتھ ساتھ معاشرتی تضاد، فراز کے گہرے اثرات کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ فیض احمد فیض تقسیم ہند سے قبل 13 فروری کو 1911ء میں سیالکوٹ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ آپ نے اسکول ہی میں فارسی اور عربی زبان بھی سیکھی۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور انگلش میں ایم اے کیا۔ بعد میں آپ نے اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں بھی ایم اے کیا۔

فیض احمد فیض پر منعقد اس عالمی سیمینار میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے انتہائی معلوماتی

اور اہم مقالہ بعنوان ''فیض کی شاعری کی اولی معنویت'' پیش کیا۔ جس میں آپ نے فیض کے کلام کی اولی معنویت اور اکیسویں صدی میں اس کی اہمیت و مدلل انداز میں پیش کیا۔ سامعین نے نہایت دلچسپی سے آپ کے مقالے کو سنا اور ہر نکتے پر تالیوں کی گونج سے اپنی بھرپور پسندیدگی کا ثبوت دیتے رہے۔ ''فیض شناسی'' اور ''فیض فہمی'' کے عنوان سے ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی کتابوں نے فیض احمد فیض کی شاعری کی تفہیم کے لیے ساری دنیا میں مقبولیت حاصل کی ہے جو موصوف کی چالیس سے زائد تحقیقی تصنیفات میں شامل ہیں۔

آپ نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ''میر کے ایک لاکھ میں سے ہزار اشعار انیس کے بیاسی ہزار اشعار، میر کے اڑتیس ہزار اشعار، اقبال کے انچاس ہزار اشعار، غالب کے چودہ ہزار اشعار اور فیض کے تین ہزار مطبوعہ اشعار ہیں جب کہ فیض کے پاس صرف اٹھارہ سو اشعار ہیں۔ پچپن سالہ فیض کے شعری دور میں صرف ستر غزلیں ہیں جن میں کل چار سو پینسٹھ اشعار ہیں۔ اس کے باوجود فیض اپنی ایک پہچان بنانے میں انتہائی کامیاب نظر آتے ہیں۔ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فیض نے بالکل جا فرمایا ہے کہ

ہم نے جو طرز فغاں کی قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی مشہور نظم

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

پر بھرپور گفتگو کی اور نظم کی مختلف خوبیوں کو احسن طریقے سے اجاگر کیا۔ آپ نے فیض کی زندگی سے مختلف واقعات کا ذکر کیا اور ان واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی نظموں پر بھی عالمانہ گفتگو فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ ''فیض کے پاس احساس کی شدت، جذبوں کا خلوص اور عمل کی خواہش بہت نمایاں ہے۔ فیض نے قفس میں رہ کر بھی

اور کھایا بھی ہے۔ فیضؔ نے انسانیت کی وحدتی رَت پر ہاتھ رکھا ہے۔'' آپ نے کہا کہ ''شاعر کی اہمیت و عظمت وقت بتاتا ہے۔ بہت سارے شاعروں کے مجموعہ کلام کا جنازہ شاعر کے جنازے کے ساتھ ہی اٹھ جاتا ہے لیکن فیضؔ اکیسویں صدی میں بھی اسی آن بان کے ساتھ زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیضؔ کے چند پسندیدہ شعر اور ان سے چند گفتگو کے آخری شعر کے ذکر کے ساتھ متعدد اشعار اور نظموں پر گفتگو کی جس میں مندرجہ ذیل مشہور زمانہ اشعار بھی شامل تھے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

•••

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

•••

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

•••

وہ جب بھی کرتے ہیں نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

•••

در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض احمد فیضؔ پر سیمینار منعقد کرنے پر بزم اردو قطر کے ذمہ داران و اراکین کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ ''ایسی محفلیں سجائی جاتی رہنی چاہییں۔ جس میں باذوق سامعین کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان مہیا ہوتا رہے۔'' آپ نے بزم اردو قطر کا شکریہ بھی ادا کیا اور فیضؔ کی مندرجہ ذیل نظم کو پیش کر کے اپنی گفتگو کا اختتام کیا۔

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے

•••

جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشق رہتے تھے

•••

ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

•••

کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا

•••

پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

بزم ارد و قطر نے اب تک گیارہ عالمی سیمینار منعقد کیے ہیں جن میں سیمینار 1991ء، اقبال سیمینار 1992ء، غالب سیمینار 1993ء، فیض سیمینار 1994ء، امیر خسرو سیمینار 1995ء، میر انیس سیمینار 1996ء، آبرو شاہ مبارک سیمینار 2003ء، ولی سیمینار 2006ء، ولی سیمینار 2007ء، نظیر اکبر آبادی سیمینار 2009ء اور مخدوم سیمینار 2011ء شامل ہیں۔ بزم اردو قطر کے سیمیناروں میں ہندوستان سے گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر خلیق انجم، جوگندر پال، عبدالستار دلوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر عتیق رضوی، ساغر خیامی، ڈاکٹر محمد مہدی، خورشید احمد، ڈاکٹر کلیم عاجز، ڈاکٹر محبوب راہی، ابراہیم اشک اور ڈاکٹر مظہر مہدی اور پاکستان سے ڈاکٹر سلیم اختر، اسلم سومرو، شفیق احمد، انتظار حسین، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، کامران، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر بلال نقوی، سرفراز شاہد، نوید حیدر ہاشمی، محترمہ صوفیہ بیدار، یاقوت علی خاتم، انجم سلیمی،

محترمہ صدف اور مسعود عثمانی صاحبان کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بزم اردو قطر نے بارہویں عالمی سیمینار یعنی فیض سیمینار میں شرکت کے لیے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو دعوت دے کر اور ان کی "فیض فہمی" اور "فیض شناسی" سے قطر کے اہل اردو ادب کو مستفیض کر کے ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ اس موقع پر بزم اردو قطر کی جانب سے ڈاکٹر سید تقی عابدی اور جناب ملک العزیز کاتب کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سیمینار کے انعقاد میں بزم اردو قطر کے پیٹرن جناب ڈاکٹر فیصل حنیف خیال، صدر جناب محمد رفیق شاد اکولوی، جنرل سکریٹری جناب افتخار راغب کے ساتھ دیگر ذمہ داران وارا کین کے علاوہ سرپرست و پروگرام کوارڈینیٹر جناب نصیر احمد ناصر نے بہت اہم رول ادا کیا۔ سیمینار سے قبل حیدرآبادی اسپائسز ریسٹورینٹ کی جانب سے شاندار عشائیہ کا انتظام تھا جسے حاضرین نے خوب ذوق و شوق کے ساتھ نوش فرمایا۔ بزم اردو قطر نے حیدرآبادی اسپائسز ریسٹورینٹ کے ذمہ دار جناب محمد یاور حسین صاحب کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ قطر میں اردو داں حلقے کی علمی و ادبی تشنگی کو بجھانے کے لیے اور اردو ادب کے قد آور ادیب و شاعر علامہ شبلی نعمانی کی ادبی خدمات کے مختلف گوشوں کو متعارف کرنے کے لیے بزم اردو قطر نے ایک مثالی و پروقار عالمی سیمینار 2015ء میں منعقد کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جو ان شاء اللہ قطر کی اردو ادبی تاریخ میں ایک یادگار سیمینار ہوگا۔

صدر مجلس کے علاوہ مہمان خصوصی جناب ملک العزیز اور مہمان اعزازی جناب ظفر صدیقی نے خوشی کا اظہار کیا اور بزم اردو قطر کو مبارک باد پیش کی اور ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے بعد بزم اردو قطر کا شاندار سالانہ مشاعرہ 2014ء بھی منعقد ہوا جس میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر تقی عابدی اور مہمان خصوصی جناب ملک العزیز کاتب کے علاوہ قطر کے منتخب و معیاری شعرائے کرام نے شرکت کی جن میں شاعر خلیج جمیل نظامی، حقیقی نظر محمد رفیق شاد اکولوی، فرحتاش سید، افتخار راغب، رؤیس ممتاز اور وزیر احمد وزیر کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مشاعرے کی تفصیلی رپورٹ جلدی ہی پیش کی جائے گی۔

سوا سو سے زیادہ معزز سامعین نے سیمینار میں شرکت کی اور استفادہ کیا۔ جن میں بزم اردو قطر کے سرپرست سید عبدالحی و مولانا عبدالغفار، نصیر احمد کاتب چیف ایڈیٹر

ڈاکٹر فیصل حنیف خیال، صدر محمد رفیق شاد اکولوی، نائب صدر فیروز خان، جنرل سکریٹری افتخار راغب، خازن محمد غفران صدیقی، میڈیا سیکریٹری رئیس ممتاز، رابطہ سیکریٹری وزیر احمد وزیر، اراکین میں افسر عاصمی، عبدالمجید، سید آصف حسین اور خالد حسین، انڈیا اردو سوسائٹی کے صدر جلیل انصاری، حلقہ ادب اسلامی قطر کے صدر خلیل احمد، ڈاکٹر عبدالرحمن صدیقی ندوی، انڈین ایسوسی ایشن فار بہار اینڈ جھارکھنڈ کے صدر فاروق احمد، جنرل سکریٹری علیم اختر وجاہد عالم، شمس الحق آزاد، شفیق احمد، حامد رضا، سراج الحق، عدنان خان، پی ای سی کے سابق ڈائریکٹر شاعر فرتاش سید کے علاوہ ڈاکٹر توصیف ہاشمی، انجم حسن خان، رحمت اللہ ندوی، اشفاق احمد، اکرام الدین، ابوسعید ندوی، قیام الدین، شمس الرحمن صدیقی، سیف اللہ محمدی، فخر الدین رازی، محمد غوث، احتشام الدین ندوی، فیاض بخاری، عبدالحلیم، وحید احمد، محمد شفاق، سراج، حامد علی، شمس الدین رحیمی، سرفراز نواز، ذوالفقار ابراہیم، عبدالباسط، ندیم حسین، محمد حسین خان، بہاء الدین ندوی، عمران فاروقی، قاضی خان، عبدالسلام خان، ایم ایم پاشا، مختار احمد، انیس الرحمن، عتیق الرحمن، فیض الرحمن اقدس، فرزانہ، محمد زار خان، محمد ضمیر، شفاق الرحمن، عبداللہ، قاضی عبدالرشید، ولی محمد، ابوبکر زبیر، سرفراز الحق، محمد رشید، باسط بیگ، محمد ارشد، عبدالشکور، شیخ یاسین، جمیل احمد اور بشیر الدین صاحبان کے نام گرامی شامل ہیں۔

مرثیہ عدم تشدد کا داعی ہے

اُردو ادب میں شاعری کا اصل محور مرثیہ ہے

جامعہ کراچی شعبہ اُردو کے تحت عالمی سیمینار

مرثیہ موجودہ دور کے درد کا درماں بن سکتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی، سحر انصاری اور دیگر کا خطاب

کسی بھی واقعہ کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے انسانیت کے لئے رخ روشن کیے۔ انسانی تاریخ مہیب حادثات و سانحوں میں چنداں کمی نہیں آئی۔ البتہ انسانیت کے لیے جاں دینے والے کا غم دائمی غم بن جاتا ہے۔ واقعہ کربلا کے پس منظر میں ''مرثیہ'' ایک فصیح و بلیغ استعارہ بن گیا ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ مرثیہ میں ایسے ہی زندہ لوگ ملتے ہیں جو بظاہر سانس لیتے ہوں مگر وہ دلوں کو جلا بخشتے ہیں اور اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ چناں چہ مرثیہ کو کسی خاص فرقہ سے منسوب کرکے اس کی جو تعبیر بنا دی اس اہم صنف کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اردو ادب میں اخلاقی شاعری کا اصل محور مرثیہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایک روزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان ''اُردو مرثیہ۔ ادب عالیہ'' میں ممتاز مقررین ڈاکٹر تقی عابدی، سحر انصاری، ہلال نقوی، پروفیسر ظفر اقبال اور ڈاکٹر شمس الدین نے کیا۔ جس کا اہتمام جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو کی جانب سے کیا گیا تھا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنے کلیدی خطاب میں مرزا انیس و دبیر نگاری پر گہری روشنی ڈالتے ہوئے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''قابل توجہ امر تنقید نگاروں کا غیر محتاط رویہ ہے جس کی وجہ سے ادب کا ایک جامع حصہ قاری کی نظروں

سے اوجھل ہے۔ مرثیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موجودہ دور کے درد کا درماں بن سکتی ہے۔ مرثیہ عدم تشدد کا داعی ہے، شرکا محفل نے اس امر کی توجہ دلائی کہ اردو رسم خط شدید عدم تحفظ کا شکار ہے۔ جامعات کے اردو شعبہ جات کو اس طرف توجہ رکھنی چاہیے۔ پروفیسر سحر انصاری نے مرثیہ کو خاص اردو کی ایجاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ "یہ صنف کہیں سے مستعار نہیں ہوئی ہے اس لیے اس کی حفاظت بھی ہمارا ہی کام ہے۔"

اسرار زیدی
ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' پاکستان
15 تا 21 مارچ 2004ء

رثائی ادب و شاعری کا ارتقاء انیسؔ و دبیرؔ کی تخلیقات سے ہوا

یادگار دبیرؔ سیمینار میں تین کتابوں کی تقریب پذیرائی

اس بار جس تقریب کا ذکر مقصود ہے، وہ اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں کینیڈا میں مقیم معروف محقق اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کی تین کتب ایک ہی بلند پایہ مرثیہ نگار شخصیت مرزا سلامت علی دبیرؔ کی زندگی اور فن کے مختلف پہلوؤں کا انتہائی ناقدانہ اور محققانہ طور پر جائزہ لیا گیا تھا۔ ان کتب میں عنوان کے حوالے سے ''مجتہد نظم مرزا دبیرؔ''، ''سلک سلام دبیرؔ'' اور ''طالع مہر'' شامل ہیں۔ تینوں کتب حال ہی میں لاہور کے بک ناشر نے شائع کی ہیں۔

تینوں کتب کی تقریب پذیرائی عالمی مجلس ادب کے زیر اہتمام ایک مقامی ریسٹورنٹ میں انعقاد پذیر ہوئی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کی جب کہ متعلقہ موضوع پر اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر، سید وحید حسن ہاشمی، شہزاد احمد، مشکور حسین یاد، احمد عقیل روبی، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ڈاکٹر اجمل نیازی تھے۔ طاہر ناصر علی، نزہت ترابی، ہمی رضا کاظمی، رفعت عباس اور آصف قبال مغل نے مرزا دبیرؔ کو منظوم خراج عقیدت پیش کی۔ نظامت ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کی۔

اس امر کا ذکر بھی یہاں غیر ضروری نہ ہوگا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی ایک کتاب مرزا دبیرؔ کی شخصیت اور فن سے عبارت ہے، جس کا عنوان ''مجتہد نظم مرزا دبیرؔ'' ہے۔ دوسری

کتاب جس کا عنوان "سلک سلام و بیت" ممتاز مرثیہ نگار کے سلاموں پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب "طالع مہ" میں مرزا دبیر کا غیر مطبوعہ کلام شامل کیا گیا ہے۔

اپنے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر خواجہ زکریا نے متعلقہ موضوع کے ہونے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "تنقیدی اور تحقیقی سطح پر ہمیں میر انیس و مرزا دبیر سے سب سے پہلے شبلی نعمانی نے "موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر متعارف کرایا۔ اس موازنہ میں مولانا شبلی نے جو بنیادی بات کہی تھی، وہ یہ تھی کہ میر انیس آمد کے اور مرزا دبیر آورد کے شاعر ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "اس کے بعد دونوں ممتاز مرثیہ نگاروں کے حوالے سے جو مباحث ہوئے یا مضمون تحریر کیے گئے، ان کا محرک "موازنہ انیس و دبیر" ہی ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دونوں مرثیہ نگار انتہائی زود گو اور قریب قریب کے ہم عصر شاعر تھے۔"

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کہا کہ "شبلی نعمانی کا "موازنہ انیس و دبیر" اپنی جگہ تاہم موجودہ دور میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ان عظیم المرتبت مرثیہ نگاروں کا جدید تناظر میں مطالعہ کیا جائے۔ ادب کا ایک عام طالب علم میر انیس کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے تاہم مرزا سلامت علی دبیر کی شخصیت اور فن سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔"

صاحب صدارت نے مقالوں کے مصنف ڈاکٹر تقی عابدی کو ان کی کارکردگی پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "انھوں نے اپنی ان کتب کے ذریعے مرزا دبیر کو ہمارے سامنے بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ موصوف خود ایک ہمہ جہت شاعر اور محقق ہیں۔ انھوں نے قبل ازیں میر انیس اور علامہ اقبال کے بارے میں تحقیقی مضامین تحریر کیے اور متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے قوی امید ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کاوشیں علمی و ادبی حلقوں میں بطور خاص پذیرائی حاصل کریں گی اور ان کے توسط سے دبیر شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔"

پروفیسر ڈاکٹر نجم الحسنین رضوی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اردو شعر و ادب بالخصوص مرثیہ و مرثیہ نگاری میں مرزا سلامت علی دبیر کی حیثیت مسلمہ ہے۔ یہ امر بڑا اچنبھا ہے کہ بیشتر لوگ میر انیس کے حوالے میں مرزا دبیر کو لاتے ہیں جب کہ یہ حقیقت ہے

مؤخرالذکر خود بھی میر انیس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ یہ بڑی عظمت ہے۔ انھوں نے میر انیس کی وفات کے بعد یہ کہہ کر مرثیہ لکھنا چھوڑ دیا۔ "انیس کی وفات کے بعد مرثیہ لکھنے کا لطف نہیں رہا۔"

ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے تھی کہ رثائی ادب و شاعری کا ارتقا انیس و دبیر کی تخلیقات سے ہوا۔ دونوں نے بے شمار بلند پایہ مرثیے، سلام، منقبت اور رباعیات تخلیق کی ہیں۔ یہ ہماری شعری تاریخ کا بڑا اہم جزو ہیں۔ مرزا دبیر تو اس قدر قادر الکلام مرثیہ گو تھے کہ انھوں نے متعدد مرثیے ایسے تخلیق کیے جن میں نقطوں والا کوئی لفظ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر تقی نے ان مرثیوں کو بھی یکجا کرنے کا بڑا اہم کام کیا ہے۔

دیگر مقررین نے بھی مرثیہ نگاری کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا کہ "انیس و دبیر محض مرثیہ نگار ہی نہیں، شاعری کے دو روشن ستارے ہیں، جو آج ہی نہیں آنے والے ادوار میں بھی فروزاں رہیں گے۔" نیز یہ کہ "ڈاکٹر تقی عابدی نے دور دراز کے ملک میں رہتے ہوئے مرزا دبیر کا کلام جمع کرنے اور ان کی شخصیت کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے ایک ناقابل فراموش کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ موصوف نے مرزا دبیر اور ان کی پوری شاعری کا نئے سرے سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مرحلے پر تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "انھوں نے مرزا دبیر پر جو کام کیا ہے، وہ ان کی برس ہا برس کی محنت شاق کا نتیجہ ہے۔" انھوں نے بتایا کہ "ان تین کتابوں کے علاوہ بھی دبیر کے مراثی اور فکر و فن کے موضوعات پر متعدد کتب تحریر کی ہیں، جو انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔" انھوں نے کہا کہ "اردو شاعری میں مرزا دبیر کو بے حد اہمیت حاصل ہے لیکن مولانا شبلی سے لے کر موجودہ ناقدین سب نے ان سے اغماض برتا ہے۔"

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "مرزا دبیر نے تمام دوسرے مرثیہ نگاروں سے زیادہ مرثیے کہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے۔ یہاں تک کہ اس میدان میں انھوں نے نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔" آخر میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں

نے اتنی پذیرائی کی ہے۔

یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ عالمی مجلس ادب اور اظہار سے اشتراک سے مرزا دبیر کے بارے میں دانش قلی عابدی کی کتب کی جو تقریب منعقد کی گئی ہے، وہ "یادگار دبیر سیمینار" کے نام سے موسوم کی گئی ہے اور اس امر کا قوی امکان ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ہفت روزہ "فیملی" پاکستان
17 تا 23 اپریل 2005ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتابوں کی رونمائی اور مرزا دبیر پر سیمینار

گزشتہ دنوں بزمِ مجلس ادب پاکستان کے زیر اہتمام مقامی ہوٹل میں اردو کے بے مثال شاعر مرزا سلامت علی دبیر کی شخصیت و فن پر ایک یادگار سیمینار منعقد ہوا۔ اس موقع پر نامور محقق ڈاکٹر تقی عابدی کی دبیر کے حوالے سے مرتب کردہ تین کتب "لب المصائب"، "مصحف فارسی" اور "مثنویات دبیر" کی رونمائی بھی ہوئی۔ سیمینار کی صدارت معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے کی۔ جب کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور ڈاکٹر سلیم اختر مہمانانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اور پروفیسر عبدالکریم خالد نے سیمینار میں اپنے مقالات پیش کیے۔ دیگر اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور عرفی ہاشمی شامل تھے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے "مثنویاتِ دبیر" پر لکھے گئے اپنے مضمون میں دبیر کی مثنویوں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ "اردو مثنویوں کی کتابوں اور تذکروں میں اب تک دبیر کی تین مثنویوں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے تحقیق سے دبیر کی مزید پانچ مثنویوں کو دریافت کیا ہے۔ جن میں دبیر کا ایک غیر مطبوعہ مخطوطہ بھی شامل ہے۔ جو دبیر کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ان کی یہ کاوش لائق تحسین ہے کہ انھوں نے دبیر کو ایک مرثیہ نگار کے علاوہ ایک اہم مثنوی نگار کے طور پر بھی متعارف کرایا ہے۔"

پروفیسر عبدالکریم خالد نے "ایک عظیم تحقیقی کارنامہ" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی بنیادی طور پر طب کے پیشے سے منسلک ہیں لیکن

تحقیق سے شغف میں امریکہ و برطانیہ اور کینیڈا سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ کینیڈا کے شہر ورنن میں ایک پتھالوجسٹ اور فزیشن کے طور پر معروف ہیں۔ یہ بات کی بات ہے کہ اپنی مصروف ترین زندگی میں انھوں نے ایک ضابطے کے تحت قابل لحاظ اوقات ادبی تحقیق کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ اردو سے ادبی اور انسانی محبت ہزاروں میل دور بیٹھ کر تن تنہا وہ کام سرانجام دے رہے ہیں جو ہمارے یہاں مستقل اداروں سے بھی انجام نہیں دے پاتے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق کا اہم موضوع انیس اور دبیر ہیں۔

گزشتہ دو برس کے دوران دبیر پر ان کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اس وقت وہ دبیر کے مرثیوں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "دبیر کی نثری تصنیف "ادب المصائب" 1811ء سال قبل لکھی گئی نادر و نایاب کتاب ہے۔ جسے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دریافت کرنے کے بعد بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو انیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں لکھی جانے والی اردو نثر کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مقدمے میں کتاب کے موضوع اور اسلوب پر نہایت شستہ اور مبسوط بحث کی ہے جو عالمانہ بحث ہے وہ تحقیق اور تنقید دونوں میں اعلیٰ معیار قائم کرتی ہے۔ "مصحف فارسی" کا ذکر کرتے ہوئے عبدالکریم خالد نے کہا کہ "اس کتاب میں مرثیہ دبیر کی فارسی رباعیات، قطعات، سلام، مخمسات اور مسدسات کے علاوہ ان کے غیر مطبوعہ نثری رسائل اور مکتوبات بھی شامل ہیں جو دبیر کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی فارسی دانی کے جوہر دکھائے ہیں۔

سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اجمل نیازی نے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی محنت اور ریاضت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا یہ تحقیقی کام اردو زبان و ادب کی اتنی بڑی خدمت ہے جس کی موجودہ دور میں کوئی مثال نہیں ملتی۔" انھوں نے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی انسان کے میں ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے بھی مسیحا ہیں۔"

عرفی ہاشمی نے کہا کہ "ہمیں جدید دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب کے فروغ و اشاعت کے لیے انٹرنیٹ کی دستیابی میں لانا چاہیے تاکہ ہم پوری دنیا میں اردو

ادب کو متعارف کرائیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی کی محنت اور محققانہ جستجو قابل تعریف ہے۔" عام طور پر غیر ممالک سے پاکستان آنے والے ادبا شعری مجموعے لے کر آتے ہیں۔ لیکن وہ پہلے شخص ہیں جو بھاری بھرکم تحقیقی کتابوں کے ساتھ پاکستان آئے۔"

سیمینار کے صدر انتظار حسین نے کہا کہ "میر انیس کے مقابلے میں دبیر کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ شبلی کے "موازنہ انیس و دبیر" کے بعد ہمارے ناقدین کی زیادہ توجہ انیس کی طرف رہی اور مرزا دبیر ذہنوں سے محو ہوتے چلے گئے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دبیر پر اوپر تلے چھ کتابیں مرتب کر کے دبیر کو نئے سرے سے زندہ کر دیا ہے۔ انھوں نے وقت ظاہر کی کہ ڈاکٹر تقی عابدی جلد ہی دبیر کے مرثیوں کو تحقیقی منظر عام پر لائیں گے اور دبیر شناسی کے تمام مراحل طے کریں گے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ممتاز شاعر اور ناقد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے انجام دیئے۔ اس موقع پر انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب کی پاکستان آمد پر ان کی شاندار انداز میں پذیرائی ہونی ہے۔ ان کے اعزاز میں بہت سی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ جی سی یونیورسٹی لاہور اور اردو سائنس بورڈ میں انھوں نے ادب کی موجودہ صورت حال پر خصوصی لکچرز دیئے۔ ایک نشست پروفیسر مشکور حسین یاد کے گھر میں منعقد ہوئی جس میں شہر کے چیدہ ادیبوں نے شرکت کی۔ لاہور کے ادیبوں سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی جاری رہا۔ جس سے ان کے ادبی اور تحقیقی کام سے متعارف ہونے میں مدد ملی۔

روزنامہ ''امروز''، ''جسارت''، ''نوائے وقت''، ''کراچی''، ''ایکسپریس''، ''قومی اخبار''، ''خبریں''، ''جنگ''، ''ایوننگ پوسٹ''

24 جنوری 2006ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق و تدوین ''کائناتِ نجم'' کی تقریب اجراء

پاک و ہند کے مشہور محقق و مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق و تدوین ''کائناتِ نجم'' کی تقریب اجراء 20 جنوری 2006ء بروز جمعرات 7 بجے شام بمقام کلب بار ایسوسی ایشن (کے بی سی اے) منعقد کی جارہی ہے۔ تقریب کے مہمان خصوصی (سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی) ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کریں گے۔ اس موقع پر کتاب کے مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی خصوصی خطاب کریں گے۔ تقریب میں پروفیسر شاہدہ حسن، تاجدار عادل، ڈاکٹر یاس نقوی، ڈاکٹر سلمان ترابی اور پروفیسر حنا انصاری اظہار خیال کریں گے۔ تقریب کے تلاوت سید اکبر شاہ، نظامت حسین، نجم، سید نجم، سید اکبر شاہ نقوی پڑھیں گے۔ سید محمد رضوی، سید اظہر حسنین اور سید جعفری نے تمام اہل ادب اور شخصیات سے شرکت کی استدعا کی ہے۔

روزنامہ "جناح"، "مساوات"، "نوائے وقت"، "اوصاف" لاہور
16-30 دسمبر 2008ء

پاکستان میں اُردو کو قومی اور سرکاری زبان کا درجہ جائے: تقی عابدی

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا اُردو زبان و ادب پر خصوصی لیکچر

شعبہ اُردو یونیورسٹی آف ایجوکیشن اور مال کیمپس لاہور کے زیر اہتمام پذیرائی کے لیے معروف محقق اور ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی کے خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر منعقدہ تقریب کی صدارت ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کی۔ عالم لسانیات، محقق، ناقد اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اُردو کے مراکز سے دور بیٹھ کر تحقیق و تنقید کا جو کام تنہا سرانجام دیا ہے وہ ادارے بھی مل کر نہیں کر سکتے اور ان کی تمیں سے زیادہ کتب ان کی ذہانت کی عکاس ہیں۔" ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "اُردو زبان ادب، بین الاقوامی تناظر میں" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے پاکستان سے باہر اُردو ادب کی تازہ ترین صورت حال پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ "اُردو کے مقابلے میں ہندی زبان زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ اگر ہم نے پاکستان میں اُردو کو ایک قومی اور سرکاری زبان کے طور پر قبول نہ کیا تو پھر پاکستان سے باہر بھی اُردو بولنے والا نہیں ملے گا۔" ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے صدارتی خطاب میں موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اُردو زبان و ادب کے طالب علموں پر زور دیا کہ وہ اُردو زبان کو ہر سطح پر رائج کرنے کے لیے اسے درست طور پر سیکھیں اور اس کے فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کریں۔ انھوں نے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی ایک ہشت پہلو نگینہ ہیں اور انھوں نے بے شمار موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔" آخر میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے معزز مہمانوں کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ اساتذہ اور طلبا و طالبات کی ایک کثیر تعداد نے اس لیکچر میں شرکت فرمائی۔

روزنامہ ''جناح''، ''نوائے وقت''، ''انصاف''، ''اساس''، ''انصاف''، ''آواز''، ''آج کل''، ''سما''، ''آواز''، ''جناح''، ''مساوات'' لاہور

26 دسمبر 2008ء

مرزا سلامت علی دبیر کی یاد میں انٹرنیشنل سیمینار

اُردو کی حقیقی تفہیم کے لیے دبیر کے کلام سے استفادہ کرنا ہوگا

عالمی مجلس ادب پاکستان اور پیپلز لائبریری سوسائٹی کی جانب سے گزشتہ روز مرزا سلامت علی دبیر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ایک یادگار انٹرنیشنل سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سلیم اختر نے کی جب کہ امجد اسلام امجد مہمان خصوصی تھے۔ سینیٹر ڈاکٹر سے معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر قمر رئیس عابدی اور امریکہ سے ویل انصاری خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ عالمی مجلس ادب کے چیئرمین ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کہا کہ ''عصری ضرورتوں میں ہم نے جس تخلیق کار کو فراموش کر دیا ہے جو شعر و ادب کا اہم ترین ستون رہا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''دبیر کا مقام انیس سے بھی بلند ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔'' ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے افتتاحی کلمات میں کہا کہ ''دبیر فہمی کی آج بے حد ضرورت ہے یوں کہ ہم اپنی حقیقی تہذیب و ثقافت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔'' امجد اسلام امجد نے کہا کہ ''آج دبیر شناسی کی زیادہ ضرورت ہے اور قمر عابدی نے مرزا دبیر کے حوالے جو کام کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔'' ویل انصاری نے کہا کہ ''پوری دنیا میں اردو بولنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اردو کی حقیقی تفہیم کے لیے بھی ہمیں دبیر کے کلام سے مزید استفادہ کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر قمر عابدی نے کہا کہ ''دبیر اردو زبان کا ایک بہت بڑا شاعر ہے اور اس کی بہت قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔'' انھوں نے دبیر کی رباعیات کے حوالے سے بعض نکات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ان کی دبیر شناسی کے حوالے سے تین کتابوں ''رباعیات دبیر'' کا افتتاح بھی ڈاکٹر سلیم اختر نے کیا۔

تقریب کے صدر ڈاکٹر علیم نے کہا کہ "دبیر نے مقام و مرتبے و بلکی نعمانی کی تائید نے کمزور کیا۔" انھوں نے کہا کہ "بلکی ایک ناقد سے زیادہ مورخ تھے۔ لہذا انھوں نے مرثیے کی سلطنت پر میر انیس کو تاج پہنا کر بٹھا دیا۔" انھوں نے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی نے دبیر فہمی اور دبیر شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔"

پروفیسر آصف وٹو، مدثر نعیم اور اسد بخاری نے مرزا دبیر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو کی۔ آخر میں پیپلز لائبریری سوسائٹی کے نویدہ اور عالمی مجلس ادب کے چیئرمین ڈاکٹر شبیہ الحسن نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور تحائف پیش کیے۔ مختلف علمی، ادبی انجمنوں کے اراکین اور مختلف رسائل کے مدیران نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو تحائف پیش کیے۔ حاضرین کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس پروقار تقریب میں شرکت کی۔

"عالمی اردو ادب"

11 مارچ 2017ء

غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار آفاقیت کے حامل ہیں: ڈاکٹر سید تقی عابدی

شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے زیر اہتمام پاکستان اسٹڈیز سنٹر، قائداعظم کیمپس یونیورسٹی میں سینیڈا میں مقیم معروف محقق، ناقد اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پرنسپل اورینٹل کالج و ڈین کلیہ علوم شرقیہ پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے کی، جب کہ مہمان اعزاز سابق صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اور معروف ماہر اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تھے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ضیا الحسن نے کیے۔ صدر شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس چیئر پر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر مظفر معین کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی سے لیکچر کے انعقاد کی اجازت دی اور عملی تعاون بھی فراہم کیے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے لیکچر بعنوان "غالب سے اقبال تک" میں اردو شاعری کی روایت، بیدل سے غالب پر اثرات، غالب کی شاعری سے آفاقی عناصر سے علاوہ اقبال کے تصور خودی اور فکر اقبال سے تنظیم تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک سے متعلق پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ "ہمارے شاعر آفاقی طرز احساس سے حامل ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری روایت اور عصری شعور کی روشنی سے مستقبل کو منور کرتی ہے۔" تقریب سے مہمان اعزاز معروف ماہر اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو عصر حاضر کا منفرد اقبال شناس قرار دیتے ہوئے ان کی تحقیقی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

تقریب کے اختتام پر پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے اپنے صدارتی کلمات میں غالب اور اقبال کی فکر کو تہذیبی اثاثہ قرار دیا اور چند اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے خصوصی لیکچر کی دعوت قبول کی۔ انھوں نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران معین ناصر علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھوں نے کامیاب تقریب کے انعقاد پر صدر شعبۂ اردو اور شعبہ کی ادبی تنظیم "انجمن اردو" کے رکن کو مبارک باد پیش کی۔

25/جون 2018ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی خدمات کا اعتراف

شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں گذشتہ ایک مقیم معروف محقق، ناقد، مورخ اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایم فل کی سطح کے دو مقالے مکمل کیے گئے۔ پہلا مقالہ شعبہ اردو کی ریسرچ اسکالر سحرش افتخار نے ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت محقق و نقاد'' اور دوسرا مقالہ محمد عدنان نے ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور فیض احمد فیض شناس'' کے موضوع پر تحریر کیا۔ مذکورہ مقالات پر پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران، چیئرمین شعبہ اردو کی نگرانی میں مکمل ہوئے۔

عزیز حیدر

پندرہ روزہ "حدیث دل" دہلی
شمارہ اپریل 2005ء

رثائی ادب کی ایک شام

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک ہی شاعر کی بیک وقت چھ کتابوں کی رسم اجرا پہلے کبھی انجام نہیں دی گئی اور وہ بھی ایک ہی ادیب و محقق کی ترتیب و تدوین کی ہوئی۔ یہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا کارنامہ ہے۔ وہ تقریباً ہر سال ہندوستان آتے ہیں اور کوئی نہ کوئی ادبی تحفہ ضرور ساتھ لاتے ہیں۔ اس بار وہ چھ ایسے بیش بہا ادبی تحفے اپنے ساتھ لائے ہیں جس کی امید نہ تھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ (چیئرمین ساہتیہ اکادمی) نے "حدیث دل ٹرسٹ" کی جانب سے 12 مارچ کو غالب اکادمی نئی دہلی میں منعقدہ "رثائی ادب کی ایک شام" میں اپنے صدارتی کلمات میں کیا۔ دہلی اردو اکادمی کے تعاون سے منعقدہ اس پروگرام میں مرزا دبیر سے متعلق چھ کتابوں "ابواب المصائب"، "مثنویات دبیر"، "مصحف فارسی مرزا دبیر"، "مجتہد نظم مرزا دبیر"، "طالع مہر" (خطی منقوطہ کلام کا مجموعہ) اور "سلک سلام دبیر" رونمائی ہوئی۔

جناب سید شاہد مہدی (سابق شیخ الجامعہ)، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر صادق (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر فضل امام رضوی (حیدرآباد)، پروفیسر رہبر آزردہ (کشمیر یونیورسٹی)، جناب اطہر رضوی (کینیڈا)، جناب رضا علی عابدی (لندن)، جناب وکیل انصاری (امریکہ)، جناب امجد اسلام امجد (لاہور)، جناب شمیم حنفی نظامی (جودھپور)، ڈاکٹر فقیہ محمد حسنی (سندن) اور ڈاکٹر عظیم امروہوی نے اپنے اپنے انداز میں ڈاکٹر تقی عابدی کی اردو زبان و ادب کی خدمات کو عدیم المثال قرار دیتے ہوئے کہا کہ "انھوں نے تحقیق و تدوین کو عصری تقاضوں کے اعتبار سے نئی جہت عطا کی ہے اور نئے امکانات سے ہمکنار کیا ہے۔" ان لوگوں نے کینیڈا میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے

ہوئے بتایا کہ "اتنی بڑی ذاتی لائبریری شاید ہی کہیں اور موجود ہو جس میں چودہ سو قلمی نسخے اور مخطوطات موجود ہیں۔"

محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام (پاکستان) نے اپنے شگفتہ لب و لہجہ اور مترنم انداز و آواز میں ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی خدمات کو ناقابل مثال قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اسی طرح سے اردو کی نوادرات و دیگر زبان و ادب کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

سید محمود نقوی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ "جوش ملیح آبادی نے ڈاکٹر عالیہ امام کو تحریری شہادت دی اور فیض احمد فیض نے طوطی پاکستان سے خطاب سے نوازا تھا لیکن آج محترمہ کی تقریر سن کر انھیں مسدس تقریر کہنے کو جی چاہتا ہے۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیقی و تحریری مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "آٹھ گھنٹے کی راتیں اپنی ذاتی لائبریری ہی میں گزرتی ہیں اور روزانہ بارہ چودہ گھنٹے وہ پڑھنے میں خرچ کرتے ہیں۔" جناب عبدالمتان طرزی اور جناب متین امروہوی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر شرکائے جلسہ میں سے اس افراد کو قرعہ اندازی کے ذریعہ ڈاکٹر تقی عابدی کی مرتبہ کتابوں کے سیٹ دیے گئے۔ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں و اہل اردو کراچی کے سرپرستی جناب مرغوب عابدی نے لائبریری کی تازہ مطبوعات پیش کیں۔ "حدیث دل نرسنگ" کی طرف سے تمام حاضرین کو وہیل ناتھ آئن مرحوم کے تحقیقی کارنامہ مجموعہ "میں حقیقت" بطور تحفہ پیش کیا گیا اور عشائیہ کے ساتھ جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ ''تحریک وطن'' مرادآباد
24/مارچ 2005ء

جنت نشاں میں کینیڈا کے مصنف ڈاکٹر تقی کی تین کتابوں کا افتتاح

کینیڈا کے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ایک ساتھ تین کتابوں کا افتتاح آج سابق وزیر حافظ محمد صدیق نے کیا۔ موصولہ اطلاع کے مطابق سرسید ایجوکیشنل ٹرسٹ اور جنت نشاں اسکول کی مشترکہ قیادت میں آج پیر غیب میں واقع جنت نشاں اسکول میں ایک خوب صورت تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں خاص طور سے اس وقت کینیڈا میں رہنے والے ڈاکٹر تقی کی تصنیفات ''مثنویات دبیر''، ''مصحف فارسی دبیر'' اور ''ابواب المصائب'' کا افتتاح سابق وزیر اور سینئر کانگریسی لیڈر حافظ محمد صدیق معروف مصنف ڈاکٹر طفل ہاتھ کے مشترکہ طور پر کیا۔ اردو میں لکھی ان کتابوں کی طباعت شاہد پبلی کیشنز دہلی نے کی۔ اس موقعہ پر حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی نے کہا کہ ''انھیں اس بات کا فخر ہے کہ انھوں نے اردو میں کتابیں لکھی ہیں۔'' انھوں نے اپیل کی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو میں کتب لکھیں اور اردو کو ترقی دینے کے لیے کوشش کریں۔''

انھوں نے کہا کہ ''اردو سے چاہنے اور بولنے والے پوری دنیا میں ہیں جو اردو کو بلند کرے گا اس کا مرتبہ بھی بلند ہوگا۔ اس دوران ڈاکٹر طفل ہاتھ، ڈاکٹر محمد شاہد، حبیب الرحمن راعینی، ناصر منصوری، عتیق احمد، قمر اقبال وغیرہ نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی صدارت حافظ محمد صدیق نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض جاوید رشید ایڈووکیٹ نے ادا کیے۔ پروگرام میں مدثر حسین، انصار حیدر، سہیل بونی، ڈاکٹر مہتاب، مبشر حسین، ندیم منصوری، محمد وسیم وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ ''لشکر''، لکھنؤ

24/مئی 2005ء

مشہور ادیب ڈاکٹر تقی عابدی کی ہندوستان آمد

اردو کے مشہور معروف نقاد محقق اور ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی ہندوستان کے دورے پر ہیں۔ آج وہ ریاستی راجدھانی پہنچے۔ جہاں ان کا استقبال اتر پردیش وقف بورڈ کے ممبر علی سبہ ایڈووکیٹ نے کیا۔ تقی عابدی سینیڈا میں مقیم ہیں اور پیشے سے دل سے رجنی ہیں لیکن ان کو اردو ادب میں بلند مقام حاصل ہے اور اپنے دور کے مشہور مرثیہ نگار میر انیس، مرزا دبیر کے مراثی پر تقریباً دس کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد، برطانیہ، امریکہ اور سینیڈا میں میڈیکل سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ڈاکٹر عابدی کا ذوق شاعری اور ادبی تحقیقات سے، انھوں نے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں پیش کی ہیں اور زندگی کا بڑا حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا ہے۔ ڈاکٹر عابدی ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور سینیڈا میں قیام کر چکے ہیں۔ جہاں انھوں نے اردو کی خدمت کے علاوہ طب کی بھی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر عابدی کی مشہور کتابوں میں ''شہید''، ''جوش عقیدت''، ''سخن رہے یاد''، ''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''شاہ اللہ خاں شاہ''، ''رموز شاعری''، ''اظہار حق''، ''مجدد نظم مرزا دبیر''، ''طب عربی''، ''تجزیہ یا کار انیس''، ''تصنیف فن مرثیہ''، ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ''، ''رباعیات دبیر''، ''فنی شناسی'' اور دیگر کتابیں تحریر کی ہیں۔ اپنے دورہ قیام میں ڈاکٹر عابدی یہاں مخطوطات اردو کی رونمائی کے سلسلے میں آئے ہیں۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی

31 جنوری 2000ء

امروہہ

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''کائناتِ نجم'' کا اجرا

یہاں حسن آرائرسٹ ٹرسٹ دہلی کے زیر اہتمام کوثر منزل امروہوی دربار شاہ ولایت میں صبیح ''کلیات نجم'' جو ''کائنات نجم'' کے نام سے عالمی شہرت یافتہ محقق و ادیب ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کی تحقیق و تدوین اور تنقید سے کی رسم اجرا بدست پروفیسر منظر عباس نقوی سابق صدر شعبۂ اردو ملی مسلم یونیورسٹی ادا کی گئی۔ جلسے کی صدارت مولانا سید محمد سیدت سابق صدر شعبۂ اردو ہندو پی جی کالج امروہہ نے کی اور نظامت کے فرائض علی نقوی نے انجام دیئے۔ جلسے کا آغاز مولانا سید احسن اختر سروش نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ سلیم امروہوی (جدہ) نے نعت پیش کی اور آرام فوگاوی نے کلام نجم آفندی پیش کیا۔ پنڈت بھوونیش کمار بھون نے ڈاکٹر تقی عابدی کی خدمات کو اپنے قطعات میں سراہا۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف پیش کرتے ہوئے انھیں عہد کے محقق اعظم قرار دیا۔ جب کہ نجم آفندی کی ہمہ جہت شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں جدید مرثیہ کا ممتاز شاعر اور اہم ستون بتایا۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی اور مولانا شبیہ حسین امام جمعہ مرادآباد نے نجم کے فنون پر مقالے پیش کیے اور انھیں انقلابی اور تبلیغی فکر کا بانی قرار دیا۔ کامریڈ شوق امروہوی نے نجم آفندی پر علامہ نجم آفندی کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سید شمیم ہاشمی (پاکستان) اور منظور امروہوی (ممبئی) نے شرکت کی۔ پروفیسر منظر عباس نقوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ کام یقیناً تاریخ ساز ہے۔'' صدر جلسہ ڈاکٹر محمد سیدت نے علامہ نجم آفندی کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر بتایا اور ان کی نوحہ گوئی پر خاص طور سے اظہار خیال کیا۔ ٹرسٹ کے بانی اور آرگنائزر سکریٹری کمال حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد
11 فروری 2006ء

کائناتِ نجم

شاعر اہلبیت حضرت نجم آفندی اُردو کے ان شعراء میں ہیں۔ اردو تنقید نے جن کا حق ادا نہیں کیا اور جو اپنی بے نیازی، شہرت پرستی، استغنا اور خودداری کے باعث وہ مقام نہیں پاسکے جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ نجم آگرہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم یہیں پائی اور بعد ازاں اپنے طور پر شعر و ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا۔ وہ اُردو، فارسی اور ہندی اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی میں بھی خاصا درک تھا۔ ریلوے ملازمت کے سلسلہ میں دہلی، کانپور اور غازی پور میں رہے۔ تحریک ترک موالات سے متاثر ہوکر ملازمت ترک کردی اور تجارت کی غرض سے رنگون میں کاشتکاری کی اور جونیئر پرنس منظم جاہ آصف سے دربار سے بھی منسلک رہے۔ بارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ انھیں اپنے دور کے نامور اساتذہ کی صحبتوں سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ ناصر املت نے نجم آفندی کو ''شاعر اہلبیت'' کا خطاب دیا۔ ہم عصر شعراء میں جلال، اکبر، اقبال، حسرت موہانی، حسن لکھنوی، آرزو لکھنوی ہیں تو ہم عصر شعراء میں فانی، جوش، صدیق جامی، یگانہ، سیماب، مہذب لکھنوی اور مہذب رضا۔ نجم کی تصانیف کی تعداد 50 کے قریب بتائی جاتی ہے۔ حالب علی کے دور کی سے قوم پرستانہ جذبات سے حامل تھے۔ زیادہ تر تخلص کا استعمال کرتے رہے ملازمت کو ترک کرنے کی وجہ سے پرنس کی ملازمت سے بھی سبکدوشی اختیار کی۔ اپنے طور پر ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا جو زیادہ چل نہ سکا۔ فارغ البالی نے جلد ہی رخصت پائی اور نجم مالی پریشانیوں سے دوچار ہوئے۔

1957ء میں اور 1958ء میں اہلیہ کے انتقال نے جذباتی طور پر پریشان کردیا۔ مسلسب میں تنہائی، غم خواری اور ضعف نے عاجز و آخری عمر میں معذور، جبر،

قلب کی بیماریوں رہتے ہوئے مستقل علالت سے دوچار رہے۔ بھائی اور بہنوں نے پاکستان ہ
رخ کیا اور یہ بھی مجبوراً ہو کر اپریل 1971ء میں ترک وطن کر کے اپنی بچی ہوئی
1975ء کو کراچی میں مالک حقیقی سے جا ملے۔

نجم نے اپنی تصنیف کی ترتیب و اشاعت پر کم توجہ دی۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ
1917ء میں شائع ہوا اور آخری مجموعہ "لہو قطرہ قطرہ" ان کے انتقال سے چار سال بعد
1979ء میں۔ ان کے کئی مجموعوں کی اشاعت کے سامان نہیں ہو سکے۔ انھوں نے خود
نوشت مقدمے شروع کی تھی جو نامکمل رہی اور اس کی اشاعت بھی نہ ہو سکی۔ ان کے مضامین کا
مجموعہ نوشت ترتیب ہی نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی اردو کی اپنی بستیوں سے دور ایک نئی
بستی کینیڈا میں قیام پذیر ہیں اور طبابت کی خدمات انجام دیتے ہیں تب ہوتا ہے۔ انھیں
اپنی مصروفیات کے باوجود اتنا وقت کہاں سے ملتا ہے کہ وہ تحقیق، تدوین و تنقید کی دنیا میں
مصروف رہتے ہیں۔ اب تو انھوں نے ممتاز محققین کی صف میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ تقی
عابدی کی تا حال کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "شہید" "جوش مودت" "گلشن رویا"
"تجزیہ یادگار انیس" "ابو ب المصائب" "ذکر دربار ان" "عروس سخن" "مصحف فانی
دبیر" "مثنویات دبیر" یہ وہ کتابیں ہیں جنھوں نے نامور اہل علم احباب سے
ستائش وصول کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی زیر تالیف کتابوں میں "تجزیہ شکوہ جواب شکوہ"
"رباعیات دبیر" "فانی شناسی" "مصحف تاریخ گوئی" "روپ نگار مراثی" اور "تحقیق
لکھنوی" ہیں۔ اس دوران ان کی قابل مطالعہ اور اہم تحقیق "کائنات نجم" ہے۔ "کائنات
نجم" واقعی کائنات نجم ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے حضرت نجم کی کل غزلوں رباعیات،
قطعات، نعت شریف، قصائد، سلام، نوحوں اور متفرقات کے علاوہ مرثیوں در بندی کا جمع
یکجا کر دیا ہے۔ "کائنات نجم" میں یہی نہیں کہ نجم کا سارا کلام محفوظ کر دیا گیا ہے بلکہ ان کی
حیات، شخصیت اور فن کے بارے میں اکابرین کے رشحات قلم بھی شامل ہیں۔ سید علماء،
مولانا علی نقی نقوی، جناب ضیاء الحسن مولوی، ڈاکٹر محمد حسن فاروقی، شمشاد حسین رضوی، سید
ہاشم رضا، علامہ سید ضمیر اختر نقوی، سری منہاس، سید معز الدین قادری متانی، جناب قد
عریضی اور ڈاکٹر فاطمہ تشہیر جیسے لکھنے والوں نے علامہ نجم آفندی کے مزاج اور فن پر بحث

ڈالی ہے۔ غزل کے باب میں تقی عابدی، اختر انصاری، آبرو آبادی اور سید نواز حسن زیدی کے مضامین ہیں تو پروفیسر احتشام حسین، پروین شاکر، پروفیسر کمال الدین حیدر اور افضل حسین نقوی کی تحریریں بھی جو کہ نجم کے فن کے کئی پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔

تقی عابدی نے جس توجہ، محنت، اہتمام اور سلیقے کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے ایسی مثالیں کم ہی ہیں کی۔ "کائنات نجم" نہایت دیدہ زیب اور ضخیم دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ جس کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے حضرت نجم کے فرزند علامہ جمیل آفندی نے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی نے کئی سال کی محنت کے بعد یہ کام مکمل کیا ہے۔ انہوں نے علامہ نجم کے کئی اشعار و جو عام طور پر نہیں ملتے تحقیق کر کے اس میں شامل کر دیا ہے۔" وہ اس تقریب رسم اجراء کی صدارت فرما رہے تھے۔ سابقہ کابینہ کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے، پروفیسر نارنگ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ "تقی عابدی جو کام کر رہے ہیں اس کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں۔ علامہ نجم آفندی شاعر اہل بیت اور شاعر رسالت ہیں۔ انہیں اپنے آپ پر اعتماد تھا اس لیے اپنے زمانے میں ناقدری کے باوجود آج ان کی قدر ہو رہی ہے۔" تقی عابدی نے بتایا کہ 13-12 ہزار اشعار ہونے کے باوجود انہیں کم اندازہ کیا گیا۔ نارنگ صاحب نے کہا کہ "ہر زمانہ کم اندازہ نہیں کرے گا تو ہمارے محققین اور ناقدین کیا کریں گے۔ زمانہ بڑی شخصیتوں کے ساتھ ہمیشہ ناقدری کرتا ہے۔ ایسے شعراء زمانے سے متصادم ہوتے ہیں۔ علامہ نجم آفندی نے اپنا کلام شائع نہیں کیا وہ زمانے سے متصادم بھی نہیں ہوئے لیکن آج ان کو ان کا مقام مل رہا ہے۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی اس قدر تحقیق "کائنات نجم" کے بارے میں کہا کہ یہ اردو کا واحد مجموعہ ہے جو "کائنات نجم" ترتیب دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ "کائنات نجم" کے 16 فیصد اشعار غیر مطبوعہ ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب سینڈ ایمیں ترتیب دی۔ تقی عابدی نے بتایا کہ قبل از جنگ سے پہلے 1913-1912 میں سامراج کے خلاف پہلی آواز نجم نے بلند کی۔ جس پر کئی نجم کی رباعیاں میں شامل ہوئی تھیں۔ نجم سوشلسٹ نظریات سے حامل تھے انہوں نے کہا کہ اسلام امن کا نام ہے لیکن اسلام دہشت گردی کے لیے بدنام کیا جا رہا ہے جب کہ واقعہ یہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ "کائنات نجم" کی اشاعت کا مقصد نجم

شناسی کو عام کرنا اور اُردو کے دامن کو وسیع کرنا ہے۔ ڈاکٹر ریاض فاطمہ شیخ نے جنھوں نے علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ نجم کی شاعرانہ عظمت پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ "تنقید نے نجم کی طرف توجہ نہیں دی، لیکن تقی عابدی نے تحقیق سے کام لے کر ان کے کارناموں کو محفوظ کر دیا ہے۔" شارب ردولوی نے کہا کہ "نجم نے مرثیہ میں داخلی تبدیلی کی کوشش کی۔ کربلائی جنگ مظلوم اور ظالم کی جنگ تھی۔ نجم نے اس جنگ کو ایک نیا رخ دیا اور اس مشن کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستانی عوام کو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے راغب کیا۔ نجم بھی شہادت امام حسینؑ کے پیچھے جو فلسفہ ہے اسی کو پیش کرتے ہیں۔" علامہ نجم آفندی نے اپنی سحر انگیز تقریر میں نجم کی شاعری کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور نجم کی شخصیت کے بارے میں دل موہ لینے والے پیرایہ میں اظہار خیال کیا۔ جناب حمایت علی شاعر نے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی نے انیسؔ پر تاریخی کام کیا ہے۔ نجم صاحب بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔"

انھوں نے اردو شاعری کو نئی فکر دی۔ ان کی شاعری میں انقلابی عمل ملتا ہے۔ جو زمانہ سے باخبری اور تاریخی تسلسل کو ذہن میں رکھنے سے آتا ہے۔ جناب امجد اسلام امجد نے کہا کہ "کائنات نجم" ایک ایسا بہت تحقیقی کام ہے اُردو ادب میں ایسے کام کی ضرورت ہے۔ جناب خلیل الرحمن نے "کائنات نجم" کی ستائش کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی سے خواہش کی کہ وہ اپنے کاموں کو جاری رکھیں اور اردو تحقیق میں نئے چراغ روشن کرتے رہیں۔ پروفیسر صادق نقوی نے کہا کہ "علامہ نجم کو شاعر اہل بیت کا خطاب آسانی سے نہیں ملا۔ علامہ نجم نے شاعری کو روزگار کا ذریعہ بنایا اور نہ مذہب و حصول دنیا کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی ایسی ہی تربیت دی۔ علامہ نجم نظر سے اور اردو کی رثائی شاعری میں "نجمیت" باقی ہے۔ مذہبی اور رثائی شاعری میں نجم کا مقام اہم ہے۔ جناب آغا محمد حسین نے نجم کی رباعی گوئی پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں فنی معمار قرار دیا۔" پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ "آج جس کتاب کی رسم اجراء انجام دی گئی ہے وہ اردو ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔ ان دو جلدوں پر تحقیق اور تنقید کا عمل جاری رہنے کا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نجم آفندی کی شخصیت اور شاعری ہماری تنقید کا اہم موضوع ثابت ہوگی۔" پروفیسر

صدر رئیس نے کہا کہ "رثائی ادب میں عظیم شاعری کے امکانات موجود ہیں۔ عالمی ادب کے سرمایہ کو سامنے رکھتے ہوئے مرثیہ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔" پروفیسر صادق نقوی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور آخر میں شکریہ ادا کیا۔ محبوب حسین جگر بال، حاظ روزنامہ "سیاست" میں منعقدہ اس تقریب میں دیگر اصحاب اور صاحبان ذوق کے علاوہ عالمی اردو کانفرنس میں بیرون حیدرآباد اور بیرون ہند سے شرکت کے لیے آئے کئی مندوبین نے شرکت کی۔

"ٹائمز میگ" ٹورنٹو

15 / جون 2006ء

"جشن مجاہدین اُردو" کے عنوان حسن آرائرسٹ کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کو شاندار تقریب میں عالمی مجاہد اُردو ایوارڈ سے نوازا گیا

نئی دہلی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں جناب احمد فراز پاکستان کی صدارت میں ایک عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ "جشن مجاہدین اُردو" عنوان سے ہونے والے اس پروگرام میں عالمی شہرت کے مالک محقق، ناظم، ماہر لسانیات اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کینیڈا کی اردو ادبی خدمات کے اعتراف میں حسن آرائرسٹ کی جانب سے عالمی مجاہد اردو ایوارڈ برائے جناب محمد اشرف فاطمی، وزیر اقلیتی آرائی حکومت ہند پیش کیا گیا۔ محترمہ نرملا دیش پانڈے ایم پی، جناب ظہیر احمد وہوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف کرایا اور کہا کہ "کینیڈا جیسی جگہ پر رہ کر آپ نے گزشتہ بیس سال میں تیس سے زیادہ علمی ادبی اور تحقیقی مراکز تصنیف اُردو کو پیش کی ہیں اور وہاں آپ کی لائبریری میں دس ہزار سے زیادہ اردو کتابیں ہیں اس طرح آپ مستقل اُردو کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تقریر میں کہا "ہم کہیں اور رہے جائیں اپنی زبان اردو اپنی تہذیب اور ثقافت کو فخر کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ "ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے" آپ نے مزید کہا کہ مجھے دنیا کے مختلف ممالک سے ایوارڈ ملے ہیں لیکن یہ ایوارڈ جو سلطنت اُردو معلی میں ملا ہے یہ ایوارڈ میرے لیے ایوارڈ معلی ہے۔"

عالمی مشاعرے کی نظامت کے فرائض سلمان صفدر نے انجام دیے چند شعراء کے

منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں
بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں
(احمد فراز، پاکستان)

بھٹکے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
رستوں سے اگر راہ نماؤں کو ہٹا دو
دنیا میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی کبھی آئینہ خانے میں بٹھا دو
(ڈاکٹر تقی عابدی، کینیڈا)

فصیل جبر سے کہہ دو کہ ہم نے جو بھی کہانی لکھی ہے
منظر نامہ ہیروئی ہے ہر بات ہماری اپنی ہے
اپنے دیس سے آنے والے دیس کا پتہ احوال سنا
خوف کی چادر اوڑھے جیتی کی حالت یہی ہے
(عاشور کاظمی، لندن)

نئی دہلی یہاں حسن آرا فرحت کی جانب سے "جشن مجاہدین اردو" عنوان سے عالمی مشاعرہ 2010ء میں منعقد ہوا تھا اس کا دوسرا اجلاس عالمی بزم نعت و منقبت اردو کے زیر عنوان سے 22 مئی کو وفا ایجوکیشنل آرٹ اکیڈمی جامعہ نگر میں سات بجے شام منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت کے لئے شاعر رشید ادیب ریحان اعظمی پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب عاشور کاظمی لندن نے شرکت فرمائی افتتاح جناب احمد فراز پاکستان نے بہ ذریعہ صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا نے انجام دیئے اور نظامت کے فرائض محترمہ وفا نقوی نے ادا کئے۔ سید جلال حیدر صاحب قبلہ نے تلاوت کلام پاک سے اس کے بعد مہمانوں کا استقبال جناب ندیم عباس زیدی نے کیا۔

شعرا کے کلام کا انتخاب مندرجہ ذیل ہے احمد فراز صاحب نے پہلے نعت پیش کی۔

میرے ضمیر نے قاتل کو نہیں بخشا، میں نے صلح کرنے والوں سے
کے بعد سلام پیش کیا۔

حسن تجھ کو کہیں کیا سلام ہم جیسے
کہ تو عظیم ہے ننگ و نام ہم جیسے
خطیب شہر کا مسلک ہے بیعت سلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے

•••

ہوتے رہیں گے ہاتھ قلم یا علی مدد
جھکنے نہ دیں گے حق کا علم یا علی مدد
بارود کے دہانے پہ بیٹھی ہوئی یہ قوم
تاریخ کر رہی ہے رقم یا علی مدد

•••

بے یقینی کے دھندلکوں میں ہے امت تیری
آج تو کل سے بھی زیادہ ہے ضرورت تیری
(عاشور کاظمی، لندن)

بدل گیا ہے مقدر تیرے حوالے سے
دعا جو آئی ہے لب پر ترے حوالے سے
ترے وسیلے سے ہم نے خدا کو پہچانا
سمجھ میں آئے پیمبر تیرے حوالے سے
(ہمایوں ظفر زیدی، مسقط)

نکلے تھے ہم خلوص کا اک آئینہ لیے
لوگوں نے اپنے ہاتھ میں پتھر تھما لیے
(ڈاکٹر ماجد دیوبندی)

خون انسان کا پینے سے جو خوش ہوتا ہے
نام اس کا کہیں مووی کہیں بش ہوتا ہے
(خلیل حسن شمسی)

قہقہے دے رہے ہیں داد اس کی
غم چھپانا بھی غم گساری ہے
(متین امروہوی)

باغ اردو میں قدم رکھ ہی نہیں سکتی خزاں
نہ سہی میر مگر دبدبۂ میر تو ہے
(نایاب دہلوی)

تمہاری قسمت اک ایسا دن ہے کہ شام جس کی کبھی نہ ہوگی
ہماری قسمت اک ایسی شب ہے کہ جس کی کوئی سحر نہیں ہے
(سلیم امروہوی)

جو اپنے ہاتھ میں محلات کی کنجی نہیں رکھتا
وہ اپنے پاس جینے کے لیے کچھ بھی نہیں رکھتا
(محمد مہران)

دل ان کے جو نام کر رہے ہو
تم خود کو عام کر رہے ہو
(پیمبر نقوی)

اس موقع پر مشہور پاکستانی غزل کی شعر محمد مہ کاشف آرا سید نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بے حد کامیابی سے بعد مشاعرے کا اختتام ہوا اور آخر میں کمال حیدر نے شعراء سامعین غیر ملکی مہمانان کے شکریہ کے ساتھ تالی کی آواز صوتی فاؤنڈیشن اردو شعراء اور دیگر شعبوں میں اردو کی خدمت کرنے والے گزشتہ 700 سال میں ہونے والی تخلیقات کی شاندار تصویری نمائش کی گئی بہت پسند کیا یہ یوں کہ صدر دروازے سے ہی دونوں جانب قد آور تصاویر آویزاں تھیں اور کچھ ہالوں میں چاروں جانب اہل اردو کی

تصاویر مع اشعار اور جشن ولادت وفات کی ہوئی تھیں۔ تصاویری نمائش کا افتتاح فیجی ملی شعراء نے شمع روشن کر کے کیا۔

شکستہ خواب جیسا ہوگیا ہوں
لئے اسباب جیسا ہوگیا ہوں
ضرورت ہی نہیں جس کی کسی کو
ادب آداب جیسا ہوگیا ہوں
(ڈاکٹر ریحان اعظمی، پاکستان)

آگہی ایسی ملی دیدار والے ہوگئے
آپ کی صحبت میں سب کردار والے ہوگئے
سر پہ جن کے تاج تھا ہاتھوں میں اب کشکول ہے
در بدر رہتے تھے جو دربار والے ہوگئے
(خالد فریدی، سعودی عرب)

آپ ایٹم کو توڑ سکتے ہیں رخ ہواؤں کا موڑ سکتے ہیں
قتل و غارت گری، ظلم ستم کیا یہ عادات چھوڑ سکتے ہیں
(ڈاکٹر اقبال مرزا، لندن)

خون رونے کا عمر بھر بے حد دیکھ مجھے وفا نہ راس بے حد
ایک عالم تھی منتظر جن کا ان کی قسمت میں تھا سفر بے حد
(ظفر زیدی، ممبئی)

آئین تو ہم روز بدل سکتے ہیں اخلاق میں ترمیم نہیں ہو سکتی
ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں تہذیب کی تقسیم نہیں ہو سکتی
(پنڈت آنند موہن کلزار زتشی، دہلی)

بولی بیوی پتی شوہر سے زندگی کیوں عذاب کرتے ہیں
غیر کرتے ہیں حسن کا دیدار آپ میک اپ خراب کرتے ہیں
(ناظر فیجی)

کبھی بھی چھوڑ کے اپنی زمیں نہیں جاتے
ہمیں بلاتی ہے دُنیا نہیں جاتے
مہاجرین سے اچھے تو پرندے ہیں
شکار ہوتے ہیں لیکن کبھی نہیں جاتے

(منور رعنا)

جاتی بھی دستو یا شاعری سلیت تھی
رات توڑی جانے یا تھا جانے یا کاتے رہے
زندگی بھر عشق کا اظہار کرنے کے لیے
وہ بھی بکاتے رہے اور ہم بھی بکاتے رہے

(پاپولر میرٹھی)

بیٹھ پہاڑوں پہ میری نظر بیٹھتی نہ تھی
دُنیا بری تو تھی مگر اتنی بری نہ تھی

(مخمور سعیدی)

رہنا آتا نہیں زمیں پہ جنھیں
بات کرتے ہیں آسمانوں کی

(پروفیسر اوپ سنگھ ناز)

شاعری شوق نہیں میرا ایمان کی طرح
میرے اشعار بھی ہوتے ہیں فقیہوں کی طرح

(ڈاکٹر مدھر ماتھر)

سنورتے ہیں وہ دیکھ کر آئینے کو
سنور جائیں تو آئینہ دیکھتا ہے

(فیض فاروقی)

عجب طرح لی ہے ... زبان کی خوشبو
جو بولتا ہے وہی عطردان لگتا ہے
(ڈاکٹر عظیم امروہوی)

کون کہتا ہے کہ بادیدہ غم ملتے ہیں
مسکرا کر غم حالات سے ہم ملتے ہیں
(شیدا نعیمی)

نئی فضا نئی رسم وفا نکلتی ہے
جہاں قیام کریں کربلا نکلتی ہے
(ڈاکٹر ناشر نقوی)

یاعلی کہہ کے ہر اک بزم سجا دیتا ہوں
سونے والوں کو بہرحال جگا دیتا ہوں

• • •

تجھے رشتہ کریا ہے سارے رشتے توڑ ...
خاک پا چن لی تری ہیرے، جواہر چھوڑ ...
یہ محمدؐ کا اثر ہاتھ میں شبیرؑ کے
رکھ دیا بیعت کے پنجے کو ابد تک موڑ ...
(ڈاکٹر تقی عابدی، کینیڈا)

زلف و آبرو نہیں اوصاف حمیدہ لکھو
جیسا قرآن نے سمجھا انھیں ویسا لکھو
چاند لکھنا ہے تو نعلین محمدؐ لکھو
کیوں بھلا چاند کو ان کا رخ زیبا لکھو
ذکر جس چھت کے تلے سید ابرارؐ کا ہو
اس کو پھر چھت نہ کہو گنبد خضراء لکھو
(ڈاکٹر ریحان اعظمی، پاکستان)

حمد خدا صفت نبیؐ جرأت حسینؑ
الفاظ سارے تیر تھے زینبؑ کمان تھی
جب سر قلم ہوئے تو زبانیں بھی سو گئیں
زینبؑ ہر اک شہید کی گویا زبان تھی
(ڈاکٹر اقبال مرزا، لندن)

پھر دل نے کیے نعت محمدؐ کے ارادے
یارب میرے تخیل کو احرام پہنا دے
(نایاب دہلوی)

زندگی کی راہوں میں رہبری ضروری ہے
تیرگی مٹانے کو روشنی ضروری ہے
طے نہیں ہوا بیعت پار ہوگئی تیری
اے یزید تجھ کو خودکشی ضروری ہے
(سلیم امروہوی)

آخر میں کمال حیدر جنرل سکریٹری ٹرسٹ نے سب کا شکریہ ادا کیا اور تمام مہمانان و معین نے نذر میں شرکت فرمائی، گیارہ بجے پوری کامیابی سے بعد اجلاس ساتھ ہی یادگار پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ ''قومی آواز'' نئی دہلی
16/دسمبر 2006ء

غالبؔ کی شخصیت اور فکر
میں ہندوستانیت رچی بسی تھی: ارجن سنگھ

سالانہ غالبؔ تقسیم انعامات تقریب میں مرکزی وزیر انسانی وسائل کا اظہار خیال

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو اپنے دور کا منفرد اور عظیم مفکر بتاتے ہوئے مرکزی وزیر انسانی وسائل مسٹر ارجن سنگھ نے آج یہاں کہا کہ غالبؔ کی شخصیت ایسی تھی کہ انھوں نے سماج کے ہر طبقے کے ساتھ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''ہندوستانیت غالبؔ کی شخصیت میں رچی بسی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی میں بھی کچھ کم مقبول نہیں تھے۔'' مسٹر ارجن سنگھ نے کہا کہ غالبؔ فارسی کے بھی ادیب تھے جو ہمارے کئی پڑوسی ملکوں کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری بھی فارسی کی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ وہاں غالبؔ کی مقبولیت بھی ہے۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ غالبؔ انعامات تقریب میں خطاب کرتے ہوئے مسٹر ارجن سنگھ نے کہا کہ ''غالبؔ پر بہت کام ہوا ہے لیکن ہم اس عظیم شخصیت کا حق پوری طرح ادا کر پائے ہیں یا نہیں۔''

قبل ازیں انھوں نے اردو تحقیق و تنقید کے پروفیسر صادق علی کو غالبؔ انعام (2006) علالت کی وجہ سے ان کی غیر موجودگی میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی کو پیش کیا۔ ان کے بعد فارسی تحقیق و تنقید کے پروفیسر اسلم پرویز کو اردو شاعری کے لیے پروفیسر اسلم پرویز کو اردو شاعری کے لیے ہمہ جہت ادبی و علمی خدمات کے اظہار اعتراف کو اردو فارسی کے شاہد اور اردو شاعری کی خدمات کے لیے

تقسیم صبا نویدی کو پیش کیے۔

ایوان غالب آڈیٹوریم میں منعقدہ تقریب کی صدارت ہمایوں کے ورثہ پروفیسر اے آر قدوائی نے کی۔ اس موقع پر مسٹر ارجن سنگھ نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی چار کتابوں "غالب در رام پور"، "غالب کے منتخب فارسی مکتوبات"، "تفہیم غالب" شمس الرحمن فاروقی اور "غالب نامہ" کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "غالب، دیوان غزل و منتخبات" کا اجرا بھی کیا۔ بعد ازیں پاکستان کی معروف گلوکارہ گلشن آرا سید نے غالب کا کلام پیش کیا۔ اس تقریب میں ملک کے معروف ادیبوں، صوفی، ادیبوں، شعرا نے شرکت کی۔ جن میں پاکستان سے آئے ہوئے مرزا حامد بیگ، اصغر علی سید، بابلینڈ سے سید مفتی، ہالینڈ سے آئے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم، شمیم اے آر، خواجہ حسن ثانی نظامی، صدیق الرحمن قدوائی، محمد شفیع قریشی، انیس اے آئی عابدی، پروفیسر علی احمد فاطمی، جسٹس بدر الدین احمد، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ہمایوں نظر زیدی، خورشید اکرم، انجم عثمانی، انیس امروہوی، عزیز برنی، اسد رضا، نسیم سحوتی، نگار عظیم وغیرہ شامل تھے۔ کل سے ایوان غالب میں دو روزہ تین الاقوامی غالب سیمینار منعقد ہوگا اور کل شام ایک عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ممتاز عالم رضوی
روزنامہ ''ہندوستان ایکسپریس'' دہلی
17/دسمبر 2006ء

غالب کو سمجھنے کے لیے ان کے لہجہ سے واقفیت ضروری ہے

سالانہ بین الاقوامی غالب سیمینار میں معروف ادیب تقی عابدی کا خطاب رخشاں

''غالب کو سمجھنے کے لیے ان کے لہجہ سے واقفیت ضروری ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں یہ اہم نہیں ہے، بلکہ غالب کیا سمجھا رہا ہے یہ زیادہ اہم ہے۔'' ان خیالات کا اظہار رخشاں کے معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی نے کیا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ سالانہ بین الاقوامی سیمینار بہ موضوع ''بیسویں صدی کا تخلیقی ذہن اور غالب'' کے دوسرے روز دوسرے اجلاس کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے غالب کا تقابل طرز بیان اور موجودہ عہد'' پیش کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''صرف تاثراتی تنقید سے غالب کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالب جب شعر خلق کرتا ہے تو بہت سارے صنعتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ میں غالب کے ایک ویل کی حیثیت سے یہ پوچھتا ہوں کہ آخر غالب کی نعتیہ شاعری پر گفتگو کیوں نہیں کی گئی، صرف کلیات سے وہ اشعار جو نعت کے 281 اشعار نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالب کی افلاک کی سیر کرنے والا اگر کوئی شاعر ہے تو وہ صرف غالب ہے۔

پہلے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال نے کہا کہ ''کہتے ہیں کہ آج کے فکشن سے غالب کا کیا تعلق ہے۔ بڑا لکھنے والا کسی ایک عہد کے لیے نہیں ہوتا اور غالب ایسا ہی فن کار ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''بڑے شاعر کی کوئی شرح نہیں ہوتی۔'' انھوں نے کہا کہ ''بڑا لکھنے والا اپنے عہد پر اپنے وقت سے آگے ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر مصحف اقبال توصیفی نے اپنا مقالہ ''غالب اور عہد حاضر کی شاعری'' پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''بیسویں صدی میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ غالب کی دین ہے۔ غالب نے

یہ آسمان اور نئے افق وا ہیں۔ غالب کے امکانات کی دنیا اور قیامت کا جو نقشہ ہے اس سے میں کیا آنے والی نسلیں بھی فیضیاب ہوتی رہیں گی۔"

پروفیسر شمیم حنفی نے اپنا مقالہ "غالب اور غالب کی دلی" پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ "غالب کے یہاں آپ بیتی اور شہ بیتی دونوں ہیں، وہ آپ بیتی شاعری کے ذریعہ اور شہ بیتی خطوط کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک ساتھ کئی عہد سانس لیتے ہیں۔ وہ کبھی ایک سمت تو کبھی کئی سمتوں میں سفر کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دہلی کی اچھی اور بری دونوں تصویر بناتے ہیں۔ غالب وہ ہیں جس نے نئی بیداری کا خیر مقدم کیا۔"

ڈاکٹر حسن عباس نے کہا کہ "غالب نئے عہد کا پہلا شاعر بھی تھا اور اپنے عہد کا آخری شاعر بھی۔" صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ "ان پڑھے گئے تمام مقالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے یہاں کس قدر تضادات ہیں اور یہی تضادات غالب کا کمال اور ان کا فن ہے۔ انھیں کو ملا کر ایک عظیم شخصیت بنتی ہے اور یہ تضادات ایک وحدت بن جاتی ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید امیر حسن عابدی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نذیر احمد نے جب کہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے اجلاس کی صدارت میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، سید شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر اسلم پرویز وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ مقالہ نگاروں میں انور معظم، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، پروفیسر سید احمد فاطمی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر اصغر ندیم سید، ڈاکٹر خالد جاوید، اقبال مجید، زبیر رضوی اور شمیم حنفی شامل ہیں۔ مقالوں سے اندازہ ہوا کہ سمینار اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رشید حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی اور ڈاکٹر صمیمہ حنفی نے انجام دیے۔ اس سلسلے کی پہلی شام ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک اور بیرون ملک سے آئے ہوئے ممتاز شاعروں نے اپنے کلام پیش کیے۔

ف۔س۔اعجاز
ماہنامہ ''انشا'' کلکتہ
23/دسمبر 2006ء

کلکتہ میں سید تقی عابدی کی کتاب ''غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت'' کا اجرا

ماہنامہ ''انشا'' کے زیر اہتمام پریس کلب کولکاتہ میں پچھلے ہفتہ ایک اردو کتاب ''غالبؔ دیوان نعت ومنقبت'' کا اجرا ہوا جس کے مصنف پیشہ سے انجینئر سید تقی عابدی ہیں۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی زیر صدارت رسم اجرا کی تقریب سے پہلے جناب ہاشم عبدالحلیم نے انجام دی۔ مہمانان خصوصی جناب کلب کے سکریٹری شہناز نبی تھے۔

مدیر ''انشا'' ف س اعجاز نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ تقریب سے قبل کتاب پیش کیے جانے کے بعد ف س اعجاز نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف پیش کیا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک معزز شخصیت تھے۔ حیدرآباد سے انجینئرنگ کرنے کے بعد برطانیہ سے ایم ایس، امریکہ سے ایف ای اے پی ای اور ایم بی اے کی ڈگری مکمل کی۔ آپ اونٹاریو، کینیڈا میں مقیم ہیں۔ شاعری، ادبی تحقیق وتنقید ان کا ذوق اور رسمائی ادب میں ان کی مہارت قابل داد ہے۔ مرثیوں کا انتخاب مرتب کرکے انھوں نے کافی بلند کیا ہے۔ علامہ نجم آفندی کے بارے میں ''کائنات نجم'' دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ انیس، اقبال، نشاط کے ادب پر وقیع تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ آپ تین سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ف س اعجاز نے غالب سے منظومات کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے سید تقی عابدی کے ''غالبؔ دیوان نعت ومنقبت'' کے بارے میں منظوم معروضات پیش کیں۔ انھوں نے کہا

''غالب کی فارسی اور اردو نعتوں اور منقبتوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے اور غالب کے پسندیدہ شہر کلکتہ میں اہم ترین ادبی و علمی شخصیتوں کی موجودگی میں اس کا اجرا کلکتہ والوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔'' ف س اعجاز نے کہا کہ ''۱۱۱ صفحات کے ''غالب دیوان نعت و منقبت'' کی چند جلدیں ہمیں تین دن قبل ڈاک سے موصول ہوئیں۔ اجرائے پروگرام کی تیاری پہلے سے ہو چکی تھی۔ سید تقی عابدی کل کلکتہ پہنچے تو اپنا تازہ ترین مجموعہ مضامین ''سید سخن'' بھی ساتھ لیتے آئے۔ اور آج ان دونوں مطبوعہ کتابوں کا اجرا مغربی بنگال اسمبلی کے سپیکر عزت مآب ہاشم عبدالحلیم صاحب کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے گا۔ رسم اجرا سے قبل ف س اعجاز نے تقی عابدی کی کتاب ''کائنات سخن'' سے حامد سخن آفندی کی غالب سے منسوب مندرجہ ذیل دو رباعیاں پڑھیں:

یاں سر نہ کریں ہم تو کہاں غالب
کچھ کم ہے یہ حاصلِ کلام غالب
دنیا سے ہر اک ملک ہر اک ملت میں
تبلیغ ہے اُردو کی بنام غالب

•••

مدت سے ہیں ہم مدح سرائے غالب
دل میں ہے مرے اہل دل کے جائے غالب
یورپ میں بھی ہے آج ہماری تقلید
پہنچی ہے کہاں کہاں نوائے غالب

جناب ہاشم عبدالحلیم نے دونوں کتابوں کا اجرا فرمایا۔ اجرا کے بعد انھوں نے اردو سے اپنی محبت بڑی سچائی سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے اردو سے واقفیت نہیں ہے بلکہ محبت ہے۔ اردو زبان بہت ہی حساس اور موثر زبان ہے۔ جو لوگ اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ زبان ہر مذہب سے ماننے والوں کی زبان ہے۔ چیئرمین صاحب نے کہا کہ ''ایران سوسائٹی'' سے میری خاندانی وابستگی ہے چنانچہ اپنی عمر سے شیخ میری قریب سے واقف ہیں۔ بہت میری بیوی اردو

خبریں، کتابیں اور رسالے پڑھتی ہیں۔ اور اپنے مطالعہ کا علم مجھے سے آپ ایتی ہیں۔ مجھے سید تقی عابدی اور سید یحییٰ نشیط جیسے ادیب کلکتہ آمد پر اور ان سے درمیان اپنی ملاقاتوں پر بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ عابدی صاحب کا ''غالب دیوان نعت و منقبت'' میں نے اسی طرح دیکھا ہے۔ اور ان کی اس عالمانہ تحقیق کی قدر کرنے میں مجھے دقت نہیں ہوتی۔ اس لئے کولکتہ کے عالموں، اردو اکادمی اور یونیورسٹی والوں کو جاننا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ عابدی صاحب دوبارہ جب کلکتہ تشریف لائیں تو یہاں ان کا قیام کچھ زیادہ ہو۔ میں ان کی خاص پذیرائی کا موقع حاصل ہو۔'' ہاشم صاحب نے کہا ''میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا جیسا آپ چاہتے ہیں۔ اگلے دورے میں وہاں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا۔ مجھے قوی امید ہوگی۔'' ہاشم صاحب نے کہا ''کلکتہ میں اردو رسائل و اخبار کی رفتار اب پہلے سے تیز ہو گئی ہے اور ماہنامہ ''انشاء'' کا اس میں بڑا حصہ ہے۔''

اس موقع پر مہمان خصوصی سابق پروفیسر، شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر کوکب میرزا نے کہا کہ ''تقی عابدی صاحب نے (۱) کتابیں لکھی ہیں اور یہ ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اب سے دس بارہ سال قبل تقی عابدی صاحب سے کم واقف تھے لیکن آج انھیں سب جانتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی کتابیں ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ عابدی صاحب کی سات آٹھ کتابیں ان کے پاس ہیں جن کا مطالعہ کرنے سے ان کے علم و مرتبہ سے آشنا ہو پائے ہیں۔ ان کی ہر کتاب آج کل کی ایک بڑی اہم ضرورت کہی جائے گی۔ اور اتنی ساری کارآمد کتابوں کا مصنف کلکتہ میں یقیناً بڑی پذیرائی کا مستحق ہے۔ ''غالب دیوان نعت و منقبت'' تقی عابدی کا ایسا کارنامہ ہے جس پر کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے انھیں اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی جانے کی بات ہونی چاہیے۔'' میرزا صاحب نے کہا کہ ''جس طرح دیگر یونیورسٹیوں میں ایسے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کو اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کرنے کی روایت ہے اسی طرح کلکتہ یونیورسٹی میں بھی ہونی چاہیے۔'' انھوں نے کہا کہ شہر کلکتہ کی قدیم اردو کلکتہ یونیورسٹی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

میرزا صاحب کے گھر میں شادی کا ماحول تھا، چچیرے بھائی سے فرزند کی شادی

انجام پائی تھی۔ اس کے باوجود مدیر "انشاء" کی دعوت اور تقی عابدی صاحب کی کتاب نے انھیں شریک بزم ہونے پر مجبور کر دیا جس کے لیے مدیر "انشاء" نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میرزا صاحب نواب واجد علی شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ستیہ جیت رے کی فلم "شطرنج کے کھلاڑی" کی اسکرپٹ کے سلسلے میں ان کی خدمت فلم میں اخذ کی گئی ہے۔

شاعر، نقاد اور ڈرامہ نگار سابق صدر شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر شہباز نبی (موجودہ وائس چیئر پرسن مغربی بنگال اردو اکاڈمی) کی کتابوں کی مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب غالب کے سفر کلکتہ کے بارے میں ہے۔ انھوں نے تقی عابدی صاحب کی کتاب "غالب دیوان نعت و منقبت" کے محاسن اور انفرادیت اور موضوعی اہمیت پر انھیں دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے میرزا صاحب کی اعزازی ڈی لٹ کی تجویز پر کہا کہ "اس بارے میں پہلے سے ہماری یونیورسٹی کے ضابطے کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ایسی کوئی نظیر ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اس بارے میں یونیورسٹی کے اصولوں کا پتہ لگانے کے بعد ہی ایسی کسی تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔" شہباز نے کہا کہ "روزانہ کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کتاب کا نمبر علم ہو یا ہم نے ہر کتاب دیکھی ہو۔ لیکن تقی عابدی صاحب کی یہ کتاب واقعی ایسی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ علمی استفادہ کیا جا سکے۔ یہ اپنے موضوع پر اچھوتی کتاب ہے۔"

فلم کی اجازت نعت، منقبت، قصیدہ وغیرہ اصناف کی تعریف پیش کرتے ہوئے اپنی بات سے ظاہر کی کہ "ہومر، ورجل، ملٹن، گوئٹے، دانتے، رومی، فردوسی، حافظ شیرازی، سعدی، جامی، امیر خسرو، میر انیس وغیرہ کا ادب اعلیٰ اور ارفع ترین ادب قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح اقبال، ٹیگور اور دنیا کی شاعری یہ ثابت کرتی ہے کہ ادب کا مذہب سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ گوتم بدھ، رام چندر جی، کرشن، بر دھ مہاویر، عیسیٰ اور تمام ادیان عالم کے پیشواؤں سے منسوب اولی شاہکار ملتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ سے عشق کا اظہار نعتوں اور منقبتوں میں ہوتا ہے۔ صنف مرثیہ پر پچھلے چند سالوں میں بڑا کام ہوا ہے، لیکن نعت و منقبت و قصیدے موضوع کے طور پر ابھی تشنہ ہیں یا جا رہا ہے۔ اس کام کی بنیاد جن سے ہاتھوں ہو رہی ہے ان میں سے وہ

حضرات آج ہمارے مہمان ہوئے ہیں۔ سید تقی عابدی ہیں جن کی [illegible] ایک کتاب پاکستان سے شائع ہونے والے صبیح رحمانی کے جریدہ "نعت رنگ" نے شائع کی۔ اور دوسری شخصیت تقی عابدی صاحب کی ہے۔ یہ لوگ نعت کی تاریخی اور [illegible] تعین کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ فرمان انجاز نے کہا کہ نعت کہنے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے جس طرح بھجن گانے کے لیے ہندو ہونا ضروری نہیں ہے لیکن ہر دو صورت میں متعلقہ مذہب کی قدروں کے لیے دل میں احترام ہونا ضروری ہے۔ فرمان انجاز نے "غالب دیوان نعت و منقبت" پر ایک مختصر مضمون بھی سنایا۔ مضمون میں غالب کے دینی مسلک کو جس طرح وہ عابدی صاحب کی کتاب میں [illegible] پیش کیا گیا۔

اس کے بعد مصنف سید تقی عابدی نے اپنی کتاب کا نظریہ [illegible] ان کے مباحث کے تنوع اور تاریخ سے ان مباحث کی [illegible] اچھی طرح باندھ دیا۔ ان کی عالمانہ تقریر نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ فرمان انجاز نے مضمون پر روشنی ڈالتے ہوئے تقی عابدی نے غالب کے پانچ مقبول [illegible] ڈھنگ سے کی کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ مثنوی "ابر گہربار" بھی موضوع بحث بنی۔ فرمان انجاز نے روشنی ڈالی۔ غالب کے حضرت علی سے عشق کے مختلف پہلوؤں اور اس عشق کی حقیقت کا [illegible] عقلی جائزہ تقی عابدی نے پیش کیا۔

عابدی صاحب کی تقریر کے بعد فرمان انجاز نے چند باتوں کی طرف سامعین کی توجہ دلائی۔ پہلی بات یہ کہ غالب کی عظمت ہر دور میں ان کے فن پر لوگوں کے مختلف رائے کی وجہ سے ہے۔ اس سے ادب میں اختلاف [illegible] ہوتی ہے۔ چناں چہ تقی عابدی نے بھی اپنے اختلافی آرا کے ذریعہ غالب کے مسلک کی مختلف جہات روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مغرب سے اب تک کی شعرا اور فنکار کلکتہ میں ہمارے مہمان ہو چکے ہیں۔ سید تقی عابدی مغرب سے آنے والے [illegible] جنھیں کلکتہ کا مہمان ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اور یہ ہمارے لیے [illegible] بات ہے۔

فرمان انجاز نے ڈاکٹر یحییٰ نشیط کی طرف متوجہ ہو کر [illegible]

میں پھولا تامل یقین اور مثالی سی ہے کہ یحییٰ صاحب نے مجھ خاکسار ادب پر برسوں کی ریاضت سے ایک ضخیم کتاب لکھی، جو 2003ء میں شائع ہوئی۔ لیکن دیکھئے ان سے میری پہلی ملاقات کل ہوئی جب یہ ملتفتہ تشریف لائے۔ خلوص اور یگانگت سے اس تعلق پر بطلاون نہ فدا ہوا۔ سید تقی عابدی نے فن سے اثبات کے لیے میری ذات میں یحییٰ نشیط سے زیادہ موزوں کوئی نہ تھا اور تقی عابدی خود ان کے قدر دان ہیں۔ اس لیے میں نے نہیں مہاراشٹر سے ایک دور دراز متصل علاقہ سے مدعو کیا، جہاں یہ شہر کے شور اور آلودگی سے بچے رہ کر ادب کی تعمیر میں مشغول رہتے ہیں اور صوفیانہ طرز بسر کرتے ہیں۔ ان کا تنقید و تحقیق کا تخصص چھ جلدیں ہوئیں ان سے موضوعات تحریر بہت متنوع ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ کی حیثیت سے سید یحییٰ نشیط نے سامعین سے خطاب فرمایا۔ گرچہ وہ ایک مضمون لکھ کر لائے تھے لیکن انھوں نے اپنے تاثرات اپنی تقریر میں ہی روشن کردیے۔ انھوں نے تقی عابدی و غالب کا تقدیسی اصناف پر سارا کلام "غالب و دیوان غالب" منقبت "میں یکجا کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ہر عابدی صاحب نے دعائے ذیل میں یہ مناجات روحانی تجربہ، دعا کے جہاں اور دعا سے حضرت سجاد نے فیض ترشح کا ذکر کیا ہے۔ حضرت سجاد امام زین العابدین کی دعا کا منظوم ترجمہ جو غالب کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے بڑا موثر اور وقت انگیز ہے۔ یہ وہ دعا ہے جس سے فتنہ کے سامنے طوفان خس و خاشاک کی طرح بہہ پڑتی تھی۔ یہ وہ دعا ہے جس کے متعلق فرزدق نے ہشام بن عبدالملک سے کہا تھا۔

"یہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین کی دعا ہے۔ یہ متقی پاک صاف اور ہوشیار ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے قدم کو زمین محسوس کرلیتی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کو بیت اللہ جانتا ہے۔ اس کی حرمت پہچانتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جب تجھ سے ہو سکے تو اس سے قریب ہو جا تاکہ اللہ کی طرف سے باتوں کا استقبال کرے (یعنی باتوں کو سنے) یہ وہ شخص ہے جو شرم و حیا سے اپنی آنکھ نیچی رکھتا ہے اور ساری دنیا اس کی عظمت و ہیبت سے آنکھ نیچی رکھتی ہے۔"

یحییٰ نشیط نے زین العابدین کی دعا کے وقت "لبیک" کی خوف سے نہیں نکلتے

کہ کہیں جواب میں بارگاہ ایزدی سے "لا لبیک" کی صدا نہ آجائے۔ ظاہر ہے آپ کی ظاہری حالت میں خوف خداوندی کا یہ عالم ہو تو باطنی کیفیت میں آپ کی رقت و زاری کا کیا عالم رہتا ہوگا۔ غالب نے حضرت جامی کی ایک ہی ایک تضمین آمیز عارفانہ غزل کہی ہے، جس میں جذب و اضطراب اور بخود رفتگی سے عارفانہ بندگی کی جھلکیاں نمایاں ہوتی ہے۔ حضرت علی سے منسوب "دعائے صباح" کا منظوم ترجمہ بھی غالب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے نہایت اہتمام سے اس قدیم نسخے کی عکس پذیر کاپی کو اس پیش کے مضمون کے ساتھ کتاب میں شامل کر لی ہے۔"

یحییٰ نشیط نے کہا کہ "تقی عابدی صاحب نے غالب کی نعتیہ غزل کا تجزیہ بھی خوب کیا ہے۔ اس نعت میں عقیدت رسول تغزل کی چاشنی سے بھرپور ہو گئی ہے۔ باقی نعتوں میں غالب کا عشق رسول نمایاں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس ضمن میں یہ اولین کوشش ہے۔ آپ نے غالب کی نعتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ منقبت سے متعلق بعض اصطلاحات کی وضاحت بھی ضمناً اس میں ہو جاتی تو سونے پر سہاگا ہو جاتا۔ مثلاً "اہل بیت" "اثنا عشری نظام" "یوم غدیر خم" "علی ولی اللہ" "انگشتری علی" "شیر خدا" وغیرہ کہ ان میں سے بعض کا استعمال باقی کے معراج نامے میں قدیم معراج ناموں میں بھی ہوا ہے، اور منظوم سیرت رسول میں بھی۔ یہ مقامی ہی نہیں بلکہ اسلامی اساتذہ بھی ان کے معنی، مفاہیم سے باہم ہیں۔ کتاب کے اولین صفحات میں غالب سے متعلق چند مضامین بھی انتہائی معلومات افزا ہیں۔ کلکتہ میں یہ تقریب یادگار رہی۔

روزنامہ ''منصف'' ''سیاست'' ''اعتماد نیوز'' حیدرآباد
28/دسمبر 2006ء

اُردو زبان، تہذیب وثقافت کا عظیم خزانہ

مولانا آزاد یونیورسٹی میں ''غالب شاعر زیست'' سیمینار

وائس چانسلر سی نارائن ریڈی اور دوسروں کا خطاب

وائس چانسلر سی نارائن ریڈی سابق وائس چانسلر تیلگو یونیورسٹی نے کہا ''ہمیں اپنی شناخت کی برقراری کے لیے اپنی زبان وزندہ رکھنا ہوگا۔ اُردو زبان تہذیب وثقافت کا عظیم خزانہ ہے۔ مرزا غالب کے مرنے کے اتنے برسوں کے باوجود وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ زندہ ہیں۔ اس لیے وہ مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بجائے خراج تحسین پیش کررہے ہیں۔ وائس چانسلر سی نارائن ریڈی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مرزا غالب کے 211 ویں یوم وفات کے موقع پر ''غالب شاعر زیست'' کے عنوان پر پہلے دو روزہ بین الاقوامی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات بتائی۔ جس کی صدارت پروفیسر اے ایچ پنجوانی وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کی۔ وائس چانسلر نارائن ریڈی نے کہا ''ہندوستانی زبانیں آج مختلف ماحول سے دوچار ہیں۔ ہندوستانیوں نے ضرور آزادی حاصل کرلی لیکن یہ آزادی صرف سیاسی آزادی ہے۔ تہذیب وتمدن زبان اور ادب کے معاملے میں ابھی آزادی نہیں ملی۔ ابھی بھی ہم انگریزی کے آنچل سے بندھے ہیں۔''

وائس چانسلر نارائن ریڈی نے مرزا غالب کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا ''اس دور کے شعراء درباروں میں تعریفوں کے پل باندھتے نظر آتے تھے لیکن غالب ان سے دور رہتے۔ ان کا پتہ بھی نہیں تھا لیکن وہ قلعہ والوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔'' پروفیسر اے ایچ پنجوانی وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اس موقع پر کہا

سید تقی عابدی (کینیڈا) کی جانب سے تیار کردہ "غالب دیوان نسخہ مطبوعہ" کی رونمائی انجام دی اور اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو یونیورسٹی میں پچیس سے تیس روزہ سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے جو مرزا غالب کی 221 ویں ولادت کے موقع پر منعقد کیا جائے گا۔ اس موقع پر انھوں نے مؤلف "غالب دیوان نسخہ مطبوعہ" سے اپیل کی کہ اگر ان کے پاس اضافی قلمی مخطوطات ہوں تو وہ اسے اردو یونیورسٹی کے میوزیم و لائبریری میں رکھ دیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس کے جواب میں اعلان کیا کہ "ان کے پاس مخطوطات سے اگر اضافی نسخے ہوئے تو وہ اسے اردو یونیورسٹی کو عطیہ کر دیں گے۔"

انھوں نے بتایا کہ "ٹورنٹو (کینیڈا) میں ان کی شخصی لائبریری میں تقریباً 10,000 کتب اور 2 ہزار سے زائد قلمی مخطوطات موجود ہیں اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے مرنے کے 12 گھنٹوں کے اندر ساری کتابیں اور مخطوطات ٹورنٹو یونیورسٹی منتقل کر دی جائیں گی۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ برصغیر کی زبان ہے اسے مذہب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ابتداء میں پروفیسر ایس اے وہاب آنریری رجسٹرار انتظامات یونیورسٹی نے خیر مقدمی تقریر کی اور مہمان ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کا تعارف کروایا۔ تقریب میں پروفیسر قمر رئیس نائب صدر نشین دہلی اردو اکادمی، جناب جناب خواجہ عبدالمنتقم، ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر فاطمہ پروین، ڈاکٹر مسرت جہاں، جناب رحیم الدین مدار سمیت اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ "اعتماد" حیدرآباد
27 دسمبر 2006ء

رسم الخط کی تبدیلی سے
اُردو کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ

نئی نسل کو اردو سکھانے میں اس کی بقا مضمر، مولانا آزاد یونیورسٹی میں ڈاکٹر تقی عابدی کا توسیعی لکچر

اُردو تہذیب سے وابستہ افراد کسی ملک یا تمدن تک محدود نہیں، اُردو داں چاہے کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں لیکن اجنبی ممالک میں جب وہ اُردو کے نام پر جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں۔ صرف شمالی امریکہ بشمول کینیڈا میں 25 لاکھ کے قریب اردو داں ہیں جہاں پر تقریباً 50 اردو اخبارات، رسائل اور جرائد شائع ہوتے ہیں۔ مشہور اردو دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں "اردو کی نئی بستیاں" کے عنوان پر توسیعی لکچر دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا جس کی صدارت پروفیسر اے ایم پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے لکچر میں بتایا کہ آزادی کے بعد بعض گوشوں کی جانب سے اردو کو صرف 11 سال کی مہمان بتایا گیا تھا لیکن یونیسکو کے مطابق اردو آج دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ تقریباً ایک سو سال سے کچھ پہلے سے اردو والوں کی نئی بستیاں بسنا شروع ہوئیں۔ ایک سو سال پہلے لندن میں اردو کی پہلی نئی بستی وجود میں آئی تھی جس کے بعد یورپ کے مختلف ممالک مشرقی وسطیٰ کے بعد یہ آج امریکہ میں اپنے قدم مضبوط کر چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو صفحۂ ہستی میں زندہ رکھنے کے لیے اردو بولنا ضروری ہے جب کہ مغربی ممالک میں اردو کے بغیر زندہ رہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان ممالک میں اردو سے ذوق و شوق پیدا کرنے

کے لیے مختلف سرگرمیوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ میں ہر سال 400 یا 500 اردو مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ پروفیسر تقی عابدی نے کہا کہ "مشاعرے جو پہلے علمی دانش گاہ ہوتے تھے اب صرف تماشہ گاہ بن گئے ہیں۔ اس سے نہ صرف اب اردو کی خدمت نہیں بلکہ شہرت پرستی اور خودنمائی زیادہ ہو رہی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "اردو کی بقا میں اردو زبان خطبات جمعہ، میلاد کے جلسوں اور عزاداری کی مجلسوں سے کافی فروغ پا رہی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "جدید وسائل جیسے انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن وغیرہ سے بھی اردو کے فروغ کے لیے کام کریں تو زبان کو فروغ حاصل ہوگا۔" انھوں نے کہا کہ "اردو والوں کا فریضہ ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا انتظام کریں تو یہ زبان کبھی زوال پذیر نہیں ہوگی۔" اردو کے درخشاں ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "1800ء میں ٹیپو سلطان کی پہلی شہادت کی سال گرہ کی خوشی میں انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی تھی اور جان گل کرسٹ نے اس کالج کا نصاب تیار کیا تھا جس میں 75 فیصد اردو کی کتابیں تھیں۔ اس وقت ہندی کا وجود نہیں تھا۔" انھوں نے بتایا کہ "ہندی کی پہلی کتاب پریم ساگر جس کے مصنف للو جی لعل تھے شائع ہوئی تھی۔ 1900ء میں [illegible] میں ہندی کو فروغ دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔" مہاتما گاندھی نے 1918ء میں کہا تھا کہ "ملک میں قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو اردو اور ہندی دونوں پر مشتمل ہوگی۔" [illegible] اس کی مخالفت کرتے ہوئے 1952ء میں ہندی کو قومی زبان قرار دیا [illegible] برسوں میں ہندی نے اس قدر تیزی سے ترقی کی ہے کہ اقوام متحدہ کے مطابق دنیا بھر میں 7 واں مقام رکھتی ہے جب کہ اردو کو 22 واں مقام دیا گیا ہے۔ [illegible] بولنے والوں نے مادری زبان کے زمرہ میں مراٹھی، پنجابی، سندھی وغیرہ لکھائیں۔ انھوں نے کہا کہ "اردو اپنے ممالک میں بیانوں کی طرح رہتی ہے جب کہ [illegible] میں سڑکوں کے نام تک فارسی کی سرکردہ شخصیتوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے بتایا کہ "ایسے اردو اور پنجابی [illegible] ہندوستان میں دی جاتی ہیں اتنی پاکستان میں بھی نہیں دی جاتیں۔ اس کا مستقبل روشن ہے لیکن اردو والے اردو کی بنیادی سطح کو مضبوط بنانے سے [illegible]

سنوارنے میں لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "اردو ادب میں جتنا سرمایہ موجود ہے اتنا انگریزی ادب میں بھی نہیں ہے لیکن اردو والوں میں باہمی ارتباط نہ ہونے سے اس کی جامع ترقی نہیں ہو رہی ہے۔" پروفیسر تقی عابدی نے اردو کے دانشوروں پر زور دیا کہ وہ اردو حروف تہجی کے سلسلہ میں ایک پروٹوکول ترتیب دیں کوئی اردو کے 51 یا 52 حروف بتاتا ہے جب کہ انگریزی اور عربی کے حروف کی تعداد کمی سے بھی دریافت کر لیں تمام ایک ہی بتائیں گے۔ انھوں نے تمام دانشوروں کو جمع ہو کر اردو کے حروف تہجی کی تعداد طے کرنے کا مشورہ دیا۔" انھوں نے کہا کہ اردو رسم الخط کی حفاظت نہایت ضروری ہے کیوں کہ رسم الخط اردو کا چہرہ ہے۔" انھوں نے اردو کی 700 سالہ تاریخ کے حوالے سے کہا کہ "اردو رسم الخط تبدیل ہو گیا تو یہ معدوم ہو کر رہ جائے گی۔ رسم الخط کی تبدیلی سے تمام علوم جیسے کہ صرف، تشبیہات اور تعلیقات بدل جائیں گے۔" انھوں نے کہا کہ "اردو زبان کے حروف تہجی کی صوتیات (فونٹکس) پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ نئی نسل کو حروف تہجی کی صوتیات کے ذریعہ اگر تعلیم دی جائے تو یہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔"

انھوں نے نئی نسل کو اردو کی محافظ قرار دیا اور کہا کہ "نئی نسل کو اردو سکھانا اردو کی بقا ہے۔" انھوں نے اردو حروف تہجی پر سیمینار منعقد کرنے کا بھی مشورہ دیا اور اردو کے مختلف سیمیناروں اور ورکشاپس میں نوجوانوں کو موقع دینے کی وکالت کی۔

پروفیسر ایم یحییٰ وائس چانسلر یونیورسٹی نے کہا کہ "جب تک ہندوستان زندہ ہے اردو زندہ ہے۔ یہ زبان ختم نہیں ہو سکتی۔" انھوں نے اردو کی ترقی کے لیے انفارمیشن ٹکنالوجی سے مربوط کرنے پر زور دیا اور بتایا کہ یونیورسٹی کے تحت اردو ڈیجیٹل کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس میں اردو اور انفارمیشن ٹکنالوجی پر کام کا آغاز ہو گیا ہے۔" اس موقع پر پروفیسر ایس اے وہاب قیصر امتحانات بھی موجود تھے۔

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد
30/دسمبر 2006ء

''مرثیے کی شعریات''
عنوان پر ڈاکٹر تقی عابدی کا توسیعی لکچر

اُردو میں صنف مرثیے کو فارسی سے وراثت میں ملنے سے ترقی حاصل ہونے کی بات ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے کانوکیشن کال میں ''مرثیے کی شعریات'' پر اپنے توسیعی خطبے کے دوران کہی۔ پروفیسر ایس اے وہاب قیصر کنٹرولر امتحانات و انچارج ڈائریکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم نے صدارت کی۔ ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''ایک کامیاب مرثیہ نگار جذبات و احساسات کو تخلیقی وصف سے ہم آہنگ کرکے اس طرح پیش کرتا ہے کہ مرثیہ شاعری کے تخلیقی وصف سے مربوط ہوجاتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اردو شاعری کا تقریباً پچاس فیصد حصہ مرثیے پر مشتمل ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اردو مرثیے نے عربی اور فارسی مرثیے سے براہ راست استفادہ کرتے ہوئے اپنی ترقی و فروغ کا سفر طے کیا ہے۔''

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''شاعری چوں کہ محاکات یا جذبات نگاری کا نام ہے لہٰذا ایک کامیاب مرثیہ نگار جذبات نگاری کے ذریعہ اپنے اشعار کو تخلیقی بلندی سے ہم آفاقی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔'' اس توسیعی خطبے کے دوران ڈاکٹر عابدی نے اپنی بات کے نمائندہ مرثیے نگاروں کے بند بطور مثال پیش کرتے ہوئے جذبات نگاری کی مختلف قسموں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر عابدی نے مرزا دبیر کے مرثیے ''جب پیشوائے دیں ہوئے رخصت رن میں'' میں بارہ استعاراتی نظام کا تفصیل سے ذکر کیا۔

پروفیسر ایس اے وہاب قیصر کنٹرولر امتحانات و انچارج ڈائریکٹر [illegible]

فضلائی تعلیم نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر آفتی عابدی کے توسیعی خطبے کو فکر انگیز اور عالمانہ قرار دیتے ہوئے ان کی علمی، ادبی اور اردو خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ پروفیسر وہاب نے کہا کہ "ڈاکٹر عابدی صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز اردو کے ایک عظیم مجاہد اور خدمت گزاری حیثیت سے دنیا بھر میں سرزمین دکن کے پرچم کو بلند کرنے میں شبانہ روز مصروف ہیں۔"

ڈاکٹر نگہت جہاں، ایڈیٹر نظامت فضلائی تعلیم نے کارروائی چلائی اور اس پروگرام کے تحریر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، انچارج شعبہ تعلقات عامہ معلمان آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ڈاکٹر عابدی سے یونیورسٹی کے سرورق پروگراموں میں شرکت کے لیے اظہار تشکر کیا۔ اس توسیعی خطبہ میں موجود حضرات بالخصوص طلباء و کارکنان نے ڈاکٹر عابدی سے مرثیہ کی شعریات کے مختلف پہلوؤں پر استفسارات کیے جس کے ڈاکٹر عابدی نے تسلی بخش اور اطمینان بخش جوابات بھی دیے۔

روزنامہ ''پندار'' پٹنہ
14/دسمبر 2007ء

علامہ اقبالؔ کا ''جاوید نامہ'' انسان سازی کا شاہکار ہے

خدا بخش لائبریری میں سید تقی عابدی کا توسیعی خطبہ

خدا بخش لائبریری میں ٹورنٹو (کینیڈا) سے تشریف لائے ہوئے [illegible] سید تقی عابدی نے 13/دسمبر 2007ء کی شام ساڑھے پانچ بجے ''علامہ اقبال جاوید نامہ اور انسانی اقدار'' کے موضوع پر ایک پر مغز توسیعی خطبہ پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت معروف ادیب و شاعر پروفیسر لطف الرحمن، سابق وزیر تعلیمی فائق حکومت بہار [illegible] امتیاز احمد، ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری نے مقررین و سامعین کا [illegible] آج کے خطبہ کے موضوع اور مقرر کی شخصیت سے [illegible]

انھوں نے فرمایا کہ ''سید تقی عابدی اردو فارسی [illegible] کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے مطالعے کا خاص موضوع علامہ اقبال کی حیات اور ان کی تصانیف رہی ہیں۔'' انھوں نے آگے کہا کہ ''علامہ اقبال کی خواہش [illegible] ہے۔ ان کا پیغام عام انسانیت کے نام ہے۔'' انھوں نے اپنی تحقیقات میں انسانیت کے اقدار کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔

سید تقی عابدی نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ''علامہ اقبال کا جاوید نامہ انسان سازی کا شاہکار ہے۔ یہ علامہ کا اہم منظوم کلام ہے جس کی طرف خاص طور پر توجہ اور دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں دنیا کے تمام مذاہب خاص کر بدھ مت، ہندو دھرم اور اسلام وغیرہ کا خصوصی ذکر ہے۔ اس تمثیلی نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی قدر کرنے کی طرف بلایا گیا ہے۔ اس میں علامہ اقبال نے مولانا روم کے ساتھ مختلف سیاروں کی سیر کی ہے۔ یہ علامہ اقبال کا [illegible]

اس میں الغفران ابوالعلا المعری، فتوحات مکیہ ابن عربی اور دیوان حیدری سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں غالب کے معراج نامہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

"جاوید نامہ" میں علامہ اقبال نے شوامتہ کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ مختلف ادیان کے اکابرین کو مختلف سیاروں پر رکھا ہے مثلاً فلک قمر پر شوامتہ کو رکھا ہے۔ جنھیں انھوں نے جہاں دوست کا خطاب دیا ہے۔ شوامتہ کے سوالوں کے جواب میں علامہ نے کہا کہ "علم الموت کے بارے میں بندہ زیادہ جانتا ہے۔" اس طرح کی مختلف مثالوں سے انھوں نے علامہ اقبال کی تصانیف میں "جاوید نامہ" کی اہمیت کو واضح کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر لطف الرحمن نے اپنے صدارتی کلمات میں علامہ اقبال کی گوناگوں صفات کا ذکر کیا۔ علامہ اقبال کے پیغام کو انسانیت کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے انھوں نے علامہ اقبال کے پیچیدہ اشعار کے معنی کو محفوظ کیا۔ آخر میں ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل لائبریری ڈاکٹر امتیاز احمد نے مقررین و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ ''منصف'' ، رہنمائے دکن'' حیدرآباد
9/ مارچ 2009ء

غالبؔ شناسی، فارسی اشعار کے مطالعہ کے بغیر نامکمل

اُردو یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا توسیعی لکچر

''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی رسم اجراء

غالبؔ شناسی غالبؔ کے فارسی اشعار کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہے کیونکہ غالبؔ ایک عظیم لغت گو شاعر بھی تھے۔ فارسی کا ان کا مثنوی ابر گہربار میں شامل ''معراج نامہ'' نعت گوئی کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز غالب شناس ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ''غالبؔ بحیثیت فارسی شاعر'' کے موضوع پر توسیعی لکچر کے دوران کیا۔ مرزا غالبؔ اردو زبان و ادب کلچرل سے زیر اہتمام کانفرنس ہال میں منعقدہ لکچر کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن وائس چانسلر و انچارج وائس چانسلر نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی کی تصنیف ''کلیات غالب فارسی'' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے تحقیقی لکچر میں غالبؔ کی فارسی شاعری کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جن سے اکثر اردو داں حضرات ناآشنا ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کی فارسی شاعری کے علمی معیار اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ریمارک کیا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس عظیم شاعر کی شہرت و مقبولیت ان کی شاعری کے ایک چھوٹے سے جز ''دیوان غالبؔ'' (۱۸۴۱) سے ہوئی ہے۔ غالب شناسی چوں کہ غالبؔ کے فارسی شعر کے مطالعہ کے بغیر ادھوری ہے اسی لئے وہ اردو شاعری تک محدود رہتے ہوئے بھی ''ہم غالبؔ کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے''۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے بتایا کہ ''غالبؔ اپنی نعت گوئی کی خصوصیات کے لحاظ سے

''کلیات غالب فارسی'' مرتب کی ہے، جو 11337 اشعار پر مشتمل ہے۔ 250 صفحات پر مشتمل ڈاکٹر عابدی کا تحریر کردہ مقدمہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اور اقبال کا فارسی کلام ان کے اردو کلام سے زیادہ بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے خود اپنے اردو کلام کے کئی اشعار مسترد کر دیے تھے۔ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر بہت طور پر فخر تھا۔ غالب کے لیے فارسی اشعار ہی سند، ایرانی شعرا تھے۔ انھوں نے زبان دانی کے معاملے میں ایرانی شاعروں کی تقلید تو کی لیکن فکری طور پر اپنی ایک جداگانہ شناخت بنائی۔ فارسی کلام ''مثنوی ابر گہر بار'' میں شامل معراج نامہ 281 اشعار پر مشتمل ہے جو فنی شاعری میں کی شاہکار سے مرتبہ۔ ممتاز اسکالر نے جو بار مغرب میں اردو کی شمع روشن ہوئے ہیں لیکچر کے ابتدا میں کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی ساری دنیا میں عموم ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اردو تہذیب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ایک بڑا چیلنج ہے۔ جس سے پروفیسر اے ایم پٹھان اور ان کے ساتھی نہایت خوش اسلوبی سے نمٹ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لیکچر کے اختتام پر شرکا کے سوالات کے تسلی بخش جواب بھی دیے۔ پروفیسر آر اقبال احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کے فارسی کلام کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ''برصغیر کی فارسی نگاری کے ارتقا میں غالب کا ایک خاص مقام ہے۔'' انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیف ''کلیات غالب فارسی'' کو غالبیات میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ ابتدا میں پروفیسر بی کے ٹی، این اسکول آف لینگویجز نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، انچارج ڈائریکٹر مرکز برائے اردو زبان نے کارروائی چلانے کی ذمہ داری لی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایس اے وہاب، انچارج رجسٹرار کی ایما پر ایشیا یونیورسٹی، پروفیسر ایس رحمت اللہ، پروفیسر خدیجہ بیگم، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر ریحانہ سلطانہ، پروفیسر فاطمہ بیگم، پروفیسر آمنہ شکور، ڈاکٹر عباس خان، ڈاکٹر شاہدہ، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر ابوالکلام، حبیش الدین ایرانی، ڈاکٹر محمد نصرت جہاں، ڈاکٹر طارق مسعود، ڈاکٹر محمد عالم، جنید انور، ڈاکٹر شاہد نوید اور دوسرے موجود تھے۔

روزنامہ ''سیاست'' ''رہنمائے دکن'' حیدرآباد

1 رنومبر 2009ء

معرفت خداوندی اور حب رسولؐ، علامہ اقبالؔ کے فلسفۂ عشق کا نچوڑ

معرفت خداوندی اور حب رسولؐ، علامہ اقبالؔ کے فلسفۂ عشق کا نچوڑ ہے۔ مشرق نے عشق کے نچوڑ کا اسی راستے کی نشاندہی کی ہے جو بال جبریل سے زیادہ تیز ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی، صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ''اقبالؔ کا فلسفۂ عشق'' کے موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔ پروفیسر کے آر اقبال احمد، وائس چانسلر انجارنی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''عشق کا راستہ حضرت آدمؑ سے حضرت محمدؐ تک پہنچا ہے۔ عشق ایک عربی لفظ ہے جس کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے البتہ حدیث میں اس کا حوالہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ''حب'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ عشق کا فلسفہ بڑا پیچیدہ اور مشکل ہے۔ علامہ اقبالؔ کے اردو کلام کو اگر مطالعہ کریں تو جملہ 33 مقامات پر عشق کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب کہ مولانا رومؒ کے کلام میں جس سے علامہ اقبالؔ نے تحریک حاصل کی تھی۔ یہ تذکرہ صرف 4 مقامات پر ہے۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبالؔ کی شاعری میں عشق کے عناصر کی نشاندہی دیتے ہوئے کہا کہ ''اردو یا فارسی میں علامہ اقبالؔ سے بہتر تخلیقی اشعار کا مل سکتے۔ فلسفہ عشق و مستی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مذہب سے عاشق کے لیے مادی کثافتوں سے دور رہنا ضروری ہے۔ علامہ اقبالؔ کے فلسفہ عشق

شعرا پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ ان شاعروں سے پیغاموں میں معاملاتِ عشق کے ساغروں سے انڈیلی گئی عشق کی شراب ہے۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے نشاندہی کی کہ "دنیا میں فلسفہ عشق و معرفت پر تحقیق اور مطالعہ کی زبردست گنجائش اور ضرورت ہے۔ حیدرآباد میں یہ کام بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔"

ابتداء میں پروفیسر اقبال احمد نے ڈاکٹر عابدی کو عالمی سطح پر "اردو کا مبلغ" قرار دیا اور کہا کہ "اس زبان سے بے پناہ محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ ہیوسٹن سے پابندی کے ساتھ حیدرآباد آتے ہیں۔"

پروفیسر ایس اے حبیب مہمان اعزازی نے کہا کہ "اقبال کی شاعری میں فلسفہ عشق کا وسیع پیمانہ ہے جس سے مطالعے کے لئے گہرائی کے ساتھ گیرائی کی ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد ڈپٹی ڈائریکٹر انچارج نے مہمان کا تعارف اور مرزا سرزمینوں کا جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین اسسٹنٹ پروفیسر تعلیم نسواں نے خیر مقدم پیش کیا اور جلسہ اختتام کو پہنچا۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی

26/مارچ 2010ء

اخوت کا درس دینے والے دین کو دہشت گردی سے جوڑنا غلط: ڈاکٹر عابدی

ورلڈ پیس کانفرنس میں عزیز برنی کو امن ایوارڈ سے نوازا گیا

حضرت محمد مصطفیٰؐ کے یوم ولادت کے سلسلے میں [illegible] میں ورلڈ پیس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ''راشٹریہ سہارا'' [illegible] برنی کو ان کی صحافتی خدمات کے سلسلے میں پیس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان [illegible] یہ ایوارڈ سہارا کے سینئر صحافی شکیل شمسی نے وصول کیا۔ اس موقع پر [illegible] نے عزیز برنی کی صحافت اور طرز تحریر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا [illegible] کے ساتھ سچ بیان کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ابھی [illegible] مکتی ہے۔''

اس موقع پر مشہور تعلیم کے میدان میں [illegible] کے چانسلر سریش جین صاحب کو بھی ایوارڈ دیا گیا۔ پروگرام [illegible] ہوئے مہمان جناب علی ابن الحسین باقری نے [illegible] فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔

اس موقع پر ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں [illegible] منعقد ہوا، جس میں شکیل شمسی، سابق مرکزی وزیر عارف محمد خاں [illegible] مقالات پیش کیے۔ شکیل شمسی نے ''آنحضور [illegible] انھوں نے کہا کہ ''اگر مسلمان [illegible]

ایک دوسرے سے خطرہ محسوس نہ ہوتا اور وہ اپنی حفاظت کے لیے ہتھیاروں کی بیساکھیاں تلاش نہ کرتے۔"

عارف محمد خان نے اپنے مقالے میں کہا کہ "ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آنحضورؐ کی تعلیمات پر عمل کرے اور کسی مسلمان کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنے سے متعلق یا پست تر درجے کے لوگوں میں تفرقہ پیدا کرے۔" انھوں نے کہا کہ "اسلام میں بندگی کا مطلب ہے تقویٰ اختیار کرنا۔" انھوں نے کہا کہ "تقویٰ کے ایک معنی خدا شناسی بھی بیان کیے گئے جو انھیں زیادہ بہتر لگتے ہیں۔"

[illegible] سے آئے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مقالے میں کہا کہ "[illegible] سازی، اخلاق اور اخوت کا درس دینے والے دین کو دہشت گردی کا الزام دینا سراسر ناانصافی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے والے لوگ دلوں کو توڑنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔" انھوں نے علامہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں عشق رسولؐ کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی۔ سیمینار کے اختتام پر مہمان خصوصی اور سابق صدر پاکستان جناب رفیق احمد خان علوی نے حضورؐ کی سیرت طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "[illegible] دنیا میں مسلمان کو پریشانیوں میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے مسلمان اسلامی تعلیمات کو بھولتے جا رہے ہیں۔" انھوں نے کہا "حضور اکرمؐ نے کوڑا پھینکنے والی عورت کی عیادت کرکے ہمیں یہ تعلیم دی کہ ہمیں اپنے دشمن کے ساتھ کیسا عمل کرنا چاہیے۔ لیکن ہم اپنے دشمن تو کیا اپنے دوست کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کر پاتے۔"

پروگرام میں بڑی تعداد میں علما اور زعما نے شرکت کی۔ اس موقع پر امام حسین فاؤنڈیشن کی جانب سے کتاب کا جرمنی، ہالینڈ اور فرانس کی جانب سے سب ہی مہمانوں کو مومنٹو پیش کیا گیا۔

اسد رضا

روزنامہ "راشٹریہ سہارا" نئی دہلی

27 مارچ 2011ء

مرثیہ اور غزل اُردو کی زندگی کے ضامن ہیں

رثائی ادب کے ماہر معروف ناقد و محقق

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا اظہار خیال

37 سے زائد کتب کے مصنف، معروف ناقد و محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی حال ہی میں کینیڈا سے تشریف لائے تو روزنامہ "راشٹریہ سہارا" کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "وہ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ جب تک اس میں مراثی اور نوحے نیز ادبی تقاریب میں غزلیں پڑھی جاتی رہیں گی تب تک اردو کا مستقبل تابناک ہی رہے گا۔"

ڈاکٹر عابدی کے الفاظ میں "مرثیہ اور غزل اردو کی زندگی کی ضمانت ہیں۔ میر صاحب مراثی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب اور مرزا دبیر کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ سب کے مصنف ہیں۔ لہٰذا ان سے جب رثائی ادب کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ "مرثیہ ایسی صنف سخن ہے جو اسلام کے فن و ثقافت سے پیدا ہوئی ہے۔ قرآن کریم، احادیث اور تاریخ اسلام اس بات کے شاہد ہیں کہ ہمارے مذہب نے کسی کو منع نہیں کیا بلکہ وقوع کیا اور مرثیہ اس حقیقت کا عکاس ہے۔ اس لئے تمام مذاہب کے غیر مسلموں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ جن کی تعداد [illegible] سے زیادہ ہے۔ مرثیہ اسلامی ادب عالیہ کا جزو لاینفک ہے۔ لہٰذا اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رثائی ادب کو بھی نصاب پر نصاب کا حصہ بننا چاہیے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے [illegible]

اعلیٰ اخلاقی، ادبی اور مذہبی اقدار ہیں اور یہ اقدار کسی مخصوص فرقے کے لیے نہیں ہیں، بلکہ تمام مسالک اور مذاہب کے لیے ہیں۔ اگرچہ عابدی صاحب ایم بی بی ایس، ایم ایس، ایف سی اے پی اور ایف آر سی پی ہیں لیکن انھوں نے ادب کے ڈاکٹروں کے مقابلے میں زیادہ کہی اور یہ انی سے ناقدانہ محققانہ کارنامے انجام دیے ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ فکر انگیز قول ملاحظہ فرمائیں، وہ کہتے ہیں "مرثیہ زندگی کا آئینہ بھی اور آئینہ ساز بھی" تقی عابدی نے روزنامہ "راشٹریہ سہارا" کی اردو اشاعتوں کی بھی تعریف کی۔ انھوں نے بتایا کہ سینیڈا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، سعودی عرب، یو اے ای وغیرہ میں بھی اردو زبان و ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان نئی اردو بستیوں سے بھی اتنے شاعر، مرثیہ گو، ادب اور ناقد و محقق ابھر رہے ہیں۔

ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر
جون 2010ء

حکیم الامت کی پانچویں سالگرہ

ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر کی پانچویں سالگرہ کی تقریبات پر [illegible]
ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) ''حکیم الامت'' سے پہلے ایوارڈ سے [illegible]
اکبر حیدری کی دعوت پر 30 مئی 2010ء بروز یکشنبہ وہ اپنی [illegible]
پر وارد ہوئے۔

اگلے روز 31 مئی 2010ء دوشنبہ 3 بجے [illegible]
مہمان ہال ''حکیم الامت'' کے ثابت قدم پروانوں سے [illegible]
برقی قمقموں سے مقصہ نور بن رہا تھا۔ اسی اثنا میں [illegible]
جناب پروفیسر عبدالواحد قریشی تشریف لائے اور تمام [illegible]
تعظیم و تکریم بجالائے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مظفر حیدری نے جناب قریشی صاحب، ڈاکٹر تقی
عابدی، پروفیسر اکبر حیدری، ڈاکٹر شاہد علی (ڈائریکٹر جناب [illegible])
ذی وقار ڈاکٹر شاہ فیصل (جنھوں نے حال ہی میں ہندوستان [illegible]
(IAS) کی قابلیت کا کوہ نور کا تاج اپنے سر پر رکھ کے فخر ہندوستان کا [illegible]
سے گزارش کی کہ وہ اسٹیج پر تشریف لانے کی زحمت کریں۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز موقعہ اور محل کی مناسبت سے [illegible]
صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت سے کیا۔ تلاوت کے بعد [illegible]
خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا تعارف شاندار الفاظ میں [illegible]
علی جناب پروفیسر عبدالواحد قریشی نے ڈاکٹر عابدی صاحب کو [illegible]
دیوارۂ (توصیفی سند) اور خلعت فاخرہ سے [illegible]

صاحب نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تازہ ترین اور نئی تحقیقی و تنقیدی کتاب ''کلیات غالب فارسی'' مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی رسم رونمائی بھی انجام دی۔ ڈاکٹر شاہد ماہلی صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں عابدی صاحب کی مسلسل محنت شاقہ اور غالب شناسی کی تعریف کی۔

چوں کہ جناب وائس چانسلر صاحب کی یونیورسٹی کے انتظامی کاموں میں بے حد مصروف تھے اس لیے انھوں نے جلسے کے اختتام سے قبل ہی معرکہ آرا خطبہ صدارت پیش کیا۔ قریشی صاحب نے ''حکیم الامت'' کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حکیم الامت ملک کا اہل جواب اور بہت اہل رسالہ ہے جو گزشتہ پانچ برسوں سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔'' قریشی صاحب نے اور باتوں کے علاوہ میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ کردار پر بھی اظہار خیال کیا کہ حقیقت کا معیار تک میں کرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کے بارے میں پروفیسر واحد نے کہا کہ ''مجھے یہ لکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ جس ہندستانی فن کار نے اب تک جو تقریباً ۲۰ تصانیف کے مصنف ہیں، کینیڈا سے تشریف لاتے ہیں۔ میں ان کے مضامین ''حکیم الامت'' میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور ان سے غائبانہ متعارف بھی ہو چکا ہوں لیکن آج ان سے روبرو گل پوشی میں ایک گرمیٔ خوشیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ جب ہماری یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام شروع ہوگا تو ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لائیں گے۔''

خطبہ صدارت پیش کرنے کے بعد قریشی صاحب نے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب سے ادبیات کے موضوع پر طویل تقریر سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ وہ ایک گھنٹے سے زیادہ اپنی رواں خوش بیانی سے محفل پر چھائے رہے اور ''حکیم الامت'' کے ستارے ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے۔

ڈاکٹر سید تقی کی علمیت افروز تقریر کے بعد مہمان ذی وقار ڈاکٹر شاہد فیض جو بالکل نوجوان ہیں، انھیں پرتشکر الفاظ سے خراج تحسین پیش کیا اور اس کے فروغ و ترقی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ سامعین بے حد خوش ہوئے۔ ۱۹۸۷ء امتحان میں اردو ان کا اختیاری مضمون تھا۔

ڈاکٹر شاہ فیصل کی تقریر کے بعد چائے نوشی ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ بجے شعری نشست کا آغاز زیر صدارت ڈاکٹر شاہد عابد ہوا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور اپنے منفرد انداز بیاں میں اشعار پیش کر کے سامعین سے داد لی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سید محمد رضا صاحب نے انجام دیے۔ ان کے بعد شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ جناب شبیر قمر، جناب اشرف عاصی، ڈاکٹر اشرف انڑی، جناب سلطان الحق شہیدی، محترمہ رخسانہ بتول اور جناب [illegible] انتظار ہے)

ساڑھے سات بجے ڈاکٹر ظفر حیدری کے اظہار تشکر کے بعد [illegible]

ناندیڑ (مہاراشٹر)
5/جنوری 2011ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کی 5/جنوری کو ناندیڑ آمد

یشونت کالج کی بزم اردو کی افتتاحی تقریب میں شرکت

اور اُردو کے ادبی مسائل پر تقریر

عالمی شہرت یافتہ شاعر و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی بروز بدھ 5/جنوری دوپہر 12 بجے ناندیڑ پہنچ رہے ہیں۔ وہ اس دن یشونت کالج ناندیڑ کی بزم اردو کی افتتاحی تقریب میں شرکت کریں گے اور اُردو کے ادبی مسائل، اقبال اور غالب کے فن پر تقریر کریں گے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ہدیۂ تبریک تازہ ترین فون پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ یشونت کالج کے پرنسپل اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر سید شجاعت علی کی دعوت پر ناندیڑ آرہے ہیں۔ 5/جنوری کو صبح حیدرآباد سے چلیں گے اور دوپہر 12 بجے تک ناندیڑ پہنچیں گے۔

افتتاحی تقریب کے بعد کالج کے مشاعرہ میں بھی شرکت کریں گے۔ یکم مارچ 1952ء کو ہلی میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر سید تقی عابدی اس وقت کینیڈا میں قیام پذیر ہیں اور پیشہ سے ڈاکٹر ہیں۔ وہ کارڈیو لوجسٹ (CARDIOLOGIST) کینیڈا میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ وہ پچھلے 30 سال سے Internist اور Cardiologist کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے 1975ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے MBBS کی ڈگری حاصل کی۔ 1978ء میں گلاسگو (برطانیہ) سے (Pathologist) MRCP (پیتھالوجسٹ) ہونے کی وجہ سے انھیں ہندوستان اور پاکستان کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل

رچکے ہیں۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر 30 سے زائد تحقیقی
تحریریں ہیں جنھیں اُردو حلقوں میں کافی پسند کیا گیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالات وقتاً
فوقتاً سے شائع ہوتی ہیں۔ ان کی چند مصنفہ تحقیقی کتابیں یہ ہیں "باب العلم" (دو
جلد)، "اقبال کے عرفانی زاویے"، "مثنویات دبیر"، "سوانح نگار"، "مصحفی تنقیدی
مطالعہ"، "رموز شاعری"، "اظہار حق"، "روپ کنور مہاری"، "دلگیر"، "عاشق"،
"دربار رسالت"، "خوشہ انجم"، "شہید"، "شاہ اللہ فدا"، "اودھ کی ادبی
درباریں"۔

روزنامہ "ورق تازہ" ناندیڑ

۷/جنوری 2011ء

اُردو کو مسلمان بنانے کی کوشش مت کیجیے، اُردو کو 400 ملین افراد سمجھتے ہیں: ڈاکٹر تقی عابدی

یشونت مہاودیالیہ کی بزم اُردو کی افتتاحی تقریب میں مفتاح مجاز، ڈاکٹر بیگ احساس، فاطمہ پروین کا خطاب، شعری نشست کا انعقاد

معروف شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ "اردو کو مسلمان بنانے کی کوشش مت کیجیے کیوں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو دنیا کے 400 ملین افراد سمجھتے ہیں۔ اردو دنیا کی وہ زبان ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی اور ہم اردو والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پورا کام اردو میں کریں گے جس طرح دیگر زبان بولنے والے قومیں کرتی ہیں۔ وہ آج شہر کے یشونت مہاودیالیہ کی بزم اردو کا رسمی طور پر افتتاح کرنے کے بعد ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سی۔ این جاوھنے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی (فورٹو، کینیڈا)، اردو کے معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر مفتاح مجاز (حیدرآباد)، اردو کے جدید افسانہ نگار ڈاکٹر بیگ احساس (صدر شعبہ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی)، محترمہ فاطمہ پروین (صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)، ڈاکٹر محمد شوکت علی راشد پروفیسر نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) و محمد تقی ایڈیٹر "ورق تازہ" ناندیڑ تھے۔ جلسہ کا آغاز محمد یاسین کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی کلیدی تقریر میں کہا کہ

"جب اردو میں طاقت پیدا ہوئی تو وہ خود مختار روایتی روزی سے بڑھا ہے ۔ اردو کی [illegible] میں پیوست ہیں۔ اردو کے قواعد کا ڈھانچہ سنسکرت سے تعلق ہے۔ اردو شاعری نے صرف 250 سالوں میں ترقی کی ہے جو دوسری زبانیں 1000 سالوں میں نہیں کر سکیں۔ میر سے لے کر مرزا غالب کی غزلیں اور میر انیس کے مرثیے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کا حصہ ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے خصوصیت سے مرثیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی [illegible] شاعری مرثیہ پر مشتمل ہے۔ مرثیہ میں میر انیس نے بات کرنے کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ امام باڑوں میں دفن نہ کیا جائے بلکہ اسلام کا پیغام [illegible] مرثیہ میں محاسن زبان ملیں گے۔ الطاف حسین حالی [illegible] اردو کا زوال مرثیہ سے روگردانی بھی ہے۔ [illegible] ہیں۔ قرآن مجید کے سب سے زیادہ [illegible] ورزبان میں نہیں۔ اردو دل کو چھونے والی زبان ہے۔

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا
کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

یہ مصرعہ دل پر اثر کر جاتا ہے۔ اردو زبان و زندہ [illegible] حکومت پر الزام دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اپنی [illegible] طلبہ کو صحیح ادبی راستہ دکھائیں۔" ڈاکٹر تقی عابدی نے [illegible]

"اردو کو مسلمان بنانے کی کوشش مت کیجیے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں [illegible] کو بھی چاہیے کہ وہ اردو کے کسی مذہب کا یقین نہ کریں۔" انہوں نے [illegible] چار بڑے شاعر میر تقی میر، مرزا غالب، میر انیس اور [illegible] ہیں۔ غالب کے [illegible] ہیں ایک اردو اور ایک فارسی میں۔ [illegible] 12000 اشعار پر مشتمل ہے۔ غالب کی فارسی شاعری [illegible]

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "اردو کا [illegible] فیض سے [illegible] 1911ء میں ہوئی تھی۔ 13 فروری 2011ء میں [illegible]

۱۰ اے فیض کی صدی منائیں۔"

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ "عبرانی زبان یہودیوں کی مادری زبان ہے۔ جس کا یہودی ۳ ہزار سال سے تحفظ کرتے آئے ہیں۔ ان کے یہاں عبرانی زبان سیکھنا ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم اردو کو ذریعہ تعلیم بنائیں۔ اپنی مادری زبان اردو میں بچوں کو ابتدائی تعلیم دلوائیں۔"

محترمہ ڈاکٹر پروین نے ہندوستان میں اردو کی ترقی پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی ابتدا میں پروفیسر ڈاکٹر محمد شجاعت علی نے ڈاکٹر عابدی کا اور پروفیسر نسیم قمر نے ڈاکٹر مظفر حنفی کا خوب صورت انداز میں تعارف کروایا۔ پروگرام کی نظامت کاشف حسنات صفدر علی اور مہتاب بیگم نے بحسن و خوبی انجام دی۔ تمام مہمانوں کی گل پوشی، شال اور مومنٹو سے استقبال کیا گیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد شعری نشست کا آغاز ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کی۔ ڈاکٹر عابدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی، فیروز رشید اور مہدی امیر صدیقی نے اپنے شعری کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ دونوں پروگراموں میں طلبا، طالبات اور معزز شہریان کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ ''سیاست'' ''رہنمائے دکن'' حیدرآباد
5/جنوری 2011ء

''فیضؔ فہمی'' کے لیے وسعت النظری کے ساتھ مطالعہ ضروری

ڈاکٹر تقی عابدی کا ''گواہ'' توسیعی لکچر،

انقلابی شاعر کی زندگی کے مخفی گوشوں پر روشنی

فیض احمد فیضؔ کی شخصیت اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے [illegible] ضرورت ہے۔ فیضؔ خاموش طبع اور ان پڑھ جانے والے [illegible] شخصیت کے حامل تھے۔ انہیں چند ترقی پسند شعرا نے [illegible] نشانہ بناتے رہے کیوں کہ فیضؔ کی شاعری میں شعلہ فشانی، [illegible] ہے۔ فیضؔ اپنی شاعری کے آتش گل سے شعلہ فشانی [illegible] کانفرنس ہال، ہوٹل گرانڈ پلازا، نامپلی میں ڈاکٹر تقی عابدی، [illegible] ''گواہ'' کے زیر اہتمام توسیعی لکچر بعنوان ''کیا یہ فیضؔ کی صدی ہے؟'' سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔

اس موقع پر شہ نشین پر ڈاکٹر سید ضیاء الدین [illegible] جاوید، جناب فخار شریف، جناب وصل حسین پرویز اور [illegible] تھے۔ جب کہ شرکا میں ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی [illegible] میں ڈاکٹر یوسف اعظمی، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر [illegible] کالج عثمانیہ یونیورسٹی، جناب شریف الدین [illegible] نیہ، جناب مظہر مجاز، جناب اعجاز احمد خان صدر [illegible] جوہ وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے [illegible]

میں ترقی پسند عناصر موجود ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "فیض پر صرف ترقی پسند شاعر ہونے کا الزام غلط ہے انھوں نے حمد، نعت، مناجات بھی لکھیں۔ فیض پر بہت زیادہ مظالم ڈھائے گئے۔"

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "ان کی نظر میں فیض احمد فیض کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں کے تین گروپ ہیں ایک گروپ ترقی پسند شعراء اور مصنفین کا ہے جو فیض کے کلام سے حوصلہ افزائی حاصل کرتے ہیں اور اس کی ہمیشہ ستائش کرتے ہیں۔ دوسرا گروپ ایسا ہے جو ہمیشہ فیض کے کلام پر تنقیدیں کرتا رہا ہے اور تیسرا گروپ فیض کے کلام کی خوبیوں کو پسند کرتا ہے اور دوسری غیر اہم باتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ "یہ صدی فیض کی صدی ہے کیوں کہ وہ اپنے دور کے ایک منفرد شاعر رہے ہیں۔" ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مختلف نقاد کا نام لیتے ہوئے کہا کہ "یہ بات میرے مطالعہ سے ثابت ہے کہ دنیا کی بہت سی زبان کے ممتاز شعراء کے کلام کو مغرب کے شعراء کے کلام سے تقابل کرتے ہیں۔ فیض کی نظموں کو بھی انگریزی شعراء کی نظموں کا پرتو قرار دیتے ہیں جن میں ان کی مشہور نظم "تنہائی" بھی شامل ہے جب کہ یہ فیض کا منفرد کلام ہے۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "فیض ایک نرم گفتار اور منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے وہ ایک رجائیت پسندی اور شب زندہ دار شاعر تھے۔" انھوں نے کہا کہ "فیض احمد فیض کی مرتبہ حیدرآباد کانفرنس بھی کیے تھے۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ "ان کی خدمات اور ان کا کام غیر معمولی ہے۔" اس تقریب سے جناب ظفر جاوید اور ظفر شریف ایڈووکیٹ نے بھی خطاب کیا۔ جناب سید فضل حسین پرویز ایڈیٹ روزنامہ "واحد" نے مہمانوں کا تعارف کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف کروایا۔ ڈاکٹر شاہ عنایت علی رشدی نے ریٹائرڈ ملازم آزاد اردو یونیورسٹی نے خدمت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر جناب ظفر جاوید و صدر نشین ظفر ضیاء الدین

ڈیولپمنٹ بینک جدہ تا مزدیے جانے پر "گوادر" کی جانب سے تہنیت پیش کی گئی۔ "گوادر"
کی جانب سے تمام مہمانوں کی شال پوشی کی گئی اور انھیں یادگاری تحائف پیش کیے گئے۔ مولانا
رکن الدین اور خان اظہر نے فیض کا کلام سامعین کے گوش گزار کیا۔ "گوادر" کی جانب
سے محمد رفیق شکیل مرزا، محمد عبدالرشید جنید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ "منصف" حیدرآباد

18/مارچ 2011ء

اُردو کی بقاء کے لیے بچوں کو اُردو تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور

"اکیسویں صدی میں اُردو کے عصری تقاضے"

کے عنوان پر ڈاکٹر تقی عابدی کا لکچر

ممتاز تحقیق، دانشور و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے اُردو جاننے والوں پر زور دیا کہ "وہ اپنے بچوں کو اپنی تعلیم کے ساتھ اُردو کی بنیادی تعلیم دینے کا انتظام کریں یا وہ خود پڑھائیں تاکہ ان کے ذریعہ آنے والی نسلوں تک اُردو زبان کو پہنچایا جاسکے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی آج ہوٹل گرانڈ پلازہ میں منعقدہ "اکیسویں صدی میں اُردو کے عصری تقاضے" کے موضوع پر توسیعی لکچر دے رہے تھے۔ یہ توسیعی لکچر معلمانِ اُردو، طلبہ حیدرآباد کے لیے خاص منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ "اپنے بچوں کو اُردو تعلیم کا بندوبست کرانے کے لیے حکومت سے فریاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اُردو جاننے والے اساتذہ اپنے محلوں میں بچوں کو اُردو کی تعلیم دیں۔" انھوں نے کہا کہ "اُردو ہماری مادری زبان ہے اس میں مذہبی معلومات کے علاوہ دیگر معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ والدین اپنے بچوں کو اُردو تعلیم سے وابستہ کریں کیونکہ یہ زبان بول چال سے بڑھتی ہے اور بولنے والوں کی زبان بن جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں والدین کو اپنے گھروں پر اُردو اخبار اور لٹریچر منگوانے کا انتظام کرنا پڑے گا تاکہ اس کے ذریعہ معصوم بچوں میں اُردو سے لگاؤ اور شوق پیدا ہو۔" انھوں نے کہا کہ "اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں 4000 مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، دنیا میں 276 واں مقام ہے جب کہ دنیا میں ہندی زبان کو چھٹواں مقام حاصل ہے۔" انھوں نے کہا کہ "500 سال سے وہ ان ملک میں ہندی زبان

تیزی سے پروان چڑھی ہے اس طرح [illegible] فروغ حاصل نہیں ہوا [illegible]

"امریکہ میں اردو کو زبردست فروغ حاصل ہو رہا ہے [illegible] ہفت وار اور نو رنخو میں (2) ہفت وار اور [illegible] ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "ہندوستان کی بہ نسبت امریکہ میں [illegible] دینے کے لیے زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ [illegible] اسکول میں دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جب کہ ہندوستان میں [illegible] والے اسکولی طلباء کی تعداد صرف 6 فیصد ہے۔ [illegible] اردو پڑھانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ [illegible] مشاعروں اور دیگر پروگراموں میں نوجوانوں کی [illegible]

نامور مزاح نگار پدم شری [illegible] نے [illegible] اردو زبان کی ٹکر کی کوئی دوسری زبان نہیں تھی [illegible] کرانے کے لیے ابھروں [illegible] آزاد ہونے کے بعد اب اس کا [illegible] علاقے کے عوام اس زبان سے محبت [illegible] کہ "پچھلے (50) سال سے [illegible] کے لیے کام کرنا پڑے گا۔"

صدر شعبہ اردو حیدرآباد [illegible] عابدی کا تعارف کرایا۔ ایڈیشنل [illegible] کی۔ صدر کلب [illegible] کارروائی چلائی۔ [illegible]

"عالمی سہارا" نئی دہلی
13 اگست 2011ء

"فیض فہمی" کے عنوان سے مذاکرہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں "فیض فہمی" کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا، جس میں پیش آئے ممتاز ماہر سرطان اور اردو کے قارئ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "فیض عالمی شاعری کا ایک مکمل شاعر ہے۔ جدید شاعری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے اور انھوں نے الفاظ و خیال کے پرانے ساغر کو نئی شراب سے سجایا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "فیض کی شاعری میں مغربی و مشرقی شاعری کا حسین امتزاج ملتا ہے جس میں رومان بھی ہے اور عشق و انقلاب بھی۔" ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "وہ صحت سے غریب اور اب سے امیر ہیں۔" مظلوم شعرا کے ساتھ ہونی زیادتیوں اور ان کی قابل ستائش کاوشوں و منظر عام پر لانا ان کا اصل موضوع ہے۔" انھوں نے کہا کہ "مرثیہ و امام باڑوں میں فن دیا ہے جب کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا خزینہ ہیں۔"

شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد نے مہمان خصوصی جناب تقی عابدی کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ہی ان کے علمی و تنقیدی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ صدر مجلس پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے سید تقی عابدی کی کتاب "فیض فہمی" کا اجرا کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے سید تقی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کے تحقیقی کاموں کی ستائش کی۔ جناب انتظار عباس بلگرامی نے بذریعۂ ڈاکٹر شاہد علی نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔ نظامت کے فرائض جناب حیدر نقوی نے انجام دیے۔

سید وقار الدین قادری (چیف ایڈیٹ)
روزنامہ "رہنمائے دکن" حیدرآباد
30/اگست 2011ء

کلام فیضؔ علامتی شاعری کا شاہکار

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا لکچر

4/ستمبر کو بدست پروفیسر محمد میاں "فیضؔ فہمی"
1424 صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی رسم اجرائی

مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام فیضؔ عابدی [illegible]

4/ستمبر کو شام 7 بجے "کلام فیضؔ" علامتی شاعری کا شاہکار [illegible]
دانشور، ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی (سینیڈ) سے تعلق رکھنے والے [illegible]
متصل تاج ہاؤس، نامپلی حیدرآباد میں انجام پائیں گی۔ [illegible]
آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے وابستہ چیئرمین پروفیسر محمد میاں [illegible]
ہوں گے۔

ممتاز مورخ دانشور و ماہر [illegible] صدارت کریں گے۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد میاں [illegible]
مرتبہ 1424 صفحات پر مشتمل انتخابی ضخیم کتاب "فیضؔ فہمی" [illegible]
کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد بانی صدر مکتب [illegible]
آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے بحیثیت چیف میڈیا فیکلٹی [illegible]
میں شامل کی گئی۔ اپنی نوعیت کی اس منفرد کتاب میں صرف [illegible]
کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر [illegible]

پروین ... کی پرنسپل کالج آف آرٹس، علامہ یونیورسٹی ... پروفیسر سید احسان، صدر شعبہ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی ... عابدی کا تعارف اور ... کا مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

پروفیسر ... اردو ... معلومات افزا مقالہ ... آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ... کلب ... پیش کریں گی۔ اس خصوصی توسیعی لیکچر ... تقریب ... قبل شام ۱۱ بجے ... مدعوین ... لیے چائے نوشی کا نظم رہے گا اور ... پروگرام کا آغاز ... ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد نے تمام مدعوین بالخصوص ... شعبہ ... کارکن اور پروگرام ... وقت ... پابندی ... شرکت ... پرخلوص خواہش کی ہے۔ مزید تفصیلات ... فون نمبر 03462587612 ... رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد
26 ستمبر 2011ء

فیضؔ کسی ایک نظریہ کے حامی نہیں بلکہ عوامی انقلاب کے طرف دار تھے

ڈاکٹر تقی عابدی کے ضخیم کتاب "فیضؔ فہمی" کی رسم اجرائی، ضیاء الدین شکیب، مجتبیٰ حسین اور دیگر کا خطاب

فیض احمد فیضؔ حقوق و آزادی کے نقیب اور مظلوموں، محرومو کے طرف دار تھے۔ وہ کسی ایک نظریہ کے انقلاب کے حامی نہیں بلکہ عوامی انقلاب کے خواہاں تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کے رومانیہ، عقیدہ و مقصدی کلام میں بھی حق پرستی کے ساتھ ساتھ مظلومیت کا ذکر ملتا ہے۔ فیضؔ کا لہجہ درد، خلوص حق بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ کلام پیش نہ کرنے کے باوجود جید شعراء کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مختلف دانشوران ادب نے آج یہاں ہوٹل گرانڈ پلازہ میں ڈاکٹر تقی عابدی کی ضخیم کتاب "فیضؔ فہمی" رسم اجرائی تقریب و توصیفی لکچر میں کی جس کا اہتمام معوان آزاد کلب نے کیا تھا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کیا۔ اس موقع پر توصیفی خطبہ دیتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "فیض احمد فیضؔ پر بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ فیض شناسی پر اب تک جتنا کام ہوا ہے اس میں فیض شناسی سے زیادہ خود نمائی نظر آتی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "فلسفہ کا سب سے بڑا شاعر سر محمد اقبالؔ ہے۔ "جاوید نامہ" کے 1892 اشعار ایسے ہیں جنھیں سمجھنے کی ہم نے کوشش نہیں کی ہے۔ "جاوید نامہ" جو تمثیلی معراج نامہ ہے پوری دنیا کو سر محمد اقبالؔ نے ایک چیلنج کے طور پر دیا ہے جس سے ہم نا آشنا ہے۔"

انھوں نے کہا کہ "اقبالؔ اور فیضؔ دونوں ہی سیالکوٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان

ے انتظار ایک ہی ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "اقبال کی شاعری کی توضیح سے بعض زاویوں کا نام فیض ہے۔" انھوں نے کہا کہ "فیض غزل سے صرف [illegible] شعر پر زندہ و تابندہ رہے اس کی مثال ہے" فیض نے [illegible] مزاحمت میں صرف [illegible] غزلیں ہی اور اتنی مقبولیت حاصل کی اس کی مثال ہے" ان کی شہرت و مقبولیت کی مثال کا فن اس شاعری ہے۔"

انھوں نے کہا کہ "فیض نے [illegible] کیا ہے اور [illegible] کا سلسلہ ہے۔" انھوں نے فیض اور فیض کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ "[illegible] تھا [illegible] فیض نے یا ان نے انھیں سب سے منفرد بنا دیا ہے۔ ان کے [illegible] [illegible] [illegible] نے۔" انھوں نے کہا کہ "مزاحمتی و احتجاجی شاعری میں [illegible] جوش ہوتا ہے [illegible] شاعری [illegible] جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اس کے برخلاف فیض کی شاعری میں [illegible] [illegible] جس سے قوش دیرپا قائم رہتے ہیں۔"

[illegible] نے کہا کہ "فیض نے [illegible] اپنے ہاتھ سے جانے دیا اور نہ ہی سمجھ سکے [illegible] فیض نے [illegible] [illegible] میں [illegible] فرمائی ہے جس کا اردو [illegible] میں [illegible] پایا جاتا ہے۔ انھوں نے [illegible] علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ انھوں نے فیض سے صرف نظر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ اقبال مظلوم تھے اس لیے ان پر کفر کے فتوے [illegible] [illegible] میں جب فیض پر کفر کا فتویٰ جاری کیا [illegible] [illegible] فیض نے جیسے دیوانوں [illegible] [illegible] انھوں نے کہا کہ "فیض نے [illegible] [illegible] اور [illegible] میں بھی [illegible] [illegible] [illegible] فیض کا [illegible] [illegible] [illegible]

راہیں کھولی ہیں۔" انھوں نے فیضؔ کے کلام کا سائنسی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور اپنے مضامین کو پیش کیا ہے اور اپنے مضامین سے علاوہ دیگر دانشوران ادب کے مضامین کو پیش کیا ہے۔ جن تک عام لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔ فیضؔ کی کے خلاف راعلس و نفرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ پاکستان سے برطانیہ آنے کے بعد ان سے ملنے کا نہیں موقع ملا جس سے ان کی شخصیت اور کلام کو سمجھنے میں بھی مدد ملی۔ انھوں نے کہا کہ "فیضؔ کے کلام و شخصیت کے جن پہلوؤں پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے اس کا ہمیں اس کتاب سے پتہ چلا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فیضؔ پر چلے کے متعلق مواد کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔"

جناب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ "طب کے جو ڈاکٹر ہوتے ہیں وہ بیماریوں کو پھیلنے سے روکتے ہیں مگر جو ادب کے ڈاکٹر ہوتے ہیں وہ بیماریوں کو پھیلاتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی جو پیشہ کے اعتبار سے طب کے ڈاکٹر ہیں ادب میں بھی بڑی حد تک دخیل ہیں مگر انھوں نے ایک ایسے دور میں جہاں غلط فہمیوں، خوش فہمیوں اور تنگ نظر فہمیوں کا دور دورہ ہے۔ "فیضؔ فہمی" کا کام کیا ہے۔"

انھوں نے بتایا کہ "فیضؔ احمد فیضؔ اپنا کلام ایسا پڑھتے تھے جیسے وہ کسی دشمن کا کلام پڑھ رہے ہوں مگر ان کے کلام کو مہدی حسن اور نور جہاں نے بڑے ہی خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے اور اب ڈاکٹر تقی عابدی نے "فیضؔ فہمی" کا انداز اختیار کیا ہے۔ فیضؔ اگر آج ہوتے تو ڈاکٹر عابدی کی "فیضؔ فہمی" سے فیضؔ بھی فیضیاب ہوتے۔"

پروفیسر سیدہ جعفر نے کہا کہ "فیضؔ فہمی، بیک وقت اور کرانقدر مرصع ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی جیسی علم دوست اور ادب نواز شخصیت سے نام سے وابستہ ہونے پر سرزمین حیدرآباد ناز کرتی رہے گی۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنی سادگی کی بناء پر "فیضؔ فہمی" کا نام دیا ہے جب کہ اس کو فیضؔ انسائیکلوپیڈیا کہا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیق و کاوشوں کے ساتھ ساتھ مختلف دانشوروں، نقادوں، ادیبوں، اساتذہ، پروفیسروں کے مضامین کو شامل کرتے ہوئے فیضؔ کے مختلف گوشوں اور زاویوں کو منظر عام پر لائے ہیں۔ یہ کتاب تحقیق و ترتیب کا بہترین امتزاج ہے۔"

قبل ازیں پروفیسر فاطمہ پروین نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی خدمات کا جامع،

روزنامہ ''رہنمائے دکن'' حیدرآباد
27/ستمبر 2011ء

فیضؔ کی شاعری منفرد ترسیلی نظام اور امیجری کا شاہکار

''فیضؔ فہمی'' کی بدست پروفیسر سیدہ جعفر رسم رونمائی مقررین کی مخاطبت

فیضؔ کو جس چیز نے فیضؔ بنایا ہے وہ ان کا فن ان کی شاعری اور امیجری ہے۔ ایسی امیجری اردو میں بہت کم ملتی ہے۔ فیضؔ علامتی شاعری کا ایک مکمل شاعر ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی ممتاز محقق، ادیب، شاعر، دانشور، ناقد (کینیڈا) نے ''کلام فیضؔ علامتی شاعری کا شاہکار'' موضوع پر اپنے توسیعی خطبہ کے دوران کیا جس کا انعقاد فیضؔ صدی تقاریب کے سلسلے میں مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام کانفرنس ہال ہوٹل سرنڈ پلازا متصل حج ہاؤس حیدرآباد عمل میں لایا گیا تھا۔ ممتاز مورخ و دانشور پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب نے اس تقریب کی صدارت کی جب کہ پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ و حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے بحیثیت مہمان خصوصی اور پدم شری پروفیسر مجتبیٰ حسین نے بحیثیت مہمان اعزازی اس تقریب میں شرکت کی۔ سلسلہ خطاب جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ نے حمد ہو کہ نعت، منقبت ہو کہ مرثیہ، ہر صنف میں اپنے فن کو انتہائی منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیضؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنا ایک علیحدہ ترسیلی نظام رکھتے ہیں۔ جس کے باعث ان کی شاعری میں ترسیل و ابلاغ مسئلہ بآسانی حل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ کے کلام میں غنائیت بھری ہوئی ہے۔ لیکن فیضؔ ایک جرأت مند شاعر ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''جہاں فیضؔ ''مجھ سے پہلی سی محبت نہ مانگ'' کے ذریعہ اپنے محبوبہ کا تعارف کرواتے ہیں وہیں غم جاناں و غم دوراں کو بھی اپنی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تحقیقات کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ مہمان اعزازی پدم شری پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ "ڈاکٹر عابدی جو بھی کام کرتے ہیں مثال کا کام کرتے ہیں۔" پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ "اگر آج فیضؔ زندہ ہوتے تو تقی عابدی سے اپنے اشعار سن کر "فیضؔ فہمی" سے وہ بھی مستفید ہوتے۔" پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ "حیرت اس بات کی ہے ڈاکٹر عابدی اکیلے ہی یہ سارے کام اس حسن و خوبی سے انجام دیتے ہیں کہ ان کی کاوشوں کو سراہا نہ جائے تو یہ ادبی بددیانتی ہوگی۔"

پروفیسر سید احسان صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے "فیضؔ فہمی" کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "فیض احمد فیضؔ پر تنقیدی جامع کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی مستقبل میں اس کی امید ہے۔"

پروفیسر فاطمہ پروین مالن پرنسپل کالج آف آرٹس جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف اور "فیضؔ فہمی" کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقات میں ان کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ ابتداء میں پروفیسر ریحانہ سلطانہ نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے قیام کے اغراض و مقاصد اور ان کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔

جناب سید فضل حسین پرویز ایڈیٹر "گواہ" نے اس موقع پر شائع کردہ "گواہ" کے زیر اہتمام 11 فروری کو حیدرآباد میں منعقدہ فیضؔ صدی کی پہلی تقریب کی روداد پر مبنی (1) ڈاکٹر تقی عابدی کو پیش کی۔

پروفیسر ریحانہ سلطانہ، جناب عباس خان رکن پارلیمنٹ انچارج مانو، ڈاکٹر محبت جہاں ایسوسی ایٹ پروفیسر مانو، جناب محمد مجاہد علی پروڈیوسر، انسٹرکشنل میڈیا سنٹر مانو اور ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم نے مہمانوں کو نذرانہ کل پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد ڈپٹی ڈائریکٹر سی پی ڈی یو ایم پی مانو، بانی صدر کلب نے وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر محمد میاں کی جانب سے ڈاکٹر عابدی کو اردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ پروفیسر بنائے جانے کے سلسلے میں پروفیسر محمد میاں کا پیام مبارک پیش کیا۔ نظامت کی اور کلمات تشکر پیش کیے۔ اس تقریب میں پرستاران فیضؔ احمد فیضؔ اور تقی عابدی کی ایک بڑی

تعداد ۴۰ تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر عابدی نے حاضرین کے استفسارات کے بھی تشفی بخش جوابات دیئے۔ جناب رحیم الدین خاں، جناب منظور الامین، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر میر محبوب حسین، ڈاکٹر شیخ سلیم، ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب صلاح الدین نیر، جناب علی ظہیر اور نمائندہ ماہنامہ کتاب نما بھی اس تقریب میں شریک تھے۔ جناب حمید المظفر نے اس موقع پر ڈاکٹر عابدی کو آندھیا پردیش کی جانب سے شائع کردہ مختلف کتابیں ڈاکٹر عابدی کو تحفتہً پیش کیں۔

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد
27/ستمبر 2011ء

اُردو کی ترقی وترویج کے لیے
ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمات کا اعتراف

مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی کے اعزازی وزیٹنگ پروفیسر مقرر کرنے کا فیصلہ

[illegible] مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد میاں نے ممتاز نقاد، ادیب، شاعر و ماہر تعلیم ڈاکٹر سید تقی عابدی کو یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں بحیثیت استاد اور بحیثیت ماہر زبان و ادب اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے کی جانے والی انتھک کاوشوں کے اعتراف میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد کے اجتماعی [illegible] ڈاکٹر سید تقی عابدی کی زیر ادارت شائع ہونے والی سہ ماہی بین الاقوامی ریفریڈ جرنل ''فکر و تحقیق'' کا 'فکر و تحقیق ایوارڈ' کی شاہکار سے موقع پر جناب بے پائی صدر، ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، رجسٹرار، پروفیسر مسرور پیشہ وران فروغ برائے [illegible] تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے وائس چانسلر یونیورسٹی پروفیسر محمد میاں کی جانب سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو پیام وشناسائی ہوئے یہ اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی [illegible] اردو میں ناقابل فراموش خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں دو سال کے لیے اردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے آپ جیسے بے لوث محب اُردو کی اُردو دُنیا میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کی جانے والی ناقابل فراموش خدمات کے پیش نظر دو سال کی میعاد کے لیے آپ کو اُردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ

پروفیسر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو یونیورسٹی سے مرتبہ پیشہ ورانہ فرائض کے لئے اس تقرر
اردو ذریعہ تعلیم سے ڈپٹی ڈائریکٹر نے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں سے ادکامات اجرا کی
ہدایت کے مطابق جب یہ اعلان کیا تو تقریب میں موجود بے شمار پرستاران تقی عابدی نے
تالیوں کی گونج میں اس کا خیر مقدم کیا۔ تقریب کی صدارت پر موجود ڈاکٹر سید ضیاء الدین احمد
شکیب اور مہمان خصوصی نامور مزاح نگار، کالم نویس پدم شری پروفیسر مجتبیٰ حسین اور
پروفیسر سید جعفر سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن یونیورسٹی نے بھی جو اس
تقریب کی مہمان خصوصی تھیں، پروفیسر محمد میاں کے اس اقدام کی ستائش کرتے ہوئے
اسے ایک خوش آئند قرار دیا اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی
راشد کے مطابق ڈاکٹر سید تقی عابدی سے آئندہ ماہ حیدرآباد کے موقع پر یونیورسٹی کے
وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں ڈاکٹر سید تقی عابدی کو ادکامات تقرری پیش کریں گے۔

نئی دہلی

دسمبر 2011ء

منیزہ ہاشمی اور ڈاکٹر تقی عابدی کا جے این یو میں استقبالیہ

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں معروف و مشہور شاعر اور ترقی پسند تحریک کے رہنما رواں فیض احمد فیض کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی اور معروف نقاد ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کی ہندوستان آمد پر انھیں یونیورسٹی کے زبانوں کے مرکز میں بعنوان ''فیض اور ان کی وراثت'' ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اپنی خیر مقدمی تقریر میں فارسی زبان کے استاد ڈاکٹر اخلاق آہن نے کہا کہ ''فیض نے فکر کی مختلف جہات کو متاثر کیا اور عہد جدید کے بڑے شعراء و ہاں عظمت کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی تخلیقی جڑیں ہماری تہذیبی روایات میں پیوست ہیں۔

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنی تقریر کے دوران فیض کی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے وابستگی اور موجودہ جے این یو میں فیض کی بازشت کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اسی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر علی جاوید نے یونیورسٹی میں فیض احمد فیض کی آمد پر ہوئے ایک تاریخی مشاعرے کا ذکر کیا جس میں جگہ نہ ملنے کے باعث عالمی شہرت یافتہ مصور مرحوم مقبول فدا حسین نے کئی گھنٹے کھڑے ہو کر اس مشاعرے کو سنا تھا۔ معروف نقاد ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کے حوالے سے نوجوانوں سے اپیل کی کہ فیض کو ہمیں اکیسویں صدی میں ان کے تمام عملی اور جدوجہد سے بھرپور کارناموں کے ساتھ لے جانا ہے۔ البتہ انھوں نے فیض پر اردو ادب میں تنقید کے نئے پہلوؤں کی جانب فقدان کا بھی اشارہ کیا۔

مہمان خصوصی محترمہ منیزہ ہاشمی نے فیض احمد فیض سے وابستہ اپنے بچپن کے بہت سے واقعات کا ذکر کیا۔ بتایا کہ ''فیض نے ہمیں کبھی بھی زندگی کے کسی بھی نشیب و فراز پر ہمت نہ ہارنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے پاکستان میں فیض گھر کے قیام سے متعلق جانکاری بھی سامعین کو فراہم کی اور اسے دیکھنے کی دعوت بھی دی۔''

صدر جامعہ پروفیسر شاہد حسین نے کہا کہ فیض احمد فیض کی یاد میں منعقد جوابہ
علی نہرو یونیورسٹی کے دروازے پر فلمیں بنتی ہیں اور جس قدر اس یونیورسٹی میں نہیں پڑھا اور
کیا جاتا ہے اتنا کسی اور یونیورسٹی میں نہیں۔ فیض کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ بعد
میں انھوں نے تمام خاندان اور بچوں کا تعارف بھی کرایا۔

جے این یو کی طالبات کے فیض ڈانس گروپ نے انجام دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر گوہر
پروفیسر [illegible] پروفیسر [illegible] پروفیسر [illegible] پروفیسر [illegible]
خوشحال علی، ڈاکٹر عبید فاروقی، محمد ارشد، تمنا، شیلیش کمار، عامر یزدانی، محمد حسن،
محمد شاہد، شبیر احمد، ڈاکٹر مرتضیٰ علی، ڈاکٹر محمد ہادی، رہبر اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مختلف
شعبوں سے کثیر تعداد میں طلبا نے شرکت کی۔

خصال مہدی

فیضؔ کے اشعار سے ان کے طرف دار اور مخالف دونوں محظوظ اور مستفید ہوتے تھے: ڈاکٹر تقی عابدی

فیضؔ نے فکر کی مختلف جہت کو متاثر کیا اور عہد جدید سے بڑے شعرا میں ان کی عظمت کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی تخلیقی جڑیں ہماری تہذیبی روایات میں پیوست ہیں۔ یہ بات جواہر لعل یونیورسٹی میں فارسی زبان کے استاد ڈاکٹر اخلاق آہن نے فیض احمد فیضؔ کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی کی ہندوستان آمد پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں زبانوں کے مرکز میں ''فیضؔ اور ان کی وراثت'' کے عنوان سے منعقدہ استقبالیہ تقریب میں خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہی۔ دہلی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر علی جاوید نے یونیورسٹی میں فیضؔ احمد فیضؔ کی آمد پر ہوئے ایک تاریخی مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اس مشاعرہ میں اتنا مجمع تھا جس میں جگہ نہ ملنے کے باعث معروف مصور مرحوم مقبول فدا حسین نے کئی گھنٹے کھڑے ہو کر اس مشاعرے کو سنا تھا۔'' کینیڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا۔ ''فیضؔ کے اشعار سے ان کے طرف دار اور ان کے مخالف دونوں محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ فیضؔ شعر کو کوزے میں مضمون کے سمندر کو نہ صرف سمو دیتے ہیں بلکہ اس میں تاثر بھی پیدا کر دیتے ہیں۔'' فیضؔ کے حوالے سے نوجوانوں سے اپیل کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ کو ہمیں انیسویں صدی میں ان کے تمام عملی و جدوجہد سے بھرپور کارناموں کے ساتھ لے جانا ہے، البتہ انھوں نے فیضؔ پر اردو ادب میں تنقید کے پہلوؤں کی جانب فقدان کا بھی اشارہ کیا۔

مہمان خصوصی منیزہ ہاشمی نے اپنے والد فیض احمد فیضؔ سے وابستہ اپنے بچپن کے

بہت سے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "فیض نے ہمیں زندگی سے ہر محاذ پر ہمت نہ ہارنے کا حوصلہ دیا۔" انھوں نے پاکستان میں فیض گھر کے قیام کے متعلق سے سامعین کو معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ "آپ سب لوگ فیض گھر کو دیکھنے کے لیے پاکستان آئیں۔"

صدر جلسہ پروفیسر شاہد حسین نے کہا کہ "فیض احمد فیض وہ واحد اعلیٰ نمبر یونیورسٹی سے بنا ڈگری حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان کی یاد میں یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ میں جس قدر کام یونیورسٹی میں انھیں پڑھایا اور کیا جاتا ہے، اتنا کسی اور کو نہیں۔ اس کے علاوہ شعبہ اردو یونیورسٹی میں ستارہ امتیاز حاصل کرنے والے ادیبوں کے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر تحسین فراقی نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر [illegible] پروفیسر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر [illegible]

خصال مہدی
نئی دہلی
23/دسمبر 2011ء

فیض اگر ایران میں ہوتے تو ان پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں

غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''مزاحمتی ادب کی جمالیات اور فیض'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں مقررین کا اظہار خیال

میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں۔ یہ بات غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''مزاحمتی ادب کی جمالیات اور فیض'' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ بین الاقوامی غالب سیمینار میں کینیڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے کہی۔ انھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''فیض فہمی'' کے تعلق سے کہا کہ ''کتاب تیار ہونے تک فیض کے 700 سے زیادہ مقالے آ گئے ہیں اور اس طرح فیض کے اوپر 80 سال میں 700 مقالے لکھے گئے۔'' انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''چار سو بیس لوگوں کی زبان والے فیض پر سات یا سات سو کتابیں لکھی گئیں۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''فیض جیسا شاعر اگر ایران میں ہوتا تو آج ان پر تین ہزار سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں۔'' مزاحمتی ادب کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ ''مزاحمتی شاعری کی بات کی جائے تو مزاحمتی اشعار سب سے زیادہ فیض کے مرثیوں میں نظر آئیں گے، مرثیہ صرف امام باڑوں کی جاگیر نہیں ہے۔ ہندو مرثیہ سے قدیم اور موضوعاتی وابستگی سامنے آتی ہے، مرثیہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا نام ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیض کی سب سے بڑا شاعر ہونے کی یہی وجہ ہے کہ فیض کی زبان سے عوام نے احتجاج کا طریقہ سیکھا۔ فیض جیسے عظیم شاعر نے ہمیں لہجہ دیا۔ فیض کی خصوصیت ہے کہ

انھوں نے کبھی غصہ ظاہر نہیں کیا انھوں نے ہمیشہ جلال کو جمال کی صورت میں پیش کیا۔
لوگ فیض کی زبان دانی میں رہ گئے جب کہ فیض نے بڑی عمدگی کے ساتھ پوری شاعری کو
پیش کیا ہے۔ اس سے قبل سیمینار کا پہلا جلسہ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر
خلیق انجم کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ہندی کے
معروف نقاد اور ''صدا'' میرٹھ کے مدیر ڈاکٹر اقبال مرزا نے شرکت کی۔ اس جلسے
میں ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر عتیق الرحمان اور پروفیسر معین الدین جینا
بڑے نے مقالے پڑھے۔ اس جلسے میں زماں آزردہ کا مقالہ اس اعتبار سے اہمیت کا
حامل رہا۔ انھوں نے فیض کی شاعری سے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جس پر عام طور
سے بہت کم نظر پڑتی ہے۔ پروفیسر آزردہ نے اپنے مقالے میں ان اسلامی تعلیمات کا
ذکر کیا جن تعلیمات کا فیض اور اقبال کی شاعری میں بخوبی نظر آتا ہے۔

پروفیسر عتیق الرحمان نے فیض اور اقبال کی شاعری کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے
اس بات پر زور دیا کہ دونوں کی شاعری میں کافی مماثلت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی
صدارتی تقریر میں کہا کہ فیض کی قومی شاعری کے ساتھ ساتھ جوش کی مزاحمتی
شاعری کو بھی یاد کیا جائے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ دوسرے
اجلاس کی صدارت فیض کی ساتھی منیزہ ہاشمی نے کی، اور نظامت اشفاق
حسین نے کی۔ اس جلسے کی حیثیت سے ڈاکٹر عابدی بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس
میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ اپنی صدارتی تقریر میں فیض کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی نے
اپنے والد کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا ذکر کیا جو فیض کی زندگی کے آخری برسوں میں
ان کی شخصیت کا حصہ بن گئے تھے۔ فیض کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والوں
کو اس بات کا علم ہے کہ فیض کی شخصیت کا ارتقا ہوتے ہوتے کہاں تک پہنچا تھا۔ انھوں نے
بھی اپنے والد کی شخصیت کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جن کی طرف بہت کم
لوگوں کی توجہ گئی تھی۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ظفر
پروفیسر ساجد پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر ندیم سید اور ڈاکٹر
حسین کے مقالے تھے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق کی صدارت میں

شروع ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے کی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے اپنے مقالے میں کہا کہ "فیض کی زندگی پاکستان اور ہیروت کے اسلامی معاشرہ میں زیادہ بڑی اسی لیے اثرات ان کی شاعری پر بھی نظر آتے ہیں۔" اس کے علاوہ ڈاکٹر شمیم کی اہل ڈاکٹر، ڈاکٹر ثروت خان، ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شمیم کی اہل ڈاکٹر نے کی اور نظامت ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے کی۔ اس میں پروفیسر راجندر مدار اور پروفیسر مرلی منوہر نے ہندی ادب میں فیض کی مقبولیت کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "فیض جتنا اردو والوں کے لیے مقبول ہیں اتنا ہی ہندی والوں کے لیے ہیں۔" اجلاس کے اختتام کے بعد ایوان غالب کے آڈیٹوریم میں عالمی مشاعرہ کا باقاعدگی کے ساتھ آغاز ہوا۔ جس میں ملک و بیرون ملک کے شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔

پروگرام میں ڈاکٹر مول بخش، لیق رضوی، جاوید رحمانی، سلیم امروہوی، مشتاق انور عالم، خواجہ حسن ثانی نظامی، عابد سہیل، وقار مہدی، امیر احمد فی مرشکار پوری، ڈاکٹر مظفر حنفی، محمد ہادی رہبر اور تسلیم اختر کے علاوہ اردو کے متعدد شاعر موجود تھے۔

نئی دہلی 2011ء

فیضؔ نے ہندو پاک کے درمیان پل کا کام کیا

محمد نقی شاداب (الہ آباد)

2012ء

فیضؔ نے اپنی شاعری کی زمین کو گنگا کی زمین سے زرخیز کیا ہے: ڈاکٹر تقی عابدی

پروفیسر اعجاز حسین ایوارڈ برائے 2012ء سے نوازے گئے ڈاکٹر عابدی

ادب و تحقیق پر مشتمل 37 کتابوں کے مصنف مجاہد ادب ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے "پروفیسر اعجاز حسین" کی اعزازی تقریب میں تقریباً 60 منٹ فیض احمد فیض کی شاعری اور شخصیت پر یادگاری خطبہ کے طور پر روشنی ڈالی۔ ہوٹل وائس رائس میں رائین ادبی انجمن کاروان کی جانب سے منعقد پروگرام کی صدارت خواجہ معین الدین چشتی لسانیونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے کی۔ خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنے بیش خطاب میں کہا کہ "فیضؔ 21 ویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے، ان کا لہجہ سب سے منفرد تھا، انھوں نے اپنی شاعری میں جس لہجے کا استعمال کیا ہے اسے آپ جدید سب سے لہجے کا نام دے سکتے ہیں۔" اور انھوں نے کہا "میں نے صرف فیضؔ پر تین کتابیں لکھیں ہیں۔ "فیضؔ شناسی"، "فیضؔ فہمی" اور "باقیات فیضؔ" جس میں 1700 مضمون لکھے گئے ہیں۔ فیضؔ نے نظموں کے علاوہ 63 سال میں صرف 70 غزلیں کہیں جس کا ایک ایک شعر بیش قیمت ہے اور ہزاروں معنی سے پر ہے۔ فیضؔ نے جہاں عشقیہ شاعری کی ہے وہیں انقلاب کی طرف بھی سفر کیا ہے۔ فیضؔ کی رومانی شاعری ہو انقلابی بے مثال ہے۔"

مسز تقی عابدی نے کہا "فیضؔ کا لہجہ صبح آزادی میں، لکھے جو انھوں نے 1949ء میں لکھی۔ فیضؔ کی شاعری کے اثرات دیرینہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فیضؔ علامت میں

بات کرتے تھے، فیض اشاروں میں بات کرتے تھے اور کنایوں میں بات کرتے تھے۔ ان کا لہجہ نثر میں بھی بہت ہی نرم ہوتا تھا اور انتہائی معنی خیز بھی۔" ممتاز مفتی نے کہا "جیسے غالب نے قطرے سارے شعر پیئے تھے، ویسے ہی فیض نے قطرے سے لے کر مدے تک سارے شعر پیئے ہیں۔ فیض نے کہا ہے اپنی شاعری کی زمین وزر لیا ہے۔ انھوں نے مرثیہ بھی کہا ہے [illegible] کے مرثیہ یعنی [illegible] شعر وہ بھی اپنے آپ میں بے مثال ہیں۔"

انھوں نے اس موقعہ پر ترقی پسند سے ہوئے سے بھی گفتگو کی کہ "ترقی ختم ہو چکی ہے۔ یعنی تحریک ابھی باقی ہے۔ ایران سے انقلاب" بھی اپنی گفتگو کا محور بنایا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر ممتاز عابدی و پروفیسر [illegible] حسین ایوارڈ 2011ء سے بھی نوازا گیا۔ صدارتی کلمات میں ڈاکٹر انیس نے کہا کہ "ہندوستان سے [illegible] پر بات ہونی چاہیے جنھوں نے ہندوستانی زبان میں کام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ [illegible] تک پہنچنے میں فیض کا ہاتھ تھا۔ [illegible] فیض [illegible] ان کا [illegible] بہت بڑا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ [illegible] جانی [illegible] ہمارا فرض ہے۔ [illegible] کے حوالے سے انھوں نے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] جوڑیں۔"

پروفیسر محمد حسن [illegible] نے [illegible] فیض کے بارے میں [illegible] کہیں۔ پروفیسر [illegible] نے پروفیسر اعجاز حسین کی [illegible] کی [illegible] کی تخلیق کردہ تصنیف "فیض شناسی" [illegible] کی [illegible] کی [illegible] نے [illegible] پروفیسر اعجاز حسین کا [illegible] کی [illegible] کی [illegible] کی

حیدرآباد
31/اکتوبر 2012ء

مرثیہ کی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی اور انسانی معیارات کا عظیم ذخیرہ

جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو میں ڈاکٹر تقی عابدی کا خطاب

اُردو شعر و ادب کی دُنیا میں مرثیہ ایک ایسی صنف شاعری ہے، جس میں اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاقی معیارات کا اتنی فیصد ذخیرہ موجود ہے۔ اُردو مرثیہ کا مطالعہ تن سے انسانی مسائل کے تناظر میں کیا جائے تو ساری انسانیت کی بقاء ممکن ہے کیوں کہ دورِ حاضر کا انسان مادی طور پر جس بلندی پر پہنچ چکا ہے اتنا ہی اخلاقی طور پر پستی کا شکار ہے، جس کا تدارک اعلیٰ ادبیات کی توضیح و تشریح کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان خیالات کا اظہار سینئر اسکالر مہمان اور طبیب مستند ڈاکٹر تقی عابدی شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے منعقدہ توسیعی خطبہ کے دوران کر رہے تھے۔ جب کہ پروفیسر ایس سدرشن راؤ پرنسپل آرٹس کالج نے صدارت کی اور آرٹس کالج کا مومنٹو پیش کر کے مہمان کا استقبال کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی طب، اور ساتذہ سے ''میر انیس کے کلام میں انسانی اقدار'' کے عنوان سے مخاطب تھے۔ انھوں نے عصری تناظر میں کلام انیس کے مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ''ادب کی ایسی خدمت کا کام صرف جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہی انجام دے سکتے ہیں۔'' انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں اپنی تعلیم اور ادب سے لگاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے طلباء پر واضح کیا کہ ''وہ خوش نصیب ہیں کہ انھیں جامعہ عثمانیہ میں درس حاصل کرنے کا موقع دستیاب ہوا۔'' اس توسیعی خطبہ کا آغاز پروفیسر مجید بیدار کے افتتاحی کلمات سے ہوا، جس میں انھوں نے میر، غالب، اقبال اور نجم آفندی کی جدید تناظر میں بازیافت کی ستائش

روزنامہ ''صحافت'' ''راشٹریہ سہارا''
نئی دہلی
17 دسمبر 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کو یونائیٹڈ اکنامک فورم کی جانب سے استقبالیہ

کینیڈا میں مقیم معروف ادیب، شاعر اور مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی کی دہلی آمد پر یونائیٹڈ اکنامک فورم کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر فورم کے سرپرست ڈاکٹر ایس فاروق نے ڈاکٹر عابدی کو شال پہنا کر ان کا استقبال کیا۔ ساتھ ہی اس بات پر اظہار تشکر کیا کہ ڈاکٹر عابدی نے فورم کی تقریب میں شرکت کرکے اپنی علمی و ادبی گفتگو سے حاضرین کے علم میں اضافہ کیا۔ پروگرام میں فورم کے صدر اور ایمس کے سابق ڈین پروفیسر ایم فاروق، نائب صدر آصف اعظمی، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی کے علاوہ آندھرا بینک کے چیف منیجر جاوید اقبال، راشد حامدی، نعمان انور، فیصل امین الاسلام، مدثر عالم، غضنفر الٰہی، محمد مسرور عالم وغیرہ بطور خاص موجود تھے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے شاہد ماہلی نے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی اپنے علم و دانش کی وجہ سے صرف کینیڈا کے نورتنوں شہر تک محدود نہیں ہیں بلکہ جہاں جہاں بھی اردو کے چاہنے والے ہیں وہاں ان کے نام لیوا موجود ہیں وہ اردو کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ تازہ تصنیف ''فیض فہمی'' ڈاکٹر عابدی کی علمی و ادبی صلاحیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔''

پروفیسر ایم فاروق نے تقی عابدی کی تشریف آوری کو نیک فال بتاتے ہوئے کہا کہ ''یہ ہمارے لیے خوش قسمتی کی بات ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیں ان سے سیکھنے کا موقع ملے گا۔'' تقی عابدی نے اعزاز کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ

"پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے قطب شاہ پر ایک تاریخ تحریر کی تھی۔ اب جب کہ ان کی عمر ۹۱ سال ہے تو وہ رچکی ہے۔ ۱۱ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں حال ہی میں شائع "فیض فہمی" بھی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ "فی الحال وہ شاعر مشرق علامہ اقبال پر جو ڈرامے پر کام کر رہے ہیں امکان ہے کہ وہ ایک سال میں لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔"

روزنامہ ''انقلاب'' نئی دہلی

19 دسمبر 2012ء

جے این یو میں فیض میموریل لکچر کا انعقاد

ڈاکٹر تقی عابدی نے ''غالب کی فارسی شاعری'' پر خصوصی لکچر دیا

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویجز لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز میں سینٹر آف انڈین لینگویجز کے زیر اہتمام تیسرے فیض میموریل لکچر بعنوان ''غالب کی فارسی شاعری'' کا انعقاد کیا گیا۔ خصوصی لکچر کے لیے ہندنژاد ڈاکٹر تقی عابدی مقیم حال ینیڈا مدعو تھے۔ پروگرام کے کنوینر پروفیسر معین الدین جینابڑے نے صدر جلسہ پروفیسر اعلم صدیقی کا تعارف کرایا اور پروفیسر مظہر مہدی نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''غالب ایک نابغہ روزگار شاعر تھے۔ انھیں بلا تکلف دنیا کے عظیم شعراء کی جماعت میں رکھا جا سکتا ہے۔ غالب کی اردو شاعری کی طرح ان کی فارسی شاعری بھی عظیم ہے۔ غالب کی فارسی شاعری فقط فکری نہیں، جذبے کی بھی شاعری ہے۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی جذبات و احساسات کے تقریباً وہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں جن مضامین سے ان کی اردو شاعری مملو ہے۔ غالب کی شاعری میں مضمون و لفظ کی حسین آمیزش ہے۔ ان کی شاعری کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں قدیم و مستعمل موضوعات بھی جدت ادا اور طرفگی خیال کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے وقت ان کی غزل کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تنقید کا زیادہ تر محور ان کی غزل گوئی پر رہا ہے۔ ضرورت ان کے عقائد پر نظر مرکوز کرنے کی ہے۔'' انھوں نے اپنے خطبے میں غالب کی غزلیات کے علاوہ ان کی مثنویوں اور نعت و حمد کا بھی جائزہ لیا۔ ان کی

تحقیق کے مطابق غالب کی مثنویوں کی تعداد بارہ نہیں بلکہ پندرہ ہے۔ شعر فہمی آسان ہے۔ شعر فہمی مشکل ہے۔" پروفیسر اسلم اصدقی نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ غالب کے کلام کا مکمل طور پر جائزہ لیا جانا چاہیے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ غالب کے جائزے سے ایسے بہت سے پہلو سامنے آ جاتے ہیں جو تحقیق طلب ہیں۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے صدر، جائزہ نگار مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر انور پاشا، ڈاکٹر آصف زہری، ڈاکٹر شیخ ایوب، ڈاکٹر [illegible]، ڈاکٹر ہارون رشید، ڈاکٹر منور صدیقی، شفیق انجم اور متعدد طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔

نئی دہلی
19 دسمبر 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کا توسیعی لکچر
''غالبؔ کے فارسی نثری کلام کی طلسم آرائی''

جس طرح غالبؔ کی نظم اپنا جواب آپ ہے، اسی طرح غالبؔ کی نثر بھی لاجواب ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی کے زیر اہتمام کیلور ہال، ڈیارمیٹری میں ''غالبؔ کی فارسی شاعری میں طلسماتی کیفیت'' کے عنوان سے ڈاکٹر تقی عابدی کا اظہار خیال

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی کے زیر اہتمام کیلور ہال، ڈیارمیٹری میں ایک توسیعی خطبہ ''غالبؔ کی فارسی شاعری میں طلسماتی کیفیت'' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ خطبہ کے مقرر خاص ممتاز ادیب و محقق ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے کہا کہ ''جس طرح غالبؔ کی نظم اپنا جواب آپ ہے اسی طرح غالبؔ کی نثر بھی لاجواب ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ کے فارسی اشعار اور اردو خطوط پر کافی کام ہوا ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ غالبؔ کے فارسی خطوط پر ابھی تک کام نہیں ہو سکا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ نے اپنا پہلا فارسی خط انگریز حکمران کو لکھا تھا۔ اس کے بعد 1849ء میں اردو خطوط نگاری کی۔ ہمارے فارسی اسکالرس کو چاہیے کہ غالبؔ کو اچھی طرح پڑھیں اور اس پر تحقیق کریں۔''

پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ''آج کے موضوع کے لیے ڈاکٹر عابدی کا انتخاب شعبۂ فارسی کا حسن نظر تھا میں اس حسن انتخاب کے لیے شعبہ فارسی کو مبارک باد دیتا ہوں۔'' موصوف نے غالبؔ کے فارسی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ جس کا ذکر غالبؔ نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔'' آخر میں صدر شعبہ پروفیسر عراق رضا زیدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم توسیعی خطبات کے لیے عام طور سے ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں

جو ہمارے درس کا حصہ ہوتے ہیں تاکہ اس طرح سے نصاب سے ہمارے عزیز طلبا استفادہ
کر سکیں۔ یہ بھی کہ غالب ہمارے درس کا حصہ ہے۔ لہٰذا اس کا مضمون ہمارے لیے بہت
اہم ہے۔ اس لیے ہم نے اس مضمون سے پی ایچ ڈی کا انتخاب کیا۔ پروگرام کا
آغاز پروفیسر جعفری کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جب کہ نظامت کے فرائض شعبہ فارسی
میں سنیارٹی پروفیسر ڈاکٹر سید کلیم الصفا نے انجام دیے۔ شرکا میں ڈاکٹر احمد حاجی، ڈاکٹر
تجمل وکیل، ڈاکٹر عشرت جہاں، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر عالیہ، ڈاکٹر نورالہدیٰ، ڈاکٹر راشد
قریشی، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے سابق صدر پروفیسر خالد محمود، پروفیسر قمر رئیس،
پروفیسر محمد قاسم، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر سلیم یوسف، ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر شمع
افروز زیدی، ڈاکٹر ریحانہ حنیف صدیقی، ڈاکٹر محمد عباس، ڈاکٹر محمد ارشد اریب، ڈاکٹر
نجیبہ فاروق، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر شائستہ یوسف، ڈاکٹر نوشاد احمد، ڈاکٹر محسن علی، ڈاکٹر
حسین الرحمان، عبدالحق صدیقی، ڈاکٹر ریاض عثمانی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر شعبہ
جات سے اساتذہ و طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

خصال مہدی
روزنامہ "انقلاب" نئی دہلی
22 دسمبر 2012ء

مرزا غالبؔ اُردو شاعری کا سرسبز پھول: ڈاکٹر تقی عابدی

غالبؔ ہماری شاعری کا سرسبز پھول ہے۔ غالبؔ برصغیر کا سب سے پہلا ترقی پسند شاعر ہے۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالبؔ میں "ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید" کے موضوع پر منعقدہ غالبؔ سیمینار کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ اس موقع پر خواجہ حسن ثانی نظامی، مولانا خالد رشید فرنگی محلی، جسٹس بدر دریز احمد، ڈاکٹر پرویز احمد اعجاز، عابد سہیل نے بھی بطور خاص شرکت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سیمینار کے متعلق سے کہا کہ "مجھے اُمید ہے کہ اگلے دو روز میں یہاں ادب کا ایسا دریا بہے گا جس سے ہر خاص و عام سیراب ہوگا۔" اس سے قبل افتتاحی تقریر میں انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ "غالبؔ سیمینار ہر سال نئے نئے عنوانات اور مختلف موضوعات پر منعقد کیا جاتا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "غالبؔ کے نام سے منعقد ہونے والے سیمینار میں اتنی وسعت ہے کہ ہم جن موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں وہ غالبؔ کے خواب و خیال سے ملتے ہیں۔" پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ افسر ڈاکٹر رضا حیدر نے انسٹی ٹیوٹ میں جاری سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "یہ سیمینار ہر سال غالبؔ کے نام سے ہوتا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہونے والے پروگراموں میں ملک و بیرون ملک سے متعدد ادبا اور شعرا شرکت کر چکے ہیں۔" اس کے علاوہ عابد سہیل، پاکستان سے ڈاکٹر عطاء الحق قاسمی نے بھی اظہار خیال کیا۔

تقریری سلسلہ کے بعد غالبؔ انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ جس میں دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر عتیق اللہ کو برائے اردو تحقیق و تنقید "فخر الدین علی احمد

غالب نمبر 2011ء" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کی پروفیسر آزرمی دخت صفوی کو برائے فارسی تحقیق و تنقید "فخر الدین علی احمد غالب ایوارڈ 2011ء" معروف شاعر رشن نظر کو برائے اردو شاعری "غالب ایوارڈ 2011ء" پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر پدم شری پروفیسر کلیم عاجز کو برائے مجموعی ادبی خدمات "غالب ایوارڈ 2011ء" اور ممتاز پروفیسر نور الحسن کو برائے اردو ڈرامہ "تمغہ غالب ایوارڈ 2011ء" اور چونکہ یہ اعلامیہ شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد زماں کی وجہ سے جاری نہیں ہو سکے تو ان کا برائے اردو تنقید "غالب ایوارڈ 2011ء" اور چونکہ یہ اعلامیہ شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد زماں کی وجہ سے جاری نہیں ہو سکے تو ان کا برائے اردو تنقید "غالب ایوارڈ 2011ء" اور چونکہ یہ اعلامیہ شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد زماں کی وجہ سے جاری نہیں ہو سکے تو ان کا

زبیر قریشی
روزنامہ ''صحافت'' نئی دہلی
23/دسمبر 2012ء

ایک ہمہ جہت شخصیت تھے فیضؔ: ڈاکٹر تقی عابدی

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام تین اقوامی غالب سیمینار میں ''ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید'' کے موضوع پر ہندوستان بھر سے آئے ہوئے مقالہ نگاروں نے عنوان کی مناسبت سے اپنے مقالے پیش کیے۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر خالد اشرف نے اپنے مقالے جس کا عنوان تھا ''ڈاکٹر قمر رئیس فکشن کی تنقید'' کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر یعقوب یاور، ڈاکٹر اصغر ندیم سید وغیرہ نے اپنے مقالوں کے ذریعے ادب، کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید اور دیگر موضوعات پر معلوماتی مقالے پیش کر کے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ پاکستان کی نامور ادیبہ کشور ناہید نے اپنے صدارتی کلمات میں مقالوں کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ سید مہدی نے اپنے مقالے ''ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید'' پیش کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے انجام دی۔ ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر تقی عابدی وغیرہ نے اپنے مقالوں کے ذریعے ترقی پسند تنقید نگاری اور نظریۂ فیضؔ کے علاوہ ترقی پسند نظریات کا تشکیلی دور اور عہد، الحق قاسمی نے ''کلاسیکی شاعری اور ترقی پسند'' جیسے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں اور چند لوگ فیضؔ کو تنقید نگار قبول نہیں کرتے۔'' انھوں نے فیضؔ کے نثری اور شعری کلام پر بھی اظہار خیال کیا۔ اسی اجلاس کے تیسرے دن میں بحیثیت صدر پروفیسر اسلم پرویز اور مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی موجود تھے۔

ڈاکٹر ارجمند آرا کے مقالہ کا عنوان تھا ''ترقی پسند تنقید کی فکری بنیادیں'' انھوں نے

اپنے مقالے میں بیسویں اور چوبیسویں ابواب میں ترقی پسند تحریک کا بیان پیش کیا جس میں جدوجہد آزادی، غربت اور ناخواندگی کے لیے جدوجہد شامل تھی۔ ڈاکٹر تنویر عباسی فریدی، قاضی عبدالرحمٰن اعظمی کے علاوہ پروفیسر بن تول، پروفیسر شہاب الدین، پروفیسر فیجو پنڈت، شمیم کی ال ڈاکٹر، پروفیسر زمان آزردہ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ جس کی صدارت شاہد صدیقی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر اطہر پرویز، عابد سہیل وغیرہ نے نبھائی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر شفیق عارفی، ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر ارشد عزیز نے انجام دی۔

سیمینار کے بعد عالمی مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر اقبال مرزا، ڈاکٹر سید تقی عابدی، اقبال حیدر، تمیم کی ال ڈاکٹر، شکیل اعظمی، شاہد عابدی کے علاوہ دیگر شعرا اور شاعرات نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ پروگرام میں دہلی اور بیرون دہلی سے آئے ہوئے مہمانوں کے اعزاز میں ایک ظہرانہ، سید شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر ادریس، شفیع جاوید، اسعد بدایونی، اقبال حیدر، قاضی عبدالرحمٰن وغیرہ موجود تھے۔ شاہد عابدی اور ڈاکٹر جناب اعظمی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد
28 دسمبر 2012ء

میر انیسؔ کا کلام امام باڑوں میں دفن کردیا گیا

''دیوان رباعیات انیسؔ'' کی رسم اجراء تقریب

پروفیسر محمد میاں اور تقی عابدی کا خطاب

اُردو ادب کے زوال کی اہم وجہ یہ ہے کہ مرثیوں کو امام باڑوں میں دفن کردیا گیا۔ مرثیہ حسن یوسف ہے۔ مرثیہ میں وہ اوصاف ہیں کہ وہ تہذیبی سطح پر پڑھائی جاسکتی ہے۔ صنف مرثیہ کے ذریعے اُردو ادب کی بہترین خدمات کی جاسکتی ہیں جس صنف میں سب سے زیادہ اشعار کہے گئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی ممتاز محقق و دانشور نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے ''کلام انیسؔ میں ادبی اور اخلاقی اقدار'' کے زیر عنوان اپنے خطاب میں کیا۔ مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیقی کتاب ''دیوان رباعیات انیسؔ'' کی رسم اجراء تقریب 26 دسمبر کو ہوٹل اشوک کاکٹی اینکل روبرو سکریٹریٹ کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''میر انیسؔ کے 213 مرثیے کی تحقیق میں نے کی۔ میر انیسؔ نے تقریباً 82 ہزار اشعار کہے ان کے کلام میں 8 تا 12 فیصد بین کا حصہ ہوتا ہے باقی ادب ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''میر انیسؔ نے بہت سی رباعیاں فی البدیہہ کہی ہیں۔'' ''دیوان رباعیات انیسؔ'' کی رسم اجراء بدست پروفیسر محمد میاں وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی عمل میں آئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''تقی عابدی کی کتاب کی رسم اجراء کرتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہورہی ہے میں نے تقی عابدی کی لائبریری کینیڈا میں دیکھی اور جتنی کتابیں میں نے وہاں ادب کے موضوع پر ان کی ذاتی لائبریری میں دیکھی وہ کسی دوسرے شخص کی ذاتی لائبریری میں نہیں ہیں۔ اردو

[illegible] یونیورسٹی کی [illegible] سے [illegible] تو ہماری [illegible] ایک [illegible] ایک خوش آئند اضافہ ہوگا۔" انھوں نے کہا کہ "میں نے انیس اور دبیر کو اسکول میں پڑھا تھا۔ میں آج بھی ان کی شاعری کو نہایت عمدہ شاعری تصور کرتا ہوں۔" انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ "تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی اور جب مکمل ہوتی ہے تو تحقیق ختم ہو جاتی ہے۔ تنقید سے تحقیق کی راہیں ہموار ہوتی ہیں لیکن تنقید تہذیب کے دائرے میں ہونی چاہیے اور تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے۔"

[illegible] نے [illegible] سے [illegible] کا تعارف پیش کیا۔ مجلس میں پروفیسر [illegible] اور پروفیسر [illegible] بھی شامل تھے۔ پروفیسر [illegible] نے [illegible] سے [illegible] چاہتا ہے [illegible] شاعروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ [illegible] نے [illegible] پر اور [illegible] پر بہت وقیع کام نہیں ہوا ہے۔ [illegible] شاعرات ہیں جن کے خاندان میں کئی پشتوں تک خاندان اور خاندان شاعر پیدا ہوتے رہے۔" انھوں نے کہا کہ "تقی عابدی نے ایسی خواتین کو دریافت کیا ہے۔"

پروفیسر [illegible] نے [illegible] تقی عابدی نے اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے [illegible] قومی [illegible] کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ "دیوان رباعیات نیسی" سے ایک ایک صفحہ پر دو رباعیاں اور دو [illegible] تقی عابدی کی دیدہ ریزی، محنت اور مشقت کی غمازی کرتی ہے۔

[illegible] تقی عابدی کی [illegible] جانب میدان برلاس کی [illegible] نے اپنی کتاب میں [illegible] کی رباعیوں کا [illegible] کیا ہے۔ [illegible] پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ "انیس کا تعلق دیوہ [illegible] سے تھا۔ [illegible] 1857ء کے بعد جب لکھنؤ [illegible] ہے تو [illegible] نے [illegible] دیوہ [illegible] کی [illegible] کتب خانوں میں [illegible] (اس وقت [illegible] تھے [illegible] کی [illegible] نے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] کے بعد دیوہ [illegible] نے [illegible] کے [illegible] پر [illegible] 1000ء [illegible] مشتمل تھا۔"

یہ [illegible] تقی [illegible] نے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کیا ہے [illegible]

اظہار کر کے محفل کو قہقہہ زار بنا ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ "میں اب تک تقی عابدی کی تقریر کے سحر میں گم ہوں جس طرح یہ کام کرتے ہیں میں دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں۔ بلاشبہ ادب کا جو سلسلہ تقی عابدی نے شروع کیا ہے وہ لائق تعریف ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے کام کے ذریعہ ادب کے کئی ذائقوں کی چھٹنی کر دی ہے۔ کام کرنے کا جو جذبہ وتوانائی ان کے اندر ہے وہ حیرت انگیز ہے۔"

نظامت کے فرائض کنوینر جلسہ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد بانی و صدر کلب نے انجام دیئے۔ کنوینر جلسہ ڈائریکٹر سی پی ڈی یو ایم پی، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی نے بخوبی انجام دیئے۔ کنوینر جلسہ کے شکریہ پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ قرعہ اندازی کے ذریعے جن افراد کے درمیان "دیوان رباعیات انیس" کی تقسیم عمل میں آئی۔

sherosokhan.net

حیدرآباد

29/دسمبر 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کو پروقار
ایوارڈ ''میر تقی میرؔ'' کے لیے نامزد کیا گیا

مرثیہ فیڈریشن آف سلام آف انڈین ریجن (AIMF) نے اپنی سولہویں افتتاحی نشست سے [illegible] یہ ایوارڈ ''میر تقی میر'' پیغمبر اسلام، حضرت محمد صلعم، اہل بیت اور [illegible] ڈاکٹر تقی عابدی کو دیا جائے گا۔ اس نشست کی صدارت نسوانی، حیدرآباد میں مرثیہ کے [illegible] کی۔ اس سے شرکا میں جناب [illegible] جناب شبیہ الحسن (سابقہ جسٹس ہائی کورٹ صدیقی، پیر میں [illegible] قیصر میشن ایوسی ایشن، [illegible] اور [illegible] سے سابقہ وزیر جناب شبیہ علی وغیرہ تھے۔

''میر تقی میر'' ایوارڈ [illegible] کے لیے دیا جاتا ہے جو اردو ادب کے لیے [illegible] ہو۔ یہ ایوارڈ [illegible] معروف دانشور، ادیب اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کا انتخاب [illegible] کی خدمات کے اعتراف میں کیا گیا ہے۔ آپ کی سابقہ کئی شعری تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ نثر کی صنف میں آپ نے افسانے، دانشور، ادیب اور [illegible] کے خاکے لکھے ہیں۔ آپ کتابوں کے مصنف ہیں۔

[illegible] جناب [illegible] جناب [illegible] اور [illegible] کی [illegible]

''حکیم الامت'' سری نگر
لکھنؤ

اُردو مراثی میں کتاب اخلاق کا ہر درس موجود ہے: ڈاکٹر تقی عابدی

ادارہ حکیم الامت کے تحت ''اُردو تہذیب اور مرثیہ'' موضوع پر کانفرنس

ادارہ ''حکیم الامت'' سری نگر کے تحت شیعہ کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ میں ''اردو تہذیب اور مرثیہ'' عنوان پر مرثیہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اُردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ممتاز شاعر انیس انصاری (آلی اے ایس) کی صدارت میں ہونے والی اس مرثیہ کانفرنس کے مہمان خصوصی آل انڈیا میر اکادمی کے صدر مظفر احمد ناری تھے۔

کینیڈا سے آئے مشہور محقق اور ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''تہذیب مرثیہ ہی خالص ترین اُردو تہذیب ہے۔ اردو مراثی میں کتاب اخلاق کا ہر درس موجود ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر منبر پر بیٹھ کر تہذیب سازی کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' انھوں نے مختلف اشعار سناتے ہوئے صبر، قناعت، شجاعت، بہادری اور انسانی جذبات کی عکاسی کے بہترین نمونے پیش کیے اور کہا کہ ''ہر کوئی صنف یہ بتاتی ہے کہ اسلام محبت، امن اور آشتی کا مذہب ہے تو اس میں مرثیہ سر فہرست ہے۔''

تقی عابدی نے کہا کہ ''اُردو کے ساتھ ناانصافی کے لیے حکومتیں اور اغیار نہیں بلکہ ہم خود ذمہ دار ہیں۔'' یونیسکو کے مطابق 4(((ملین افراد اردو زبان سمجھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے زبانوں کی فہرست میں اردو کو چھٹے مقام پر ہونا چاہیے لیکن افسوس ہے کہ 3(((ویں مقام پر ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہم نے اپنی زبان اُردو نہ لکھ کر کہیں پنجابی، کہیں سندھی تو

کہیں دوسری کوئی زبان لکھائی ہے۔"

[illegible] "اردو تہذیب سے اردو مرثیہ وجود میں آئی ہے۔ مرثیہ
پر [illegible] اور اسے [illegible] میں فن [illegible] ہے۔ اب کہ مرثیہ اردو کی
شاہکار ہیں۔"

اس سے قبل پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ "اردو مرثیہ صرف
ایک صنف نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس میں
موجود نہ ہو۔ یہ اردو کی [illegible] صنف سخن ہے۔ اردو تہذیب اور مرثیہ ایک
دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

[illegible] کے صدر انیس اشفاق نے کہا کہ "مرثیہ کے تہذیبی
عناصر ہی اردو تہذیب ہے۔ مکمل انسانی قدروں کے ساتھ مکمل انسانی تہذیب اور کی شاعری
سے یہاں ملتی ہے وہ مرثیہ انیس ہیں۔"

[illegible] "مجلہ [illegible]" کے [illegible] "خصوصی [illegible]" کے [illegible] یہ
[illegible] نے [illegible] کی [illegible] کے صدر انیس انصاری نے اس
موقع پر [illegible] کے [illegible] پر [illegible] خصوصی نظر [illegible] نے [illegible] یہ
[illegible] پر [illegible] کی [illegible] پر [illegible] کریں گے۔ اس
موقع پر [illegible] حسن [illegible] نے [illegible] بھی اپنے
[illegible] کے [illegible] "[illegible]" کے [illegible] نے [illegible]

ماہنامہ "حکیم الامت" سری نگر
اکتوبر تا دسمبر 2019ء

عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس دہلی دسمبر 2012ء

افتتاح نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری

صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ، کلیدی خطبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی

انجمن ترقی اُردو دہلی کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے ایک تین روزہ عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس غالب آڈیٹوریم 1 غالب نئی دہلی میں عظیم الشان طریقے پر 28، 29 اور 30 دسمبر 2012ء کو منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس 28 دسمبر شام 6 بجے برنگر ہوا۔ جس کا افتتاح عزت مآب جناب محمد حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے کہا کہ "مرثیہ ہماری نایاب میراث ہے۔ عدم تشدد جو آج ایک اہم فلسفہ اور صلح و امن کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے وہ حسین ابن علی کے کردار سے نمایاں ہے۔" شبلی نعمانی کے موازنہ انیس و دبیر کی حکایت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ "مرثیہ بغیر قلبی لگاؤ کے نہ لکھا جا سکتا ہے اور نہ سنا جا سکتا ہے۔ اُردو مرثیہ اُردو شاعری کی اہم صنف سخن ہی نہیں بلکہ اس کے پیغام سے یہ بھی درس حاصل ہوتا ہے کہ ارتقا ساتھ ہو تو عدم تشدد سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے۔ نائب صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ "رثائی ادب نے اُردو کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے اور اردو مرثیہ نے امام حسین کے امن کے پیغام کی تشہیر کی ہے۔"

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں عالمی مرثیہ کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتلایا کہ بڑی طویل مدت کے بعد یہ عمدہ مرثیہ کانفرنس غالب سنٹی

ٹوٹ کے قدموں سے برابر ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا "مرثیہ ایک عظیم الشان ملی و تہذیبی روایت ہے، مرثیہ اردو ادب کی قدروں کا خزانہ ہے جس سے ہمارے قومی کلچر کو فروغ ہوتا ہے۔" اپنے خطبے میں نامور محقق، نقاد اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیہ پر تفصیلی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عابدی نے اردو مرثیہ کی تاریخ اور اس کے مقام کا تعین کرتے ہوئے بتایا کہ "اردو شاعری کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی صنف سخن میں ہے۔ قدیم اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب "نوسرہار" بھی واقعہ کربلا کا منظوم کلام ہے۔ مرثیہ صرف عزاداروں تک محدود نہ ہونا چاہیے اس کو مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے نصاب میں رکھ کر اس کی ادبی و اخلاقی اقدار سے زبان و ادب کو مالا مال کیا جا سکتا ہے۔ مرثیہ حسن یوسف ہے جس کو بازار مصر کی نہیں عالم بازار جہاں میں پیش ہونا چاہیے۔ شاید اسی لیے مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا "اردو ادب کی جانب سے عالم کی غزلیں اور فرانس کے مرثیے دنیا کے ادب کو تحفہ میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔" اردو مرثیہ دراصل انشائیہ اور ڈرامے کا دلکش امتزاج ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے بتایا کہ "انیس اور دبیر کے مرثیے کا خاتمہ ضروری اور لازمی جزو ہے لیکن اس کے متعلق میں آزاد کی تحریف کو اور ڈاکٹر امداد حسین کے بیان کو صحیح نہیں سمجھتا۔ آج ہم کو مرثیہ کی ضرورت ہے اس لیے کہ اس کے خاتمہ میں اخلاقی درس کی قوت عمل کی ضرورت ہے جو ہمیں اپنی زندگی میں پیدا کرنی ہے۔ انیس و دبیر نے اخلاقی اقدار کو جو عام کیا اور اخلاقی فوقیت کی تلقین کی اس کی ضرورت آج سب سے بڑھ کر ہے جو ہم کو صنف مرثیہ کے ذریعہ اپنی نئی نسل میں پیدا کرنی ہے اور اس کو عملی رنگ دینے کی بھی کوشش کرنی ہے۔" ڈاکٹر عابدی نے مزید کہا کہ "مرثیہ کی خاص قدر و قیمت یہ ہے کہ مرثیہ سے روزمرہ کی اردو ادب سے منہ موڑنے کے معنی ہیں۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے سبکدوش پروفیسر سید شاہد مہدی نے کہا کہ "انیس اور مرزا دبیر نے مرثیوں کے ذریعے سے تہذیب و ثقافت کی اخلاقی اور آزادی کی قدروں کو جو پیش کیا ہے وہ اقوام عالم کی ہر زمانہ کی تہذیبوں و ثقافتوں کے کلچر میں قابل تقلید ہے۔ مرثیہ ادب کا تعلق ہمارے اخلاق کی تربیت اور تعلیم و تہذیب کی غذا بن کر رہ گیا ہے۔

مہمان ذی وقار سابق گورنر جھارکھنڈ جناب سید سبط رضی صاحب نے اردو مرثیہ کی وسعت اس کی گیرائی اور گہرائی پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ "اردو دنیا میں اقوامی مقام حاصل ہوا وہ صرف مرثیہ کی بدولت تھا۔" اردو مرثیہ سے عدم واقفیت اور اس سے ساتھ عدم توجہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ "برصغیر میں رثائی ادب ایک ایسے دریا کے مانند ہے جس کا روز بروز پانی کم ہوتا جا رہا ہے جو اردو ادب کی کشت اور آبیاری کے لیے تشویش کا باعث ہے۔"

افتتاحی اجلاس کے صدر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ "مرثیہ اردو شاعری کی اہم صنف سخن ہی نہیں بلکہ اردو مرثیہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا نقیب بھی ہے۔ اردو مرثیہ کی ترویج اور تشہیر دراصل اردو ادب کی ہی خدمت ہے۔ اردو مرثیہ میں ہندوستانی ماحول اور یہاں کے کلچر کے نقوش نے اسے ایک خالص ہندوستانی صنف بنا دیا۔ کربلا اب صرف مرثیوں کی روایات یا حکایات تک محدود نہ رہا بلکہ یہ اردو ادب اور شاعری میں ظلم اور جبر کے خلاف امن اور حریت کا استعارہ بن گیا۔

آخر میں شاہد دہلوی نے جو غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں اس پورے پروگرام کے نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی جنھوں نے مہمانوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ مرثیہ کانفرنس سے مربوط عمدہ اردو مرثیہ کے اشعار بھی سنا کر محفل میں چار چاند لگا دیے۔ اس اجلاس کے اختتام پر دلی کے مشہور استاد قمبر احمد خان نے اپنے مخصوص انداز میں سوز خوانی اور سلام خوانی کی، پھر چیئرمین وقف بورڈ بہار جناب محسن علی معصومی نے تحت اللفظ میں مرثیہ خوانی خاص دلکش اور پر تاثر انداز میں کی۔

جلسے میں بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ جلسے میں شامل افراد میں پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر آزرمی دخت، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عراق رضا زیدی، پنڈت ملکزادہ ہوشی، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر مہتاب نقوی، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، پروفیسر محمد رضا مولوی، پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عابد حسین

حیدری، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر نگینہ بیگم، ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر ظفر محمود، ڈاکٹر حسن باقی، اشفاق عارفی، محمد حسن نقوی، علیم الدین اسعدی، سلیم امروہوی، خصال مہدی، ممتاز عالم، ڈاکٹر علی جاوید اور اقبال مرزا شامل تھے۔

[illegible] بروز ہفتہ (۱۹ دسمبر 2015ء) خصیب سماعتی ہال میں پہلے اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر حقیقت فاروقی نے فرمائی جبکہ پروفیسر آزری وجاہت صفوی نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی تھے۔ ڈاکٹر حسن باقی نے مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر اعجاز بخش نے پیش کیا جس میں انہوں نے مرثیوں کے مطالعے کا جدید ساختیاتی تنقید کے تحت کیا گیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر ریحانہ فاروقی نے ڈاکٹر فضل باقی کے مرثیہ اور اردو عالیہ کے زیر عنوان انیس کی شعریات میں خارجیت، داخلیت اور ہندیت کی نمائندگی کو پیش کیا۔ تیسرا مقالہ جامعہ عالیہ سے فاروق پروفیسر عرفان رضا ریحانی کا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ خصال نے اپنے مقالے میں علم نجوم کی اصطلاحات اور علم نجوم سے عمل دخل پر پرمغز گفتگو کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی نے تینوں مقالوں پر اظہار خیال کیا اور آخر میں پروفیسر آزری وجاہت نے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے مرثیے کے مختلف مسائل پر بھی گفتگو کی۔ اس اجلاس کے فوری بعد دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کی اور نظامت قمر رضا شہزاد نے فرمائی۔ اس اجلاس میں چار مقالے پڑھے گئے۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے روزنامہ انتساب کے نمائندے رپورٹر خصال مہدی نے لکھا

عالمی مرثیہ کانفرنس سے دو روز قبل آباد یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے پروفیسر علی اندلیبی نے "مرثیہ کی نفسیات" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "ہر بڑی شاعری تصورات و خیالات سے بڑی ہوتی ہے اور مرثیہ اس سے بڑی شاعری ہے یوں کہ مرثیے نے اب تک شاعری میں پائے جانے والے جتنے تصورات و خیالات دیے ہیں انہوں نے کہا کہ "انیس کا بیشتر حزنیہ عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ شجاعت و قربانی کے بڑے موضوع تھے اور ہیں۔ ہر بڑا رزمیہ جنگ سے عبارت ہے، اقدار کی جنگ سے عبارت

ہے۔ مرثیہ انسانی جمالیات سے زیادہ انسانی جمالیات سے تعلق رکھتا ہے۔'' مرثیہ کی قدر و قیمت کے تعلق سے پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ''مرثیہ پیدائش سے لے کر موت تک راہ نجات ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ میں انسان ہی نہیں انسانی معاشرہ کی جمالیات، اخلاقی و دینی ہے۔'' رام پور رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ ''مرثیہ کو ہندوستان کی زمین بڑی راس آئی جوش بکار اردو مرثیہ کی شکل میں سامنے آئے اس کی مثال دنیا کی مانی ہوئی زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی میں نہیں ملتی۔ عجیب بات ہے کہ جو خراج عقیدت اردو مرثیہ نے امام حسینؑ و ہندوستان میں پیش کیا وہ عالم اسلام میں بولی جانے والی زبانیں عربی، فارسی، ترکی اور دری وغیرہ بھی نہ پیش کر سکیں۔ پروفیسر عزیز نے کہا کہ ''ہندوستان میں واقعہ کربلا اور اردو مرثیہ اس قدر توجہ کا مرکز بنا کہ ہندو دانشور اور شعرا جن کی اپنی تاریخ میں کربلا جیسا واقعہ تھا ہی نہیں انھوں نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر سینکڑوں مرثیے کہے۔ عزیز الدین حسین نے استاد قمر جلالوی کی فن مرثیہ گوئی پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔ پٹیالہ یونیورسٹی کے پروفیسر ناشر نقوی نے اردو مرثیہ معنویت، روایت اور روبیل کھنڈ کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ ''کسی برگزیدہ شخصیت کے وصال کے بعد، اس کے صالح اور قابل تقلید کردار اور پیغام کی منظوم تشہیر و تبلیغ کو مرثیہ کہتے ہیں۔'' اس کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ نے انیس اور شعری روایات اور ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اپنے مقالے میں شبلی کی تنقید پر اعتراض کیا۔

صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالہ نگاروں کے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''مرثیہ کے تنقید کے میدان میں بھی ادبی دہشت گردی پائی جاتی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''انیس اور مرزا دبیر کے کلام کے تقابل کے چکر میں بہت سے لوگوں نے ادبی دہشت پھیلائی ہے وہ اس طرح کہ شعر کسی شاعر کا کسی اور شاعر سے منسوب کر دیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ کسی فرقہ کی جاگیر نہیں ہے۔ مرثیہ جمالیات کا پورا مرقعہ ہے مرثیہ اردو کی فرہنگ ہیں اور میر انیس محاوروں کے شہنشاہ ہیں۔'' اس کے علاوہ انھوں نے اردو مرثیہ کی صورت حال کے علاوہ میر انیس، مرزا دبیر اور بیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور

مہمان خصوصی کی حیثیت سے رضا لائبریری سے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین موجود تھے۔
ڈاکٹر شمس صابر، ڈاکٹر وقار مظہری، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر ہلال نقوی اور پروفیسر محمد
رضا موسوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت عابد حسین حیدری نے کی۔ ڈاکٹر وقار مظہری
نے ڈاکٹر عابدی کی تازہ کار تصنیف "تجزیہ یادگار مرتبہ" جب قطع کی مسافت شب آفتاب
نے" پر ایک تنقیدی اور تجزیاتی مقالہ پیش کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت
سے پروفیسر آزرمی دخت صفوی موجود تھیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد شجاعت علی نے
انجام دیے۔ اس اجلاس میں محترمہ خدیجہ بیگم، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر حسن مہدی، ڈاکٹر نظیم
امروہوی اور ڈاکٹر حسن عباس نے مقالات پیش کیے۔ کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر رضا حیدر
نے اعلان کیا کہ بہت جلد ہی تمام مقالات کتابی شکل میں منظر عام پر لائے جائیں گے۔
چائے کے وقفے کے بعد علامہ سوز خوانی اور بہت اللہ مرثیہ خوانی کا دور شروع ہوا۔
سوز خوانی کے بعد جناب متین امروہوی، ڈاکٹر تاجدار حسین زیدی، معین شاداب، پروفیسر زیدی
یہ نوائی اور نسیم امروہوی نے مرثیہ سنائے۔ پروفیسر حسن مہدی صفوی نے اپنے مخصوص انداز
میں مرثیے سے چند بند ترنم سے سنائے۔ آخر میں سابق وزیر بہبود سید سبط
رضی صاحب نے تحت اللفظ میں مرثیہ پڑھا جسے عمدہ پڑھت میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس
مرثیہ خوانی کا پروگرام [illegible] تک قدر رات دیر تک مجلس مرثیہ میں موجود رہی۔
مرثیہ کانفرنس کے تیسرے اور آخری روز بروز اتوار رفیع سازندے دن کے پانچوں اجلاس
شروع ہونے کی صدارت ڈاکٹر تاجدار حسین زیدی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر
زماں آزردہ موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ممتاز عالم نے انجام دیے۔
ڈاکٹر ممتاز عالم نے مقالہ "مرثیہ میں [illegible] پر مفروضات کے بارے میں
[illegible] سے پیش کیا۔ ان کے مقالے کو صف کانفرنس کے مراسلہ میں قید رکھنا
[illegible] ہے۔ ڈاکٹر تاجدار حسین زیدی نے ڈاکٹر عابدی کے بیان کی تائید میں
[illegible] کے بعد ڈاکٹر [illegible] مرثیہ پر ایک مقالہ پڑھا جس
مرثیہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے کو بھی کانفرنس کے مراسلہ

دین اردو ادب کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔"

پہلا مقالہ ڈاکٹر نگینہ جبیں کا تھا جنھوں نے مرثیہ کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر محمد شجاعت علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر میں بھی مرثیہ دیکھ سکتے ہیں۔ نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت نواب اسٹیٹ ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے کی اور لندن سے تشریف لائے ماہنامہ "صدا" کے ایڈیٹر اقبال مرزا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، پروفیسر زماں آزردہ اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ تمام مقالات عالمانہ اور پرمغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے انیس کی جذبات نگاری پر مدلل مقالہ پڑھا اور ان غیر مطبوعہ مراثی پر بھی گفتگو کی جو اب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ "اردو ادب کی یہی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، حریت، بھائی چارگی، محبت اور بین المللی کا تصور بڑی خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے۔ نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عظیم امروہوی موجود تھے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر قمبر مرزا اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی اور ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق اور جناب شاہد ماہلی نے تینوں دن سیمینار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ ملک میں اپنی نوعیت کے اس پہلے سیمینار میں ڈاکٹر رضا حیدر کا مرثیہ کی ہر جہت پر اپنے قیمتی مقالات پیش کیے اور سیمینار کی کامیابی پر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر رضا حیدر کو مبارک باد پیش کی۔ شب میں بزم سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کے تحت غلام سجاد نے سوز خوانی کی۔ شعرا کرام نے سلام پیش کیا۔

جن میں گلزار دہلوی، عظیم امروہوی، دھرمیندر ناتھ، مہدی رضا اور خصوصاً مہدی شامل تھے۔ معروف مرثیہ خواں ڈاکٹر ارشاد حسن معصومی نے میر انیس کا خاص مرثیہ اپنے

مخصوص انداز میں پڑھ کے تحسین و آفرین کے غلغلوں سے سارا ہال گونج اٹھا۔ اس کانفرنس کی آرگنائزر جناب شاہد مہدی نے میر انیس کا شاہکار مرثیہ پڑھ کر سماں معین و محفوظ کیا۔ موصوف کا تحت اللفظ مرثیہ کا انداز بیان منفرد اور موثر ہے۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر تنویر عابدی کی جدید تصنیف و تالیف "رباعیات انیس" کا رسم اجرا اور ادیبوں و نقادوں میں تقسیم کی گئی۔ حسین مرزا کی "مطبوعہ مرثیہ حسن علمدار" کا بھی عمل میں آیا۔ کانفرنس سے پہلے ان مرثیوں کی کتابوں کی نمائش بھی کی گئی۔ کانفرنس میں رسالہ "انقلاب" کے مدیر علی شکیل شمسی اور روزنامہ "ہمارا" کے مدیر علی احمد رضا بھی شامل تھے۔ "پوتھی دنیا" کی مدیرہ میمونہ شاہد، "صحافت" کے مدیر سے علاوہ ڈاکٹر ریاض احمد، فاروق ارگلی، ایم رحمان، سمیت دہلی کی علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی شخصیتیں موجود تھیں۔

روزنامہ "انقلاب" نئی دہلی

28-30 دسمبر 2012ء

مرثیہ کی تدریس کے مسائل حل کرنے کی ضرورت

انجمن ترقی اُردو ہند دہلی شاخ کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ سہ روزہ عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس اختتام پذیر

اُردو مرثیہ نگاری کی تاریخ، فن، تنقید، اہمیت و افادیت اور عصری معنویت پر کارآمد بحث و مباحثے کے ساتھ اس جانب بھی توجہ مبذول کرائی گئی کہ اس کی قرأت اور تدریس کے مسائل کس طرح حل کیے جائیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دینے والے اساتذہ نے مرثیہ کی تدریس کے موجودہ مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "جس طرح غزل، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور دیگر اصناف پر یونیورسٹیوں میں ریفریشر کورس کرائے جاتے ہیں اسی طرح مرثیہ پر بھی ریفریشر کورس ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر زماں آزردہ، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر نگینہ جبیں، ڈاکٹر عابد حیدری اور ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی وغیرہ نے اس مسئلہ پر بطور خاص یہ حاصل گفتگو پیش کیے۔ دیگر اجلاس میں مرثیہ نگاری پر مقالات پیش کیے گئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی شاخ کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ سہ روزہ عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس اتوار کو اختتام پذیر ہوا۔

کانفرنس کے آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کینیڈا سے تشریف لائے مشہور ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زماں آزردہ موجود تھے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر نگینہ جبیں کا تھا جنھوں نے مرثیہ کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر محمد شجاعت علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر

میں بھی مرثیہ کو لیکچر سکتے ہیں۔ نظامت ڈاکٹر مختار زمان نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت جناب انیسی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے کی اور دہلی سے تشریف لائے ماہنامہ "صدا" کے مدیر جناب اقبال مرزا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر آذری، دکتر صفوی، پروفیسر زماں آزردہ، ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ تمام مقالات عالمانہ اور پر مغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مطبوعہ مراثی پر بھی مفصل گفتگو کی جو اب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ "رزم و ادب" ہی ایسی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، محبت، بھائی چارگی، محبت اور عین الحق کا تصور بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔" نظامت کے فرائض محمد ظہیر عالم نے انجام دیے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی موجود تھے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر اقبال مرزا اور پروفیسر مہدی الدین صفوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی، اور ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق اور جناب شاہد ماہلی نے قیمتی مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیے۔ اس طرح تین روزہ سیمینار میں ۱۱ مقالے پڑھے گئے۔ مرثیہ کی تنقید کے حوالے سے یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا۔ سیمینار کی کامیابی پر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر رضا حیدر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شب میں بزم سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کے تحت علامہ جوادی، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر اقبال مرزا اور پروفیسر مہدی الدین صفوی نے سلام پیش کیے اور معروف مرثیہ خواں ڈاکٹر ارشاد حسین صفوی نے میر انیس کا مرثیہ اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔ دوسرا مرثیہ جو معجزہ سے متعلق تھا، شاہد ماہلی نے پڑھا۔ سیمینار میں بڑی تعداد میں طلبہ اور شہر کے [illegible] موجود تھے۔

زبیر قریشی
نئی دہلی
30 دسمبر 2012ء

نوعیت اور اہمیت کے باعث مرثیہ ہر دور میں مقبول

مرثیہ ہر دور میں نوعیت اور اہمیت کے باعث نہ صرف ہند بلکہ بیرون ہند میں بھی مقبول ہوا ہے۔ مرثیہ نگاروں میں انیس و دبیر نے مرثیوں کو جو معراج عطا کی ہے وہ اور کسی اور مرثیہ نگاروں میں کم ہی نظر آتی ہے۔ ابتدا زمانہ قدیم سے لے کر زبان جدید تک مختلف شعراء نے اپنے اصناف سخن میں مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ اسی سے پیش نظر انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام ایوان غالب میں "عالمی اردو مرثیہ کانفرنس" کے دو روزہ اجلاس کا پہلے اجلاس میں جس کی صدارت ادارہ تحقیقات فارسی، علی گڑھ کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے کینیڈا سے آئے معروف محقق، دانشور ڈاکٹر تقی عابدی موجود تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مولی بخش، ڈاکٹر فضل ہاشمی اور پروفیسر عراق رضا زیدی نے مقالات پیش کیے۔ تینوں مقالات معنی اور مواد کے اعتبار سے عالمانہ اور پر مغز تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گفتگو میں اردو مرثیہ کی موجودہ صورت حال کے علاوہ میر انیس، مرزا دبیر اور بیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے کی۔

دوسرے اجلاس میں بطور صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے فریضہ انجام دیا اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اقبال مرزا موجود تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر ناشر نقوی ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر عزیز الدین، پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین موجود تھے۔ اس اجلاس میں

ڈاکٹر جسم صابر، ڈاکٹر مظفری، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر محمد رضا موسوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت کا فریضہ عابد حسین حیدری نے انجام دیا۔

سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر ریاض آزاد نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر آرزو [illegible] موجود تھیں۔ اس اجلاس میں محترمہ سفینہ بیگم، ڈاکٹر آئیل [illegible] ڈاکٹر حسن شمیم، ڈاکٹر شمیم احمد صمدانی اور ڈاکٹر حسن عباس نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ محمد شجاعت علی نے انجام دیا۔ عالمی مرثیہ کانفرنس سے پہلے ان چھ [illegible] مقالے پڑھے جا چکے تھے۔ ان مقالات میں عالمی مرثیہ کانفرنس کے [illegible] مقالات شامل تھے۔ [illegible] مرثیہ خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کا بھی تقابلی جائزہ پیش کیا گیا۔ [illegible] مرثیہ خوانی اور مرثیہ خواں حضرات نے مختلف خراج عقیدت پیش کیا۔ [illegible] عالمی مرثیہ کانفرنس میں [illegible] ہندوستان کے [illegible] شرکت کی۔

روزنامہ ''ہمارا سماج'' دہلی
30 دسمبر 2012ء

عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس کا انعقاد

مرثیے کو جدید مسائل کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام عالمی اردو مرثیہ کانفرنس کے آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ اس اجلاس میں مشہور ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زماں آزردہ موجود تھے۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر گلیفہ بیگم کا تھا۔ جنھوں نے مرثیے کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر محمد شاہ عالم علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر میں بھی مرثیے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ممتاز عالم نے انجام دیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جناب انجم عثمانی نے کی اور ڈاکٹر جناب شاہد ماہلی نے دہلی اور کلکتہ سے تشریف لائے ہوئے مہمان ''صدا'' ایڈیٹر جناب اقبال مرزا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر آزری دخت صفوی، پروفیسر زماں آزردہ، اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کے تمام مقالات نہایت ہی عالمانہ اور پر مغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے اُن غیر مطبوعہ مراثی پر بھی گفتگو کی جو اب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اردو ادب کی یہی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، حریت، بھائی چارگی، محبت اور بین المذاہب کا تصور بڑی خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے انجام دیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس

محمد اطہر
روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی
30/دسمبر 2012ء

مرثیہ پر کسی خاص فرقہ کی اجارہ داری نہیں

عالمی اُردو کانفرنس کے دوسرے دن محققین اور دانشوروں کا اظہارِ خیال

مرثیہ کسی خاص فرقہ کی جاگیر نہیں۔ آج ادب میں الفاظ کو نرم بنانے اور تحریر میں گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اُردو خود مسلمان نہیں بلکہ مسلمانوں کی کئی زبانوں میں سے ایک ہے۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا کے معروف ادیب ڈاکٹر تقی عابدی نے ایوان غالب میں عالمی مرثیہ کانفرنس کے مختلف اجلاس میں بطور مہمان خصوصی اور صدارتی خطاب میں کیا۔ پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ ''اُردو کی بقا و تحفظ کے لیے نئی نسل کو اُردو بمع اس کی رسم الخط کے سکھانے ضرورت ہے۔'' اس موقع پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''مرثیہ کی جمالیات'' موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''مرثیہ آج بھی زندہ ہے اگرچہ اس کی تنقید مردہ ہوگئی ہے۔ معروف ناقد و شاعر پروفیسر عتیق اللہ نے ''انیس اور شعری روایات'' کے موضوع پر اپنے مقالہ میں کہا کہ ''اُردو ادب میں روایت اور انفرادیت میں ابھی تک کوئی فرق اور واضح تصور قائم نہیں کیا جا سکا ہے۔'' اس کے علاوہ رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین حسین نے ''استاد قمر جلال پوری کے فن مرثیہ گوئی میں نمایاں کارنامہ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے عربی اور فارسی ادب کے تناظر میں مرثیہ کو شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے ''تنقید مرثیہ کی نارسائیاں اور مرزا دبیر'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا جب کہ پروفیسر ناشر نقوی نے اپنے منظوم مقالہ میں مرثیہ کی تاریخ بیان کی۔

پہلے اجلاس کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی تھے جب کہ نظامت کے فرائض

[illegible] یونیورسٹی میں [illegible] حسن شمسی رضوی نے انجام دیے۔ پروفیسر عرق رضا زیدی، [illegible] اور [illegible] نے [illegible] پڑھے۔ دوسرے اجلاس کے صدر [illegible] عابدی اور مہمان خصوصی [illegible] معروف ادیب [illegible] اقبال رضا تھے جب کہ نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔

یہ [illegible] کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر [illegible] نے کی اس کے مہمان خصوصی [illegible] پروفیسر [illegible] تھے۔ اس اجلاس میں [illegible] [illegible] پروفیسر [illegible] اور پروفیسر محمد رضا [illegible] نے [illegible] پیش کیے۔ نظامت عابد حسین حیدری نے کی۔ یہ [illegible] کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر [illegible] نے کی۔ [illegible] [illegible] اور [illegible] حسن شمسی [illegible] نے [illegible] پیش کیے۔ نظامت [illegible] محمد شجاعت علی نے کی۔ [illegible] [illegible] [illegible]

اُردو تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
سرحدوں سے پار جہاں اور بھی ہے

قومی اُردو کونسل میں اُردو کے سفیروں کو استقبالیہ

اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا حوالہ ہی نہیں ہمارے ملک کی پہچان بھی ہے۔ اپنی اثر انگیزی اور ترسیلی صلاحیت کی وجہ سے یہ زبان ہندوستان کی سرحدوں سے باہر بھی اپنی مقبولیت کی بنا پر آج دنیا کی زبان ہونے کے دعوے کر سکتی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ آج اردو نے مشرق وسطیٰ سے لے کر یورپ اور امریکہ تک اپنے پرستاروں کی ایک بڑی تعداد پیدا کر لی ہے جو اس زبان کی شیرینی کے قائل ہو رہے ہیں۔

اردو کی ان بستیوں میں جہاں پر مختلف یونیورسٹیوں، اداروں اور بہت سارے انجمنوں اداروں کے ذریعے تحقیق، تنقید اور تدریس سے متعلق قابل قدر کارنامے آ رہے ہیں۔ جن کی بدولت سے قومی اردو کونسل کی یہ کوشش رہی ہے کہ دنیا کے جن جن حصوں میں اردو سے متعلق کارنامے وقوع پذیر ہو رہے ہیں اہل قلم کو ہندوستان میں مدعو کر کے تشریف لاتے ہیں تو ان کو کونسل کی جانب سے استقبالیہ دینے کی سعادت حاصل کی جائے۔ آج کی محفل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کونسل میں تشریف لائے غیر ملکی مہمانوں کا استقبال کونسل کے ڈائریکٹر جناب وسیم بریلوی نے گلدستہ پیش کر کے کیا۔ اس محفل کی صدارت پاکستان سے تشریف لائے ضیاء الدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پیرزادہ قاسم نے کی۔

خوشی کی بات ہے، اس خاص محفل میں کونسل کی دعوت پر اردو کے عاشق نازاویب، محقق، دانشور، شاعر، ڈاکٹر تقی عابدی جو پینیڈ میں عرصہ دراز سے اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں، محفل میں تشریف لائے۔ آج کی اس خاص محفل میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "دیوان رباعیات انیس" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس موقع پر کہا کہ "میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب "دیوان رباعیات انیس" کا تعارف پیش کیا۔

اس تقریب سے مہمان خصوصی ہندوستانی عدیہ کی عظیم شخصیت جناب جسٹس مارکنڈے کاٹجو تھے، جن کی جرات مندانہ صداقت پسندی پورے ہندوستان میں روشنی پھیلا رہی ہے۔ ہندوستانی حکومت، عدلیہ، شعر و ادب اور سب سے بڑی بات اردو کی خدمت و محبت کے لیے ہندوستانی معاشرے میں ایک بحث کا موضوع ہے۔ جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کہا "اردو شاعری ہماری تہذیب کی ترجمان ہے۔"

جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کہا کہ میر و غالب اردو شاعری کی روایت کا نہایت ہی محترم

سے مقامی اثرات قبول کر رہی ہے؟ عالمی سطح پر اُردو، اُردو تحقیق کاروں کی سوچوں میں وہ وجہ امتیاز بنتی ہے۔ ان کا جائزہ لیا جانا چاہیے اور عالمی سطح پر اُردو تحقیق کن نئے تیوروں سے آشنا ہو رہی ہے اس کی تفصیل یہاں کے اُردو داں حلقے تک پہنچنا چاہیے۔

تقریب کے آخر میں قومی اُردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب وسیم بریلوی نے تقی عابدی کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ''اُردو تحریر، تقریر، تحقیق کی چلتی پھرتی خوشبو کا نام تقی عابدی ہے۔'' انھوں نے کونسل کی جانب سے سبھی مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔

آج کی اس خاص محفل میں جن اُردو داں حضرات نے شرکت کی اُن کے نام اس طرح ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول،، ڈاکٹر شاہد ماہلی، جناب فیروز بخت، جناب حافظ مطلوب کریم، جناب آصف اعظمی، جناب فرید احمد، جناب ایم فاروق انجینئر، شیخ علیم الدین اسعدی، جناب راشد حامدی، پروفیسر شہپر رسول، جناب انیس اعظمی، جناب اقبال مسعود، ڈاکٹر مشتاق، جناب ایم اے عالمگیر کے علاوہ قومی اُردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد اور کونسل کے عملے نے بھی شرکت کی۔

لکھنؤ

میر انیسؔ کی رباعیات کو نئے زاویہ سے دیکھنے کی کوشش

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "دیوانِ رباعیات انیسؔ" کا اجراء

[illegible] ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "دیوانِ رباعیات انیسؔ" کا اجراء [illegible] لکھنؤ یونیورسٹی کے [illegible] صدر ڈاکٹر کاظم [illegible]

[illegible] کارنامہ [illegible] ڈاکٹر تقی عابدی نے [illegible] کتاب پر [illegible] انیسؔ کی تمام رباعیات کی تدوین [illegible] انیسؔ کی شاعری پر روشنی [illegible]

[illegible] افروزی کا تقابلی مطالعہ ہونا چاہیے۔"

[illegible] غزلوں پر بھی کام ہونا چاہیے۔

پروفیسر انیس اشفاق نے صنف رباعی میں لکھنؤ کی مرکزیت اور ڈاکٹر تقی عابدی کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی نے انیس کی رباعیات کو نئے زاویہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ انیس کے مقام مرثیٰ کی طباعت کرتے جارہے ہیں۔ یہ اردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس موقع پر لکھنؤ کی تہذیبی اہمیت، یہاں کی شعری روایات اور میر انیس کی شاعرانہ عظمت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ ''ابھی تک میر انیس کو محض 10 فیصد ہی دریافت کیا جاسکا ہے۔ میر انیس کی رباعیات کی تعداد 579 ہے جب کہ فارسی کے عظیم شاعر خیام نے صرف 179 رباعیات ہی کہی ہیں۔ ہم لوگ میر انیس کی رباعیات کی عظمت سے ناآشنا ہیں، ان کو اہم مقام اور مرتبہ دلانے کے لیے کافی ہیں۔'' بنارس ہندو یونیورسٹی شعبہ اردو کی سابق صدر پروفیسر قمر جہاں اور ڈاکٹر جعفر عسکری نے بھی اظہار خیال کیا۔ خانوادۂ انیس کے فرد علی احمد دانش نے ''رباعیات انیس کی مرحلہ وار اشاعت'' موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ تقریب میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر اکبر حیدری، ڈاکٹر احمد عباس ردولوی، نواب جعفر میر عبداللہ، اطہر نبی، افسانہ نگار ارشاد امروہوی، عائشہ صدیقی، ڈاکٹر تقی علی عابدی، حیدر نواب جعفری، قمر گونڈوی اور اسرار سید سمیت ادیبوں، شاعروں، معززین شہر اور طلبہ وطالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

23/مارچ2013ء

جشن فیض احمد فیض صدی تقریب میں
سید تقی عابدی اور انجینئر عبدالقدیر کی شرکت

تقریب میں کینیڈا سے تشریف لائے مشہور ادیب و شاعر سید تقی عابدی نے فیض احمد فیض کی شاعری کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فیض کے متعلق کئی غلط فہمیوں کو رفع کیا۔ تقریب میں شامل مشہور ادیب حکیم صبا نویدی نے بھی فیض پر ایک وقیع مضمون سامعین کی نذر کیا، جس کے بعد بیدر کرناٹک سے تشریف لائے مشہور شاعر پی یو کانتے جنرل سکریٹری عبدالقدیر صاحب کو اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ زبان اور تعلیم کو فروغ دینے پر ان کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے "امتیاز اردو" ایوارڈ برائے 2012ء سے نوازا گیا۔ مجلس فاؤنڈیشن اردو رابطہ کمیٹی ہر سال اردو کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو امتیاز اردو ایوارڈ دیتی آرہی ہے۔ قبل ازیں یہ ایوارڈ دبئی کے مشہور عرب شاعر ڈاکٹر زہیر فاروق اور کینیڈا کے نامور ادیب و شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کو دیا جا چکا ہے۔ انجینئر عبدالقدیر نے ایوارڈ قبول کرتے ہوئے اپنے تعلیم کے طریقہ کار سے سامعین کو واقف کرایا، جس سے سامعین کافی متاثر ہوئے۔ جس کے بعد ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا، جس میں ڈاکٹر تقی عابدی کے علاوہ بنگلور سے آئے ہوئے شاعر اختر علوی اور کئی مقامی شعراء نے اپنے کلام سے محظوظ کیا، مشاعرہ کی صدارت مجلس فاؤنڈیشن کے نامور شاعر و ادیب حکیم صبا نویدی نے کی۔ اس تقریب میں کافی تعداد میں سامعین اور محبان اردو نے شرکت کی۔

ہفتہ وار "گواہ" حیدرآباد
28/مارچ 2013ء

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اعظم کیمپس پونہ میں تقی عابدی کا خطاب

روزنامہ "صحافت" دہلی
6 ستمبر 2013ء

رسم الخط کی ترویج اُردو کا سب سے بڑا مسئلہ

کونسل نے ساری دنیا سے اُردو
پرستاروں کو جمع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا: تقی عابدی

اُردو رسم الخط کی ترویج و تربیت آج اردو زبان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس شاندار زبان کو نئی ٹکنالوجی سے جوڑنے میں قومی اُردو کونسل نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ صحیح معنوں میں آج دنیا میں اُردو کو فروغ دینے والا سب سے بڑا ادارہ بن چکا ہے۔

ان خیالات کا اظہار بین الاقوامی اردو کانفرنس کے دوسرے دن کے اجلاس میں کیا گیا۔ یہ کانفرنس نہ صرف کونسل کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے بلکہ اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں بھی اسے سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ "اکیسویں صدی میں اُردو فروغ اور امکان" کے موضوع پر قومی اُردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ منعقد کی گئی۔ بین الاقوامی کانفرنس میں آج پہلے سیشن کا موضوع اُردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کا کردار تھا، جس میں نسیم عارفی، خوشتر نورانی اور پروفیسر عبدالحق نے اپنے وقیع مقالات پیش کیے۔ اس سیشن میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کونسل کی تمام کارگزاریوں پر مشتمل ایک پاور پوائنٹ پریزینٹیشن پیش کیا۔ پاکستان کے معروف کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی نے کونسل کی خدمات کی ستائش کی اور کہا کہ "کونسل واقعی اُردو کی خدمت کر رہی ہے۔" انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری جناب اطہر فاروقی نے انجمن ترقی اُردو ہند کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انجمن کے دائرہ کار کی توسیع پر زور دیا۔ ڈاکٹر ظفر محمود نے اپنے مقالے میں ہندوستانی آئین کی مختلف دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے ملک میں اُردو کی صورت حال بیان کی اور ملکی و عالمی سطح پر اُردو کے فروغ کا ایک منظم و

مربوط لائحہ عمل مرتب کرنے کی درخواست کی۔ نتوں نے حکومت کی اسکیموں کا جائزہ لیا اور کہا کہ "اردو والوں کو بھی اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ خود اردو کے فروغ کی کتنی سنجیدہ کوششیں کر رہے ہیں۔" اس اجلاس میں معروف ادیب جناب غلام نبی خیال نے جموں کشمیر کے وزیر مالی محکمہ مواصلات کی اس کانفرنس کے لیے خصوصی پیغام بھی پڑھ کر سنایا۔ اپنے پیغام میں وزیر موصوف نے اردو کی ترقی کے لئے کانفرنس کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مجلس صدارت میں شامل سابق مرکزی وزیر مملکت جناب علی اشرف فاطمی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ "اردو ہندوستان کی قومی نیشنل زبان ہے، ست عالمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ قومی زبان اردو کو بنیادی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ہر سطح پر اردو اسکولوں کے قیام کی سمت میں کوششیں کی جانی چاہئیں۔"

جلسہ صدارت سے ڈاکٹر جناب وجاہت حسین نے کہا کہ "اردو اور ہندی کا فرق بیجا ہے۔ میں ہمیں ان زبانوں کے فروغ کی کوششیں کرنی ہوں گی۔ ہندوستان [illegible] جناب وجاہت حسین نے صدارتی کلمات میں کہا کہ "ان مقامات میں اردو کی ترقی کے لئے ہمیں مزید سنجیدہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کانفرنس میں [illegible] صدارت کے دن پروفیسر [illegible] نے مقالے پڑھے۔ [illegible] نے کہا کہ "ان مقامات میں اردو کی ترقی کے لئے ہمیں مزید سنجیدہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کانفرنس میں [illegible] صدارت میں [illegible] پروفیسر [illegible]

[illegible]

یہ بتایا کہ وہاں عرب لوگ بھی اپنی بات چیت میں اُردو کے ڈھیروں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "مصر ہی نہیں بلکہ تمام خلیجی ممالک میں اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ اس سمت میں یہاں کے اداروں کو وہاں کی درس گاہوں میں کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔"

پاکستان کی مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر اور معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے مجلس ترقی ادب کی خدمات پر گفتگو کی اور کہا کہ "مجلس نے ادب کے ساتھ دیگر موضوعات پر ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں۔" پاکستان کے معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے اپنے شگفتہ انداز میں برجستہ اُردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ ماسکو سے تشریف لائیں ڈاکٹر نذیر یادا نے روس میں اُردو زبان کے آغاز و ارتقا پر اظہار خیال کیا۔

استنبول کے ڈاکٹر خلیل طوقار نے ترکی میں اُردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "زبان کو ختم کرنے کے کئی مجرب نسخے ہیں جنھیں آج پاکستان میں آزمایا جا رہا ہے۔ اس سمت توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مجلس صدارت کے رکن معروف ناقد و محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے پڑھے گئے مقالوں پر مختصر اظہار خیال کرتے ہوئے اُردو کی تاریخ پر خوب صورت نثر یہ شاعری کی اور اُردو کے رسم الخط کے تحفظ، بنیادی تعلیم، اُردو کو جدید لسانیات سے ہم آہنگ کرنے، اُردو ریڈر شپ کی توسیع اور اردو کتابوں کو اغلاط سے پاک کرنے کے لیے اُردو میں پروف ریڈنگ کورس شروع کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کونسل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ "قومی اردو کونسل نے ساری دنیا سے اُردو پرستاروں کو جمع کرکے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے تاکہ یہ اسکالرس یہاں بیٹھ کر اُردو کی ترقی کی سمت میں غور و خوض کرسکیں۔ دوسرے اجلاس کے اختتام کے بعد بین الاقوامی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر وسیم بریلوی، مظفر حنفی، فرحت شہزاد، عطاء الحق قاسمی، محمد علوی، ڈاکٹر زبیر، عزیز نبیل، ڈاکٹر نسیم نکہت، انور جمال پوری، راحت اندوری، جاوید اختر، تقی عابدی، جلیل نظامی، سریندر تجر، مہتاب عالم اور نواز دیوبندی وغیرہ نے اپنے خوب صورت کلام سے محفلِ مشاعروں کو رونق بخشی۔

وسیم افتخار انصاری
ماہنامہ "آرہا ہے چاند" اندور
اکتوبر 2011ء

اندور میں "فیض شناسی"

کا اجرا توسیعی خطبہ، سیمینار اور مشاعرہ

اندور میں رشید اندوری مرحوم اور راجہ رشید اندوری ایک شخصیت ہیں جو بیک وقت ادبی و شعری تقریبات منعقد کرتی رہتی ہیں۔ جس سے اندور کے ادبی تعارف میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کچھ تنظیمیں یا ادارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ صرف شہر کی ادبی تاریخ [illegible] تقریبات میں بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک ایسی ہی یادگار تقریب اندور میں منعقد ہوئی۔

[illegible] 7 اکتوبر 2011ء بروز جمعہ [illegible] معروف ناقد رشید اندوری کے اعزاز میں [illegible] ترقی پسند تحریک کے [illegible] ناقد، ماہر غالب، فیسیات، [illegible] فیض خیل اندوری صدیقی مشیر کی صدارت میں ایک عظیم الشان [illegible] جس میں شہر اور بیرون شہر کے معروف شخصیات نے شرکت کی۔

[illegible] سے [illegible] پروفیسر [illegible] نے [illegible] فیض کی تخلیقی [illegible] فیض شناسی [illegible] لوگ مسرور ہوئے۔

کتاب کی رسم اجراء کے بعد، صاحب اعزاز ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فیض احمد فیض کی حیات، شخصیت، عہد، فن اور شاعری پر توسیعی خطاب فرمایا، انھوں نے فیض کو سیاسی، سماجی، تاریخی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نظر سے ادب کی ایک نابغہ روزگار شخصیت بتلایا، موصوف کا انداز کلام اس قدر شیریں، شگفتہ اور موثر تھا کہ محفل ان کی عالمانہ گفتگو سے محظوظ ہوگئی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے توسیعی خطاب کے بعد عالمی مشاعرے اور سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر خلیل نے کی، مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے کی، کہانی کار، محقق، ناقد پروفیسر مختار شمیم (سابق پرنسپل، گورنمنٹ پی جی کالج) نے "فیض شناسی" پر تنقیدی تحقیقی باریک بینی کے ساتھ پر مغز مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر عزیز اندوری نے بھی اندور کے ادب پر گفتگو فرمائی۔ پروفیسر اے اے عباسی نے اپنے علی گڑھ تعلیم کے دوران فیض کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے فیض کی یادوں کو تازہ کیا۔ ان کے بعد سیمینار کے صدر پروفیسر خلیل احمد صدیقی مشیر نے پیش کیے گئے مقالات پر بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ منصفانہ تبصرہ کیا۔ انھوں نے پروفیسر مختار شمیم کے مقالے کو بہترین مقالہ قرار دیا۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض رشید اندوری نے بحسن و خوبی انجام دیئے۔ جس کے بارے میں صدر سیمینار نے بھی اعتراف کیا کہ اگر کسی تقریب کا میاب ناظم اچھا ہونا چاہیے یوں بھی ساری تقاریب کے اہتمام اور کامیابی کا سہرا رشید اندوری کے سر ہے۔

سیمینار کے بعد ادبی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر سید تقی عابدی اور نظامت فریاد بہادر نے کی۔ جس میں اندور سے علاوہ برہانپور، بھوپال اور دہلی سے تشریف لائے شعراء نے شرکت کی۔ فوق عالم، حافظ حسن، خلیل آتش، احمد نثار، ڈاکٹر جلیل، اسحاق اثر، فریاد بہادر، قیصہ عزیز، عشرت واحد، جاوید عرشی، نعیم راشد، نصیر انصاری، پروفیسر مختار شمیم، رشید اندوری اور صدر مشاعرہ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے کلام سے عوام کو محظوظ فرمایا۔

اندور میں یہ ایسا پہلا موقع تھا کہ عوام نے دیر رات تک اتنا طویل نشستی پروگرام سماعت کیا ہو اور اس کے بعد جیت انگیز طور پر مشاعرہ بھی کامیاب رہا ہو۔ واقعی جاوید عرشی اور خصوصاً رشید اندوری مبارک باد کے مستحق ہیں۔

15/دسمبر 2013ء

شعبہ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام اُردو فیسٹیول کا انعقاد

ڈاکٹر تقی عابدی کا لکچر اور بین کلیاتی ادبی مقابلے

ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اُردو کا بیان

[illegible]

دور میں خواتین کا تحفظ۔ اور موجودہ دور میں سماجی پستی اور ہماری ذمہ داریاں رکھے گئے ہیں۔ تقریری مقابلے کے لیے عنوانات اُردو سے روزگار کے مواقع مسائل اور امکانات، لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے مسائل اور اعلیٰ تعلیم اور اخلاقی اقدار رکھے گئے ہیں۔ ان مقابلوں کے لیے طلباء انفرادی طور پر شرکت کر سکتے ہیں۔ طلباء اپنے نام کالج کے اردو لکچرر کے ہاں پیش کریں۔

دوسرے دن نظم خوانی اقبال کی نظموں سے انتخاب اور بیت بازی کے مقابلے منعقد ہوں گے اور اسی دن جلسہ تقسیم انعامات عمل میں آئے گا۔ بیت بازی اور ادبی کوئز کے لیے کالج سے دو ٹیمیں حصہ لے سکتی ہیں۔ ان ادبی مقابلوں کے لئے مختلف کالجوں سے لکچرس کو کنوینرس بنایا گیا ہے۔ تحریری مقابلوں کے کنوینر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج سیدہ نشاط فی طلبہ ریسرچ اسکالر شریک کنوینر، تقریری مقابلوں کے لیے عبدالرحمٰن داؤدی لیکچرر اُردو بوڈھن کنوینر اور آفرین سلطانہ متعلم ایم اے اُردو سال اول شریک کنوینر، ادبی کوئز مقابلوں کے لیے ڈاکٹر محمد ناظم علی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ کنوینر اور اسماء بیگم متعلم سال ایم اے سال دوم شریک کنوینر، نظم خوانی کے لیے ڈاکٹر گل رعنا اسسٹنٹ پروفیسر کنوینر اور شمیم سلطانہ لیکچرر اُردو ویمنس ڈگری کالج نظام آباد شریک کنوینر اور بیت بازی کے لیے ڈاکٹر موسیٰ اقبال کنوینر اور افتخار فہد ریسرچ اسکالر شریک کنوینر ہوں گے۔ ان مقابلوں کے سرپرست اعلیٰ پروفیسر ایم دھرم راج، کوآرڈینیٹر ڈاکٹر اطہر سلطانہ اور جنرل کنوینر ڈاکٹر موسیٰ اقبال نے تمام ڈگری اور پی جی اُردو میڈیم طلبہ وطالبات سے کثیر تعداد میں شرکت کرنے اور اُردو فیسٹیول 2013 کو کامیاب بنانے کی اپیل کی ہے۔

3 مارچ 2014ء

غالب انسٹی ٹیوٹ میں
پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب پر مذاکرہ

غالب انسٹی ٹیوٹ نے ریزیڈنسی مشاعرہ [illegible] کے موقع پر ممتاز ادیب، دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اہم کتاب "غالب معنی آفرینی، جدیدیت، شونیتا اور شعریات" پر ایک اہم مذاکرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس تازہ ترین کتاب پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ نارنگ صاحب نے اس کتاب میں غالبیات سے متعلق [illegible] کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی ہے۔ اس سے قبل بھی غالبیات پر بہت کام ہوا ہے تنقیدیں بھی لکھی گئی ہیں پروفیسر نارنگ نے اس کام کو تحقیق و تنقید دونوں کی آمیزش سے [illegible] اس طرح سے مہمان خصوصی پروفیسر اے [illegible] نے کہا کہ یہ کتاب بہت سی خصوصیات کی حامل ہے اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق غالب سے مربوط ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں غالب سے متعلق نئی نئی باتیں پیش کی ہیں جو وقت کی اہم ضرورت ہے نارنگ صاحب نے اس کتاب میں [illegible] کیے ہیں اور اس کام کو بہت فکر انگیز اور معنی خیز بنا دیا ہے۔"

[illegible] نے کہا کہ یہ کتاب نارنگ صاحب کی [illegible] کا نتیجہ ہے [illegible] نارنگ صاحب نے اس کتاب میں [illegible] پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں [illegible]

غالبؔ کے ہر شعر کو چیلنج کی طرح قبول کیا ہے اور اُس کی عالمانہ تعبیر پیش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی دُنیا میں یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت سے جانی جارہی ہے۔'' الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے فرمایا کہ ''نارنگ صاحب نے اپنی اس کتاب میں غالبؔ کے اشعار کی نئی توجیحات پیش کی ہے جسے پڑھ کر ہمارا دماغ روشن ہوجاتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے شونیتا کے فلسفے کو غالبؔ کی شاعری سے جس طرح مربوط کیا ہے اُس سے اس کتاب کی وقعت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کتاب کو لکھ کر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنا شمار اہم غالبؔ شناسوں میں کرالیا ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی نے فرمایا کہ ''پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں غالبؔ کو نئے طریقے سے دریافت کیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے کلام میں جس نئی شعریات کو وضع کیا آپ نے اس کتاب میں اُس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ فلسفہ شونیتا پر بھی جس عالمانہ طریقے سے آپ نے گفتگو کی ہے اس سے پہلے اُردو دُنیا میں اس انداز سے کسی نے گفتگو نہیں کی تھی۔''

نظام صدیقی نے فرمایا کہ ''کتاب کے ہر باب میں پروفیسر نارنگ نے غالبؔ کے اشعار کی جس عالمانہ انداز میں شرح پیش کی ہے اس سے یہ کتاب غالبیات کی دُنیا میں سنگِ میل کی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔''

عالمی اُردو ٹرسٹ کے چیئرمین جناب اے رحمان نے کہا کہ ''ہماری ادبی دُنیا میں غالبیات کے تعلق سے اتنی اہم اور معنی خیز کتاب کم ہی لکھی گئی ہیں۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''پروفیسر نارنگ نے شونیتا کے ساتھ ساتھ جدلیاتی وضع کو مفکرانہ انداز میں واضح کیا ہے۔''

ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے فرمایا کہ ''حالیؔ کی ''یادگارِ غالبؔ'' کے بعد اگر کسی کتاب نے ہمارے دل و دماغ کو متاثر کیا ہے تو وہ نارنگ صاحب کی موجودہ کتاب ہے۔ یہ کتاب اکیسویں صدی کی اُن شہرہ آفاق کتابوں میں سے ایک ہے جس کا ہر صفحہ مصنف کے عالمانہ افکار کی ترجمانی کررہا ہے۔ نوجوان ناقد ڈاکٹر مولیٰ بخش نے فرمایا کہ ''پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں ہندستان کی پوری تاریخ اور فلسفے

کے تناظر میں غالب کی شاعری کو دیکھا ہے۔ موجودہ دور میں اس کتاب کی اس لیے بھی اہمیت ہے کہ جس ہر طرف ظلم و تشدد کا ماحول گرم ہے وہیں یہ کتاب ہمیں روشنی بھی عطا کر رہی ہے۔"

ڈاکٹر رشید انور رشید نے لکھا ہے کہ "پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں غالبیات کے چھپے ہوئے ان گوشوں پر گفتگو کی ہے جس پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔"

جشن کی نظامت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے ابتدا میں کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا "اس کتاب کا ہر صفحہ اور ہر لفظ غالبیات کی ایک نئی بازیافت ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ مصنف نے غالب کے اردو اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی اشعار پر بھی عالمانہ گفتگو کی ہے اور فارسی کے بڑے شعرا فردوسی، رودکی اور بیدل کے کلام کے تناظر میں غالب کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس مذاکرہ میں خاص بات یہ تھی کہ اس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ خود موجود تھے اور انھوں نے اپنے غالب سے متعلق تحقیقی کام کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے کہا "غالب کو سمجھنا آسان نہیں ہے غالب پر لکھتے ہوئے میں ہمیشہ اپنے کو طالب علم ہی سمجھتا رہا۔" آپ نے یہ بھی کہا کہ "غالب کے سب سے زیادہ شارح ہیں اور سب سے مختلف۔ غالب کی شاعری کی تفہیم و تشریح کی تاریخ کا علم ہوتا ہے یوں کہ غالب کے کلام کی بہترین شرحیں اس عہد کے تہذیبی پس منظر سے ہی ہوئی تھیں۔ غالب کی شاعری کی تعریف سے جو پہلو سامنے آتے ہیں وہ بھی یہی نظر آتے ہیں۔"

[illegible] غالب [illegible] تحقیق سے بھی [illegible] غالب [illegible] مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے [illegible] غالب [illegible] چکنے تک [illegible]

ڈاکٹر سید تقی عابدی
روزنامہ "اعتماد" حیدرآباد
14 جولائی 2014ء

سعید شہیدی صدی تقاریب

سعید شہیدی کی موجِ غزل طوفان سے ساحل تک

سعید کی غزلوں میں قدیم روایتی مضامین ساحل طوفان اور سفینہ نئے نئے عنوان سے پیش کیے گئے ہیں۔ سعید نے اپنی بوقلموں میں کی شراب بھری ہے۔ روشاعری میں ان کے پاس کلاسیک مضامین پر شاعری کی نہیں کہی ہے باوجود سعید کا تخیل بلند شعر بیان اور جدید طرز کا حامل ہے جو ان کی ذہانت فکری اور تخیل کی گرمہ سازی کا نتیجہ ہے جس سے ان کے شعر میں تازگی اور تازہ کاری پیدا ہوئی ہے۔ سفینہ طوفان ساحل اور ناخدا کو رقیب بنا کر سعید نے جدید طرز کا مضمون باندھا ہے۔ سعید کا ایک اور شعر دیکھیے جو طوفان سے نجات دلا کر ساحل تک پہنچا تا ہے لیکن ساحل کی طرح نجات کا حامل نہیں وہ بھی ڈوب سکتا ہے اور کبھی نہ کبھی ناخدا سے مل سکتا ہے۔

سعید نے طوفان سے متاثر ہو کر انسان کی قدرت اور برتری کا اظہار کیا ہے جو مثبت آزمائشی قدر بتایا ہے۔

خدا حافظ تمہارا اہل ساحل
مجھے انجام طوفاں دیکھنا ہے

•••

ابھی کیوں لاؤں کشتی سوئے ساحل
ابھی تو زور طوفاں دیکھنا ہے

•••

قدموں میں آجائے گا ساحل
طوفان سے ٹکراتے رہیے

•••

[illegible] ساحل ٹکراتے ہیں
[illegible] طوفانوں سے ٹکرا لے آئے ہیں

•••

[illegible] ساحل تک آپ کو
طوفاں کے رخ پہ اپنا سفینہ بڑھائیے

•••

[illegible]
[illegible]

•••

سفینہ وہ نہیں جو لوٹ آئے ساحل پر

[illegible]

یہ شعر [illegible] بندگی کی تعلیم نہیں، یہ ان شعروں میں [illegible] اور مشکلات سے [illegible] نہیں، یہ ان مضامین میں قنوطیت سے [illegible] نہیں، یہ آتی پندگی [illegible] نہیں ہوتی۔ [illegible] ان [illegible] شاعر کے حساب میں [illegible] زندگی [illegible] شاعر [illegible] زندگی میں [illegible] اور [illegible] پیش [illegible] ٹکرانے [illegible] طوفان سے [illegible] ہے۔ کچھ شعر ان مطالب کے یہ ہیں:

اپنی مرضی سے ڈبویا ہے سفینہ میں نے
کبھی طوفان کا احسان اٹھایا ہی نہیں

•••

بچ کہ کیوں آئے کنارے پہ سعید
ڈوب جاتے تو بہت اچھا تھا

•••

جس نے خود طوفاں میں کشتی ڈال دی
اس کے دل میں حسرتِ ساحل کہاں

•••

ساحل بھی اپنا طوفاں بھی اپنا
اب پار اتریں یا ڈوب جائیں

•••

طوفانوں کو جس نے پالا
وہ کیا جانے ساحل کیا ہے

•••

گرداب بلا کا تجھے اندازہ ہو کیسے
جب تیرا سفینہ ہی بھنور تک نہیں پہنچا

•••

نذر طوفاں جب سفینہ ہوگیا
مطمئن یارانِ ساحل ہوگئے

•••

ہمارا سفینہ بھی ڈوبا ہے یاں
ہمارا بھی کچھ حق ہے طوفان پر

زندگی میں سکون عیش و آرائش عارضی ہے جس طرح طوفان سے پہلے فضاؤں میں

خاموشی اور سکوت چھا جاتا ہے اسی طرح ظاہری خوشی کے بعد غم اور مشکلات کا موسم شروع ہوتا ہے۔ اس لیے خدائے سخن میر انیس نے فرمایا تھا

کسی کو ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

شاعر انیس کے شعر ہمیں بتاتے ہیں کہ دنیا میں ہر شے مستقل نہیں رہتی۔ انسان کے خدا نے کئی دوسری چیزیں پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ہر خوشی غم میں اور ہر تاریکی روشنی میں بدل سکتی ہے۔ اس لیے انسان کو تیار رہنا چاہیے اور یہی ایک کامیاب زندگی کا راز ہے۔

طلب گارانِ ساحل یاد رکھیں
لبِ ساحل بھی کشتی ڈوبتی ہے

•••

تھا نگاہوں کے سامنے ساحل
کس جگہ جا کے ناؤ ڈوبی ہے

•••

[illegible]

•••

آپ ساحل سے نہ طوفاں کا تماشا دیکھیں
[illegible]

•••

سن لیں سارے اہلِ ساحل
طوفانوں کی بات چھڑی ہے
[illegible]
مجھے ڈوبنا بھی نہ ہو جائے مشکل
کنارے پہ آنے کی زحمت نہ کیجے

مسکراتے ہوئے کنارے پر
ڈوب جانے کی بات کرتے ہو

•••

یہ تضاد ہے تمام فلسفہ زندگی کا
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آنچہ در عالم بلجند آدم است
آنچہ در آدم بلجند عالم است

وہ شاعری جو انسان کی باطنی حقیقتوں سے روشناس کرتی ہے آفاقی شاعری ہے۔ کبھی کہتے ہیں:

ساحل سے ہیں محوِ تماشا
طوفاں سے ٹکرانے والے

•••

آج وہ محوِ تماشا ہے لبِ ساحل سے
[illegible]

•••

[illegible]
اب تماشہ بینے ساحل تک آیا ہے وقت

اس مختصر تجزیہ کے بعد ہم اقبال کے ان شعروں پر تبصرہ کرتے ہیں جس سے باطنی حقیقی انسان کی وہ تشکیل ہوتی ہے جو اس کی شخصیت اور مشیت کا درس دیتے ہیں

ڈوبنے والے کو طوفاں سے بچانے کے لیے
کس قدر گہرا ہے دریا کیسے دیکھا جائے

•••

تجربوں سے تجربوں کا ہو گیا اندازہ
زندگی نے سانس سے سینہ کو بڑھایا ہی نہیں

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد
22/ستمبر 2014ء

اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت

نظام آباد میں بین الاقوامی سیمینار: ڈاکٹر تقی عابدی

کانفرنس سے ویڈیو کانفرنس کے ذریعہ خطاب، مندوبین کی بڑی شرکت

اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس زبان نے ہندوستان میں شاندار تہذیبی روایات قائم کی ہیں۔ اس نے ملک میں مذہبی رواداری، آپسی بھائی چارہ، محبت، خلوص، انسانیت جیسے جذبات پروان چڑھائے ہیں۔ اردو کی شعری و نثری اصناف میں امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی، میر، غالب، اقبال، جوش، فراق، امجد، اقبال، پریم چند وغیرہ نے جو شاندار تہذیبی روایات اور اقدار کا خزانہ چھوڑا ہے اس سے عصر حاضر کے اقدار سے عاری دہشت گردیوں سے لڑنے والے ماحول میں روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور عقلی میں بھی اپنی تہذیبی شناخت برقرار رکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار محقق و ناقد پروفیسر قاضی عابدی نے نظام آباد میں قومی وسیل برائے فروغ اردو زبان اور شعبہ اردو سے ریاست منعقدہ ایک روزہ قومی و بین الاقوامی سیمینار سے بذریعہ ویڈیو کانفرنس براہ راست مخاطب ہوتے اپنے خطاب میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ "آج سماج میں جو قدریں پروان چڑھ رہی ہیں اور انسانی زندگی سے جس طرح اقدار نکل رہے ہیں اس سے قدرے سے اردو کے شاندار تہذیبی ورثے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔"

انہوں نے کہا کہ مستقبل میں اردو کے فروغ کے لیے مادری زبان میں بچوں کی تعلیم اور اردو روزگار سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ اس ایک روزہ سیمینار کا موضوع اردو

ادب تہذیبی قدریں ماضی حال اور مستقبل تھا۔" اس سیمینار میں پروفیسر خالد سعید انچارج
ڈرکیٹر مرکز برائے اردو زبان تہذیب و ثقافت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بطور
مہمان خصوصی شرکت کی اور کلیدی خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ "تہذیبوں کے بننے
میں جغرافیائی حالات، زبان، لباس اور رہن سہن اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اردو زبان و
ادب میں خلق اور اقدار پر مبنی باتیں ہیں جن سے موجودہ حالات میں استفادہ کیا جا سکتا
ہے۔" انھوں نے سیمینار کے موضوع کی افادیت و اہمیت کے حوالے سے
شاندار اردو سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد دی اور کہا کہ "ویڈیو کانفرنس کے ذریعے
ہی سہی لیکن ہندوستان کے مختلف حصوں سے اتنے سارے اسکالرز کو ایک جگہ
جمع کرنے کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے۔ اردو
والوں کے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ عالمی لاک ڈاؤن کے ذریعے کچھ مثبت کام
سیمینار کی نظامت کے فرائض محمد عابد حسین کارکن ویڈیو کانفرنس نے انجام دیے۔
سیمینار کا افتتاحی اجلاس صبح ۱۰ بجے شروع ہوا جس میں پروفیسر اقبال کی نظم سچائی ہمیشہ
کی دعا پیش کی گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے سیمینار میں شرکت کے لیے آئے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔
ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے سیمینار کا مقصد بیان کیا جس میں انھوں نے سیمینار کی منظوری
کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اراکین
تنظیم اور دیگر شرکا سے پہلی بار ویڈیو کانفرنس کے ذریعے اردو پروگرام کی
منظوری دینے پر مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر سعید احمد صدر شعبہ اردو
مانو سیمینار کی تھیم پیش کی جس میں انھوں نے "تہذیب اور اس کا تعلق بچوں کی اخلاقی
تربیت" پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ "تہذیب انسان کے ان اعمال پر مشتمل ہے جن
سے انسانی قومیں وجود میں آتی ہیں۔ ہر زبان نے تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدریں
ہمارے لیے چھوڑی ہیں۔"

ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ "تہذیب کی تعمیر میں زبان کا
اہم رول ہوتا ہے اور ہندوستانی تہذیب کے تحفظ میں اردو زبان نے اتحاد و بھائی
چارے کے فروغ کا رول ادا کیا ہے۔"

میں صحافتی اقدار کی پامالی پر اظہار افسوس کیا اور نوجوان نسل کو پیشہ صحافت اختیار کرنے اور صحافتی اقدار کے تحفظ پر زور دیا۔ پروفیسر ایس لمبا گوڑ نے کامیاب سیمینار کے انعقاد پر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی اور ان کے رفقاء کو مبارک باد پیش کی اور دیگر یونیورسٹیز کو بھی اس طرح کی کوشش کرنے پر زور دیا انھوں نے کہا کہ ''اردو ادب سے سماج میں خوش گوار تبدیلی آئی ہے اس طرح کے سیمینار کے انعقاد سے ملک میں تہذیبی اقدار کو پروان چڑھانے میں مدد ملے گی۔ سید مجیب علی ڈائریکٹر کریسنٹ کریم آف اسکولس نظام آباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''اقبال کی شاعری تہذیبی قدروں کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔''

جناب محمد عبدالعزیز ماہر تعلیم و این آر آئی نے کہا ''ملک میں آئے دن ہونے والے شرمسار واقعات اور صنف نازک پر ہونے والے حملے ہماری اقدار کی گراوٹ کا نتیجہ ہیں۔'' جناب طارق انصاری ڈائریکٹر قومی کالج نظام آباد نے کہا کہ ''اردو کے فروغ کے لیے موجودہ حکومت سنجیدہ ہے اور تاکید میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے وہ حکومت سے نمائندگی کریں گے۔'' انھوں نے نظام آباد میں بین الاقوامی اردو سیمینار کے انعقاد کے لیے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی و دیگر کو مبارک باد پیش کی۔ جناب محمد نصیرالدین سابق صدر شعبہ تاریخ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کلچر شائستگی اور نفاست سے پیدا ہوتا ہے یہ معاشرے سے تعلق رکھتا ہے کلچر داخلی پہلو ہے اور تہذیب خارجی پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ تعلیم گاہ دراصل تربیت گاہ ہے لہذا تعلیم کے ذریعے تہذیب اقدار طلباء و طالبات میں پیدا کیے جائیں۔ جناب جمیل نظام آبادی، ڈاکٹر صفدر عسکری پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج آرمور نے بھی سیمینار سے خطاب کیا۔ سیمینار میں پیش کردہ مقالوں پر مبنی سووینیر اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی تیسری تصنیف سائنس نامہ کی رسم اجراء پرنسپل کالج اور مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پرنسپل کالج اور سیمینار کے منتظمین کی جانب سے تمام مہمانوں اور ریاض تنہا، جمیل نظام آبادی، مجید صاحب نیشنل بک ڈپو کو تہنیت پیش کی گئی۔ ظہرانے کے بعد ملک بھر کی مختلف جامعات سے آئے ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ نے مقالے پیش کیے۔ اہم مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر محمد عزیز سہیل، سراج انصاری، جے محمد شفیع، محمد احتشام الحسن، محمد عبدالقدوس، شیخ فہیم اللہ، گل رعنا، ڈاکٹر مسرور سلطانہ، ڈاکٹر حمیرہ، ناہیدہ بیگم آمنہ آفرین

وغیرہ شامل تھے۔

پڑھے گئے مقالوں پر اجلاس کے صدر پروفیسر خالد سعید اور ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نگران سیمینار نے تمام مہمانوں اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار سے اختتامات میں محمد عابد علی، سید حسیب الرحمن، محمد مبین الدین، محمد عبدالبصیر، ڈاکٹر محمد عبدالرفیق بیگ، ابو باشاہ، نظار، مصطفیٰ اور دیگر نے حصہ لیا۔

روزنامہ "راشٹریہ سہارا" حیدرآباد
26/اکتوبر 2014ء

حقوق انسانی کی پاسداری توکل پر یقین کے بغیر ناممکن

کلام انیسؔ میں حقوق انسانی کی پاسداری پر

ڈاکٹر سید تقی عابدی (سینیڈا) کا توسیعی لکچر

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں و اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ان
مرثیوں میں بھی فطری شاعری اپنی تمام تر جلوہ افروزیوں کے ساتھ
خیالات کا اظہار پروفیسر میر ایم تقی خان نے اردو شعر و حکمت اور مہمان آزاد کتاب
حیدرآباد سے زیر اہتمام اردو ہال حیدرآباد میں منعقدہ ڈاکٹر سید تقی عابدی (سینیڈا) کے
توسیعی لکچر "کلام انیسؔ میں انسانی حقوق کی پاسداری" کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب
کے دوران کیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر محمد علی رودینی صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
کاچی گوڑہ حیدرآباد کی قدامت کلام پاک اور نعت ڈاکٹر محمد شوکت علی راشد اپنی ذاتی
پی ڈی یو ایچ ای مہمان آزاد انٹرنیشنل ریڈیو کی سے استقبالیہ کلمات سے اس توسیعی لکچر کا
آغاز ہوا۔

پروفیسر تقی خان نے کہا کہ انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ کو ایک نئی جہت اور زندگی عطا
کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انیسؔ ایک سائنسدان ہوں اور ڈاکٹر تقی عابدی ایک طبیب یکساں
اردو کی چاشنی اور زبان کی نے تمام موضوعات کو اس زبان سے جڑنے کی راہ ہموار کی ہے۔ انھوں
نے ڈاکٹر عابدی کے توسیعی لکچر کو انتہائی معلوماتی اور پرمغز قرار دیا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے
کہا کہ میر انیسؔ کے بیان کردہ اشعار موجودہ حالات میں جب کہ کلام انیسؔ شاعری کے
تمام اصناف پر محیط ہے۔ انھوں نے کہا کہ میر انیسؔ کے مرثیہ ہر سال پچیس ہزار مقامات

پر کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تیس مرتبہ پڑھے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "مرثیہ اردو ادب کی چنتیس فیصد شاعری پر مشتمل ہے۔ اس وجہ سے یہ اردو ادب عالیہ میں شامل ہے۔" انھوں نے کہا کہ "حقوق انسانی کے متعلق انیس کی شاعری میں کئی اشعار ملتے ہیں اور حقوق انسانی کی پاسداری اپنے مقصد پر قائم رہتے ہوئے اس کا حصول ہے۔" ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "انسانی حقوق کی پاسداری توکل پر یقین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔" انھوں نے کہا کہ "حقوق انسانی درحقیقت انسانی قدروں سے مربوط ہے لہٰذا اسے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔" انھوں نے کہا کہ "تصوف بھی انسانی حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ "میر انیس نے پند و نصائح سے گریز کرتے ہوئے راست طور پر حقوق انسانی کی پاسداری کو مختلف انداز سے موضوع بحث بنایا ہے۔" مہمان اعزازی پروفیسر [illegible] نے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق خالص ہوتی ہے وہ مبالغہ آرائی سے پرہیز کرتے ہیں۔ انیس و دبیر اور مرثیہ ان کا خصوصی میدان ہے۔" پروفیسر [illegible] نے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی منفرد تحقیق اور علمی صلاحیتوں کے باعث اپنا [illegible] سے مختلف موضوعات میں [illegible] ایک منفرد محقق کی حیثیت سے اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کرلی ہے۔" [illegible] نے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی کی [illegible] کا اختتام عمل میں آیا۔ اس [illegible] ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پروفیسر ایم ایم تقی خان، پروفیسر بیگ احساس اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف پیش کیا۔ [illegible] نے شکریہ ادا کیا۔ اس توسیعی لکچر میں مہمان [illegible] کے [illegible] پروفیسر [illegible] ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بیٹی قدا اشریف تھی۔

روزنامہ ''رہنمائے دکن''، ''صحافی دکن'' حیدرآباد
30/اکتوبر 2014ء

فلسفۂ شہادت عبد اور معبود کے عشق حقیقی کا ترجمان

''کلام اقبالؔ اور فلسفۂ شہادت'' پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کا خطاب

علامہ اقبالؔ نے اپنے فارسی اور اُردو کلام کے ذریعہ شہادت عظمیٰ کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ رہتی دُنیا تک خاندان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و مرتبت کو انسانیت سے روشناس کروانے کے لیے شاید ہی اپنا ثانی پیدا کر سکے گا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے اُردو ہال حمایت نگر حیدرآباد میں محفل اقبال شناسی کے زیر اہتمام منعقدہ توسیعی لکچر ''کلام اقبالؔ اور فلسفہ شہادت'' سے اپنے خطاب کے دوران کیا۔

قبل ازیں ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی تلاوت کلام پاک اور کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائریکٹر، سی پی ڈی یو ایم ٹی مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے استقبالیہ کلمات سے اس مقصدی لکچر کا آغاز ہوا۔ جناب غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ کنوینر محفل اقبالؔ شناسی و صدر انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے اس لکچر کی صدارت کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ ''اقبالؔ نے اپنے کلام کے ذریعہ شہادت عظمیٰ کا منظر نامہ اُجاگر کرتے ہوئے حق و باطل کے معرکہ میں حق کی برتری کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ساری انسانیت اس سے مستفید ہوتی رہے گی۔ ڈاکٹر عابدی نے فلسفۂ شہادت کو انسانی عظمت کی معراج سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ ''عبد اور معبود کے حقیقی عشق کو اقبالؔ نے فلسفۂ شہادت سے مربوط کرتے ہوئے انسان سازی کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''بی بی مریم کی عظمت صرف

ایک رشتہ کے باعث ہے جب کہ شہزادی کونین کی نسبت چار طرح سے ہے۔"

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "اقبال نے محور عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہوئے فلسفہ عشق کو فلسفہ شہادت سے مربوط کیا ہے۔ انھوں نے عشق حقیقی کے ذریعہ عبد و معبود کے رشتہ میں پیش آنے والی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر شہادت عظمیٰ پر اپنی بات کو تمام کیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "اقبال کو شاعری میں فلسفیانہ نکتوں پر ملکہ حاصل ہے۔ اسی لیے انھوں نے شہادت کو مقصدیت میں کامیابی قرار دیتے ہوئے مقام شبیر کو حقیقت عبدی سے تعبیر کیا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "یہ فلسفہ دراصل شہادت کے اسرار میں ہے اسی لیے اس فلسفہ کو منطق کے ذریعہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ شہادت کو آدمیت اور انسان سازی سے جوڑتے ہوئے شہادت عظمیٰ کو حرارت ایمانی کا نقطۂ ارتکاز قرار دیا۔" انھوں نے کہا کہ "شہادت حسین کے بیان کے ذریعہ اقبال نے نفس کی پاکیزگی اور آزادی کی حیثیت سے مظاہر کو پیش کیا ہے۔ اسی لیے فلسفہ شہادت منزلت شہید [illegible] ہے۔" مہمان اعزازی پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، سابق وائس پرنسپل صدر شعبہ [illegible] نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے لکچر پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر عابدی عشق کے تقاضوں کی بھی آبیاری کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے فکر انگیز بیانات کے ذریعہ پابندگی جسم و روح کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے نانا سے محبت سے لے کر ایک لمحے تک عبادت میں مصروف رہنا اور نماز کا پابند ہونا ثابت کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے سجدے میں سر کٹاتے ہوئے رتبہ تک پہنچنے کی حقیقت کا ذکر کیا ہے۔"

صدر انجمن جناب [illegible] نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر قبال شمیم [illegible] ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کے تحقیقی مضامین کے مجموعہ سے پہلا مضمون [illegible] انھوں نے کہا کہ "ڈاکٹر قبال شمیم نے اپنے مختلف مضامین میں خصوصی طور پر [illegible] کی ہے۔ انھوں نے [illegible] کے ذریعہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے [illegible]

نے کہا کہ ''محفلِ اقبال شناسی کی خصوصی نشستوں کی شہرت ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے بعد اب ویب سائٹ کی بدولت دُنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔''

اس موقع پر ڈاکٹر یوسف اعظمی، ڈاکٹر رؤف خیر اور دیگر شرکاء نے ڈاکٹر سید تقی عابدی سے استفسارات بھی کیے۔ کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائریکٹر، سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے کلمات تشکر پر اس مقصدی لکچر کا اختتام عمل میں آیا جس میں ممتاز ادباء، شعراء، طلبا اور اسکالرس کے علاوہ خواتین و حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

J. S. Iftkekhar
Telangana Today
January 05, 2020

A doctor with incurable passion

Dr Taqi Abedi's love for Urdu literature knows no bounds and can be seen in the 62 books he has written so far

He is a doctor alright but in him dwells a writer. After a busy day in the hospital, he retires into his study during night and loses all track of time. A kind of unwinding for him. That's Dr Taqi Hassan Abedi for you. A physician whose true calling is writing. With him medicine and literature seem to share a kind of synergy. There is no conflict of interest between his profession and passion. In fact, being a writer has helped Dr Abedi in his work as a physician.

What does it mean to be a doctor and a writer at the same time? "Reading and writing have broadened my perspective of life," says the Hyderabad-born Canadian physician. Love for literature made him more empathetic and caring towards his patients. The most surprising thing is that this doctor-writer has done more for the promotion and propagation of Urdu than any university professor. The sheer number of books written by him — 62 till date — is a pointer to his infatuation with Urdu literature.

Diagnosing ailments of others comes easy to him but his own malady eludes a remedy. He is a doctor with an incurable passion for Urdu. No, it's not a case of physician heal thyself. He is smitten with the love of Urdu poetry. And his obsession grows by the day. Dr Abedi loves to introduce himself as 'Peshe se tabib Urdu se vakeel aur adab ka mareez'. The last two epithets stand out like he

porcupine's quills. He never tires of championing the cause of Urdu nor hides his maddening love with literature. While living in dayaar-e-gair (outside the sub-continent), he has done yeomen service to Urdu by introducing its well known as also little known writers to the world. His scholarly works on Mirza Ghalib, Allama Iqbal, Mir Anees, Faiz Ahmed Faiz, Altaf Hussain Hali, Amjad, Sayeed Shahidi are matchless. Besides adding a critical body of work to Urdu literature, they offer new vistas of understanding about these poets

A man of many parts – doctor, poet, critic, author – all rolled into one, Dr Abedi has bagged several awards, including the 'Life Time Achievement award' from the Doha-based Urdu language literary organisation, Majlis-e-Frogh-e-Urdu Adab. He has also secured the Fakhre-e-Urdu International award, Urdu Markaz International, Los Angles, Writer of the year award, Eastern News Canada, Award for Distinguished services and contribution to Urdu literature, Aligarh University Alumni, New York, Allama Iqbal Award of Excellence, Canada, besides awards from Sahitiya Academy, UP (Sahitya Akademi???).

Having obtained his Bachelor's Degree in medicine from Osmania University, Dr Abedi served in Iran, England, US and is presently working in a hospital at Ontario, Canada. His dalliance with Urdu poetry began right from his student days and it has taken him to different parts of the world where he delivers talks to packed audience. Early in life he was seduced by books and his fascination continues. His library has a staggering 14,000 books, a good number in English and Persian.

Dr Abedi has a great affinity towards Ghalib and Iqbal and is inspired by the latter's philosophy of action, courage and self-reliance. He says:

Khud roshni phailegee muhabbat ki zameen par
Iqbal aur Rumi ke kutch ashaar suna do

He is known more as an expert in Iqbahat and Ghalibiat besides being an authority on Anees, Dabeer and Faiz While his major work comprises critical analysis of these poets, he has also written two books of poetry Gulshan-e-Roya and Josh-e-Mawadat Sample some of his verses

Sahil pe khade ho ke tamasha nahin karte
Hum doobti kashti ka nazara nahin karte
Toofan se lada dete hain jo apna safeena
Sahil ko kabhi apna kinara nahin karte

Sublimity of thought is central to his poetry He expresses his ideas in the poignant ways of Anees and sometimes adopts the philosophical tone of Iqbal The following verses mirror the realities of the present times where marauders masquerade as honourable men

Aaj haivan-sifat pahne hain insani naqab
Aaj har haath main rehti hai tamaddun ki kitab
Bhatke huye manzil pe pahunch jayenge khud hi
Raston se agar rahnumaon ko hata do
Logon main fakhat ayeb nazar aate hain jisko
Is ko bhi kabhi ayna khane main hatha do

Dr Abedi's nazm Husn-e-Mutlaq is one of his most acclaimed poems Characterised by sensual imagery, it paints a vivid portrait of beauty in all its dimensions Here, the poet tries to see beauty in everything and from different angles A mesmerising spell takes hold as one reads this poem.

Husn se dekho to har cheez haseen hoti hai
Husn se hat kar har ek cheez asar khoti hai
Husn ahsas main rehta hai jawani mam nahin
Nasha hai khoon main angoor ke pani mam nahin
Husn jab jheel main pahta hai kamal hanta hai
Husn jab sher mam dhalta hai ghazal hanta hai

Dr Abedi has penned many nazms in praise of the Prophet of Islam A popular nazm which can be heard at religious gatherings is

Woh jis ke liye mehfil-e-kownain sajee hai

Firdaus-e-hareen jis ke waseelay se banee hai
Woh Hashmee Makkee Madanee al Arabee hai
Woh mera Nabi mera Nabi mera Nabi hai
Woh mera Nabi hai

Dr Abedi has done encyclopaedic work on Mir Anees, Mirza Dabeer, Mirza Ghalib, Altaf Hussain Hali, Allama Iqbal and Faiz Ahmed Faiz. He has thrown light on many undisclosed aspects of these master bards. His books Tajzia-e-Yadgar Anees, Rubayat-e-Dabeer, Kulliyat-e-Ghalib, Inshaallha Khan Insha, Faiz Fahmi, Faiz Shinasi, Iqbal Kay Irfani Zaweye and Choon Marg Ayed - are a must-read for research scholars.

In the last mentioned book, Dr Abedi makes a mention of various ailments that afflicted Allama Iqbal and impacted his life. These details he has extracted from the letters written by the 'Poet of East' himself. The doctor in him comes to the aid of Dr Abedi in explaining the diseases.

A strong votary of Urdu, Dr Abedi feels it is the best remedy to unite hearts in the present troubled times. No other Indian language has the capacity to integrate people like Urdu since it is an embodiment of composite cultures. "Urdu is one of the several languages of Muslims but the language itself is not Muslim," he says

Urdu is definitely spoken by Muslims but it is more Hindustani in nature, embracing diverse traditions. Therefore, its preservation and propagation is the responsibility of everyone and not just Muslims alone. Quoting TS Eliot, he says any language which has rich classical literature wouldn't perish. If Urdu dies, it would be an irreparable loss for the country as a whole.

Dr Abedi refers to the beautiful way Bihari Lal Mushtaq, a student of Mirza Ghalib, captured the syncretic culture in this couplet. What is unique about this little known verse is that the numerical value (Abjad notations) of both Jamuna and Zam-Zam are the same 94.

Hum hain Hindu, tum Musalman donon baham ek hain
Jis tarha aadad Jamuna wo Zam-Zam ek hain

(I'm a Hindu, you a Muslim, together we are one
Like the numerical of Jamuna and Zam Zam are one)

For Dr Abedi, Urdu is not just a lingua franca but a beautiful flower vase representing different faiths. It has the mohabbat (love) of Hyderabad in it, nazakat (elegance) of Lucknow, saqafat (culture) of Delhi, sarawat (embellishment) of Agra, saadat (fortune) of Sindh, zakawat (knowledge) of Bengal and latafat (tenderness) of Kashmir.

Zafar Hyderi
Sri Nagar
"New Hope" V.:3, No.:6
Nov-Dec-2002

Tajzia Yadgar-e-Anis

'Authors', remarked Schopenhauer, 'may be divided into falling stars, planets and fixed stars: the first have a momentary effect: the second a much longer duration; and the third are unchangeable possess their own light, and shine for all time'. In my individual opinion, Dr. Syed Taqi Abedi, by virtue of his work, deserves to be placed in the third category of authors as defined by Schopenhauer.

Dr. Abedi, the learned author of the book "Tajzia Yadgar-e-Anis" deserves genuine applause on this latest venture of his. Judging by the subject mater and the range it covers, this book ought to have taken a decade or so in its preparation and arrangement of the material. But it was for the tremendous labour of the author that, within a couple of years, it is shaped out in the form of a book.

The fact is that in the past too, attempts were made to present the works of Mir Anis in the sub-continent. Allama Shibli Nomani's venture "Muazana Anis-o-Dabeer", can be broached as the best example in this direction, which appeared some 100 years ago. In contrast to Shibli's book, which dealt with numerous "Marsias" of Mir Anis, Dr. Abedi's entire book is based on only one 'Marsia' of Mir Anis,

Jab Qata Ki Masafat-e-Shab Aftab Ne
(The sun had run his journey o'er the night),

In which the author has analysed and discussed about one hundred qualities and beauties of this 'Marsia' Dr Abedi, indeed, is the first person who has analysed one single "Marsia" of Mir Anis with such creativity. It is, beyond doubt, a great achievement which is unmatched and unrivalled. Unique as this book is, it is supplemented by another work of paramount importance. It is translation of the 'Marsia' in English by David Matthews and in Arabic by Maulana Syed Ali Naqvi.

The book is based on 14 chapters. Three chapters i.e., 11th, 12th and 13th are of extraordinary importance. In these chapters, the author has thoroughly analysed the fore mentioned "Marsia" from the book 'Sheokar e Anis' by Prof. Masood Hasan Razvi Adeeb. Prof. Razvi's book has 197 sixtams and all the sixtams have been poetically and creatively analysed and incorporated in the book. Moreover, Dr. Abedi has arrived at his own theories. But his most remarkable contribution is the [illegible] because no term as such was known [illegible].

It will not be out of place to mention here that in addition to the analysis of 197 sixtams of the Marsia, the book provides a detailed study of the life of Mir Anis in chapter one. According to the author, the term 'Khadim e Sokhan' has been used for two [illegible] Mir Taqi Mir and Mir Anis. The former used [illegible] expression whereas the latter coined Mir's [illegible] expression of Imam Hussain A.S. [illegible] testimony that Mir Anis has [illegible] poetry and therefore he was [illegible] Khadim e Sokhan.

(In Shabbir's adoration, mine is the fifth generation)

The real greatness of the poetry of Mir Anis lies in his mastery of language He enjoyed such a perfect command over the language that he very easily couched into words not only the profoundest thoughts but even the sublimest of feelings The depth of his thought, coupled with his limitless capacity to evoke feelings, indeed lent such a dignity to his poetry which no other Urdu poet has so far been able to create.

Mir Anis has the power of expressing one and the same thing in manifold ways He was wellversed in the art of expanding and compressing a passage. He had such a rich and inexhaustible stock of words which no other poet of Urdu, nor probably any poet in any other language, appears to have possessed The poetry of Anis is conspicuously marked by the characteristics of simplicity, elegance and eloquence These qualities are not only abundantly clear in his work but are the very essence of his poetry. So glaring are these characteristics that they do not escape the attention of a reader, provided he or she has a taste for culture.

Besides, the poetry of Mir Anis, Dr Abedi has also tried to trace the minute details of the life of Anis like his appearance, costume, punctuality, sensitivity, behaviour and habits, first and last "Majlis" (sermons), prayers, illness and death. The last few years of Anis' life were disturbed by the turbulent political events During his visit to Azimabad, he fell ill. When illness took a serious turn, he rushed back to Lucknow. He was ill for about a month and, at the age of 73, he breathed his last in 1874 A. D. The following couplet of Mirza Dabeer reveals not only the

exact year of his death, but it is also the best tribute to the person who had been his life long rival

"Aasman Bay Mah-e-Kamil
Sidrah Bay Rooh-ul-Ameen
Toor-e-Seena Bay Kaleem-ul-lah
Mimber Bay Anis"

(Poor is the sky without the full moon,
And empyrean without Gabriel is meaningless,
Nothing is the Mount Toor, without Moses,
And pulpit without Anis is worthless)

Further, there is a chapter (2), which deals with some of the eminent personalities having had a direct or indirect relationship with 'Marsia' and Mir Anis. They include Ghalib, Nasik, Dabeer, Azad, Hali, Shibli, Chakbast, Josh etc. and contemporary figures like Prof. Akbar Hyderi, Prof. Gopi Chand Narang, Dr. Nasser Mahmood, Dr. Hilal Naqvi and many more. Dr. Taqi Abedi has discussed and presented everything in the most objective way.

Prof. Akbar Hyderi, has written the foreword of the book. According to him Dr. Abedi has done a most just act to the meaning of the words, expressions, phrases, metaphors and similes of the Marsia - an art of creativity which is beyond the reach of others. In this connection he says:

Jauhari Bhi is Tarha Moati Piro Sakta Nahin

Lafzia Nakgar-e-Anis is an actual work to Anis the analysis is the 'Marsia' of Mir Anis, nothing short of a miracle. Dr. Abedi has accomplished this task most successfully and has endeavored to introduce the poet in its most interesting manner. In fact, the research and learned author of the book has left no stone unturned to

make it lucid, analytic and upto date. According to the author, it is unfortunate that when the world is going to celebrate the 200th birth anniversary of Mir Anis, much work has not been done on the art of Mir Anis. There are certain areas of the poetry of Anis, which are still to be unearthed.

But, Dr. Abedi's venture is doubtlessly a research work of high quality. It is indeed a work of exceptional merit. It is not only a valuable contribution to Urdu literature but an innovation, a model. Dr. Abedi has authored many books, which include Shaheed' (1982), 'Josh-e-Muwaddat' (1999), 'Ramooz-e-Shairi' (2000), 'Iqbal Ke Irfani Zavai'(2001) and many more. Presently he is working on yet another project on Mir Anis.

Born on March 1, 1952 at Delhi, he did his MBBS from Hyderabad and later MS from Britain. Dr. Abedi is a widely travelled person. He has visited many American and European countries. Presently, he is residing at Toronto (Canada). As already mentioned by profession he is a doctor, with an excellent taste for Urdu literature. He is also gifted with the talent of composing poetry.

As far as the publication of the book is concerned, it is in itself a unique publication. It has 816 multi-coloured pages printed on imported art paper. The size of the book is 29 x 23 Cms. weighting about 3 Kgs. The matter of each page of the book is enclosed in a multi-coloured border resembling Iranian Paper Machie. The price of the book is Rs. 750/-, which is quite reasonable considering the quality of its printing. In other words the book has made Dr. Taqi Abedi immortal.

Intizar Hussain
Daily Dawn (Karachi)
February 29, 2004

Three research books on Dabir

In my previous column, I had complained that since long Mirza Dabir's marsiya were not available to the readers and that one had to be a researcher to have access to them. Just after that I received three volumes consisting of a variety from Dabir's writing- "Mujtahid-i-nazm Mirza Dabir" "Silk-i-salam-i-abedi" and "Lala-i-mehr"

These Volumes, which have been published by Izhar sons, Urdu Bazar, Lahore have been compiled after much research by Dr Syed Taqi Abedi. The inaugural ceremony, where these volumes were presented, was held last week in a befitting manner. A number of Scholars and critics paid homage to the great marsiya writer. More interesting was the paper read by Aqil Rubi who had tried to judge Anis and Dabir's Marsiya in the Background of the epics by Homer and Virgil. He picked up some observations from Anis and Dabir on the one hand and from Homer's Iliad on the other, and showed how Similar was their depiction of various situations.

The chief guest was Syed Taqi Abedi, who had reached here with his research work on Dabir and was on his way to Delhi, where the Sahitya Academy has chalked out an ambitious Programme to celebrate the combined 200th Death anniversary of Anis and Dabir.

Dr Taqi Abedi's threads extend to us as a research Scholar more particularly with reference to his researches

study of one selected marsiya of Anis presented in a Well-decorated volume. But, perhaps, he is more devoted to Dabir. He seems bent upon digging out all that Dabir has written in verse as well as prose. He intends to present them in a Series of 22 volumes. The above-mentioned three volumes may be seen as part of that series

"Mujtahid-i-Nazm Mirza Dabir" is the introductory volume where we find the outcome of Taqi abedi's research on the life and personality of the poet this biographical account carries with it a selection from Dabir's writing The other volume "Silk-i-salam-i-Dabir" is a collection of his salams. The third, "Tala-i-mehr" introduces us to Dabir's experimentations. It is a collection of marsiyay and salams in which he has experimented with what is called "Ghair Manqoot"

But I wonder why the esteemed scholar has chosen to start this series with volumes containing Dabir Salams and experimental verse These volumes deserved to be published in the concluding volumes. What we want in the first instance are the marsiyay, which is Dabir's main work. This may not be taken as an attempt to minimize the importance and worth of Dabi's salams and experimental verse. It is just to show that our priorities should be correct.

On the basis of his research, Dr. Abedi has made some astounding assertions in favour of Dabir. His first assertions is that Dabir is the most prolific Urdu poet with 120,000 couplets to his credit. No other poet in Urdu has been able to do so. In the field of marsiya, too, he is most prolific with 675 pieces to his credit. It is a record, leaving all other marsiya writers far behind

Dr Abedi has also claimed that Dabir has to his 1334 rubaiyat, a number unsurpassed by any other poet

Speaking in this vein, he has used a number of superlatives for Dabir But the most astounding one is in respect of the number of words used by him Dr Abedi has asserted that of all the Urdu poets, Dabir has used the largest number of words in his marsiyay Our research scholars had given this credit to Nazir Akbarabadi. Dr Abedi has refuted this claim.

The same kind of claim he has made in respect of "Ghair Manqoot" or undotted verse Insha Allah Khan is supposed to be the most prolific in this kind of experimentation In prose, too, he made this experimentation His long Short story ' Silk-i Gauhar", has been written in undotted prose But Dr Abedi Claims that Dabir has surpassed Insha in this field

Dr. Abedi has also talked about his prose writings Which are all in Persian He has in particular referred to "Risala-i-Dabir". It is a sort of critical writing Here, he is seen discussing critically the genre of the mars'a, keeping in view its form as well as its subject matter

The release of three volumes on Dabir on the occasion of his 200th birth anniversary is a good start Let us hope that the volumes containing his marsiya will soon follow

Intizar Husain
Daily Dawn (Karachi)
April 17, 2005

A Tribute to Dabir

A Research scholar with three newly compiled volumes of Mirza Dabir arrived last week in Lahore. He was warmly welcomed and was much lauded for this valuable work in the inaugural function of these volumes The next day he proceeded to Lucknow via Delhi for the purposes of the research in hand.

This was his second visit after a lapse of about one year. The three volumes he had brought w'th him in the last visit was the first instalment of the long series of Dabir's volumes he has planned to bring out The scholar is Syed Taqi Abedi, who professionally is a medical practitioner, living in Canada and is busy in his research work on Dabir. His deep involvement in this work of research may well be read as a sign of hope for Dabir, who since long was consigned to oblivion. To be more explicit, should we now expect a revival of Dabir? Perhaps yes Perhaps the process has begun.

This history of literature offers instances of poets, who after remaining for long in oblivion tooth and nail for the clamed attracted attention of some scholar possessed with a searching eye. He retrieved all the verses lost to us and re-interpreted them in accordance with the sensibility of his times. And lo, the poet stands revived. Perhaps Dabir in his recession to oblivion was waiting for some such scholar. He has at last found one such soul

But how did Dabir recede into oblivion? He at one time dominated the scene of marsiya and was held in high esteem as a great master in the field of marsiya writing. He was at his peak, as a marsiya writer when Mir Anis made his appearance. His meteoric rise in the field soon seemed posing a challenge to Dabir's authority in marsiya writing.

The two poets were polite enough to restrain themselves from challenging each other openly. But their disciples and devotees lacked that kind of restraint. They soon were divided into two camps better, known as 'Dabiriyat' and 'Anisiyat', each ready to fight with tooth and nail for the claimed superior position of his master.

At a later stage, Maulana Shibli's book Mawazna-e-Anis-o-Dabir imparted a literary dimension to this fight. Maulana though not a Lucknavi, behaved on this occasion typically like Lucknavis, who had been very fond of cock fighting. His comparative study of the two poets gives the impression of being a cock-fight.

But we should not be oblivious to the positive contribution made by Shibli's Mawazna. It imparted a literary respectability to marsiya, which hitherto was treated as the kind of verse meant to serve solely the purposes of Majlis-e-Aza. By discussing it according to the laws laid down for judging poetry, Shibli got it released from the confines of Imambara and elevated it to the level where it is reckoned among accepted forms of poetry. But unfortunately he did it at the cost of Dabir. Indeed Mawazna did not go unchallenged.

Dabir did have his defenders. But they were hardly a match to Maulana Shibli who was an acknowledged scholar and a literary authority. Hardly any of the defender's

had the ability to make a critical study of Dabir's marsiyas and determine their literary worth. In the absence of such a study, Shibli's judgments on Dabir were readily accepted in the literary circles. What added to this situation was the non-availability of Dabir's works. Syed Taqi Abedi holds his relatives and disciples responsible for this as none of them cared for the publication of his works Consequently, Dabir gradually receded into oblivion.

It is only in recent years that some scholars interested in marsiya have paid attention do Dabir. Foremost among them is Syed Taqi Abedi, who is engaged more seriously in his research on Dabir. He in fact had started with his research on Mir Anis. He concentrated his research on one of his marsiyas and presented it a ong with his research in a deluxe volume. But after that he solely devoted himself to the research on Dabir. As stated above, the three volumes published last year were the first instalment of the proposed long series consisting of Dabir's writings The three volumes brought out now are the second instalment These three volumes are:

"Masnaviat i Dabir"

"Abwabul Masaib"

"Mushaf-i-Farsi"

All these three volumes, like the previous ones, consist of Dabir's miscellaneous writing other than marsiyas, which have been dug out after much research. The first is a collection of his newly discovered masnavis written on different religious themes On the basis of these masnavis Dabir, claims Abedi, deserves to be counted among distinguished masnavi writers of Urdu.

The next volume "Abwabul Masaib" is prose writing of Dabir, which has been unearthed after much research. Here, is a narration of the tragic events of Karbala under the title quoted above.

The third is a collection of his verses in Persian

These volumes will be followed by a series of volumes consisting of marsiyas, which, according to the research of Taqi Abedi, are 675 in number. His number also includes his unpublished marsiyas.

Khalid Hasan
Daily "Times" US Based
March 04, 2007

Remembering Iqbal in Washington

Iqbal will have been dead exactly 70 Years this year, but one tends to think of him in terms of the immediate rather than the distant. And he continues to be remembered with affection. But affection tinged with a sense of awe because of the tremendous power and sweep of his genius.

Faiz called him the "sweet-voiced wanderer who transformed wildernesses into living cities and abandoned taverns into halls of good cheer". Whos "song lives. L ke a lamp that the blowing wind cannot put out, like a candle that lives on beyond the morning.

It was here in Washington the other day that Iqbal's memory was invoked at a small gathering. Courtesy Abul Hasan Naghmi. Radio Pakistan Lahore's once famous Bhai Jan. He had taken advantage of the presence in town of Syed Taqi Abedi, an Indian-Canadian physician, who has written a book on Iqbal's ailments based on his research, the poet's letters being the primary source.

Iqbal was not a well man. Especially in his last years. Over the course of his life he suffered from one thing or another. Ironically, his genes were good though because there was longevity in his family. According to Dr. Abedi, Iqbal should have lived at least for another 20 years. And had Iqbal been born in the latter part of the last century than in the latter part of the one before, modern medicine would

not have let him die seven months short of his 61st birthday.

One thing is clear Iqbal did not like doctors and, as he writes in one of his letters, he is like a child who hates to drink the bitter medicines that are given to him He had little faith in allopathic medicine and much preferred the herbal and traditional kind. He was a great believer in the efficacy of what the famous Hakim Nabeena of Delhi, under whose treatment he remained for many years prescribed he also had himself seen by the celebrated Hakim Ajmal Khan.

But Iqbal's various ailments were beyond the ken of traditional healers and, as Dr Abeer shows, for over 30 years those who attended on him included Dr Mathura Das of Lahore, Dr Abdul Basit of Bhopal, Dr Muhammad Yusuf, Dr Abdul Qayyum, Dr Jamiat Singh and Lahore's famous German Physician Dr Seltzer

Dr Abeer has gone through 1,450 of Iqbal's letters and found 251 of them descriptive of the various diseases and ailments that assailed him for a good part of his life Especially, the final pain-filled years Iqbal was a great believer in the development of traditional Islamic medicine and hoped that it would undergo some revolutionary change

Dr Abedi, who has practiced medicine for 30 years is wonderstruck at the calm and confidence with which Iqbal received news of the presence of a tumour in his chest after an X-ray examination performed by on Dr Dick, a Lahore radiologist. A few hours after Nazir asking him to have a word with Hakim Nabeena Two hours before his death he refused to take an opium based painkiller saying

he did not wish to die in a half conscious or unconscious state. Only a few hours before the end, Iqbal spent time discussing with the woman principal of an Islamic school in Lahore the best way to bring the message of the Quran to her students.

A list of Iqbal's ailments worked out by Dr. Abedi makes chilling reading. A lesser man would have given up and succumbed to them much earlier. He had heart and renal disease, gout, immature cataract, liver congestion, bronchial asthma, shortness of breath, laryngitis and oral problems that dogged him all his life. In the last two years, his voice kept getting progressively hoarse. And yet this titan packed more into his 60 years than it would take others centuries to even comprehend, much less express in undying verse and prose.

Dr. Abedi is indeed a remarkable man. Married to an Iranian, who does not speak a word of Urdu, as don't their children, he converses with them in Farsi, while he writes his books of which there are many, in Urdu. Before Dr. Abedi spoke about Iqbal, the host Naghm recalled that 35 years ago when he came to Washington, there weren't many in this town who were interested in Urdu. But an entire generation of Pakistanis had grown up here since. Which was divided into two groups. One understood a bit of Urdu, while the other could speak Urdu but was unable to read it. They wrote Urdu in Roman letters.

If the practice grew, as it is likely to, we would like Turkey where thousands of books written in the Arabic script lie in libraries with no readers. To that can add that some of the more with-it of our Pakistan youth not only cannot read Urdu but are quite prove it. I cannot help

quoting Faiz, who once said that you do not know your own language. You will remain ignorant of other languages too.

Dr. Abedi said Urdu is becoming an "aural language" whereas it should be a language of the eyes. There are 600 million people in the world who understand Urdu but the Urdu script is slowly dying. India, for instance. I can narrate from my own experience that in the entire city of Lucknow, I could find only one sign in Urdu and that too was a crumbling one which said that the place where it hung use to be the site of the famous Maktaba Nawal Kishore. I looked for a bookshop that would sell Urdu books but all I found was a small place with a couple of hundred used books that were coming apart.

Dr. Abedi, to whom I return, described himself "a physician by profession and a patient of the Urdu language by choice." He said on no other poet has more books been written than on Iqbal. He listed the number at 4,500, compared with Ghalib (1,000) Mir (500) and Anis (228). He also said that the largest number of commentaries on the Quran were to be found in Urdu.

Dr. Abedi said Iqbal smoked a hukka for years at least and in Europe he must have smoked cigarettes. He wasn't much for exercise and preferred to recline on a bed to read and converse. He was simple in his eating habits and would talk whatever was brought to him. Once, the story goes, someone said to him, "Dr. Sahib, whenever I've had the pleasure of breaking bread with you, I've always found cauliflower and meat. That must be your favourite dish." Not really, "Iqbal replied, "but that is all Al-Razi knows how to cook." What a man!

Intizar Hussain
Daily Dawn (Karachi)
February 15, 2006

In search of Roop Kunwar Kumari

I have before me a collection of Munqabats and marsiyas composed by Roop Kunvar Kumari. It may be seen as a new kind of Bhakti poetry where two religious sensibilities appear mixing in each other the way sugar dissolves in the milk.

But who was Roop Kunvar Kumari. Did she really exist or is she just a figment of popular imagination nurtured by the Indo-Muslim culture.

This devotional poetry came as a pleasant surprise for Muharram mourners, who were all praise for Roop Kumari. The circles of marsiya writers felt intrigued wondering who this Hindu lady is. So many among them just refused to believe that there was ever such a soul. Late Nasim Amrohvi was foremost in expressing his disbelief in this respect. When his attention was drawn to a marsiya believed to have been written by her, he promptly replied that Roop Kumari is an imaginary being while the marsiya referred to has in fact been written by her so-called ustad Fazal Rasool.

But the researchers in the field of marsiya were not going to be misled by such verdicts based more on whims than on any convincing proof. They remained seriously engaged in their research, determined to solve the mystery of this controversial figure. Their researches bore fruit as they succeeded, through a gradual process, in finding

proofs of the actual existence of such a Hindu female marsiya writer.

And now Dr Syed Taqi Hassan Abedi has come out with the fruitful results of his own research He tells us about the hand written manuscripts of Roop Kumari's marsiyas and Munajabats and allied papers which he has dug out from his own store of books and manuscripts He talks of a manuscript containing Roop Kumari's five marsiyas along with a few salams, qitas, and mukhammas, most of whom, say about 60 per cent written in her own hand-writing And he adds that a few of these writings bear the evidence of correction made by Fazal Rasool In addition these researched papers include a number of letters written by Fazal Rasool On the basis of these newly dug out manuscripts, Dr Taqi has brought out a collection of Roop Kumari's devotional verse Along with her marsiyas and munajabats, we find here a brief biographical account of her a survey of her works, and a discussion with reference to the writings of scholars in this respect

Dr Taqi has expressed his unhappiness at the attitude of those marsiya writers and scholars who helped in creating an atmosphere of doubt about the physical existence of Roop Kumari He in particular has condemned the attitude of late Nesar Ahmed, who, according to him, passed his verdict without care to make some enquiry before giving air to his disbelief

If Roop Kumari provoked a sense of curiosity and suspicion in the circle of marsiya writers and scholars, it was perhaps for the reason that she was perhaps the first Hindu female attempting to write marsiya and expressing her ardent devotion to Hazrat Ali and Imam Hussain.

otherwise we have in Urdu a long tradition of marsiyas written by Hindu poets. We can also trace this trend in Punjabi, which provides one such example in the form of a bara-masa written with reference to Karbala by Mukhi Ram.

Kalidas Gupta Raza, who himself made some attempts in the form of marsiya, had tried to compile an account of Hindu marsiya writers. I have before me Dr Zamir Akhtar's "Nawadirat-i-marsiya Nigari" where he talks of a fine marsiya, Dayan-i-Sham Main Jab Qaidiyon Kaun Sham Hui written by Raja Chandu Lal Shadan. Mirza Jafar Husain in his book Qadeem Lucknow ki Akhri Bahar tells us about two Hindu taziadars Munshi Sarjoo Prashad Nigam and Ramji Mal, who had themselves composed marsiyas to be recited on the occasion of their tazia procession.

But Roop Kumari appears standing distinguished from all these Hindu marsiya writers. And it is not simply because of her being a female, which provoked a curiosity mixed with a sense of attraction about her. It is rather the peculiarity of her devotion to the personalities of Hazrat Ali and Imam Husain and its expression in an individualities way, which imparts to her marsiyas a flavour very different from the one we find in Muslim poets' marsiyas and in her co-religionists' marsiyas. This peculiarity may be defined in terms of her Bhakti sensibility, which she has inherited from her own religious tradition

Hindu writers in general when writing marsiya try to identify themselves completely with that mode of devotional feeling and its allied expression which is associated with marsiya and which bears the stamp of Arab

Iranian Islamic culture with a mix of Indian sensibility. Roop Kumari is seen disowning her Hindu beliefs which a Hindu marsiya writer will not like to do. But, at the same time, she stubbornly sticks to what she has received and absorbed on a cultural level from her Hindu tradition. So she sees no harm in expressing her devotion to Imams in terms borrowed from her Hindu background. Rather she relishes in calling Hazrat Ali a rishi or a devotee or sanyasi maharaj and saying Najat Hamaray Liyay Hardwar-aur-Kashi Hai.

So we see in her marsiyas an intermixture of two cultural idioms pointing out to an intermixture of two cultural sensibilities.

Dr. Qaisar Abbas
University of North Texas,
U.S.

"Faiz Fehmi" Documenting The Legacy of Faiz and his work

Title: Faiz Fehmi, Tehqiq o Tangeed
Editor: Dr. Syed Taqi Abedi
Year of Publication: 2011
Pages: 1,403
Publisher: Multimedia Affairs, Lahore

Recently I had a chance to meet the last survivor of the famous Rawalpindi Conspiracy Case Zafarullah Poshni in Dallas who was also incarcerated with Faiz Ahmed Faiz. Recollecting the memories of the days he spent with Faiz in confinement, he told me that while most of the inmates showed their psychological rage and stress at times, Faiz was always respectable to others and never lost his temper. The only time Faiz looked miserable, he said "silently smoking cigarette, walking back and forth" when he was creating poetry.

Zafarullah Poshni was part of this extraordinary group of individuals who always cared for the miseries of common folks and struggled peacefully for their rights. Dr. Syed Taqi Abedi has documented history and life of this legendary poet of the 20th century in his new book "Faiz Fehmi."

In launching the book in Canada recently, Dr. Gopi Chand Narang rightfully declared the book as Magnum-Opus. Published by Multi Media Affairs in Lahore, the

book is an astonishing anthology of articles, research papers, interviews, personal accounts of his friends and family members, photographs and illustrations on the life and work of Faiz. A voluminous work of over 1400 pages with color printing and the fine paper quality adorned with a leather cover, the book so passes all other publications on Faiz in its quality, content and finesse.

Although some of the articles are reproduction of published materials, most are new, based on contemporary topics. In fact, the editor claims in the preface: "This document has been published to meet the demands of the 21st century so we can view his life and work from every possible perspective. We know that so much has been written on the poet and his life but we are also aware that there is a lot to write on the finest of his verse and the narrative of his prose." It is in this context that the book attempts to fill this huge gap.

The editor also tried to keep up with the quality saying: "We have consciously avoided 'cut-and-paste' articles using published materials without changes as we did not want to demean these writers."

The anthology includes articles / studies of Faiz literature from across the world. The list includes Gopi Chand Narang, Syed Mujtaba Hussain, Kaleemuddin Ahmed, Mirza Khalil Beg, Salder Meer Shirin Rabaai Shamsurrehman Faroqui, Alee Ahmed Sabzwari, Shahid Hafiz Hagan, Ahmed Nadim Qasmi, Syed Sajjad Zaheer, Zaid Hasan, Zafar Iqbal, Abu Lais Siddiqi, Waziri Abdul Muhammad Ali Siddiqi, Umra Fahim, Hamat Rais Mojaddi Hasan, Nasar Ansari, Kamla Hasan, Intizar Hussain, Syed Ghulam Mustafa Tabassum, Mirza Rasa, Ali Abbas

Hussaini, Indar Kumar Gajral, Krishn Chandr, Fariqh Bukhari, Syed Sibte Hasan, Iftikhar Arif, Ali Sardar Jafri, Qudratullah Shahab, Knahiya Laal Kapur, Mirza Zafarul Hasan, I.A Rehman, Noon Meem Rashid, Hilal Naqvi, Sadiq Naqvi, Khwaja Ahmed Abbas, Mushtaq Ahmed Yousfi, Abullah Malik, Fateh Mohammad Malik and lot more.

Articles of several English and Russian writers such as George Fisher, Alexander Surikov, Lyudmala Vasilyeva and world leaders like Yasser Arafat embellish the book. A unique section includes personal accounts of family members of Faiz include articles of his wife Alice Faiz, two daughters, Saleema Hashmi and Muneeza Hashmi, and his son in-law Shoab Hashmi.

The book also includes five articles by Faiz himself on a variety of topics such as the progressive literary ideology, Josh as a revolutionary poet, films and culture, Beirut under the Israeli attack and his speech at the Lenin Peace Award ceremony.

Of the 162 articles on the poet, about one third (42) are written by the editor himself, Dr. Taqi Abedi. Contentwise, the book has about 30 articles on the poet's life, interviews and personal accounts of his friends while 132 articles on critical reviews of his poetry and work.

Zafarullah Poshni is also represented in the book through his article "Faiz or Zindan" (Faiz and Prison). He ends the article with glowing tributes to Faiz and Sajjad Zaheer: "I learned a lot from both of these and the knowledge I gained from them during confinement made the rest of my life a real ecstasy and delight."

Faiz Fehmi is a milestone work in trying to disseminate the same knowledge and ecstasy to a wide range of readers.

Qaisar Abbas
Pakistaniaat A Journal of Pakistan Studies
Vol. 5, No. 1 (2013)

"FAIZ FEHMI"
Understanding Faiz with Style

"Faiz Fehmi, Tehqiq o Tanqeed"
Dr Syed Taqi Abedi,
Ed. Pages 1403.
Lahore: Multimedia Affairs, 2011.

In an event in Dallas a couple of months ago, I had a rare chance to meet the last survivor of the famous Rawalpindi Conspiracy Case, Zafarullah Poshni, who was also incarcerated with Faiz Ahmed Faiz in 1950.

Recollecting the memories of the days he spent with Faiz in confinement, he discussed with me his up front and honest recollection of the days he spent in jail with Faiz. He said he was the youngest of all inmates who were confined in the famous Rawalpindi Conspiracy Case and Faiz saheb was always kind and caring to him. While most of the people in jail could not control their rage as a result of psychological distress in confinement, Faiz was always cool, well mannered, and respectful to others, he recalled.

"At times when Faiz looked miserable, silently smoking cigarettes walking back and forth, thinking and writing, we knew a poem was in the making and we started planning for a Mushaira" he said, "and those were the most precious moments of our internment."

Speaking in the event organized to honor him that evening, he said, technically there was no legal justification for a conspiracy case against us. The group met at the residence of General Akbar to discuss the possibility of a coup but the plan was rejected as it was not realistic and practical. The government, on the other hand, using some people as witness, by hook or by crook, tried to prove in the court that a conspiracy to stage a coup was hatched.

Comparing 2011 to the 1950s, he said, intolerance is creeping in our society to the extent that bigotry has replaced civility and violence has taken over common sense in our society. As the last survivor of the Rawalpindi conspiracy case, Zulfiqullah Poshni, still in good health at his age, represents an extraordinary Qaisar Abbas group of individuals who cared about the miseries of people and struggled for their rights through a peaceful movement.

Zafarullah Poshni is also represented in the new book "Faiz Fehmi" with his article "Faiz or Zindan" (Faiz and the Prison). He concludes the article with paying glowing tributes to Faiz and Sajjad Zaheer, his friend. "I learned a lot from both of these and the knowledge I gained from them during confinement made the rest of my life a rea ecstasy and delight."

In this new book, Dr. Syed Taqi Abedi, the editor, has documented life, legacy and poetry of the same legendary poet of the 20th century who was part of the so-called "Conspiracy" 2006.

Published by the Multi Media Affairs in Lahore, the book is an astonishing anthology of articles, research papers, interviews, personal memories of his friends, and family members, and photographs and illustrations on its

life and work. A voluminous work of over 1,400 puges with color printing and the fine paper quality, adorned with a leather cover, the book surpasses all other publications on Faiz in its quality, content and finesse.

In an era where you rarely see quality publications on the poet, the new book looks l ke an unexpected g ft to Urdu literature and Faiz lovers Although some of the articles are reproduction of published materials, most are new on contemporary topics. In fact, the editor claims in the preface:

"This document has been published to meet the demands of the 21st century so we can view his life and work from every possible perspective. We know that so much has been written on the poet and his life but we are also aware that there is a lot to write on the lament of his verse and the narrative of his prose."

It is in this context that the book attempts to fill a huge gap of quality work on Faiz and his poetic discourse. The editor also tried to keep up with the quality saying:

"We have consciously avoided 'cut-and-paste' articles using published materials without citations as we did not want to demean these writers."

The anthology includes art cles of stalwarts of Urdu literature from across the world including India, Pakistan, Russia, England, Canada, the United States and other countries. Articles of several English and Russian writers such as George Fisher, Alexander Surikov, Lyudmala Vasilyeva and world leaders like Yasser Arafat also embellish the book.

The list includes Gopi Chand Narang, Syed Ahtesham Hussain, Kaleemuddin Ahmed, Mirza Khalil

Baig, Sharib Ridolvi, Shamsurrehman Farooqi, Al-e Ahmed Saroor, Mlik Raam, Ali Abbas Hussaini, Indar Kumar Gajral, Krishn Chandr, Knahiya Laal Kapur, Ali Sardar Jafri and Syed Sajjad Zaheer from India

A number of writers from Pakistan are also represented such as Shamul Haq Haqqi, Ahmed Nadim Qasmi, Ziaul Hasan, Zafar Iqbal, Abul Lais Siddiqi, Wazir Agha, Mohammad Ali Siddiqi, Jamil Jalibi, Qamar Rais Mujtiba Hussain, Sahar Ansari, Karrar Hussain, Intizar Hussain, Sufi Ghulam Mustafa Tabbassum, Faruqh Bukhari, Syed Sibte Hasan, Ikhtar Arif, Qudratullah Shahab, Mirza Zafarul Hasan, I.A. Rehman, Noon Meem Rashid, Hilal Naqvi, Sadiq Naqvi, Khwaja Ahmed Abbas, Mushtaq Ahmed Yousfi, Abullah Malik, Fateh Mohammad Malik and Safder Meer, to mention a few

A unique section has been devoted to personal reflections of family members of Faiz including articles of his wife Alice Faiz, two daughters, Saleema Hashmi and Muneeza Hashmi, and his son in law Shoaib Hasmi

The book also includes five articles by Faiz himself on a variety of topics including the progressive literary ideology, Josh as a revolutionary poet, films and culture, Beirut under the Israeli attack when Faiz was there, and his speech at the Lenin Peace Award ceremony in Moscow which was in Urdu.

Of the 162 articles on the poet about one third (421 are written by the editor himself Dr Tasir Abedi Thematically, the book has about 30 articles on the poet's life, interviews and personal memories of his friends while 132 articles are critical reviews of his poetry and work

Unfortunately, the book is a limited edition not for sale which might be disappointing for a large number of readers. But the good news is the editor intends to publish a paperback edition to make it available to everyone, as he told me. Because of its huge size, however, the book might be published in the following three thematic volumes:

1 Volume I with new and unpublished articles.

2. Volume II on poet's life and memories of his families and friends with illustrations and pictures.

3. Volume III with all previously published articles.

Publishing these volumes on paperback will make them more accessible and affordable to common readers and researchers everywhere. In launching the book in Canada, Gopi Chand Narang declared "Faiz Fehmi" as magnum opus of Urdu literature, a rare and unprecedented work of art. Without any doubt it is a milestone work for which the editor, who spent a huge amount of funds from his own pocket to publish it, deserves recognition and felicitation.

J. S. Ifthekhar
Hyderabad
November 18, 2018

A poet who defies definition

Saeed Shaheedi, poet of 'Barq-o-Aashiyan', excelled in all genres of poetry. A tribute to the prolific writer

There is no dearth of poets in Hyderabad But, he remains a cut above the rest You can rock to his romantic ghazals and also sob to his soulful dirges That's Saeed Shaheedi for you. A poet who defies definition

A prolific writer, Saeed has left his stamp in all genres of Urdu poetry Ghazal, Qasida (panegyric), Naath (eulogy of the Prophet), Manqabat (sufi devotional poem), Rubai (quatrain), Munajaat (supplication), Salam (salutation), Marsia (elegy) and Noha (lamentation) He carved out a special niche for himself as versifier of Ahl-e-Bait His devotional poetry written in praise of the Prophet's family is a big draw during the Muharram mourning sessions Saeed is equally popular for his ghazals where he is at his best depicting the feelings of love and bereavement.

Born Mir Abid Ali, he is known by the nom de plume Saeed During his lifetime, he figured among the show stealers His style of rendition apart the profundity of thought, the pungent freshness poignancy and music in his verses cast a Mesmerizing spell The effect is much the same even now as the poet himself remarked once

Jab bhi mehfil mein chidi meri ghazal
Sari mehfil ko tadapta dekha

(Whenever my ghazal is recited The entire assemblage is seen in spasm)

What is unique about this *Shayer-e-Deccan* is that he could express exquisite sentiments with beauty, ardour and pathos in short *behr* (meter). His lyrical power is extraordinarily versatile and renders the whole gamut of human emotions with consummate felicity. Most of his ghazals betray a nostalgic longing for the beloved. Sample these verses:

Kaise sukoon paoon tujhe dekhne ke baad
Ab kya ghazal sunaoon tujhe dekhne ke baad
Teri nigah-e-mast ne maqmoor kar diya
Kya maikadh ko jaoon tujhe dekhne ke baad

His ghazals are distinctive and moving. Using elegant vocabulary and metaphorical allusions, Saeed is able to express different shades of feelings while adhering to rhyme and meter. See how in this ghazal he plays on words and emotions which he alone could do

Kis ko pane ki baat karte ho
Hosh udane ki baat karte ho
Jam khali laga ke honton ko
Ladkhadane ki baat karte ho

Known as poet of 'Barq-o-Aashiyan', Saeed's *shayeri* is full of references to lightning and nest. He employs these metaphors superbly in different contexts to depict the ravages suffered by a hapless lover at the hands of the beloved and to cock a snook at destiny.

Barq ke liye kya kya zahmaten uthata hoon
Aashiyan ke jalte hi aashiyan banata hoon
Aashiyane ki bunyad rakh ker Saeed
Barq ka housla azmate hain hum

It is difficult to gauge the depth of his poetry as he mastered the art of expressing difficult situations in an easy way. The agony of Karbala, the most poignant chapter in Islamic history, has a bearing on his poetry. No wonder his verses have the sensation of smouldering embers. But, they don't scorch the readers and listeners rather bestow the

warmth of life upon them. Saeed surely is one of a kind. This is best summed up in his own words:

Ghalib nahin main phir bhi Saeed itna kahoonga
Har ek se hat kar mera andaze bayan hai

Poetry runs in his genes with his father, Mir Mehdi Ali, being a poet himself. Saeed gave a hint of his brilliance when he took part in the annual *mushaira* held at Nizam College as a student. Those present, including the then Prime Minister Maharaja Kishan Prasad, couldn't miss the great poet in the making.

Mubtalaye zulf ghabrate nahin
Khelte hain khaid mein zanjeer se

Though Saeed worked in the Excise Department, he remained a poet at heart. He was bestowed the title of *sad ra-shara* and travelled widely addressing poetic sessions both within and outside the country. His poems were regularly broadcast from All India Radio and BBC. Perhaps, Saeed had an inkling of his fame and said it in a subtle way in this couplet:

Aankhen khul jayengi zamane ki
Meri aankhen to band hone do

There could be no better tribute to this master poet than publication of his complete works. And that great son of the soil, Dr Syed Taqi Abedi, deserves compliments for bringing out the *Kulliyat-e Saeed* Shaheedi to mark his birth centenary celebrations held on January 23, 2018. A collector's issue, the 759-page tome contains all the 3,569 verses composed by him along with the views of top writers.

J. S. Ifthekhar
Hyderabad
November 25, 2018

Gulzar enriches Urdu with Triveni

Urdu poetry is now richer by a new genre, Triveni. The credit goes to filmmaker and lyricist Gulzar.

A poetic unit of three verses, Triveni packs a punch in the last line by turning around the meaning expressed in the first two verses.

Gulzar, who has mastered the art of writing the Triveni, regaled the audience the other day at the Maulana Azad National Urdu University (Manuu).

What was billed a seminar turned into a mushaira with the renowned poet holding everyone spellbound with his three-liners. Right from Vice Chancellor Aslam Parvaiz to professors and students, Gulzar's recital swept everyone off their feet.

A book penned by Canada-based Hyderabadi scholar Dr Syed Taqi Abidi, Gulzar ki Taqleeqi Sinf, Triveni, Tashreeh o Tajziya was released on the occasion.

Three-line poetry is not new to Urdu language.

There are various forms like the musallu, the haiku, tikoni, salees and the tipai where an idea is expressed in three lines. But Triveni differs in that it's free from the restrictions of radeef and qafia (rhyming).

The thought expressed in the first two lines takes a new twist when the third line is read.

For the last few years, Gulzar has been writing Trivenis on subjects as varied as love, the calamities of life, social milieu and moral values.

The best part of Gulzar's shayeri is that one doesn't need to consult a dictionary. His poetry is simple and down

to earth. What's more, he doesn't hesitate to borrow commonly used English words.

Asked why he named his three-line verse Triveni, Gulzar said the first two verses meet like the Ganga and the Jamuna and complete a thought and an emotion. But beneath these streams runs another river, the Saraswati, which is apparently hidden. He likens the Triveni's third line to the Saraswati which makes a world of difference.

Sample this triveni:

Samne aye mere, dekha mujhe, baat bhi ki
Muskuraye bhi purani kisi pehchan ki khatir

Kal ka akhbar tha, bas dekh liya, rakh bhi diya

(You come before me, acknowledge me and even talk to me your smile reveals our long acquaintance. Like yesterday's newspaper, read and discarded.)

At a time when Urdu readership is dwindling, Gulzar remains its face. In his own remarkable way, he is trying to keep the flickering flame burning. He wants the language to be made simpler for Hindi readers. He superbly captures the dilemma facing Urdu thus:

Badi aristocracy hai zaban main
Faqeeri mein nawabi ka maza deti hai Urdu

Dr. Mohd. Zafar Hyderi
Sri Nagar

Continued from Editor's Desk

The learned author deserves genuine applause for publishing this book. Judging by the subject matter and the range it covers, this book ought to have taken a decade or so in its preparation and arrangement of the material But it was for the tremendous labour of the author that, within a couple of years, it was shaped out in the form of a book It has 816 colour pages printed on high quality art paper. The size of the book is 29x23cms, weighing about 3Kgs. The matter of each page of the book is enclosed in a colour border resembeling Iranian Paper Machie

In the past too, attempts were made to present the works of Mir Anis a great Marsia (Elegy) poet in the subcontinent. Allama Shibli Nomani's venture "Muazana Anis o Dabeer", can be broached as the best example in this direction, which appeared some 100 years ago. In contrast to Shibli's book, which deals with numerous 'Marsias' of Mir Anis, Dr Abedi's entire book is based on only one Marsia of Anis....

Jab Qata Ki Masafat e Shab Aftab Ne

(The sun had run its journey o'er the night) in which the learned author has analysed and discussed about one hundred qualities and beauties of the said Marsia Dr Abedi, indeed, is the first person who has analysed one single Marsia of Anis with such creativity It is, beyond doubt, a great achievement which is unmatched and unrivalled. Unique as this book is, it is supplemented by

another work of paramount importance, the translation of the said Marsia in English by David Mathews and in Arabic by Syedul U'llema Maulana Syed Ali Naqi un Naqvi

The book is based on 14 chapters. Three chapters (i e 11th, 12th and 13th) are of extra ordinary importance. In these chapters, the author has thoroughly analysed the fore mentioned Marsia from the book "Shankar e Anis", by Prof Masood Hasan Rizvi Adeeb. Prof Rizvi's book has 197 sixtams and all the sixtams have been beautifully and creatively analysed and incorporated in the book. Moreover, Dr Abedi has arrived at his own conages. But his most remarkable contribution is the ingenuity of form, because no form as such was known to exist before.

It will not be out of place to mention here that in addition to the analysis of 197 sixtams of the Marsia, the book provides a detailed study of the life of Mir Anis in chapter one. According to the author the title 'Khuda e Sukhan" has been used for only two great poets Mir Taqi Mir and Mir Anis. The former used 'Ghazal' as a medium of expression, whereas the latter selected 'Marsia' and made martyrdom of Imam Husain(as) his subject. It was from his ancestors that Mir Anis has inherited the heritage of poetics and, therefore, he was justified in making a well founded claim

Panchvein Pusht hai Shabbir ki maddah mein

(In Shabbir's adoration, mine is the fifth generation)

According to the author, the real greatness of the poetry of Mir Anis lies in his mastery of language. He showed such a perfect command over the language that he very easily couched into words not only the profoundest thoughts but even the sublimest of feelings. His depth of

his thought, coupled with his limitless capacity to evoke feelings, indeed lent such a dignity to his poetry which no other Urdu poet has so far been able to create. Mir Anis has the power of expressing one and the same thing in manifold ways. He was well versed in the art of expanding and compressing a passage He had such a rich and inexhaustible stock of words which no other poet of Urdu, nor probably any poet in any other language, appears to have possessed. Anis himself claims:

Guldasta e mana ko naye dhang se baandhun
Ek phool ka mazmoon ho to sau rang se baandhun

The poetry of Anis is conspicuously marked by the characteristics of simplicity, elegance and eloquence. These qualities are not only abundantly clear in his work but are the very essence of his poetry. So glaring are these characteristics that they do not escape the attention of a reader, provided he or she has a taste for culture.

Besides the poetry of Mir Anis, Dr Taqi Abedi has also tried to trace the minute details of the life of Anis like appearance, costume, punctuality, sensitivity, behaviour and habits, first and last "Majlis", prayers, illness and death The last few years of Anis's life were disturbed by the turbulent political events. During his visit to Azimabad, he fell ill. When illness took a serious turn, he rushed back to Lucknow. He was ll for about a month and at the age of 73, he breathed his last in 1874 AD. The following couplet of Mirza Dabeer reveals not only the exact year of his death, but it is also the best tribute to the person who had been his life-long rival:

Asman bay Muh e Kamil
Sidrah bay Rooh ul Ameen

Toor e Seena bay Kaleem ul Lah

Mimber bay Anis

(Poor is the sky without the full moon, and empyrean without Gabreil, is meaningless. Nothing is the Mount Toor, without Moses. And pulpit without Anis, is worthless)

Further, there is a chapter (2), which deals with some of the eminent personalities having had direct or indirect association with Marsia and Mir Anis. They include Ghalib, Nasik, Dabeer, Azad, Hali, Subli, Chakbast, Josh etc. and contemporary figures like Prof Akbar Hyderi, Prof Gopichand Narang, Dr Nayyer Masood, Prof Sharib Rudaulvi, Prof Fazal Imam, Dr Hilal Naqvi and many more. Dr Taqi Abedi has discussed and presented everything in the most objective way.

Prof Akbar Hyderi Kashmiri has written the foreword of the book. According to him, Dr Abedi has done utmost justice to the meaning of the words, expressions, phrases, metaphors and similes of the Marsa-an art of creativity, which is beyond the reach of others. In this connection he says:

Jauhari bhi is tarha moati piro sakta nahen

(Undoubtedly, "Tajzia Yadgaar e Anis" is a scholarly work of Dr Syed Taqi Abedi. He has accomplished this task most successfully and has endeavored to introduce the Poet in the most befitting manner. Last but not the least. It is pertinent to mention here that in this special issue the said book has also been reviewed by Akbar Hyderi Kashmiri, Baqir Zaidi and Abdur Rehman Abd. Besides the other books of Dr Abedi which have been reviewed in this very special issue include "Ghalib Diwan Nasir e

Manqabat", "Rubaiyaat e Anis & Dabeer", "Chun Marg Ayed", "Faiz Fehmi", "Amjad Fehmi", "Hali Fehmi", "Kuliyaat e Hali", "Insha Ullah Khan Insha", "Kuliyaat e Saeed Shahidi," "Gulshan e Roya", "Kainat Najam", "Roop Kumari", "Tajzia Yadgar Anis", etc In a nutshell this issue is a treasure of knowledge.

Dr. Syed Taqi Abedi
October 29, 2021

"The Visionary outlook of Allama Iqbal's teachings in the modern era"

In the 21st century's Global village, where people of different Creed, Culture and colour are living together, the message of the poet of east, the Islamic thinker, Allama Iqbal enlighten the human and in particular the Muslim mind as he put the visionary light on the exaltedness of human being in the Universe.

In the so-called civilized culture, the thought development Promotes my way in the highway concept, there is no respect for others because they are either unaware of the greatness of the human beings or they do not want to interact with the truth.

Iqbal said, "Manliness is to respect the Man, you have to know the right placement of Man"

آدمیت احترام آدمی

باخبر شواز مقام آدمی

If you consider 37 yourself a civilized person then, you have to respect the other human beings, because the states of this supreme Creation, so called Man is loftier than the heavens, that for the roots of the culture are engraved in the respect of the human beings

برتراز گردوں مقام آدم است

اصل تہذیب احترام آدم است

Iqbal said I have seen the man with no vision has fallen prostrate at the feet of the Rulers have you ever saw a deer prostrate for other ... in fact the supreme creation is fallen so low in moral values

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد

گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است

من ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد

The Man the supreme creation, the only vicegerent of God, on the earth, for whom God said in Quran, "Verily we have made subservient to you Whatever is in the earth and in the skies", Iqbal love and teaches power, success through refining oneself with the inner power of "Quran, and the teachings of the holy prophet, Iqbal said it is unwise to change yourselves to the preseribed worldly ways, you should Change the world on your terms and bring it to your way by power and conquer.

حدیثِ بے خبراں است بہ زمانہ بساز

زمانہ با تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز

Iqbal emphasizes conquering the world with obedience, obligations and hard work and he ask the Muslims to become finest human beings in the world.

He said the dusty marble by its adaptation in a building Construction is Taj Mahal, the scattered sounds when travel the music instruments produce Cosmic melody.

Iqbal is the post of conviction, he sees in ilm (knowledge of Sharia) The action (عمل) and in the action she look upon the obedience (عشق) and finally in the obedience the conviction (یقین) as he narrates in his famous verse" The conviction of the individuals which builds the society and that is the only action which shapes the destiny.

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

When Iqbal noticed the downfall of the Muslims in the world, in the same as "Rumi saw in his times, he said" Like Rumi I call upon The Muslims to Join The good work of existence to demolish the destructive forces emits from both inner and outer environment

چوں رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

Iqbal's message to the modern world is to get Enlighted by the light of "Noore Mubeen the Quran for which they have to read and understand as it was revealed on their chests

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

As long as the Quran is not revealed upon your soul, neither Razi nor Kashaf can solve the riddles Iqbal's core teachings include the love and faithfulness to Prophet Mohammad (PBUH), he addressed to Muslims of yours are faithful to prophet then God will be yours

ع: کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

These tributes of Iqbal aspirations not only Enlighted the soul the inner core of Muslim umma but also act as a spiritual catalyst in divine concept Iqbal prescribes continuous hard work, struggle and truth to achieve the divine love

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں

Iqbal is not happy in today's world where Muslims are idol bearer as he has to spread the doctrine of the Allah.

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکم اذاں لاالٰہ الاللہ

Although the Muslim congegation held idols in their sleeves, I have been instructed to declare "There is no god but the God."

He is asking "Be Like Ibrahim, the God intoxicated and demolish every old idol house"

باش مانند خلیل اللہ مست ہر بتِ خانہ را باید شکست

Iqbal encourage us to follow the steps of Ibrahim to achieve the success, if someone adopt the faith of Ibrahim, the fire can change itself to a garden full of followers.

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا

آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

Iqbal designated himself as the poet of tomorrow means, poet of new generation He prayed to Allah to spread the light of his vision.

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نورِ بصیرت عام کر دے

Iqbal wants to lead The Umma as he pointed out in his verse that I will lead tierd worn-out my Caravan in the dark night where my sighs will emit and my breath will Spark flames.

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو

شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

Iqbal says in this turmoil of cultures make Rumi your guide and, on the path, you may granted the ardour and compassion, because Rumi separates "Kernel from the shell, and he is steadfast in the true parts of the Beloved

پیر رومی رفیق راہ ساز　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

رمز رومی مغز را اندر پوست　　پوست محکم تر کند از پوست

Iqbal is asking us to get on to the day-to-day struggle because a nation cannot face the future boldly if it does not control its destiny today.

وہ قوم نہیں لایق ہنگامۂ فردا

جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں

I will end this visionary outlook with a Verse of Iqbal where he uses metaphorically The "SAJDAH" an exalted performance of obedience, if it is done with conviction, love and total subjugation to the God

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی ہے

اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

That (Sajdah) prostration which brought tremors to the soul of the earth: The pulpit (Mimbar) and the niche long for it.

Hasan Abidi
Daily Dawn (Karachi)
February 18, 2004

A novel marsia collection

"Izhar-i-Haq" a volume, comprising unpublished elegies of the late Sultan Saheb Fareed, a marsia poet coming from the clan of Mir Anis, was launched under the aegis of the Idarae Tahzeeb-o-Tarveege Marsia at the NIPA auditorium on Monday.

Dr Syed Taqi Abedi, a Canada-based intellectual and researcher, also a physician, who researched, edited and compiled the hand-written elegies found in decaying condition, spoke with a zest on the elegies of Sultan Saheb Fareed and the Lucknow of the early decades of the last century. As Mr Abedi had arrived with his three other research publications about another marsia poet, Mirza Dabeer, an equally important contemporary of Mir Anis, he spoke on the Dabeer's merits and invaluable contribution to Urdu poetry.

Marsia, Dr Abedi said, was not just the poetry of sorrow, "It encompasses the whole life," he emphatically argued while denying the critics who considered marsia as simply "religious poetry."

Talking about Sultan Saheb Fareed, he said, about 70 per cent of his 'Kalaam' was missing. In the later part of his life, he had stopped composing marsia, reacting against the jealousies of lesser people in Lucknow, Dr Abedi said, adding that whatever could be found in the family treasure was the most precious.

Sultan Saheb Fareed's illustrious son Dr Iftekhar Ahmad, a botanist and also based in Canada, commenting on the merits of the marsia collection, admired Dr Abedi's efforts and pointed out some lapses in the compilation,

سیاق و ارتباطِ حروف

PDF BOOK COMPANY

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

mainly the omission of the efforts made by Dr Ahmad's elder brother in preserving the manuscripts.

The present volume carries fifteen elegies, thirteen Salams and twenty five Rubaiat.

Giving his views on Mirza Dabeer, Dr Abedi said he was the most 'victimized' poet of his time, maligned and abused by many. He had to his credit the largest number of couplets, while his command over various experiences of life and study of nature was amazing, he added.

He informed that the bicentennial celebrations of Mirza Dabeer were going to be held in India.

Dr Farman Fatehpuri spoke highly about Dr Abedi and also admired Dr Iftekhar Ahmad. He suggested that a small portion of selected elegies might be published for lay readers, at a low price, to make the genre popular

Dr Hilal Naqvi of the Idara, in his welcome address, briefly referred to the evolution of marsia in Urdu

Dr Mohammad Raza Kazmi presented his critique on the elegies of Fareed. Prof Saher Ansari called it a "monumental work," Dr Abedi had done at the age of 55, and suggested that a history of Urdu marsia should also be compiled

Dr. Hasanain Walji
October 30, 2004

Dr Taqi Abedi in Dallas on Saturday Oct. 30

Dr Taqi Abedi is literary legend in our Community and an internationally acclaimed poet, who hardly needs an introduction.

His visits to Dallas have always been inspirational. Once again he will be visiting us on Oct 30/31. He will preside as Guest of Honor at the IILM Fundraiser on Saturday evening.

In addition to his magnus opus on Mir Anees, called "Yadgar-e-Anis", he nas authored some 17 books and will be presenting some selections from them on Saturday. Some of the titles are:

"Josh-e-maodat", "Gulshan-e-Roya", "Iqbal Kay Irfani Zaweye", "Inshaullah Khan Insha", "Ramooz-e-Shaere", "Izhar-e-Haq", "Mirza Dabir", "Taleh Mehr", "Ahwabul Masaeb", "Silk-e- Sakam-e-Dabir", "Aroos-e-Sukhan".

He will also have some rare marsiya manuscripts for display during his time here and Mumineen will be able to obtain his CDs during the evening. At the same time our own local .egend, RAZALI will be presenting, by popular request, a special compilation of "SHIKWA JAWAB-E-SHIKWA" by Allama Iqbal during the evening. There will also be poetry recitals in Arabic and Farsi.

Ayub Khan
The Milli Gazette Online
July 1-15, 2005

International Urdu Conference in Toronto

Urdu is not a threatened language but is alive and well, proclaimed Dr Gopi Chand Narang, noted critic and president of Indian Academy of Letters, at a three day International Urdu Conference held in Toronto from June 17-19. He said that the organization of such conferences in North America proves that Urdu will continue to flourish in the future. He said Urdu should not be restricted to the Muslims alone but should be promoted as a universal language.

The conference, organized by the Urdu Times, was attended by well-known poets, writers, and journalists from India, Pakistan, UK, France, and Canada. Sessions were held on Literature and Modern Trends, Iqbal studies, Ghalib studies, Urdu Media's new challenges, Religious poetry, and Women's Urdu Literature.

Speaking at the conference Zahid Ali Khan, editor in chief of Siasat Daily, Hyderabad, said every year more than 50,000 students from Urdu schools drop out in the state of Andhra Pradesh alone never to return to studies. He said it is vital that the students remain in schools and that the schools' standards should be raised to meet modern challenges. He appealed to the attendees to sponsor at least one student in a year. Khalil ur Rahman, publisher of the New York based Urdu times, announced that he will sponsor the publication of quality Urdu works and that an inte national jury will select the submitted works.

The conference resolved that immediate measures need to be taken to protect the Urdu script in its present

form. Dr. Taqi Abedi, convener of the conference, said the Perso-Arabic script is not the clothing but the skin itself of Urdu language and that no compromises should be made on it. The conference resolved to form an international committee to solve issues relating to the count of the Urdu alphabet and the teaching of Urdu in Sunday Islamic schools in North America. The attendees appealed to the Indian and Pakistani governments to ease travel restrictions on poets, writers and other literary figures.

The conference closed with a Mushaira attended by over 1500 people. Dr. Jamil Jalibi, Dr. Shan ul Haq Haqqi, Dr.David Matthews, Dr. Peerzada Qasim, Wakil Ansari, Mona Shahab and other national and international poets took part in it. Another International Urdu Conference is being held in Hyderabad this November.

Daily Patrika
(Allahabad)
January 19, 2006

"Kainat-e-Najm" to be released on Jan. 20

"Kainat-e-Najm" the latest literary creation of the renowned Urdu litterateur Dr Taqi Abedi would be released on Jan 20 at the Vinayanagaram Hall of Allahabad University The book "Kainat-e-Najm" concerns with the literary achievements of the renowned poet Allama Najm Afridi.

In the book releasing function, several scholars legal luminaries would be present. The programme would be presided over by Mr. Justice Barkat Ali Zaidi The main speakers would include S M Akil Rizvi, Prof Shamsur-Rehman Farooqi and Prof A A Lamti Even Dr Taqi Abedi would also grace the occasion who would remain in Allahabad city only for ten hours

"Kainat-e-Najm" is the literary creation containing Ghazals, Marsia, Qata, Nauhas and Salam of Allama Najm Afridi

Mr Taqi Abedi holds a special place in Urdu literature In spite being a medical practitioner, his literary services are commendable.

Daily Patrika
(Allahabad)
January 21, 2006

Book release function of "Kainat-e-Najm" held

At a glorious function was held at Vijayanagaram Hall, Science Faculty, Allahabad University, the latest book of Canadian poet Indian origin Dr. Taqi Abedi entitled "Kainat-e-Najm" was released by the senior-most Prof of Allahabad University Prof Janak Pandey. The Judge of Allahabad High Court Mr. Justice Barkat Zaidi was the chief guest. Former head of the Urdu department, Allahabad University, Prof S.M. Aqil Rizvi, presided the function. Prof. Shamsur Rahman Farooqi and Prof. Ahmad Fatmi was the chief Orator. A research scholar of Allahabad University Fazil Hashmi conducted proceedings who was also the convener of largely attended programme. Dr. Taqi Abedi himself was present who stayed only for 10 hours in Allahabad.

Speaking as chief guest Mr Justice B.A. Zaidi said that nowadays the literary interest of the masses is on decline. Under these circumstances Dr. Taqi Abedi will must get prayed for his continuous researcn work. I pray to God for long life of Dr. Abedi so that new books may come into existence. Looking very happy with his warm we come Dr. Taqi Abedi said that this is his 15th research book and is divided in to two parts. There are 195 Ghazals, 596 Rubaiyat, 485 Quataat, 106 Salaams, 4 Mareiyas and 144 Nawhas in these volumes. There are 12792 lines in these books in all. There are Ziyarats and Nath Shants init. Allama Najm Afandi born in 1893 in UP and later migrated to Hyderabad. He died in 1975. He was a revolutionary poet in these books and I have collected the poems related

to framers, labourers and patriots. Releasing the book Prof. Janak Pandey was in all prays for Dr. Taqi Abedi Prol. Pandey specially praised the poems "Qaidi Ka Raag" and "Mazdoor Ki Awaz" Earlier Dr Fazil Hashmi welcomed the chief guest and other dignitaries and promised to organized such literary functions in future

The persons present among those include Prof Fazle Imam Rizvi, Prof. Abdul Hamid. Prof Raza Hasnain, Prof Atiya Nishat, Prof. Ali Ahmad Fatmi Prof Naushaba Sardar Principa Ahmad Hasnain, Zafar Abbas Farman Naqvi, Dr. Sabnam Hamid Sayyed Azadar Hussain, Dr Fakhral Kanm, Aslam Allahabadi, Ramz Allahabadi, Banar Naqvi and others. A micro Mushaira of only 30 minutes was also organized It was conducted by Naeeb Allahabadi.

Daily Hindustan Times
(Allahabad)
January 20, 2006

"Kainat-e-Najm" released

The latest book of Canadian poet of Indian origin, Dr Taqi Abedi, titled "Kainat-e-Najm" was released by Prof Janak Pandey of Allahabad University at a glittering function at Vijayanagaram Hall, Faculty of Science, AU.

Justice Barkat Ali Zaidi of the Allahabad High Court was the chief guest while former head of the Department of Urdu, AU., Prof S.M. Aquil Rizwi, presided over the function.

Renowned Urdu writer Prof Shamsur Rahman Farooqi and Prof Ali Ahmad Fatmi were the chief orators.

Speaking on the occasion, Justice Zaidi said literary interest of the masses was on the decline these days. Under these circumstances, Dr Taqi Abedi must be praised for his continuous research work.

Dr Abedi said this was his 15th research book and was divided in two parts. The volumes included 195 ghazals, 596 rubaiyat, 485 quataat, 106 salaams, 4 marciyas and 144 nawhas.

In these books, Dr Abedi has collected the poems related to farmers, labourers and patriots.

Prof Pandey specially praised the poems "Qaidi ka Raag" and "Mazdoor ki Awaaz". Earlier, Dr Fazil Hashmi, who conducted the programme, welcomed the chief guest and other dignitaries at the function.

Among those present on the occasion included Prof Fazle Imam Rizvi, Prof Abdul Hamid, Prof Raza Hasnain, Prof Atiya Nishat, Prof Ali Ahmad Fatimi, Prof Naushaba Sardar, Dr Shabnam Hamid, Sayyed Azadar Hussain, Dr Fakhrul Karim, Dr Aslam Allahabadi, Ramz Allahabadi,

Ahmad Hasnain, Zafar Abbas, Farman Naqvi, Bagir Naqvi and others.

A 30-minute mushaira was also organized on the occasion, which was conducted by Nomi Allahabadi

M. A. Qudoos
Khaleej Times (Dubai)
May 24, 2006

Urdu poetry book of late Najm Afandi launched

A 1,800-page Urdu poetry book, Kayanat-e-Najm (The Universe of Najm), a collection of some 13,000 verses of poetry about the Holy Prophet (peace be upon him) and members of his family by famous poet late Najm Afandi of Agra, India, was launched at a literary programme here on Monday.

The book, compiled by a Canada-based Urdu scholar, Dr Syed Taqi Abedi, was launched by Yasub Abbas, who had specially flown in from Lucknow to preside over the programme.

Introducing the book, Taqi said that it took him nearly three years to collect the verses of Najm, who died in Karachi in 1975 while visiting his daughter. Unfortunately, his verses were not fully preserved by family members

Taqi said that some 65 per cent of the verses included in Kayanat-e-Najm were not published earlier Reading verses to explain the variety of Najm's poetry, Taqi said that it included naats, nohay, manqabat, salaams, qaseedas, rubaiyat, and ghazals.

Speaking about Najm's manqabats, Taqi said that the poet was an inventor of the modern style of manqabats. His style was followed by the young poets of his time Taqi said that Najm also revolutionised the style of nohas

Taqi said that Najm was among the first Urdu poets to raise voice through his simple poetry against the rich and in support of the poor He lamented that Najm was not recognised in his lifetime and died a poor man.

Taqi said that so far 10 collections of Najm's work had been published in India and Pakistan. All of them are being made available on a web site.

Kayanat-e-Najm was first launched in Hyderabad, India, in January 2006 by Najm's son, Sohail, who is also a poet.

Iqbal Haider from Germany said that some 50 per cent of Najm's work was lost because it was not preserved or published in time by the many literary organisations which receive heavy grants to promote Urdu literature. Safdar Ali read verses on the occasion.

After launching the book, Yasub praised Taqi's efforts in compiling the book. He said that Taqi is well known all over the world for his research, specially on Mir Anees and Mirza Dabeer. "Taqi's books are not for sale. Kayanat-e-Najm is a valuable gift to Urdu literature and we should benefit from it," Yasub said.

Another book, a compilation by Taqi of the work of Roop Kumari, who hailed from a Kashmiri Pandit family, was also launched on the occasion. Her verses included hamd, naat, sagi nama, and bhagti poetry. Najm had been a teacher (Ustad) of Kumari for some time.

Hindustan Times
(Allahbad)
December 20, 2006

AU V-C releases book on Ghalib

Allahabad University Vice-Chancellor Prof Rajen Harsh Released 'Ghalib-Diwan-e-Na'at-e-Manqabat' a book by Dr Syed Taqi Abedi of Canada in the presence of renowned Urdu scholars at AU's Viztanagaram Hall on Tuesday. Vice chairmen of national council for promotion of Urdu language Prof. Shamsur Rehman Faruqi presided over the function.

Prof Harshe said that the book was a sincere effort of Dr Abedi and added that the students should follow the example set forth by Dr Abed in the field of literature. Prof SR Farooqi said that the book was a treat for Urdu Poets and praised the efforts Dr Abedi in exploring several expects of life reflected in the Ghalib's writings.

Uttar Pradesh Rajarshi Tandon Open University Vice-Chancellor Prof KNS Yadav, Head of AU's Medieval and Modern History Department Prof NR Farooqi and AU registrar Firdous A Wani also graced the occasion. A number of renowned Urdu scholars and students were also present.

Daily Patrika
(Allahabad)
December 20, 2006

Ghalib-Diwan-e-na`at-o-Manqabat relased.

Ghalib did wonders in religious writings too: Prof Harshe

'Mirza Ghalib who is known for love and beauty-based poems and couplets, had gifted priceless repository to generation in the form of Naat and religious rhymes' said vice chancellor of Allahabad university Prof RG Harshe while releasing the book "Ghalib Diwan-e-na`at-o-manqabat' in a glittering function held at Vijayanagaram Hall on Tuesday.

He said that though, he had not gone through the literature of Ghalib, but on the basis of interaction with eminent writer and poet Gulzar, it could be said that Ghalib not only did wonders in urdu poetry but also made remarkable contribution in religious writings He further released the book title "Ghalib-Diwan-e-na`at-o-manqabat" written by Canada based NRI author and medical practitioner Dr Syed Taqi Abedi

The function was presided over by Prof Shamsur Rahman Farooqi, Vice-Chairman, National Council for Promotion of Urdu language Dr Syed Taqi Abedi (Canada) who was chief guest on the occasion said that despite his medical profession, he tried to unveil the hidden facets of Mirza Ghalib.

He further mentioned that literature of the country act as bond for the person staying in other part of the globe His guest of honour was Prof N R Farooqi Dean, College Development Council, and Prof K N Tiwari Vice

Chancellor; UP Rajrashi Tandon Open University Mr. Inroous A Want, Registrar also released a book titled "Shand-e-Saki". He said that literature teaches us about the existing Garage-Vemun tradition in the country.

Daily Dawn (Karachi)
May 3, 2009

The art of Rubai

In certain cases one may offer some plausible explanation for it. But generally one wonders why a poet is consigned to the dustbin of history and why after long years he attracts the attention of researchers and at their hands regains his lost reputation

At least in the case of Mirza Dabeer we can offer an explanation and say that it was because of Maulana Shibli's comparative study of Anees and Dabeer published in 1906 that poor Mirza Dabeer suffered a setback

Of course, even after the publication of Shibli's views, thanks to the soz khwans and marsiya khawans, Dabeer remained popular in the circles of the mourners. But in the world of literature Maulana Shibli's harsh judgment went unchallenged

The poet speedily fell into oblivion and remained so for more than half a century. It was only in 1975 after the death centenary of Mir Anees a few literary journals cared to remember his 100th year of death and brought out special editions paying homage to this great master of Urdu marsiya.

That may be seen as the beginning of an attempt on the part of researchers and critics to get rid of the influence of Shibli's dismissive verdict about Dabeer

Prof Karrar Husain, in his article published in Mah-i-Nau Dabeer Number (Sept-Oct 1975) emphasised the need to revise our attitude towards Dabeer. We should, he said, go back to him and read his works anew with care

This statement was indicative of a changing attitude towards Dabeer. And as the century came to a close we saw

a newly emerged scholar engaged in digging up the lost writings of Dabeer.

He was Dr Syed Taghi Abedi, who, after doing some research work on marsiya writers in general, gradually devoted himself to researching Dabeer alone. His painstaking effort slowly and gradually started to bear fruit.

He was able to dig out enough material, which he carefully sorted out and compiled in separate volumes. The latest is the seventh volume published by Shahid Publications, New Delhi, under the title Rubaiyat Dabeer.

It is perhaps for the first time that we have such a big volume of Urdu rubaiyat which is of 612 pages.

In his introductory article Dr Abedi has talked about this short form of poetry providing us precious information about its origin, its technicalities and its favourite themes in the light of his research.

This introductory article is preceded by a foreword by Allama Aqeel-ul-Gharvi, who is of the opinion that compared to Anees, Mirza Dabeer is more prolific and appears better placed in the field of rubai.

Dr Abedi has carefully compiled these rubaiyat, classifying them in accordance with the themes they deal with. As enumerated by him, the total number of rubaiyat he has been able to collect and present in this volume is 1323, of which 40 have been written in Persian.

According to Abedi's research a poet known as Shah Ghamgeen is credited with writing 1,800 rubaiyat, the largest number written by any poet in Urdu. Dabeer is second only to him.

In fact, the rubai has not been very popular in Urdu. The reason, as explained by Dr Abedi, is that it is a difficult form of poetic expression and is a challenge to the poetic capability of a poet. He has to say all what he intends to say in just four lines

The fourth is the decisive line. It comes as a test for the poet, who has to prove in one line that he has

something extraordinarily precious to say.

It should come as a final word of wisdom. And only a few poets have been able to succeed in this regard.

Persian poetic tradition has in its fold poets who have come to be acknowledged as the most accomplished writers of rubai Omar Khayyam's Rubaiyat, when translated, or rather recreated in English by Fitzgerald, won international fame.

In Urdu, of all the poets, the two marsiya writers Anees and Dabeer have come out as the two most accomplished rubai writers

e-mail (Toronto)
From. Mohammed Ayub Ali Khan
Sent. Tuesday, August 18, 2009 2:59 PM
To: Mazin Khan
Subject: Fw:

Dr. Taqi Abedi, Kader Khan to collaborate for the promotion of Urdu

August 13, 2009-Noted Toronto based author and Urdu scholar Dr. Taqi Abedi has extended his full support to the initiative taken by Mr. Kader Khan to promote Urdu language and literature in the West and elsewhere The veteran film actor recently visited Dr Taqi Abedi's expansive library in Newmarket, Ontario and exchanged ideas for further collaboration.

Mr. Khan appreciated Dr Taqi Abedi's scholarly efforts and and congratulated him for his impressive collection of books which number more than ten thousand.

Mr. Kader Khan would be returning to Toronto soon to work on this project.

The dynamic partnership between the two is a promising start and productive results can be expected towards the promotion of the Urdu cause.

Intizar Husain
Daily Dawn (Karachi)
September 06, 2009

Persian Legacy

Dr Taqi Abedi had taken a start as a research scholar solely devoted to the study of Urdu marsiya. His first noticeable venture was the study of a selected marsiya by Mir Anis, which he published along with its English translation by David Mathews in a deluxe edition under the title "Tanziya Yadgar-i-Anis".

But soon he realised that more than Anis, Mirza Dabeer stands in need of research and study as he thinks he has been badly neglected by the scholars and the critics since the time when Shibli's "Mawazna-i-Anis-o-Dabeer" was published. With this realisation he now devoted himself to a hectic research and study of the writings of Dabeer.

He had planned to bring out all his writings along with his marsiyas in several volumes. A number of volumes have already appeared, the latest being the one consisting of his rubaiyat.

However, while still engaged in the study of Dabeer, he perhaps developed a feeling that he should not confine himself to marsiya alone. With this realisation he turned to other poets, more particularly Ghalib, in an attempt to expand the scope of his research.

In the case of Ghalib, Dr Taqi has brought out two compilations in quick succession which speak of his deep study in the field of Ghalibiyat.

In 1986 he had published his research work on Ghalib's devotional poetry in Persian and Urdu, compiled under the title 'Ghalib Dewan-i-Naat-o-Manqabat'.

Now just after two years he has been able to bring out a collection of Ghalib's Persian verses compiled in two volumes a ong with his new research on those verses.

As is known to us, Ghalib attached much importance to his Persian poetry. But, ironically, his readers d ffered with him. They held him in high esteem and regarded him as a great poet on the basis of his Urdu poetry.

His Urdu Diwan has been among the best sellers of Urdu literature.

It has been a great source of inspiration for singers, who sung his Urdu ghazals and played a great part in popularising him, more particularly in India. To top it all, researchers and critics too concentrated more on his Urdu verses than on his Persian poetry.

But now it seems that the popularity of Ghalib's Urdu verses has reached its saturation point. Ghalib lovers are now showing signs of turning to his Persian verses with the curiosity to know about his achievements in that language.

The Ghalib Institute in Delhi is perhaps the first to realise this changing trend. It has taken the lead to bring out Ghalib's Persian works one after the other.

It has already brought out his collection of Persian masnavis along with their translations in Urdu by Zoe Ansari. The 11 masnavis included in the collection are followed by a few more poems in the form of naat, munqabat, and munajat.

Now the Institute has brought out Ghalib's collected works in Persian in two big volumes covering 1399 pages. In fact, his Persian verses are far more in number than his Urdu verses. The compiler, Syed Taqi Abedi, has collected and compiled these verses after much research.

The collection is preceded by a long article, in which Abedi has exhaustively discussed Ghalib's Persian poetry. Apart from ghazal, Syed Abedi has also cared to talk about other forms employed by Ghalib

Perhaps he has concentrated more on his "Mairaj Nama" which he has discussed in the background of Persian mairaj namas. He has in particular referred to Iqbal's "Javaid Nama". He thinks that Iqbal may have drawn inspiration from this poem.

"Divan-i-Naat-o-Munqabat" too appears to be the outcome of Dr Abedi's strenuous research. The text is preceded by a long preface in which he has discussed Ghalib's devotional poetry.

So now we have with us Ghalib's Persian poetry brought out in different volumes after a great deal of research and after being studied in a new way.

Peerzada Salman
Daily Dawn (Karachi)
October 28, 2009

Scholars highlight marsia's status in Urdu literature

Scholars highlighted the finer points of marsia writing and its elevated position in Urdu literature at a seminar titled "Marsia aur adab-i-aali", organised by the Urdu department of Karachi University in its arts auditorium on Tuesday.

Former chairman of the Urdu department Dr Waqar Ahmed Rizvi presided over the event.

The seminar began with the welcome address by the current chairman of the Urdu department, Dr Zafar Iqbal, to the participants and audience of the programme. Introducing the seminar's topic, he said marsia-writing was an important part of Urdu literature.

Dr Iqbal said that since Lucknow's culture was no longer in vogue, modern linguistic trends must be kept in mind while writing marsias. He said that non-serious criticism of marsia-writing was another matter that needed to be looked into.

Dr Taqi Abedi, who is settled in Canada, was the keynote speaker. His impassioned talk kept the audience glued to their seats. Dr Abedi spoke at length on the subject and quoted many a couplet and stanza from Mir Anees and Mirza Dabeer, eliciting applause from the audience.

Tracing the history of elegiac verse, Dr Abedi said Sohrab's mother wrote a marsia after her son was murdered; Amir Khusrau composed one on Multan's destruction. Umrao Qais dabbled in it too. All of this indicated that there was a rich tradition available to us.

He said in Urdu literature marsia revolves around the tragedy of Karbala. He lamented that this form of writing had not been given its due status, and told the audience that Mir Taqi Mir wrote more than 34 marsias, and Mir Anees over 213.

Dr Abedi said marsia-writing contained many essential elements of nearly all poetic genres - it had ghazal's sonority, masnavi's flow and even certain elements of an epic poem. He severely criticised those who never took such poetry with the seriousness it deserved

In this regard, Dr Abedi quoted Altaf Hasan Hali's "Muqaddama-i-Sher-o-Shaeri" in which the author had attached great importance to the genre. This made him pose a question "Why haven't experts on the subject followed that line and why haven't institutions done enough to undertake research on the topic?"

Dr Abedi claimed that Mir Anees and Mirza Dabeer had used more words in Urdu poetry than any other poet. He said Nazir Akbarabadi had written 8,500 couplets, whereas Dabeer's tally was 120,000, and Anees's 86,000.

Dr Abedi educated the students present in the auditorium on the poetic tools employed in poetry, and praised Anees and Dabeer's remarkable use of metaphors and similes.

He talked about one of Dabeer's marsias in which the poet had come up with seven metaphoric arrangements, without making them clash with one another. He said it was disheartening to know that marsia writing was associated with only one religious order, and added that since the genre had been ignored by scholars, the visitation of Imambargah had kept it alive.

Dr Abedi also spoke on the moral lessons marsia embodied, which was why its message was relevant in modern times and would remain relevant for all times to come.

Dr Sahib was unhappy with Shibli Nomani's thesis "Muwazna-i-Anees-o-Dabeer", saying Shibli had done grave injustice to Dabeer in it. Dr Shamsuddin, dean of the arts faculty, thanked the scholars and students who had gathered to take part in the seminar.

Dr Shabihul Hasan's paper was read out by the Urdu department's teacher Rahat Afshan because he could not make it to the seminar. The essay pivoted around the high moral values spread through marsia-writing. The genre originated in the subcontinent, and once Lucknow was the hub of all cultural activities in India. Then times changed, and so did literary trends.

Anees and Dabeer belonged to the Lucknow tradition. The 20th century saw the disintegration of society, and uncertainty was rife in every sphere of life. It also had its effect on literature. The marsia writers who came after Anees and Dabeer helped connect poetry to society rather than individuals. Iqbal, Safi Lucknavi, Ali Sardar Jaffery, Josh Malihabadi and Jamil Mazhari brought into the genre the issues that concerned them; Naseem Amrohvi experimented with its structure. And contemporary marsia writers brought forth political and social issues.

Dr Hilal Naqvi's paper carried profundity that everybody sensed and learned from.

He said the history of mankind was full of gory incidents. Writers tried and expressed it in their own way, but very seldom truth was represented the way it should.

He also lamented that marsia-writing had been limited to only one section of society. He said when the young ones studied it, they moved away from the genre because it was portrayed as the kind of poetry in which dead people were discussed, while ghazal was defined as conversing with a (beloved) woman and qasida was known as a poetic piece written in praise of somebody.

Dr Naqvi asked why the culture of keeping one's head high in the face of adversity was not encouraged in our society. He said man's relation with other men, with the universe and with God was the basis of marsia

He illustrated the point by saying that today cloning, computers and nuclear technology dazzled our eyes. Man was being de-linked from civilisation and culture, and his mind was getting increasingly wayward. People were being killed in the name of religion. In such a situation marsia-writing could help mitigate the problem.

Speaking on the subject Prof Sahar Ansari said marsia had all the attributes of sublime or great literature. Karbala was a bouquet of metaphors, so much so that it had now become a metaphor itself.

He claimed that Urdu marsia had originated from Urdu poetry. He said the tussle between good and evil existed from the very beginning. Just like thesis and antithesis resulted in synthesis, Karbala too was a synthesis. He praised Mir Anees and Mirza Dabeer's intelligent use of words and said marsia-writing contained elements of epic poetry.

After the papers were read, a question answer session was held in which Urdu department students put quite a few questions, mainly to Dr Taqi Abedi.

دائیں سے بائیں مسعود مرزا، بیکل اتساہی، جاوید رضا، شبنم رومانی اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں نامعلوم، ضمیر جعفری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،
ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، نامعلوم اور پوڈیم پر تقی عابدی

دائیں سے بائیں رضا علی عابدی، تقی عابدی اور ولی عالم شاہین

بائیں سے بائیں تقی عابدی، احمد فراز، علی اکبر

بائیں سے بائیں تقی عابدی، مظفر شکوہ اور اکبر حیدر آبادی

بائیں سے بائیں تقی عابدی، مظفر شکوہ، اکبر حیدر آبادی،
غلام عباس، سلیم، صفوت علی اور [illegible]

دائیں سے بائیں تقی عابدی، نامعلوم، خمار بارہ بنکوی، آغا بابر زاہد شیخ، فرحت سلطانہ

دائیں سے بائیں صفوت علی، نامعلوم، تقی عابدی، خمار بارہ بنکوی، آغا بابر

دائیں سے بائیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ساقی فاروقی اور تقی عابدی

(۱) میں سے بائیں تقی عابدی، شوکت جعفری، ڈاکٹر جاوید اقبال، نامعلوم

(۱) میں سے بائیں [illegible] جاوید، شمس رومانی، تقی عابدی، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

(۱) میں سے بائیں [illegible]

(۱) | (۱)

دائیں سے بائیں جعفری، نامعلوم، ساجد، تقی عابدی، حمایت علی شاعر، بیگم حمایت علی،
بیگم شوکت، شوکت اور علی مومن، (بیٹھے ہوئے) خورشید

دائیں سے بائیں تقی عابدی، عروج زیدی اور ضمیر جعفری

تقی عابدی اور عقیل جعفری

دائیں سے بائیں: خلیل سندوزی، نوید، نامعلوم، سلیم، اقبال، احمد علی، اظہر، اظہر الحق، تقی، محبوب حسین

دائیں سے بائیں: (استادہ) تقی، مہدی، نوید، اظہر عباس، احمد علی
(بیٹھے ہوئے) محبوب حسین، خلیل سندوزی اور اظہر الحق

دائیں سے بائیں: حسن رضوی، خلیل [illegible] تقی، مہدی [illegible]

دائیں سے بائیں تقی عابدی، حفیظ تائب، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

دائیں سے بائیں ڈاکٹر عبدالرحمان، نامعلوم، حفیظ تائب،
شبیہ الحسن، شہزاد انجم، پروفیسر صدیق اور تقی عابدی

حنیف اختر اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں [illegible] میں عبدالرحمان، انور خواجہ، قمی عابدی، تابش خانزاد

[illegible] قمی عابدی

[illegible] قمی عابدی [illegible]

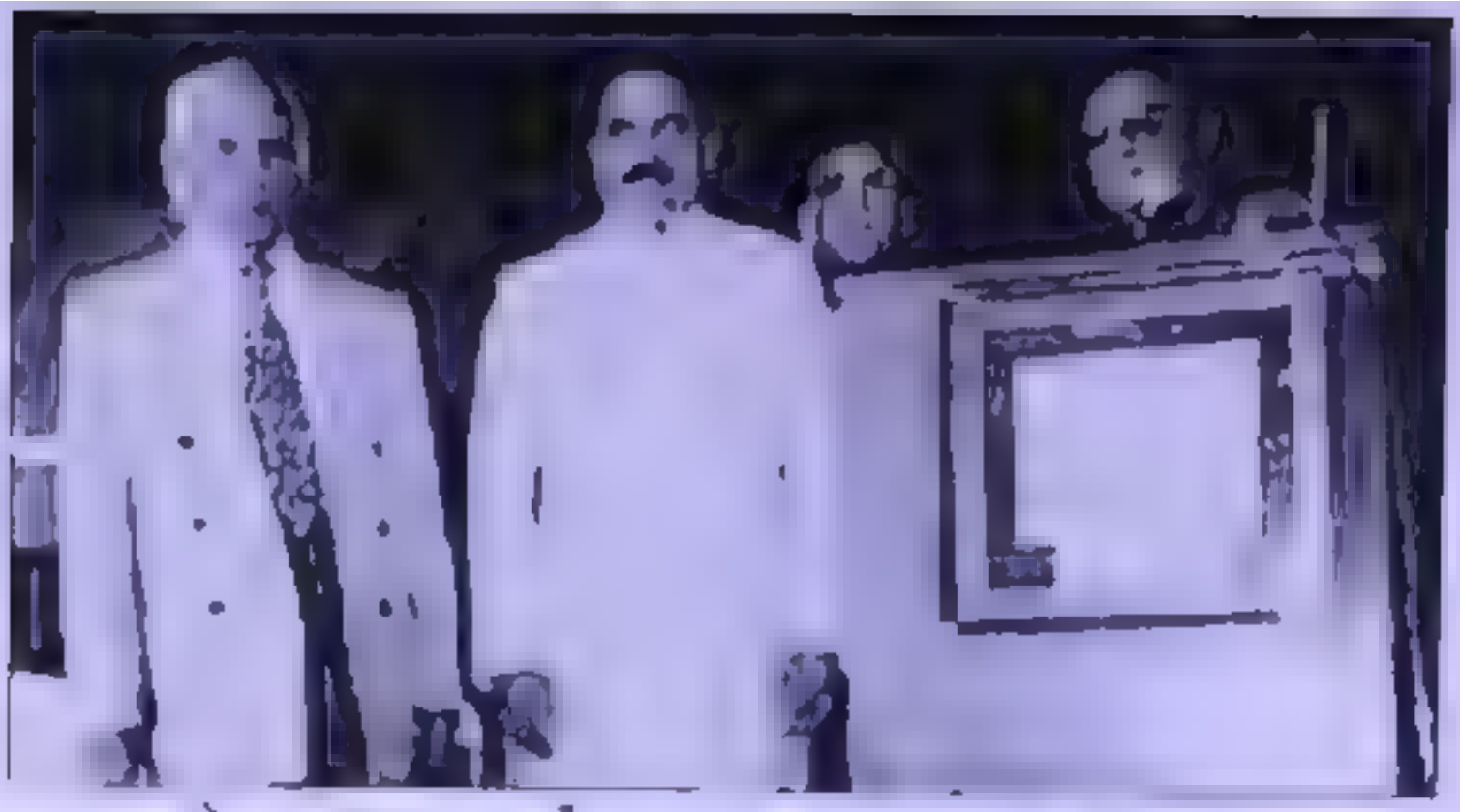

دائیں سے بائیں امجد اسلام امجد، ڈاکٹر عبدالرحمان عبید، تقی عابدی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالب اقبال اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں شمیم رجز، تقی عابدی اور سہیل عمر

دائیں سے بائیں: شجاع کامل، حیدر رضا، ضیاالدین شکیب، تقی عابدی، نامعلوم

سرفراز احمد اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: اقبال [illegible]، سلیم، زاہد تقی اور [illegible]

دائیں سے بائیں (استادہ) اشفاق حسین، مہر سلطانہ، افتخار حیدر، تقی عابدی، اطہر رضوی
(بیٹھے ہوئے) بلال نقوی، اکبر حیدری، مشکور حسین، انیس اشفاق

ڈاکٹر عبدالجلیل اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں ناصر شمسی، جاوید اقبال، تقی عابدی، رشید صدیقی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ریاض، دبیر، پیرزادہ قاسم، وسیم بریلوی

بائیں سے: [illegible] رجایہ، نامعلوم، اسعد گردیزی، نورالہدیٰ،
نامعلوم، حنیف اخگر، نامعلوم، تقی عابدی، نامعلوم

بائیں سے: [illegible] تقی عابدی، [illegible]

دائیں سے بائیں رضا علی عابدی، تقی عابدی، گوندل، ہیبر رضوی

دائیں سے بائیں مہدی، تقی اور سرفراز

دائیں سے بائیں سبزاواری، تقی عابدی، پاپولر میر تھی

دائیں سے بائیں ۔۔۔ ارشی، تقی عابدی اور ڈاکٹر جمیل جالبی

دائیں سے بائیں ۔۔۔ گوپی چند نارنگ، تقی عابدی، انور احمد، وکیل انصاری، نامعلوم

دائیں سے بائیں ۔۔۔ تقی عابدی، [illegible]

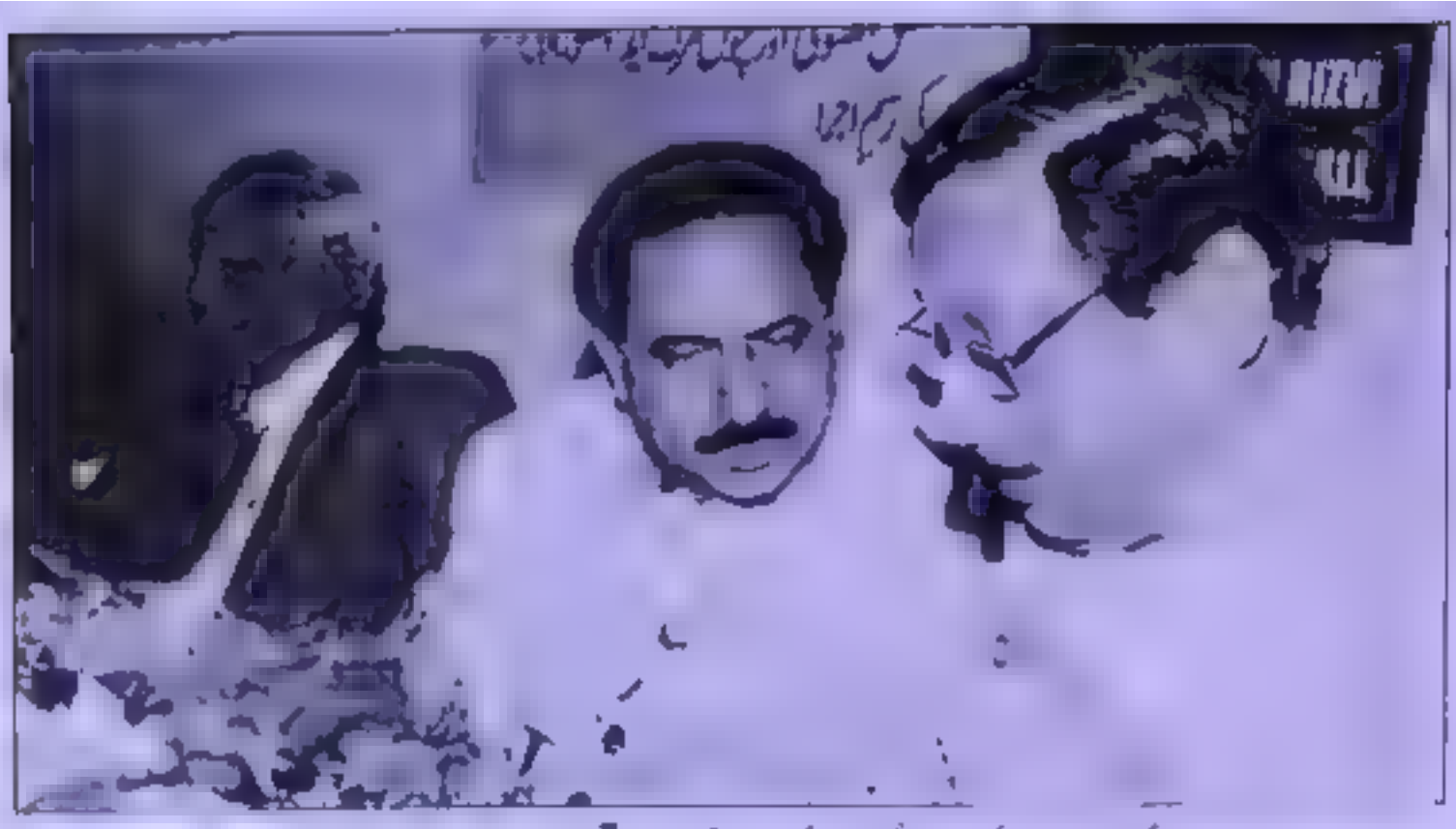

دائیں سے بائیں وائس چانسلر یونی ورسٹی، تقی عابدی اور عمر انصاری

دائیں سے بائیں نامعلوم، عابدی نوگانوی، تقی عابدی، عقیل جعفری

دائیں سے بائیں نامعلوم، خلیل الرحمان، تقی عابدی، پروفیسر صدیق

دائیں سے بائیں تقی عابدی، مشہور حسین بٹریا، طہیر رضوی اور لدمیلا وای لیوا

دائیں سے بائیں نامعلوم، اطہر رضوی، ڈیانا میتھیوز، تقی عابدی، لدمیلا وسی لیوا، خان، عطا اللہ قریشی

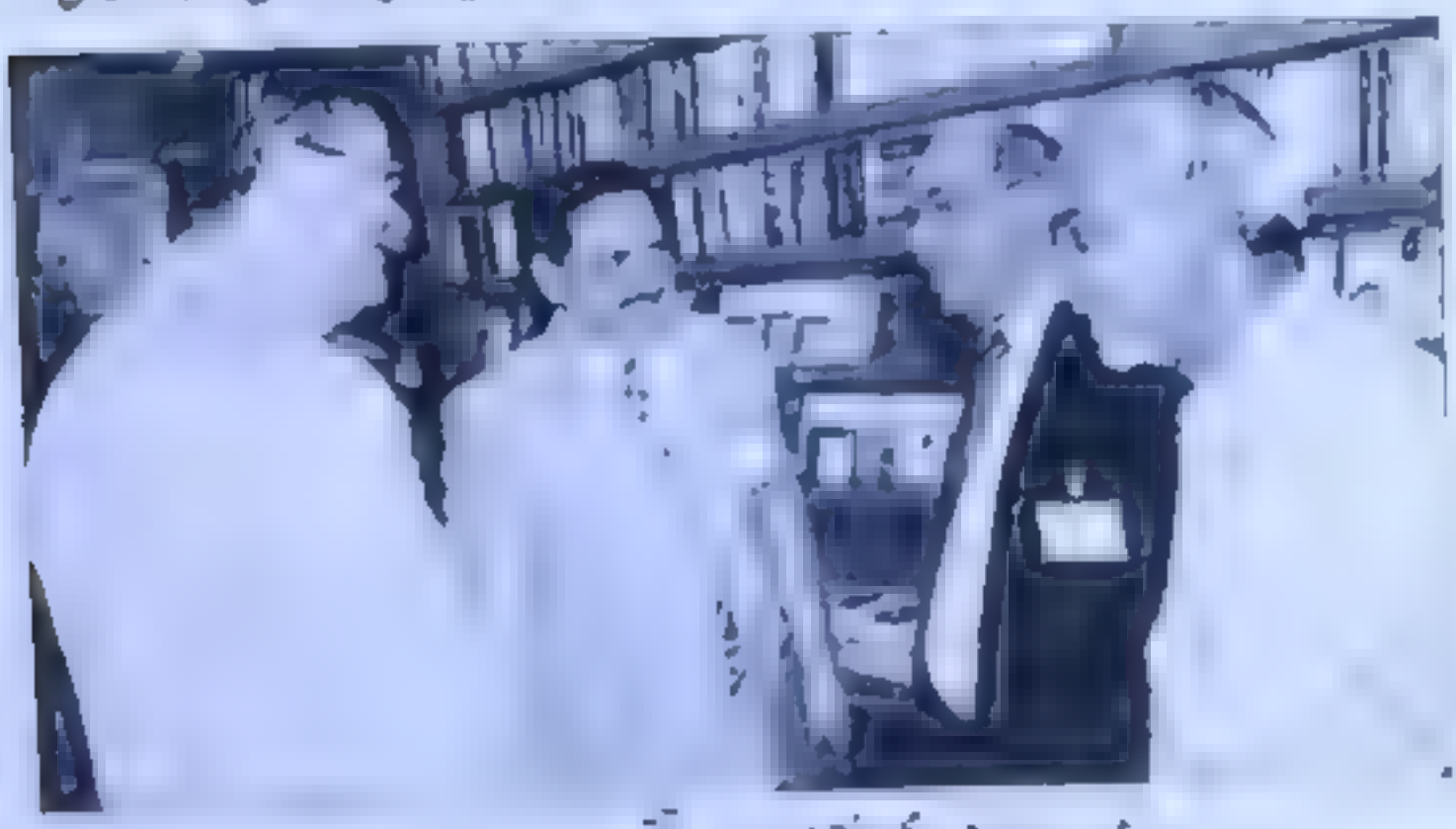

دائیں سے بائیں محمد نقی، محمد تقی عابدی، [illegible]

دائیں سے بائیں نامعلوم، ہما، تقی عابدی، شاہد حسین

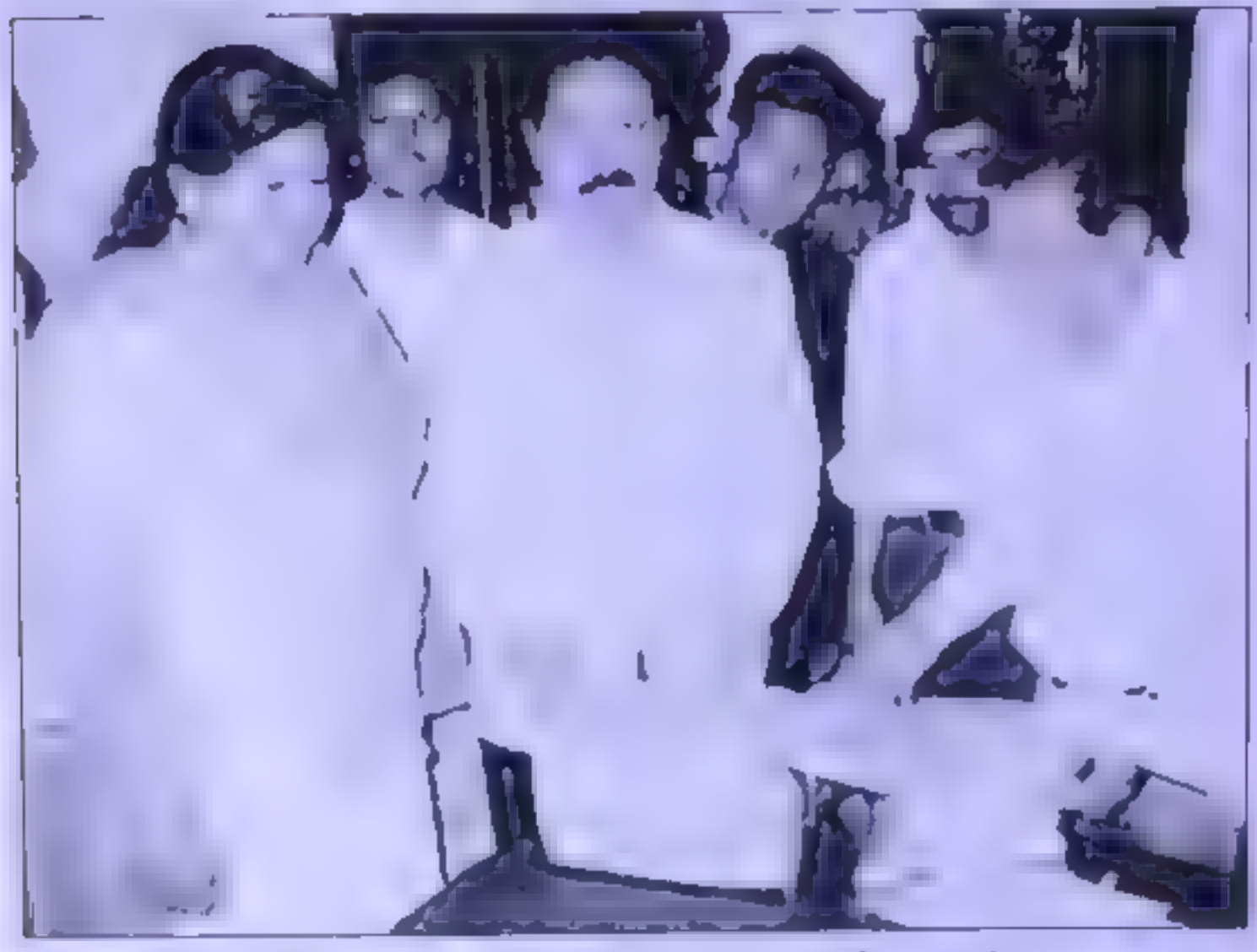

دائیں سے بائیں وقار الدین، شاہد حسین، تقی عابدی، نامعلوم، ہما

دائیں سے بائیں مسٹر رجاوید باقر زیدی، تقی عابدی اور عارفہ

الہ آباد یونیورسٹی میں تقی عابدی کی رہنمائی کرتے ہوئے۔
رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی "یہ" کی رہنمائی کرتے ہوئے۔

دائیں سے بائیں تقی عابدی، پروفیسر علی احمد فاطمی [illegible]

نیر اسعدی اور تقی عابدی

پروفیسر علی احمد فاطمی اور تقی عابدی

۱۹ میں سے بائیں تقی عابدی، ندا میاداد، اسی لیوا، ڈیوڈ میتھیوز اور عبر سلطانہ

ویلیل انصاری ورلڈ کپ کے اعجاز کے ساتھ

[redacted] تقی [redacted] ندا [redacted] حیدری [redacted] تقی ڈیوڈ میتھیو
تقی [redacted] [redacted] تقی [redacted]

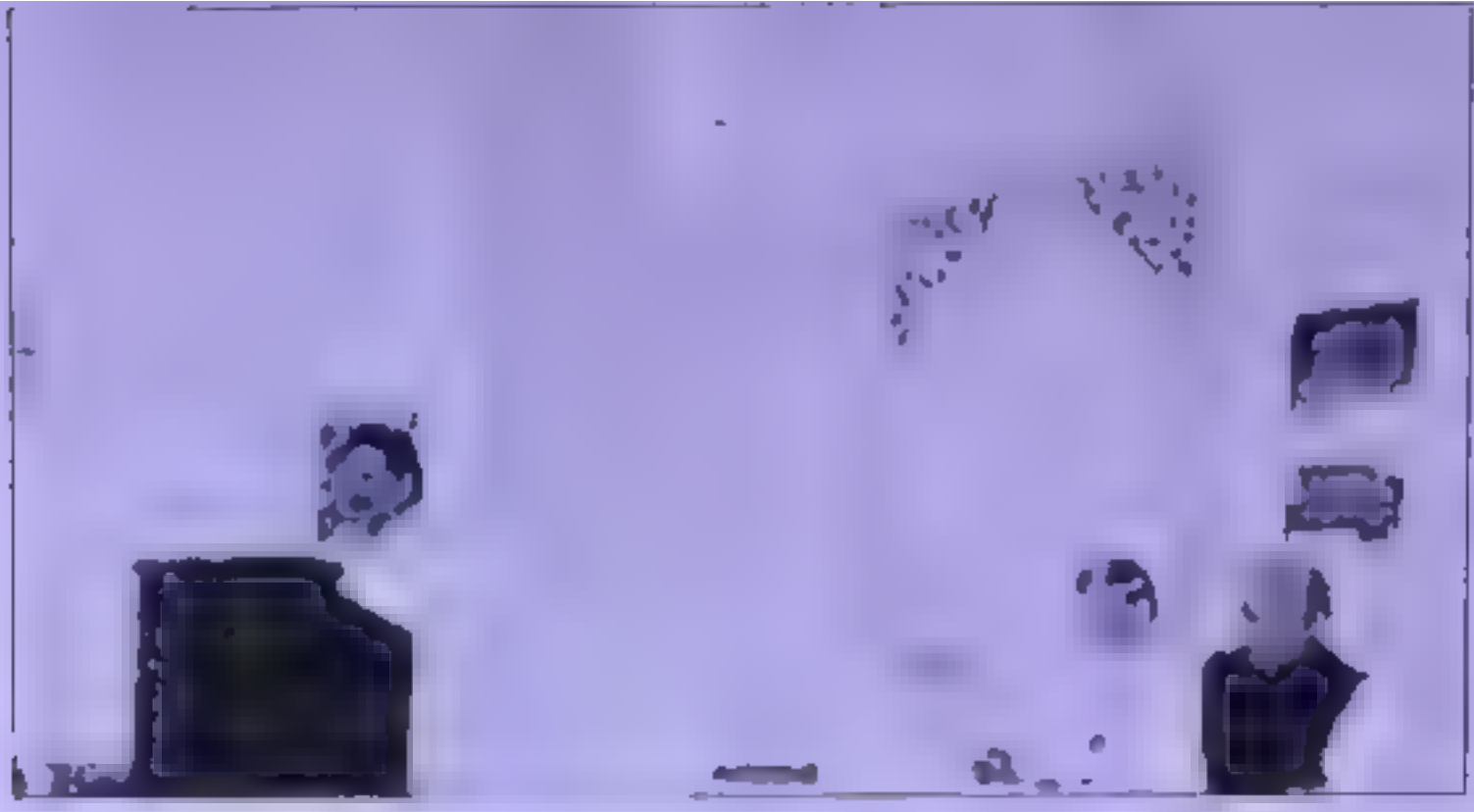

دائیں سے بائیں نسیم فروغ، ذیشان میتھیوز، لدمیلا داسی لیوا اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: انیس اشفاق، تقی عابدی، ذیشان میتھیوز، لدمیلا داسی لیوا، ور، جمال قادری

دائیں سے بائیں سید علی رضا، باقر زیدی، تقی عابدی، نسیم فروغ

سابق وزیراعظم ہند آنجہانی کے ساتھ

تجربہ کار سیاستدان کی رہنمائی

سابق وزیراعظم ہند آنجہانی مسز اندرا گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سابق وزیراعظم ہند آنجہانی لال بہادر شاستری اور آنجہانی عابدی

"یادگار رائیٹس" کی رونمائی بدست سابق پریزیڈنٹ پاکستان، نامعلوم، ملک صاحب، تقی عابدی

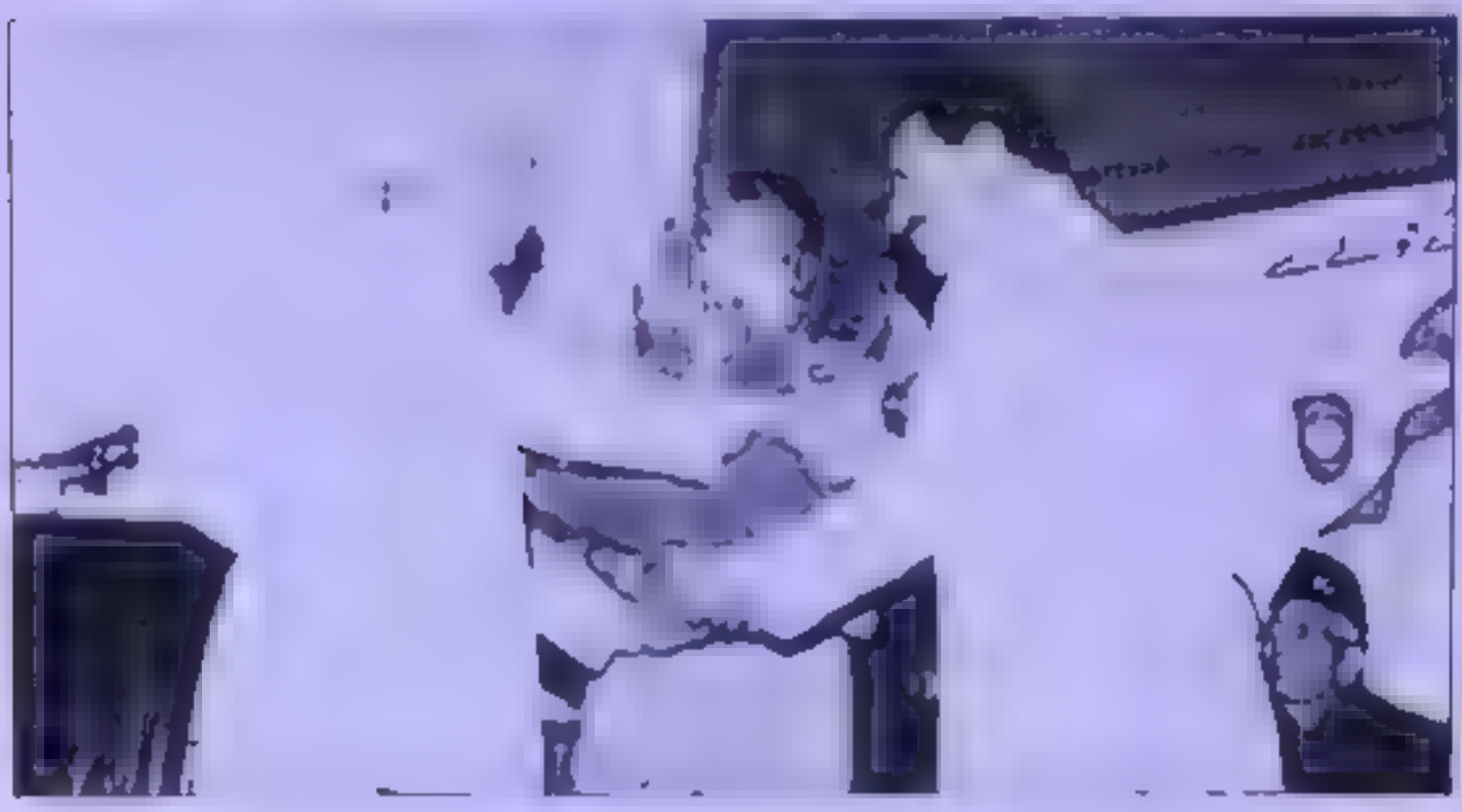

شہزاد انجم کے ساتھ

دائیں سے بائیں تقی عابدی، شبیہ الحسن اور شہزاد انجم

تقی عابدی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری

دائیں سے بائیں بلال نقوی، کاظمی، تقی عابدی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مختار احمد اور سحر انصاری

دائیں سے بائیں بلال نقوی، کاظمی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں (ایستادہ) مسعود خان، نامعلوم
(بیٹھے ہوئے) ظہیر الدین مقبول، تقی عابدی، شان الحق حقی، مصنف، شعر، عابد جعفری

دائیں سے بائیں شان الحق حقی، عابد جعفری، تقی عابدی، مسعود خان

وزیر آغا کے ساتھ

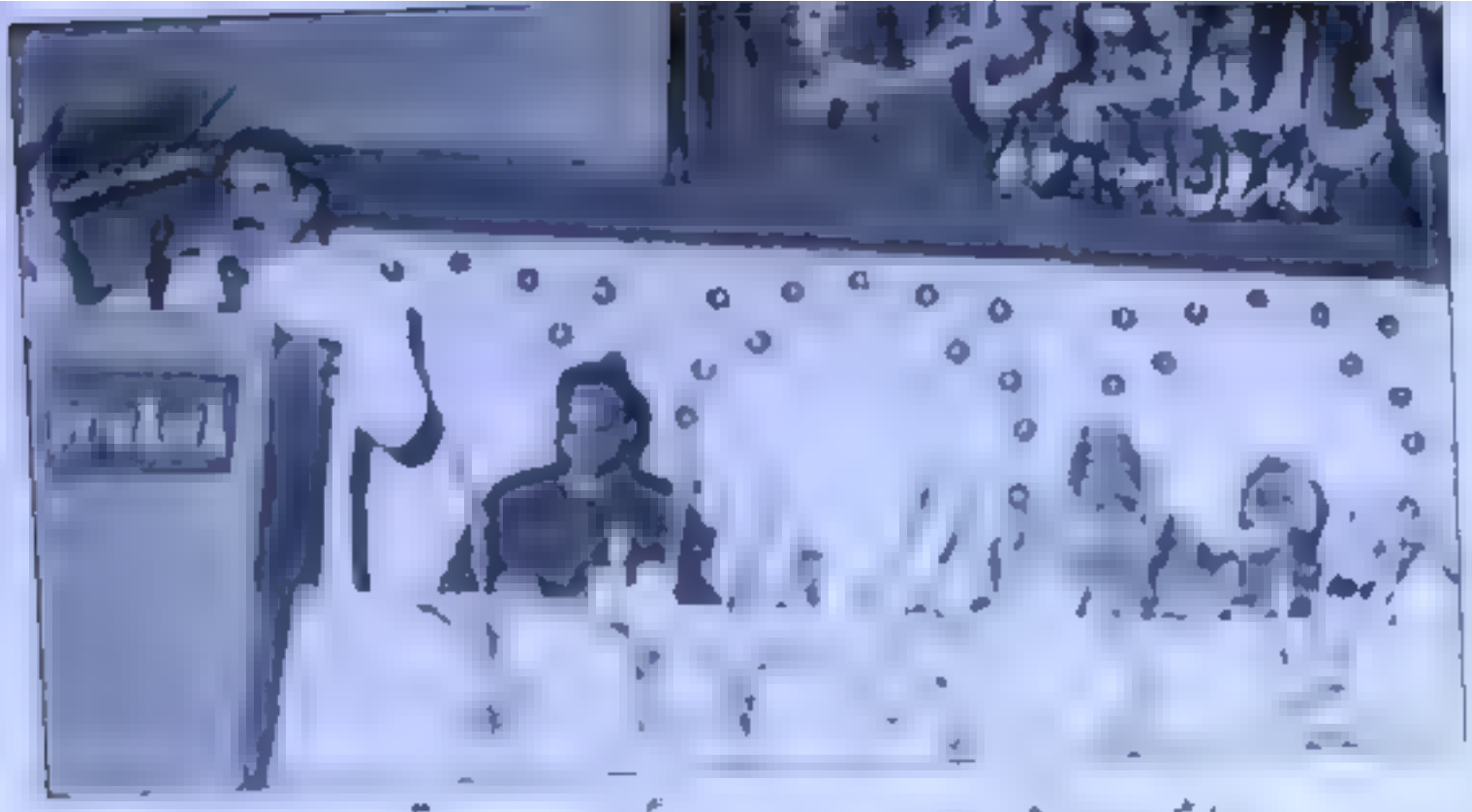

دائیں سے بائیں حامد مروہوی، حنیف اختر، نورا مروہوی، تقی عابدی

جعفری نقوی سے ساتھ

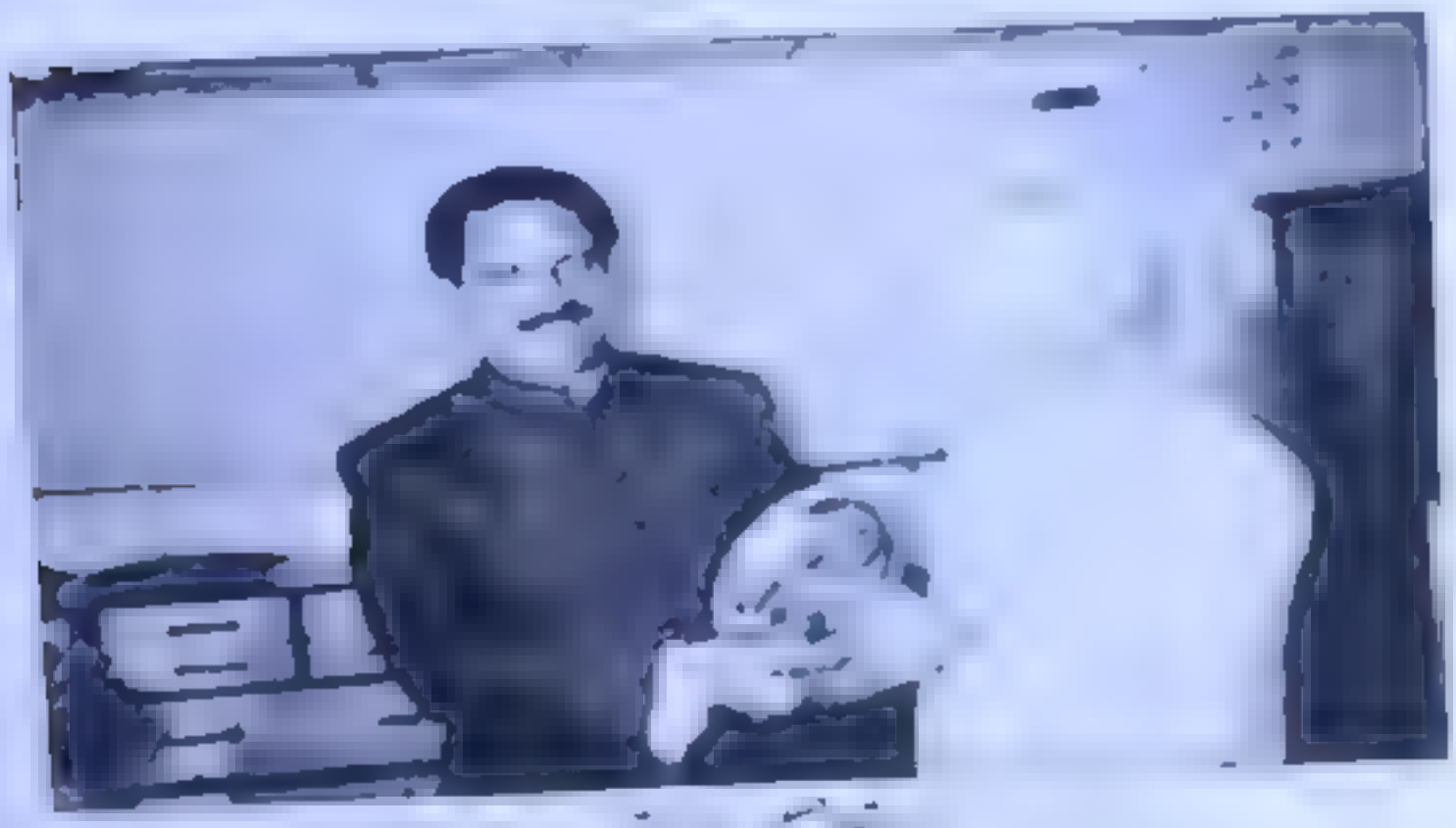

تاجر حسین سے ساتھ

یاسر خالد کے ساتھ

سعادت سعید کے ساتھ

شاہد مہدی کے ساتھ

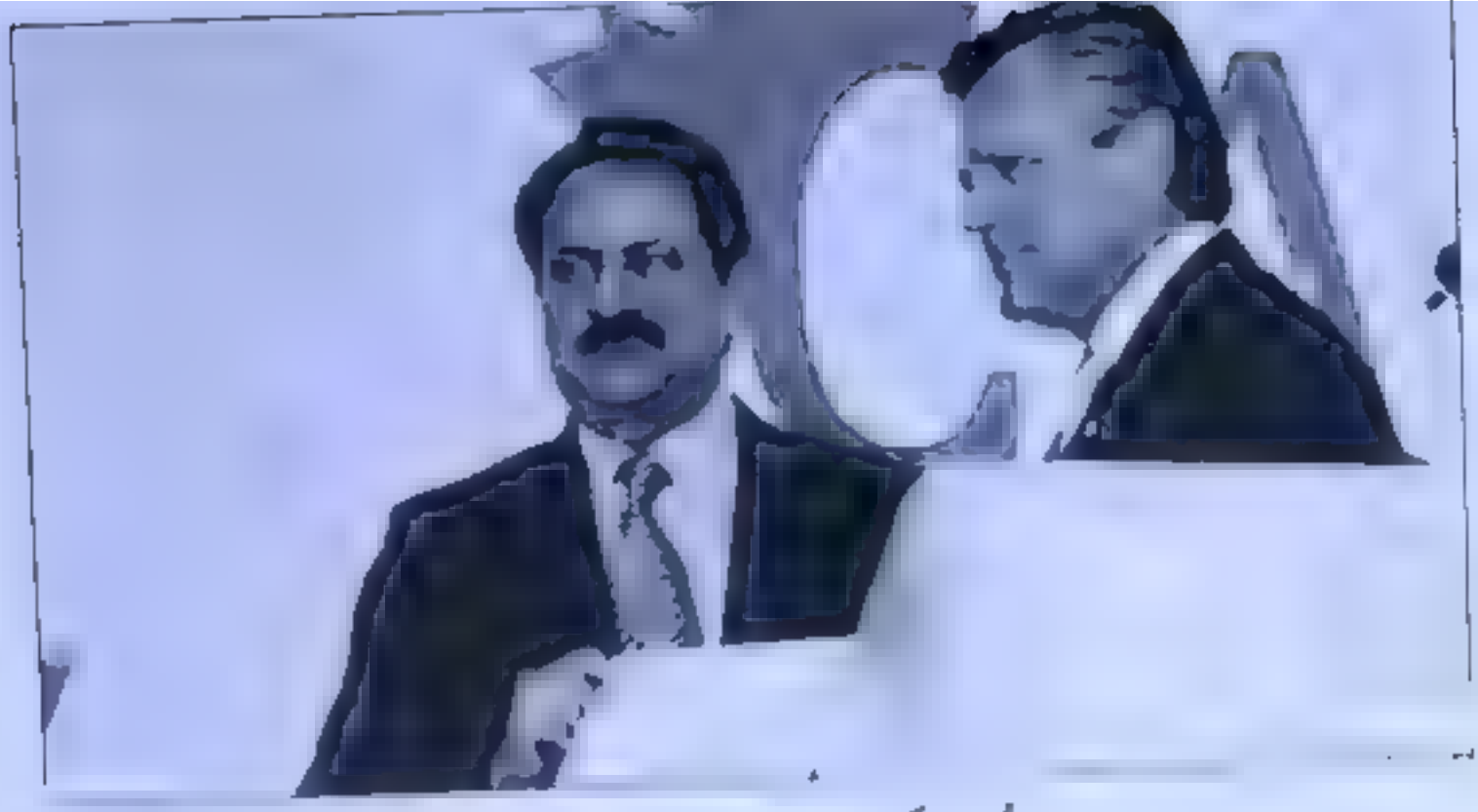

نورنٹو کے میر (Mayor) کے ساتھ

دائیں سے بائیں [illegible] حاجی [illegible]

[illegible]

دائیں سے بائیں تقی عابدی، گوندل، خلیق انجم

باقر زیدی کے ساتھ

تقی عابدی اپنے میں آفس میں

دائیں سے بائیں: ہدایت علی شاعر، مصطفیٰ زیدی، فرمان فتح پوری، پیرزادہ قاسم اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، انتظار حسین، سلیم احمد، شبیہ الحسن

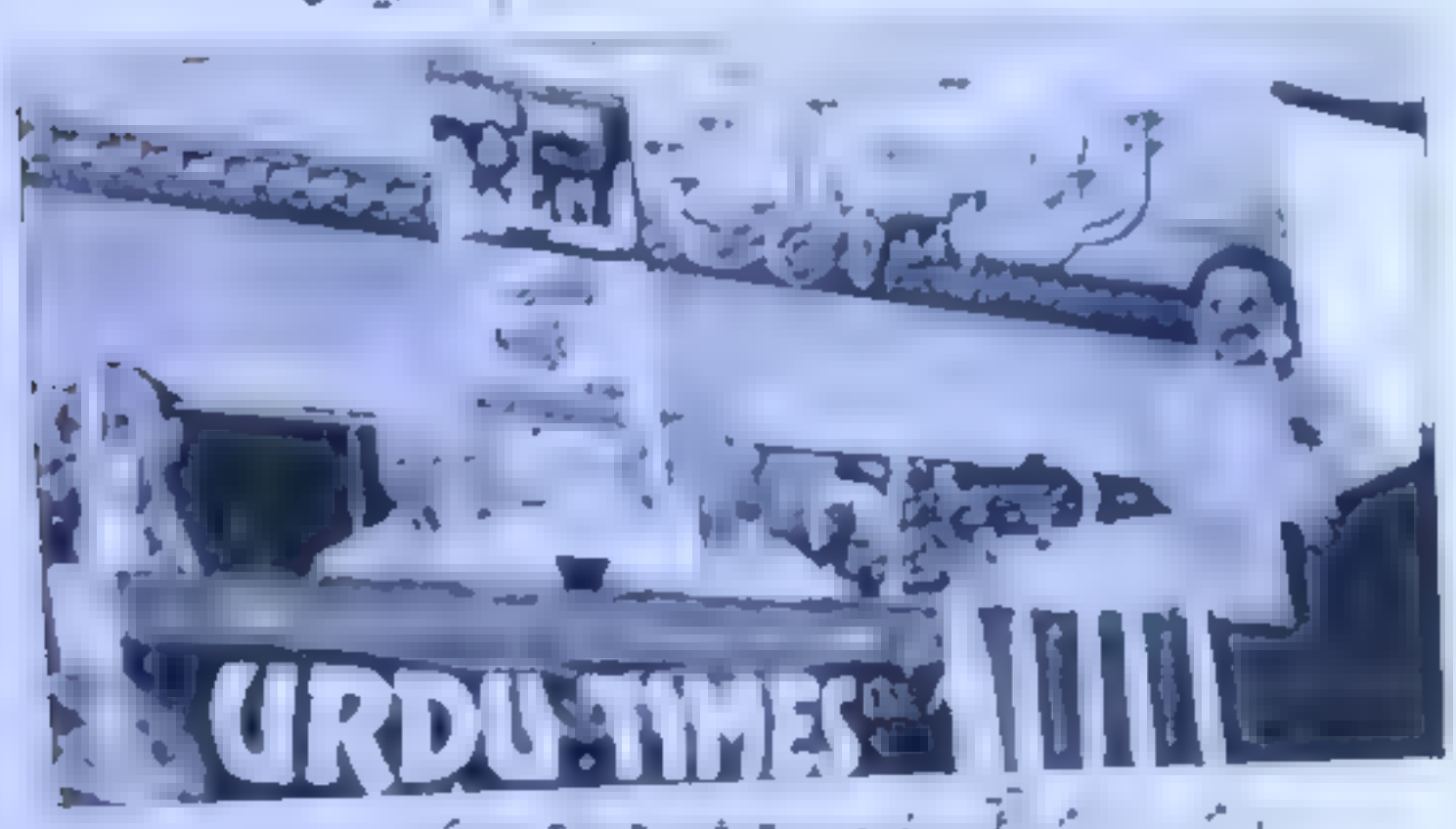

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ہدایت علی شاہ، [illegible]

دائیں سے بائیں تقی عابدی، نامعلوم، مشکور حسین، رفعت علی عابدی

دائیں سے بائیں ڈائنا نارنگ، شارب ردولوی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں تقی عابدی، ڈائنا قمر رئیس، ڈاکٹر نارنگ

مولانا جواد صادق، نقی عابدی، نامعلوم

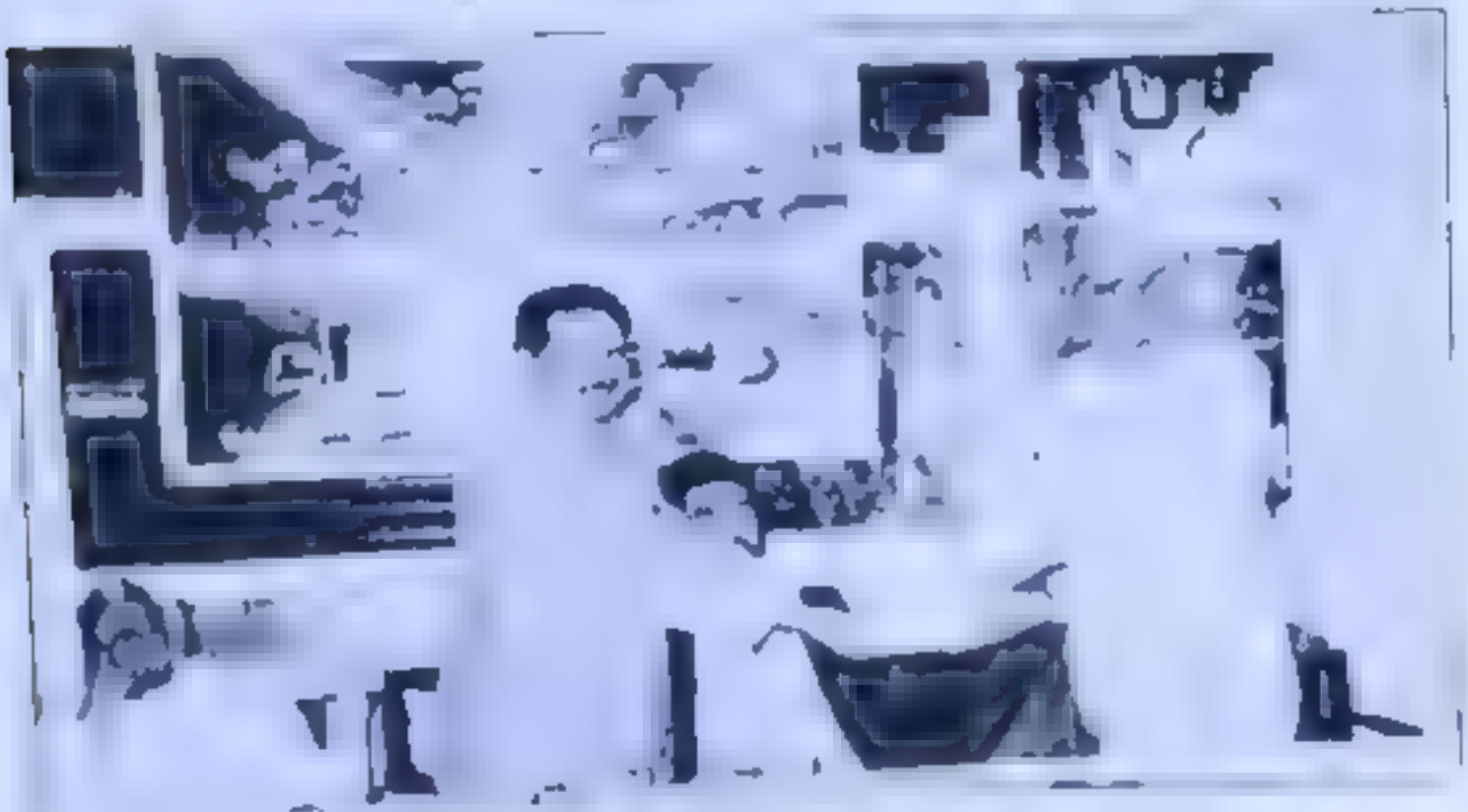

ٹارپ رائٹ کے ساتھ

[illegible]

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مہر سلطانہ، ضمیر جعفری، ملوی، نامعلوم

طرزی صاحب کے ساتھ

پریمی رومانی اور تقی عابدی "عالمی میراث" کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مرغوب عابدی اور ریاض نوگانوی

حیدرآباد (پاکستان) میں بیگ صاحب کے ساتھ

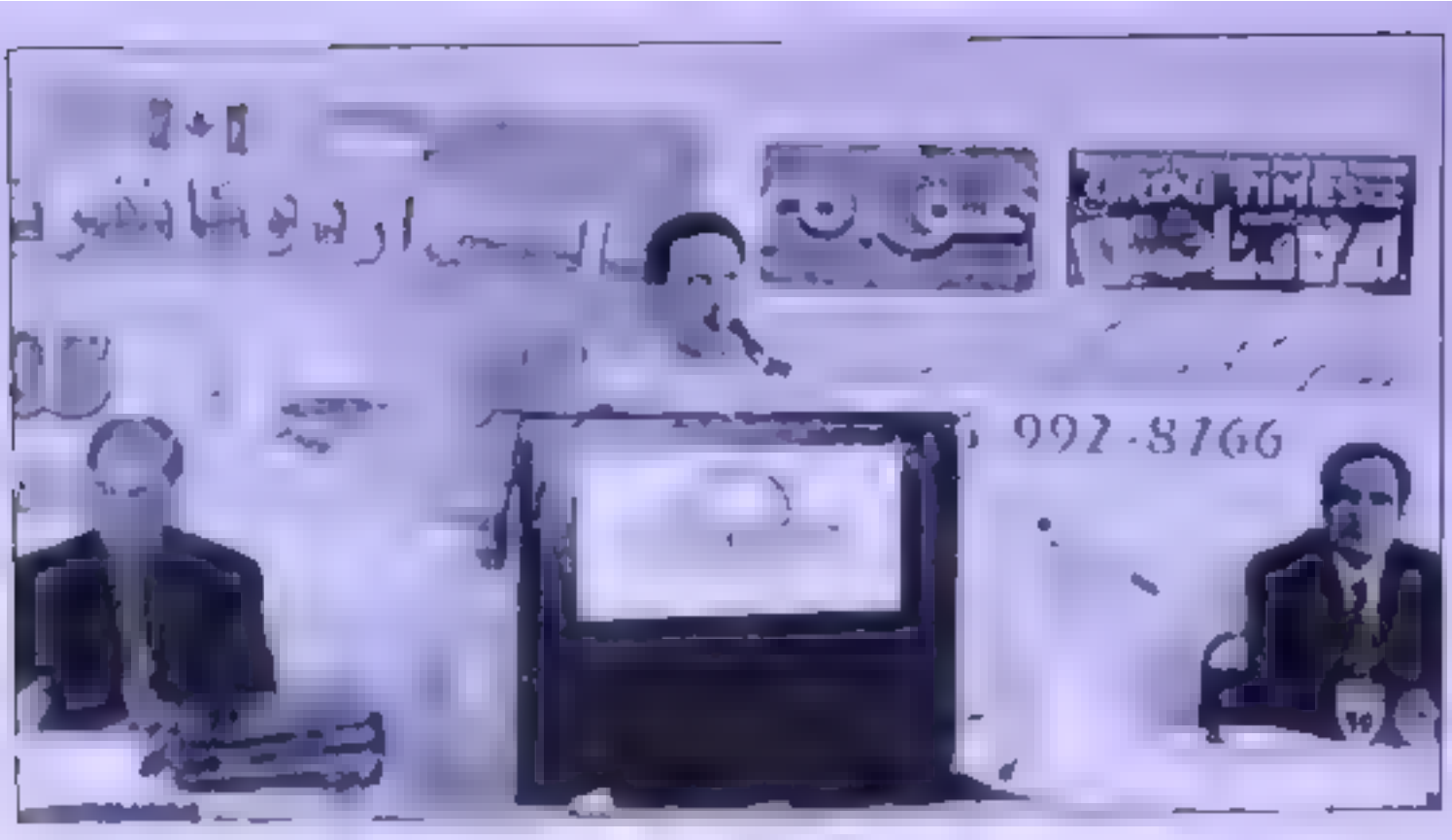

گوندل کے ساتھ

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، وکیل انصاری، تقی عابدی، جمیرہ یوسف

وکیل انصاری کے ساتھ

دائیں سے بائیں تقی عابدی، صادق اور ڈائنا نارنگ

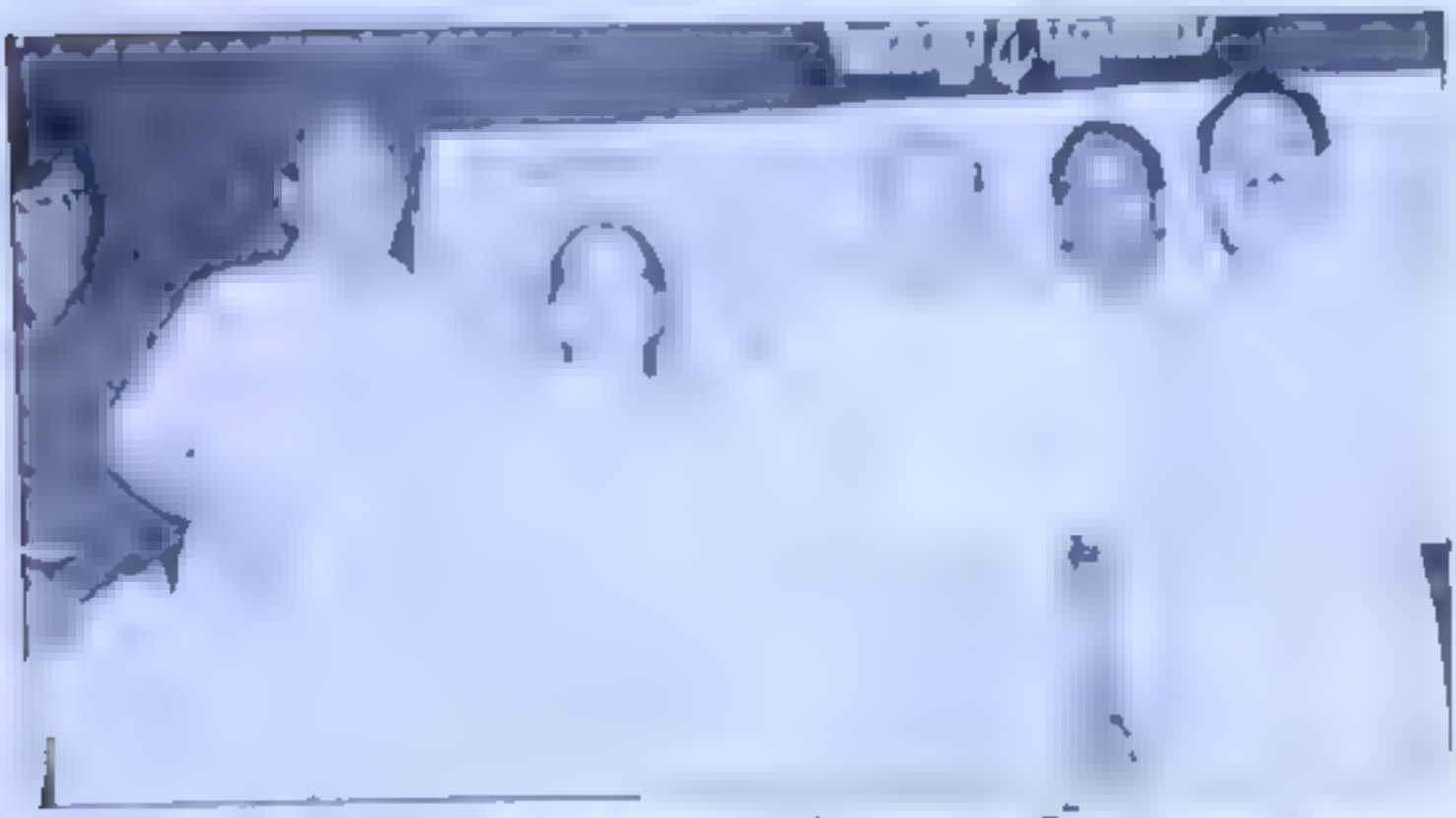

دائیں سے بائیں تقی عابدی، صادق، گوپی چند، عالیہ امام، شاہد مہدی، شمین کاف نظام

دائیں سے بائیں تقی عابدی، صادق، عالیہ امام، محمد تقی، شمین کاف نظام

دائیں سے بائیں: [illegible] حیدری، [illegible] مصوری، تقی عابدی، [illegible]

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سہیل آفندی، ڈاکٹر قمر رئیس

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، جاوید شاہ رب، [illegible] وی، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر نارنگ، سہیل آفندی

دائیں سے بائیں: مولانا کلب صادق، اکبر حیدری، تقی عابدی، نیر مسعود

دائیں سے بائیں: تقی گلبہ گولی، تقی عابدی، جاوید

دائیں سے بائیں: سید تقی عابدی، [illegible]

دائیں سے بائیں عقیل رضوی، جج سہ آباد، فاضل احسن ہاشمی، وی سی انٹ یونیورسٹی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں ڈاکٹر نارنگ، خواجہ حسن نظامی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں گلزار دہلوی، عظیم امروہوی، خلیل الرحمان، تقی عابدی

دائیں سے بائیں نامعلوم، تقی عابدی، ہلال نقوی

"کامیاب بخت" کی رونمائی، ڈائرکٹر فرمان فتح پوری کے ساتھ

دائیں سے بائیں شاہدہ حسن، صبیحہ صبوری، فرمان فتح پوری اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں تقی عابدی، شاہدہ حسن، سحر انصاری، ؟، آنسہ فرحان سیفی، ؟، نامعلوم

دائیں سے بائیں اطہر حسین، حمید رضوی، تقی عابدی، ؟، اے نجم آفندی، نامعلوم

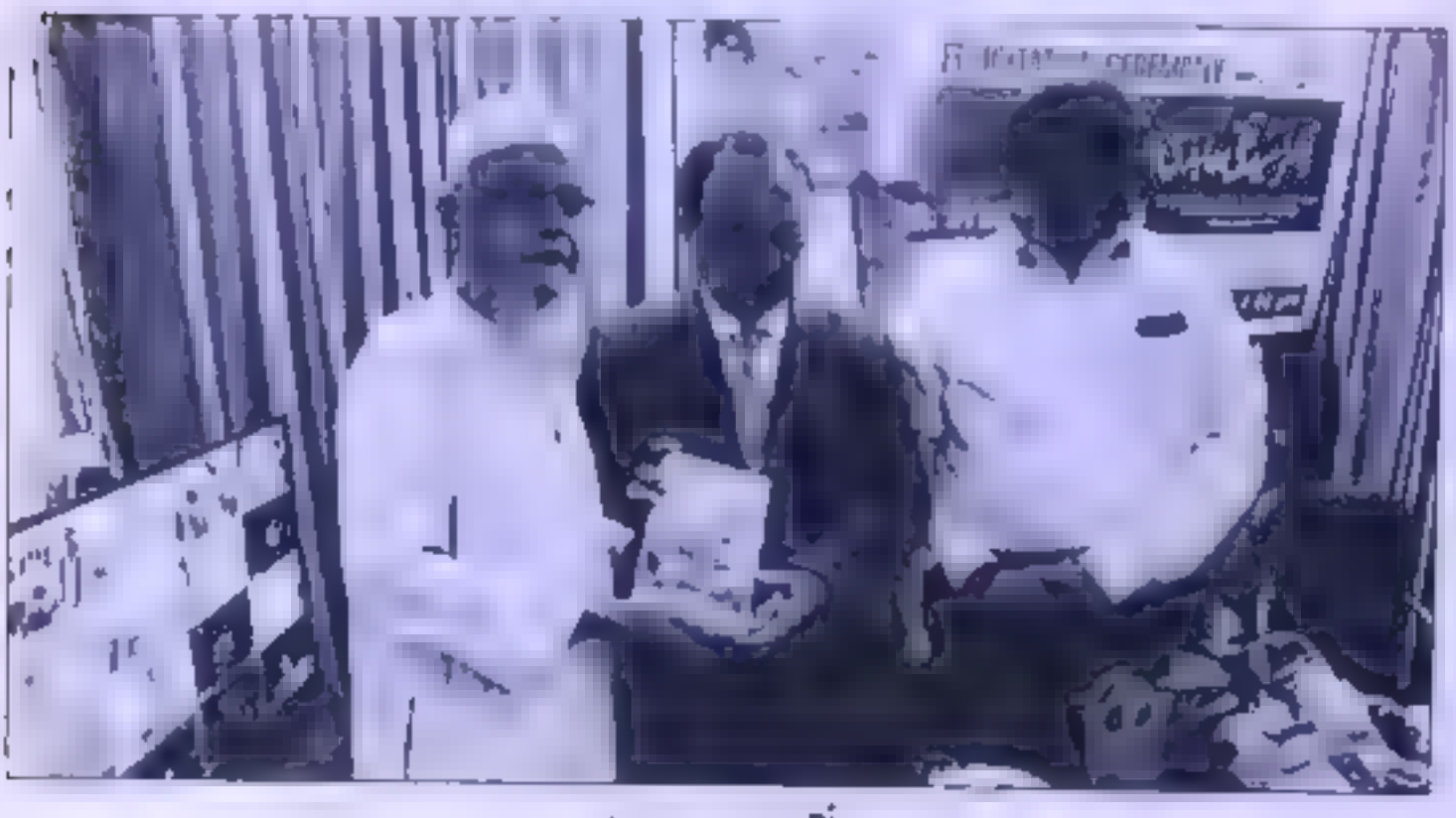

افتخار صاحب رپورٹر

دائیں سے بائیں "کائنات تجمل" کی رونمائی دہلی میں، تجمل حسین عابدی اور مولانا یعقوب عباس لکھنوی

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

دائیں سے بائیں طرزی، تقی عابدی، عاشور کاظمی، اقبال اثر، یحییٰ اعظمی

دائیں سے بائیں تقی عابدی، محمد فیاض اور ریاض فاطمی

محمد خان استقبال کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: عظیم امروہوی، تقی عابدی، ریحان عظمی

پروفیسر موسوی، تقی عابدی کو کتابیں پیش کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: [illegible] تقی عابدی [illegible]

عالمی مشاعرے ایوان غالب میں تقی عابدی

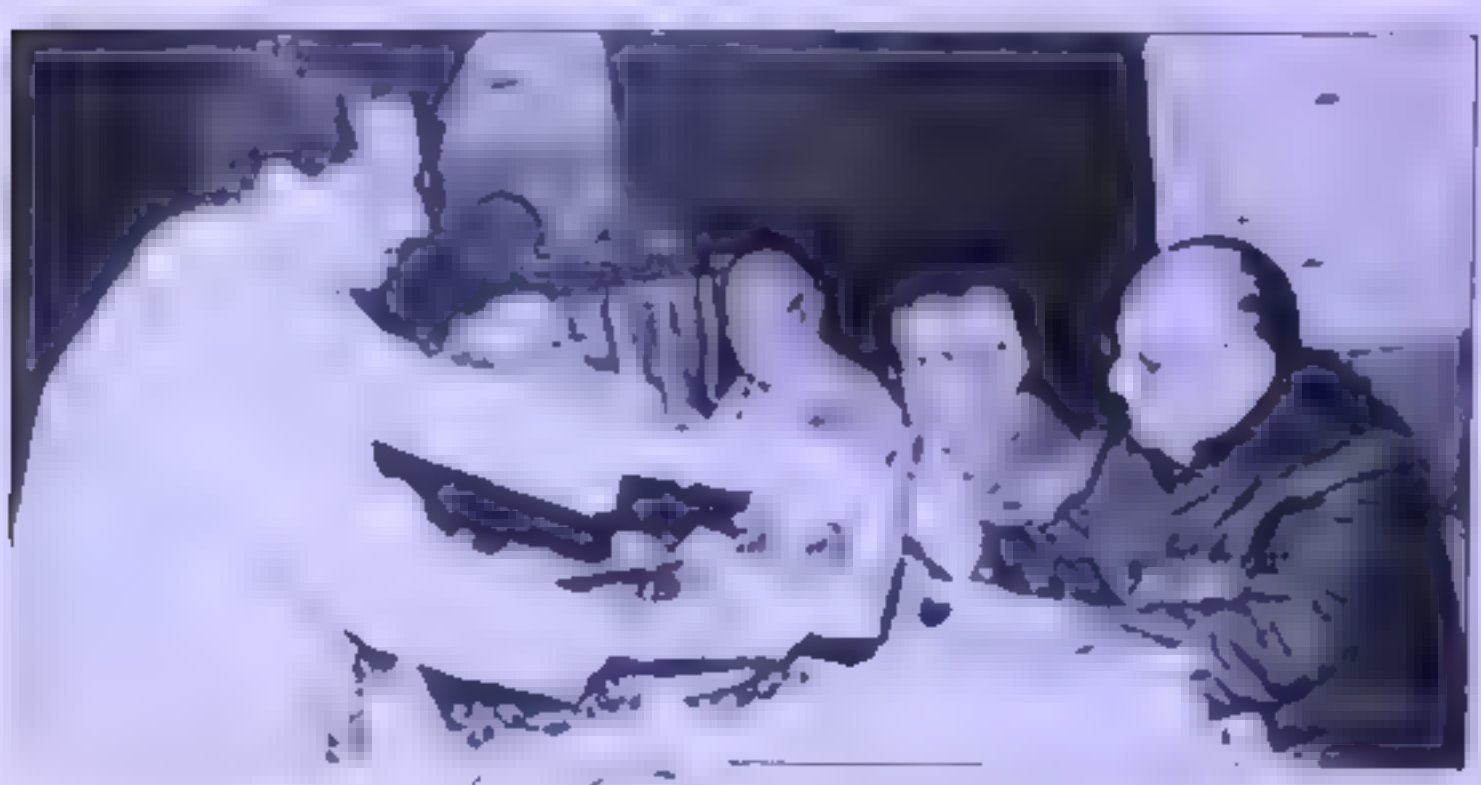

"دیوان نعت منقبت غالب" کی رونمائی
دائیں سے بائیں ارجن سنگھ، قریشی، امیر حسن عابدی اور تقی عابدی

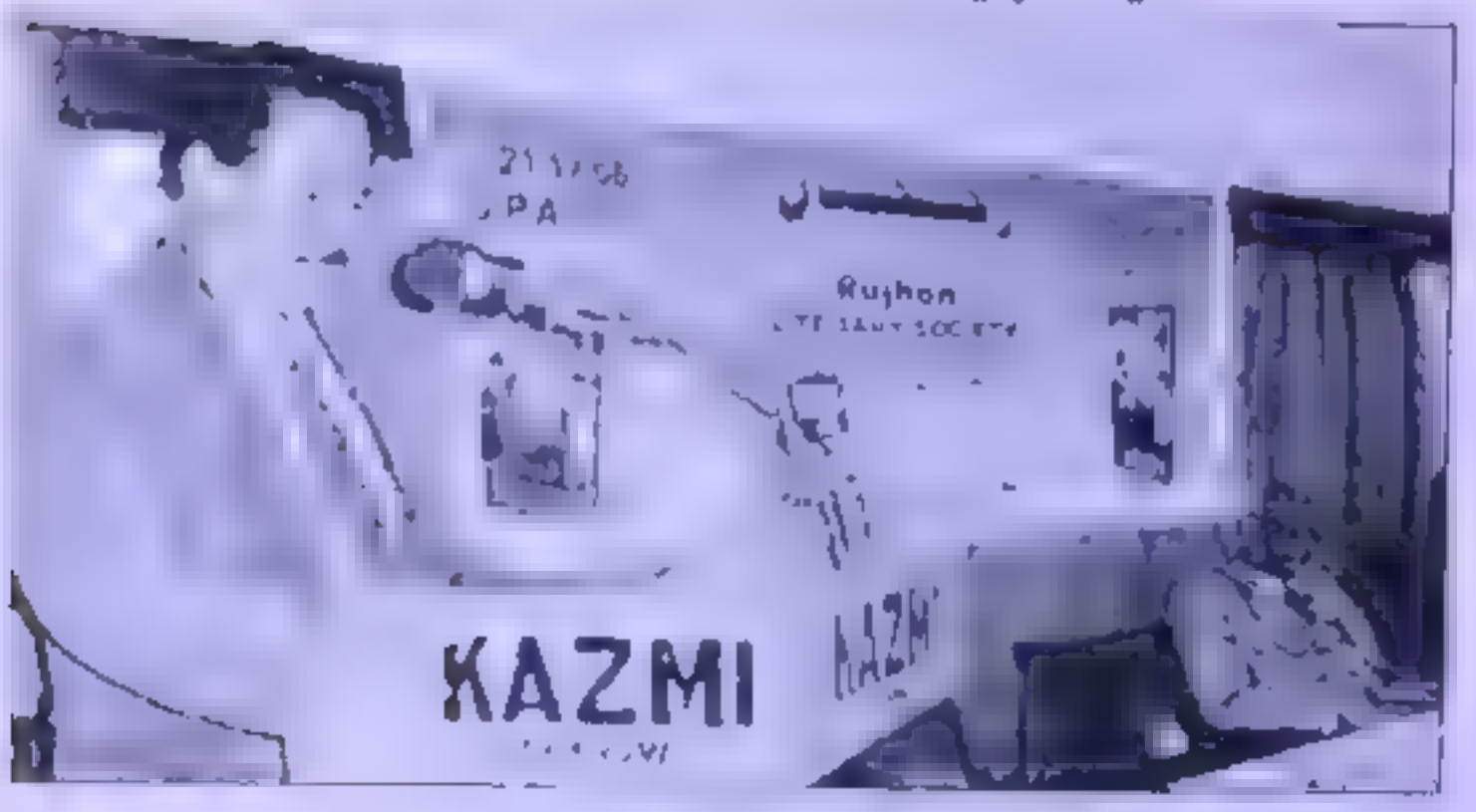

خمر انصاری، تقی عابدی

"دیوان نسخہ مصنفہ غالب" کی رونمائی

دائیں سے بائیں قمی حامدی، نامعلوم، یحییٰ نشیط، کوثر مرزا، نامعلوم، ف۔س۔ اعجاز

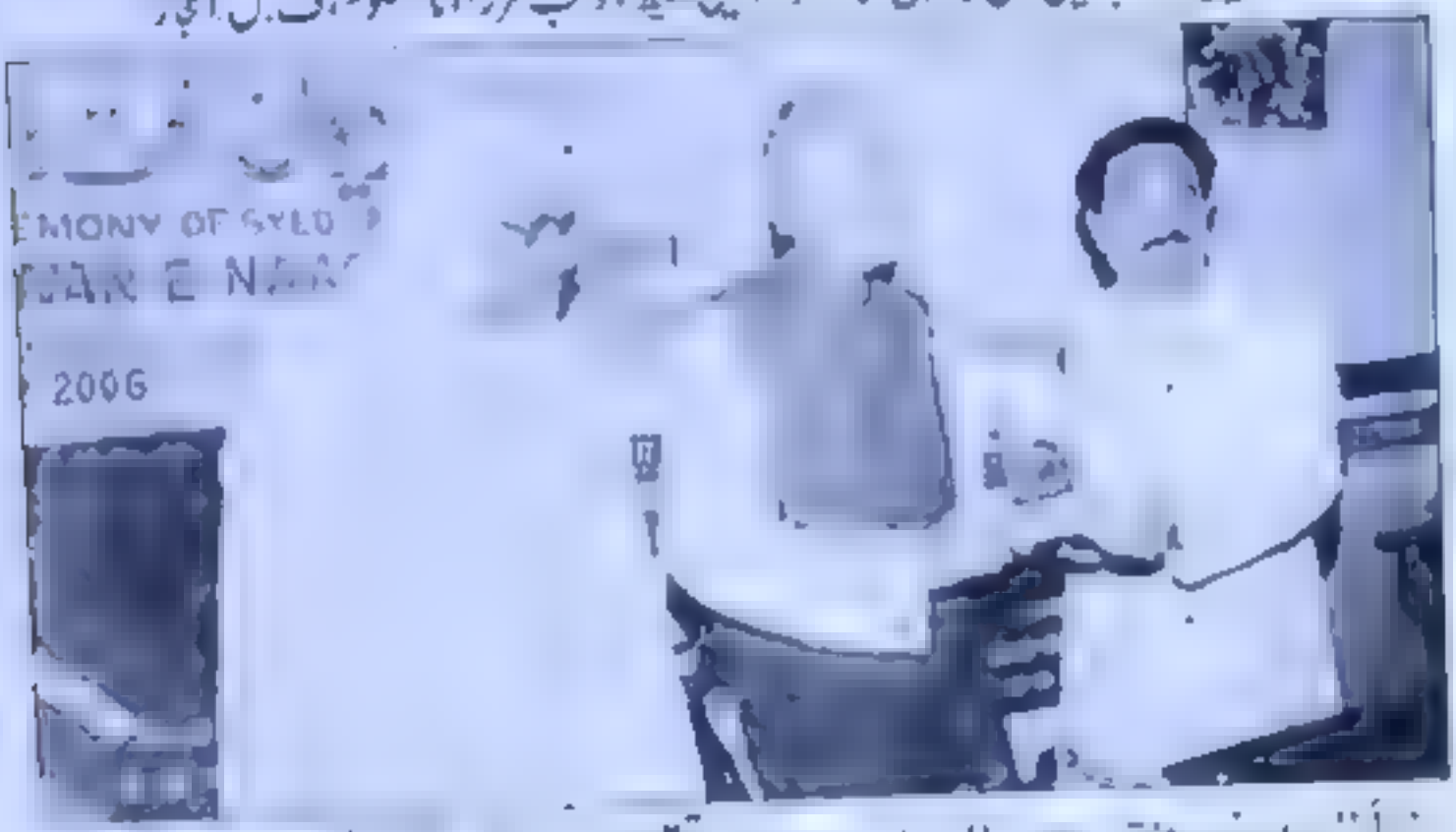

رونمائی "دیوان نسخہ مصنفہ غالب" میں سے بائیں قمی حامدی، بنگال اسپیکر ہاشم عبدالحلیم اور یحییٰ نشیط

بائیں سے دائیں شہرچاکسی، قمی حامدی، نامعلوم، نامعلوم اور نامعلوم

دائیں سے بائیں عبدالجلیل نقی عابدی، عبدالوہاب

نقی عابدی صاحب حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے

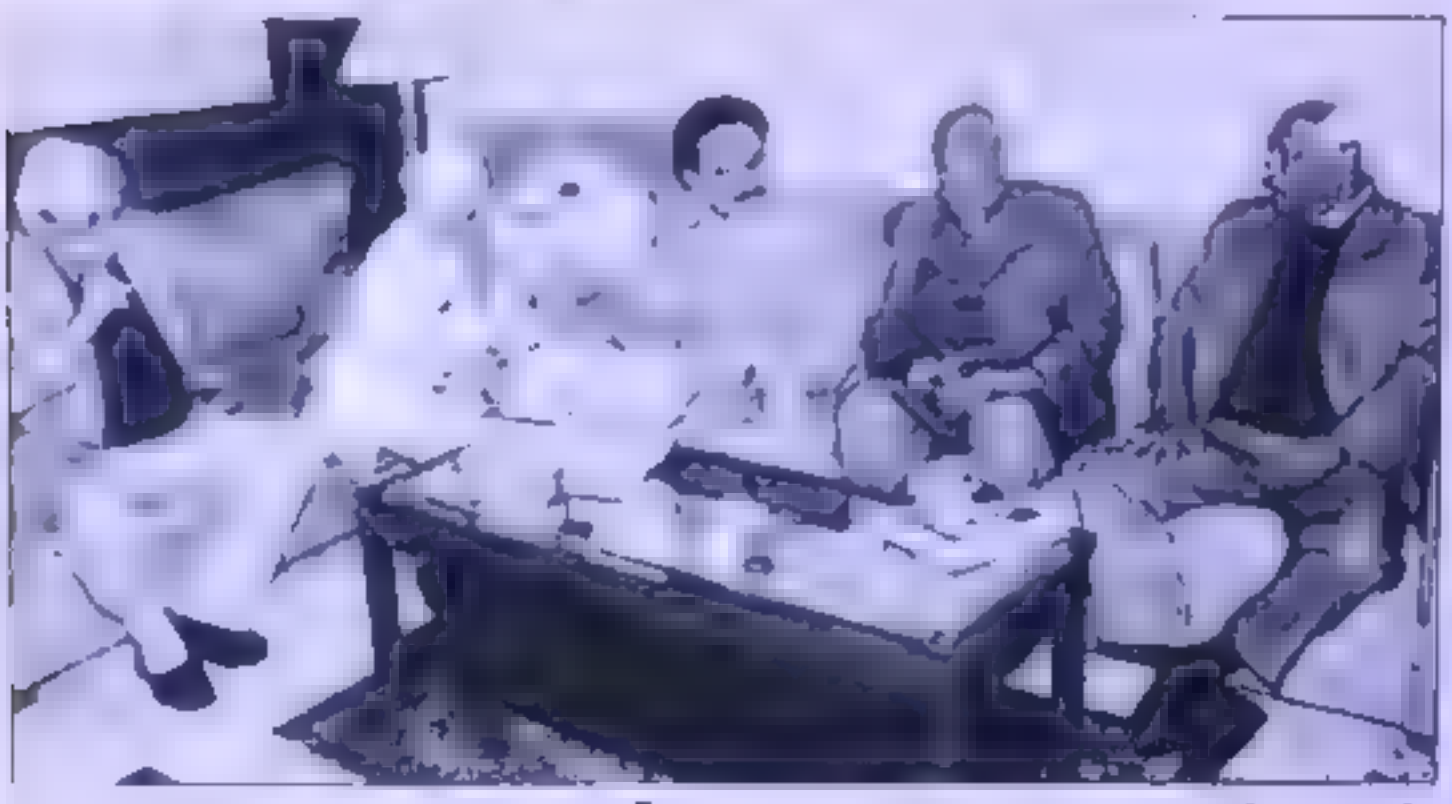

دائیں سے بائیں گورنر اے آر قدوائی، امیر حسن عابدی، نقی عابدی، گلزار دہلوی، صدیق الرحمن قدوائی

تقی عابدی افتتاحی خطبہ

دائیں سے بائیں ندیم سید عبدالجلیل، ڈائریکٹر تقی عابدی، نامعلوم

دائیں سے بائیں [illegible] تقی عابدی صدف، نامعلوم، عارف لقمانی

نذیر ناجی سے ملاقات

دائیں سے بائیں: صحافی تقی عابدی، عبدالجلیل پٹھان

دائیں سے بائیں: درخشاں، شکیل رفیق، عبدالجلیل، تقی عابدی، امت غوری، پرویز سامی

دائیں سے بائیں وکیل انصاری، نامعلوم، ندیم سید، تقی جاوید، عبدالجلیل، ڈاکٹر ناریگ، خلیل الرحمان

محمد تقی جاوید

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر ہاشمی، محمد عابدی، عتیق عابدی اور تقی عابدی

نورنگا میں ایوارڈ لیتے ہوئے

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، عتیق عابدی، تقی عابدی، تابش خان زادہ، انور خواجہ

دائیں سے بائیں: نجمہ آپا، تقی عابدی، مہر سلطانہ، کیتی عابدی، نامعلوم

"چوں مرگ آمد" اور "تشنج لعنوی" کی رسم رونمائی

دائیں سے بائیں: نفیس احمد، جمیل جالبی، روشی، تقی عابدی، ہمرا انصاری، نامعلوم

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، نامعلوم، نامعلوم

مائی مشاعرہ پڑھتے ہوئے

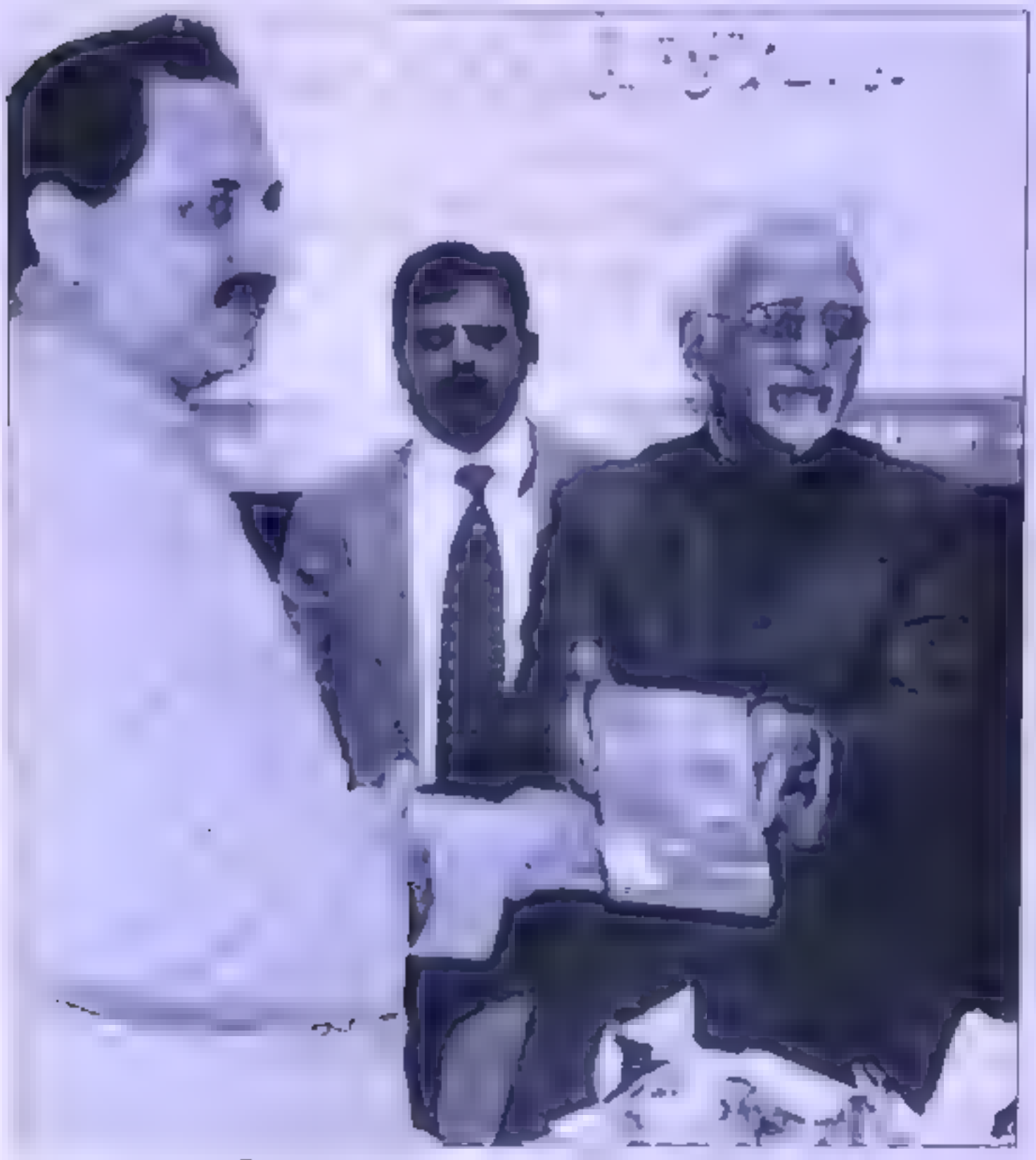

"چوں مرگ آمد" کی رونمائی، نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری، فتی عابدی

نیویارک میں ڈاکٹر عبدالباری، علی گڑھ المنائی ایوارڈ پیش کرتے ہوئے، ڈاکٹر حمید کے ساتھ

بائیں سے: بائیں آنکھی عابدی، ڈاکٹر نارنگ، اصاف سعید

بائیں سے: بائیں، رضیہ حامد، آنکھی عابدی

وائیں سے بائیں شاہدہ پروین قریشی

دائیں سے بائیں شاہدہ پروین قریشی عارفہ

دائیں سے بائیں قریشی عارفہ ارشد سلیم اور عارفہ انور بیٹھے ہوئے

"کلام انیس" کی رونمائی میں سے بائیں میم فضل، فاروق ارگلی اور تقی عابدی

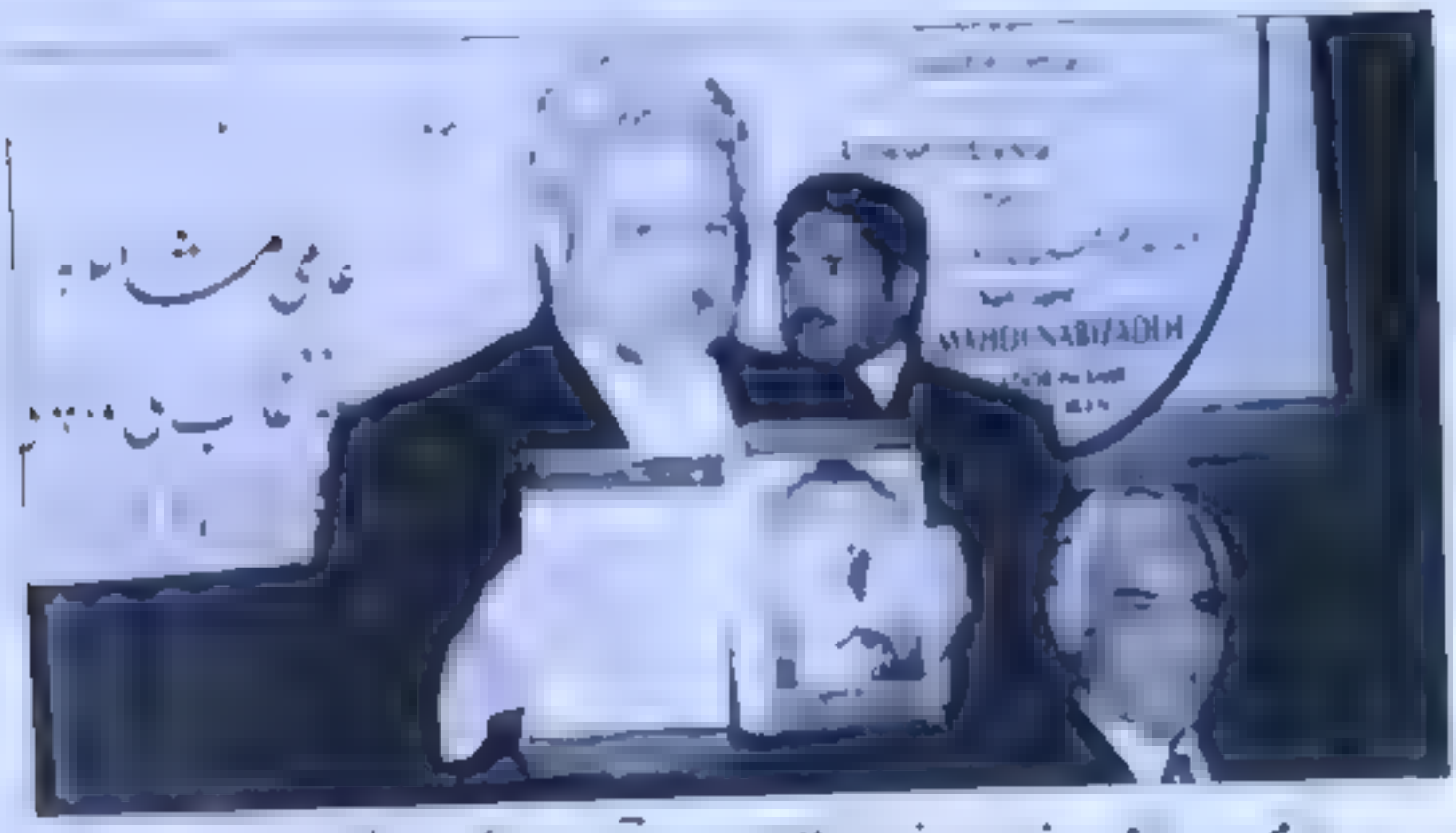

میں سے بائیں "کلیات غالب فارسی" کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں تقی عابدی، تجمل حسین اور محمد شاہ

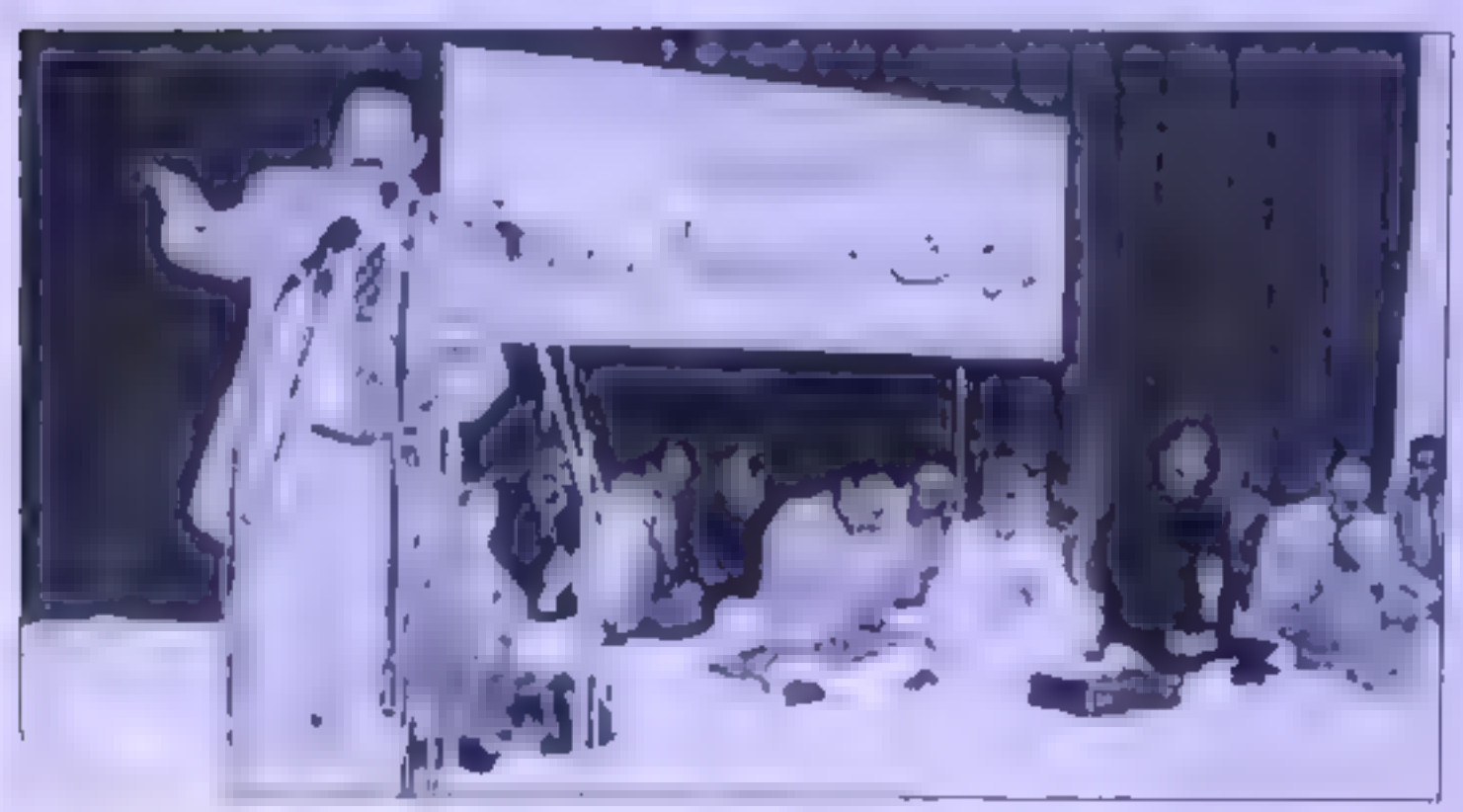

عالمی مشاعرہ پڑھتے ہوئے

دائیں سے بائیں محمد شاہ، نور، امرد ہوئی، حامد، مرد ہوئی، نامعلوم، حنیف اختر، نامعلوم، تقی عابدی

حیدرآباد میں: اکبر جاوید اور پروفیسر مجید بیدار کے ساتھ

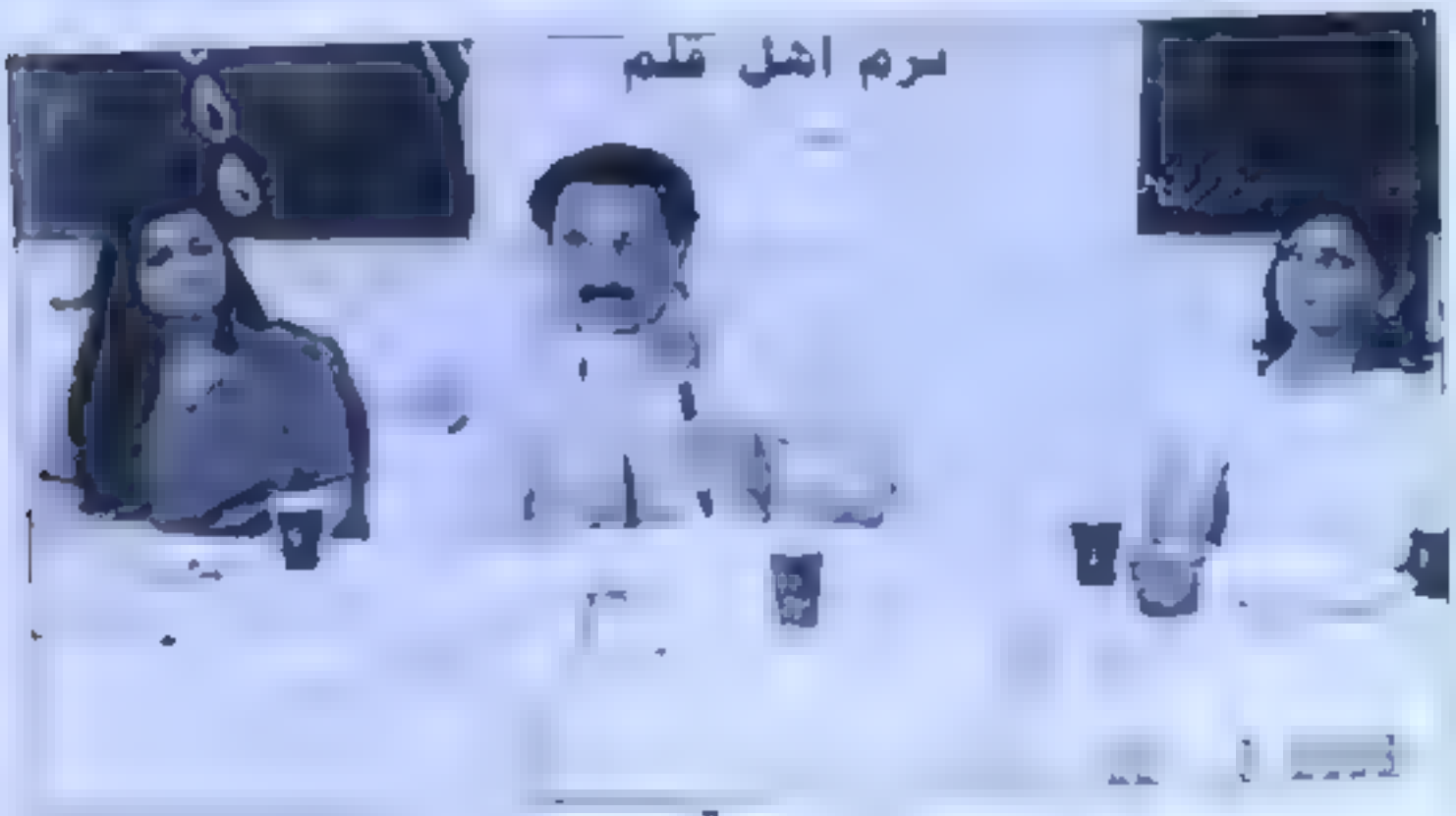

دائیں سے بائیں: حسن شاہد، تقی عابدی، ارم قادری

مرثیہ کانفرنس، پونے یونی ورسٹی، میں سے بائیں: مظفر، تقی عابدی

دائیں سے بائیں شاہد مہدی، عظیم امروہوی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں گلشن فضہ تقی عابدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

دائیں سے بائیں پرنس شکیل، ارم بتول اور تقی عابدی

''دیوان غالب'' کی رونمائی، دائیں سے بائیں تقی عابدی، وی سی کشمیر یونی، روشنی، اکبر حیدری

حسین مائل نقی عابدی

نور مرزہوی، تقی عابدی

(بائیں سے دائیں بیٹھے ہوئے) حسین مائل نقی عابدی، وی سی کشمیر یونی، اکبر حیدری

دائیں سے بائیں نذیر، تقی عابدی، صدف مرزا، عارف نقوی

بائیڈل برگ میں

دائیں سے بائیں زیبا، ارم قادری، تقی عابدی، شہناز، دارا بانو اور صدف مرزا

دائیں سے بائیں اقبال حیدر، نامعلوم، تقی عابدی اور نکہیل خان

اپنی فوجگ کے رئیس کے ساتھ

بائیں سے دائیں اپنی شریکِ حیات تقی عابدی شیخ مر

دائیں سے بائیں تقی عابدی، ابوالحسن نغمی، بیگم یاسمین نغمی، ستیہ پال آنند اور مونا شہاب

"جشن گلزار" انجمن یونی ورسٹی، دائیں سے بائیں تقی عابدی، ڈاکٹر شہاب ملک،
جناب گلزار صاحب، وائس چانسلر منوج جھا، ورنا [illegible] شہباز قمر

دائیں سے بائیں عمر فاروق، تقی عابدی، عارف نقوی

دائیں سے بائیں: نذیر تقی جاہدی، عارف نقوی، صدف مرزا

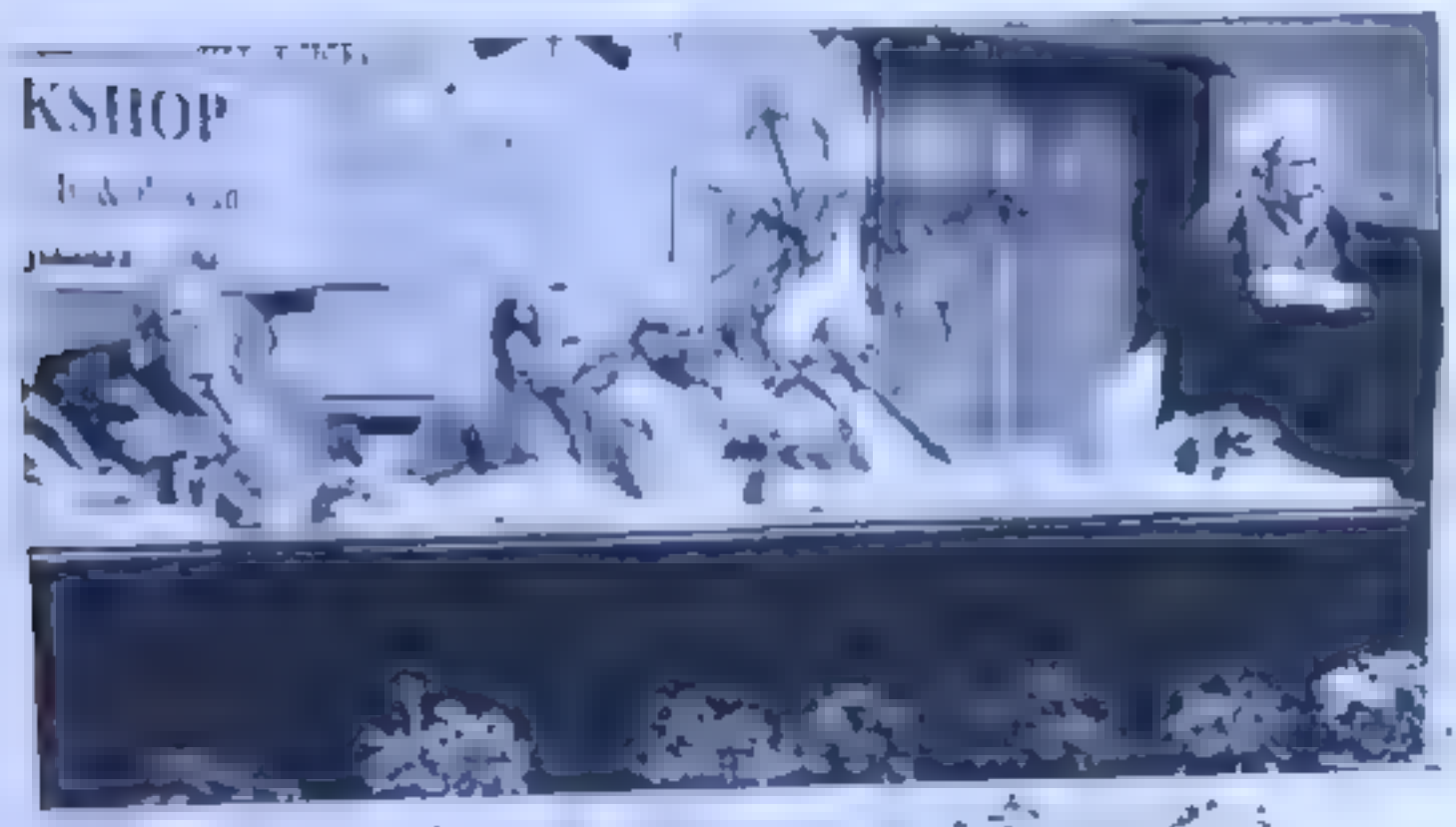

زہرا جبیں اور ڈاکٹر گوپی چند کے ساتھ

دہلی میں NCPUL کے چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر کے ساتھ

نیویارک میں ڈاکٹر گوپی چند، ڈاکٹر آفتاب چوہدری اور ڈاکٹر فرید چوہدری

نیو سٹن میں پروفیسر جعفری اور حشرت قرین کے ساتھ

استنبول کانفرنس میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین، عروج راج پوت، مدیحہ ہاشمی کے ساتھ

معروف فلم ڈائریکٹر ایس سلیمان کے ساتھ

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر شجاع کامل، حیدر رضا، کمال صدیقی، تقی عابدی، شاہد کامل

تقی عابدی عالمی مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر شجاعت، بیگ احسان، نامعلوم، فاطمہ پروین، ضیاء الدین، تقی عابدی

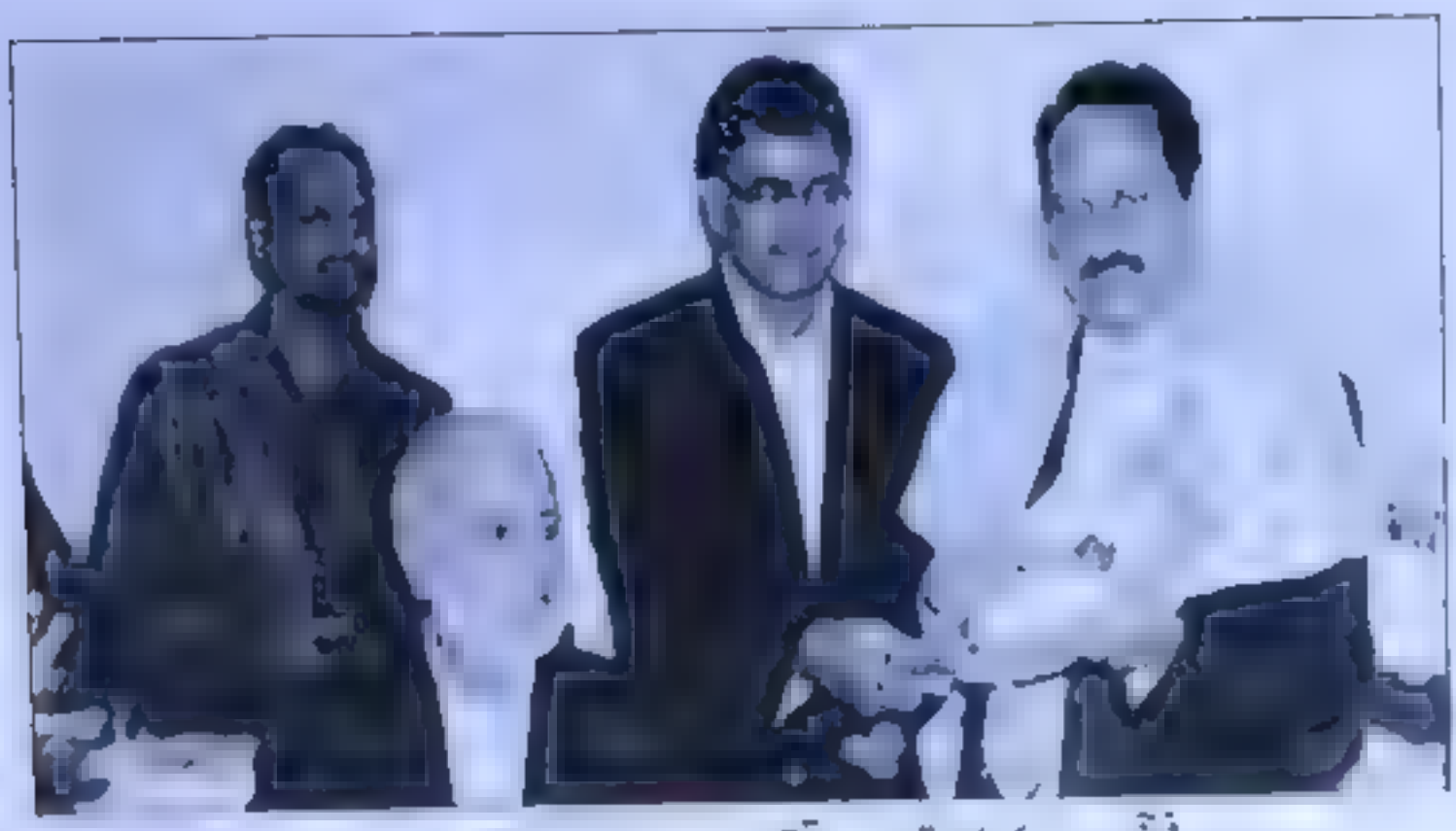

فیفتھ صدی کی چہلی تقریب، آقی عابدی، ضیاالدین شکیب صاحب

دائیں سے بائیں، مصور آقی عابدی، پروفیسر آقی خان، بیگ احساس اور شبیحت راشد

پروفیسر آقی عابدی، عبدالصمد نظامی اور دیگر

ضیاء الدین شکیب، ڈاکٹر شجاعت راشد اور تقی عابدی کے ساتھ

ڈاکٹر فاطمہ پروین اور ضیاء الدین شکیب

کلکتہ گرلس کالج میں تسبیحی لکچر، پروفیسر نعیم انیس

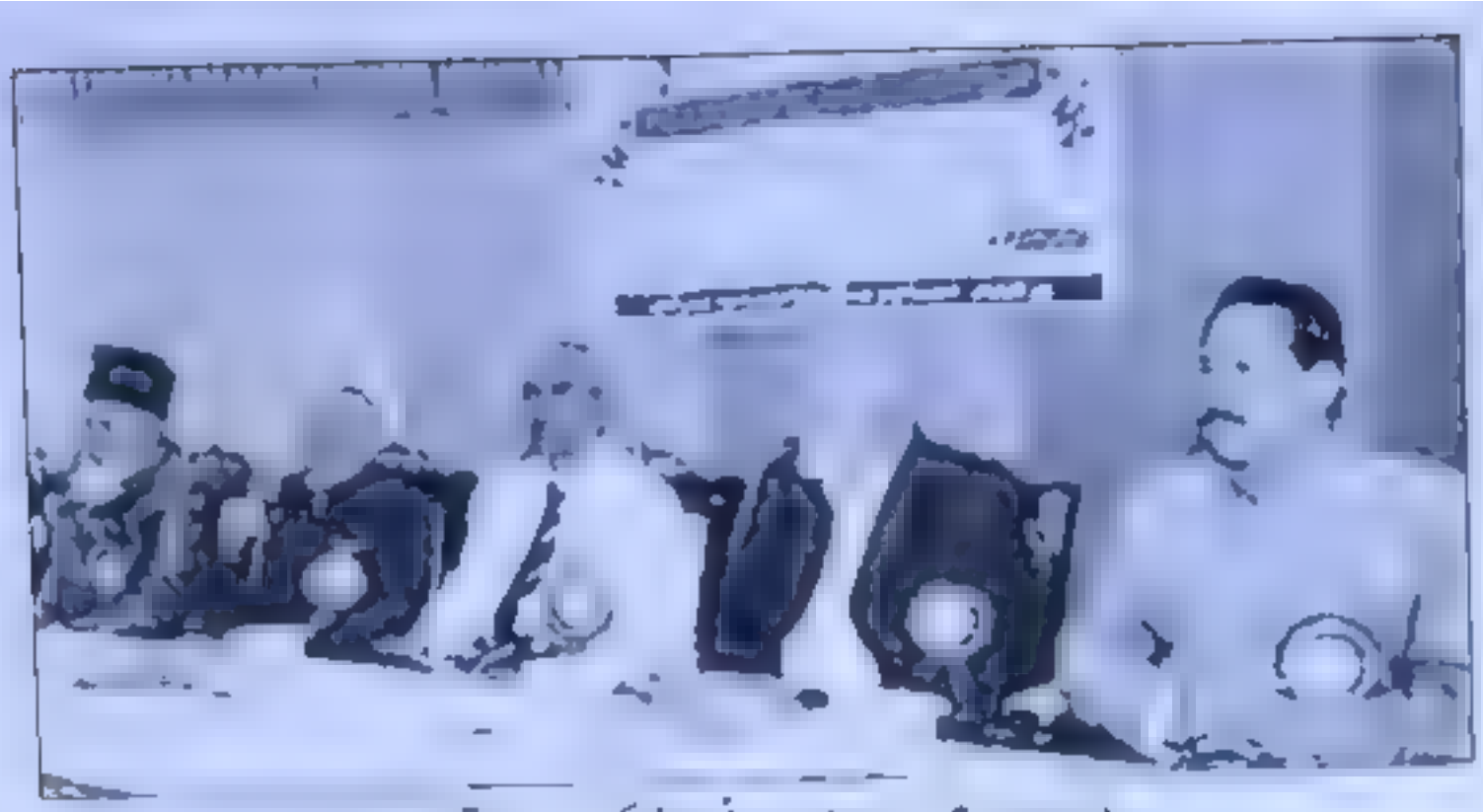

جوبلی ہال حیدرآباد میں عثمانیہ یونی ورسٹی کی 90 سالہ تقریب
دائیں سے بائیں قلی عابدی، شکیب، وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی، ماہ آئمہ منان اور انصاری

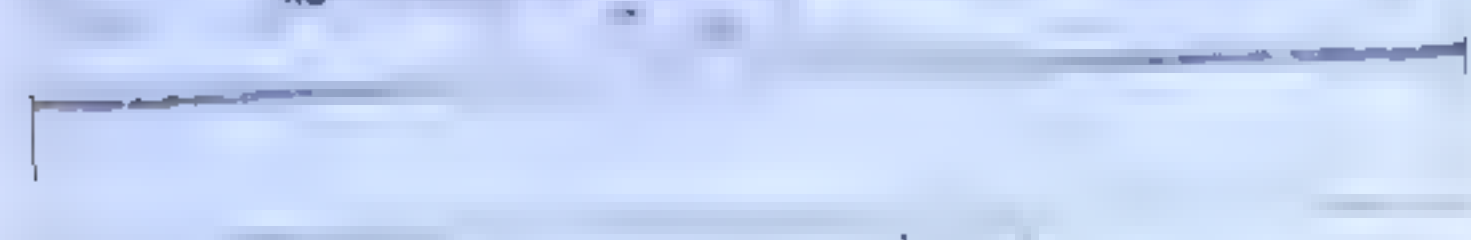

پوشیدہ اردو کانفرنس، ستار رہا وی اور صاحب کے ساتھ

[illegible]
قلی عابدی، [illegible]

ڈاکٹر فاضل حسین کے ساتھ

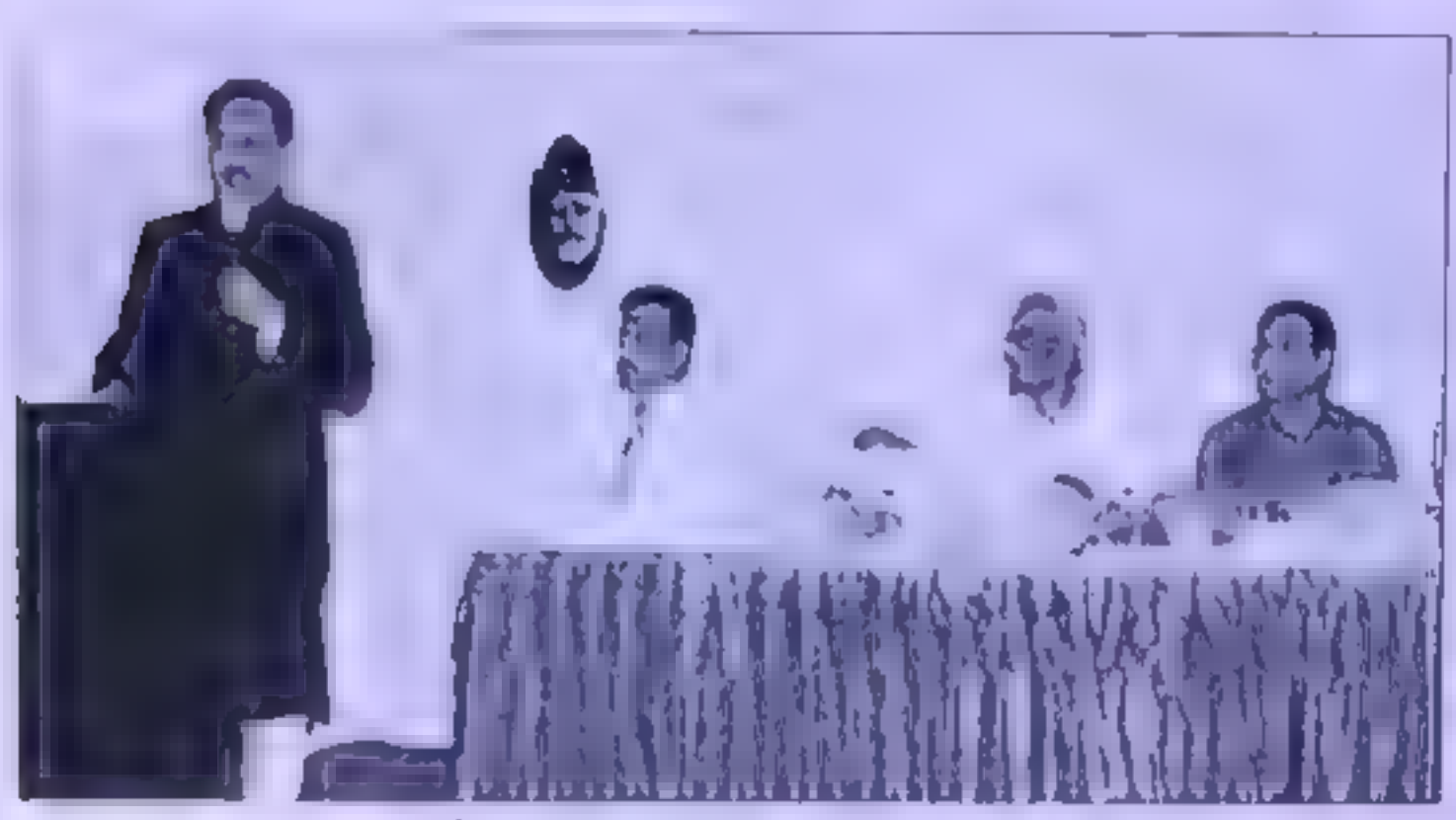

دائیں سے بائیں نامعلوم، مجتبیٰ حسین، شجاعت اور تقی عابدی

پدم شری مجتبیٰ حسین کے ساتھ

وائس چانسلر مقبوضہ یونی ورسٹی رونق عابدی کو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے

خواجہ معین الدین پشتی یونی ورسٹی میں وائس چانسلر ماورخ مرزا تقی عابدی کا استقبال کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں قدسیہ بانو مجدی، پروفیسر تقی عابدی، تقی حسین اصغر عابدی، رونق

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور خالد عرفان کے ساتھ

ابوالکلام قاسمی رونمائی ''فیض فہمی'' کرتے ہوئے، شاہد ماہلی موجود ہیں

دائیں سے بائیں تقی عابدی، پیر زادہ قاسم، جسٹس کالجو، وسیم بریلوی

دائیں سے بائیں فاروق، احمد فاطمی، تقی عابدی، پاشا، ایم پی

دائیں سے بائیں [illegible] وکیل انصاری، ڈاکٹر منیر، وہاشمی، تقی عابدی، نسیم عابدی

[illegible]

دائیں سے بائیں [illegible]

دائیں سے بائیں [illegible]

[illegible] NCPUL [illegible]

[illegible] NCPUL [illegible]

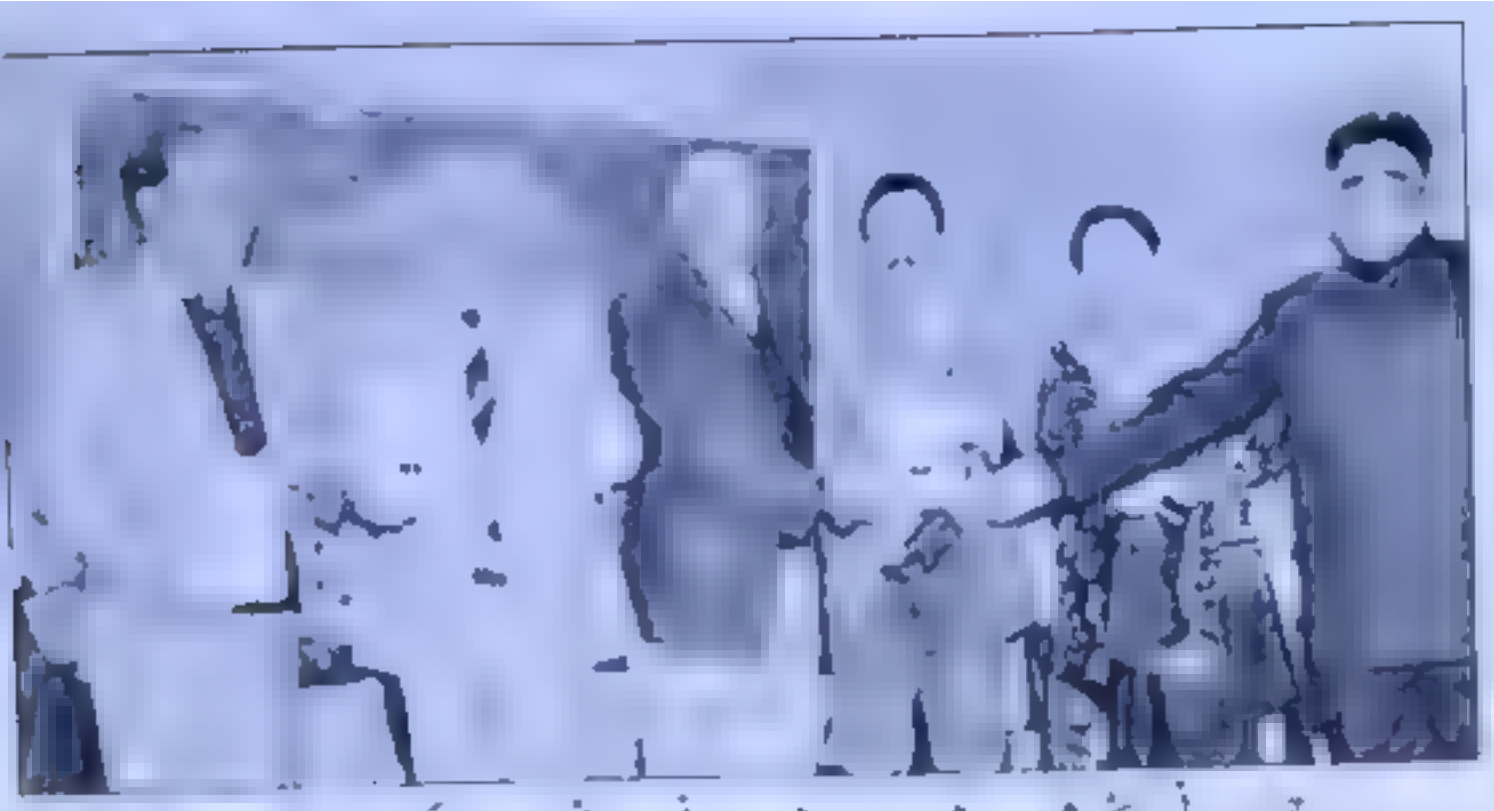

جموں یونی ورسٹی میں، دائیں سے بائیں پروفیسر ریاض احمد، ڈاکٹر شہناز قادری،
ڈاکٹر عنایت ملک، نامعلوم، وی سی شرما، تقی عابدی

[illegible] مقطر اور محمد حنیف کے ساتھ

[illegible] عابدی

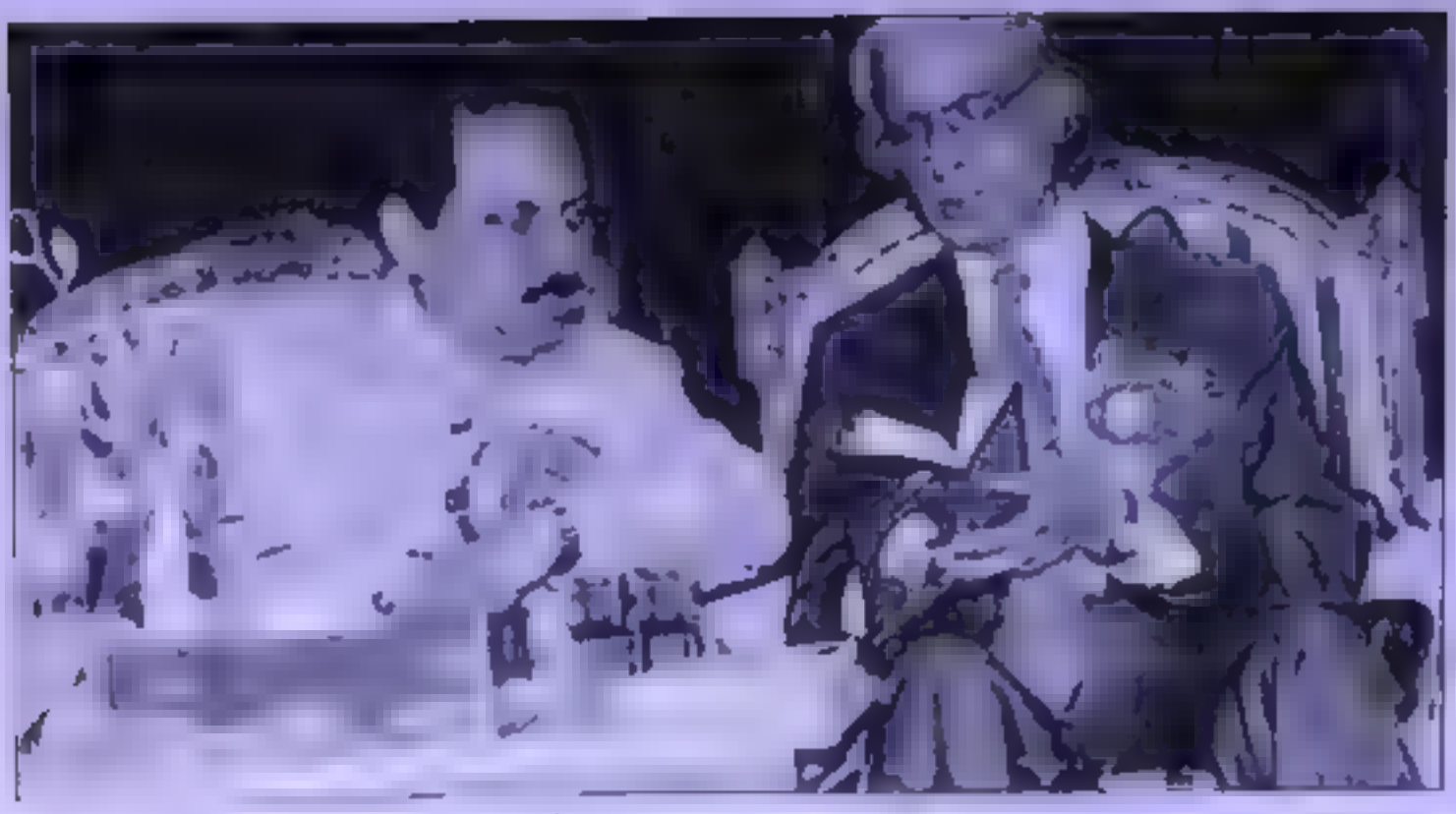

دوحہ مشاعرے میں پیرزادہ قاسم کے ساتھ

دوحہ میں "فیض فہمی" کی رونمائی

دائیں سے بائیں: بخاری، سفیر ہند، سفیر پاکستان، عزت مآب شیخ محمد تقی حامدی

کونسل جنرل غالب اقبال کے ساتھ

دائیں سے بائیں ارم بتول، خان صاحب، تقی عابدی، کیانی

دائیں سے بائیں فرزانہ خان، ارم بتول، مہ جبین، صدف مرزا، محمود، تقی عابدی

انگلینڈ کے مشاعرے میں

نورنو میں سردار علی پینٹنگ پیش کر رہے ہیں

اظہار کا مشاعرہ

دائیں سے بائیں رحمان خاور، ذکیہ غزل اور تنی عابدی

محفل شعر، نور نور، رباش گاہ ذکیہ غزل (اظہار)

تقی عابدی افغانی نیویارک میں

۱۹۸۱ء، فلوریڈا، امریکا

دائیں سے بائیں کشور ناہید، ندیم، سید آقی عابدی شاہد عابدی

خاکسار اقبال ریشی فیض محمد

اسلام آباد یونی ورسٹی میں مظہر خان، نامعلوم، واس چانسلر یونی ورسٹی آقی عابدی

ربوہ میں زیر تربیت ہوئے

جموں یونیورسٹی میں ۱۰ میں سے ۸ میں ڈگری حاصل کرنے والی طلبہ، رجسٹرار بگلز، آپا قمر عابدی، خالدہ

۱۰ میں سے ۸ میں آپا قمر عابدی، ناظمہ [illegible]

لندن، انگلینڈ میں "ثقافت فہمی" کی رونمائی

دائیں سے بائیں تقی عابدی، شاہد مہدی، قدوائی، ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی

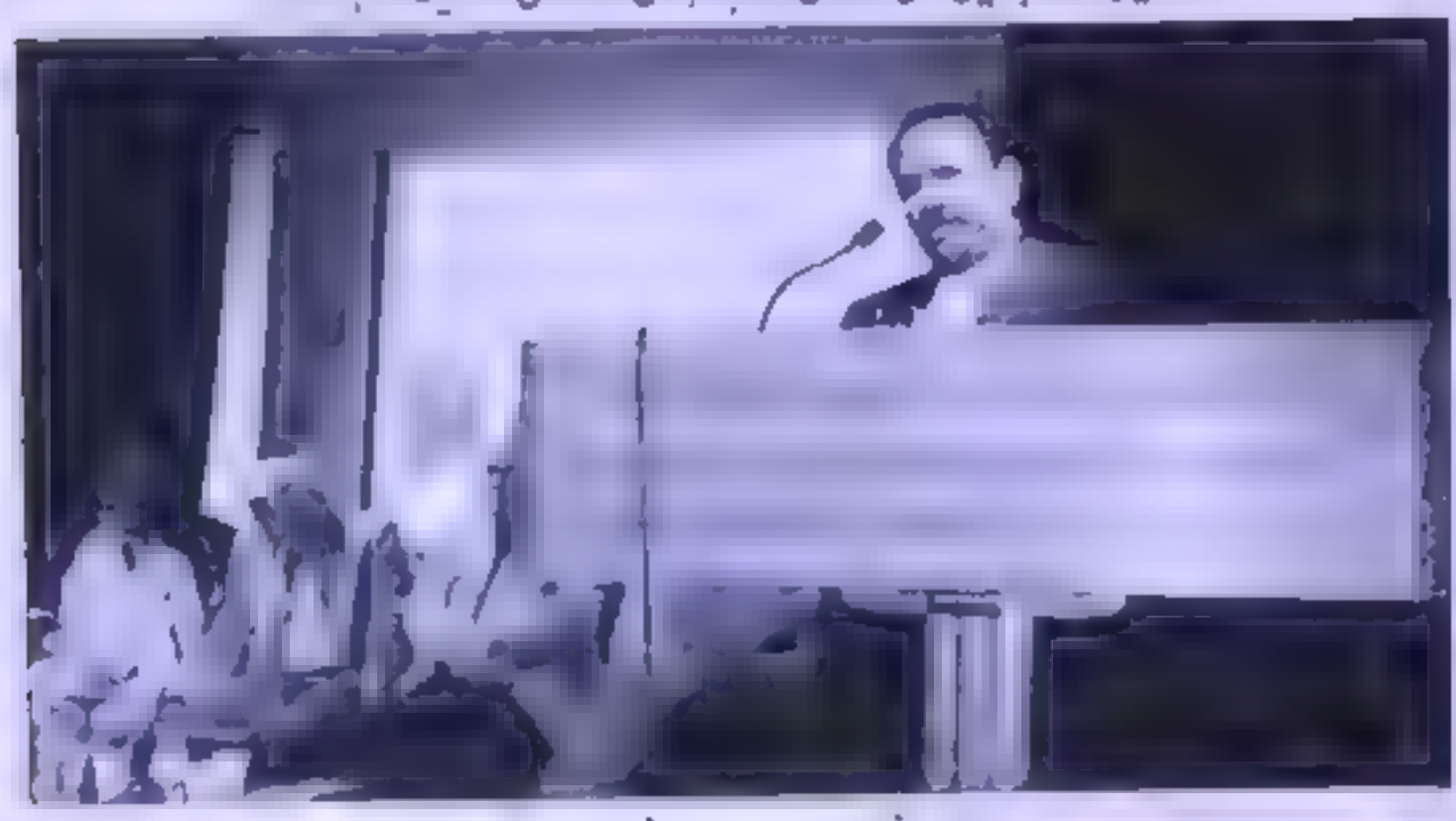

لندن، پروفیسر قدوائی

تقی عابدی، ڈاکٹر جاوید کے ساتھ

صدف مرزا کے ساتھ

دائیں سے بائیں: سعادت سعید، شاہد مہدی، تقی عابدی، رضا علی عابدی

دائیں سے بائیں: [illegible]

تقی عابدی، عزم صاحب اور پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے ساتھ

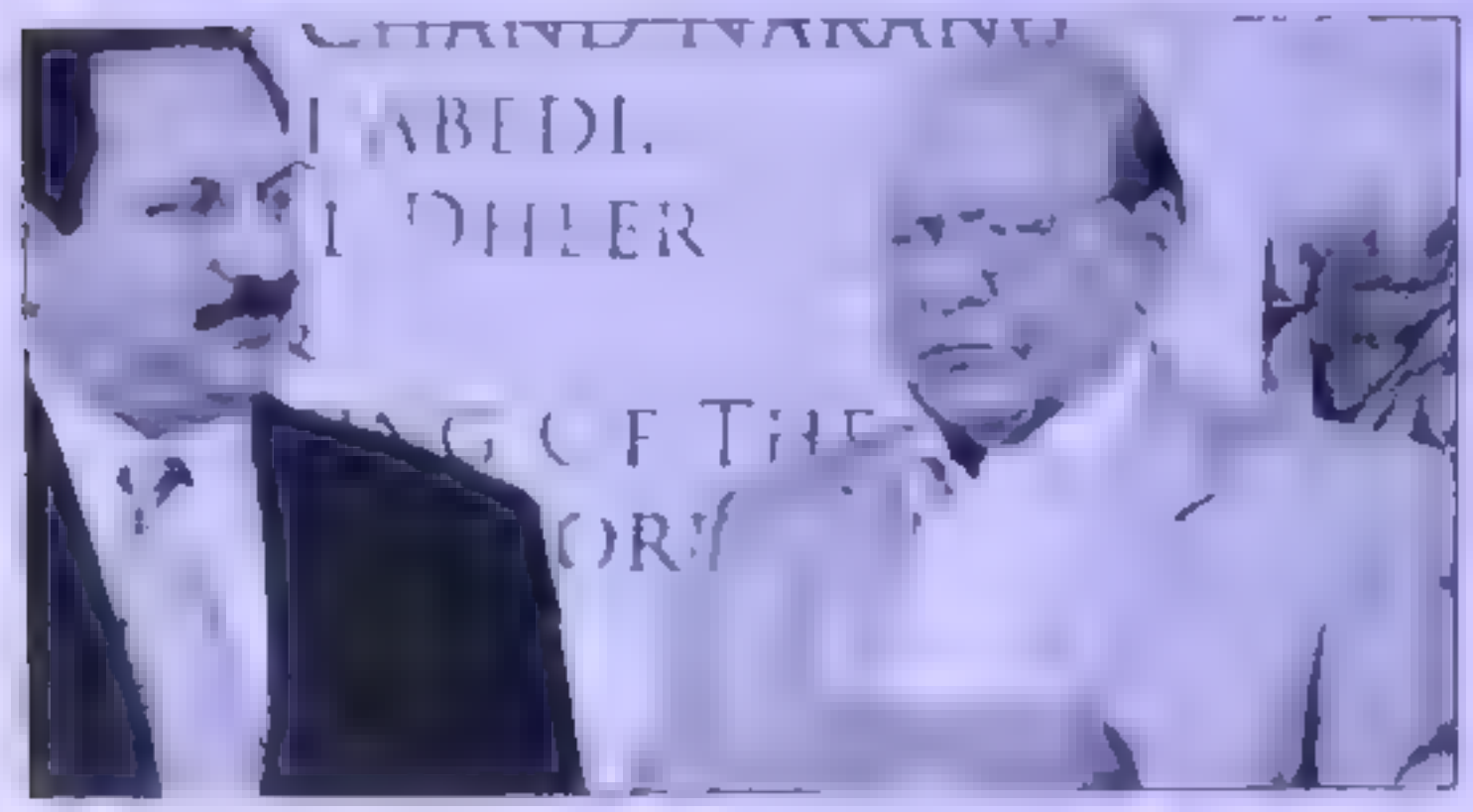

ڈاکٹر نارنگ صاحب کے ساتھ

نہرو سنٹر میں دوستوں کے ساتھ

دائیں سے بائیں: حسن شاہ، تقی عابدی، نامعلوم

برلن جرمنی میں مشاعرہ: حیدر علی عابدی کے ساتھ

جرمنی میں اردو محفل: حیدر عابدی کے ساتھ

ورنگ آباد میں ٹی وی انٹرویو دیتے ہوئے، برفراز عابدی سے ساتھ

دائیں سے بائیں نسیم فریس، بیگ احساس، نامعلوم،
مجتبیٰ حسین، وائس چانسلر محمد میاں، تقی عابدی، ڈائنہ فی ظمہ پروین، ڈاکٹر شجاعت راشد

تقریب رونمائی البم،
دائیں سے بائیں بیگ احساس، سید وقار عظیم، مجتبیٰ حسین، ڈائنہ فی ظمہ پروین، تقی عابدی

صدیقی صاحب و صاحب بیٹی ہے

دائیں سے بائیں تقی عابدی، محمد میاں، مجتبیٰ حسین

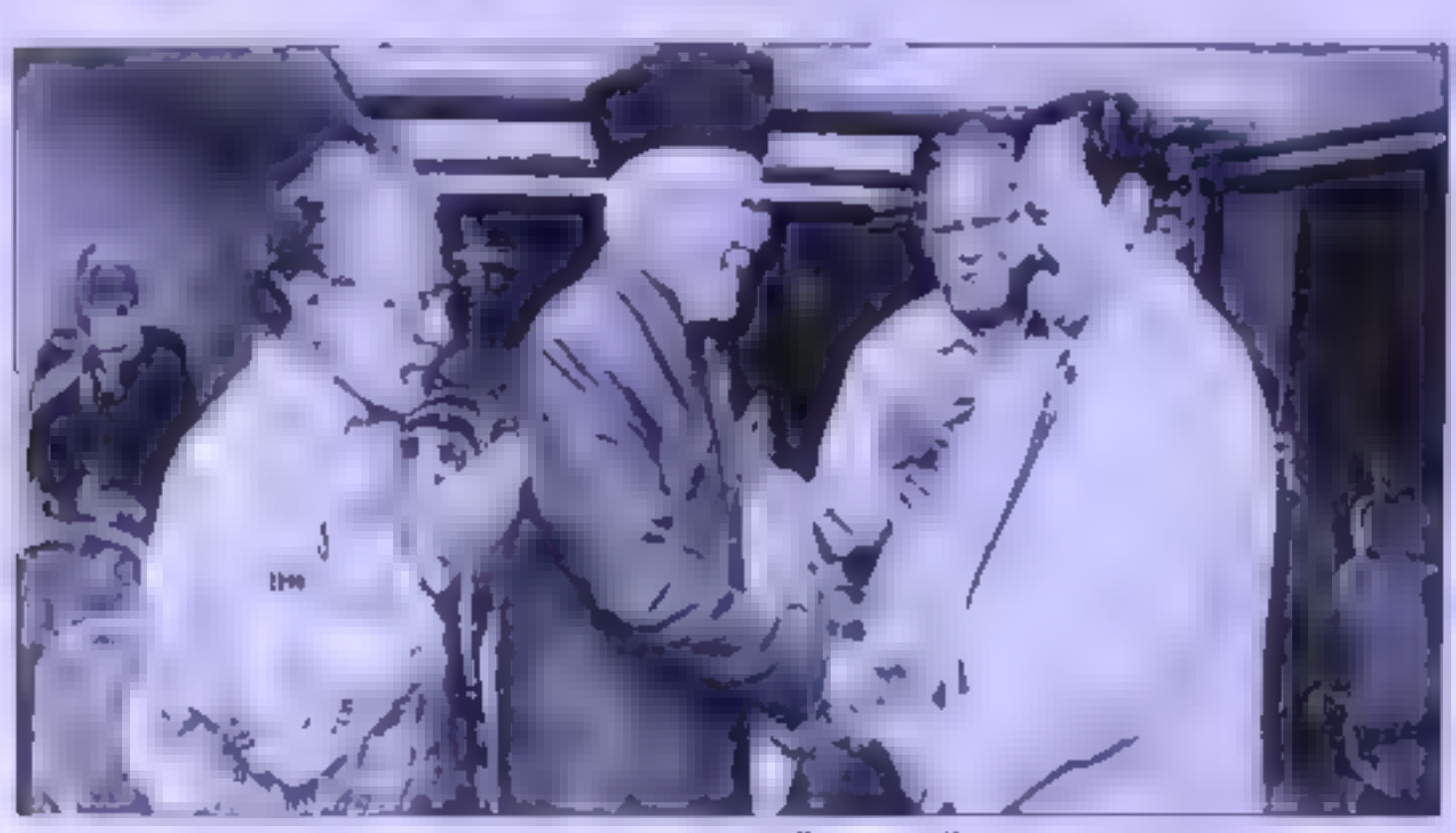

دائیں سے بائیں تقی عابدی، تقی کلبہ گوئی، سلطان بھائی، مصطفیٰ موسوی

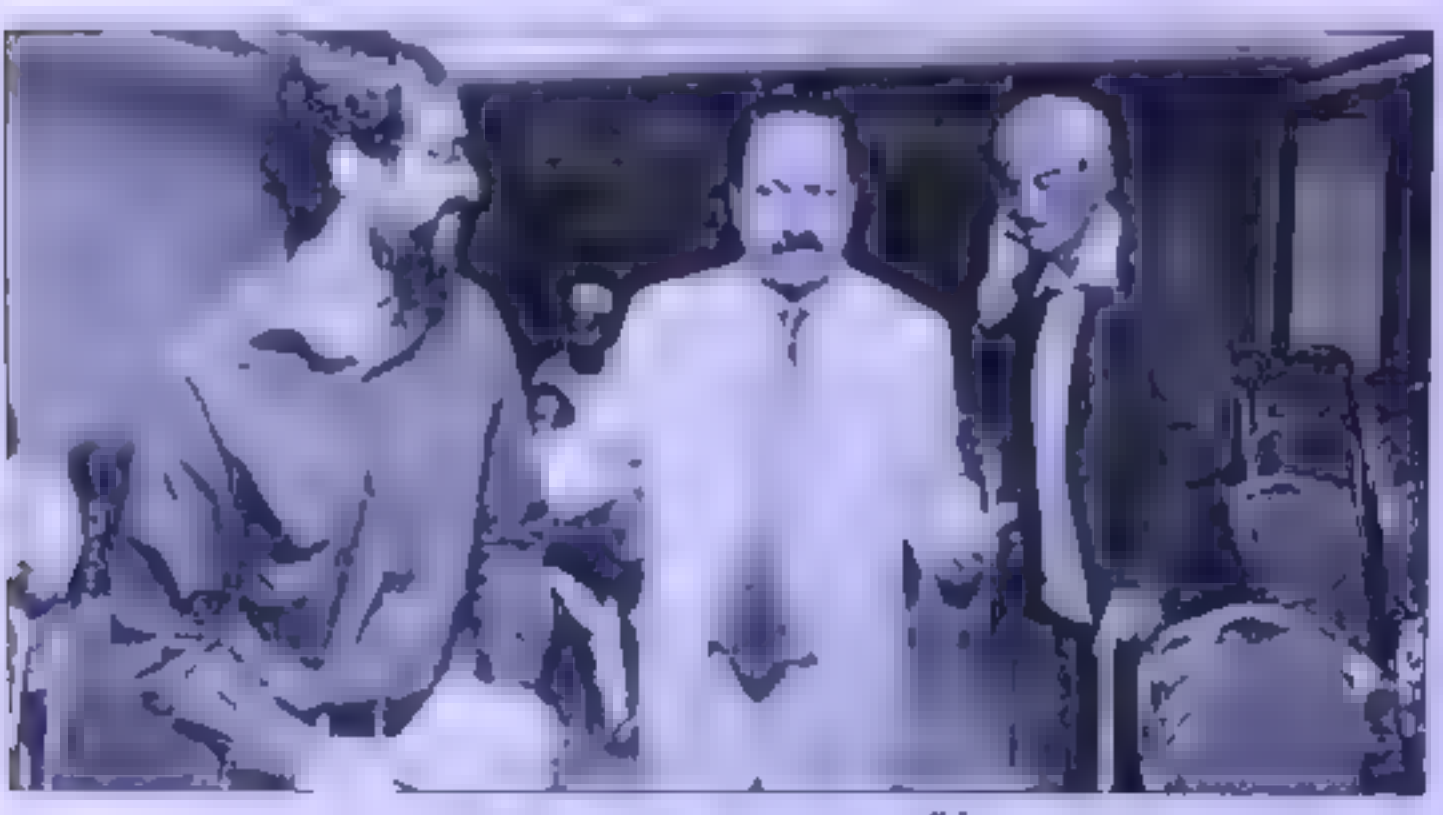

مجتبیٰ حسین درایوب پنجھان سے ملتے ہوئے

وس چانسلر ڈاکٹر محمد میاں کے ساتھ

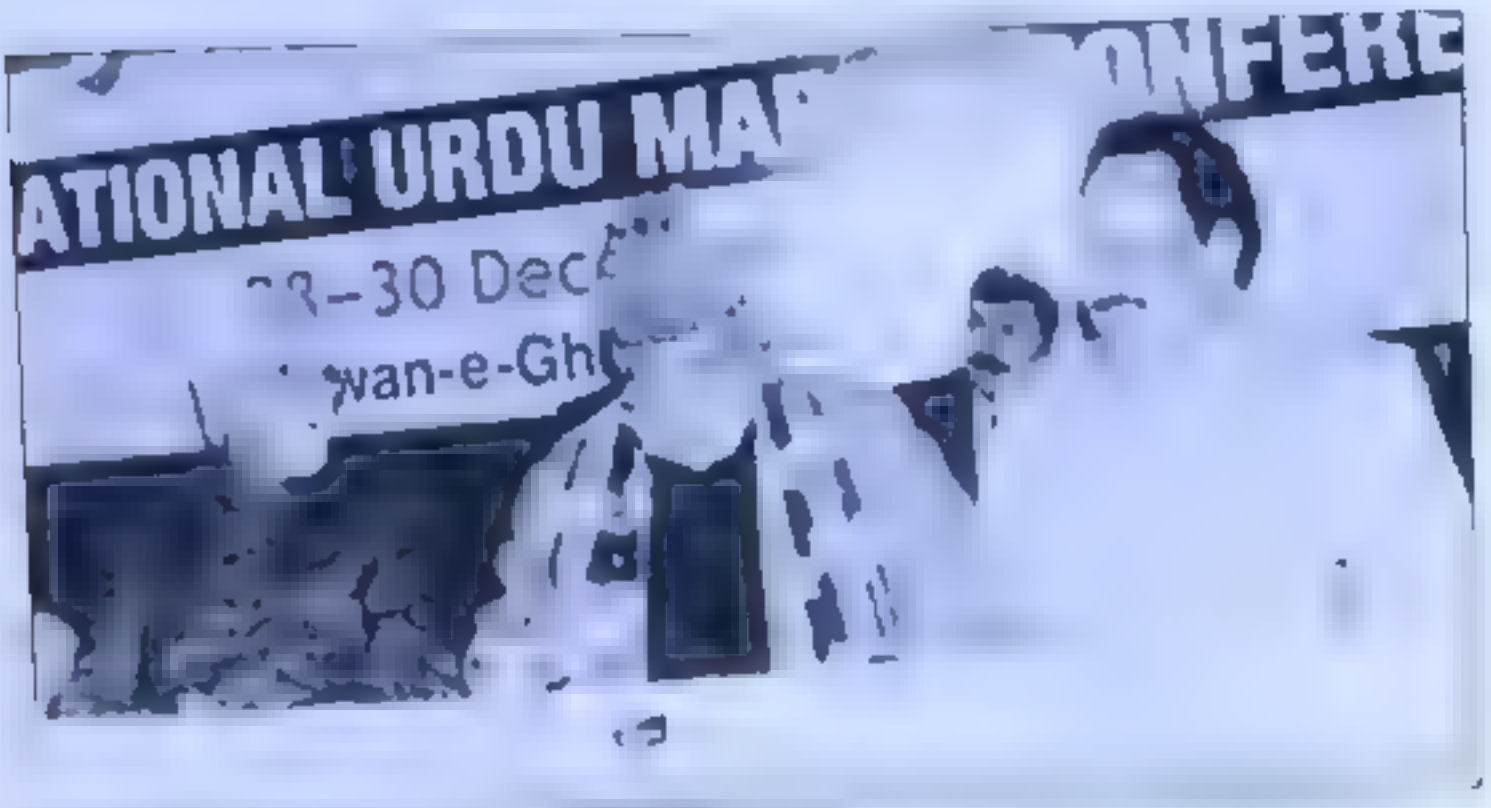

دائیں سے بائیں قمی عابدی، ڈاکٹر نارنگ، نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری

حیدر رضا کے ساتھ

دائیں سے بائیں حامد انصاری، گورنر رضی صاحب، قدوائی، شاہد ماہلی، حیدر رضا، تقی عابدی

دائیں سے بائیں آزرمی دخت، نامعلوم، تقی عابدی

دائیں سے بائیں انیس اشفاق، شاہد ماہلی، نامعلوم، آزرمی دخت، آزر، وہ، تقی عابدی، علی جاوید

حیدرآباد میں ڈاکٹر شنکر اور دوستوں کے ساتھ

وفیق شاہی، رمنانی، بدست واکس چانسلر نظام آباد

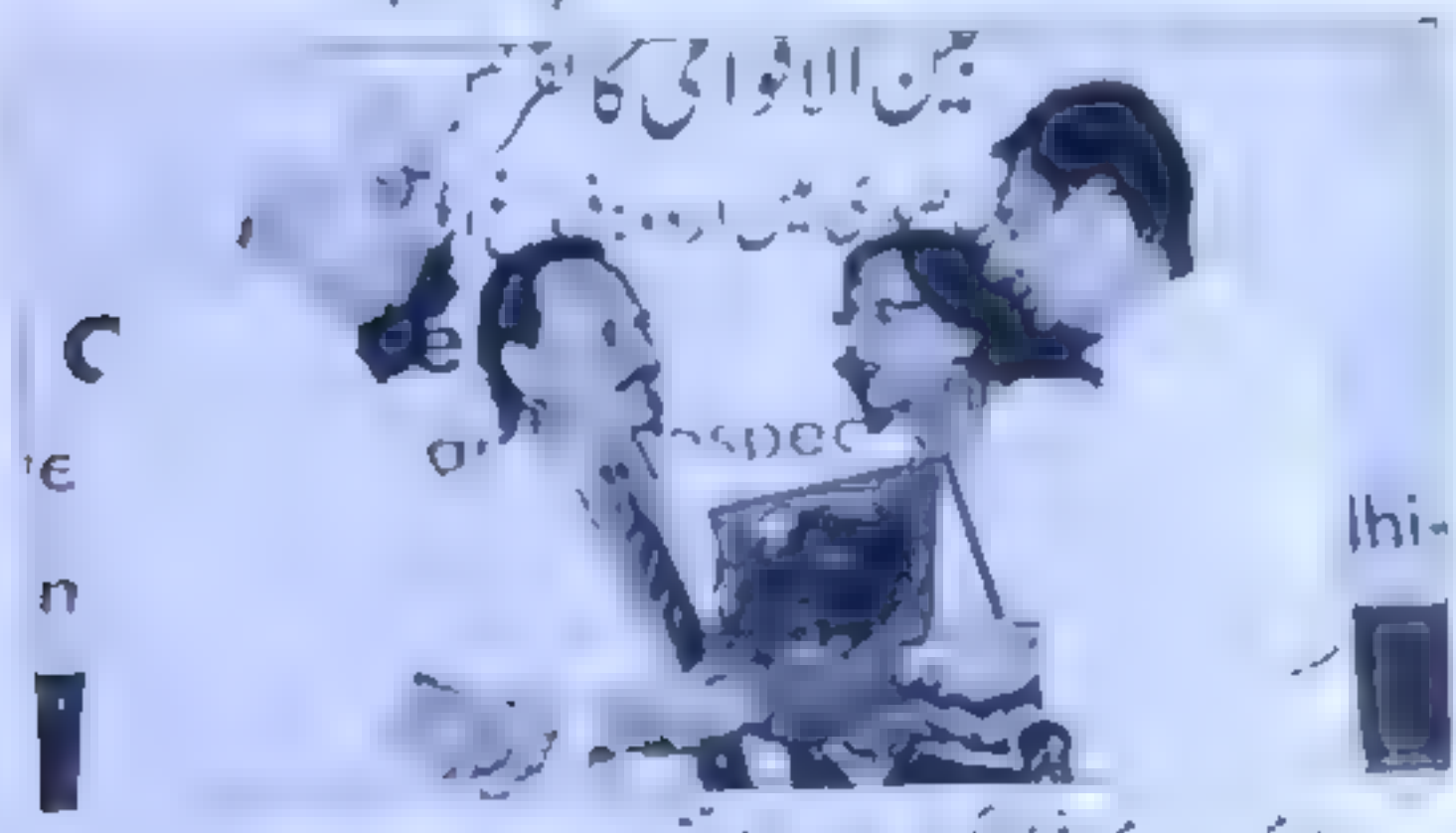

[illegible]

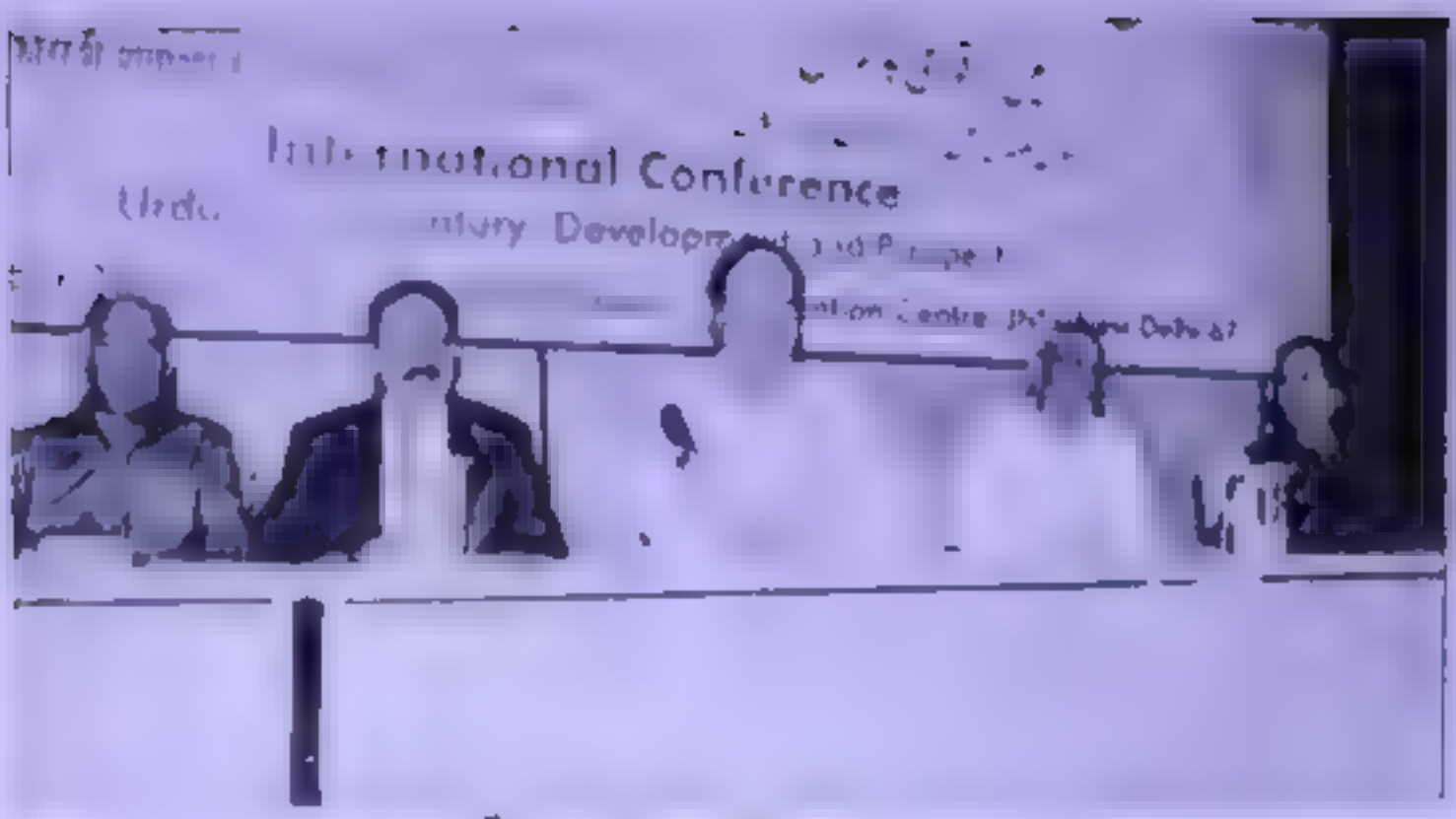

دائیں سے بائیں وسیم بریلوی، عبدالحق، مظہر حق قاسمی، آفتاب عالم

"اردو کی نئی بستیاں" کی رونمائی

دائیں سے بائیں آفتاب عالم، ڈاکٹر سید محمد یامین، ضیاء الدین شکیب

محفظ مجاز، نفیس عابدی اور دوستوں کے ساتھ

[illegible] میں سے دائیں تقی عابدی، شجاعت راشد، پروفیسر فضل اللہ مکرم

[illegible] میں سے دائیں [illegible] تقی عابدی [illegible]

سردار جعفری کے بیٹے حکمت کی فیملی کے ساتھ

سردار جعفری کے بیٹے حکمت کے ساتھ

پرویز جعفری کے بیٹے [illegible]

مشاعرے کی شمع روشن کرتے ہوئے، دائیں سے بائیں شاہد علی، مضطر مجاز، تقی عابدی، حیدر رضا

دائیں سے بائیں مجتبیٰ حسین، تقی عابدی، مجدد اسلام، شمیم، اعظم کولی

دائیں سے بائیں تقی عابدی، سفیر محترمہ، اقبال حیدر، چینی نیہ

دائیں سے بائیں افتخار حیدر، گولو صاحب،
ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، تقی عابدی، نعمان بخاری، کرامت غوری، مدیحہ شعر

اقبال سیمینار میں مندوبین کے ساتھ

فیض میلاد الحسن، ندیم سید سے گفتگو کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں آفتاب مہدی، شاہد کامران، فتح محمد ملک، وائس چانسلر صدیقی، انوار احمد، نامعلوم

دائیں سے بائیں [illegible] وائس چانسلر صدیقی سے [illegible]

دائیں سے بائیں خیب اقبال، تقی عابدی، شاہد کامران صدیقی

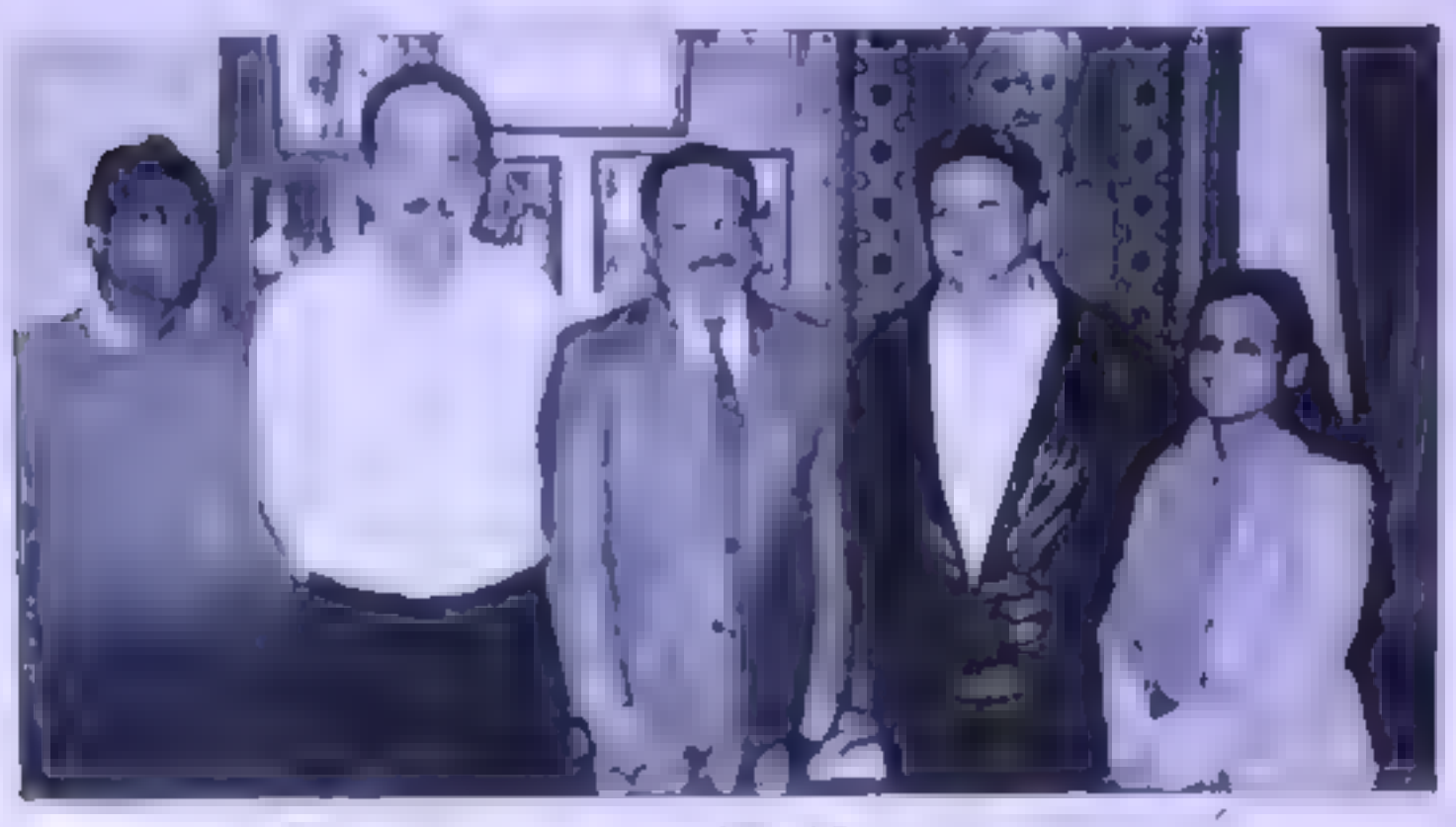

دائیں سے بائیں علامہ اقبال کے نواسے میاں صاحب، خیب اقبال، ہم

اور میں کالج لاہور میں اساتذہ کے ساتھ

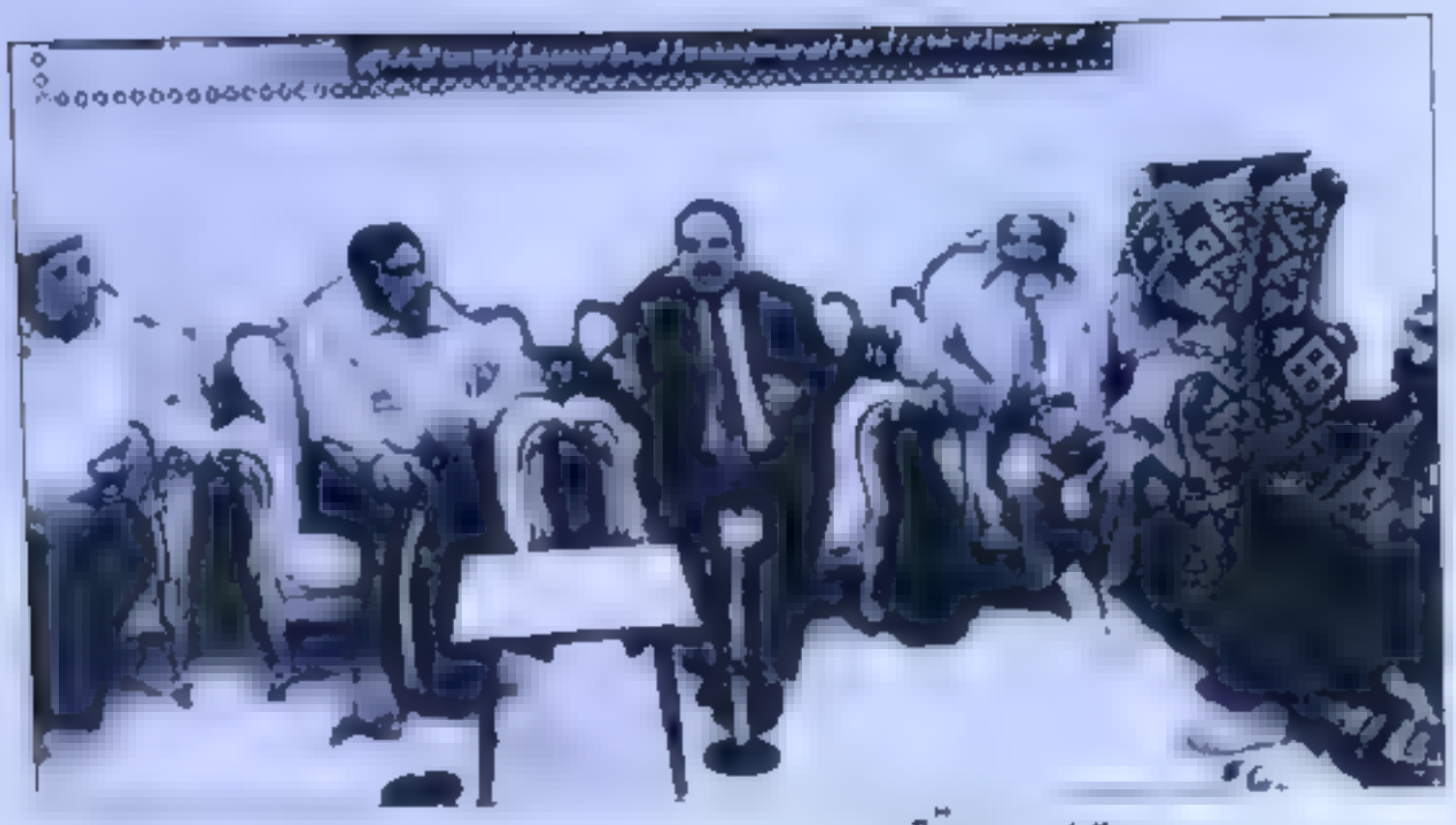

اقبال سیمینار، راقم عابدی، واحہ کے رفقاء دوستوں کے ساتھ

اقبال سیمینار، واحہ

اقبال سیمینار، واحہ

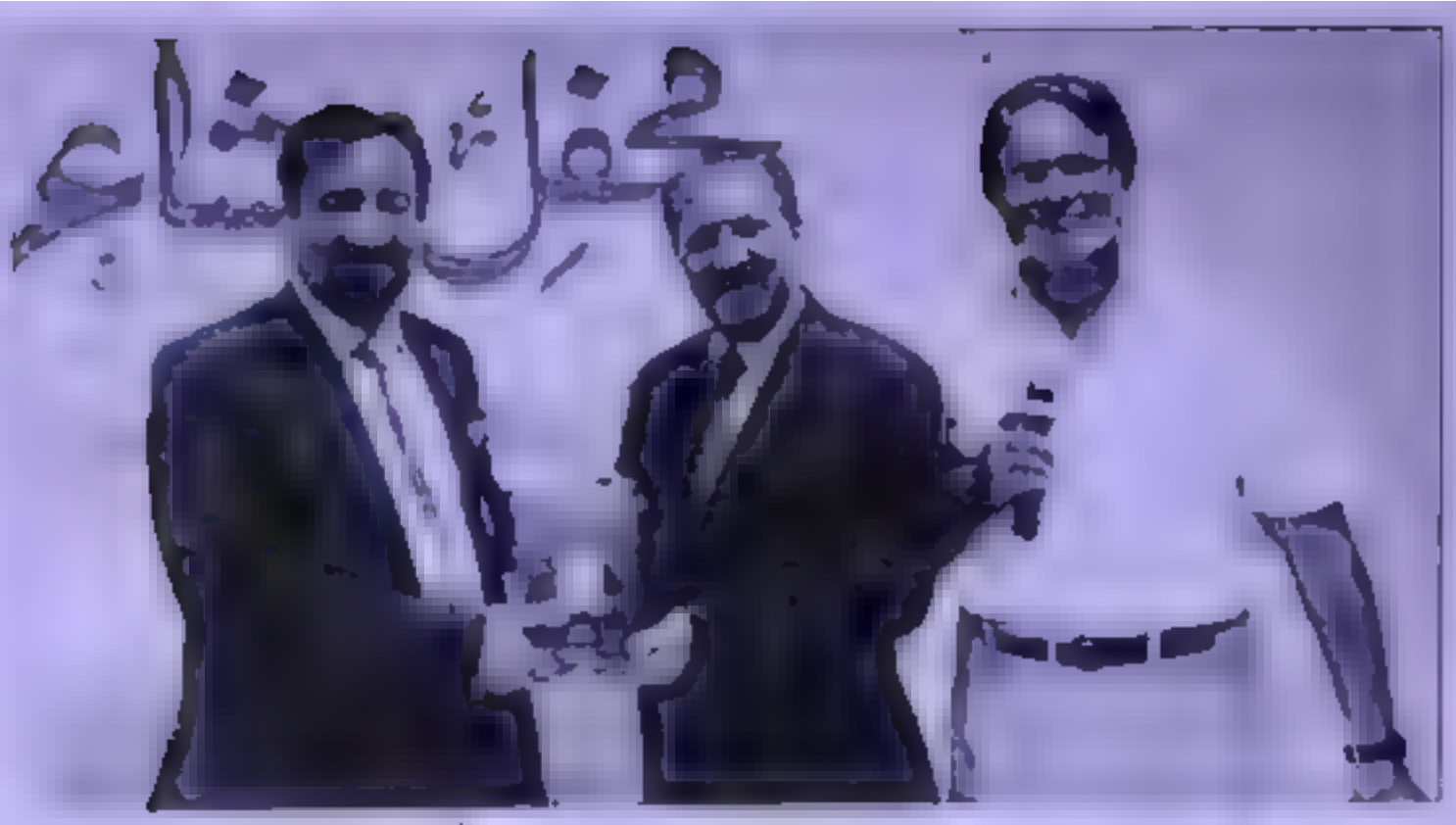

فرینکفرٹ جرمنی میں مشاعرہ میں سے ایک میں اقبال حیدر اور قمی حامدی دکھائی دے رہے ہیں

ویلفیئر ہیومن ایسوسی ایشن محفل مشاعرہ فرینکفرٹ، دو میں سے ایک میں قمی حامدی، اقبال حیدر اور دیگر

بارہ بجے سے ساتھ

داغ دہلوی سیمینار، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء میں سے بائیں تقی عابدی، وی سی پرویز، شمیم حنفی، پروفیسر نعیم

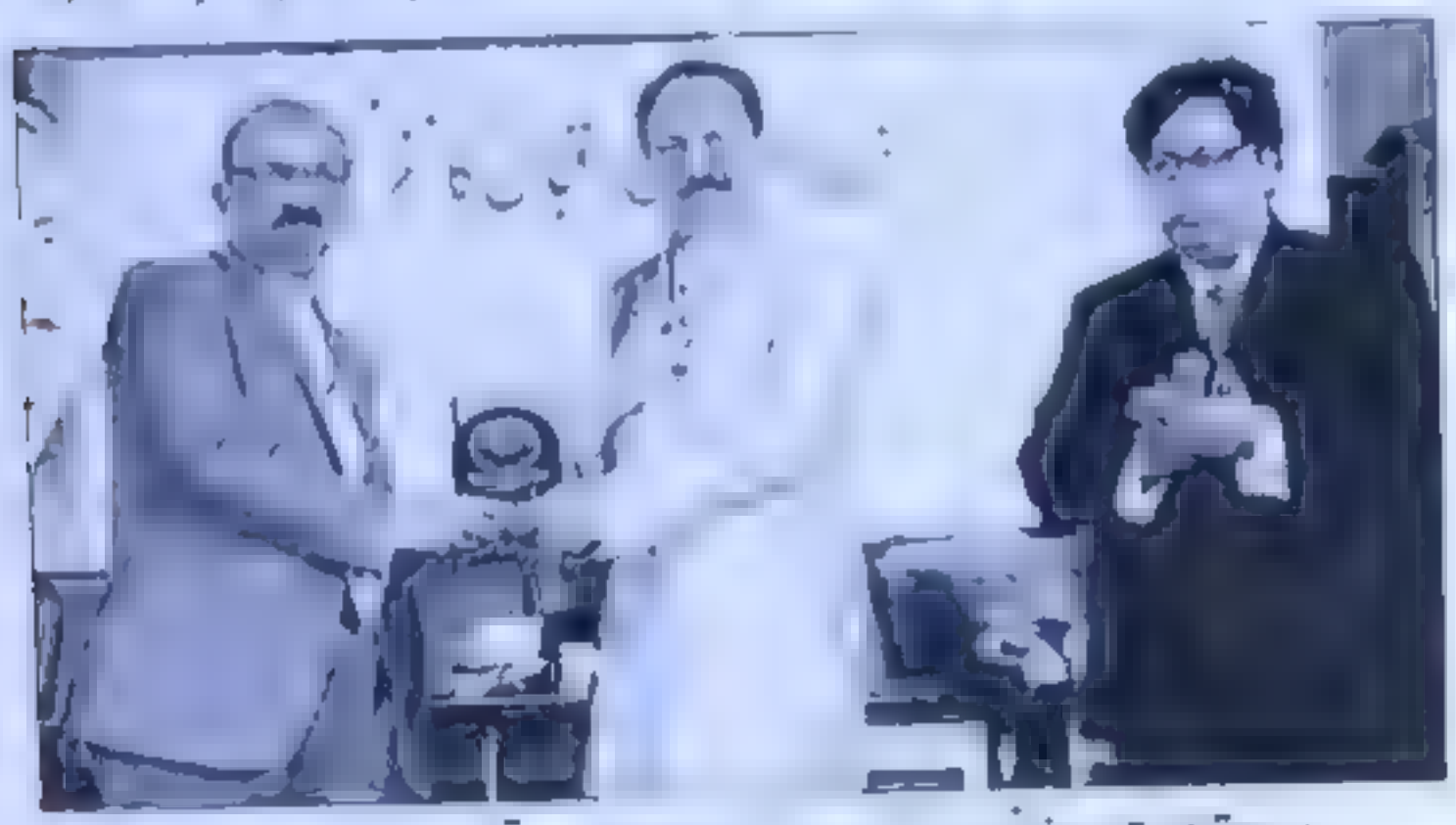

تین روزہ اقبال کانفرنس، ۱۹۸۱ء میں سے بائیں شاہد کامران، تقی عابدی، وی سی صدیقی

کانفرنس ساہتیہ اکادمی اوائیں سے بائیں : شمارنگ تقی عابدی ، ا

ساہتیہ شریی فورم

دائیں سے بائیں مونارہ ، ڈاکٹر سیدہ سیدین ، ڈاکٹر نارنگ تقی عابدی ، ڈاکٹر

رمضانی "لغیت حان"

دائیں سے بائیں ڈاکٹر اطہر فاروقی ، ڈاکٹر توحیدی ، پروفیسر خواجہ محمد زکریا تقی عابدی

تقی عابدی اساتذہ کو ستائیں پیش کرتے ہوئے

جموں وائس چانسلر منوج دھر کے ساتھ

تقی عابدی کی کتابوں کی رونمائی، سابق وائس چانسلر شامل ہیں ۔۔۔ میں سے بائیں
پروفیسر ریاض احمد، فضل الرحمان، ڈاکٹر شہاب ملک، وی سی شامل، تقی عابدی، پروفیسر [illegible]

تقی عابدی جموں یونی ورسٹی میں اساتذہ کے ساتھ

نورنگو میں پیہ فاروقی کے ساتھ

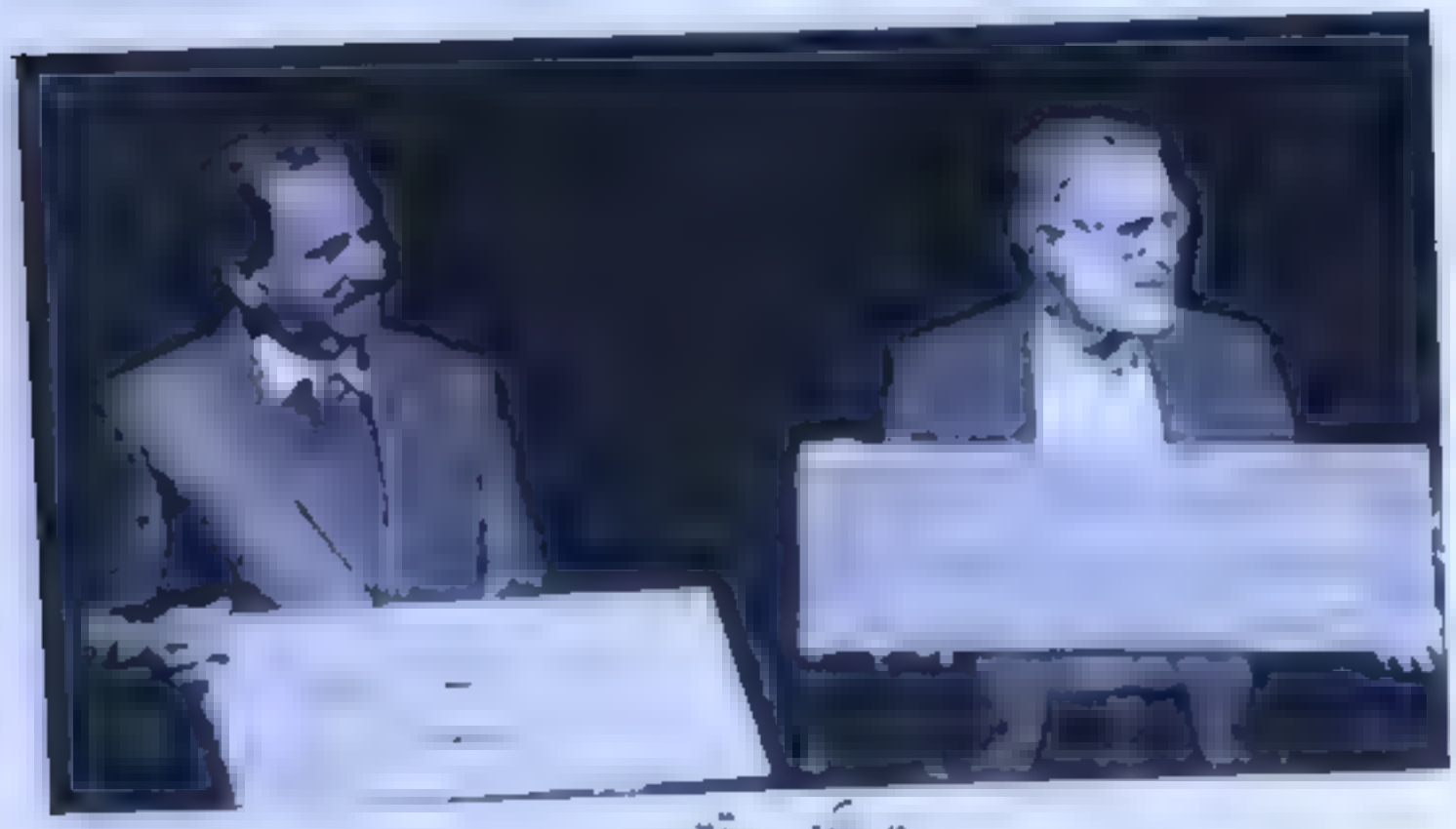

ظفر عکسن اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں فرید ندیم ملک [illegible] تقی عابدی [illegible] سعید عجمل (علی حیدر میں)

ورجینیا امریکا میں ابوالحسن نغمی کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں ماجدہ یوسفی، سیدہ حمید، تقی عابدی، انتظار حسین، [illegible]

دائیں سے بائیں عراقی، سیدی، تقی عابدی، [illegible]

توسیعی لیکچر ۱۱ میں سے بائیں شفیع ایوبی، پروفیسر خواجہ اکرام، انور پاشا اور تقی عابدی

ماجد دیوبندی کے ساتھ

قیوم نظر، مشفق خواجہ، رضا علی عابدی کے ساتھ

تقریب شاداں اندوری میں خطبہ پیش کرتے ہوئے

مشاعرہ شاداں اندوری میں راحت اندوری سے ملاقات

شاداں انوری سیمینار اندور، دائیں سے بائیں فرید راشد اندوری، معصوم قریشی، شاداں

پونا عظیم ایمپس میں توسیعی خطبہ

منور بھائی، مختار منور، تقی عابدی، نامعلوم، مشتاق

رسک مختار منڈل پونا میں سے بائیں منور بھائی، رسک بیچ میں تقی عابدی، مختار بھائی

اعظم کیمپس پونا، دائیں سے بائیں مشتاق، ممتاز منور، منور پیر بھائی، تقی عابدی

توسیعی لکچر، متھر اسٹڈل پونا، دائیں سے بائیں منور پیر بھائی،

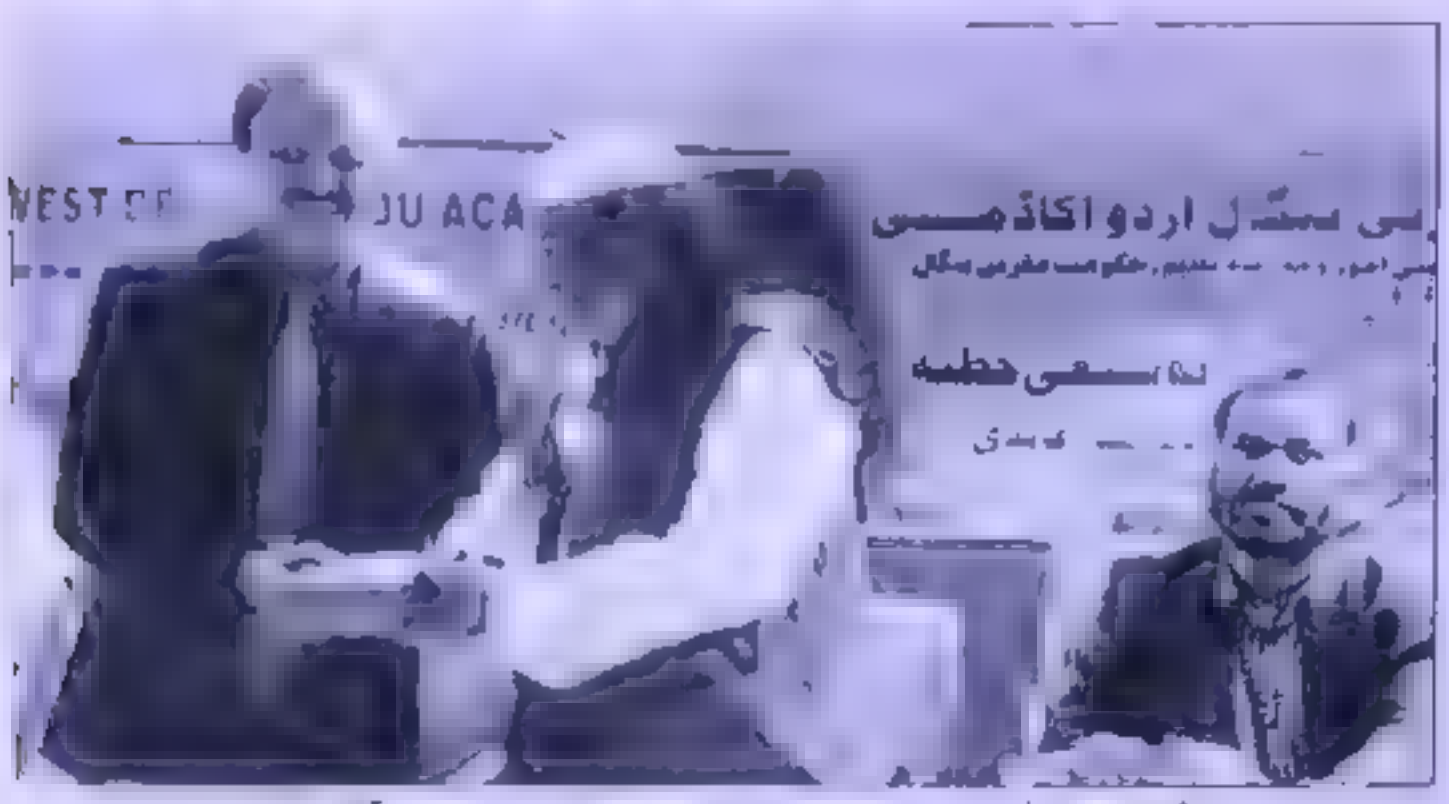

دائیں سے بائیں پروفیسر خواجہ [illegible] تقی عابدی

ملتے غالب سیمینار میں ایرانی ماہرین غالب کے ساتھ

ملتے غالب سیمینار احقر صاحب اور پروفیسر خواجہ اکرام کے ساتھ

ملتے غالب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سید وحید اختر کے ساتھ

انٹیگرل یونی ورسٹی کے کتب خانے میں [illegible]

انٹیگرل یونی ورسٹی [illegible]

[illegible]

[illegible]

ڈاکٹر رکن الدین اسکالر کے ساتھ

Inaugral Ceremony

دائیں سے بائیں قمر عابدی، وی سی وسیم اختر، وی سی علی گڑھ یونیورسٹی

دائیں چانسلر سے پروفیسر صدیقی رستے ہوئے

شاہد کامران سے وارث لیتے ہوئے

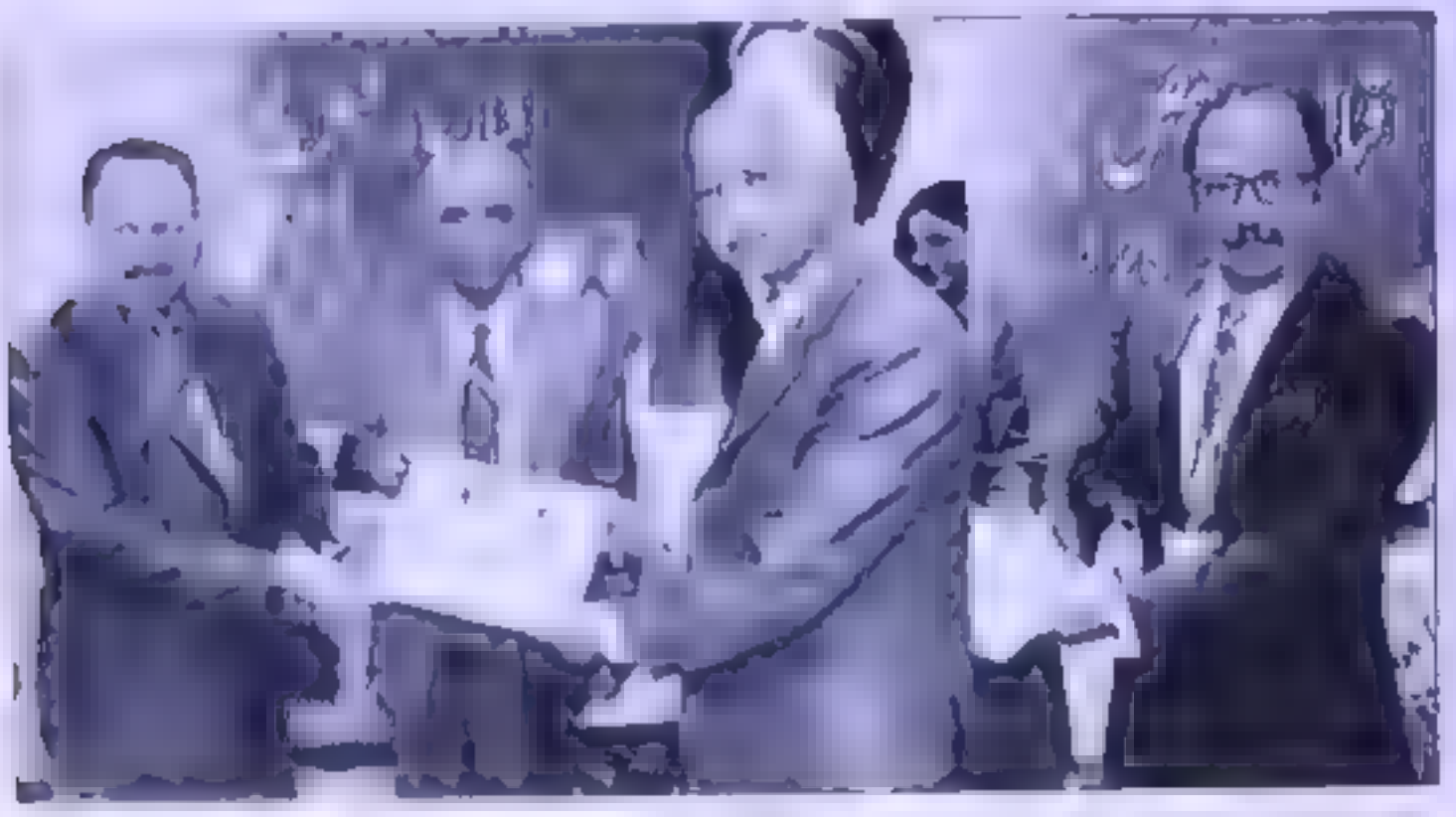

یاسر خالد اور عباس چیمہ سے ملتے

مسز کامران اور خاندان کے دیگر افراد سے ملتے

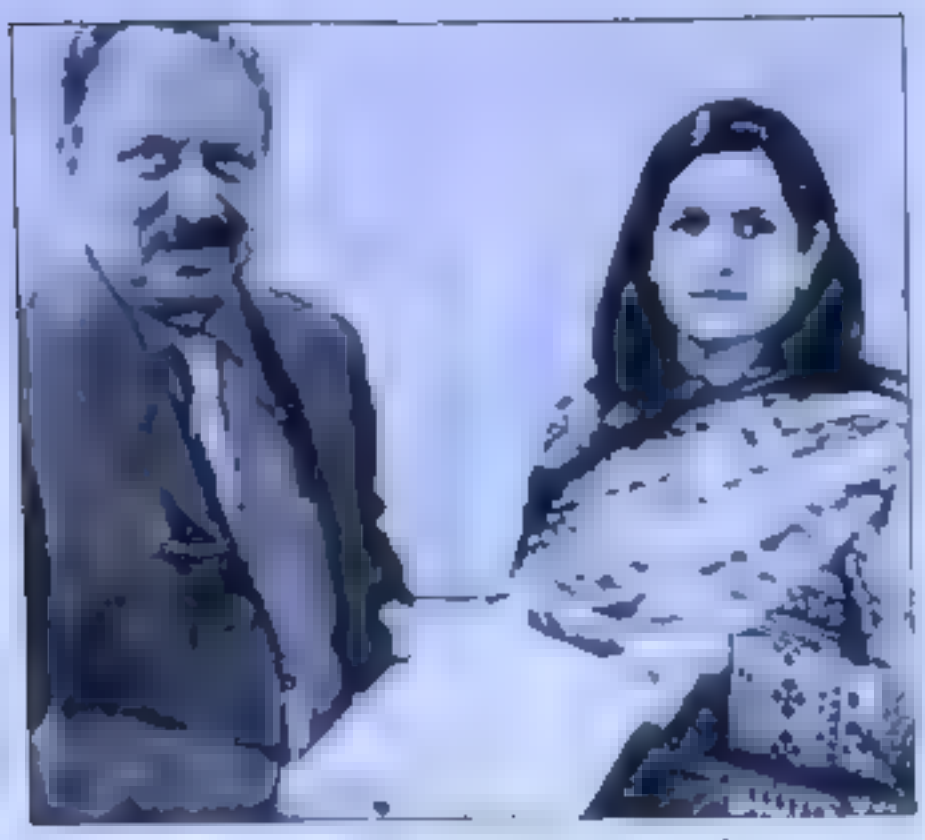

: بریگیڈیئر اقبال اکادمی سے کتاب لیتے ہوئے

ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے ، ڈاکٹر ریاض ہاشمی ، ڈاکٹر نوری ، تقی عابدی اور ڈاکٹر محمد کامران

یہ تقریب کے بعد اسلام آباد میں مقیم یونی ورسٹی کے بچوں میں

ویمن یونی ورسٹی اسلام آباد، دائیں سے بائیں ڈائنہ فرحت [illegible] صدر شعبہ [illegible] کاس سے [illegible]

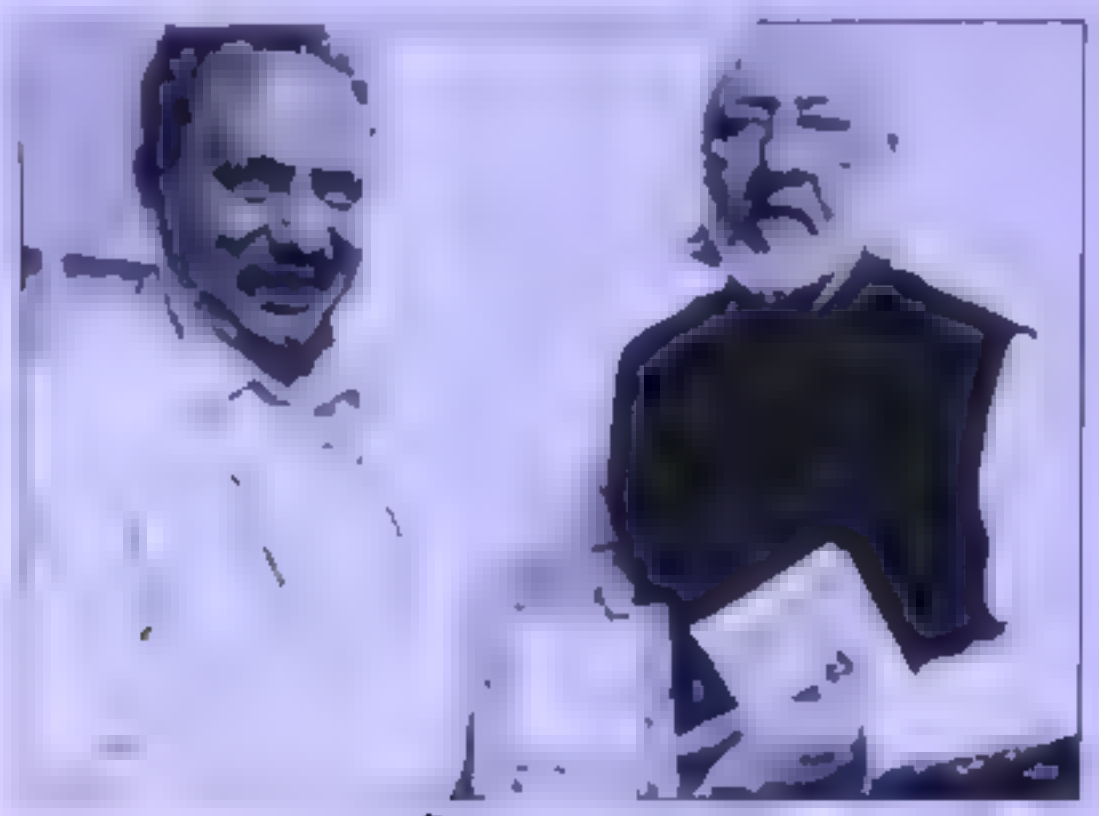

کراچی میں آغا طالب و [illegible] سے [illegible]

شکاگو میں [illegible] سے [illegible]

دائیں سے بائیں نیر جہاں پوری، [illegible] حیدر، [illegible] عابدی، [illegible] ساقی، [illegible] عابد

مشہور ادیبہ فاروقی شاکر تقی عابدی امین حیدر کے ساتھ

ریحانہ قمر کے ساتھ، ہاس انجلس

انور خواجہ اور ان کی بیگم، ہاس انجلس میں

جشن ریختہ، غالب مذاکرہ، دائیں سے بائیں تقی عابدی، سید وحید اختر، نصیر احمد ناصر

فورٹ ولیم کالج مذاکرہ، غالب سے بائیں شمس الرحمٰن فاروقی
دائیں سے بائیں وسیم عباس صدیقی تقی عابدی، ہارون الرشید، شمیم حنفی

سول کے چیئرمین ابوالحسن نغمی، ریجنل ایریا میں کارپوریٹ سائنس کی نمائندگی کرتے ہوئے

اردو مرکز ڈائس کے چیئرمین ڈاکٹر سلیمان اور ان کی بیگم کے ہمراہ

محفل "اظہار" کے منتظمین، دائیں سے بائیں

(ایستادہ) ریحان، صبا، منور جہاں، ناصر، فیصل (بیٹھے ہوئے) تقی عابدی، صبیح رحمانی، کیپٹن غزن

کیپٹن غزن، تقی عابدی، ڈاکٹر [illegible]

لندن میں "مسدس حالی" اور "حالی فہمی" کی رونمائی

دائیں سے بائیں نامعلوم، یاور علی تقی عابدی، ایوب ادیب اور نامعلوم

ایوب ادیب اور شاعر خان صاحب کے ساتھ

کے ساتھ

دائیں سے بائیں: دانشور میں خلش، تقی عابدی، ساجد اور باقر زیدی

بائیں سے: شہزاد، تقی عابدی، فرزانہ خان اور روحی کنول

بائیں سے: ریما، روحی کنول، تقی عابدی، شفیق عثمانی، فرزانہ خان

دائیں سے بائیں معظم صدیقی صدر ۱۰۱ آئی ملٹری ہسپتال پشاور سے ملتے ہوئے

سول ورجینا میں معظم صدیقی ، یونیورسٹی سے ملاقات

۱۹ میں سے بائیں صدر قومی کانگریس [illegible] سے ملاقات

مظفر آباد یونیورسٹی میں شال پوشی

تحریک آزادی کشمیر میں ڈاکٹر سید یٰسین اور عرفان زیدی کے ساتھ

صدر آزاد کشمیر پروفیسر عبدالحمید کے ساتھ

جموں یونی ورسٹی میں خطبہ

دائیں سے بائیں تقی عابدی، پروفیسر ریاض احمد، شہاب ملک، [illegible]

کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں ہتیش پیارے، شہاب ملک، تقی عابدی [illegible]

دائیں سے بائیں [illegible]

دائیں سے بائیں خورشید اکرام، صدیق الرحمان قدوائی، رضا حیدر اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں شوکت زیدی، تقی عابدی، فرحت شجاعت، نامعلوم

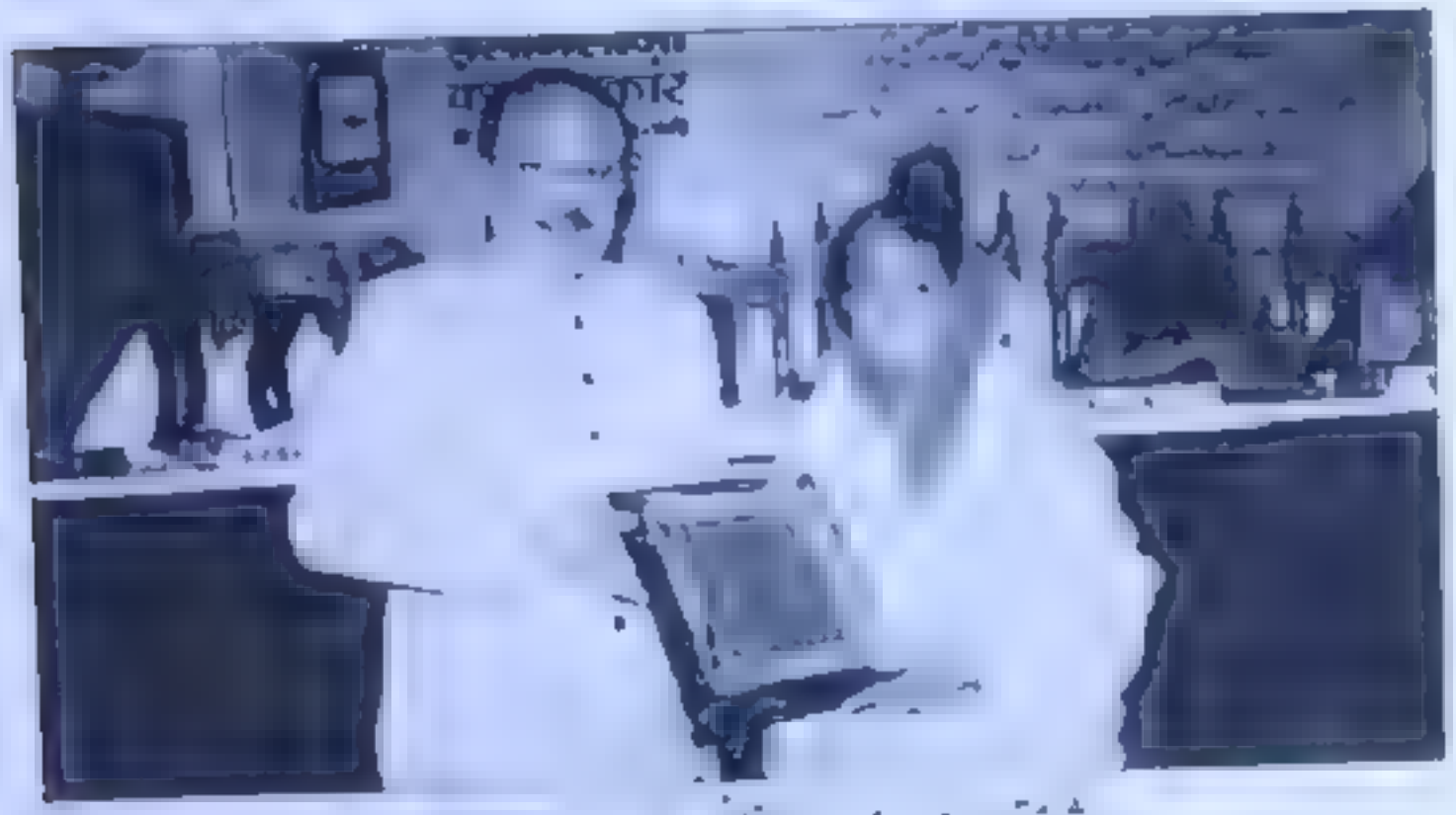

شبیحہ دہلوی نے مرثیہ فرانس میں پڑھا تھا

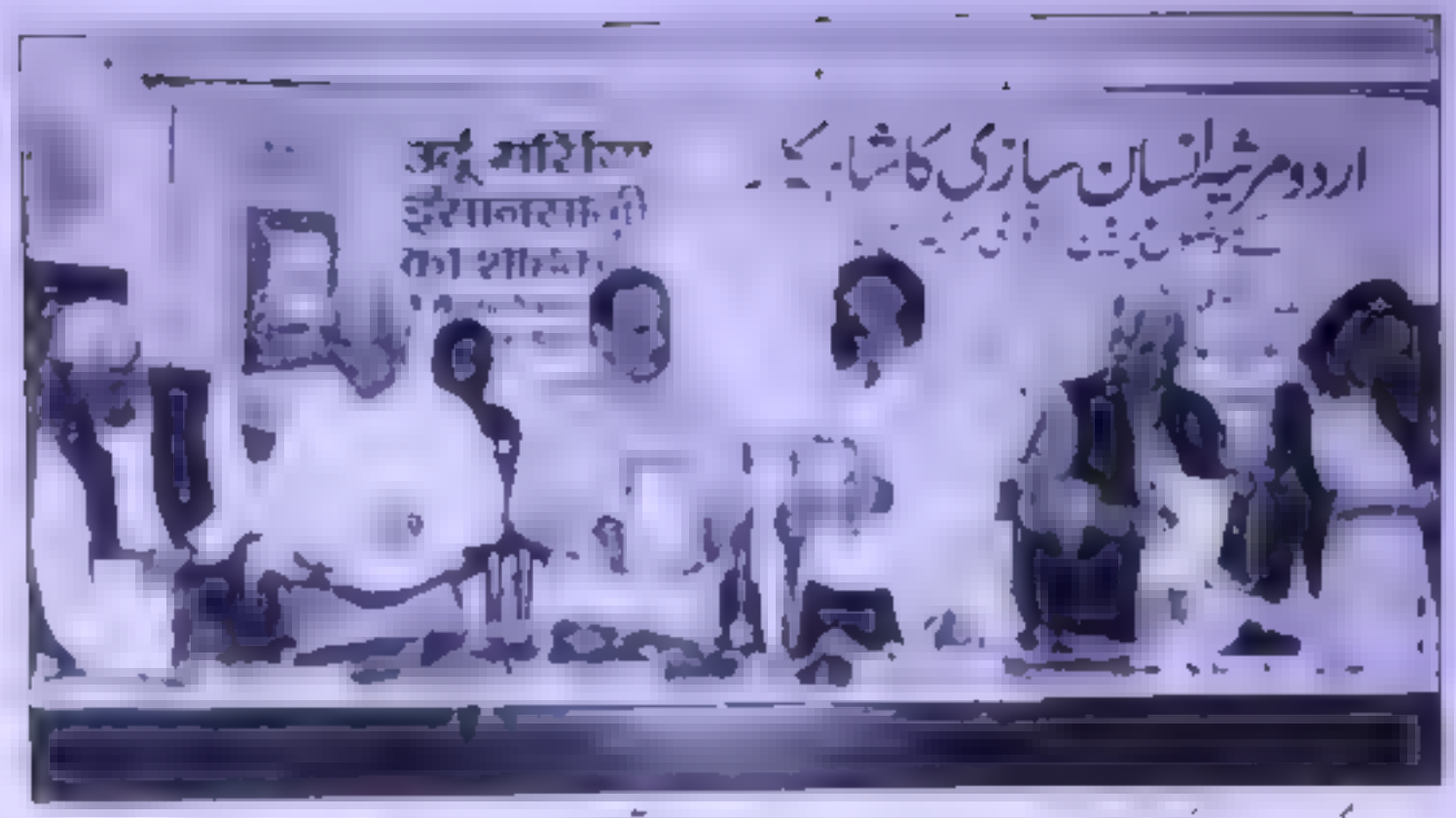

دائیں سے بائیں کامنا پرساد، ظ رضوی، خورشید اسلام، تقی عابدی

دائیں سے بائیں اظہر حسین، تقی عابدی

دائیں سے بائیں تقی عابدی،

نصرت مہدی صاحبہ سے پھول کا گلدستہ لیتے ہوئے

"کاشی سے ریاست تک" کے سٹیج پر میں، کامنا پرساد اور نصرت مہدی کے ساتھ

میر انیس کے بھائی میر انس کے پوتے
اور پیارے صاحب رشید کے بھائی

سلطان صاحب فرید

کے غیر مطبوعہ مرثیوں، سلام اور رباعیات کا مجموعہ

اظہار حق کی رسم اجراء

(تحقیق، تدوین، ترتیب اور تدوینی مقدمہ)

رسم اجرا

حضرت سلطان صاحب فرید لکھنوی السلسلۃ عالیہ کی

غیر مطبوعہ رباعیات، سلام اور مراثی کا مجموعہ

اظہار حق

تحقیق، تدوین و ترتیب ڈاکٹر سید تقی عابدی

کے رسم اجراء

۶ اگست ۲۰۰۳ء بروز بدھ بوقت ۲ بجے شام

بمکان سبطین اکیڈمی صاحب روڈ، اسکوپ ہسپتال والی گلی نمبر ۲

صدارت: علامہ سہیل عابدی صاحب کویت سے تشریف لا رہے ہیں

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب شعبہ اردو ویسٹرن یونیورسٹی لندن (کینیڈا)

ڈاکٹر حسن اختر کے خطبہ استقبالیہ کے بعد ڈاکٹر علی عابدی (کراچی)

اور جناب ہاشم رضا سعید صاحب (کینیڈا) کی صدارت میں

رسم اجرا کی تکمیل کے بعد علمی نشست کا پروگرام ہوگا

دعوت عام ہے

ڈاکٹر سید اختر احمد ایجوکیشنل ٹرسٹ

معتمد جلسہ: سید عزیز اختر

اظہار حق

کائنات نجم

کی رسم رونمائی

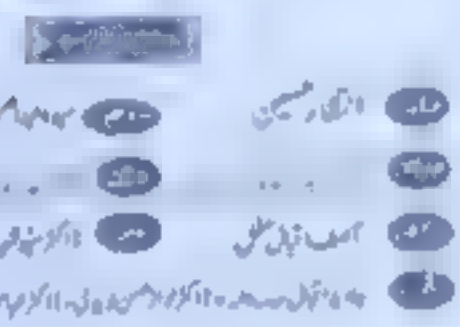

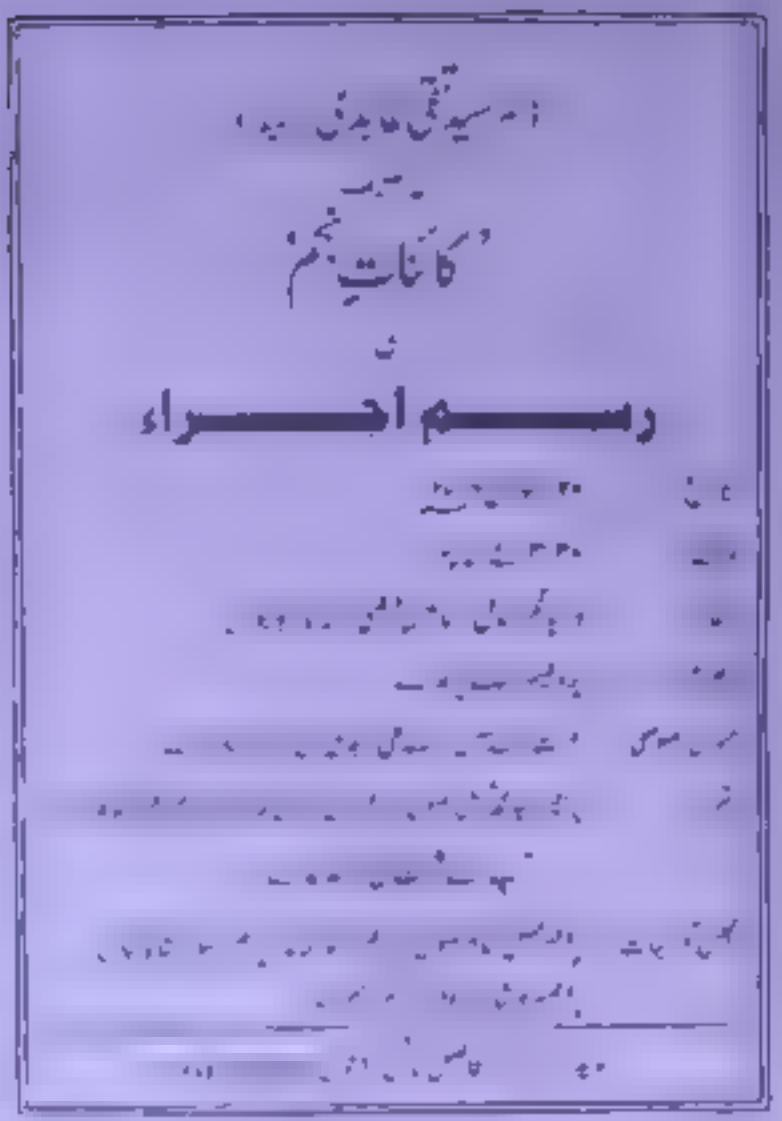

ڈاکٹر سید تقی عابدی

کی تصنیف

"کائناتِ نجم"

پر

رسم اجراء

رسم اجراء

"کائناتِ نجم"

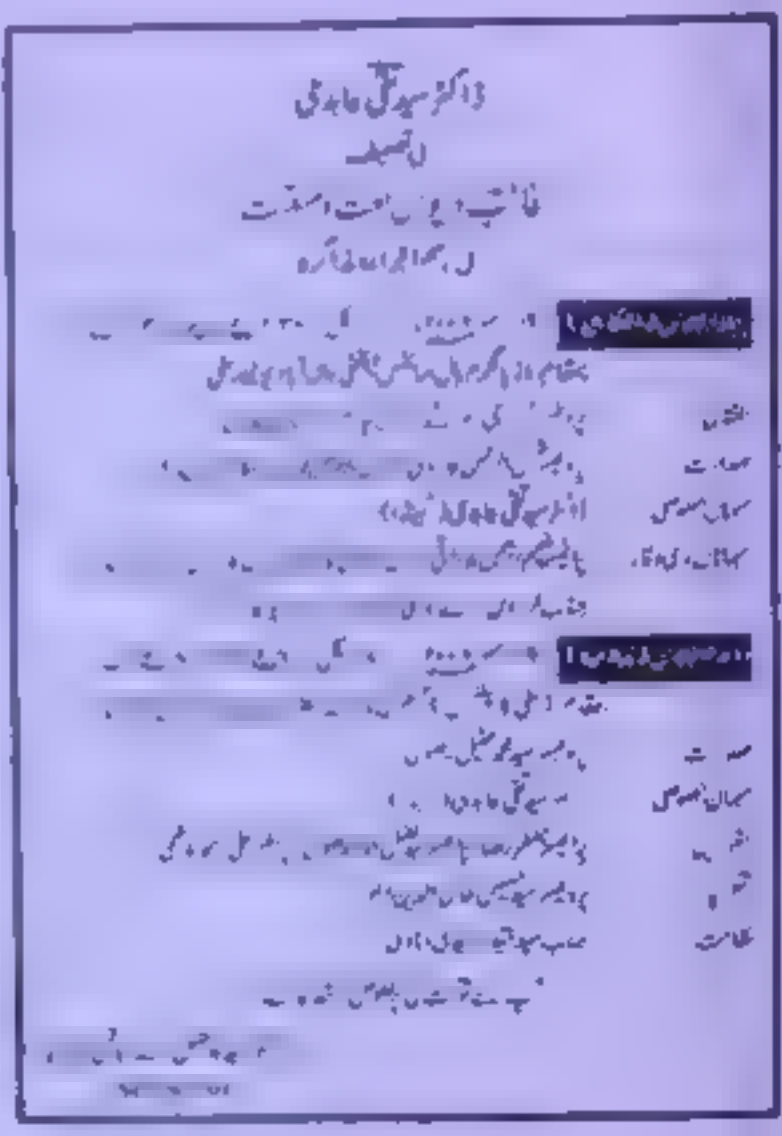

ڈاکٹر سید تقی عابدی

کی تصنیف

"کائناتِ نجم"

پر

رسم اجراء

دیوانِ غالب
APNA VISION
Amar Chand Narang
2011

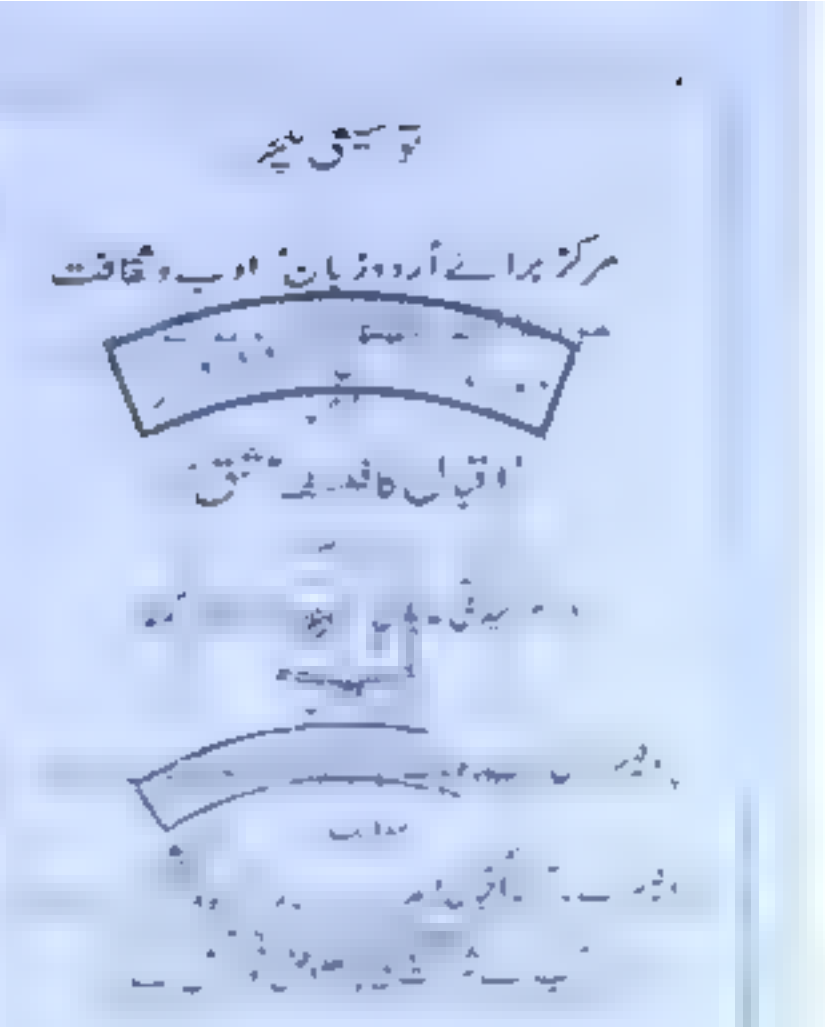
توسیقی لیجر
مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت
اقبال کانفرنس

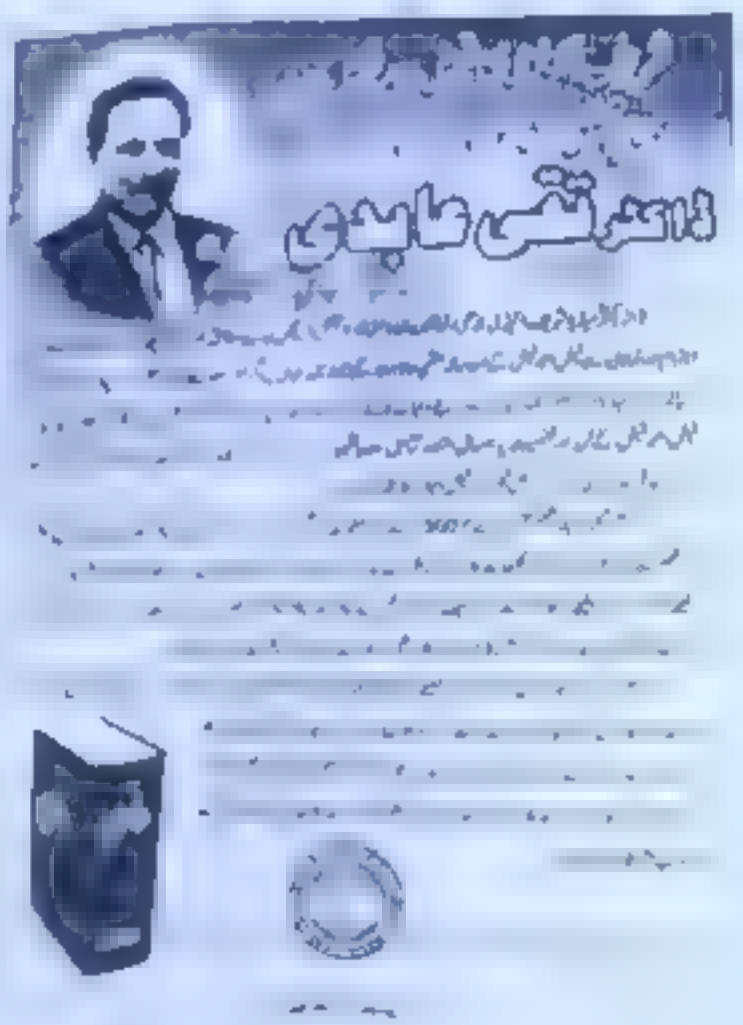
ناصر قتی طاہری

طرحی مسالمه

فیض فیضی

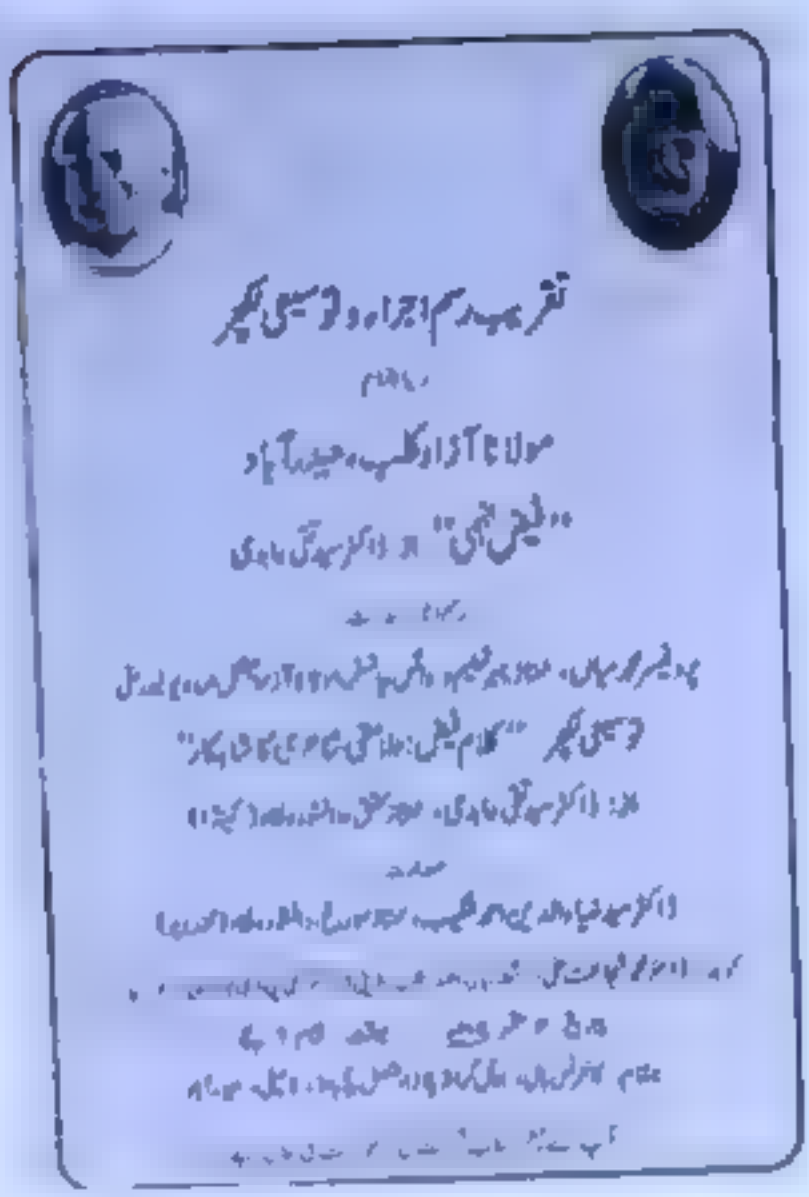

تقریب رسم اجراء و توسیعی لکچر

مولانا آزاد کلب، حیدرآباد

"فیض الٰہی" از ڈاکٹر سید تقی عابدی

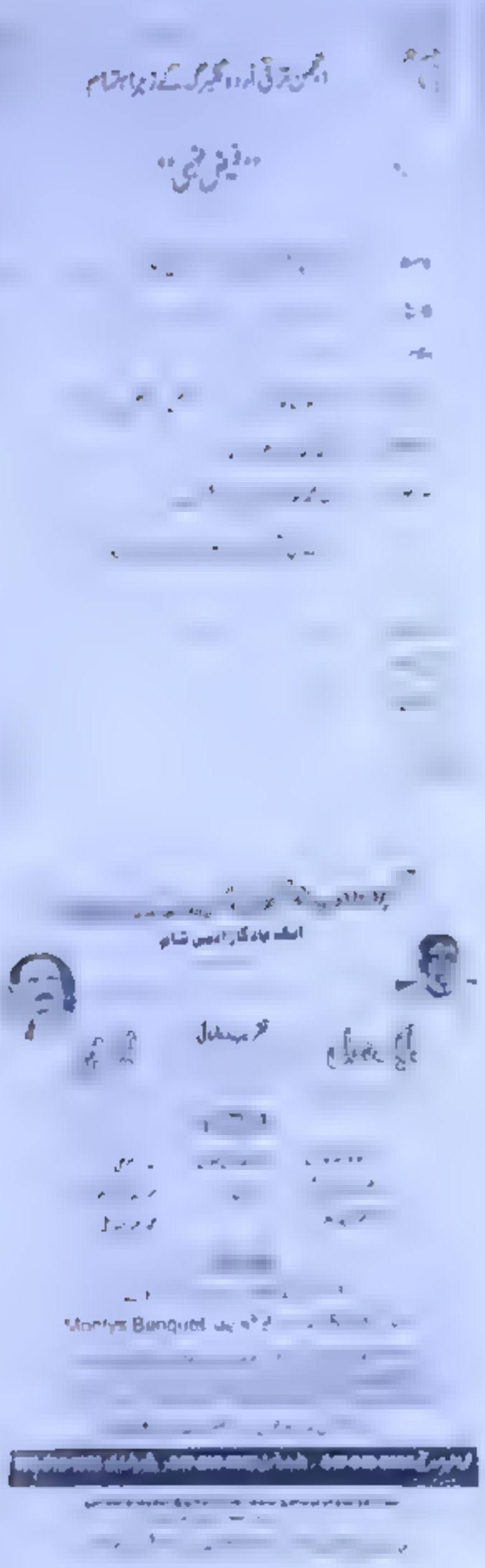

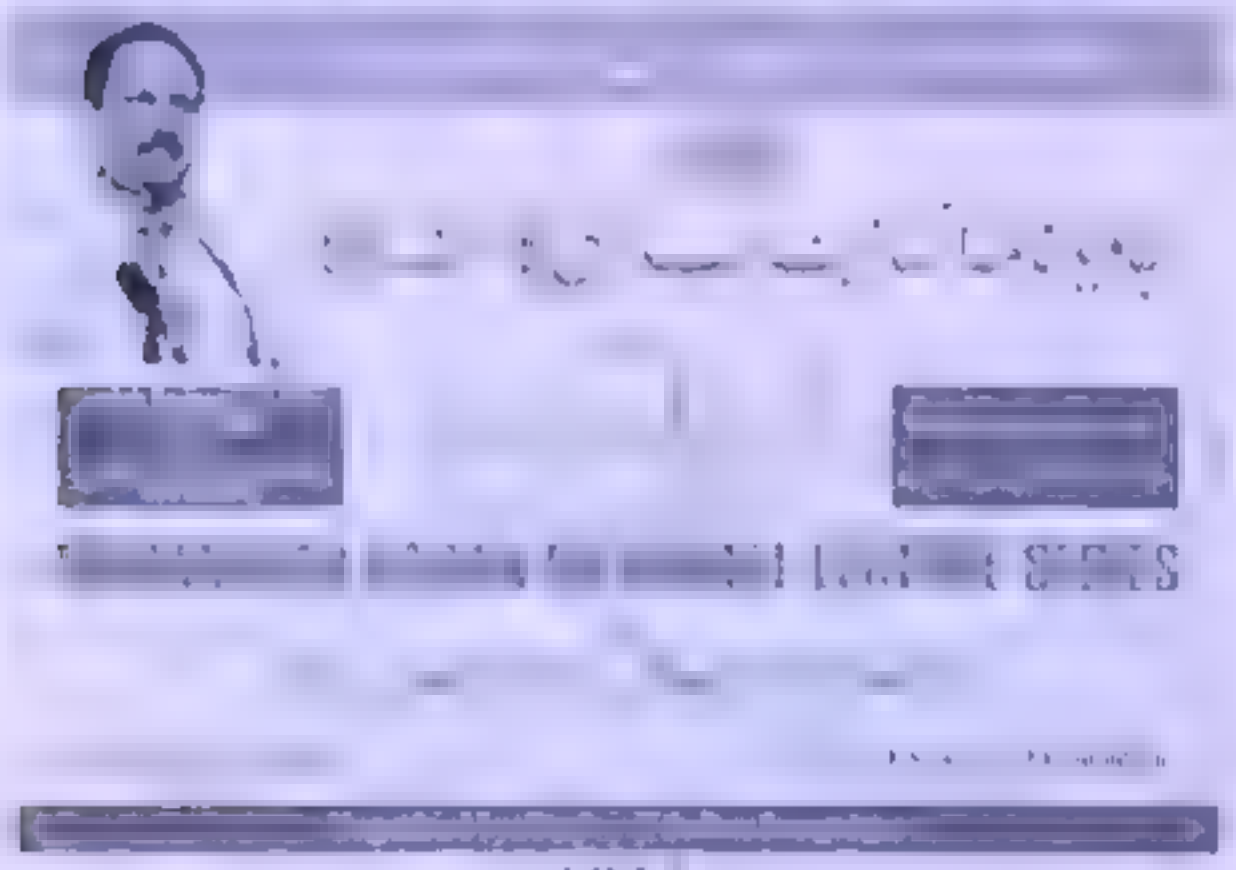

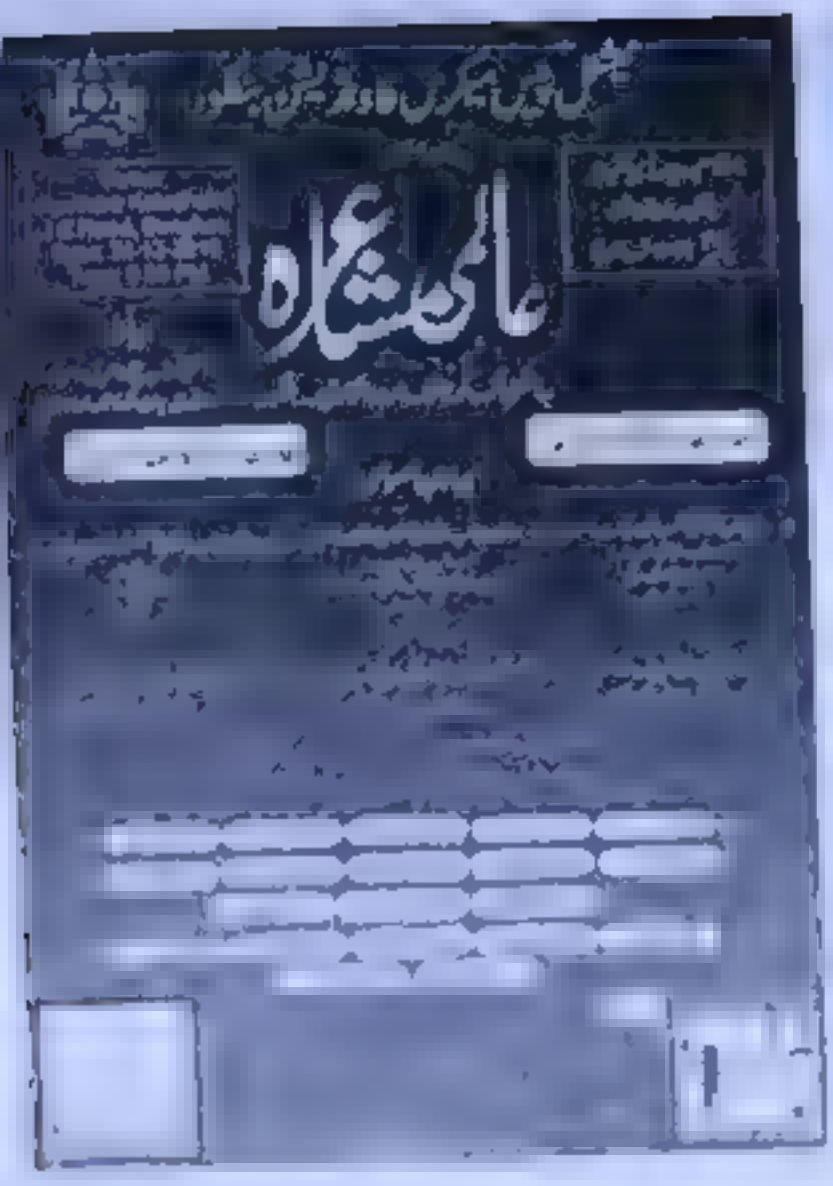
عالمی مشاعرہ

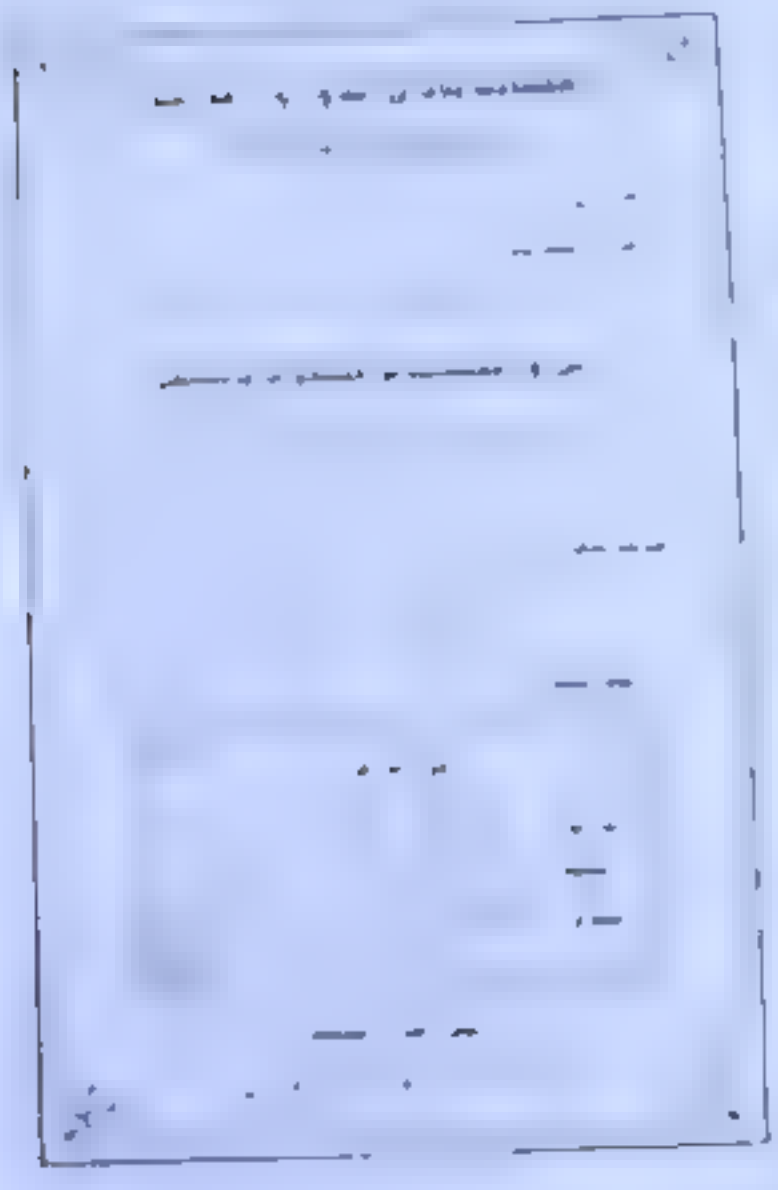

توسیعی خطبہ

ادبی محفل

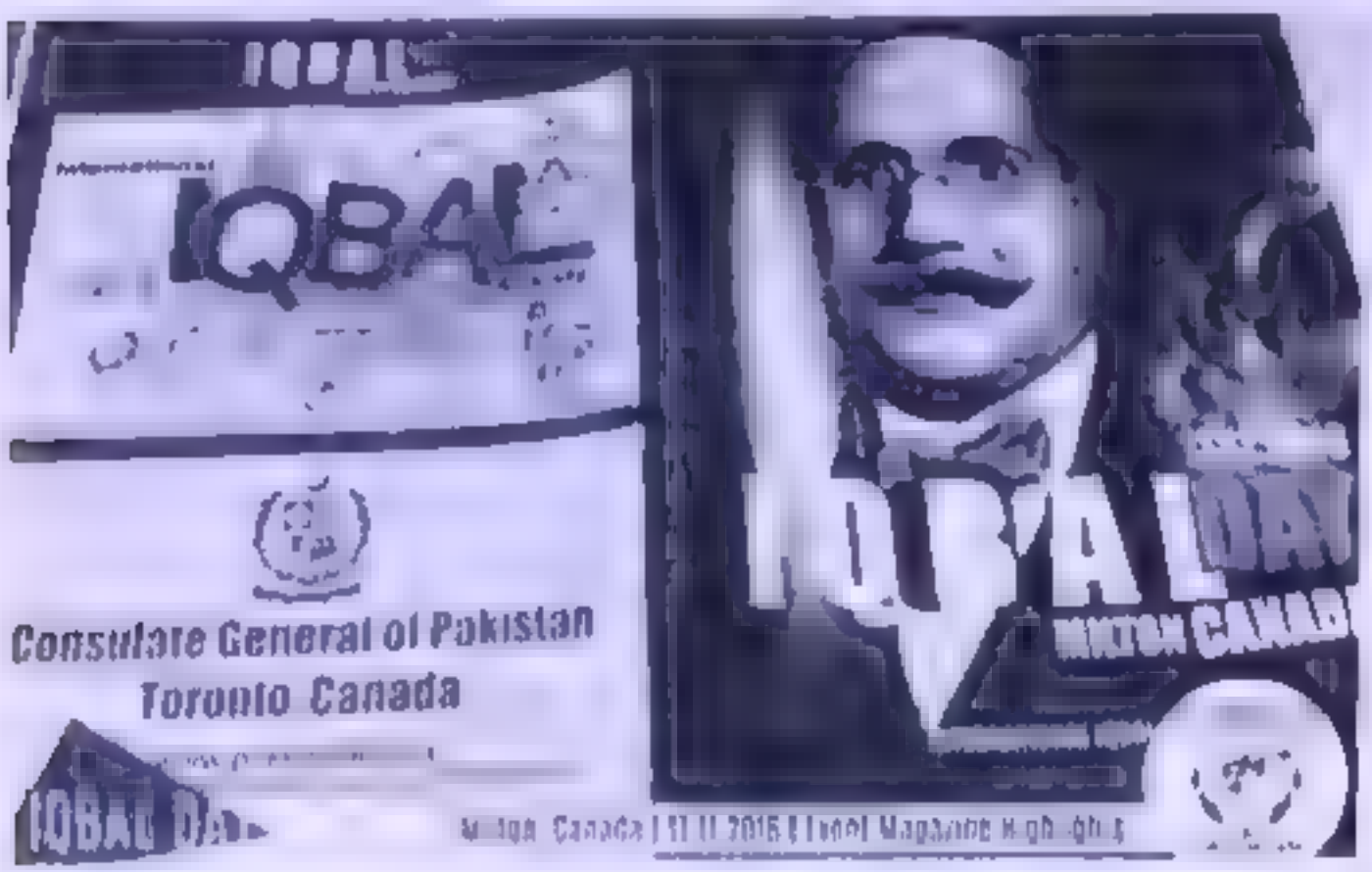

"AZADI MEIN SHOARA KA KIRDAR"

میں منتظر لب گنگن ما آفریدہ ہوں

ڈاکٹر سید تقی عابدی، کینیڈا

Dr. Syed Taqi Abedi, Canada

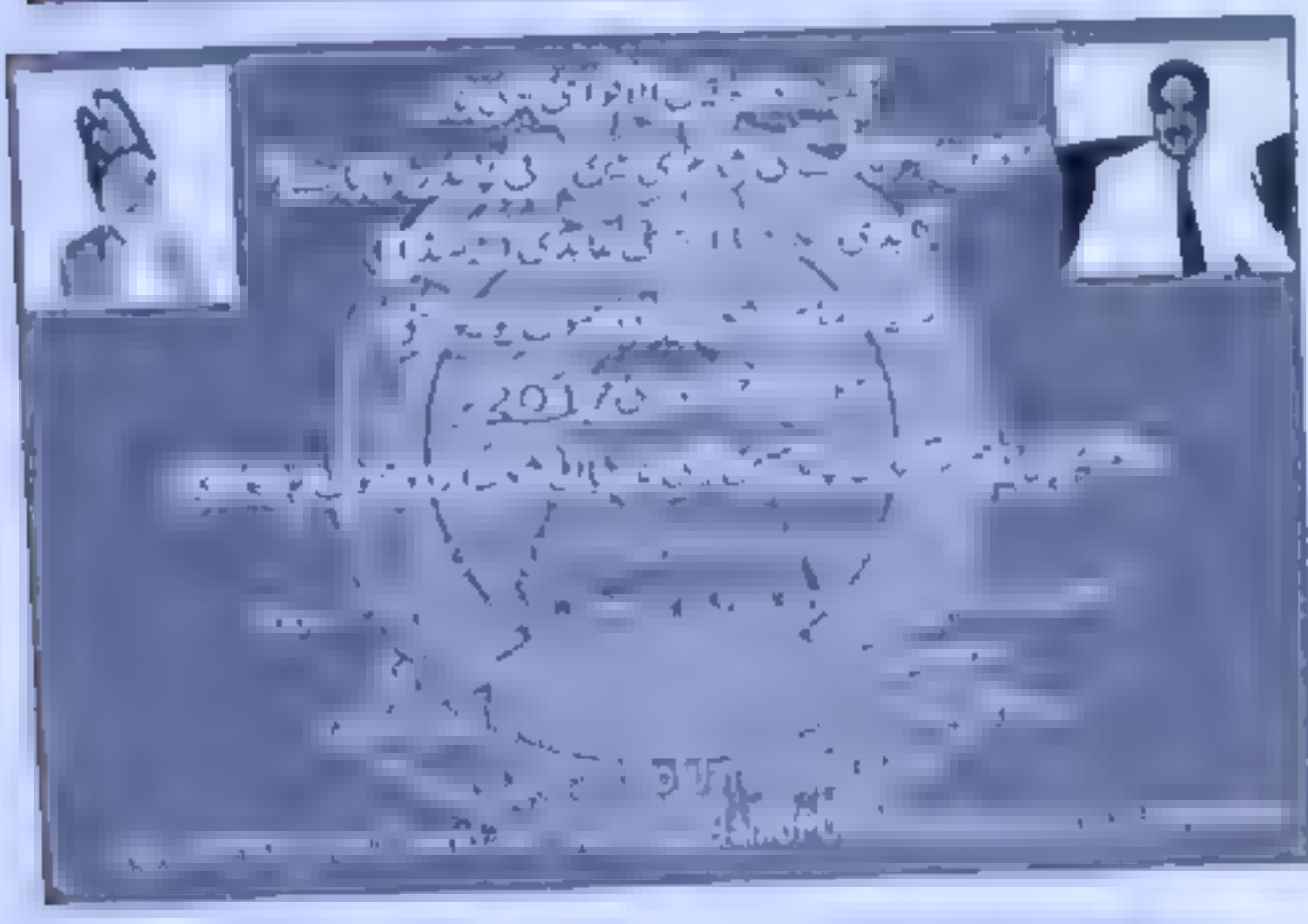

رسم اجراء

تقریب رسم اجرا

تاریخ
2017

ڈاکٹر سید تقی عابدی: بحیثیت نقاد و محقق

مصنف: محمد رکن الدین

مقررین:

شعبہ اردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام

معروف محقق، نقاد اور شاعر

پروگرام

25 ,2017

11 -

سمنام

پروفیسر ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

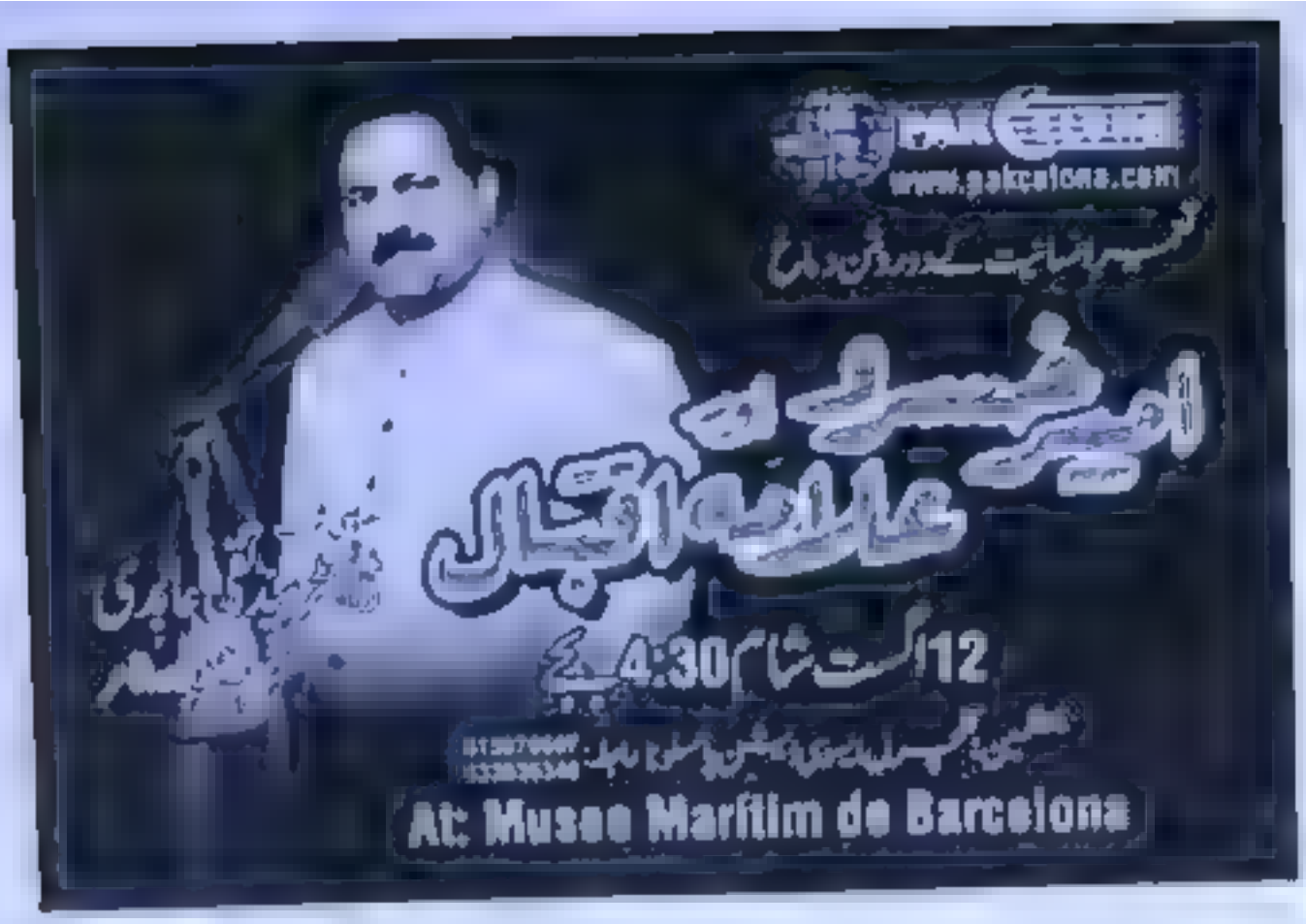
www.pakcatalans.com
علامہ اقبال
12 اگست شام 4:30 بجے
At: Museo Marítim de Barcelona

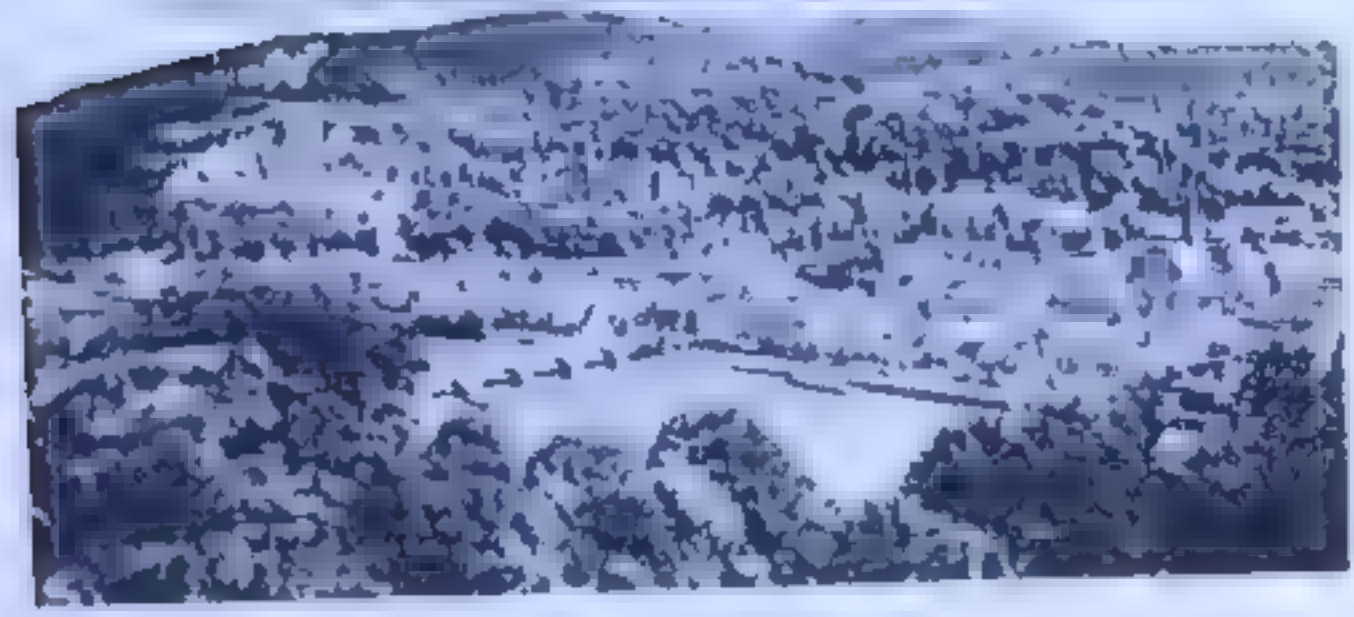

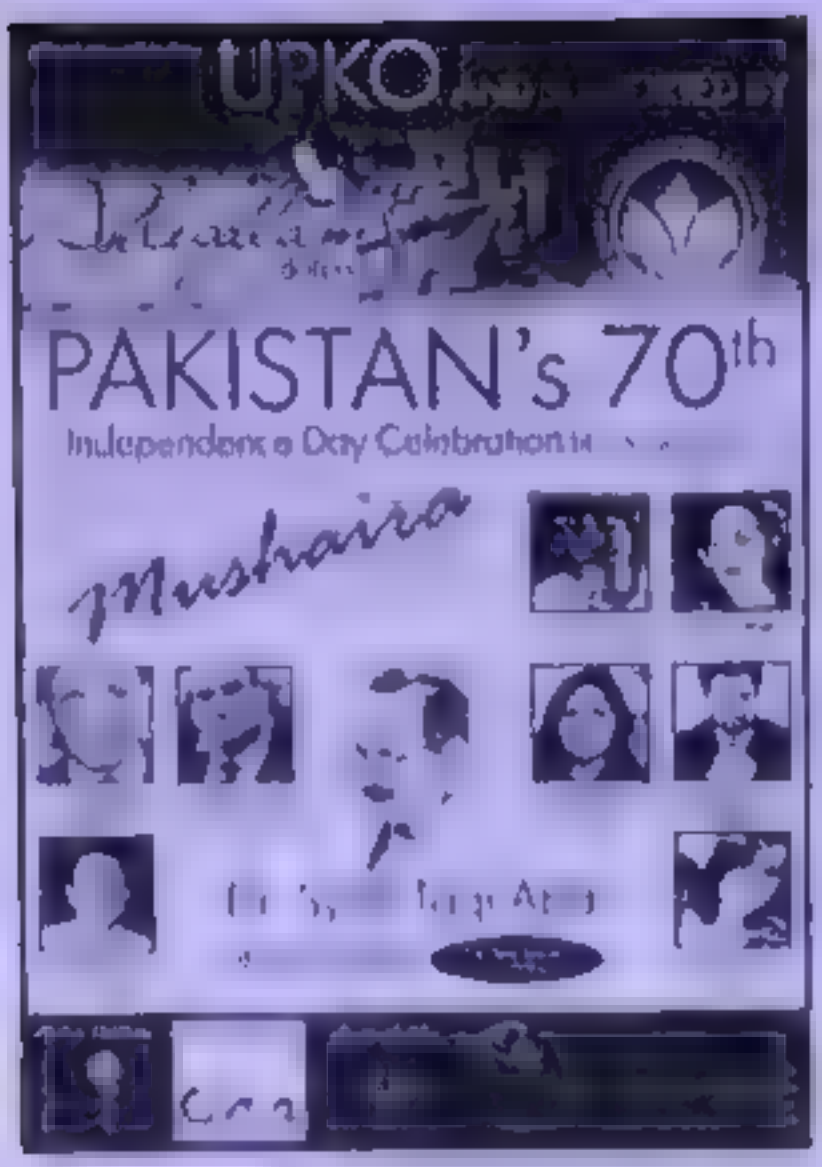
UPKO
PAKISTAN's 70th
Independence Day Celebration
Mushaira

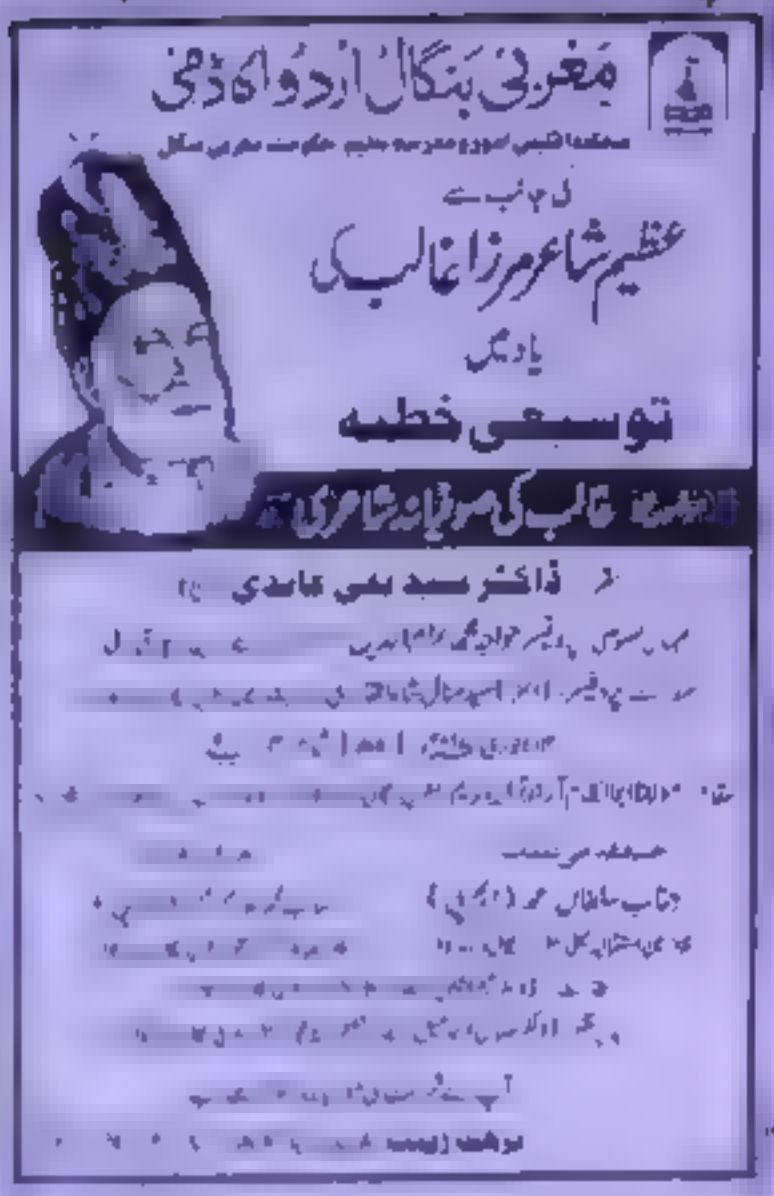
مغربی بنگال اردو اکاڈمی
کی جانب سے
عظیم شاعر مرزا غالب کی
یاد میں
توسیعی خطبہ

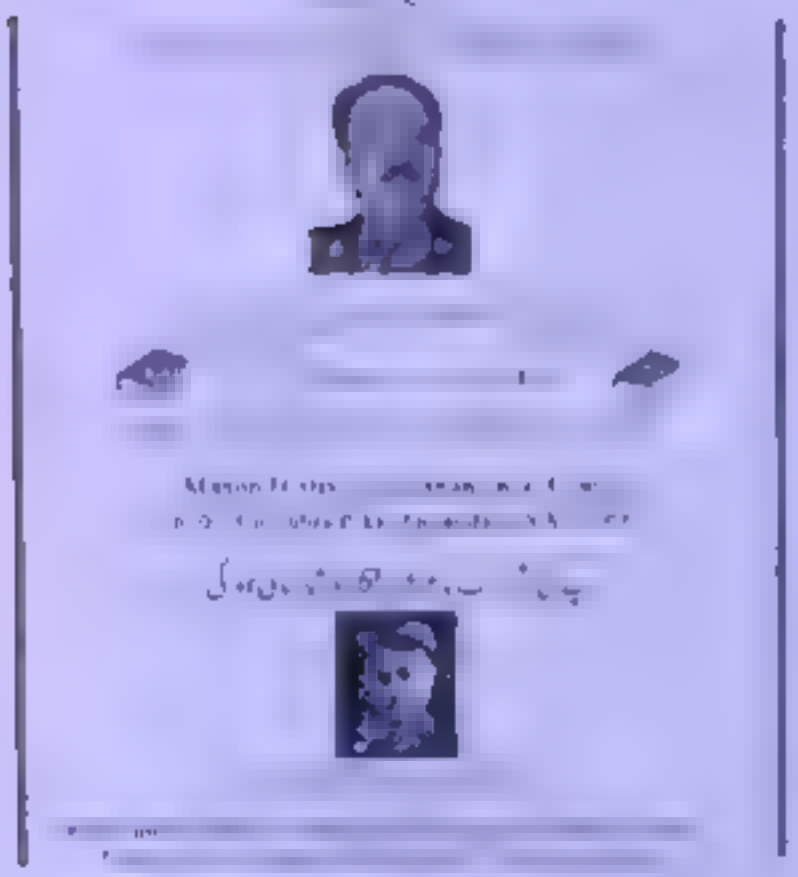
BYSNA

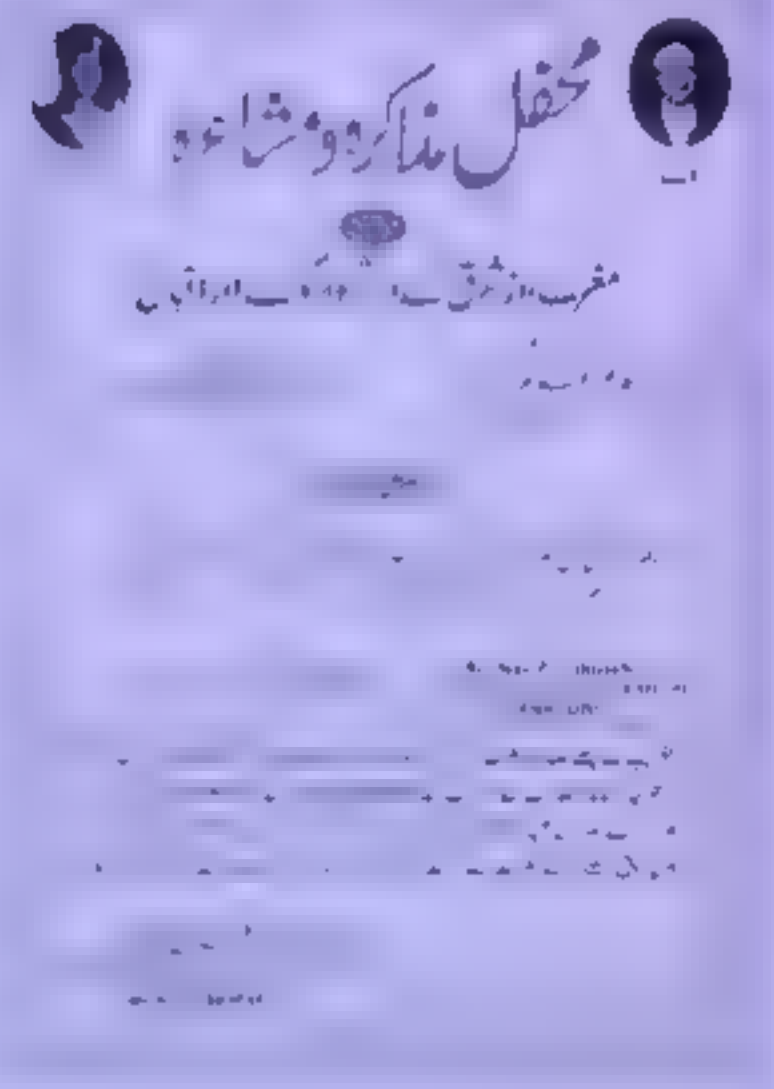
محفل مذاکرہ و مشاعرہ

Topic: Sir Syed's Message in relevance to the education among Muslims today

Topic: Sir Syed's literary and social contribution

Date: November 18, 2017

Time: 1:30 PM - 5:00 PM

ANTAGHAM KHAN

E-mail

TEXT OR WHATSAPP: 416-000-0000

دیوان سلام و کلام امیر

توسیعی لکچر

"جدید و جہد آزادی اور اردو شاعری"

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

زیر اہتمام ادارہ گواہ اردو ویکلی و میڈیا پلس

کتابخانہ یونیورسٹی آف ٹورنٹو، انڈیا

شعبہ اردو

ایک روزہ بین الاقوامی سمینار

منعقدہ تقریب

بعنوان

Writers' Forum Kuwait

Welcomes

To

An extension lecture on

"Ghalib kaa ka unlimited - Vision aur"

Venue - Titanic Complex, Salmiya-Kuwait Date :- 3rd Nov 2017

IQBAL DAY 2017
HAMILTON, CANADA
Dr. Taqi Abedi
KEYNOTE SPEAKER

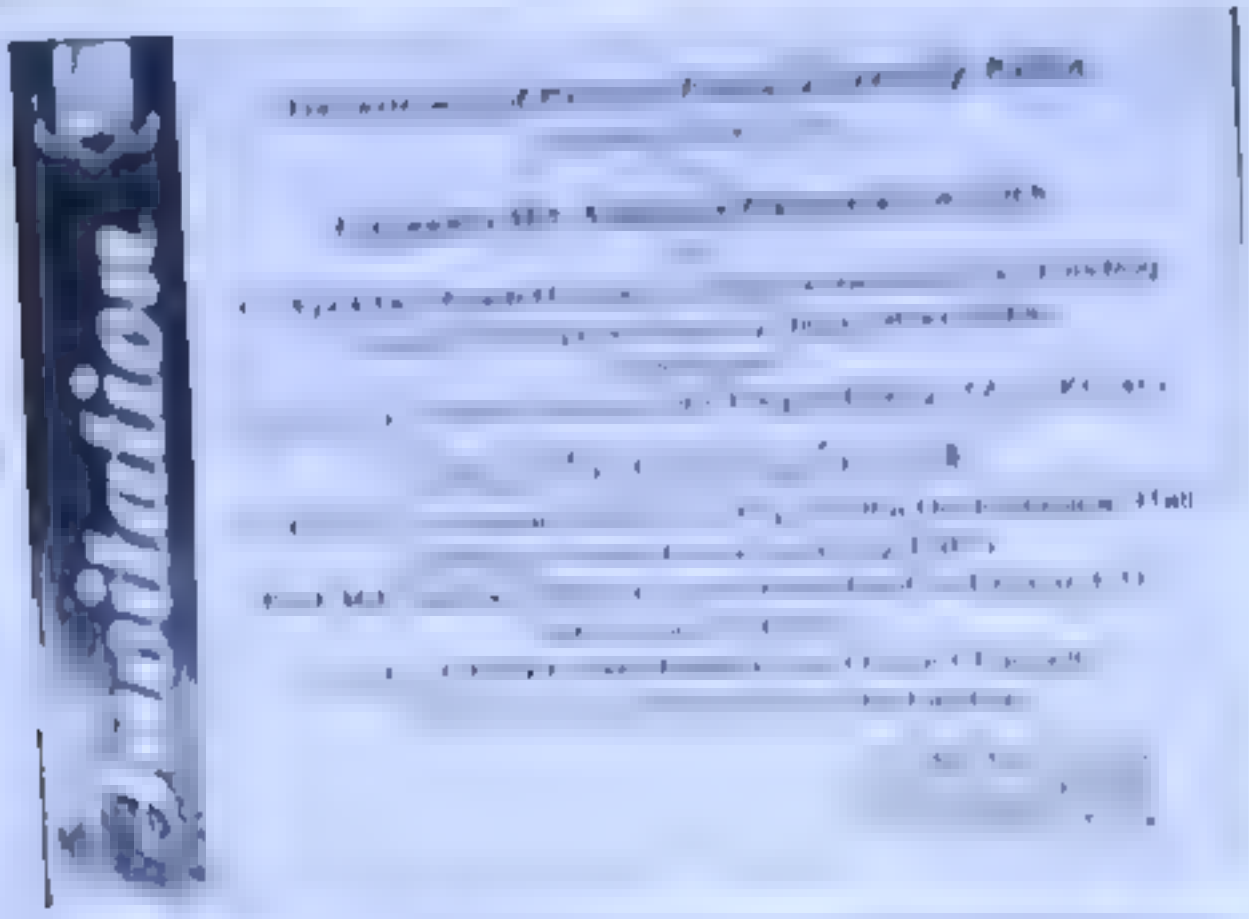

CALCUTTA GIRLS' COLLEGE

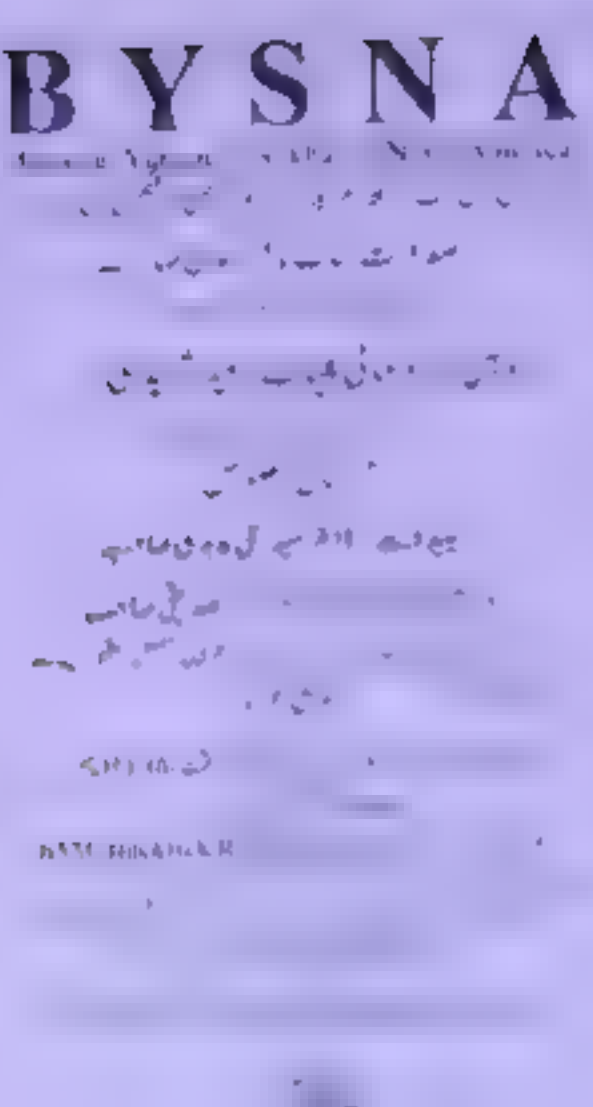
BYSNA

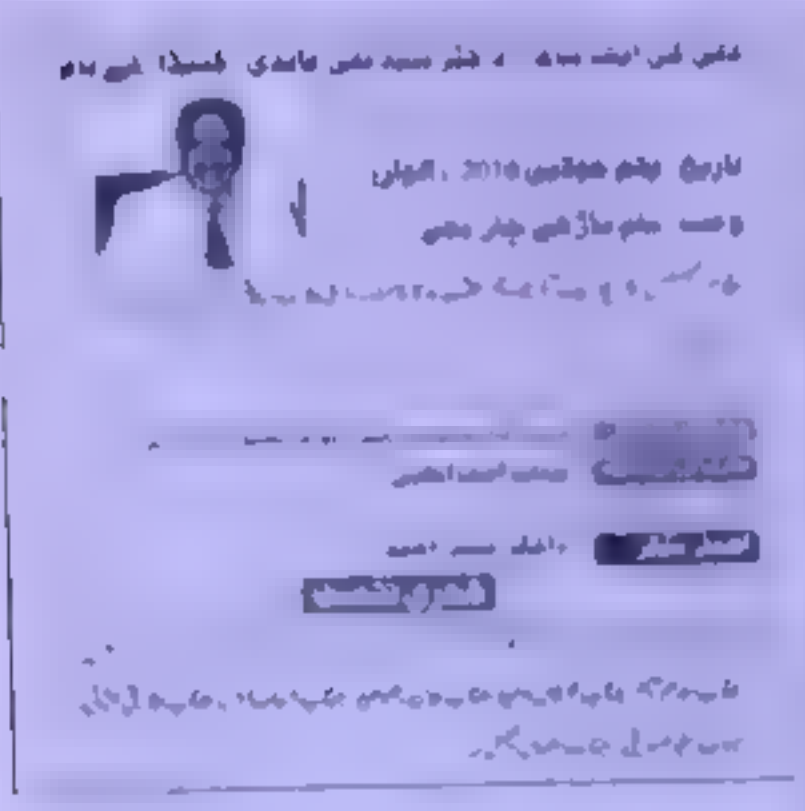

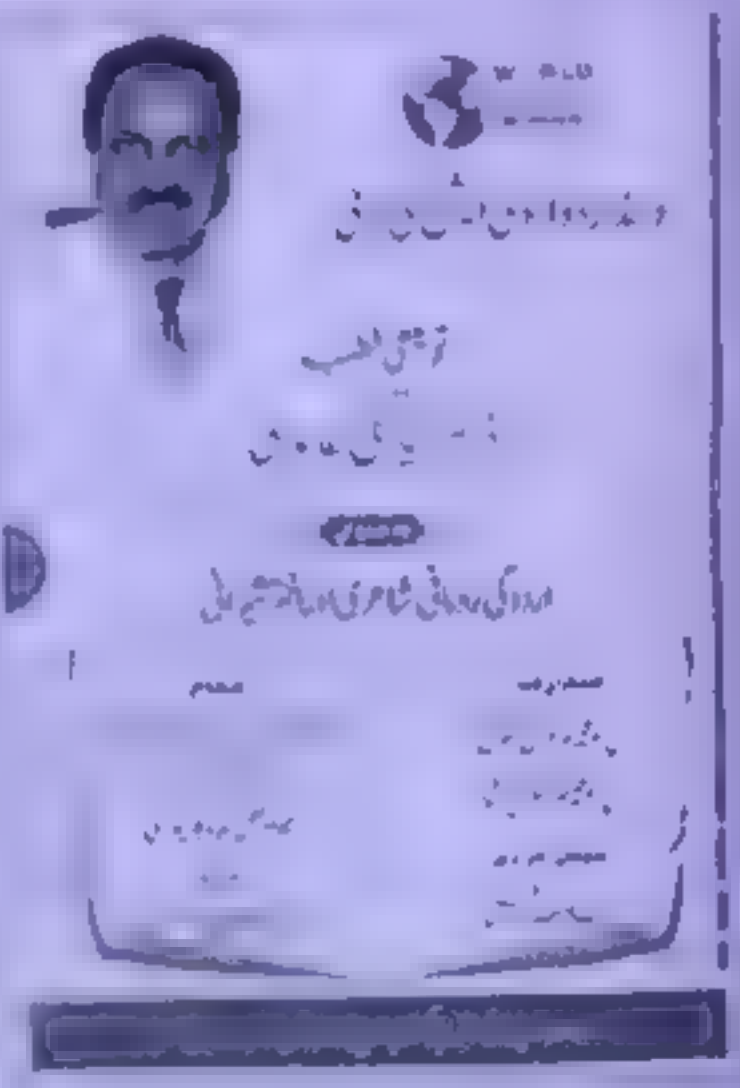

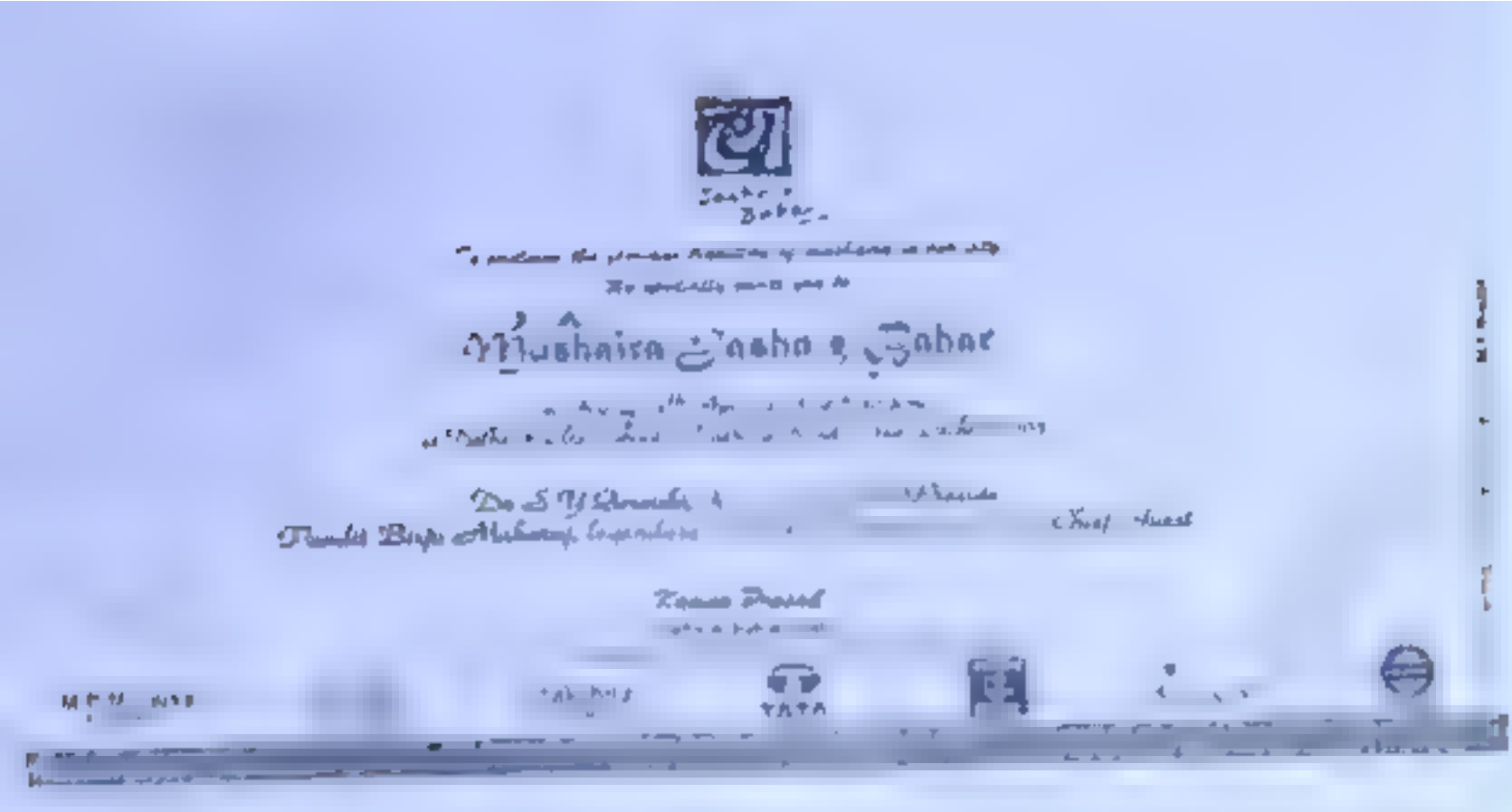

Mushaira Jashn e Jahar

Dr S M Shamsi

Rekhta Boys Mushaira Inauguration

Chief Guest

Venue Partner

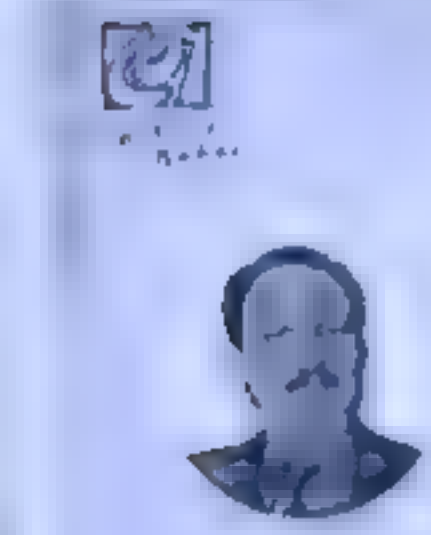

Dr Tariq Ali

Babar at DPS Mathura Road in New Delhi 15 April 2018 at 7 00PM

6 جون 2018ء سے 13 جون 2018ء

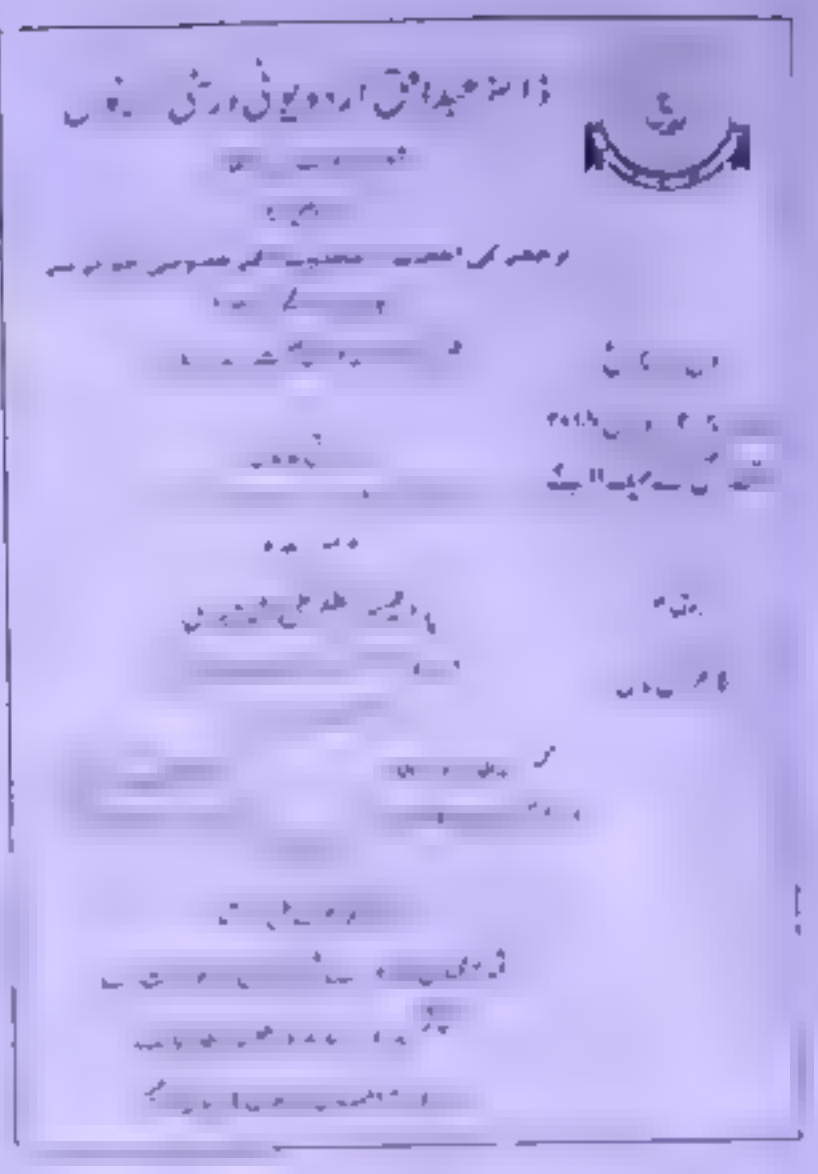

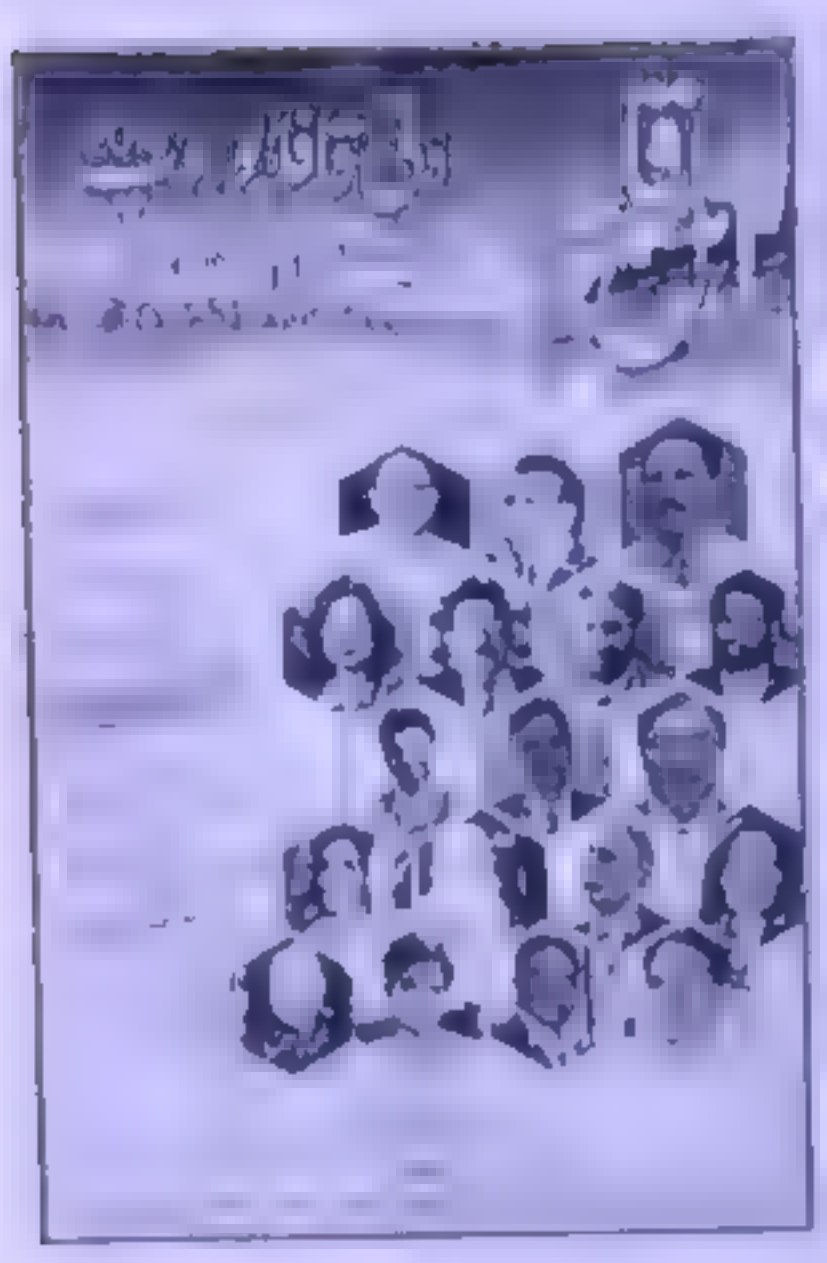

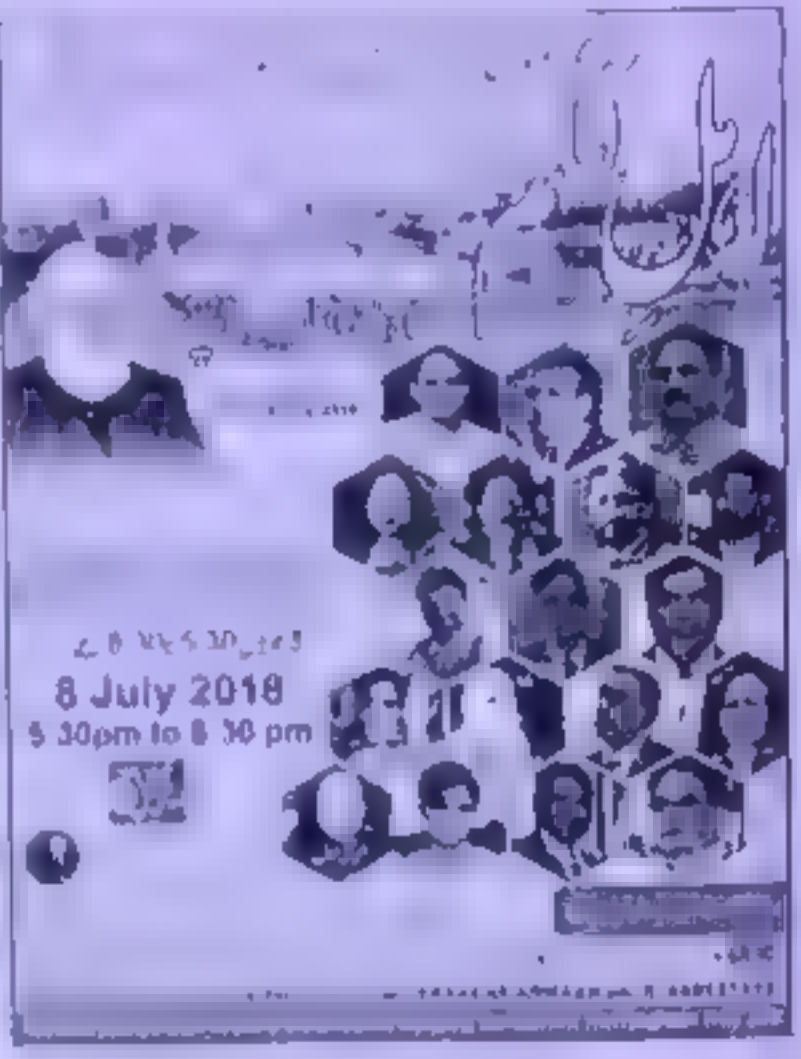

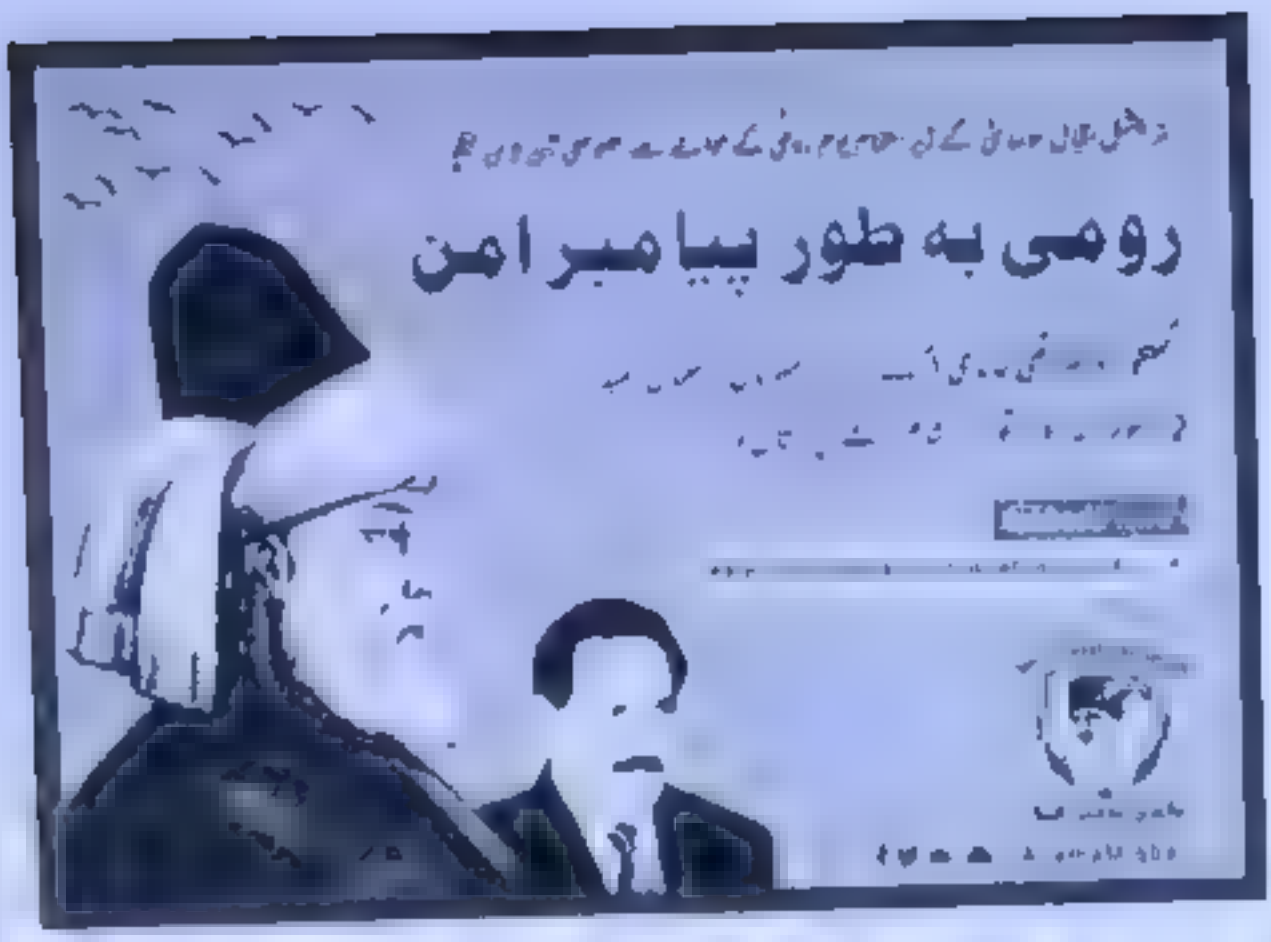
رومی به طور پیامبر امن

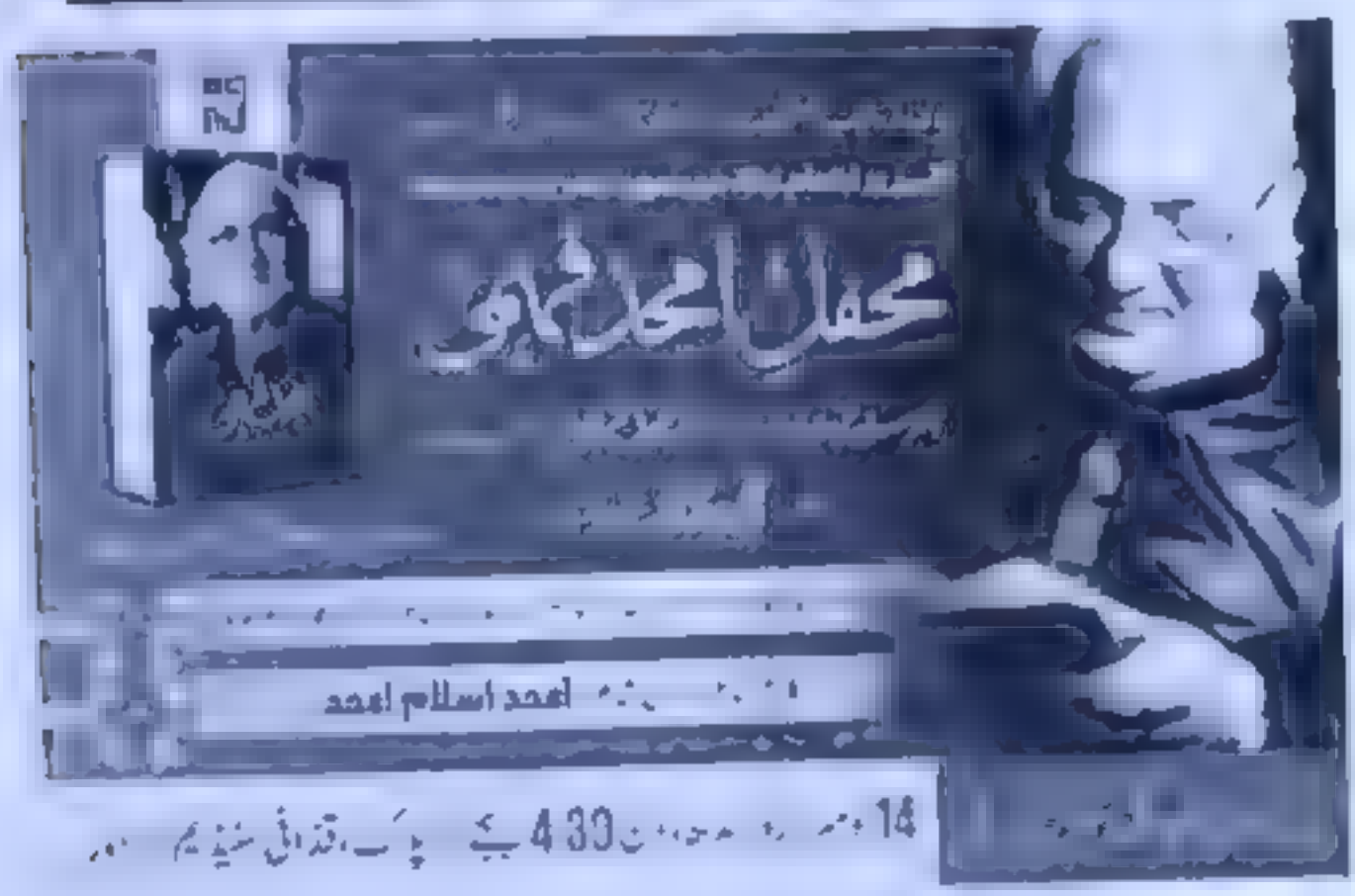
محفل امجد نامہ

امجد اسلام امجد

14 [illegible] 439 [illegible]

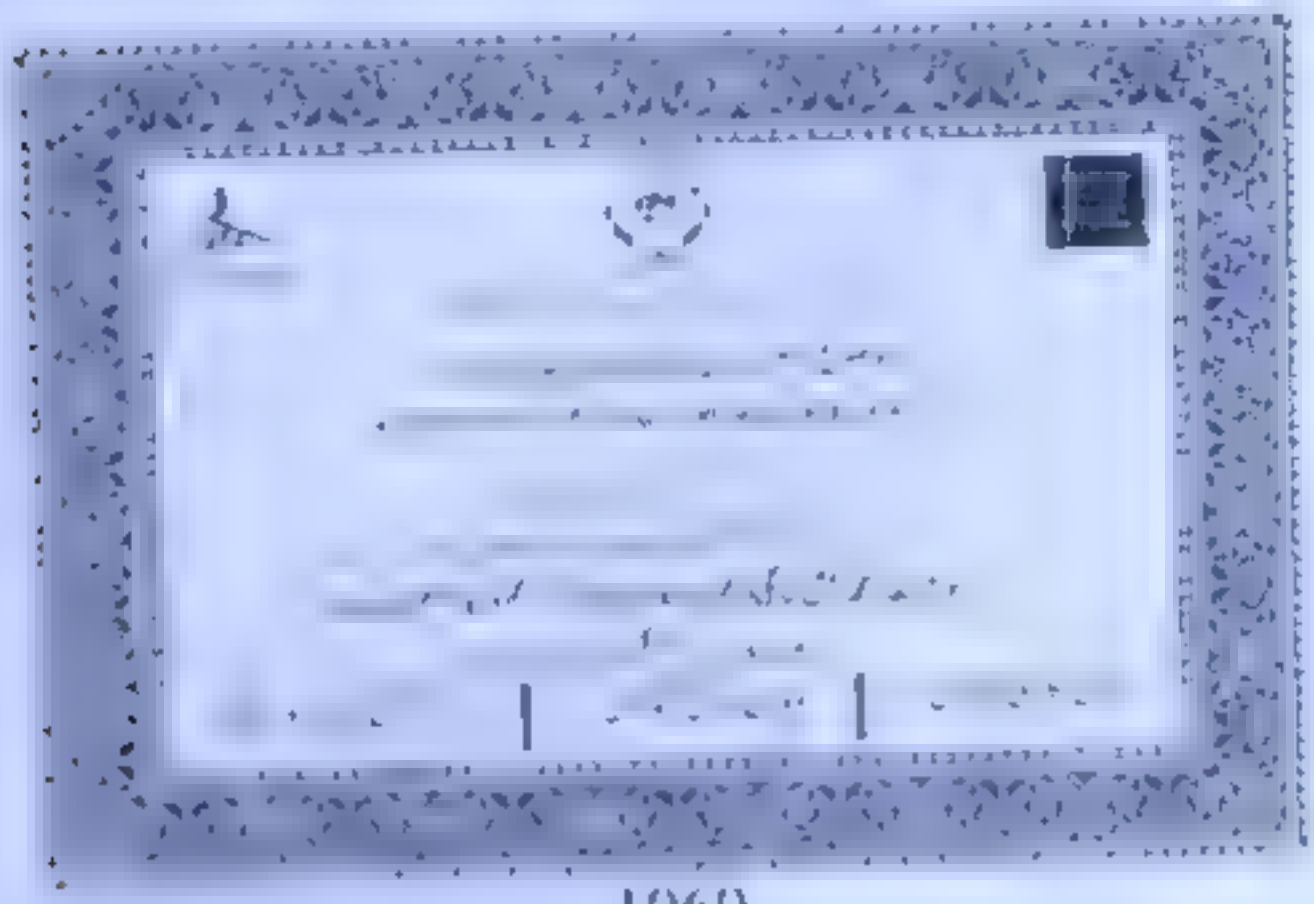

Taqi Abedi

2018
عالمی اردو مرثیہ کانفرنس

احسان سفیر گلزار

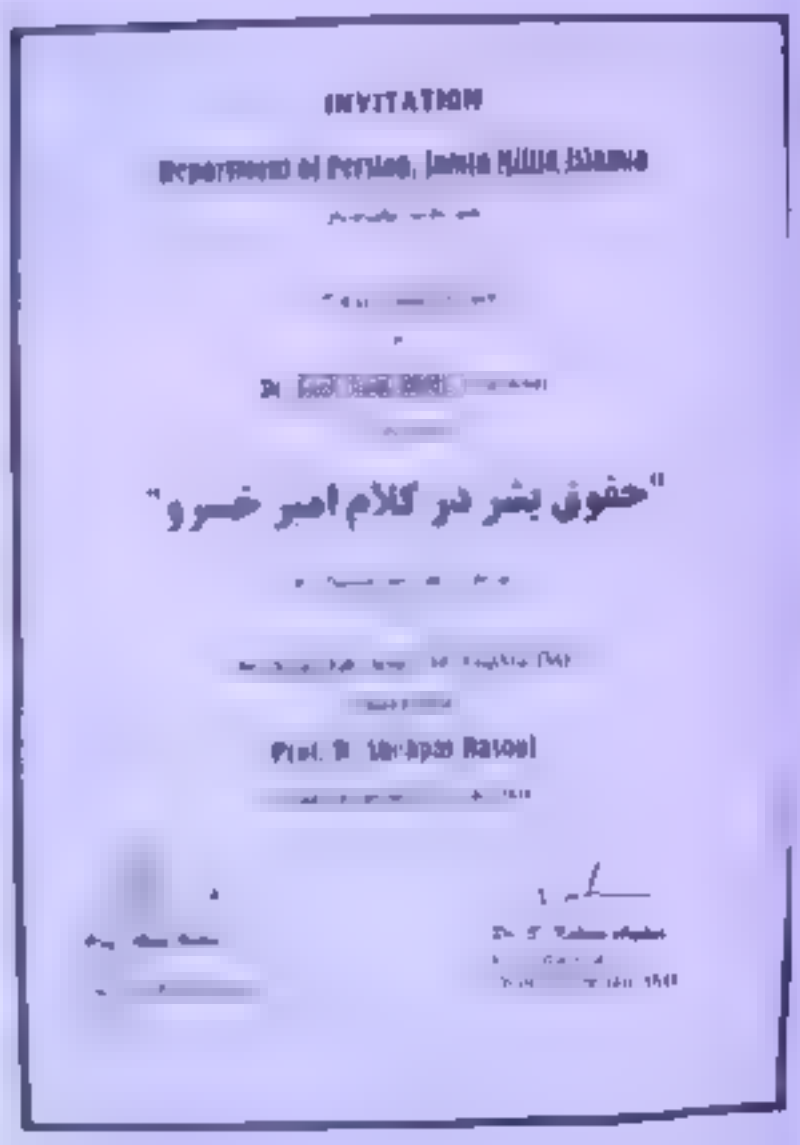
INVITATION
"حقوق بشر در کلام امیر خسرو"

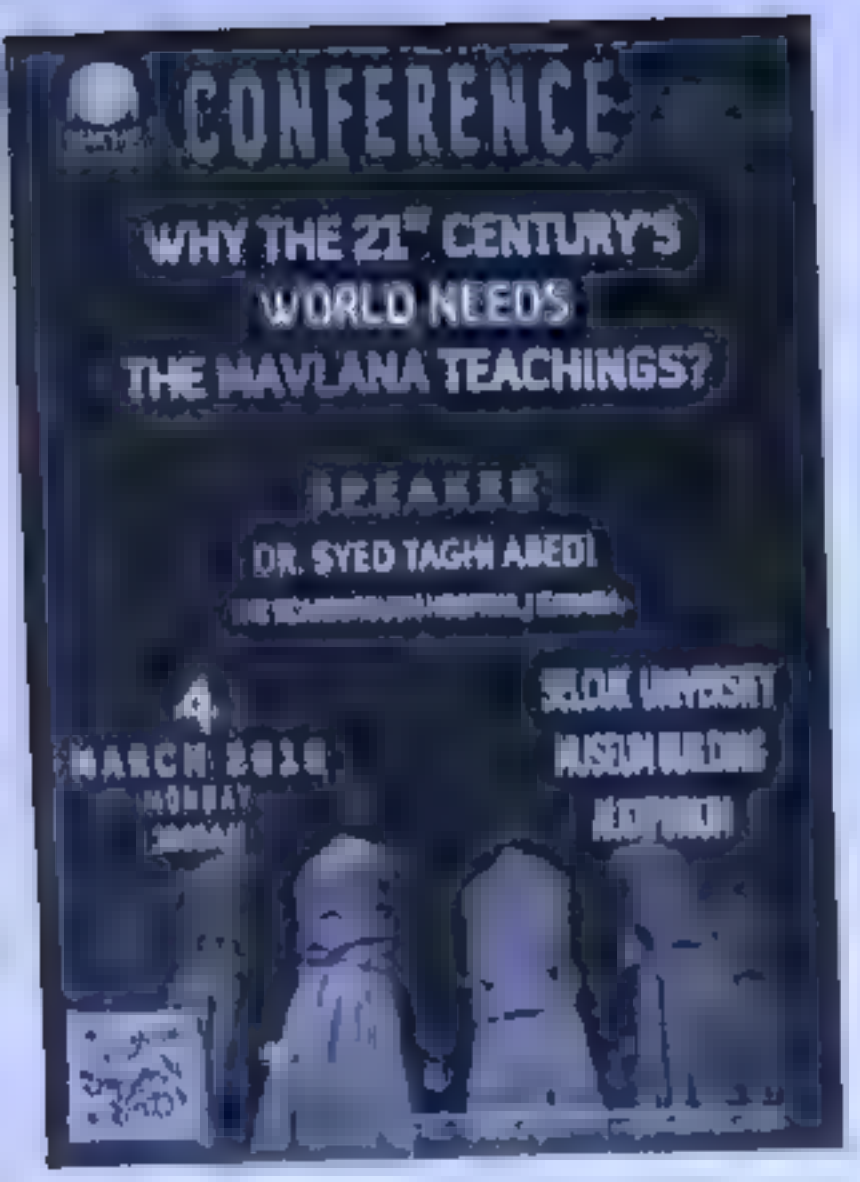
CONFERENCE
WHY THE 21ST CENTURY'S
WORLD NEEDS
THE MAVLANA TEACHINGS?
SPEAKER
DR. SYED TAGHI ABEDI
4
MARCH 2024
MONDAY
SELCUK UNIVERSITY
HASEKI BUILDING

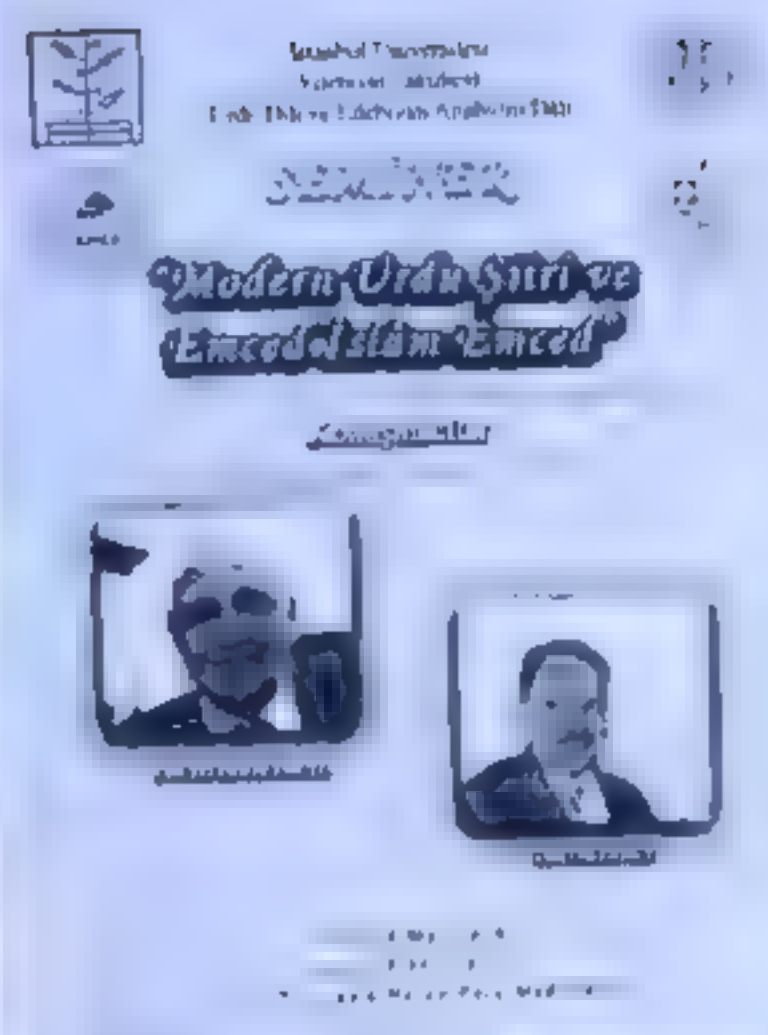
"Modern Urdu Shiri ve
Emeed Islam Emeed"

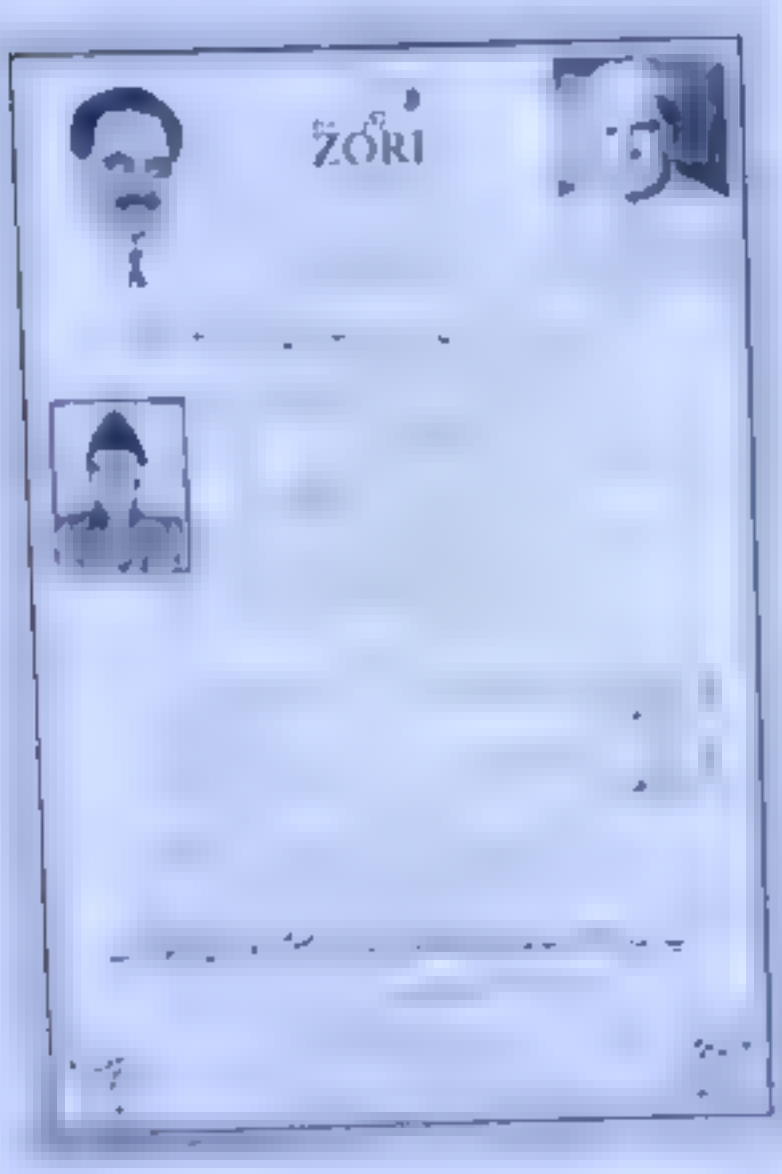
ZORI

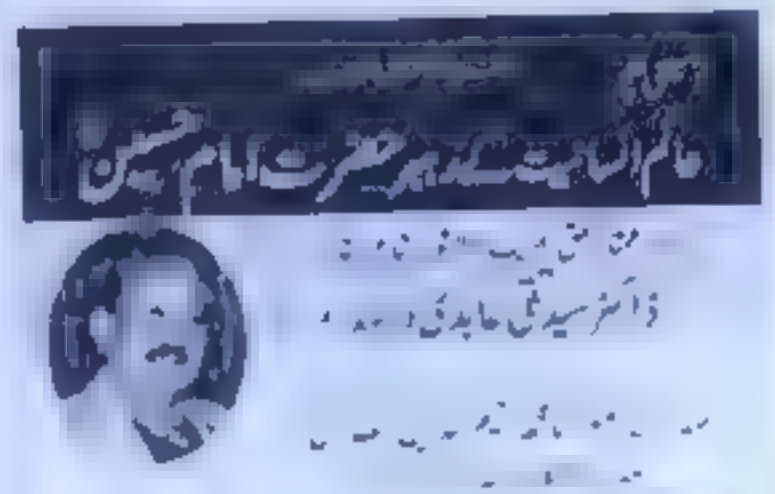
عالم انسانیت کے رہبر حضرت امام حسین
ڈاکٹر سید تقی عابدی

COLDEN JUBILEE
CELECRATIONS
گولڈن جبلی
تقریبات
جشنِ گلزار
Gulzar Festival

محقق و ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی (دہلی)

ڈاکٹر آصف علی محمد (مہاراشٹر) اور ڈاکٹر ثناء شعالی (مدھیہ پردیش)

کی کتاب کا

تاریخ: 23 دسمبر 2019 وقت 3:00 بجے سے چھ

مقام: صدر دفتر این سی پی یو ایل بھاشا بھون نئی دہلی

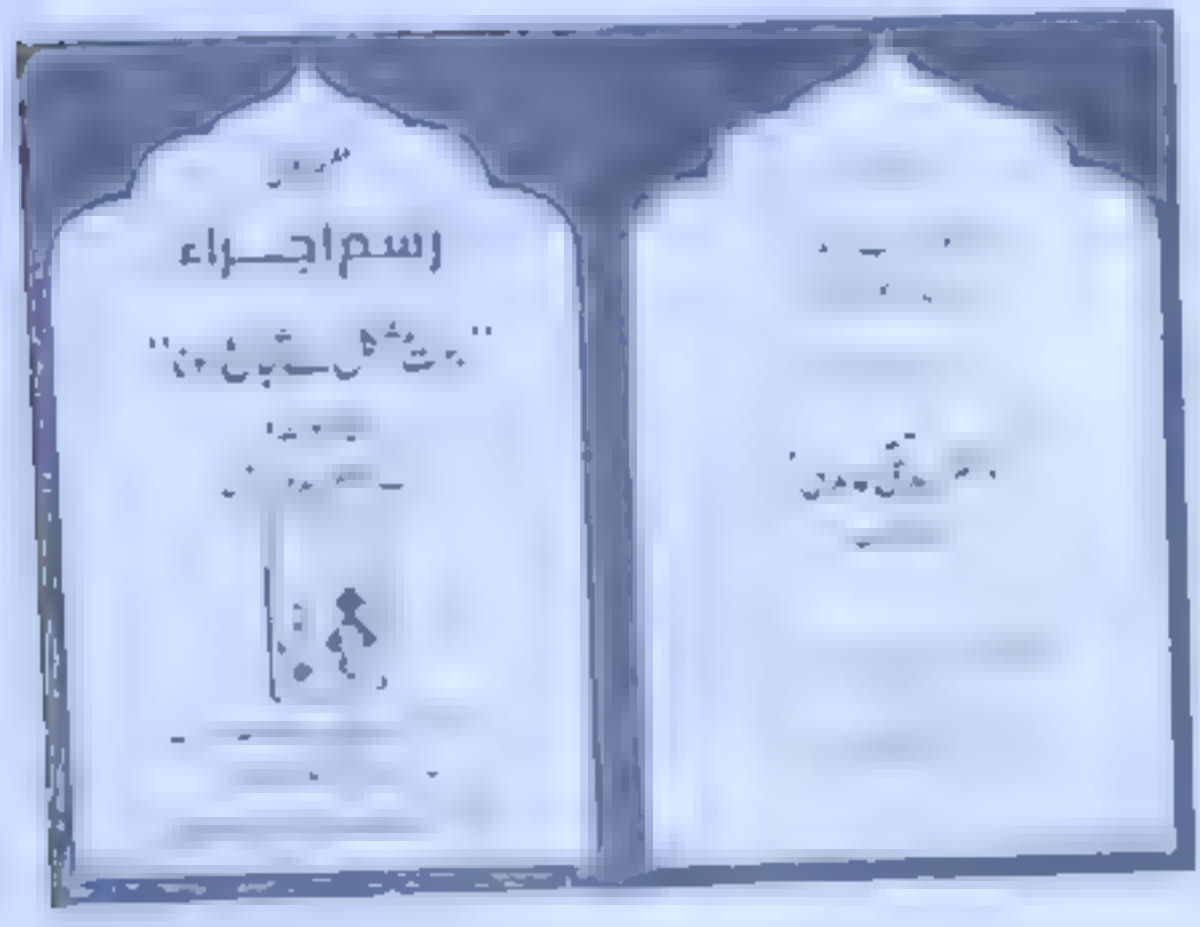

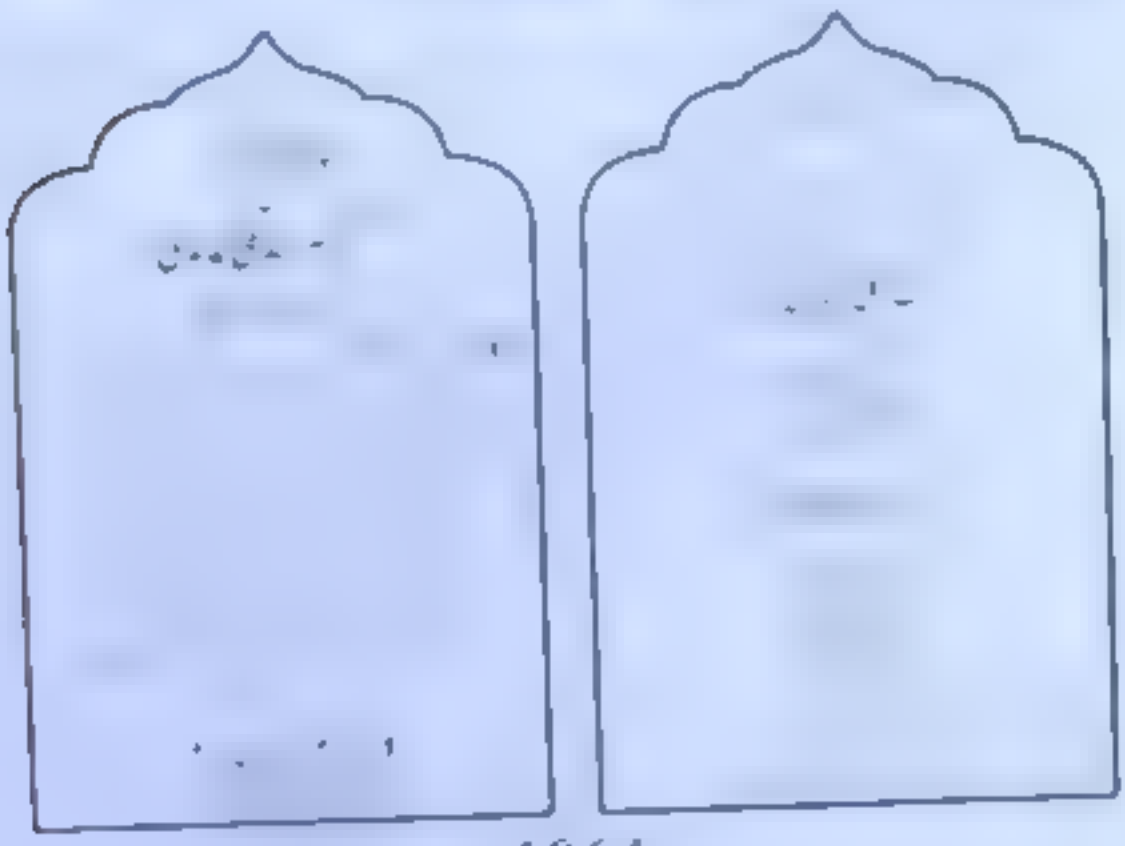

علامہ اقبالؒ اور عشق رسولﷺ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

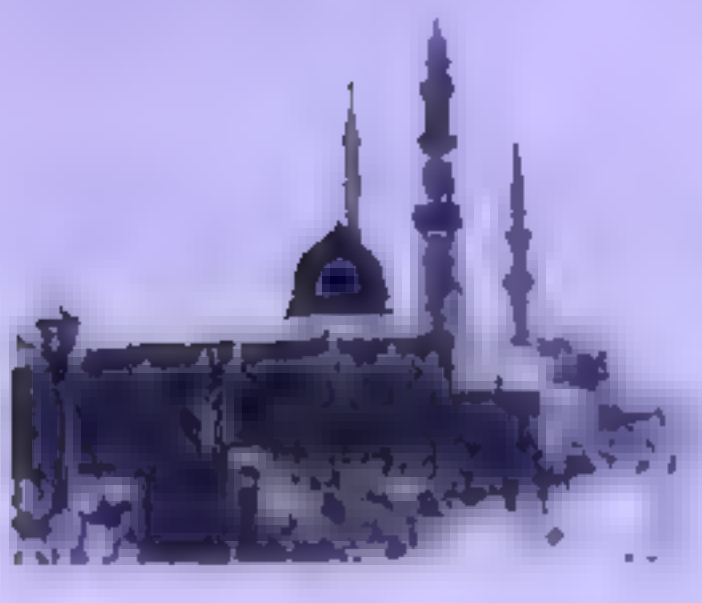

Extension Lecture

Dr Syed Taqi Abedi

Hosted

Imam Syed Sibtain

Dr Tahir Abbas

Saturday 7th April 2019

Time 3.30pm

Join Zoom Meeting

Meeting ID 751 520 8388

Password 587423

For Further Information Qasim Ali 306-717-0917

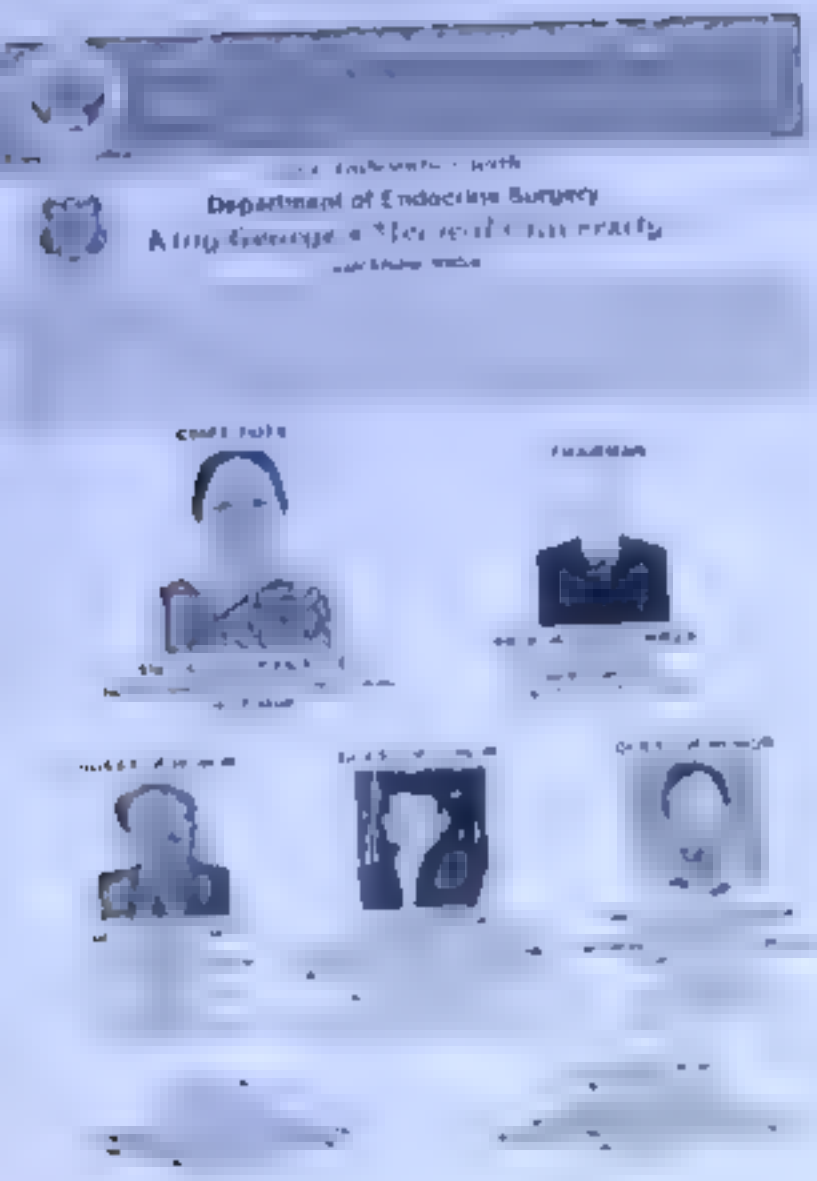
Department of Endocrine Surgery
Date Sunday June 7, 2020
Time 11:30 AM Central

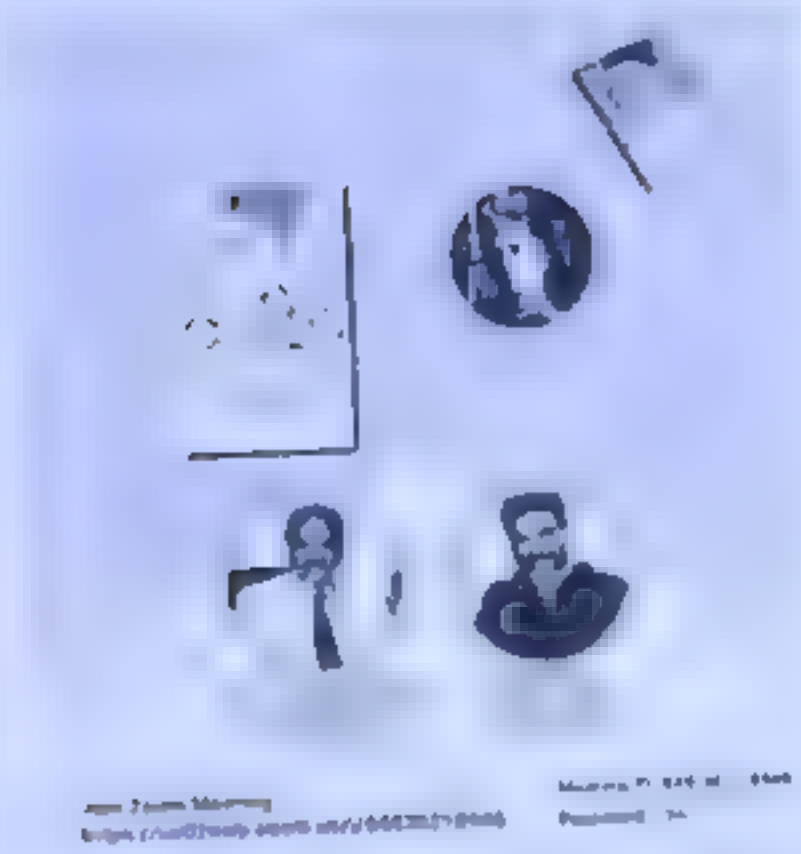

کاروانِ

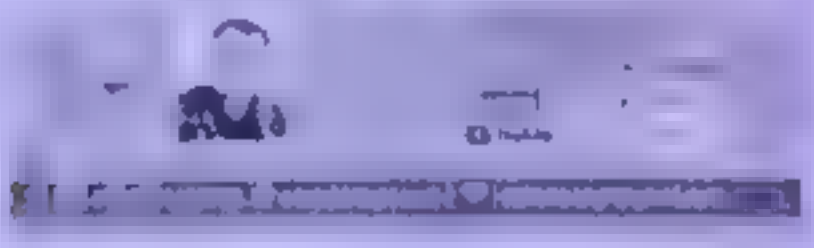

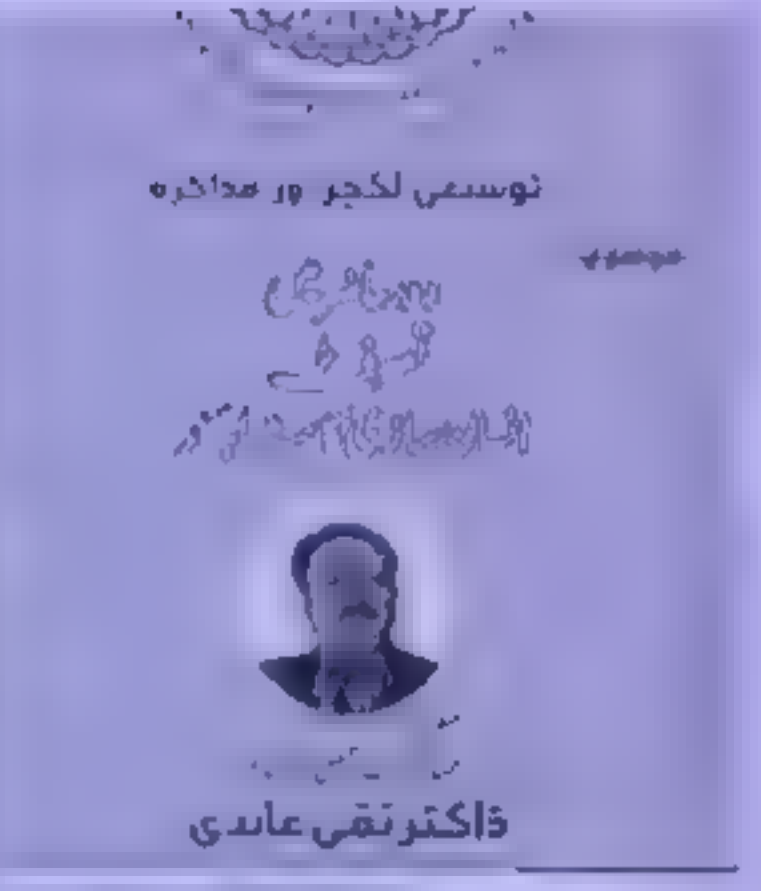
نوسعی لکچر ور مذاکرہ
ڈاکٹر تقی عابدی

INTERNATIONAL IQBAL SOCIETY'S WEBINAR
علامہ اقبال اور نپولین سلطان
Dr. Tauqir Ahmed
16th
AUGUST
SUNDAY

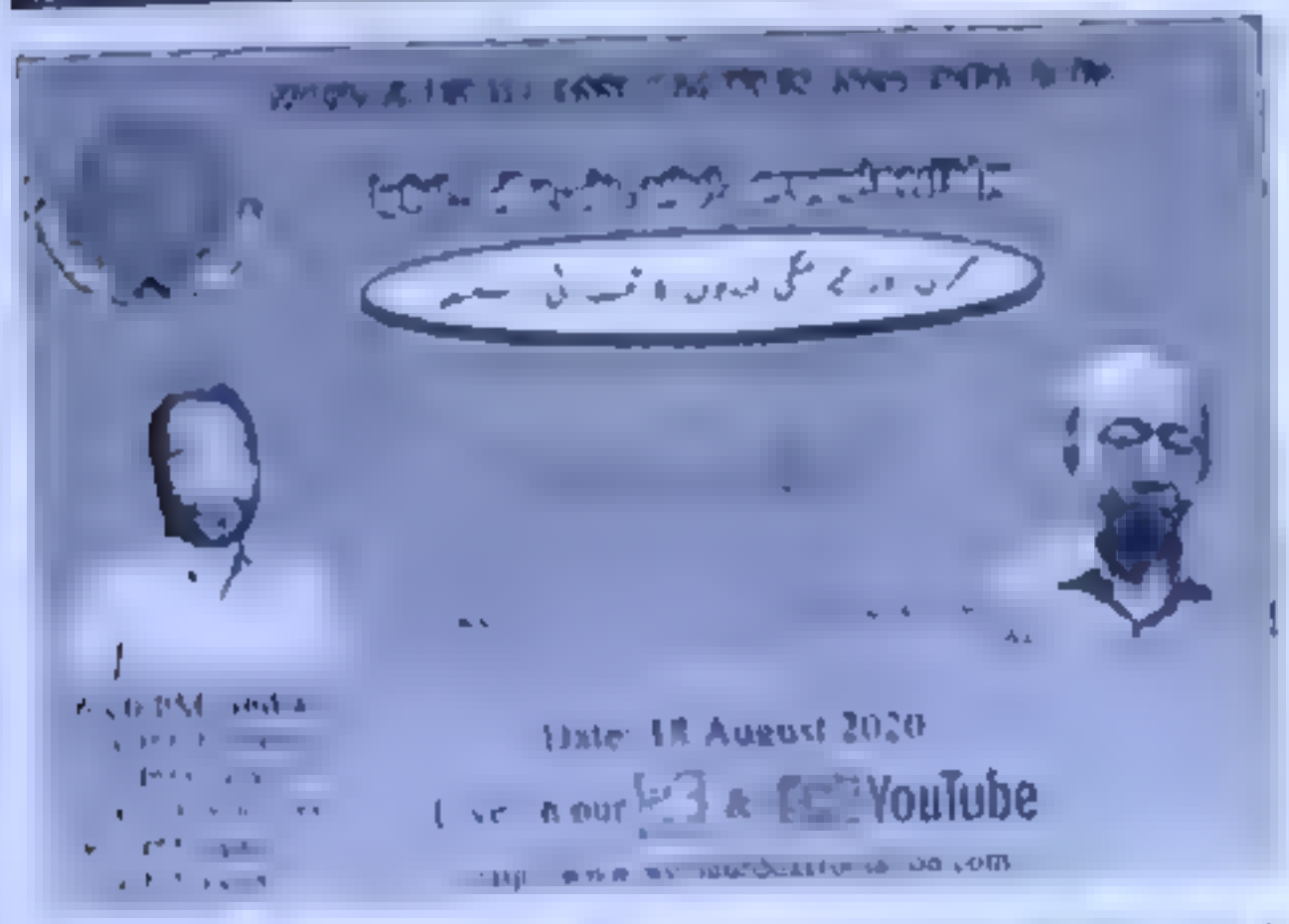
Date: 18 August 2020
YouTube

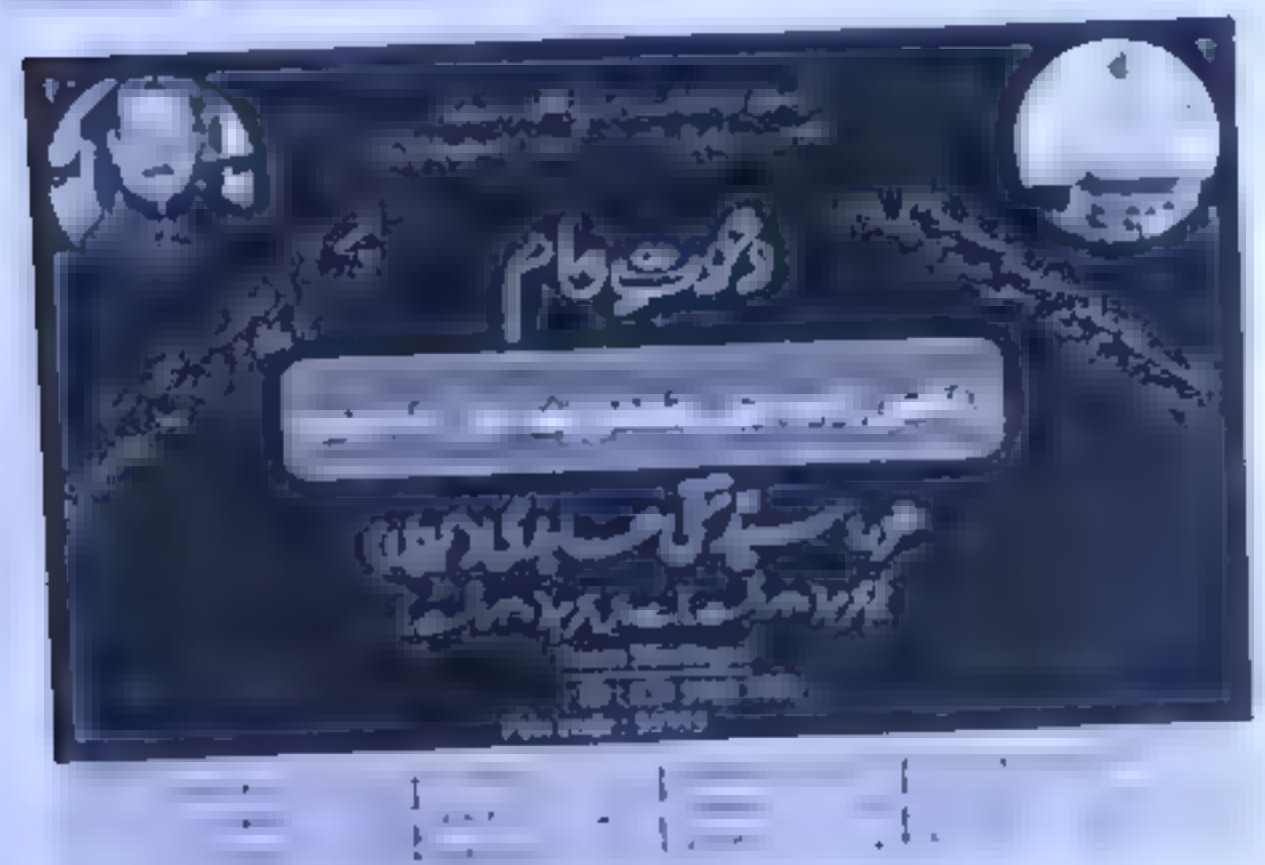

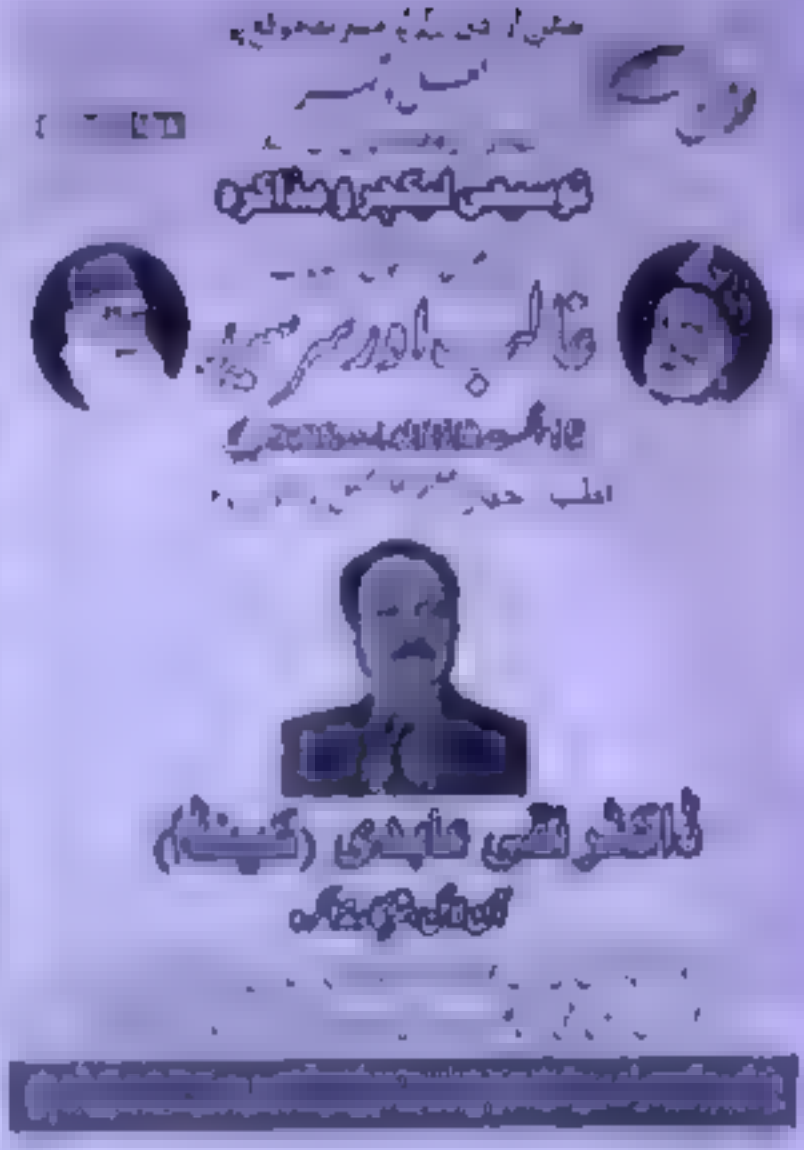
ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا)

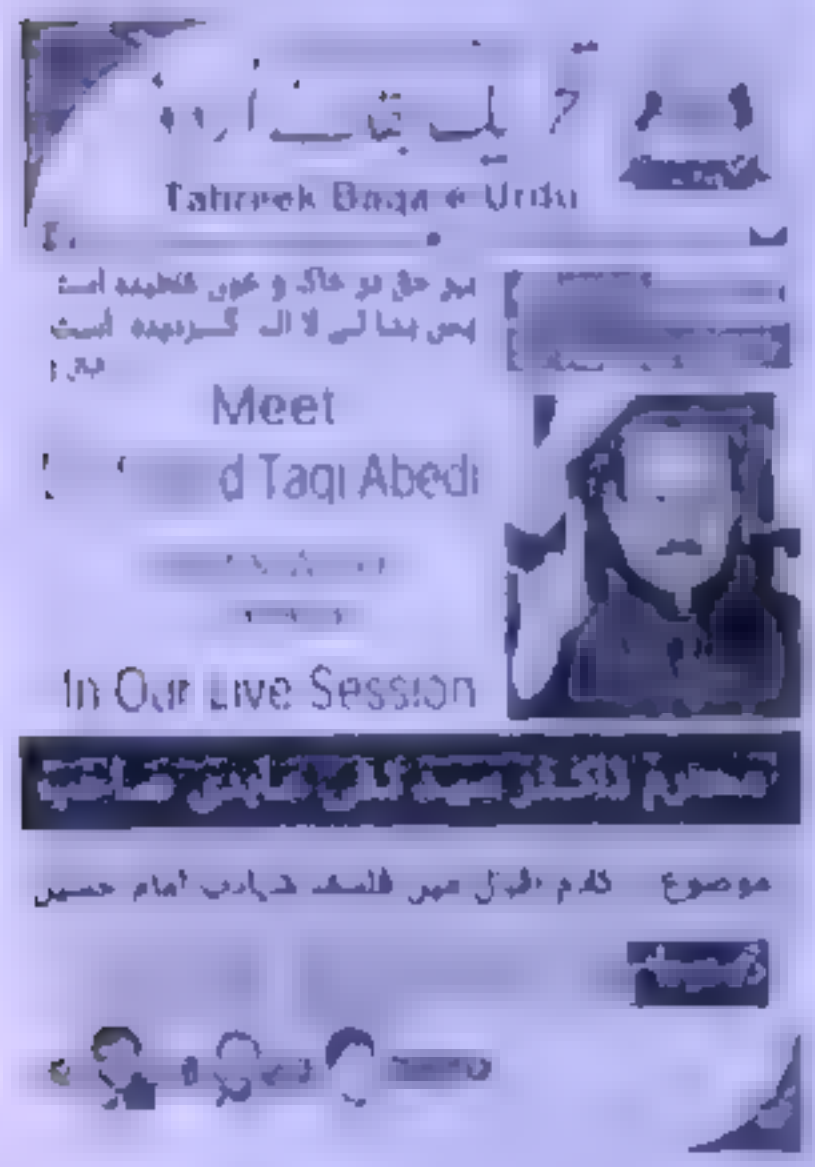
Tahreek Baqa e Urdu
Meet
d Taqi Abedi
In Our Live Session

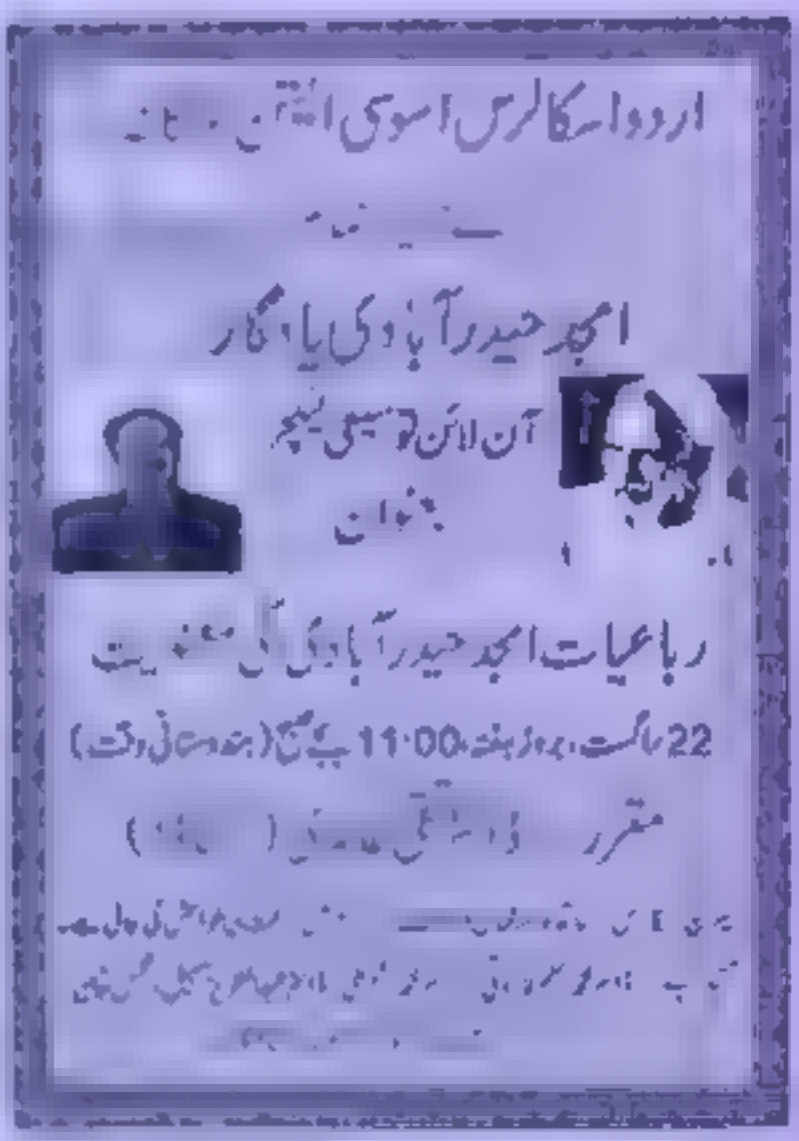
اردو اسکالرس اسوسی ایشن
امجد حیدر آبادی یادگار
22 اگست

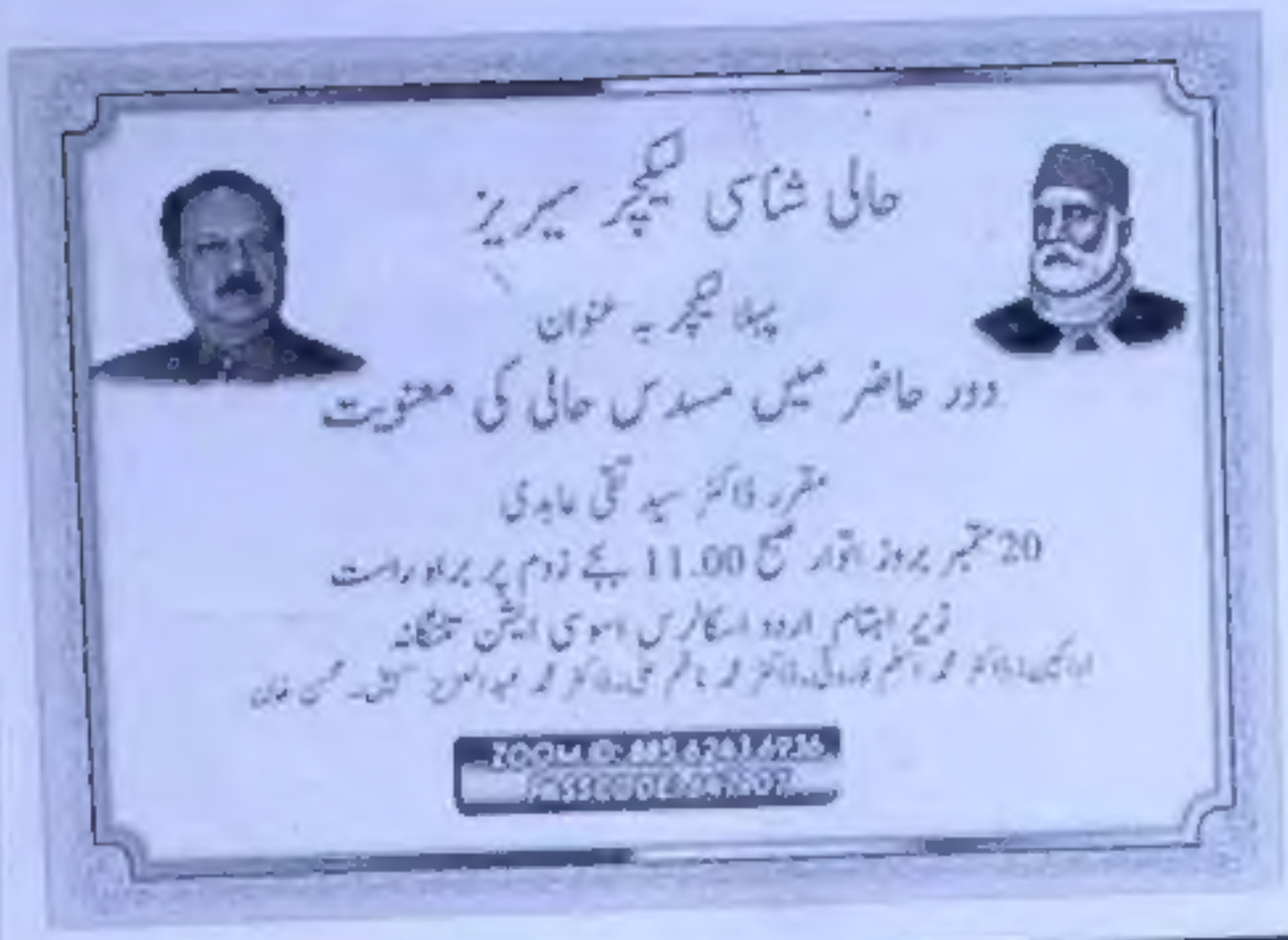
حالی شناسی لیکچر سیریز
پہلا لیکچر بہ عنوان
دور حاضر میں مسدس حالی کی معنویت
مقرر: ڈاکٹر سید تقی عابدی
20 ستمبر بروز اتوار صبح 11.00 بجے زوم پر براہ راست
زیر اہتمام اردو اسکالرس اسوسی ایشن تلنگانہ

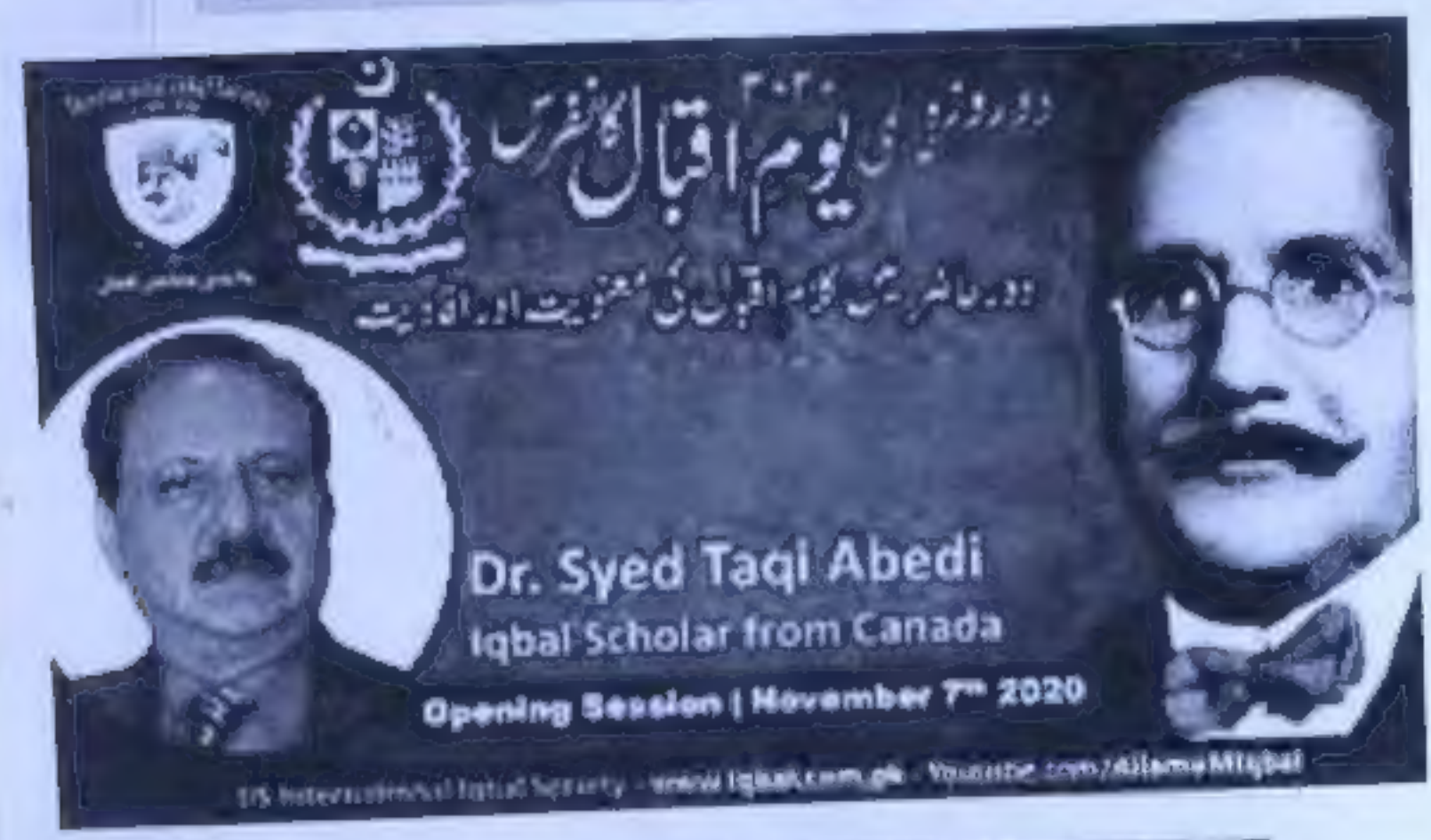
یوم اقبال کانفرنس
Dr. Syed Taqi Abedi
Iqbal Scholar from Canada
Opening Session | November 7th 2020

دریائے نیکر کے کنارے یادِ اقبال محفل مشاعرہ
0172-6650343

تعارف، تشریح اور تبصرہ کتاب
یادگار انیس
2020

ڈاکٹر تقی عابدی کا علمی لکچر
موضوع "گلزار کی تروینی"
2020

ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا)
9th November 2020 at 11 am

اقبال و تمدن اسلامی

ویبنار۔ بسلسلہ: فکر اقبال
7 نومبر 2020ء بروز ہفتہ

"گنبد کی صدا"

"دورِ حاضر میں کلامِ اقبال کی معنویت"

سوز و سازِ رومی

شہید
بوئے نافہ
گلشن دنیا
نغمۂ شاعری
عروس فن
اقبال کے حضور
نشاتہ خان انشا
یادگار مرثیہ
اظہارِ حق
طالع مہر
مجتہد الکلام مرزا دبیر
مشکل سلام
مشنویاتِ دبیر
ابواب المصائب
مصحف فارسی
ذکر ذبان دان
تصویر تمام
مجموعۂ دبیر
مہ انجم
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA
ISBN 978-81-19035-39-7
978-81-19035-39-7
www.ephbooks.com